پاکستان کی کہانی

حضور پاک ﷺ کے سپاہی کی زبانی



(حضور پاک ﷺ کا سپاہی)
میجر (ر) امیر افضل خاں



پاکستان کی کہانی

حضور پاک ﷺ کے سپاہی کی زبانی



پاکستان کی کہانی

حضور پاک ﷺ کے سپاہی کی زبانی

آزادی کی نعمتِ خداوندی
اور
اُس کی حفاظت کے تقاضے

یہ بندگی خدائی وہ بندگی گدائی۔ یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ

میجر (ر) امیر افضل خاں (حضور پاک ﷺ کا سپاہی)

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور فون: 7352332-7232336

نام کتاب	....	پاکستان کی کہانی، حضور پاک ﷺ کے سپاہی کی زبانی
تحریر	....	میجر (ر) امیر افضل خان
		19 ذیشان کالونی۔ قاب لائنز۔ راولپنڈی 5583778
ناشر	....	گل فراز
کمپوزنگ	....	انیس احمد
پروف ریڈنگ	....	جمشید زکریا
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
سنِ اشاعت	....	
قیمت	....	-/800 روپے

☆...... ملنے کے پتے ......☆

علم و عرفان پبلشرز

40۔ اُردو بازار، لاہور فون: 7352332-7232336

سیونتھ سکائی پبلی کیشنز

غزنی سٹریٹ، الحمد مارکیٹ، 40- اردو بازار، لاہور

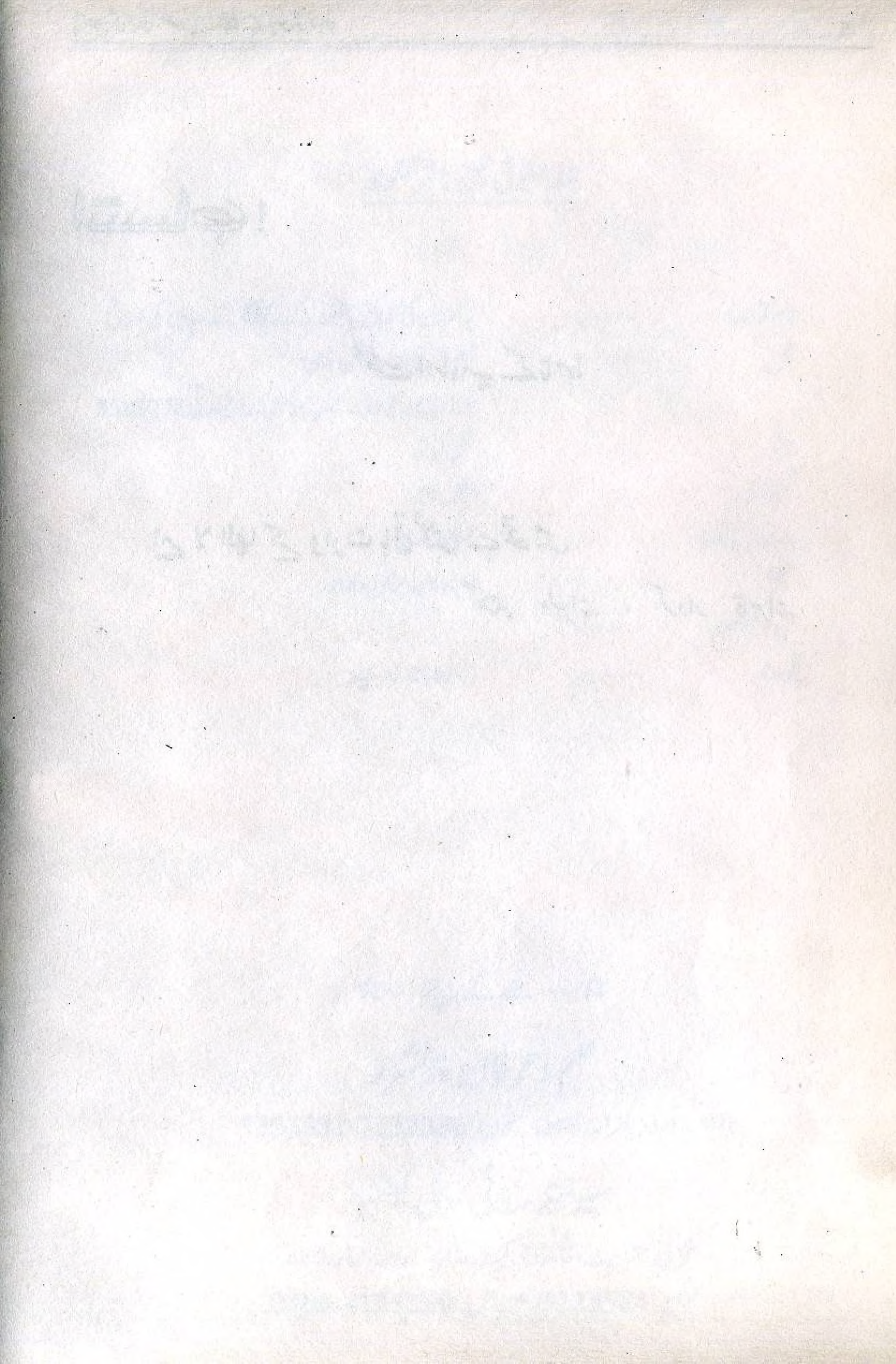
فون: 7223584۔ موبائل: 0300-4125230

انتساب!

ملت اسلامیہ کے نام!

اے لا الہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں

گفتارِ دلبرانہ ، کردار قاہرانہ



فہرست

پہلا سلسلہ

پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے

پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے

اصلی چیز اور میرے مضامین کا جس طرف رخ ہے وہ پاکستان کے بارے ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے۔ ویسے تو فطرت ہر واقعہ میں اپنے کئی ''رازوں'' کا چھپاؤ کیے ہوتی ہے۔ کہ سورۃ البقرہ کی آیت مبارکہ 216 میں واضح فرما دیا کہ ''اے انسان تم جس چیز کو اپنے لئے اچھا سمجھتے ہو تمہیں کیا معلوم کہ وہ تمہارے لئے بری ہو کہ یہ راز کی باتیں اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہی جانتی ہے۔'' اور کچھ انسان دنیا میں عبرتناک انجام سے بچ جاتے ہیں۔ لیکن جب پوری قوم ہی جھوٹ اور فریب پر گزارا کرنا شروع کر دے تو علامہ صاحب فرما گئے تھے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ جاؤ فلاں بستی کو تہ و بالا کر دو۔ فرشتوں نے عرض کی ''کہ وہاں ایک عابد زاہد بھی رہتا ہے''۔ تو رب کی ذات پاک نے فرمایا ''کہ ہاں اسی وجہ سے کہ اس نے بھی لوگوں کو میری نافرمانی سے نہ روکا'' تو قارئین اس عاجز کو اللہ تعالیٰ توفیق دے رہا ہے کہ میں لوگوں کو باور کراؤں کہ یہ ملک ہم نے اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے نام پر بنایا۔ آؤ یہاں اس ذات پاک کے دیئے ہوئے نظام اور قانون کو اپنائیں۔ اور اس کافرانہ رومن قانون اور آئین کو سمندر میں ڈبو دیں۔ تو رب کی ذات پاک مجھے اور مجھ جیسے چھوٹے میجر کو ''حجت'' کے طور پر بھی استعمال کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ عجیب و غریب مشاہدات بھی کرا رہا ہے اور واقعات کا چشم دید گواہ بھی بنا دیا ہے کہ میں کچھ عمل بھی کروں اور اپنی آنکھ سے دیکھوں کہ کس طرح لوگ ایسی کوتاہیاں کر رہے ہیں، جو پاکستان کو ختم کر دیں لیکن فطرت کسی معجزہ سے پاکستان کو بچا لیتی ہے۔

تحریک پاکستان یا پاکستان کے ابتدائی ایام کے میرے ہم خیالوں اور ہم عصروں میں چند صاحبان جنرل انوار قریشی اور بریگیڈیئر نثار قریشی، بریگیڈیئر اسلم نیازی اور شمس الحق قاضی زندہ ہے (جو نوائے وقت کے مایہ ناز قلمکار بھی ہے۔) باقیوں میں سے جنرل حق نواز، جنرل ملک شیر بہادر، جنرل فضل مقیم، بریگیڈیئر گلزار احمد، کرنل سلطان علی شاہ، کرنل شیر محمد، بریگیڈیئر صدیق سی، جنرل امیر حمزہ، جنرل احسان الحق ڈار، بریگیڈیئر نوشیروان کرنل حسن مرزا، کرنل محمد اسلم عباسی اور کرنل حفیظ آفریدی وغیرہ ایک انبوہ تھا جو اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے ہیں کہ ان لوگوں نے پاکستانی فوج کو کمال ترکی کی لائن پر بے دین نہ ہونے دیا لیکن ان میں سے اکثر صاحبان نے مایوسی کے دن گزارے۔

خاص کر برادرم کرنل شیر محمد تو اپنی زندگی کے آخری ایام میں مجھے بھی اس ''تبلیغ'' سے منع کرتے رہے

کہ میں فریدالدین عطار بننے کی کوشش نہ کروں اور اس آنے والی تباہی کو روکنے کی کوشش نہ کروں' جناب عطار منگولوں کی یلغار اور تباہی کو نہ روک سکے ''تو کون ہوتا ہے'' کہ ہماری نافرمانیوں کی وجہ سے آنے والی تباہی کو روکے۔ آنے دو اس تباہی کو کہ ''اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد''

لیکن میرا رویہ قارئین کے سامنے ہے۔ ''کہ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' مجھ سے جو کچھ ہو سکا' جاری رکھا اور اللہ تعالیٰ نے بڑی مدد کی۔

''زمانہ اپنے حوارث چھپا نہیں سکتا۔ ترا حجاب ہے قلب ونظر کی ناپاکی''

تو پاکستان کے ایک راز ہونے کے معاملات اور ''سلطانی پارٹی'' کا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ لوگ سلطانی پارٹی میں جا کر حکومت کے مزے کرنا چاہتے ہیں اور حکومت مل جاتی ہے تو خوش ہو جاتے ہیں اور وہاں وہ کچھ کرتے ہیں جو چاہتے ہیں۔ ایوب خان نے نہ صرف سیاسی بدعنوانی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے بلکہ خود سیاسی بدعنوانی کی حدیں پھلانگ گیا' نتیجہ انتظامی بدنامی کے طور پر ظاہر ہوا جس کو ختم کرنے کے اعلان کرنے والے یحییٰ خان نے ''انتظام'' کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے۔ اس عاجز نے یحییٰ خان کو بھرے ایوب ہال میں ستمبر 1970ء میں بتا دیا تھا کہ اس کی فوج کا ''چھاتہ'' پاش پاش ہونے والا ہے۔ معاملات اس سے بھی بدتر صورتحال اختیار کر گئے اور 1971ء میں ہمارے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا۔

1-ذوالفقار علی بھٹو کی عیاریاں

ہمارے اندر کے ان غداروں نے مسلم قومیت کو پاش پاش کرایا' بھٹو تو یہ کچھ ہمارے ساتھ 1965ء میں کرا رہا تھا لیکن ہماری قوم مومن کی فراست سے اتنی عاری ہے کہ 1970ء میں لوگوں نے اس کی شعبدہ بازی کی وجہ سے اس کو ہمارا نجات دہندہ سمجھ کر اپنا رہنما بنا لیا۔ اس عاجز نے تو 1965ء میں بھی بہت شور کیا کہ کوئی سازش پنپ رہی ہے اور ہمیں جنگ میں دھکیلا جا رہا ہے اور ہم اس جنگ کیلئے تیار نہیں اور زبانی کلامی تو بہت کچھ کیا' لیکن جولائی' اگست 65ء میں تو لکھ کر ایسے دیا اور اس سلسلہ میں پنجاب کے سابق گورنر جنرل محمد صفدر کو گواہ کے طور پر پیش کر سکتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ سولہ پنجاب میں کیپٹن تھے اور پلٹن کی ساری فائلیں دیکھی جائیں کہ رپورٹ میں پیدل فوج کی کمی کا رونا رویا گیا اور جنگ کے بعد کیا ہوا کہ پستول میرے ہاتھ میں تھا اور وہ لمبی کہانی تو بعد میں لکھیں گے کہ ستمبر 65ء کی جنگ ہماری فتح ہرگز نہ تھی، تنبیہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بچا لیا۔ ہمیں توبہ وندامت کر کے اپنے آپ کو ٹھیک کرنا تھا لیکن الٹے کام کیئے تو غیر جو کچھ ہمارے ساتھ 1965ء میں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے وہ کچھ 1971ء میں کر دیا۔

لیکن اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے ایک مجاہد ساتھی اور ستمبر 65ء کی جنگ کے غازی افتخار جواب کرنل کے طور سے فوج سے ریٹائر ہو گئے ہیں ان کو خواب آ گیا تھا کہ پاکستان ہار گیا' لیکن اسلام جیت گیا'' ہمارے لئے یہ ڈھارس تھی کہ پاکستانی قومیت کا فلسفہ نہ چل سکا۔ اسلام اور مسلم قومیت کا فلسفہ زندہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد سب سے پہلے مصر کے اس زمانے کے بادشاہ فاروق نے طنزیہ طور بیان دیا کہ کیا پہلے اسلام کوئی نہ

تھا؟ اب پاکستان میں اسلام نے جنم لیا ہے تو چند سال بعد بادشاہی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ایران کا شہنشاہ رضا پہلوی 1950ء میں پاکستان آیا تو راقم دو ہفتے اس کو نزدیک سے دیکھتا رہا' بہت مرعوب اور خوش ہوا اور اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی تھی۔ وہ پاکستان کا مداح تھا لیکن جب اس نے رویہ تبدیل کیا اور خفیہ ذرائع سے پاکستان کی جڑیں کاٹنا شروع کیں تو ایران کے تخت پر بھی قائم نہ رہ سکا۔ اسی طرح پاکستان کے بیرونی دشمنوں میں ماؤنٹ بیٹن' اندرا گاندھی' داؤد اور اس کے بھائی نعیم جس حشر سے دوچار ہوئے یا اندرونی دشمن خضر حیات ٹوانہ' جی ایم سید اور غفار خان صمد اچکزئی وغیرہ' جو نہ ادھر کے تھے نہ ادھر کے'' سب کی کہانی آگے وسعت کے ساتھ بیان ہوگی۔ فی الحال صرف بھٹو خاندان پر توجہ مرکوز کرتے ہیں جس کے لئے رب کی ذات پاک سے دانش نورانی کے حامل ہونے کے خواستگار ہیں۔

اک دانش نورانی اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

ہم واقعاتی طور پر یہ کچھ جانتے ہیں کہ موجودہ صوبہ سندھ کسی زمانے میں صوبہ بمبئی کا حصہ تھا اور لاڑکانہ کا ایک زمیندار شاہنواز بھٹو بڑا امیر آدمی تھا اور زیادہ وقت بمبئی میں رہتا تھا اور اس کی ایک بیوی ہندو تھی اور ذوالفقار بھٹو اور سکندر بھٹو اس کی اولاد تھے۔ شاہنواز کی ایک اور شادی حیدر آباد دکن کے کسی امراء کے گھرانہ میں ہوئی تھی اس سے ایک بیٹی' پہلی اولاد تھی جو حیدر آباد دکن سے آئے ہوئے پاکستانی فوج کے افسر صاحبزادہ سید مصطفیٰ کی بیوی تھی اور یہ مصطفیٰ مرحوم کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔

تو یہ شاہنواز بھٹو نوابوں' مہاراجوں میں جانی پہچانی شخصیت تھے اور جب پاکستان وجود میں آیا تو یہ صاحب ریاست جوناگڑھ کے وزیراعظم تھے' جس کا نواب مسلمان تھا اور رعایا میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ شاہ نواز نے نواب صاحب سے ریاست کی پاکستان میں ''شمولیت'' کرا دی' لیکن یہ ایک سازش تھی جس کو پاکستان کے حکمران یا ہم لوگ نہ سمجھ سکے۔ ہم خوش تھے کہ حیدر آباد دکن اور گوا وغیرہ کو بھی ہم پاکستان کا حصہ بنانا چاہتے تھے اور جوناگڑھ کے ساتھ سمندری رابطہ کی مدد سے اہم گوا۔ اور حیدر آباد سے ملاپ قائم رکھ سکیں گے۔ لیکن نہایت غداری سے شاہ نواز بھٹو۔ جوناگڑھ بھارت کے حوالے کر آیا اور ہمیں اس نواب صاحب کی ''مہاجر'' کے طور پر اس وقت سے دیکھ بھال کرنی پڑ رہی ہے۔ شاہ نواز خود بھارت اور پاکستان دونوں کا شہری بنا ہوا تھا اور اکتوبر 1949ء میں ذوالفقار بھٹو' بھارت کا شہری ہوتے ہوئے بمبئی سے پاکستان آیا ہوا تھا کہ راقم نے اس کو ''ٹڈی لباس'' میں کوہاٹ میں دیکھا۔ جہاں اس کا بہنوئی مصطفیٰ گائیڈ رسالہ کی کمانڈ کرتا تھا اور ضیاء الحق صاحب اسی رسالے میں کیپٹن تھے۔

اس کے بعد بھٹو کا نام ہم نے 1958ء میں سنا جب سکندر مرزا نے ایوب خان کی حکومت میں بھٹو کو وزیر بنوایا۔ لوگ بھٹو کو مذاق سے سکندر مرزا کا ''ہم زلف'' بھی کہتے تھے کہ دونوں کی بیویاں ایرانی نژاد اور شیعہ تھیں' لیکن بھٹو کو معلوم تھا کہ سکندر مرزا کا ''پتا'' کاٹا جا رہا ہے تو اس نے ایوب خان کو ''ڈیڈی'' کہنا شروع کر دیا اور ''سلطانی پارٹی'' کا پکا ممبر بن گیا۔

شاہ نواز کی اس ''سازش'' میں مہاراجہ کشمیر کوشہ دینا مقصود تھی کہ وہ ریاست کی مسلمان اکثریتی آبادی کے ہونے کے باوجود بھارت میں شامل ہو سکتا تھا کہ میر علی احمد تالپور نے جس لنگڑے لولے پاکستان کو اینگلو امریکن بلاک کی ''ضرورت'' قرار دیا' اس کو کشمیر ہرگز دینا مقصود نہ تھا اور ہماری قوم اکیلے طور پر ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف کو اپنا دشمن قرار دیتی ہے۔ بات کچھ اور ہے' ساری انگریز قوم ہماری دشمن ہے کہ صوبہ سرحد کو بھی پاکستان کا حصہ نہ بنانا تھا اور بھارت کو کشمیر دے کر چترال' سوات اور دیر کے علاقوں کے ساتھ صوبہ سرحد کے ساتھ خشکی سے ایک ملک بنانا تھا کہ بھارت کو ''مہا بھارت'' نہ بننے کیلئے مغربی پنجاب اور سندھ کو الگ رکھ کر بھارت اور پاکستان دونوں کو موجودہ حالات سے اور بدتر صورت میں اہل مغرب اپنی انگلیوں پر نچانے کا پروگرام بنائے ہوئے تھے۔

یہ عاجز اس پوری سازش کو اور ہمارے انگریز نوکروں نے جو ہمارے قبائلیوں سے سری نگر کی طرف پیش قدمی کا ڈرامہ رچوایا کہ قبائلیوں کو کھلے میدان میں بھارتی فوج سے مار دلوا کر ہمارے دماغوں سے جس ''جہاد کے کیڑے'' کو نکالنا تھا بعد میں تفصیلی بیانات سے واضح کرے گا کہ کس طرح مہاراجہ ہری سنگھ کیلئے ''اندھیرا گھپ'' کر کے اس کو سری نگر سے جموں فرار کرا کے ریاست کے بھارت میں شمولیت پر دستخط کرائے گئے۔ فی الحال یہ یاد رکھیں کہ 3 جون 1947ء کے اعلان کے چند دن بعد ماؤنٹ بیٹن نے گلگت ایجنسی' جس کو برطانوی ہند کی حکومت نے 1995ء تک مہاراجہ کشمیر سیلیز (پٹے) پر لیا ہوا تھا اور صوبہ سرحد کا پولیٹیکل محکمہ چترال کے ساتھ گلگت کا انتظام بھی سنبھالے ہوئے تھا۔ اس معاہدہ کو ختم کر کے گلگت کا علاقہ مہاراجہ کشمیر کے حوالے کر دیا کہ اگر صوبہ سرحد پاکستان میں شامل ہو گیا اور یہ لیز جاری رہی تو 14 اگست 1947ء کو یہ پولیٹیکل محکمہ پاکستان کے ماتحت چلا جائے گا اور گلگت، سکردو وغیرہ خود بخود پاکستان کا حصہ بن جائیں گے۔ اس لئے پاکستان دشمنی کی یہ وسیع وضاحتیں تھیں جو انگریزی سامراج کا ڈوبتا سورج ہمارے ساتھ کر رہا تھا۔ جواہر لعل نہرو نے نوری السعید کو ''گھاس'' نہ ڈالی تھی۔ یہ 1954ء کا واقعہ تھا اور ہم اصلی سازش کو جا کر 1962ء میں سمجھ سکے۔ جب انگریزوں کے وزیر دفاع ڈنکن سنڈے نے ایوب خان کو سبز باغ دکھا کر مزید بے وقوف بنانا چاہا' لیکن ایوب خان ایک حد سے آگے جانے کو تیار نہ تھا۔ یہ بڑا اہم واقعہ ہے کہ 1954ء میں جب نوری السعید نے جواہر لعل نہرو کو بغداد پیکٹ میں شامل ہونے کی دعوت دی تو نہرو نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ پاکستان کے بغداد پیکٹ میں شامل ہو جانے کی وجہ سے کشمیر میں رائے شماری کرانے کی اقوام متحدہ کی قرارداد کو جو منظور کیا ہوا تھا' اس کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا اور انڈونیشیا کے ڈاکٹر سوئیکارنو اور مصر کے جمال عبدالناصر سے مل کر ''غیر جانبدار'' تحریک کا شوشہ چھوڑ کر چین کو بھی بے وقوف بنانے کی سعی کی۔ اس میں وہ پوری طرح کامیاب تو نہ ہوا لیکن غیر جانبداری کے ''لبادے'' کو خوب استعمال کیا کہ اب تو اس معاہدہ کے ممبر ملکوں کی تعداد 77 ہے اور پاکستان بھی اس کا ممبر ہے کہ بین الاقوامی دنیا میں بھی سب جھوٹ ہی جھوٹ چلتا ہے۔

لیکن اندرونی طور پر جواہر لعل نہرو' اینگلو امریکن بلاک والوں سے ملا ہوا تھا اور چین کو اپنے ملک میں محدود کرنے اور تبت میں چین کے خلاف کوئی تحریک شروع کرنے کیلئے امریکن بلاک کے کہنے پر 1962ء میں نہرو کی فوجیں سرحد پر چینی فوجوں کے خلاف ''پنگا'' لے بیٹھیں لیکن ایسی مار کھائی کہ بھارتی کور کمانڈر جنرل کول فرار

اختیار کر کے آ کر دہلی میں ''چھپ'' گیا اور بھارتی فوج ایسی دگرگوں حالات میں تھی کہ پاکستان کیلئے کشمیر حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع تھا کہ کشمیر کی بھارتی فوجوں کی ناکہ بندی کر دی جاتی۔

تو امریکہ والوں نے برطانیہ کے چالباز وزیر ڈنکن سنڈے کو فوراً برصغیر میں بھیج دیا' جس نے ایوب خان کو کشمیر کے سلسلہ میں خوب سبز باغ دکھلائے اور پہلے ہی ایوب خان کی یہ لوگ نہرو کے ساتھ ملاقات کرا چکے تھے کہ ایک دفعہ مشرقی پاکستان جاتے وقت ایوب خان دہلی رک گیا کہ اینگلو امریکن بلاک نے ایوب خان سے نہرو کو ہندوستان پاکستان متحدہ دفاع کی پیشکش کرا دی تھی۔ جس کو نہرو نے ہنسی میں ٹال دیا تھا کہ کس کے برخلاف دفاع؟ (یعنی دشمن تو ہم ایک دوسرے کے ہیں اور یہاں کس کے خلاف دفاع بنائیں) تو ایوب اس ''مشن'' سے مایوس ضرور تھا لیکن ڈنکن سنڈے ایوب خان کو شیشہ میں اتارنے میں کامیاب ہو گیا کہ ایوب خان کو کشمیر کے سلسلہ میں بہت ''سبز باغ'' دکھائے لیکن جب اینگلو امریکن بلاک کی طرف سے مسٹر ڈنکن سنڈے نے یہ مشورہ دیا کہ اگر ایوب خان بھارتیوں کو مشرقی پاکستان کی زمین کے ذرائع آمدورفت کے استعمال کی اجازت دے دیں تاکہ وہ آسام اور نیفا کی بھارتی فوج کی سپلائی کے حالات بہتر کر سکے تو ایوب خان کو اپنے پاؤں تلے سے زمین نکلتی نظر آئی۔

1962ء سے 1965ء تک ایوانِ صدر اور ایوب خان کے معاملات کو اس عاجز نے بہت ''نزدیک'' سے دیکھا اور مجھے معلوم ہے کہ ایوب خان نے ڈنکن سنڈے کے اس ''مشورہ'' کا مصلحتی جواب بھی نہ دیا کہ وہ کہہ دیتا کہ ''میری قوم مجھے اس حد تک جانے کی اجازت نہ دے گی'' اس نے ذاتی طور پر اس سلسلہ میں بڑا سخت رویہ دکھایا کہ ڈنکن سنڈے کو ایسا مشورہ دینے کی ہمت کیسے ہوئی؟ اور ایوب خان کی اس ''غیر تمندی'' کی وجہ سے قدرت نے اس کو پاکستان پر مزید سات سال حکمران رکھا۔

اب جو لوگ انگریز قوم کو جانتے ہیں یا ان کے مزاج اور رویوں سے واقف ہیں کہ یورپ کی سرد ہواؤں میں گلف سٹریم کی گرم رووں نے ان کو ایک ایسا ''معتدل اور مکارانہ'' مزاج دیا ہے کہ چھوٹا سا ملک ہوتے ''طاقت کے توازن'' کی پالیسی کو اپنا کر پچھلے پانچ سو سالوں سے وہ یورپ اور دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ خود جو کچھ میں نے ایوب خان کی اپنی زبان سے سنا کہ ایوب خان کا یہ رویہ دیکھ کر ڈنکن سنڈے نے اپنی قوم کے مشہور محاورے کے تحت اپنے اس ''مشورہ'' سے ایسا ''سمر سالٹ'' مارا گویا اس کا مطلب کچھ بھی نہ تھا اور اس نے mean اپنی سوچ کے ایک پہلو کو معمولی سی ہوا دی ہے۔

لیکن جو چیز ایوب خان اور ہم اس زمانے میں نہ سمجھ سکے وہ حیلۂ فرنگی کی گہرائی ہے۔ پچھلے چار سال سے ایوب خان اہل مغرب کے احکام پر اس طرح عمل کر رہے تھے جس طرح وائسرائے ہند' آزادی سے پہلے کرتا تھا۔ انگریزوں نے امریکنوں کی مدد سے ایک نیا سبق سیکھ لیا کہ جب تک وہ اس پہلو پر عمل نہیں کرتے کہ ''مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے'' وہ اس خطہ میں اپنی من مانی نہ چلا سکیں گے۔ راقم کو اس سلسلہ میں پہلے بھی کچھ تجربہ تھا میں نے کئی مخلص پاکستانیوں کے ساتھ مل کر امریکی امداد کیلئے ''جھولی پھیلانے'' میں بڑا حصہ لیا تھا اور امریکنوں کے ساتھ خوب دوستی لگائی تھی لیکن مجھے جلد معلوم ہو گیا کہ وہ مخلص پاکستانیوں کی بجائے ہمارے اندر ''ابن الوقت

آدمیوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ میں نے اپنی طرف سے امریکنوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ابن الوقت لوگ کل روس یا سوشلسٹ بلاک کی جھولی میں جا کر بیٹھیں گے۔ تم مخلص پاکستانیوں پر بھروسہ کرو کہ وہ حق پرست ہوتے ہیں۔ تمہارے بہت کام آئیں گے اور وفادار رہیں گے لیکن مجھے جلد عملی طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ لوگ ''بے کردار'' آدمیوں کی ''تلاش'' میں تھے۔

اہلِ مغرب نے اس کے بعد ہمارے اندر سے ''بے کردار'' آدمیوں کو تلاش کر کے ان کی مدد سے ہمیں ستمبر 1965ء کی جنگ میں جھونکا لیکن پورے مقاصد حاصل نہ ہوئے تو یہ سلسلہ جاری رکھا۔ تو پہلے 1969ء میں ایوب خان کا زوال لایا گیا۔

1971ء میں مسلم قومیت کے فلسفہ کو پاش پاش کرا کے ہم سے نوے ہزار مجاہدین کو بھارت کا قیدی بنوایا لیکن فطرت اس سب کے باوجود ہمیں بچائے ہوئے ہے کہ اکیسویں صدی کے شروع میں بھی لاکھوں کی تعداد میں بھارتی فوجی تقریباً ایک سال ہماری سرحد کے ساتھ ''ڈنڈ پیلتے'' رہے لیکن ان کو ہم پر حملہ کی ہمت نہ ہوئی' حالانکہ بھارت آبادی اور ذرائع کے لحاظ سے ہمارے سے سات گنا بڑا ہے۔

ستمبر 65ء کی جنگ کے ذاتی مشاہدات اور میرے جائزے قوم پر واضح کر دیں گے کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا راز ہے کہ رب کی ذات اس کی کیسے حفاظت کرتی ہے۔ کچھ ''پردہ نشین'' کچھ ابن الوقت اور بے کردار لوگ اور ان کے ''جانشین'' خود بخود قارئین کے سامنے آ جائیں گے کہ کس طرح انہوں نے اسلام دشمن طاقتوں کے مقاصد کو پروان چڑھانے کیلئے کس بے کرداری کا مظاہرہ کیا' یا کوتاہیاں کیں یا نالائق تھے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو بچا لیا بلکہ یہ ایک سنہری موقع تھا کہ اگر ہمارے رہنما صحیح طور پر تیاری کرتے تو کشمیر حاصل کرنا تو معمولی بات ہے' بھارت کافی حد تک کفر سے بھی پاک ہو جاتا اور ایسا ایک دن ہونا ہے لیکن ہم اپنے نفس کو نہیں پہچان رہے اور ذلت کی زندگی کی طرف مائل ہیں۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

ستمبر 65ء کی جنگ ایک بہت بڑی سازش تھی۔ اس کے بڑے بڑے ایکٹروں میں ذوالفقار بھٹو شامل تھا' جو ایوب کا بیٹا بن کر اپنے بہنوئی کرنل مصطفیٰ کی مدد سے فوج کے اندر ''گھس'' رہا تھا۔ اوّل بریگیڈیئر بعد میں جنرل گل حسن کے ساتھ دوستی گانٹھی کہ وہ ڈائریکٹر ملٹری آپریشن تھا اور شراب نوشی دونوں کی ضرورت تھی اور اسی ضرورت کے تحت قادیانی میجر جنرل اختر ملک سے دوستی بنائی کہ سازش کو جنم کشمیر میں دینا تھا اور جنرل اختر ان علاقوں کا کمانڈر تھا۔ ساتھ ہی مرزا غلام کذاب قادیانی کے پوتے ایم ایم احمد جو مالیاتی سیکرٹری تھا اس اور کئی قادیانیوں سے دوستی گانٹھی۔ اپنی شیعہ بیوی اور شراب نوشی کی مدد سے میجر جنرل بعد میں جنرل یحییٰ خان سے روابط باندھے کہ اس کی دوستی کا وسیع میدان بن جائے۔ ادھر بمبئی کے ''گرائیں'' بریگیڈیئر بعد میں میجر جنرل پیرزادہ اور اس کی بیوی کے متعدد بھائیوں کرنل اسماعیل وغیرہ یا ان کے ہم زلف بعد میں میجر جنرل ابرار وغیرہ فوج میں اپنے رابطہ کو اتنا وسیع کیا کہ محکمہ تعلقات عامہ کے میجر بعد میں کرنل مسعود احمد وغیرہ بھٹو کے ''مداحوں'' کی ایک فوج

''وجود'' میں آ گئی اور ایسے لوگ آج بھی فوج میں موجود ہیں۔

دوسرا اہم ایکٹر عزیز احمد تھا جو وزارت خارجہ میں بھٹو کے ساتھ خارجہ سیکرٹری تھا اور وہ اتنا اہم آدمی
کہ بعد میں بھٹو کے زمانہ میں وزیر خارجہ اور وزیر دفاع بھی رہا اور بھٹو کو تو ضیاء الحق نے پھانسی چڑھوا دیا۔ اس
ہاتھ لگانے کی ضیاء الحق کو بھی ''اجازت نہ'' تھی۔ شروع مضامین میں یہ عاجز جو پاکستان کے ''بادشاہ گروں'' کا ذ
کر چکا ہے اس میں عزیز احمد اور غلام احمد دو بھائی اہم مقام رکھتے تھے کہ ہمارے علاقہ میں برطانوی خفیہ سروس
آخری ستون میجر جنرل کاتھورن کے خاص چنیدہ تھے اور یہ کاتھورن وہی تھا جو امریکہ کی ضرورت کے طور پر' فو
سے سبکدوشی کے بعد آسٹریلیا کا شہری بننے کی وجہ سے ہمارے ملک میں آسٹریلیا کے ہائی کمشنر کے طور پر 956
سے تعین تھا جس کے پورے ''سازشی جال'' کے پردے تو پھر کبھی اتریں گے' فی الحال یہ کچھ باور کریں کہ اکتو
1958ء کو جب سکندر مرزا کو حراست میں لے کر کوئٹہ لے جایا رہا تھا تو ہوائی اڈہ پر اس کاتھورن کو اس کے سا
ملاقات کی اجازت ملی جس کو دیکھ کر سکندر مرزا نے ایک بڑی گالی نکالی تھی ''کہ اے حرامی'' کہ اس نے سکندر م
کو کیوں نہ بتایا کہ اس کی پوزیشن نمبرون ختم ہوگئی ہے' تو کاتھورن نے معذرت کی تھی کہ وہ خود اس بارے ''بے خ
تھا اور واللہ العلم یہ سچ تھا یا نہیں۔

بہرحال یہ ''احمد برادران'' پاکستان میں اس گروہ کی بنیاد باندھ گئے جس کو آج کل اخباری دنیا
Establishment کہا جاتا ہے کہ حکمرانوں کا چناؤ امریکن بلاک کی مرضی سے وہ لوگ کرتے ہیں۔ عزیز
کے بعد لوگ اس سلسلہ میں غلام اسحاق کا نام لیتے رہے اور آج کل طارق عزیز کا نام لیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم
عاجز اب حکومت کے قصروں سے دور ہے۔

تو ان اوپر بیان شدہ لوگوں کے علاوہ ستمبر 65ء کی جنگ کے ''ایکٹروں'' میں ایوب خان' محمد موسیٰ
سب جنرلوں اور اس کی سطح کے بری اور بحری افسروں کو شامل کیا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کسی نے اس زما
میں پروٹیسٹ نہ کیا کہ اس جنگ کیلئے ہماری تیاری مکمل نہیں۔ ہاں پچھلے تین چار سالوں سے ائر مارشل نور خان
کرتا پھرتا ہے کہ یہ ہماری غلطی تھی لیکن وہ تو اب اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ بھارت کے خلاف دفاعی جنگ بھی
جائے۔ سب معاملات بھارت کی مرضی کے مطابق طے کر کے ہم بھارت کے چھوٹے بھائی بن جائیں یعنی وہ
نظیر کا ہم خیال ہے۔ کسی زمانے میں نور خان جو بہادر آدمی تھا' مادیت میں گھس کر اپنا ایمان بھی گنوا بیٹھا ہے
بہرحال جو بڑے لوگ اس وقت ''خاموش'' رہے وہ تو نااہل تھے یا ان میں کردار کی کمی تھی۔

2- نااہل جرنیل اور کمزور فوجی حکمتِ عملی

ایک فرانسیسی جنرل نے کہا تھا کہ پاکستان کے پاس کیپٹن تو بہت اچھے ہوتے ہیں لیکن کوئی اچھا ج
نہیں ہوتا۔ یعنی اس اوپر والی سطح کے یہ لوگ اہل نہیں ہوتے یعنی ایک بہادر کیپٹن یا میجر جب اوپر جاتا
''جنرل نیازی'' بن جاتا ہے۔ کہ اوپر جانے کیلئے کردار کی کمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یا اوپر جا کر آدمی بے کرد
جاتا ہے اور ''نور خان'' بن جاتا ہے لیکن اس سلسلہ میں کردار کی کمی والا پہلو زیادہ عیاں ہے کہ یہی عزیز احمد ا
خان کے مارشل لاء کے وقت ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھا اور دسمبر 1958ء میں پشاور میں ہم افسروں کو خ

کرتے سیاستدانوں کی خوب گت بنائی اور ان کی بددیانتیوں اور لوٹ مار کا ذکر کیا۔ تو اس عاجز نے اس سے سوال پوچھا ''کہ ایسا کچھ کردار کی کمی سے ہوا ہے' حکومت' قوم میں قومی کردار پیدا کرنے کے سلسلہ میں کیا تجاویز بنا رہی ہے؟ ''تو عزیز احمد نے ایک ادبی تقریر جھاڑ دی کہ ''کردار'' ایک ''ذو معنی'' لفظ ہے اور اچھا کردار' ہر معاشرے اور ہر ضرورت کیلئے الگ الگ ''کیفیات'' کا حامل ہے' مصلحت میں جھوٹ بھی بولنے پڑتے ہیں وغیرہ اور انگریزی کی سب تلمیحات کی مجھ پر ''بوچھاڑ'' کر دی کہ لوگ میری طرف دیکھ رہے تھے کہ میں خوب ''نکو'' بنایا جا رہا ہوں۔ تو میں نے مجبوراً اٹھ کر یہ کہہ دیا'' کہ عزیز احمد خان صاحب اگر پاکستان کو آپ جیسی سوچ والے رہنماؤں نے چلانا ہے تو اس کا خدا حافظ ہے'' اور میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میرے عظیم رفیق اور ہمارے ڈویژن کمانڈر جنرل فضل مقیم اب مرحوم و مغفور نے ہاتھ سے اشارہ کیا'' کہ مہمان ہے اس کے ساتھ وہ نہ کرو جو تم اوروں کے ساتھ کرتے ہو''۔

قارئین! یہ بے کرداری ہمیں لے ڈوبی ہے میں تو اب رب کی ذات پاک سے اس سلسلہ میں دعا کرتا ہوں اور میری ہر کتاب کے آخری صفحہ پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے کہ ''رب نبی محمد ﷺ! تو مقلب القلوب ہے۔ ہمارے دلوں کو پھیر دے کہ ہمیں عزت و تکریم کی زندگی عطا فرما'' تو منظر تبدیل کرتے ہیں کہ بھٹو اور اس کے حواری اب ایوب خان کو ''فاتح کشمیر'' بنانے کیلئے 1964ء سے بہت ''مستعد'' ہو رہے تھے کہ میری آنکھوں کے سامنے مری میں میجر جنرل اختر ملک ایوب خان کے سامنے کشمیر کو گوریلوں کی مدد سے فتح کرنے کی تجویز پیش کرتا ہے اور میں حیران ہوتا ہوں کہ 1955ء میں ایسی ہی تجویز جب زبانی طور کرنل شیر محمد نے ایوب خان کے (سامنے پیش کی، جب وہ راولاکوٹ کے سیکٹر کمانڈر تھے اور اختر ملک سے سینئر تھے اور 48-1947ء کے کشمیر کے جہاد میں اہم کام کیا تھا) تو ایوب خان کا ردعمل تھا'' کہ ہم بھارت کو ناراض نہیں کر سکتے۔'' بہرحال اختر ملک' ایم ایم احمد اور ذوالفقار بھٹو کھلے طور پر راولپنڈی میں 1964ء میں ایک مسٹر سبحان کے گھر ملنا شروع ہو گئے تو ملک یارن خان وغیرہ خفیہ والوں نے ایوانِ صدر میں اس کی رپورٹیں بھی پہنچائیں یا جنرل محمد موسیٰ کو ایسی رپورٹی ملیں تو سب کو ''خاموش'' کر دیا گیا کہ ایسا کچھ ایوب خان کی ''اجازت'' سے ہو رہا ہے لیکن مجھے اپنے ذرائع سے جو خبریں مل رہی تھیں سارا کام بڑے غلط طریقے سے ہو رہا تھا کہ فائر بندی سے چھوٹے چھوٹے دستے مقبوضہ کشمیر میں جا کر بھارتی پوسٹوں پر حملے کر کے ان کو ''چوکنا'' کر رہے تھے اور اس کو گوریلا جنگ کی بنیاد کہنا بالکل غلط تھا لیکن فوج میں بھٹو اور اختر ملک کی لابی کو ''جنم'' دیا جا رہا تھا تو یحییٰ خان' یا سرفراز وغیرہ جو اختر سے سینئر تھے۔ انہوں نے بھی اپنی ''لابیاں'' بنانا شروع کر دیں کہ جنرل محمد موسیٰ کے بعد کمانڈر انچیف کون بنے گا اور 1965ء کے شروع میں جب ہماری پلٹن لاہور جانے لگی تو اختر ایوب نے میرے ساتھ اس سلسلہ میں مشورہ بھی کیا جو بہت لمبی کہانی ہے لیکن میں نے اختر کو صاف کہا کہ تمہارے ''خان جی'' کے ساتھ بے وفائی یحییٰ خان' بھٹو اور قادیانی کریں گے۔ ایوب کے بیٹے اپنے والد کو ''خان جی'' کہتے تھے۔

بہرحال یہ عاجز تو مارچ اپریل 1965ء میں ایوانِ صدر والوں کو خدا حافظ کہتے ہوئے اپنی پلٹن کی ایڈوانس پارٹی لے کر لاہور پہنچ گیا کہ رن آف کچھ کا جھگڑا شروع ہو گیا یا یہ ''ڈرامہ'' رچایا گیا کہ بھارت والوں کو وہاں کافی ہزیمت اٹھانا پڑی اور اپنی افواج نے بھی سرحدوں پر دفاعی پوزیشن اختیار کر لی کہ بھارت والے رن

آف کچھ کی اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کیلئے کسی اور جگہ کچھ کامیاب کارروائی نہ کریں یا پوری جنگ بھی ہو سکتی تھی۔ ا
لئے مئی میں جب ہماری پلٹن لاہور پہنچی تو لاہور شہر کے اندر بڑوڈ بارکوں میں صرف اپنا بھاری سامان رکھ کر محاذ
اپنے ذمہ داری کے علاقے میں چلی گئی جو شاہدرہ سے آگے ضلع شیخوپورہ میں راوی سائفن کے شروع ہونے و
جگہ سے لے کر مقبول پورہ اور کالا خطائی وغیرہ تک تھا۔

اس زمانے تک کے فوجی قانون اور ضرورت کے تحت ہم جیسے جونیئر میجر کے عہدہ کے افسران کو دفا
تجویز کی کوئی پوری صورت حال تو نہ بتائی جاتی تھی اور کرنل سے اوپر والوں کو بھی کچھ اپنی ذمہ داری کا علاقہ ب
جاتا تھا اور لڑنے کی تجویز کہ حالات کیسے پیش رفت کریں گے اور ہمارے کیا کیا ردعمل ہیں ان کو تو بہت پوشیدہ ر
جاتا تھا اور فوجوں کے محاذ پر پوزیشن میں ہو جانے کے باوجود ہمیں تو کوئی بات نہ بتائی جاتی تھی۔ جن پر سکیور
کے مدنظر ہمیں اس پر اعتراض کا کوئی حق نہ تھا لیکن مجھ جیسے پرانے افسران جنہوں نے دوسری جنگ عظیم میں خو
حصہ لیا تھا ان پر جلدی واضح ہو گیا کہ اس چھپاؤ میں اوپر والوں کی ''نااہلی'' زیادہ اثر انداز ہو رہی تھی کہ اوپر وا
نہ چاہتے تھے کہ ان کی ''کمزوریاں'' ان کے ماتحتوں پر ظاہر ہوں۔ لاہور کے ہمارے ڈویژن کمانڈر اور ان ک
سٹاف نے کبھی زمین پر اپنی تجاویز کو ''پرکھا'' ہی نہ تھا اور دفتر میں بیٹھ کر نقشوں پر گزارا کرتے تھے۔ راقم کا جب ا
کے ساتھ زمین پر واسطہ پڑا تو مجھے اکثر اوپر والے ''بدھو'' نظر آئے کہ ریت کی دیوار پر ان لوگوں نے اپنی شخصیت
کے گرد جو ''قلعے'' تعمیر کئے ہوئے تھے بعد میں ستمبر 65ء کی جنگ نے ان میں سے اکثر کی شخصیتوں کو پاش پاش ک
دیا اور جو بچ گئے ان میں سے اکثر ''حادثتاً'' بچے کہ امتحان سے بچ گئے۔ اوپر والوں میں مخلص چند ہی نکلے کہ ب
صحیح طور پر مشہور ہو گیا کہ ستمبر 65ء کی جنگ میجروں اور جونیئر افسروں نے لڑی اور اس عاجز نے مئی 65ء س
اوپر والوں کو کھری کھری سنانا شروع کر دی تھیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس عاجز کو چھ سات افسروں کو چھوڑ کر ایک
سینئر افسر نظر نہ آیا۔ جس کی سوچ میجر یا کرنل کے عہدے کی سطح سے اوپر ہو۔ کتنی بدقسمتی ہے کہ کے ایم عارف ا
وحید کاکڑ جیسے لوگ جنرل بن گئے اور ہماری فوج کے سربراہ رہے۔

اس صورتحال میں ایوب خان، محمد موسیٰ یا ان کے سٹاف افسران اور خاص کر ڈائریکٹر ملٹری اپریش
بریگیڈیئر (بعد میں جنرل) گل حسن برابر کے حصہ دار تھے کہ لڑائی کی کچھ تجاویز ہمارے سامنے آ گئیں کہ آزاد کشم
کی سیز فائر لائن پر ہماری نفری بہت کم تھی اور دفاع بڑا ''Thin'' یعنی پتلا یا کمزور تھا۔ وہاں پر کم از کم ایک ڈویژ
کے برابر یعنی نو پیدل پلٹنوں کی اور ضرورت تھی جو ریزرو میں ہوتیں اور ضرورت کے مطابق خطرے والی جگہوں
پہنچتی یعنی اتنی نفری کو ''متحرک دفاع'' میں رکھنے کی ضرورت تھی جو طریقہ جنگ ہمارے آقا رسول پاک ﷺ نے
اپنایا تھا کہ اس قسم کے طرز جنگ کی طرح ڈالی جس کو انیسویں صدی میں جرمنی کے فریڈرک اعظم نے بین الاقوا
دنیا میں ''روشناس'' کرایا۔

سیالکوٹ کے سینکڑوں میل کے لمبے چوڑے علاقہ کے دفاع کیلئے صرف ایک ڈویژن فوج تھی، اچھ
بات صرف یہ تھی کہ دوسری دفاعی لائن میں چھٹا بکتر بند ڈویژن جو ایک برگیڈ کے برابر تھا جس نے ''متحرک ط
دفاع'' کو اپنانا تھا اور اسی وجہ سے ستمبر 65ء کی جنگ میں ہم بچ گئے لیکن سیالکوٹ کی پہلی دفاعی لائن کیلئے ایک

ڈویژن کی بجائے کم از کم دو پیدل ڈویژنوں کی ضرورت تھی کہ اگر سب کیلئے تو پخانہ نہ بھی ہوتا تو زمینی دفاع کیلئے ایک ڈویژن کی نفری ناکافی تھی اور افسوس کہ ''متحرک دفاع'' کو کبھی نہ سمجھا گیا۔

لاہور کا دفاع ایک ڈویژن کر رہا تھا اور بی آر بی کی زمینی مدد کی وجہ سے وہ ڈویژن دفاع کے کام کیلئے کافی تھا لیکن تجویز بڑی غلط تھی کہ دشمن پر جوابی حملہ' بی آر بی کے دشمن کے پار کرنے کے بعد کریں گے بدقسمتی سے لاہور کے بڑے افسروں نے زمین تو دیکھی نہ تھی۔ وہ راوی والے سائفن اور برکی محاذ کے ہڈیارہ اکاڈٹ دونوں کو ''سائفن'' کہتے تھے۔ سائفن کا پانی زمین دوز ہوتا ہے۔ اکاڈٹ کا پانی اونچائی کر کے اوپر Acquidite سے گزارا جاتا ہے کہ ان کے لئے دونوں کی زمینی ''اہمیّت'' کا انہوں نے کبھی پورا تجزیہ بھی نہ کیا تھا اور نہ بی آر بی کے ان حصوں کی زمینی اہمیّت کے بارے کچھ تفصیلات تھیں۔ جہاں سے دشمن بی آر بی کو پار کر ہی نہ سکتا تھا کہ راوی سائفن پر قبضہ کرنے کیلئے دشمن کو کم از کم دو بریگیڈوں کی ضرورت تھی' وغیرہ کہ وہاں قبضہ کرے اور پھر قبضہ کو قائم بھی رکھے۔

قصور کے محاذ کا دفاع ادھر ادھر سے فوج اکٹھی کر کے ایک نئے ڈویژن کی ذمہ داری تھی جو کسی طرح مکمل ڈویژن نہ تھا لیکن صرف دفاع کیلئے اس کے پاس نفری کافی تھی کہ اس علاقہ میں اس ڈویژن کی ''آڑ'' میں ہمارے ''جارحانہ دستے'' یعنی ایک بکتر بند ڈویژن اور ایک پیدل ڈویژن موجود تھے۔ جنہوں نے وہاں سے جارحانہ عمل شروع کرنا تھا لیکن پہلا نالہ روہی جو انہوں نے عبور کر کے آگے بڑھنا تھا۔ اس پر صرف ایک پل تھا کسی نے یہ نہ سوچا کہ اگر یہ پل ختم ہو جائے گا تو اس کو مرمت کرنے یا دوسرا پل بنانے میں کتنی دیر لگے گی اور جنگ میں ایسے ہی ہوا کہ پیش قدمی رک گئی۔ علاوہ ازیں ان دونوں ڈویژن کمانڈروں کے اوپر میدان جنگ میں ان پر کوئی بڑا افسر یا کور کمانڈر نہ تھا۔ اس لئے اس محاذ پر ہماری جارحانہ کارروائی بُری طرح ناکام رہی۔

انہی ڈویژنوں کی کارروائی سے ہم نے مشرقی پاکستان کے دفاع کو مغربی پاکستان سے طاقت دینا تھی۔

یحیٰی خان جو سیالکوٹ میں تھا اس کو وہاں سے یہاں آ کر پیدل ڈویژن کی کمانڈ دی گئی جس کے کئی مقاصد تھے کہ سیالکوٹ میں دفاع کے کمزور ہونے کی وجہ سے یحیٰی خان کی شخصیت پر اثر نہ ہو اور سیالکوٹ میں ایک ناتجربہ کار افسر بریگیڈیئر اسماعیل کو کمانڈ دی جو بدنام ہوا اور ستمبر 65ء کی جنگ میں اس کی جگہ وہاں میجر جنرل ٹکا خان کو بھیجنا پڑا۔ بہرحال ہماری سوچ کے مطابق یہاں قصور محاذ پر بکتر بند دستوں کے ساتھ کم از کم دو پیدل ڈویژنوں کا ہونا ضروری تھا اور اگر مکمل طور پر ساتھ توپخانہ نہ بھی ہوتا تو خالی پیدل دستے ہونا ضروری تھے۔

پاکستان کے دفاع کے لئے ہمیں مزید تین ڈویژنوں کی ضرورت تھی کہ اگر بڑے ہتھیاروں کے ساتھ پورے ڈویژن نہ بھی ہوتے تو 27 پلٹنیں اپنے پاس ہونا ضروری تھیں کہ بعد میں ستمبر' اکتوبر 1965ء میں جو 50 نئی پلٹنیں کھڑی کیں' ان میں سے آدھی اگر اگست 1965ء میں کھڑی کر دی جاتیں تو آگے ہم ثابت کریں گے کہ دہلی ہمارے قدموں کے نیچے تھی۔ بہرحال جولائی 1965ء میں رن آف کچھ کا سمجھوتہ ہو گیا کہ معاملات بین الاقوامی ثالثی کے سپرد ہو گئے جن کا فیصلہ بھارت اور پاکستان نے قبول کرنا تھا' تو فوجیں واپس بارکوں میں آ گئیں۔ تمام مورچے بند کر دیئے۔ تمام تاریں اور دفاعی مائینز ختم کر دی گئیں اور فوج کے چوتھائی حصّہ کو چھٹی پر بھیج دیا گیا اور

مشہور کر دیا گیا کہ لال بہادر شاستری پاکستان کے ساتھ لڑنے کو تیار نہیں۔

تو اگست 1965ء کے پہلے ہفتہ میں اختر ملک نے سیز فائر سے جوانوں کو اٹھا کر کے اور کچھ کمانڈو نفری کو مقبوضہ کشمیر میں گوریلا بنا کر ''لانچ'' کر دیا۔ جس بھونڈے طریقے سے یہ کام کیا گیا لوگ بریگیڈئر گلزار احمد مرحوم کے بیٹے بریگیڈئر فاروق احمد مرحوم کی کتاب پڑھیں' جس نے سب لوگوں کے مقابلہ میں بہتر کام کیا اور سب سے زیادہ عرصہ سری نگر کے گرد بھارتیوں کا ناک میں دم کرتا رہا کہ وہ اس وقت میجر تھا اور اس کو ستارہ جرات سے بھی نواز دیا گیا اور اس کی کتاب کسی غلطیوں کے معذرت والے یا مایوس آدمی کی کتاب نہیں۔ اس نے وہ حالات اور تجاویز واضح کیے ہیں کہ سب کچھ کس بھونڈے طریقے سے کیا گیا۔

لیکن ادھر قوم اور ساری فوج کو خوب بے وقوف بنایا گیا کہ اختر ملک نے کمال کر دیا ہے۔ کشمیر کے مسئلہ کو زندہ کر دیا ہے۔ ذوالفقار بھٹو' بین الاقوامی طور پر کشمیر کے معاملہ کو زندہ کر دے گا جس طرح رن آف کچھ کی ہزیمت کے بعد بھارت خاموش ہو گیا ہے۔ اب بھی بھارت ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ معاملات آگے بڑھیں گے۔ ہم مزید گوریلے بھیجیں گے اور بھارت کو مجبوراً بین الاقوامی ثالثی قبول کرنا پڑے گی' لیکن خبردار جو ہماری فوجیں' آگے محاذ کی طرف کوئی حرکت کریں ورنہ دنیا کہے گی کہ پاکستان ''حفاظتی اقدام'' کر کے ہی کارروائی کر رہا ہے۔

3۔ جو کہتا بھارت خاموش نہیں بیٹھے گا بھٹو لابی اُسکے پیچھے پڑجاتی

راقم کو اپنی سوچ بیان کرتے خودنمائی کا ڈر لگتا ہے لیکن اس عاجز نے فوجوں کے محاذ پر ہونے کے زمانے میں عجیب وغریب کچھ سچے خواب دیکھے تھے؟ جو ہو بہو ستمبر 65ء کی جنگ میں دشمن کے ساتھ ''ہاتھا پائی'' کی لڑائی کے نظاروں تک سب بعد میں سچے ثابت ہوئے تھے۔ اس لئے میں اپنے رفقاء کو کہتا تھا کہ رن آف کچھ کا سمجھوتہ نہ ہو گا۔ ہماری بھارت کے ساتھ لڑائی ہو گی اور بڑی سخت اور گھمسان کی جنگ ہو گی اور کچھ خوابوں کا ذکر بھی کر دیتا تھا اب جو ہم لوگ بارکوں میں واپس آ گئے تو میرے رفقا خاص کر میجر (بعد میں جنرل) غلام حسن مرحوم یا کیپٹن (بعد میں جنرل) محمد صفدر سابق گورنر پنجاب وغیرہ میرا مذاق تو اڑا لیتے تھے لیکن جب کشمیر میں کارروائی شروع ہوئی تو وہ مکمل طور پر میرے ہم خیال ہو گئے کہ لڑائی آنے والی ہے۔ بھارت خاموش نہ رہ سکے گا۔

حکومت ایسی کارروائی تو کر سکتی تھی کہ کشمیر کا مسئلہ زندہ ہو اور اپنے آدمیوں کو گوریلوں کا نام دینا یا جو کچھ کرنا یہ بھارت کے ساتھ چھیڑ خانی ضرور تھی لیکن ہمیں جنگ کی مکمل تیاری کرنا چاہیئے تھی اور یہ تھا مجھے اپنی حکومت کے ساتھ اختلاف اور بھارت خاموش نہ رہ سکا کہ وہ ''چھپے ہاتھ'' جو پاکستان اور بھارت دونوں کو اس جنگ میں دھکا دے رہے تھے انہوں نے شاستری کو بھی بڑی مشکل کے ساتھ اس جنگ میں ''دھکا'' دیا، جس کی ضرورت یہ تھی کہ شاستری کو دکھایا جائے کہ پاکستانی فوجیں محاذ پر نہیں ہیں اور لاہور بھارت کو ''پلیٹ'' پر مل جائے گا اور ادھر لاہور میں جنرل سرفراز کو بدنام کرانا تھا کہ ایوب خان اس کو کمانڈر انچیف نہ بنا دے اور سرفراز ایوب خان کے ساتھ وہ کچھ کبھی نہ کرتا جو یحییٰ خان نے کیا۔ میں نے ذاتی طور پر سرفراز کو کبھی پسند نہ کیا اور میرے لحاظ سے اس کی کوتاہیاں بھی بے حساب ہیں لیکن ایوب کے ساتھ اس کی وفاداری اس کی گھٹی میں تھی۔ اور یہ کچھ میں اختر ایوب کو بہت پہلے بتا چکا تھا اور ایوب نے سرفراز کے حق میں فیصلہ کر بھی دیا تھا لیکن سازش بہت گہری تھی اور اس سلسلہ

میں جنرل محمد موسیٰ اور شاہ ایران وغیرہ سمیت بھٹو وغیرہ یحییٰ خان کی ''لابی'' میں شامل تھے اور یہ لابی بہت وسیع تھی اور کمزور لوگوں کیلئے یا ابن الوقت اور بے کردار لوگوں کیلئے یحییٰ خان اور اختر ملک دونوں ایک ''چھتری'' کا کام کرتے تھے۔

اس لئے معاملہ کو آگے چلانے کیلئے ضرورت ہے کہ ہم سوچیں کہ بھارت کیسے خاموش رہتا۔ اس نے کہا کہ یہ گوریلا پاکستانی فوجی ہیں اور سیز فائر لائن سے اٹھ کر بھارت میں ''گھس'' گئے ہیں۔ ہم لوگ ان کی ان جگہوں پر حملہ کریں گے جہاں سے یہ آئے ہیں اور بھارتیوں نے وہاں حملے شروع کر دیئے جو اہم علاقے اور زمینیں تھیں اور بھارت والوں کو کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ تو ہماری فوجی کمانڈ نے پاکستان کی بین الاقوامی سرحد پر دفاعی نظام کو اور پتلا کرنا شروع کر دیا۔ کہ کچھ پیدل دستے آزاد کشمیر کی سیز فائر لائن کی دفاع کیلئے بھیجنے پڑ گئے۔ لیکن ایسا کہاں کہاں روکتے اور خیر اس سلسلہ میں اختر ملک نے تجویز بنائی ہوئی تھی اور ایک بریگیڈ سے بھارت کے مقبوضہ کشمیر کے علاقے چھمب جوڑیاں پر حملہ کرنا تھا کہ بھارت کی توجہ دوسری طرف تبدیل کی جائے۔ بریگیڈیئر گل حسن اپنی کتاب میں اس سلسلہ میں اپنا دفاع کرتا ہے کہ اختر ملک نے ایک بریگیڈ مزید فوج بھی مانگی ہوئی تھی اور کچھ بکتر بند دستے بھی اور میں ایسی مدد دینے کو تیار نہ تھا۔ لیکن جنرل ملک شیر بہادر نے ''ہاں'' کر دی تو اس کو بھی ''خاموش'' ہونا پڑا اور تمام کارروائیوں کے سلسلہ میں بریگیڈئر گل حسن ایسی ہی ''مجبوریوں'' اور ''خاموشیوں'' سے اپنا دفاع کرتا ہے۔

گل حسن میرے پرانے دوست اور مہربان تھے کہ ہم دونوں نے دوسری جنگ عظیم میں انگریز جنرل بعد میں فیلڈ مارشل ولیم سلم کے ہیڈ کوارٹر میں کام کیا تھا۔ جنگ کے بعد ان کو اکثر ان کے منہ پر کہا کرتا تھا کہ ساری کارروائی ہی غلط تھی۔ تم اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ مشرقی پاکستان کو ''لات'' مارنے والوں میں گل حسن بھی شامل تھا۔ اور ''بادشاہ گر'' کے طور پر بھٹو کو تخت دلانے والوں میں وہ بھی شامل تھا۔ لیکن بھٹو نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا یا ایئر مارشل رحیم کے ساتھ کیا یا جو طریقہ استعمال کیا اور جس بے عزتی سے ان کو فوج سے نکالا تو مجھ پر بالکل واضح ہو گیا کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے۔ جو کوئی پاکستان کے خلاف جو کچھ کرتا ہے اس کو اس کی سزا بھی ملتی ہے۔ گل حسن کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے بعد اس نے مجھے بلا کر میرے ساتھ کچھ مشورے کئے اور اس نے اس پر عمل کیا تو اس نے کچھ وقت اچھا گزار لیا۔ لیکن میری یہ بات اس نے نہ مانی کہ وہ اپنی غلطیاں بھی تسلیم کر کے توبہ و ندامت کرے اور اپنے دفاع میں کتاب لکھ کر اپنا وقت اسی طرح ضائع نہ کرے جس طرح امیر عبداللہ نیازی نے اپنے دفاع میں کتاب لکھ کر اپنا اور قوم کا وقت ضائع کیا ہے۔ گل حسن نے نیازی کے برخلاف بھی بہت کچھ لکھا۔ جو تجزیے صحیح نہیں۔ نیازی البتہ دوسروں کو ''ہدف'' نہیں بناتا۔ ویسے الزام لگاتا ہے کہ ہمارے ساتھ وعدے پورے نہ کئے گئے۔ بہرحال ان جرنیلوں کی یہ کتابیں اُلٹا ان کی کوتاہیوں کے ثبوت میں جاتی ہیں۔ لیکن ہماری قوم مومن کی فراست سے خالی ہے۔ حقائق کو صحیح طور پر سمجھ ہی نہیں پاتی۔

جنرل اختر ملک نے بکتر بند دستوں کو پوری کور کے توپخانے اور دو بریگیڈ فوج کے ساتھ چھمب جوڑیاں پر حملہ کر دیا۔ اور شروع میں حیران کن کارروائی ہونے کی وجہ سے بڑی کامیابی ہوئی۔ یہ فالتو بریگیڈ یحییٰ خان کے

ڈویژن سے ادھار مانگا گیا تھا اور قصور محاذ پر پیدل فوج میں اور کمی ہو گئی۔ اب یحییٰ خان کی ''لابی'' اختر ملک میں یحییٰ خان کیلئے بری فوج کی سربراہی میں ایک اور ''رقیب'' کو پیدا ہوتے کیسے برداشت کرتی۔ انہوں نے'' پانچوں سواروں'' میں شمولیت کیلئے یحییٰ خان کیلئے یہ بندوبست کرایا کہ وہ اپنے دوسرے برگیڈ اور ہیڈ کوارٹر کے ساتھ جلد چھمب جوڑیاں کے علاقے میں پہنچ کر اس علاقے کی کمانڈ اختر ملک سے لے لے۔ اس کیلئے ٹرانسپورٹ لاہور والے ڈویژن سے ادھار مانگ لے کہ لاہور میں ہمارے پاس محاذ پر جانے کیلئے ٹرانسپورٹ بہت کم ہو گئی۔ یہی نہیں بلکہ 5 ستمبر کو جنرل عبدالحمید کو حکم ملا کہ صاحب داد کے برگیڈ کو محاذ سے ہٹا کر یحییٰ خان کی مدد کیلئے بھیج دے یعنی ہماری اعلیٰ فوجی کمانڈ چھمب جوڑیاں، اکھنور، جموں، پٹھانکوٹ والے راستے ''دہلی کی فتح'' کیلئے پیش قدمی کر رہے ہیں۔ اور یہ خیال نہیں آیا کہ سیالکوٹ محاذ کی مدد کیلئے توپخانہ اور بکتر بند دستے ان سے لے چکے ہیں۔ وہاں دشمن حملہ کرے گا تو کیا ہوگا۔ لاہور محاذ کی ٹرانسپورٹ لے چکے ہیں۔ اور وہ لوگ لاہور چھاؤنی یا شہر میں بیٹھے ہیں۔ اگر دشمن کے حملہ کا خطرہ ہوا تو وہ لوگ آگے محاذ پر کس ٹرانسپورٹ سے جائیں گے؟ قصور محاذ کے دفاع کیلئے فوج آدھی رہ گئی ہے۔ ہمارے جارحانہ دستے بکتر بند ڈویژن جس کو کم از کم دو پیدل ڈویژن فوج چاہئے تھی اس کے پاس صرف ایک برگیڈ پیدل فوج باقی رہ گئی ہے۔ قارئین اپنا سر پیٹنا پڑتا ہے۔ سویلین صاحبان بھی یہ اندازہ لگا سکیں گے کہ سالوں کی بنائی تجویز کی ایک دن میں عملی طور پر ایسی تیسی کر دی کہ گذارش ہو چکی ہے کہ ہماری فوج میں مجھے تو کرنل کی سوچ سے اوپر سوچ کے چند آدمی ہی نظر آئے۔

جب بھارت نے اگست کے درمیان سیز فائر پر ہمارے اہم مقامات پر حملے شروع کر دیئے تو اس عاجز نے چیخ پکار شروع کر دی کہ خدارا فوج کو محاذ پر لے جاؤ کہ بھارت کچھ ڈرے اور آزاد کشمیر کی طرف جارحانہ کارروائیاں ختم کرے۔ کچھ لوگوں نے میرے ساتھ اتفاق کیا لیکن بڑوں کے ذہن پر بھٹو اور عزیز احمد ''سوار ہو چکے تھے۔ انہوں نے ہمیں خاموش کر دیا کہ ایسا کر کے ہم ان کی خارجہ اور بین الاقوامی کوششوں پر پانی پھیر دیں گے۔ میرے اس شور کی وجہ تھی کہ بھٹو لابی مجھے لاہور سے دور کرنا چاہتی تھی یا قدرت کا کوئی راز تھا کہ اگست کے تیسرے ہفتے میں میرے لئے لاہور سے مردان کے تبدیلی کے احکام آ گئے۔ اس میں قدرت نے یہ فائدہ کیا کہ مقبول پورہ اور کالا خطائی وغیرہ کے علاقوں میں اس عاجز نے جو سویلین مجاہدین تیار کئے ہوئے تھے کہ لڑائی میں فوج کی مدد کریں گے، مجھے ان کی کمانڈ کیپٹن ظہور رانا کے سپرد کرنے کیلئے بھیج دیا گیا کہ میں مردان جانے کیلئے ''فارغ'' ہو جاؤں۔ ان مجاہدین کو ستمبر 65ء کی جنگ میں کیپٹن رانا نے فوج کے مدد کیلئے تیار ضرور کیا لیکن وہاں گولی تک نہ چلی اور جب 5 ستمبر کو ہم محاذ پر جا رہے تھے تو ہمارے کرنل گول والا نے مجھے میجر غلام حسن اور کیپٹن محمد صفدر کے ساتھ ادھر نہ جانے دیا کہ وہ کام کیپٹن رانا کرے گا۔ گول والا کو میری ضرورت ہے کہ وہ نیا آدمی ہے اور پلٹن کے لوگوں کو نہیں جانتا۔ تو اس طرح فطرت نے عاجز کو لاہور جنگ میں مرکزی کردار دے دیا۔

کہ میں نے جی ایچ کیو راولپنڈی کو درخواست دے دی تھی کہ مجھے لاہور سے پوسٹ نہ کیا جائے۔ میں نے اپنے بیٹے کو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخل کرانا ہے اور مجھے جنگ نظر آ رہی ہے اور میں اس جنگ کو ان جوانوں کی ہمراہی میں لڑنا چاہوں گا جن کی پچھلے پانچ سالوں سے کمانڈ کر رہا ہوں۔ لیکن بھٹو لابی نے میر برگیڈیر

آفتاب کے کان بھرے کہ یہ آدمی اپنے آپ کو 'پاکستان کے بانیوں' میں شمار کرتا ہے اور بڑا ''رہنما'' بنا پھرتا ہے کہ اگست کے آخری ہفتہ میں میرا بریگیڈ کمانڈر میرے ساتھ بڑے طنزیہ طور پر مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''امیر افضل تم ہمیں اندھا سمجھتے ہو کہ ہمیں جنگ نظر نہیں آ رہی اور تم بڑی بصیرت والے ہو اور آنے والے حالات کو جانتے ہو'' تو اس عاجز نے گزارش کی کہ ''جناب میری عمر دیکھ کر میرے ساتھ بات کریں۔ مجھے عام میجر نہ سمجھو یہ کوئی فطرت کا راز ہے کہ میں میجری کا عہدہ لئے پھرتا ہوں ورنہ جب مجھے کمیشن کیلئے بھیجا گیا تھا تو آپ نے اس زمانے تک فوج میں آنے کے بارے بھی شاید نہ سوچا ہو گا'' یعنی ابھی مکتب میں تھے''۔ بہرحال کافی تلخ باتیں ہوئیں اور میں نے بریگیڈ کمانڈر کو صاف کہہ دیا کہ تم میری درخواست پہ جو چاہو ریمارکس لکھو۔ اگر ملٹری سیکرٹری نے بھی میری درخواست رد کر دی تو میں ملک کے صدر کو اپیل کروں گا۔ میں آسانی سے لاہور کو نہ چھوڑوں گا۔

اب اندازہ لگائیں کہ اول تو یکم ستمبر کو چھمب جوڑیاں کے حملے سے پہلے لاہور کے محاذ پر فوجوں کو بھیج دینا ضروری تھا۔ لیکن اس حملے اور بریگیڈروں اور ڈویژنوں کی لڑائی کے بعد جہاں دونوں اطراف سے لڑاکا فضائی افواج بھی اس لڑائی میں شامل ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد لاہور کے محاذ کو خالی رکھنے کو ''نااہلی'' کہیں' یا کم عقلی کہیں میں سخت الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ جنرل محمد موسیٰ تو یہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خبروں میں سنا کہ بھارتی وزیراعظم کہہ رہا ہے کہ ہم کوئی اور محاذ کھول دیں گے۔ تو میں نے جی ایچ کیو سے سگنل دلوا دیا کہ چوکنے ہو جاؤ۔ یہ لاہور کے ڈویژن کمانڈر کا کام تھا کہ اپنی سوچ اور حالات کے مطابق کارروائی کرتا۔ گل حسن اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ جنرل موسیٰ نے یہ حکم کسی ڈیوٹی افسر کو دیا اس نے خانہ پری کی اور تفصیل نہ لکھی۔ لاہور والے پوری حقیقت کو نہ سمجھے۔ اول تو جنرل موسیٰ کا بیان بڑا بودا ہے کہ کیا ایسی اہم کارروائیاں' دشمن کے ریڈیو کی خبریں سن کر کی جاتی ہیں۔ فوج نے اتنے خفیہ والے ''پال'' رکھے تھے۔ ان کے ساتھ مشورہ کر کے پوری ہدایات کیوں نہ دیں۔ گل حسن کی وضاحت ظاہر کرتی ہے کہ کمانڈ اور کوآرڈینیشن نہ ہونے کے برابر تھی۔

اس عاجز نے لاہور کے ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں بیٹھ کر جنگ کے بعد پوری **Inquiry** (چھان بین) نجی طور پر کی۔ سگنل لاہور پہنچا۔ آرڈیننس کے میجر ملک ڈیوٹی پر تھے' رات کے دس بجے تھے۔ اس نے سگنل کرنل سٹاف کرنل افضل کو بھیج دیا جس نے کسی کارروائی کے احکام نہ دیئے۔ میجر ملک حیران تھا۔ اس نے کرنل سٹاف کو فون کر دیا کہ جناب آپ پر شاید نیند کا غلبہ تھا۔ آپ بات کو نہ سمجھے۔ کرنل سٹاف پر بھٹو اور یحییٰ لابی کے اثرات تھے کہ وزیر خارجہ ایسا نہیں چاہتا اور یحییٰ لابی سرفراز کو بدنام کرنے کی سازش کر رہی تھی تو کرنل سٹاف نے میجر ملک کو ''خاموش'' کر دیا۔ میجر ملک پھر بھی ''خاموش'' نہ ہوا۔ دوسرے دن وہ جی ون کرنل افتخار بشیر کے پاس پہنچ گیا تو افتخار بشیر جنرل سرفراز کے پاس سگنل لے گیا۔ سرفراز نے حکم دیا کہ جی ایچ کیو میں گل حسن ملٹری آپریشن کے محکمہ کو فون کریں۔ وہاں فون کیا تو ڈیوٹی افسر نے جواب دیا: یہ سگنل جنرل موسیٰ کے حکم پر کسی ڈیوٹی افسر نے بھیجا ہے۔ تم ضرور چوکنے رہو لیکن ہمارا یہ حکم منسوخ نہیں کہ وزارت خارجہ والے کہتے ہیں کہ 6 ستمبر صبح سویرے سورج چڑھنے سے پہلے کوئی بڑی فوج آگے والے محاذ پر نہ ہو گی۔ ''بات ہی ختم ہو گئی'' یہ چھ ستمبر صبح سے پہلے تک لاہور محاذ کو خالی رکھنا ان چھپے ہاتھوں کی ''ضرورت'' تھی جو شاستری کو جنگ میں دھکا دے رہے تھے۔ لیکن شاستری ہچکچا رہا تھا۔

بہر حال 5 ستمبر کو صبح سویرے ہمارے کرنل گول والا اور باقی بڑے افسروں کو ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں بلایا گیا۔ یہ عاجز بھی ساتھ تھا۔ ہماری پلٹن کا پرانا ٹاسک ختم کر دیا گیا اور جہاں پوری پلٹن کام کر رہی تھی۔ وہاں صرف ایک کمپنی اور ہمارے میجر غلام حسن کو اس علاقے کی کمانڈ دی کہ باقی کام وہ مجاہدوں سے مل کر کریں گے۔ ہمیں حکم ملا کہ ایک کمپنی گیارھویں بلوچ کی دے دیں جو راوی سائفن کے علاقے میں متعین ہو گی۔ ایک کمپنی تیسری بلوچ کی دے دیں کہ وہ پدھری کے علاقے میں دونوں بریگیڈوں کے درمیانی علاقے میں ہو گی اور صرف ایک کمپنی اور ہیڈ کوارٹر کو کرنل گول والا اپنے پاس رکھیں جو بریگیڈ کی ریزرو بھی ہو گی اور بریگیڈ کی طرف سے جوابی حملہ کا کام بھی کرے گی۔ (اب قارئین پیدل دستوں کی کمی کا خود اندازہ لگائیں) پھر حکم ملا کہ 5 ستمبر شام سورج غروب ہونے کے بعد دیکھ بھال والے دستے محاذ پر جا سکتے ہیں لیکن زیادہ نفری چھ ستمبر سورج کے نکلنے یا روشنی کے بعد آگے محاذ پر جائے گی۔

احکام کی تبدیلی کو ہم چیلنج نہ کر سکتے تھے لیکن اس عاجز نے اوپر والوں کو کہا "کہ جناب فوج کی تاریخ میں یہ طریقہ بالکل نیا اور اپنی قسم کا آپ ہے کہ دیکھ بھال والے دستے رات کے اندھیرے میں اپنے علاقے میں پہنچیں تو ان کو آگے سے نظر کیا آئے گا اور بڑی نفری جس کو چھپ کر اندھیرے میں جانا چاہیئے کہ اس کے بارے کسی کو خبر نہ ہو۔ وہ ڈھول بجاتی دن کو اپنی پوزیشنوں میں پہنچے۔" میری بات سن کر سب حاضرین خوب ہنسے اور پھر ایک سناٹا چھا گیا تو کرنل افتخار بشیر نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلا کر الگ جگہ پر لے جا کر کہا "کہ امیر افضل تمہارے ساتھ نوکری کرنا مشکل ہے۔ بھارت سے کچھ غیر ملکی خاص کر امریکن مہمان آ رہے ہیں۔ وہ تقریباً 6/5 ستمبر رات آٹھ نو بجے آئیں گے۔ یہاں لاہور میں ایک بہت بڑی پارٹی ہو رہی ہے جس میں بڑے افسران اور وہ سب لوگ بھی جا رہے ہیں۔ ان غیر ملکیوں نے فوج کو دیکھ لیا تو ہمارا کشمیر کا یہ سارا مسئلہ غلط صورت اختیار کر لے گا۔" افتخار بشیر مجھ سے سینئر ضرور تھا لیکن عمر میں چھوٹا تھا اور میری بڑی عزت کرتا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا کہ فوج نے جب محاذ پر جانا ہی ہے تو غیروں کو چند گھنٹے پہلے جانے کی خبر ملے تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ پھر یہ "احتیاط" کرنا ہی ہے تو صرف شالا مار سے باٹا پور یا آگے چند میل علاقے کے لئے ایسے احکام دو۔ جنہوں نے برکی محاذ پر جانا ہے یا پدھری جانا ہے یا بھسانی پل کے علاقے میں جانا ہے یا راوی سائفن پر جانا ہے ان کو اس "بندش" کے تابع کیوں کرتے ہو۔ افتخار بشیر بات کو سمجھ گیا اور مجھے جنرل سرفراز کے پاس لے گیا کہ تمہارے یہ بھائی ملک صاحب یہ "اعتراض" کرتے ہیں۔

سرفراز نے حسب معمول وہی بات کی کہ جی ایچ کیو میں گل حسن کے محکمہ سے میرے سامنے بات کرو۔ وہاں فون کیا تو آگے کرنل اسلم بپی ڈیوٹی پر تھا جو میرے ساتھ سپاہی رہ چکا تھا تو اس کے ساتھ اس عاجز نے بات کی۔ "وہ کہنے لگا کہ ہم وزارت خارجہ سے پوچھے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ تمہاری بات اور مشورہ بڑا وزنی ہے۔ لیکن وزارت خارجہ والے اپنے احکام یا مشورہ میں تبدیلی نہ کریں گے۔" تو میں نے جنرل سرفراز کو عرض کی ہماری پلٹن کو آپ نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ آپ لوگوں نے جو ہمیں ٹرانسپورٹ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے اندرونی طور پر میجر صادق کے ذریعہ سے اطلاع ملی ہے کہ وہ ٹرانسپورٹ یہاں ہے ہی نہیں۔ چھمب جوڑیاں گئی ہوئی ہے۔

میں اپنے جوانوں کو اس طرح تو کل شام تک بھی محاذ پر نہ پہنچا سکوں گا تو جنرل سرفراز ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ میجر امیر افضل کو اپنی مرضی کرنے دو۔ باقیوں کو بھی شالامار باٹا پور کے بارے احکام دیں کہ رات کے بارہ بجے تک ادھر کوئی حرکت نہ کریں۔ باقی علاقوں میں اکا دکا لوگ آتے جاتے رہیں۔ اس عاجز نے پوری بات نہ صرف اپنے کرنل کو بتا دی بلکہ اور بھی جس کسی نے پوچھا کہ کیا ہوا تو میں نے پوری کہانی سب لوگوں کو بتا دی۔

ہم برڈووڈ لائنوں میں واپس پہنچے تو کرنل گول والا نے کیپٹن صفدر کی کمپنی میجر حسن کو دی۔ میجر مبارک کی اے کمپنی کو راوی سائفن کے لئے مقرر کیا۔ کیپٹن ظفر کی کمپنی کو پدھری میں مقرر کیا اور میجر نذیر گل کی بی کمپنی کو اپنے ساتھ رکھنے کے احکام دیئے اور سب کو کہا کہ باقی تفصیلی احکام اور ٹرانسپورٹ وغیرہ کے بارے میجر امیر افضل سب کو احکام دیں گے۔ میجر حسن نے کہا کہ امیر افضل مجاہدین کو جانتا ہے۔ یہ اب مردان نہیں جا رہا تو ان کے ساتھ چلے۔ گول والا نے کہا فی الحال اس کو امیر افضل کی ''ضرورت'' ہے۔ بعد میں تمہارا کام نہ چلا تو اس کو تمہاری طرف بھیج دیں گے۔ میں نے اپنے افسروں کے آگے پوری بات کر دی اور صاف بتایا کہ کسی زیادہ ٹرانسپورٹ کی امید نہ رکھو اور ہمیں اپنی چند گاڑیوں پر گزارا کرنا ہوگا۔

سب کو ان کے حصے کی ٹرانسپورٹ بانٹ دی اور کہا کہ اس ٹرانسپورٹ کی مدد سے دو گھنٹے بعد یعنی ایک بجے بعد دوپہر 5 ستمبر کو آگے اپنی اپنی ذمہ داری کے علاقے میں پہنچنا شروع کر دیں۔ میں ہیڈ کوارٹر والی کمپنی کو ساتھ لے آگے چل پڑوں گا۔ تمہیں اگر کوئی پوچھے کہ تم محاذ پر اتنا جلدی کیوں جا رہے ہو تو کہنا ہمارا فاصلہ دور تھا۔ علاقے مختلف تھے' اوپر سے اجازت لے لی ہے۔

4- اہلِ مغرب پاکستان، بھارت دونوں کو انگلیوں پر نچا رہے تھے

یہ عاجز اپنے گھر گیا جو پرانی انارکلی سے بھی آگے لاہور میوزیم کے پاس تھا۔ وہاں اردلی کو سامان تیار کرنے کیلئے کہا۔ وضو کیا اور داتا صاحب کے دربار پہنچا کہ رن آف کچھ کے جھگڑے کے وقت راستہ میں آتا تھا۔ لیکن اب رخ تبدیل ہو گیا تھا تو دربار پر پہنچ کر دو نفل ادا کئے۔ فاتحہ پڑھی کہ ایسے معلوم ہوا داتا صاحب سے آواز آ رہی ہے کہ جلدی کرو لوگوں کو ''محاذ پر لے جاؤ'' گھر آ کر جلدی سے ظہر کی نماز ادا کی۔ کچھ کھانے کے لئے لیا اور پھر برڈووڈ بیرک پہنچ گیا۔ وہاں احکام دہرائے اور تقریباً دن کو ڈیڑھ دو بجے محاذ کی طرف روانہ ہو گیا۔ حالانکہ میری پوزیشن بھیانی پل سے بھی بی آر بی سے بہت پیچھے تھی۔ لیکن اگر کسی نے پوچھا کہ اتنا جلدی کیوں جا رہے ہو تو ان کو کہا دن کے وقت محاذ پر اپنی منزل پر پہنچنا بہتر ہوتا ہے اور مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ بعد دوپہر تقریباً چار یا ساڑھے چار بجے گیارھویں بلوچ کا کرنل اقبال قریشی میرے پاس پہنچ گیا۔ کہنے لگا حیران ہوں کہ میری پلٹن بارکوں میں موجود نہیں۔ کوئی ذمہ دار آدمی نہ ملا کہ بتا سکے کہ احکام میں تبدیلی ہو گئی ہے؟ اور آپ یہاں اتنی جلدی کیسے پہنچ گئے؟ اس عاجز نے عرض کی۔ ''الحمد للہ جو غیبی طاقت آپ کی پلٹن کو بروقت محاذ پر پہنچا رہی ہے۔ وہ مجھے بھی یہاں لے آئی ہے''۔

لوگ بے صبر ہو رہے تھے۔ ہمیں محاذ پر آتے دیکھ کر اور دیکھا دیکھی سب آگے چل پڑے۔ بہرحال کرنل اقبال قریشی کہنے لگا کہ ان کا کیپٹن مسعود اپنی کمپنی کے ساتھ سویلین کپڑوں میں بھیانی پل پر موجود ہے اور یہ

اجازت ہمیں دو دن پہلے مل گئی تھی۔ میں اس کے پاس جاتا ہوں کہ اس کو حالات سے آگاہ کروں کہ پلٹن والے چل پڑے ہیں۔ ان کی رہنمائی کرے۔ یہ سن کر میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ مسعود میرے چھوٹے بھائیوں سے بھی اونچے مقام پر تھا۔ 1940ء میں جب اس نے جوانی میں قدم رکھا تو ہماری پلٹن 33 محمدی کے چند دن اکٹھے قیام نے ہمیں یک نفس کر دیا تھا۔ بہرحال اس عاجز نے کرنل اقبال قریشی کو عرض کی کہ مسعود کو کہنا ''تمہارا لالہ تمہارے عقب میں پہنچ گیا ہے۔ الحمد للہ آج رات میں آرام کی نیند سوسکوں گا کہ تم آگے میری حفاظت پر ہو! مسعود نے 8 ستمبر کی ملاقات میں جب جنگ شروع ہونے کی پوری کہانی سُنائی تو بسم اللہ ان الفاظ سے کی: لالہ تیرے اس طلسمی پیغام نے میری کیفیات (Dimension) کو ہی تبدیل کر دیا کہ ساری قوم سو رہی ہے۔'' اے مسعود! تو اٹھ تیرے محاذ سے آگے بڑھ کر کوئی قوم کو ذلت سے دوچار نہ کر دے۔''

قارئین! قوم نے ساری توجہ باٹاپور یا برکی محاذ کو دے دی۔ جہاں سے بھارت کی حد بہت دور تھی اور ان مقامات پر دشمن بہت دیر کے بعد پہنچا۔ بھیانی پل سے دشمن کی حد صرف ڈیڑھ میل دور تھی اور مسعود نے بی آر بی کے آگے دفاعی پوزیشن لی ہوئی تھی جہاں بھارت کی ایک پلٹن نے پو پھٹتے ہی پیش قدمی شروع کر دی۔ مسعود کے مجاہدوں نے ان بھارتیوں کو تہس نہس کر دیا۔ توپخانے والے فائر نہ دے رہے تھے کہ فائر کھولنے کے احکام اوپر سے نہیں پہنچے۔ مسعود نے اپنی اینٹی بکتر بند توپوں کے فائر سے دشمن کے حواس باختہ کیے اور توپخانے والے بھی گولے پھٹنے کی آواز سن کر فائر دینے کے لئے تیار ہو گئے کہ شاید فائر کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ اس عاجز نے 8 ستمبر کو ان بھارتیوں کی لاشوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کہ قدرت کے معجزے دیکھ کر حیران ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کو کیسے بچاتا رہا۔ بی آر بی کو صرف اکیلے باٹاپور کے مقام سے پار کر کے تو بھارت کچھ حاصل نہ کر سکتا تھا۔ باٹاپور کے شمال اور جنوب دونوں طرف سے وسیع علاقوں پر قبضہ ضروری تھا۔ شمال کی طرف سے ایسی کوشش مسعود کے ہاتھوں پامال ہوگئی۔ بھارت والوں نے ایسی کوشش سورج کے طلوع ہونے کے بعد کی کہ وہ مشکل سے اس وقت وہاں پہنچے۔ جنرل تجمل حسین ملک اب مرحوم و مغفور اس وقت کرنل تھے اور ان کی تیسری بلوچ پلٹن نے حملہ آوروں کو تہس نہس کر دیا۔

اب رہ گیا درمیان والا محاذ یا باٹاپور کا علاقہ تو اس سڑک پر حرکت کی ہمیں رات کے بارہ بجے تک بندش تھی کہ بھارت سے آنے والے امریکی مہمانوں کا ''انتظار'' تھا۔ راقم نے حوالدار معروف کو تھانہ مناواں بھیج دیا کہ وہاں پولیس والوں کو بتا کر چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ جب ''امریکی مہمان'' وہاں سے گزر کر لاہور چلے جائیں تو مجھے آ کر اطلاع دینا۔ رات تقریباً ساڑھے آٹھ بجے مسعود واپس آیا اور بتایا کہ بھارت سے تین جیپیں آئیں جن میں یہ مہمان تھے۔ تھانہ مناواں کے قریب رکے اور پولیس والوں کو کہا کہ ان کا کچھ سامان اٹاری رہ گیا ہے۔ وہ ایک جیپ کو واپس بھیج رہے ہیں کہ وہ سامان لے آئے۔ تھانہ والے واہگہ کی پوسٹ کو اطلاع دے دیں کہ جیپ کو نہ روکا جائے تو ان کے دیسی ڈرائیور یا بھارتی ایک جیپ لے کر واپس چلے گئے ہیں۔ میری بلا سے۔ مجھے اس وقت کسی کھوج کی ضرورت نہ تھی؟ میں چھپے راستے اور کچی سڑکوں کو استعمال کر کے اپنا سامان اور نفری آگے منگوا رہا تھا۔ اب میں نے حکم دے دیا کہ شالامار باٹاپور سڑک کو استعمال کرو اور ہمیں دیکھ کر باقی لوگوں نے بھی ایسا کرنا

شروع کر دیا۔ البتہ آر اینڈ ایس کے میجر عارف جان جس نے باٹا پور کے آگے پندرھویں سولہویں میل کے علاقوں میں جانا تھا۔ ان کے بارے بعد میں خبر ملی کہ انہوں نے رات کے بارہ بجے کے بھی بعد باٹا پور پل کو پار کیا اور حرکت کے دوران ہی پیش قدمی کرنے والی بھارتی فوجوں کے ساتھ جھڑپ ہوگئی اور گھمسان کی جنگ ہوئی۔ اس وجہ سے بھی بھارت کی پیش قدمی میں رکاوٹ پڑی اور عارف جان شہید ہو گئے کہ اس سے پہلے میجر علیم الدین کو بھارت والے اپنے گھیرے میں لے چکے تھے اور اس کا رابطہ رینجر ہیڈ کوارٹر سے کٹ چکا تھا۔ لیکن ہمارے بڑے افسران پارٹی میں مدعو تھے۔ ان کو کچھ خبر نہ ملی اور اگر خبر مل بھی جاتی تو وہ کیا کرتے۔ اللہ تعالیٰ خود لاہور کے مجاہدوں کی کمانڈ سنبھال چکا تھا۔ علیم الدین نے غازی علیم الدین شہید کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے بھارتیوں کو بے پناہ نقصان پہنچایا اور خود بھی شہید ہو گیا۔ پچھلی پوزیشن میں میں نے بھی جب آگے فائر کی آواز سنی تو میں اپنی جیپ میں باٹا پور پل کے پاس پہنچا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ چیختے اور روتے بچے اور عورتیں بی آر بی کے اگلے علاقوں سے پناہ کے لئے لاہور کی طرف آ رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میں اپنے آپ پر کنٹرول نہ کر سکا اور پکار اٹھا:

''اے حجاج بن یوسف! تو میرا ہیرو ہے۔ دو مسلمان عورتوں کی عزت کے لئے تو نے موجودہ مغربی پاکستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ جبکہ ہم آزادی کے وقت ستر ہزار نوجوان عورتیں کفار کے پاس چھوڑ آئے اور آزادی کے بعد بھی اپنی عورتوں کی حفاظت نہ کر سکے۔''

قارئین! اگر اسلام میں خودکشی کی اجازت ہوتی تو وہ بہترین وقت تھا اور اسلام کے اصولوں کے مطابق لڑ کر شہید ہونے کی میری خواہش کو طاقت ملی تو آگے بڑھ کر اس عاجز نے جنگ کی نبض شناسی کی کوشش کی تو مجھے نظر آیا کہ بھارتی فوج میں لڑنے کی سکت ختم ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کام مسعود، تجمل، عارف جان اور علیم الدین کے مجاہدوں سے کرایا اور خود اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کمانڈ کر رہی تھی۔ مجھے سورۃ الانفال کی آیت مبارکہ 17 یاد آئی: ''اے مومنین! آپ نے تو انہیں قتل نہ کیا تھا اللہ تعالیٰ کی ذات پاک نے قتل کیا تھا اور اے میرے حبیب آپ ﷺ نے تو وہ نہ پھینکا تھا اللہ تعالیٰ کی ذات پاک نے پھینکا تھا......

''کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو ہے تابع تقدیرِ مسلمان
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

یہ تصویر کا روشن پہلو تھا۔ اندھیرا پہلو بھی ہے۔ میں بہت زیادہ اختصار سے کام لے رہا ہوں۔ ورنہ اسی ستمبر 65ء کی جنگ کے سلسلہ میں میرے مشاہدات تحقیقات اور بامقصد نتائج کے بیانات کئی کتابوں میں بھی ختم نہیں ہو سکتے صرف چھپی باتیں قوم کے سامنے پیش کر رہا ہوں کہ کس طرح جھوٹ پر جھوٹ بول کر قوم کو پچھلے 60 سالوں سے بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔

اب ان ''امریکی مہمانوں'' کے بارے جنگ کے بعد جب ناچیز عاجز نے جنرل احسان الحق ڈار مرحوم جو میرے نمبری اور عظیم رفیق تھے، کے ساتھ مل کر جو تحقیق کی تو اس میں ہمارے سرکاری ریکارڈ اور اب سرکاری تاریخ

بھی تسلیم کرتی ہے کہ یہ ''مہمان'' لاہور کی ایک پارٹی میں مدعو تھے۔ اس کے لئے ایک ڈھونگ رچایا گیا اور ان کی جیپ تھانہ مناواں سے واپس بھارت چلی گئی۔ اس پارٹی کے بارے ہمیں لاہور میں اسی زمانے میں معلوم ہو گیا تھا کہ جنرل سرفراز اور بریگیڈئر قیوم شیر نشے میں دھت رات ایک یا دو بجے اپنے گھروں کو لوٹے اور چھ ستمبر صبح نو بجے تک سوتے رہے اور بریگیڈئر قیوم شیر نے اپنی یونٹوں کو 5 ستمبر کو کوئی تنبیہہ بھی نہ کی تھی۔ کہ اس کی ایک یونٹ 18 بلوچ کے جوان صبح آٹھ بجے لاہور چھاؤنی میں پی ٹی کر رہے تھے اور ان کا کرنل اختر عالم خود اپنے مضامین میں یہ کچھ تسلیم کرتا ہے۔ ان دونوں یعنی جنرل سرفراز اور بریگیڈئر قیوم شیر کو لاہور کے ''بچانے والے کے طور پر'' ہلال جرات سے نواز دیا گیا۔ کہ جب یہ جاگے تو بھارتی فوج اپنے زخموں کو چاٹ رہی تھی اور بی آر بی سے بہت دور ستا رہی تھی۔ اور جنگ کے آخری دنوں میں قیوم شیر نے ہمارے ساتھ کیا کچھ نہ کیا۔ وہ کہانی بعد میں آ رہی ہے۔ یہ تھے وہ جھوٹ جس سے ایوب خان کے نالاں ہونے کا ذکر پچھلے بیانات میں ہو چکا ہے۔ کہ ایوب خان کے اپنے جھوٹ یاد نہ رہے۔ کشمیر میں داخل ہوئے بغیر 48-1947ء کے کشمیر کے جہاد کے لئے ''واہ واہ کرنے والے'' کے طور پر اس کو بھی ہلال جرأت سے ''نواز'' دیا گیا اور ان جھوٹوں کی سزا ہمیں 1971ء میں مل گئی۔

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے تیرا مرض کور نگاہی

اب جو بھارتی جیپ تھانہ مناواں سے واپس چلی گئی۔ ہماری تحقیق کے مطابق اس میں بھارتی فوج کے افسر تھے جنہوں نے ڈرائیوروں کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اور امریکی مہمانوں نے ان کو دکھایا کہ پاکستانی فوج محاذ پر ''موجود'' نہیں۔ بارکوں میں سوئی ہوئی ہے یہ لوگ یہ کچھ دیکھ کر امرتسر پہنچے جہاں بھارتی کور کمانڈر جنرل ہربخش سنگھ کو رپورٹ دی۔ جس نے بھارتی بری فوج کے چیف آف سٹاف جنرل جے این چودھری کو یہ خبر پہنچائی جس کے دفتر میں لال بہادر شاستری، گلزاری لعل نندہ اور وزیر دفاع چون موجود تھے۔ اور چودھری، نندہ اور چون نے مل کر بڑی مشکل سے شاستری کو جنگ میں ''دھکا'' دیا کہ لاہور ان کو ''پلیٹ'' پر رکھا ہوا مل جائے گا۔ بھارتی اخباروں میں آدھی رات سے تھوڑا پہلے اس میٹنگ اور جنگ کے فیصلہ کی خبر کی ''بھنک'' ہم نے تلاش کر لی تھی۔ کہ فوج تیار تھی۔ ان کو پیش قدمی کے احکام مل گئے۔ اور 6 ستمبر کو ہم نے جو بھارتی قیدی پکڑے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ان کو بتایا گیا تھا کہ پاکستانی فوج بارکوں میں ہے۔ چند رینجروں یا چند فوجیوں کی ان کے ساتھ معمولی لڑائی ہو گی۔ ''آپ لوگ محاذ پر کیسے پہنچ گئے۔''

اس ساری کارروائی کا ہمارے پاس ''واقعاتی'' ثبوت موجود ہے کہ بھارتی فوج ''چوکنی'' ضرور تھی لیکن چھ ستمبر کو حملہ صرف گوربخش سنگھ کی فوج نے کرنا تھا۔ بھارتی ہمارا مقابلہ ''تنگ محاذ'' پر کر رہے تھے اور گوربخش سنگھ کی ذمہ داری کا علاقہ شمال میں ہمارے سیالکوٹ کے پسرور کے علاقہ میں سے اسٹر پل سے شروع ہو کر واہگہ، بری محاذ شامل کر کے قصور محاذ کے روہیوال کے گاؤں تک تھا۔ لیکن ہمارے قصور محاذ کے سامنے ''قیصر ہند'' اور ستلج پل کا علاقہ، فیروزپور کے فوجی کمانڈر کے ماتحت تھا۔ اسی طرح ہمارے سیالکوٹ محاذ پر سیالکوٹ کے سامنے سچیت گڑھ کا علاقہ جموں کے بھارتی کمانڈر کے ماتحت تھا۔ اسی طرح ہمارے سیالکوٹ محاذ پر پسرور میں اسٹر کے پل کے علاقہ

پر حملہ تو 5/6 ستمبر کی رات کے پو پھٹنے ہی ہو گیا تھا۔ لیکن سچیت گڑھ کے بھارتیوں نے 6 ستمبر دن کے نو بجے تک حفاظتی اقدام بھی نہ کئے کہ ان کا سنتری پگڑی پہنے اپنی پوسٹ پر کھڑا ہوا تھا کہ جموں کا بھارتی کمانڈر جنگ کی خبر آگے بروقت نہ پہنچا سکا کہ ہمارے سیالکوٹ کے آگے والے فوجیوں نے اپنے رینجر کو بلا لیا اور کھڑے بھارتیوں پر فائر کر دیا۔ تو تب بھارتیوں کو جنگ کے بارے معلوم ہوا۔ یہی صورتحال قصور میں تھی کہ بھارتیوں نے قصور محاذ کے روہیوال کے علاقہ پر 6/5 ستمبر پو پھٹتے حملہ بھی کر دیا اور کچھ کامیابی بھی حاصل کر لیکن میری پرانی پلٹن سات پنجاب کے میجر یونس نے جوابی حملہ کر کے بھارتیوں کو تہس نہس کر دیا اور بھارتی قیدی بھی پکڑے۔ لیکن ساتھ ہی قصور کے محاذ کے سامنے ''قیصر ہند'' اور ستلج پل پر بھارتی سنتری چھ ستمبر دن کے نو بجے تک پگڑی پہنے پہرہ دے رہے تھے۔ کہ فیروز پور کا بھارتی کمانڈر آگے خبر نہ پہنچا سکا۔ بہر حال لاہور پر بھارتی حملہ بری طرح ناکام رہا۔ بلکہ سلیمانکی کے سامنے تو بھارتی دن کے گیارہ بجے تک لڑائی کے بارے بے خبر تھے اور ہمارے فوجیوں نے ان کو گھیرا ڈال کر گرفتار کر لیا۔ ظاہر ہے جنرل گور بخش سنگھ باخبر تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اس کی فوج تیار تھی اور اس نے لاہور کے بارے خبر معلوم کر کے جنرل چودھری کے پاس پہنچائی تھی۔ اور جیسے شاستری نے جنگ میں کودنے کا فیصلہ کیا۔ ہر بخش سنگھ کو خبر مل گئی اور اس کے محاذ پر اس کے جوانوں نے پہلی کارروائی کی۔ باقیوں کو رات کے بارہ بجے جنگ کے فیصلہ کی خبر ملی تو وہ لوگ اپنے آگے والوں کو بروقت چوکنا بھی نہ کر سکے۔

لیکن بی آر بی کو پار کرنے کے بعد دشمن پر حملہ کرنے کی ہماری غلط تجویز کی بجائے' ہماری بی کمپنی نے بی آر بی کے آگے حملہ کر کے رانی پوسٹ پر قبضہ کر لیا۔ جس میں ہمارے کئی جوان شہید بھی ہوئے اور میجر نذیر گل زخمی بھی ہوئے اور میں ان کی جگہ لینے جا رہا تھا کہ مجھے حکم ملا کہ باٹا پور سے لے کر راوی سائفن کے آگے بی آر بی کے اگلے کنارے کی سڑک کے بارے رپورٹ دوں کہ اس پر ٹینک چل سکتے ہیں کہ نہیں' اور راوی سائفن سے یہ کام شروع کروں اور ہر میل کے بعد وائرلیس پر ''ہاں'' یا ''نہ'' کے الفاظ سے رپورٹ دیتا جاؤں۔ بڑا ''جاہلانہ'' حکم تھا۔ ایسا کچھ امن کے زمانے میں سوچ رکھتے یا یہ کام محاذ پر بیٹھے آگے والے افسر مجھ سے بہتر اس صورت حال کا مطالعہ کر کے رپورٹ دے سکتے تھے۔ اور ایسی رپورٹ امن کے زمانے میں تیار رہنی چاہئے تھی۔ شاید مجھے کوئی سزا دینا ''مقصود'' تھی۔ لیکن مجھے جنگ کی ''نبض شناسی'' کا موقع مل گیا' اور بھارتی فوج کی لاشوں کو دیکھ کر میرا مورال بہت اونچا ہو گیا کہ 9 ستمبر کے جوابی حملہ میں ہماری اے اور بی دونوں کمپنیوں کو اکٹھا کر دیا اور باقی یونٹوں سے مانگ تانگ کر جو فوج اکٹھی کی اور اس جوابی حملہ کی تاب نہ لا کر بھارتی جنرل نرنجن پرشاد اپنی جیپ چھوڑ کر بھاگ گیا اور ہم نے بی آر بی کے آگے ڈوگرئی گاؤں پر بھی قبضہ کر لیا۔

5-اسلام کسی خاص تدبیر کے بغیر پسپائی کی اجازت نہیں دیتا

10 ستمبر کے آگے واہگہ تک حملہ کیلئے ہماری اے کمپنی بکتر بند دستوں کے ساتھ ہر اول میں تھی تو گول والا نے مجھے بھی اے کمپنی کے ساتھ بھیج دیا کہ جہاں کمپنی تھک گئی' میں گول والا کو خبر دوں تو وہ بی کمپنی لیفٹیننٹ افتخار کے ماتحت میرے پاس بھیج دیں گے اور میں کچھ دور ہی تھا کہ گھمسان کی جنگ میں اے کمپنی کمانڈر میجر مبارک شہید ہو گئے تو میں نے ان کی لاش بھی پیچھے بھجوائی اور کمپنی کی کمانڈ سنبھال کر گول والا کو خبر دی کہ پیش قدمی

رک گئی ہے اور ہمارا کافی جانی نقصان ہوا ہے۔

گول والا نے کہا کہ ہم پیش قدمی کی مزید کوشش نہ کریں۔ اوپر سے بھی احکام تبدیل ہو گئے ہیں۔ وہ چودھویں میل کے پتھر کی دائیں طرف بی کمپنی کے ساتھ دفاع اختیار کر رہے ہیں اور اس کی کمانڈ کیلئے کیپٹن صغیر حسین کو بلا رہے ہیں۔ تم بھی آہستہ آہستہ دشمن سے رابطہ توڑ کر پیچھے آ کر ہماری بائیں طرف آ کر دفاعی پوزیشن اختیار کرو۔ جو مشکل کام سرانجام دینے میں کئی گھنٹے لگ گئے اور احکام کی تبدیلی کی یہ وجہ بھی کچھ سمجھ آئی کہ قصور محاذ سے ہمارے بکتر بند دستوں کی پیش قدمی رک گئی تھی اور دشمن کا بڑا حملہ سیالکوٹ محاذ پر ہے۔ میرے لئے بڑے فخر کی بات تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے لاہور محاذ کے سب سے اگلی پوزیشن کی کمانڈ دے دی۔ اور بی آر بی ہمارے بڑے کام آئی۔ لیکن بی آر بی کی بھی ''حفاظت'' کی ضرورت تھی یہ رب نبی محمد ﷺ نے اس عاجز کو سونپ دی کہ بعد میں ان مشاہدات اور تحریروں نے اس عاجز کو ''حضور پاک ﷺ کے سپاہی'' کے نام سے موسوم کر دیا۔

بہرحال ہم آگے والی پوزیشن پر ڈٹے ہوئے تھے' دشمن ایک دفعہ تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گیا تھا۔ 11 ستمبر کو میں نے اپنے سے آگے والے سارے علاقے کی خوب دیکھ بھال کی' اور کچھ حفاظتی پوسٹیں دفاع سے آگے لگائیں اور سورج غروب ہی ہوا کہ اوپر سے حکم ملا کہ آگے سے سب گشتی دستے یا پوسٹیں واپس بلا لو اور پسپائی اختیار کر کے بی آر بی کے نئے پل کے علاقہ میں واپس پہنچیں۔ کیپٹن صغیر سے جلد مشورہ کے بعد ہم نے کرنل گول والا کو یہ باور کرا لیا کہ یہ غلط حکم کسی ''سازش'' کا نتیجہ ہے۔ دشمن تو نظر نہیں آ رہا۔ کس کے ڈر سے ہم یہ اہم پوزیشن چھوڑ دیں جس کو چھوڑنے کے بعد بی آر بی کا دفاع ناممکن ہو جائے گا۔ گول والا نے ہمارے ساتھ تعاون کیا اور اوپر والوں کو بتا دیا کہ دونوں کمپنی کمانڈروں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا ہے کہ یہ حکم کسی سازش کی وجہ سے ہے۔ ایک دفعہ تو ہماری بات مان لی گئی لیکن گھنٹے کے بعد سخت احکام ملے کہ حکم مانو اور اگر وہ لوگ حکم نہیں مانتے تو ان کو کمانڈ سے ہٹا کر گول والا ان احکام کی پابندی کرے۔ اب ہم کیا کرتے' گول والا اور کیپٹن صغیر پہلے نکل گئے میں نے ان کی ''پسپائی'' کی حفاظت بھی کرنا تھی۔ اور خود اپنی پسپائی کی ''حفاظت'' کا بعد میں خود بندوبست کرنا تھا۔ اسلام کسی خاص تدبیر کے بغیر پسپائی کی اجازت نہیں دیتا' اور ہمارے لئے یہ پسپائی احکام اور تدبیر کے تابع تو تھی' لیکن خدا اس ''عمل'' سے بچائے۔ جوانوں کو کنٹرول کر کے اس عاجز کا چند میل کا یہ سفر میری زندگی کا بدترین سفر تھا۔

نئے پل پر پہنچا تو ہمارا بریگیڈیر قیوم شیر کھڑا تھا۔ اور آئیں بائیں شائیں مار رہا تھا۔ کہنے لگا ''تم نے بہت دیر کر دی۔ تم نے بڑی دیر کر دی۔ میں نے اس پل کو اڑانا ہے''۔ عرض کہ جناب میں سب سے آگے والا کمانڈر ہوں اور اب سے چھ گھنٹے پہلے واہگہ تک کے علاقہ کو نظر سے دیکھ آیا ہوں۔ مجھے تو دشمن کی کوئی حرکت نظر نہیں آ رہی تھی، تم لوگ کس کے ڈر سے ہمیں پسپا کرا رہے ہو۔'' کہنے لگا ''تمہیں کیا معلوم ہے دشمن کے تین ٹینکوں نے راوی سائفن پار کر لیا ہے۔'' اس عاجز نے گزارش کی مجھے اب سے چند گھنٹے پہلے کی خبر ہے کہ وہاں تو 15 بلوچ کا بندوبستی محکمہ اور بی ایچلان ہے اور لنگر پر وہ لوگ روٹیاں پکا رہے تھے۔ اور 15 بلوچ پیش قدمی کر کے آگے منجھ اور گکڑ تک پہنچی ہوئی ہے۔ اور راوی سائفن کو پار کرنے کیلئے دشمن کیلئے بھیائی پل کے آگے تک تین میل کے علاقہ

پر قبضہ ضروری ہے اور بھیانی پل پر کیپٹن مسعود بیٹھا ہے۔ چند گھنٹے پہلے اس نے مجھے وہاں سے سلام بھیجے ہیں۔'' تو بریگیڈئر صاحب کہنے لگے۔'' یہ ہڈیارہ سائفن ہوگا'' عرض کی ''ہڈیارہ تو سائفن نہیں ہے'' اکاڈیٹ ہے نہر اوپر سے گزرتی ہے وہاں سے تو ٹینک کا گزرنا بھی کچھ ناممکن ہے کہ نیچے ہڈیارہ نالہ اور کیچڑ ہے۔ میری خوش قسمتی کہ اس تمام بحث ومباحثہ کے دوران 18 بلوچ کے عزیزم میجر غلام محمد بھی وہاں پہنچ گئے تھے جو بعد میں فوج سے میجر جنرل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ اُس نے قیوم شیر کو کہا'' کہ میجر امیر افضل مجھ سمیت جونیئر افسروں کا ''لالہ'' ہے۔ اس کی باتیں بڑی وزنی ہوتی ہیں۔ میں ان کے تجزیہ سے اتفاق کرتا ہوں''۔ تو اس عاجز نے عرض کی کہ جناب اگر دشمن کے تین ٹینکس بھول کر ہمارے اندر ''دگھس'' بھی آئے ہیں تو وہ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔ ان کو تلاش کر کے برباد کرو۔ یا ان کے جوان خودبخود ہاتھ کھڑا کر دیں گے۔ تو کرنل گول والا بھی وہاں موجود تھا۔ اس سمیت سب لوگ ہنس پڑے۔ بریگیڈئر قیوم شیر کی جان میں جان آئی۔ کہنے لگا سب کچھ ڈویژن ہیڈ کوارٹر کی طرف سے ہے۔ اور فی الحال پل کو نہیں اڑاتے۔ میں ادھر بات کروں گا۔ میجر امیر افضل ادھر پل کے نزدیک کوئی جگہ چن کر دفاع اختیار کرے۔ گو اس جگہ کا دفاع گیارہ بلوچ کے پاس ہے۔ قارئین یہ رات میں خوب سویا اور اس سلسلہ میں ساری تحقیق بہت لمبی بات ہے۔ پس یہ اندازہ لگائیں کہ کئی لوگوں نے نااہلی اور بے کرداری کا ثبوت دیا اور افواہ کو صحیح مان لیا۔

بارہ دسمبر صبح سویرے بریگیڈئر قیوم شیر نے کرنل گول والا کو بلا کر کہا ہے ''کہاں ہے تمہارا وہ بہادر کمپنی کمانڈر؟ اس کو بولیں کہ کل رات والی چھوڑی ہوئی پوزیشن پر قبضہ کرے۔ لیکن پہلے دیکھ لے کہ دشمن ڈوگرئی میں تو نہیں پہنچ گیا۔ اگر ایسا ہے تو ڈوگرئی کی اس طرف پوزیشن لئے ہوئے۔ ہم بکتر بند دستے آگے منگوا رہے ہیں اور بعد میں اس کی مدد کیلئے بھیج دیں گے۔ ان کی مدد سے اگلی پوزیشن پر قبضہ کرے تو پھر تم بھی دوسری کمپنی لے کر وہاں پہنچ جانا'' قیوم شیر نے یہ حکم بڑے طنزیہ لہجے میں دیا۔ بے چارہ گول والا جو پارسی تھا خاموشی سے ان احکام کے لہجہ کو برداشت تو کر گیا لیکن مجھ سے بھی ڈر رہا تھا۔ کہ میں کہیں یہ حکم ماننے میں کچھ شرائط نہ پیش کر دوں۔ کہ ہمارے پروٹیسٹ اور انکار کو کیوں وقعت نہ دی گئی۔ لیکن گول والا حیران ہو گیا جب میں نے اس کو کہا ' یہ کام ہمارے بغیر کوئی اور نہیں کر سکتا۔ فکر مت کرو۔ میں ڈوگرئی کے ادھر بکتر بند دستوں کا انتظار بھی نہ کروں گا۔ ہاں اس کارروائی کے ایک دو دن بعد ہماری جگہ کسی اور کو آنا چاہیئے۔ کہ اتنی اہم جگہ پر دشمن کے توپخانہ کے فائر کو زیادہ دن برداشت کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔''

لاہور محاذ کے سب سے اگلے دستوں کے کمانڈر کے طور پر اس عاجز نے جو اس پیش قدمی میں لطف اٹھایا۔ تو مجھے داتا صاحبؒ کے اس فرمان کی بھی سمجھ آ گئی۔ کہ ''کاش میں عدم میں چلا جاؤں'' کہ یہ عاجز تو اس سے پہلے جناب ابن عربیؒ کا ہم خیال تھا'' کہ عدم بڑی ہی درد بھری کیفیت ہے'' کہ میں عدم میں جانے سے خوف کھاتا رہتا تھا۔ تو اس دن معلوم ہوا کہ عدم کے بھی کئی پہلو ہیں اِس پیش قدمی کے دوران میرا یہ ''مادی وجود'' نہ تھا۔ رب کی ذات پاک نے مجھے کوئی روحانی وجود پہنایا ہوا تھا۔ بہر حال اس عاجز نے ڈوگرئی کے اس طرف کوئی انتظار نہ کیا اور پیچھے خبر دی کہ ڈوگرئی میں دشمن نہیں ہے کہ وہاں دشمن کے گولے گر رہے ہیں۔ ڈوگرئی گاؤں

سے نکل کر چلتے چلتے حکم دیا ''امیر'' میرے بائیں ''حمید'' میرے دائیں۔ اور ''اعجاز'' میرے پیچھے۔ کل والی پوزیشن میں کھلی فارمیشن کے طور پر پہنچو اور اپنے اپنے مورچہ پر قبضہ کرو۔ سامنے دیکھو دشمن بھی اسی جگہ پر قبضہ کرنے کیلئے آ رہا ہے'' اور ہاں! مجھ بوڑھے کو بھی سہارا دیتے رہنا کہ قارئین اس وقت بھی یہ عاجز فوج میں 28 سال نوکری کر چکا تھا اور عمر 46 سال تھی۔ تب ہی تو مردان سنٹر میں آرام والی جگہ پر تبدیلی ہو چکی تھی۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے معجزہ کیا۔ ہم دشمن سے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ مشین گن کے بارود کا ایک باکس پسپائی کے وقت اندھیرے کی وجہ سے ہم پیچھے چھوڑ گئے۔ وہ بڑا کام آیا۔ نائک نجیب گل نے دشمن کی پیدل فوج کو بھون کر رکھ دیا۔ تو دشمن نے اپنی مدد کیلئے بکتر بند دستے بلا لئے۔ لیکن میری مدد کیلئے رسالہ کا شیر جوان میجر سرور پہنچ گیا۔ اور دشمن کی دو بکتر بند گاڑیاں تباہ کر دیں۔ میں نے اس کے پاس جا کر سمجھایا کہ اس سے آگے نہ بڑھے اور پیچھے ہٹ کر ''ھل ڈاؤن'' پوزیشن اختیار کرے۔ لیکن دشمن کے ''شکار'' کے شوق اور گھمسان کی جنگ میں میجر سرور نے اپنی جان اللہ تعالیٰ کے ہاں پیش کر دی لیکن اب میری مدد کیلئے کیپٹن صغیر کی بی کمپنی پہنچ گئی تھی۔ اینٹی بکتر بند توپیں بھی پہنچ گئیں۔ اور گول والا نے دفاعی جنگ کی کمانڈ سنبھال کر دشمن کو تہس نہس کر دیا۔ اس اہم واقعہ پر میں کوئی تبصرہ نہ کروں گا سوائے اس کے کاش جنگ کے بعد اس سلسلہ میں میری عرضداشت کے مطابق اس سلسلہ میں انکوائری ہو جاتی اور کتنے کم فہم تھے وہ لوگ جنہوں نے اس افواہ پر یقین کر لیا تھا۔

اگلے پانچ دنوں کی گھمسان کی جنگ میں ہمارا کافی جانی نقصان ہو گیا۔ میجر سرور شہید کی جگہ لیفٹیننٹ افتخار جعفر نے لے لی تھی۔ وہ اسلام کا عظیم فرزند تھا میری پوزیشن کی حفاظت میں اس کو بھی رب کی ذات پاک نے شہادت کا رتبہ عطا کر دیا کہ سید زادہ تھا۔ شہادت سے ایک دن پہلے بڑی پیش گوئیاں کر گیا تھا کہ میں نے زندہ رہنا ہے اور ان کی بہادریوں کی کہانیاں لکھنی ہیں اور یہ پیش بینی پوری ہو چکی ہے کہ یہ عاجز اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ چکا ہے کہ شہادت' شہید کے گرد پہلے پہنچ جاتی ہے کسی کے پاس کئی دن پہلے اور کسی کے پاس چند لمحے پہلے اور افتخار جعفر نے ''مولا علی'' کا نعرہ لگا کر میرے پوزیشن کی حفاظت میں دشمن کی کئی بکتر بند گاڑیاں تباہ کی تھیں۔

16 ستمبر کو میجر فرید ملک ہماری مدد کیلئے پہنچ گئے۔ لیکن ساتھ ہی ڈویژن ہیڈ کوارٹر سے ایک حکم لے آئے کہ میجر امیر افضل' ادھر کیا کر رہا ہے کہ مردان پوسٹنگ پر کیوں نہیں گیا۔ ان کو شاید یہ بھی معلوم نہ تھا کہ پلٹن کا ایک میجر شہید ہو گیا ہے اور ایک زخمی اور میجر امیر افضل اس حالت میں پلٹن کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ گول والا نے میجر فرید کو میری جگہ بھیج دیا اور مجھے اپنے پاس بلا کر کہا کہ میں پیچھے جا کر بریگیڈ اور ڈویژن والوں کو سمجھاؤں کہ پلٹن کو میری کتنی ضرورت ہے۔ یہ عاجز ہنس پڑا کہ میں اپنے منہ میاں مٹھو کیسے بنوں۔ میں تو مردان جانے سے انکار کر چکا ہوں کہ درخواست نامنظور ہوئی تو صدر پاکستان کو اپیل کروں گا۔ اگر تمہیں میری ''ضرورت'' ہے تو خود جاؤ تو بے چارہ گول والا سخت فائر کے نیچے سے لمبے سفر پر تیار ہو گیا۔ اور بریگیڈیئر قیوم شیر کو صورتحال سے آگاہ کیا۔ تو بریگیڈیئر قیوم شیر نے بڑا اچھا رویہ اختیار کیا کہ اس کی ذمہ داری ہے کہ امیر افضل پلٹن میں رہے گا اور وہ ڈویژن والوں کو بتا دے گا کہ ان کا حکم بڑا جاہلانہ ہے۔

17 ستمبر یا 18 ستمبر کو میجر فرید ملک 28 نے کرنل گول والا کے سامنے یہ صورت حال پیش کر دی کہ اس

مقام سے جوان مزید لڑائی لڑنے کی سکت نہیں رکھتے یا تو یہاں سے آگے بڑھ کر دشمن کے ساتھ دو دو ہاتھ کر کے شہادت حاصل کر لیں یا ہماری تبدیلی ہو۔ گول والا نے کہا کہ وہ یہ کچھ بریگیڈ کمانڈر کو پہلے ہی گزارش کر چکا ہے اور کچھ امداد کا انتظار ہے۔ لیکن اب دشمن کے خودکشی والے حملے شروع ہو چکے تھے۔ جن کو یہ عاجز خوابوں میں مئی اور جون میں دیکھ چکا تھا۔ کہ دشمن نے اوپر والوں کے سامنے جھوٹی رپورٹیں دی ہوئی تھیں کہ ان کا باٹا پور پر قبضہ ہے اور وہ بی آر بی کو پار کر چکے ہیں اور اب سیز فائر سے پہلے وہ کم از کم بی آر بی کے نزدیک تو پہنچنا چاہتے تھے کہ ہم نے ان کو بی آر بی سے آگے دو میل دور رکھا ہوا تھا۔ 18 ستمبر سورج غروب ہونے کے جلدی بعد سخت اور سیدھی بمباری سے انہوں نے ہمارے توپخانے کے ساتھ ملاپ والی وائرلیس سیٹوں کو برباد کر دیا اور حملے کیلئے ضروری بمباری شروع کر دی۔ اس عاجز کو کچھ ضروری تارگٹوں کے نمبر زبانی یاد تھے۔ میں دوڑ کر پیچھے گیا کہ 18 بلوچ کے میجر خورشید کے ساتھ توپخانے کے او پی میجر ضیاء الدین اوپل کی مدد سے حملہ آور دشمنوں پر فائر کراؤں گا۔ وہاں پہنچا، تو معلوم ہوا کہ میرے وہاں پہنچنے سے دس منٹ پہلے دونوں افسران شہید ہو چکے تھے۔ ان کے جسد ابھی وہیں مورچوں میں تھے۔ اور گو اس کمپنی کا دشمن کے ساتھ سیدھا لگاؤ نہ تھا۔ لیکن سب نظام درہم برہم نظر آ رہا تھا۔ وہاں موجود صوبیدار صاحب کو کچھ ڈھارس بندھائی۔ لیکن میرا اپنی پوزیشن پر پہنچنا ضروری تھا کہ دشمن کے ساتھ ہمارا لگاؤ تھا۔ لیکن میں جیسے گول والا کے بٹالین ہیڈ کوارٹر میں پہنچا تو سامنے سے میجر فرید ملک کے زخمی ہونے کی خبر ملی کہ وہ کسی جیپ پر ہسپتال جا رہا تھا۔ اب میں نے گول والا کو گزارش کی کہ جس طرح ہو میں کمپنی کی کمانڈ سنبھالنے جا رہا ہوں۔ تو گول والے نے کہا ''اس اندھیرے میں اکیلے نہ جاؤ''۔ گزارش کی ''کہ بھلا میرے ساتھ کون جانے کی ہمت کرے گا کہ میں حکم دے کر کسی کو زبردتی ساتھی نہ بناؤں گا۔ جو ساتھی میرے پاؤں کو بھی ''بھاری'' کر دے گا''۔ لیفٹیننٹ افتخار بعد میں کرنل پکار اٹھا ''کہ ان حالات میں وہ میرے ہمراہ جا کر ان لمحوں کو اپنی زندگی کے یادگار دن بنانا چاہتا ہے کہ دشمن کے حملہ کو روکنے میں شامل تھا۔'' صورت حال بڑی خطرناک تھی۔ ہم ایسی جگہ جا رہے تھے۔ جہاں ہمارے پہنچنے سے پہلے دشمن قبضہ کر سکتا تھا اور ہم سیدھے دشمن کے شکنجے میں ہوتے۔

الحمدللہ ہم خیریت سے میری پرانی پوزیشن پر پہنچ گئے۔ اور افتخار نے اونچا نعرہ تکبیر اور نعرہ حیدری لگایا کہ جوانو! تکڑے ہو ہم پہنچ گئے ہیں یہ سن کو صوبیدار چنار گل بھی مورچہ میں کھڑا ہو گیا اور اعلان کیا ''شیر مجاہد و میجر امیر افضل آ گیا ہے۔ دشمن کو اپنے سے دور دھکیل دو۔'' یہ اس لئے ضروری تھا کہ جوانوں پر اثر ہو گیا تھا کہ میجر صاحب کو گولی نہیں لگی۔ جوان توپخانے کا فائر مانگتے تھے۔ ان کو کیا بتاتے کہ ملاپ ٹوٹا ہوا ہے۔ حکم دیا ''کہ آج ضرورت کیلئے دشمن کے ''اکٹھوں'' پر اینٹی بکتر بند توپوں اور راکٹ لانچروں کو زمینی ضرورت کے طور پر استعمال کرو۔'' اور ایک دو فائروں سے جو روشنی ہوئی تو مشین گن والوں اور لانس نائک حیدر علی نے چھوٹے خود کار ہتھیاروں سے دشمن کو دیکھ لیا اور دیکھ کر فائر کر کے حملہ آوروں کو تہس نہس کر دیا۔ کیپٹن صغیر کو پیغام بھیجا ''کہ اپنے مشین گن والوں سے ہمارے سامنے کر اس فائر کرائے۔'' بہرحال گھمسان کی جنگ ہوئی۔ آدھی رات کو دشمن نے سخت بمباری سے ہمارے سر دبانے شروع کئے اور اپنے بچے ہوئے حملہ آوروں کو ہم سے الگ کرنے میں کامیاب ہوا۔ اگلے دو دن بھی اسی طرح گزر گئے۔ دن کے وقت دشمن حملہ نہ کرتا تھا۔ توپوں کے فائر سے ہمیں آدھ موا کرتا

رہتا تھا۔ یہ عاجز 11/12 ستمبر کی رات کو خوب سو سکا تھا۔ کہ بی آر بی کے پیچھے چلے گئے تھے اور اب دوبارہ 17/18 ستمبر کی رات کو خوب نیند آئی کہ ذمہ داری نہ تھی۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر میں تھا۔

اب پھر جاگ کر گزارہ کرنا تھا۔ کسی وقت پانچ منٹ سے زیادہ عرصہ سونا ناممکن تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اس عاجز نے سورۃ آل عمران کی آیت مبارکہ 154 اور سورہ الانفال کی آیت مبارکہ 11 کے الفاظ ''النعاس امنہ'' کی حقیقت کو عملی طور پر اس جنگ میں سمجھا۔ ہمارے مترجموں نے جو ان الفاظ کے معنی ''اونگھ'' یا ''نیند'' کیئے۔ یہ بڑے کمزور معنی ہیں۔ یہ تو روحانی سکون کی ایک کیفیت ہے جس کو بیان کرنے کیلئے دنیاوی زبان میں ہمارے پاس الفاظ ہی موجود نہیں۔ سبحان اللہ معجزے ہو رہے تھے۔

6-ہماری جوابی کارروائی نے جنرل چودھری کے اوسان خطاء کر دیئے تھے۔

بہرحال 21 ستمبر کو دشمن کا حملہ دوپہر کے جلد بعد شروع ہو گیا۔ اور بعد میں ہمیں پہچان ہوئی کہ یہ حملہ بھارتی بریگیڈ نمبر 54 نے کیا ہے جس کو ہم نے 12 ستمبر کو شکست فاش دی تھی۔ اور پورا ہفتہ پیچھے جا کر یہ بریگیڈ اب منظم ہو کر ہم پر اس طرح حملہ آور ہوا کہ 15 ڈوگرہ نے کیپٹن صغیر کی کمپنی پر سامنے سے حملہ شروع کر دیا۔ اور بھارتی چودھویں پنجاب نے میرے سامنے پر حملہ کیا لیکن ذرا دور فاصلے سے آگے نکل کر تیسری جاٹ نے میرے بائیں بازو سے آگے نکل کر معلوم ہوتا ہے کہ ایسی تجویز بنائی کہ وہ میرے پیچھے پہنچ کر مجھے گھیرے میں لے لے گی کہ میرے پیچھے جو میجر وحید حیدر ٹینکوں کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے میری مدد کرنے کی بجائے ان حملوں کے تاب نہ لا کر سورج غروب ہونے سے پہلے اپنی پوزیشن سے فرار اختیار شروع کر دی۔ میں نے گول والا کو حالت سے آگاہ کیا تو گول والا کا بریگیڈئر کے فون کے ساتھ تو ملاپ ہوتا نہ تھا اور وائرلیس پر وہ نہ چاہتا تھا کہ اپنی اس کمزور حالت کی خبر عام کرتا۔ تو اس نے لیفٹینٹ افتخار بعد میں کرنل کو بریگیڈیر قیوم شیر کے پاس بھیج دیا کہ اس کو صورتحال سے آگاہ کرے اور افتخار سورج غروب ہونے کے بعد بریگیڈ ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ ان کو بتایا کہ اب حالات وہ صورت اختیار کر چکے ہیں کہ آدھی رات تک ہماری مدد نہ کی گئی تو پو پھٹنے سے پہلے ہم سفید رومال ہلا چکے ہوں گے۔ بریگیڈئر قیوم شیر جو اپنے لئے بہادری کا تمغہ حاصل کرنے کیلئے جھوٹی داستانوں کی انگریزی بنا رہا تھا اور اس نے ایک دن بھی ہمارے دفاع کو نہ دیکھا تھا حالانکہ ہماری تربیت کے مطابق ہر بریگیڈ کمانڈر کو اپنے ماتحت پلٹن کے اگلے مورچوں کو ہر دوسرے دن اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا حکم ہے۔ اس نے افتخار کو کورا جواب دیا کہ رات کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ صبح سویرے وہ کچھ مدد کرے گا۔ اس کی عیسائی بیوی پہلے بھی اس کو تنبیہہ کرتی رہتی تھی کہ وہ اپنی جان کو ''زیادہ خطرے'' میں ڈالتا رہتا ہے۔ افتخار مایوس ہو کر ہماری طرف مڑا تو 12 پنجاب کے میجر محبوب نے اس کو بتایا کہ دشمن نے تمہاری دونوں کمپنیوں کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ تم اب ان کے پاس نہیں جا سکتے۔ افتخار واپس مڑا اور بریگیڈئر قیوم شیر کو حالات سے آگاہ کیا تو اس کا جواب تھا کہ وہ ان حالات میں کیا کر سکتا ہے؟

ہماری کیا حالت تھی یہ عاجز صرف یہ گزارش کرے گا کہ میری کمپنی جو پہلے ہی آدھی نفری سے لڑ رہی تھی۔ اس کی اللہ تعالیٰ نے جو مدد کی اور ہم نے جو دشمن کا نقصان کیا کہ دشمن کی دو پلٹنیں سورج غروب ہونے سے

پہلے میری کمپنی کو ختم کر کے اور قیدی بنا کر پیچھے خبر دینے کا وعدہ کر آئی تھیں کہ ایک اور بریگیڈ تیار تھا جس نے اسی رات بی آر بی کو پار کرنا تھا اور بکتر بند دستے تیار تھے جنہوں نے شالا مار باغ تک پہنچنا تھا کہ بھارتی جو اوپر والوں کو جھوٹی خبر دیتے رہے تھے کہ وہ بی آر بی کو پار کر چکے ہیں۔ اس کو فائر بندی کے وقت صحیح ثابت کرنا تھا۔ لیکن قارئین اللہ تعالیٰ کا معجزہ دیکھیں کہ 22 ستمبر کو جب روشنی ہوئی تو دشمن کی پلٹن چودہ پنجاب مجھ سے تقریباً تین چار سو گز دور اپنے زخموں کو چاٹ رہی تھی۔ اور تیسری جاٹ میرے پیچھے میری پوزیشن سے چار پانچ سو گز دور تھی۔ اگر بریگیڈیئر قیوم شیر رات کو حالات کا جائزہ ہی لے لیتا کہ بارہ پنجاب کے میجر محبوب کی کمپنی نے تیسری جاٹ کو کافی حد تک بھون کر رکھ دیا تھا اور صبح سویرے پیچھے سے ایک یا دو کمپنیاں آ کر پوری تیسری جاٹ کو قیدی بنا سکتے تھے۔ لیکن قیوم شیر کی طرف سے گول والا کو دن چڑھے یہ پیغام ملا، خبردار رہنا تمہارے پیچھے دشمن پہنچ گیا ہے۔ پیچھے نہ آنا ہم دشمن سے نپٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہ بکتر بند دستوں کے میجر نذر حسین اور فرنٹیئر فورس کے میجر غلام حسین بھی قیوم شیر کو غلط رپورٹیں دے رہے تھے کیا ہم حالات کو نہ جانتے تھے؟ لیکن ہمارے پاس کونسی سکت رہ گئی تھی کہ میری کمپنی میں کل چالیس کی نفری زندہ تھی۔ باقی شہید ہو چکے تھے یا زخمی۔ صغیر کی کمپنی کی حالت کچھ بہتر تھی کہ تقریباً 65 آدمی زندہ تھے لیکن کمپنی کا ستون صوبیدار غلام رسول شہید ہو چکا تھا۔

اب میری کمپنی دوطرفہ فائر کی زد میں تھی۔ لیکن ہم حیران تھے کہ ہم زندہ تھے اور دشمن حیران تھا کہ ہم دفاع کر رہے ہیں تو اس نے 22 ستمبر دن کے نو بجے بکتر بند اور پیدل دستوں سے میری کمپنی پر سیدھا حملہ کر دیا۔ میرے مجاہدوں نے پیدل دستوں کو تو بھون کر رکھ دیا اور وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن دس بجے کے قریب دشمن کے ٹینکوں نے میرے پوزیشن کو روند ڈالا کہ میرے پاس بکتر بند توڑ بارود ختم ہو چکا تھا۔ کیپٹن صغیر کچھ بہتر حالت میں تھا اور گول والا میرے حالات دیکھ رہا تھا اور میں نے اللہ تعالیٰ کو عرض کی ''میرے رب! کیا میرے لئے کوئی گولی نہ بنی تھی جو مجھے ٹھنڈا کر دیتی' کیا اب دشمن کی قید کی ذلت سے دو چار کرو گے؟'' تو وائرلیس پر گول والا کا سیدھا پیغام ملا۔ ''اب ہم یہاں نہیں لڑ سکتے۔ وہ اور صغیر بی آر بی پر جا رہے ہیں۔ تم بھی جن جوانوں کو ساتھ لے کر بی آر بی پر پہنچ سکتے ہو تو پہنچو۔ میں تمہیں کوئی R.V یعنی ملنے کی جگہ یہاں سے نہیں بتا سکتا کہ یہ حالت پر منحصر ہے اور کسی منظم پسپائی کا وقت کل دوپہر کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ اب اکیلے اکیلے دشمن کی قید سے بچنے کی ہر جوان کوشش کرے''۔ اس عاجز نے نوجوان لیفٹیننٹ اختر کو بلایا جو 20 ستمبر کو کاکول سے ہمارے پاس پہنچا تھا کہ جوانوں میں اعلان کر دے کہ اکیلے اکیلے نکل کر دشمن کی قید سے بچنے کی کوشش میں بی آر بی کی کسی جگہ پہنچ جاؤ اور سب سے پہلے اختر نکلا جو بی آر بی تک پہنچ تو گیا لیکن زخمی حالت میں۔ پانی میں چھلانگ لگا دی جس کی لاش ہمیں ایک ماہ کے بعد ملی کسی آبی جانور نے اس کی کوئی بوٹی تک نہ نوچی۔ بلکہ پانی بھی اتنا ''مہربان'' تھا کہ جیب میں ہمیں رپورٹ کرنے کا اس کو موو آرڈر ملا۔ اس کے حروف قائم تھے۔ (سبحان اللہ) گول والا اس کوشش میں زخمی ہو کر قید ہو گیا۔ کیپٹن صغیر شہید کی کمپنی سے صوبیدار رستم خان سمیت کوئی 24 جوانوں نے گھیرے کو توڑ لیا لیکن ہم سب لوگ کسی ایک مقام پر اکٹھے نہ ہو سکے تھے۔ صرف یہ عاجز بی کمپنی کا صوبیدار رستم اور نائک فرمان سمیت سات آدمی اکٹھے بی آر بی پر آ کر ایک جگہ اکٹھے ہو کر وہاں دفاعی پوزیشن میں ہو گئے۔ قیوم شیر محاذ پر صبح دس بجے کے قریب

پہنچا اور بغیر سوچے سمجھے پہلی بلوچ کے کیپٹن ظہور الاسلام آفریدی کی کمپنی سے دشمن پر غلط جگہ اور غلط وقت پر حملہ کر دیا کہ کیپٹن آفریدی سمیت تیس جوان شہید ہو گئے اور متعدد زخمی ہوئے اور حملہ آور سو گز پیش قدمی بھی نہ کر سکے۔ ایک وقت تھا کہ حملہ کی ضرورت بھی نہ پڑتی اور یہ کمپنی بروقت ہماری امداد کیلئے بھیج دی جاتی تو ہم بارہ پنجاب کے میجر محبوب کے ساتھ مل کر پوری بھارتی پلٹن تیسری جاٹ کو قید بھی کر لیتے اور اپنی پوزیشنوں پر قائم رہتے کہ ٹینک توڑ بارود ہمیں مل جاتا تو دشمن کے ٹینک کبھی بھی ہماری پوزیشنوں کو نہ روند سکتے۔ لیکن رب کی مرضی، شاید لاہور کے بچانے کیلئے ہمیں عظیم قربانی کیلئے بھی چن لیا گیا تھا۔

رات بارہ بجے سیز فائر کے بعد ہم نے اپنے بی ایچلان کے ساتھ ملاپ کیا۔ اور سورج چڑھتے ہی یہ عاجز اپنے صوبیدار میجر اشرف کو لے کر رات کے میدان جنگ میں پہنچ گیا۔ جہاں اپنے بالمقابل حملہ آور بھارتی بریگیڈئر نرنجن سنگھ سے ملاقات کی، کہ میں پاکستانی فوج کے قبروں کے محکمہ کا افسر ہوں۔ آپ ہمیں ہمارے شہدا اٹھانے دو اور تم اپنے مردوں کو اٹھا سکتے ہو۔ نرنجن سنگھ کہنے لگا ”کہ گول والا زخمی ہے اور ہمارا قیدی ہو چکا ہے کیپٹن صغیر کی لاش ان کے ہاں پڑی ہے۔ تم ہمارے میجر آشارام کی لاش کی تلاش میں ہماری مدد کرو اور ہاں ہمیں تمہارے قیدیوں کے ذریعے سے کافی پہلے سے معلوم ہے اور اب زیادہ پتہ چلا ہے کہ اے کمپنی کی کمانڈ میجر امیر افضل کر رہا تھا۔ وہ ہمارے گھیرے میں تھا اس کی لاش تو نہیں ملی۔“ میں نے صوبیدار میجر اشرف کو کہا کہ کیا تمہارا کوئی میجر امیر افضل تھا؟ تو ظاہر ہے اس نے ”ناں“ میں جواب دیا۔ بھارتیوں کو ایک اور غلط فہمی تھی، کہ پوری پلٹن کے ساتھ مقابلہ تھا۔ اور ان کے پریس نے بھی ہمیں کریک بٹالین آف پاکستان کا نام دیا۔ باقی دو کمپنیوں اور میرے بارے بھارتیوں کا یہ تجسس ان کے پریس اور خفیہ ذرائع میں اتنا زیادہ تھا کہ مرحوم جنرل احسان الحق ڈار جو اس زمانے میں ہماری M.I.Dte میں میجر تھے انہوں نے اپنے اوپر والوں کو بتایا کہ میجر امیر افضل بھارتیوں کیلئے تو ایک ”طلسمی شخصیت“ بنا ہوا ہے۔ بھارتی حیران تھے کہ صرف دو کمپنیوں نے ان کے بریگیڈوں کے بریگیڈ تباہ کر دیئے تھے۔ ہم بھی سولہ پنجاب کی دو کمپنیوں کی اس جنگ کا تجزیہ کریں لیکن ہمارے اوپر والے سب معاملات پر ”پردہ“ رکھنا چاہتے تھے کہ ان کی اپنی ”کوتاہیاں“ سامنے آ جاتی تھیں۔ ہمارے شہدا کے نام پر کوئی سڑک بھی موسوم نہ ہونے دی۔ اور میرے بریگیڈ کمانڈر یا ڈویژن والوں نے ہماری پرسان حالی بھی نہ کی کہ ہمارا پرانا کمانڈنگ افسر کرنل بی ایم مصطفیٰ (بعد میں جنرل) جو قصور ڈویژن میں جی ون تھا۔ ہیلی کاپٹر میں ہماری پرسان حالی کیلئے پہنچ گیا اور حالات سن کر حیران ہو گیا اور سیدھا جنرل سرفراز کے پاس پہنچ گیا اور اس کو کھری کھری سنائیں۔ کہ لاپرواہی، غیر ذمہ داری اور نااہلی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

اس کے بعد حالات اتنے تلخ اور بے کرداری یا بے ایمانیوں کے مظاہرے ہیں جو لکھتے مجھے شرم آتی ہے، البتہ اس عاجز نے ایک اور کتاب ”پاکستان اب ذوالجلال اور رسول باکمال کے عطیہ“ میں کچھ انکشافات کئے ہیں۔

لاہور کو اللہ تعالیٰ نے بچا لیا۔ اب قصور محاذ پر چلتے ہیں۔ جس میں سے جنرل حمید برہمی کے پیدل ڈویژن کے صاحب داد کے بریگیڈ کا ذکر کر چکے ہیں کہ۔ اس کو چھمب چوڑیاں، جموں، پٹھانکوٹ والے راستے ”دہلی فتح“ کرنے کیلئے بھیجا گیا تھا کہ بھارتیوں نے پاکستان پر حملہ کر دیا تو وہ بریگیڈ بڑی مشکل سے اپنی ذمہ داری

والی جگہ پہنچا۔ لیکن دشمن کے روہیوال پر حملہ کو ہماری سات پنجاب نے تتر بتر کر دیا تھا۔ بکتر بند ڈویژن کے پاس صرف ایک بریگیڈ پیدل فوج باقی رہ گئی تھی۔ بکتر بند کا کمانڈر جنرل نصیر مرحوم، راقم کا ذاتی دوست رہا۔ لیکن وہ اس کمانڈ کا اہل نہ تھا اس کے دو بریگیڈیئروں بشیر اور بریگیڈئر لمب (اینگلو انڈین) نے بھی بڑی نااہلیوں کا مظاہرہ کیا۔ بریگیڈیئر احسن رشید شامی شہید نے بریگیڈیئر بشیر کو منہ پر کھری کھری سنائیں اور شرطیہ طور پر دونوں محاذ پر آگے نکلے۔ شامی نے شرط پوری کی اور شہادت بھی حاصل کی اور بشیر فرار ہوگیا۔ جنرل نصیر، بریگیڈیئر بشیر اور بریگیڈیئر لمب کو جنگ کے فوراً بعد فوج سے فارغ کر دیا گیا تھا کہ وہ بہت نااہل ثابت ہوئے تھے۔ یہ بہت افسوسناک صورتحال تھی کہ ہمارے بکتر بند دستوں کے نوجوان رہنما اور باقی جوان، ہر قسم کی قربانی کیلئے تیار تھے لیکن ان کے اوپر والے ایسے لوگ تھے، بہر حال بیچ میں میرے رفیق خاص کرنل صاحبزادہ گل جیسے اسلام کے عظیم فرزند بھی تھے۔ اور میرے اس عظیم رفیق کے چھٹے لانسر نے ہراول کا کام کرنا تھا لیکن ان کو "لانچ" کرنے میں دیر کر دی گئی کہ وہاں قصور محاذ پر جنرل نصیر اور پیدل فوج کے جنرل حمید میں کوئی "ہم آہنگی" نہ تھی۔ حمید سینئر تھا۔ لیکن نصیر اس کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ تو جی ایچ کیو سے جنرل ملک شیر بہادر کو بھیجنا پڑ گیا کہ دونوں میں "ہم آہنگی" پیدا کر کے ہماری "جارحانہ کارروائی" کی بسم اللہ کی جائے۔ لیکن بعد میں یہ ہم آہنگی بھی قائم نہ رکھی گئی۔ کہ جنرل حمید کے پیدل دستے جو مدد کر سکتے تھے۔ انہوں نے وہ بھی نہ کی۔

کارروائی کی بسم اللہ کو صاحبزادہ گل نے کھیم کرن پر جلد قبضہ کر کے وہ عروج عطا کر دیا کہ ان کی کامیاب پیش قدمی اور ہمارے لاہور کے جوابی حملہ نے ایک دفعہ تو بھارتی جنرل چودھری کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔ اور اس نے اپنی فوجوں کی دریائے بیاس تک پسپائی کی تیاری کے احکام بھی دے دیئے تھے کہ قصور محاذ سے پیش قدمی کرنے والوں کے دائیں بازو کی حفاظت دریائے ستلج کر رہا تھا۔ اور تنگ محاذ پر ہمارے بہتر ہتھیاروں کی برتری اور تھوڑی فوج سے امرتسر پہنچنا بالکل آسان تھا لیکن فطرت کی ہم نے "ضرورتیں" پوری نہ کی تھیں کہ ہماری بے دین قیادت کے سر پر اسلام کی سربلندی کے سہرے کیسے بندھنے تھے؟ لاہور محاذ میں جنگ کے دوران اس عاجز پر اس سلسلہ میں جو انکشافات ہوئے اور میری دنیا تبدیل ہوگئی اور میں نے اپنے ان "مشاہدات" پر ابھی پردہ رکھا ہوا ہے آہستہ آہستہ کچھ حالات ظاہر کر رہا ہوں کہ میں صرف اکیلے لاہور کے محاذ کو "بصارت" سے نہ دیکھ رہا تھا۔ جو کچھ قصور محاذ میں ہو رہا تھا یا سیالکوٹ اور چھمب جوڑیاں میں، اس کی جھلکیں بھی کبھی کبھی بصیرت کے طور پر نظر آ جاتی تھیں کہ قصور محاذ پر میرے عظیم رفیق صاحبزادہ گل اور ان ہی کی یونٹ کے میجر دوست محمد کی شہادت کی خوشبو ایک طرف اور اس المیہ پر پژمردگی نے مجھے چونکا دیا تھا۔

گزارش ہو چکی ہے کہ روہی نالہ پر صرف ایک پل تھا جس سے یہ پیش قدمی کرنا تھی۔ پل سے میجر دوست محمد کا ٹینک ٹکرا گیا۔ دوست محمد بھی شہید ہوگیا اور پل بھی ناکارہ ہوگیا کہ صاحبزادہ گل کی سپلائی لائن کٹ گئی۔ اس کا بریگیڈ کمانڈ پل کو بھی صبح وقت پر تیار نہ کرا سکا۔ صاحبزادہ گل کو محاذ سے واپس آنا پڑا اور اپنی امداد لے کر کھیم کرن سے آگے ایک اور بھرپور حملہ میں بڑی کامیابی حاصل کی لیکن خود اپنی جان بھی رب کی ذات کے حوالے کرنا پڑ گئی۔ صاحبزادہ گل جس کو ہم بچپن میں "سبزی" کہتے تھے اس کی "ہریالی" ختم ہوئی تو اس کا بکتر بند بریگیڈ بھی

رک گیا اور دوسرے بریگیڈ کو آگے نکالا جس میں ایک غیرتمند ہمارا رفیق کرنل نذیر احمد تھا اور اس نے پیش قدمی جاری رکھی لیکن اس کے ٹینکوں کا پٹرول ختم ہوگیا اور اس نے اپنے بریگیڈئر لمب سے سخت شکایت کی تو لمب نے وائرلیس پر اس کو طعنہ دیا کہ امن کے زمانے کے تمہارے اونچے بول کہاں گئے تو نذیر کو سخت غصہ آیا۔ اس نے وہاں تک پہنچے ہوئے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ گاڑیوں اور ٹینکوں سے اترو اور پیدل فوج کی طرح دشمن پر حملہ کردیا اور بڑی کامیابی حاصل ہوئی لیکن خود زخمی ہوا اور قیدی ہوا۔

صاحبزادہ گل کی شہادت اور نذیر احمد کی غیرت نے بکتر بند دستوں میں نئی جان ڈال دی تھی اور وہ مرنے مارنے پر تیار ہو کر پیش قدمی کو بھرپور طور پر جاری رکھنا چاہتے تھے کہ دشمن نے نہریں توڑ کر علاقے کو پانی پانی کر دیا۔ دشمن کی ایسی کارروائی اوپر والوں کے ذہن میں تھی اور الطاف گوہر کی کتاب کے مطابق جب بھارتیوں نے ''پانی'' چھوڑ دیا تو ایوب خان نے دل ''چھوڑ'' دیا کہ وہ فائر بندی پر تیار ہوگیا جس کو وہ پہلے ٹالتا رہا تھا کہ اس کو کامیابیوں کی امید تھی۔ قارئین! اس المیہ کا حقیقی جائزہ یہ ہے کہ ایوب خان نے حالات کو صحیح سمجھا۔ اگر بکتر بند دستوں کے ساتھ پورا پیدل ڈویژن موجود ہوتا تو یہاں پیدل دستوں کی مدد سے پیش قدمی جاری رکھی جاسکتی تھی لیکن جنرل حمید کے پیدل دستوں کی مدد کے بارے سوچا نہ گیا تھا۔ حمید خود وقت گزار رہا تھا اور باہمی حسد کی وجہ سے اُس نے بکتر بند دستوں کی مدد نہ کی کہ دشمن اُس کے سامنے سے فرار کر گیا تھا۔ اور اُس کے پیدل دستے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھتے تھے اور ہم اسی لئے شروع سے دو پیدل ڈویژنوں کی ''ضرورت'' پر بھی زور دیتے آرہے ہیں لیکن یہاں ہماری نااہل فوجی کمانڈ جس میں ایوب خان اور محمد موسیٰ دونوں شامل ہیں' یحییٰ خان کو ''پانچوں سواروں'' میں شامل کرنے کیلئے اس محاذ پر پیدل دستوں کو ''ایسی تیسی'' کر دی تھی اور وہ ذکر چھمب محاذ کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ اب قصور محاذ پر دفاعی لڑائی ہی لڑی جاسکتی تھی۔ لاہور محاذ پر ہمیں بھی دفاعی لڑائی کیلئے واہگہ سے واپس لائے تھے جس کو کچھ ''حرکت'' میں ضرور رکھنا چاہئے تھا ورنہ وہ کچھ ہوتا ہے کہ ہم نے عظیم قربانی دیکر لاہور کو بچایا کہ لاہور محاذ کو ''ساکن'' کر دیا گیا تھا۔ اور یہ بڑی غلط بات تھی کہ ہماری سولہ پنجاب کی دو کمپنیوں سے سارے واگھہ محاذ کا دفاع کرایا جا رہا تھا۔

7۔ جنرل ایوب خان دل چھوڑ چکے تھے

بہر حال ہماری ہائی کمانڈ نے حالات کے مطابق ایک صحیح فیصلہ کیا کہ جنرل نصیر کو کمانڈ سے ہٹا کر بکتر بند دستوں کی کمانڈ صاحبزادہ یعقوب کو دی جو ویسے تو نصیر سے بھی گیا گزرا ہوا تھا لیکن اس کا نام تھا اور عزت تھی اور اس کو ''استعمال'' کیا۔ قصور محاذ پر ایک بکتر بند بریگیڈ کو جنرل حمید کے پیدل ڈویژن کی مدد کیلئے چھوڑا اور بکتر بند ڈویژن کے باقی حصّہ کو لے کر صاحبزادہ یعقوب کو سیالکوٹ محاذ پر جلد پہنچنے کا حکم دیا۔ جس محاذ کی کمزوری کو یہ عاجز پہلے بیان کر چکا ہے اور اب وہاں بھارت کا حملہ بھی بھرپور تھا لیکن راستے میں لاہور محاذ سے جب بکتر بند دستے والے گزرنے لگے تو وہاں کی فوجی قیادت پر ''دشمن کے تین ٹینکوں'' کے ہمارے اندر ''گھس'' جانے کی خبر سوار تھی اور انہوں نے جی ایچ کیو تک اور ایوب۔ خان کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا تو بکتر بند دستوں میں سے ایک بریگیڈ کو لاہور کے گردونواح میں عارضی طور پر روک دیا فوجی فراست' مومن کی فراست کی طرح ایک عظیم ملکہ اور اللہ تعالیٰ کی دین

ہے اور گو یہ ملکہ مومن کی فراست کے سامنے تو ہیچ ہے لیکن غیروں نے بھی اس ملکہ کی مدد سے دنیا فتح کر ڈالی۔ ہم اول زور پھر بھی مومن کی فراست پر دیں گے لیکن خدارا ہمارے فوجی لوگ اس فوجی فراست کے ملکہ اور جنگ کی ''نبض شناسی'' کے ملکہ کو فوجی تربیت کا حصہ بنائیں۔ مجھے اپنے ملک کی فوج میں فوجی فراست والے چند لوگ ضرور نظر آتے ہیں جن میں جنرل اکبر خان طارق، بریگیڈیئر صدیق سی، کرنل حسن مرزا وغیرہ کو تو سازش کے مقدمہ میں دھر لیا گیا تھا لیکن متعدد اور صاحبان بھی تھے۔ بریگیڈیئر نوشیروان، کرنل شیر محمد اور کرنل حفیظ آفریدی وغیرہ بھی تھے لیکن افسوس ہم نے ان کی فراستوں کا فائدہ نہ اٹھایا اور چند ایک ستمبر 65ء کی جنگ میں بھی تھے جن کی کارروائیوں کی جھلکیاں یہ عاجز دیتا آ رہا ہے لیکن فطرت نے ان میں سے زیادہ تعداد کو سیالکوٹ کے محاذ پر اکٹھا کر دیا تھا۔

سیالکوٹ محاذ ہمارے کمزور ترین دفاع کا حامل تھا۔ ایک اکیلا ڈویژن سینکڑوں میل کا دفاع کر رہا تھا کہ ایک بریگیڈ سیالکوٹ، جموں اور سیالکوٹ ہیڈ مرالہ کے لمبے چوڑے علاقے کا دفاع کر رہا تھا اور ایک بریگیڈ پسرور کے علاقہ میں جسٹر پل کے علاقہ میں دفاع کر رہا تھا۔ تیسرا بریگیڈ ریزرو بھی تھا اور درمیان کے کئی میلوں کے لمبے چوڑے علاقہ کا دفاع کر رہا تھا جس کا نمبر 24 تھا۔ ڈویژن کمانڈر غیر لڑا کا فوجی کا بریگیڈیئر اسمٰعیل تھا۔ جو لوگ ویسے بھی خاندانی طور پر صرف ''ادبیانہ اخلاق'' کیلئے مشہور ہیں کہ دل کے مضبوط لوگ نہیں اور فوج میں ان کو لڑا کا فوج میں تو بھرتی ہی نہ کیا جاتا تھا۔ اختر ملک اگر چھمب جوڑیاں کی بجائے حملہ جموں پٹھانکوٹ روڈ پر کرتا۔ تو ہم بہت کامیابیاں حاصل کر سکتے تھے۔ بہرحال ہم گزارش کر چکے ہیں کہ چھ ستمبر صبح پو پھٹتے گوربخش سنگھ کی کور نے جسٹر پل پر حملہ کر دیا جس کو ہماری تیسری پنجاب پلٹن نے پسپا کر دیا تھا اور سیالکوٹ کے سامنے سچیت گڑھ محاذ نہ صرف ''خاموش'' تھا بلکہ وہ لوگ لڑائی کے بارے میں بھی ''بے خبر'' تھے۔ جسٹر پر حملہ کے واقعات سے ہمارا وہاں کا بریگیڈیئر مظفر الدین بہت زیادہ گھبرا گیا اور دشمن کے مزید حملوں سے ڈر کے اس نے ڈویژن والوں سے مدد مانگ لی تو انہوں نے 24 بریگیڈ جو ریزرو میں تھا اس کو مظفر الدین کی مدد کیلئے بھیج دیا لیکن انہی دنوں ہمیں معلوم ہو گیا کہ جسٹر کے سامنے تو دشمن کا ایک بریگیڈ بھی نہیں ہے اور وہاں پر حملہ بھارتیوں کے جارحانہ جذبہ دکھانے کیلئے کیا تھا اور دشمن کا بکتر بند ڈویژن اور دو پیدل ڈویژن سانبہ کے علاقے سے پاکستان پر بھرپور حملے کیلئے وزیر آباد تک پیش قدمی کیلئے حرکت میں آ چکے ہیں۔ کرنل سید غفار مہدی کرنل سٹاف کب سے اوپر والوں کو بتا رہا تھا کہ وہ حقیقت پسند بنیں۔ اب تو اس نے اوپر والوں کو کھری کھری سنائیں کہ بہرحال سیالکوٹ میں جو کچھ ہونے والا تھا اس نے ڈویژن کمانڈر کو ''حواس باختہ'' کر دیا اور اوپر والوں کو عقل آ گئی۔ انہوں نے جلدی سے جنرل ٹکا خان کو وہاں بھیج دیا۔ غفار مہدی پہلے ہی کچھ صحیح فیصلے کر چکے تھے۔ انہوں نے 24 بریگیڈ کو پسرور سے واپس بلا لیا کہ پرانی ذمہ داری والی جگہ پر واپس آئیں اور کرنل نثار بعد میں بریگیڈیئر کے بکتر بند دستوں کو حکم دیا کہ وہ سیالکوٹ اور چونڈہ کے درمیان حرکتی دفاع سے دشمن کو تلاش کر کے جو دشمن ملے اس کو تباہ و برباد کریں اور ان اعمال یا کارروائی پر عمل کرانے کیلئے جنرل ٹکا خان سیالکوٹ پہنچ گیا۔

قارئین! یہ دونوں کارروائیاں ایک معجزہ ثابت ہوئیں۔ 24 بریگیڈ کا کمانڈر تو اختر ملک کا چھوٹا بھائی عبدالعلی تھا اور اس بریگیڈ کی کارروائیوں کے سارے سہرے اس کو باندھ دیئے گئے ہیں لیکن اصلی بات یہ تھی کہ

بریگیڈ کی تینوں پلٹنوں کے کمانڈر رب کی ذات نے چن کر وہاں اکٹھے کر دیئے تھے۔ پنجاب پلٹن کے کرنل جمشید (بعد میں جنرل)، بلوچ پلٹن کے کرنل شنواری (بعد میں بریگیڈئر) فرنٹیر فورس کے کرنل صدیق فقیر کا نام ہماری اس جنگ میں سنہری الفاظ میں لکھا ہوا ہے کہ گو دشمن کا پہلا ٹکراؤ ہمارے میجر اعجاز بعد میں کرنل اور کیپٹن نصیر بعد میں میجر جنرل کے چھوٹے دیکھ بھال والے دستوں کے ساتھ ہوا اور ان دستوں نے دشمن کو منہ توڑ جواب دیا لیکن معجزہ یہ ہوا کہ 24 بریگیڈ کی یونٹیں جب حرکت میں تھیں تو ان کا پیش قدمی کرنے والے دشمن کے ساتھ ٹکراؤ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ہمارے آقا ﷺ کی سنت کے مطابق ''حرکتی دفاع'' بنا دیا اور دشمن کے ہراول کے دستے ایسے پاش پاش ہو کر پسپا ہوئے کہ کرنل جمشید اور میجر محمد حسین ملک نے ان کا دور دور تک تعاقب بھی کیا۔ بکتر بند دستوں کا کرنل نثار بعد میں بریگیڈیئر بھی اللہ والا تھا۔ وہ جو دوسری طرف سے دشمن کی تلاش میں نکلے تو ان کی پیٹن (Patton) ٹینکوں نے جو بہتر ٹینک تھے انہوں نے بھارتی شرمن ٹینکوں کو تہس نہس کر دیا اور بھارتی گھبرا کر پسپا ہونا شروع ہو گئے اور وہ لوگ یہ سمجھے کہ پاکستان کا پہلا بکتر ڈویژن سیالکوٹ میں موجود تھا یا اب پہنچ گیا ہے۔

بھارتی خفیہ والوں کی رپورٹ کے مطابق پاکستان کے پاس امریکی امداد کے طور پر جو پیٹن ٹینک تھے وہ اتنے کم تھے کہ ایسے ٹینک صرف پہلے بکتر بند ڈویژن کی یونٹوں کے پاس تھے۔ پیدل ڈویژن کے ساتھ جو بکتر بند یونٹ ہوتی تھی اس کے پاس شرمن ٹینک ہوتے تھے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے کرنل نثار اور ان کے مجاہدوں کو دشمن پر مزید فتح دیدی لیکن کسی ایک آدھ کامیابی سے دشمن کی پیش قدمی کو روکا نہ جا سکتا تھا۔ خیر یہ تو اللہ تعالیٰ نے بڑی مہربانی کی کہ چوتھی کور کا توپخانہ جو چھمب جوڑیاں گیا ہوا تھا' وہ اپنے بریگیڈیئر امجد چوہدری کے تحت سیالکوٹ کے دفاع کیلئے واپس آ گیا جس کا اصلی آدمی ہمارا پرانا رفیق مرحوم کرنل عطا محمد (بعد میں بریگیڈئر اور پنجاب میں ضیاء الحق کے زمانے کا بندوبستی وزیر) تھا اور توپخانے والوں میں کئی اسلام کے عظیم فرزندوں کرنل عبدالرحمٰن شہید اور میجر بعد میں کرنل رشید احمد نے جس صحیح بمباری سے دشمن کی پیش قدمی کو تتر بتر کیا اور معجزات کا کوئی حساب نہیں کہ ہوائی جہاز سے رابطوں کا کام پنجاب رجمنٹ کا میجر (بعد میں کرنل) عبدالرؤف جانتا تھا اور وہ ہسپتال میں بیمار تھا لیکن وہ بھی بیماری کی حالت میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا کہ وہ بیٹھ کر ہوائی جہازوں کے ساتھ پیغام رسانی اور رہنمائی کا کام تو کر سکتا ہے اور آگے جا کر خود آنکھوں سے دیکھ کر جس طرح میجر رؤف دشمن کی پیش قدمی کو تتر بتر کراتا رہا یا دشمن میں تباہی پھیلائی اس کا کوئی حساب نہیں۔

لیکن ایک اکیلا نمبر 24 بریگیڈ سارے علاقے کا دفاع کیسے کرتا؟ یہ عاجز تینوں پلٹنوں کے مجاہدوں کو سلام کرتا ہے کہ یہ عاجز اختصار کی وجہ سے ان کی بہادریوں کی تفصیل میں نہیں جا رہا کہ ان کی مدد کیلئے ہمارا چھوٹا سا (ایک بریگیڈ کے برابر) چھٹا بکتر بند ڈویژن بھی چھمب جوڑیاں سے اپنی بکتر بند اور حرکتی پیدل دستے نکال کر بریگیڈ نمبر 24 کی امداد کیلئے عین اس وقت پہنچ گیا کہ دشمن نے زبردست حملہ کر کے اس بریگیڈ کی حرکت کو ختم کر کے ان کو دفاعی لڑائی لڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور دشمن کے دستے ان کے بازو اور چونڈہ کے علاقہ سے آگے نکل کر ڈسکہ اور سمبڑیال کیلئے پیش قدمی کیلئے پر تول رہے تھے۔ چھٹے بکتر بند ڈویژن کے کمانڈر میجر جنرل ابرار کا تعلق پیدل فوجوں کے ساتھ تھا اور ان کو بکتر بند کے ایک ''نامی قسم کا'' بریگیڈئر آفندی مشیر کے طور پر دیا گیا تھا۔ اس

نے جو کچھ اور جس ٹامی انگریزی کے لہجہ میں ابرار کو مشورہ دیا' اس کا صحیح اردو ترجمہ مشکل ہے۔ الفاظ کچھ اس طرح تھے ''ابرار۔ تم یہاں لڑائی نہیں لڑ سکتا۔ میں نے افریقہ میں ٹینکوں کی لڑائی میں حصہ لیا ہے۔ تم تو دوسری جنگ عظیم میں جاپان کا جنگی قیدی تھا۔ تم یہاں سے بھاگو اور سمبڑیال کے پاس مرالہ نہر کے پیچھے سے اس طرح لڑائی لڑو جیسے لاہور محاذ والے بی آر بی کے پیچھے سے لڑ رہے ہیں'' جنرل ابرار نے کہا ''آفندی تمہاری مشاورت ختم۔ میں ادھر چونڈہ ہی میں لڑائی لڑوں گا' تم جا کر سمبڑیال کے ڈاک بنگلہ میں آرام کرو''۔

چونڈہ کی لڑائی سیدھی اور کھلی لڑائی تھی۔ اس لڑائی سے پہلے بھی میرے ایک عظیم رفیق مرحوم میجر (بعد میں بریگیڈیئر) اکابر حسین نے دشمن کو خوب تہس نہس کیا اور میجر (بعد میں کرنل) رشید احمد کیانی نے اپنے کرنل عبدالرحمٰن کی شہادت کے بعد اپنی توپخانہ کی یونٹ سے جس طرح دشمن کو روکا۔ یہ ہماری عسکری تاریخ کے سنہری ابواب ہیں۔ بکتر بند کے عظیم سپوتوں میں سے اور خاص کر اپنے رفقا میں سے بچہ بچہ کی بہادری سے آگاہ ہوں خواہ یہ گائیڈ رسالہ کا میجر عباسی شہید تھا یا میرے عظیم دوست کرنل عبداللہ شاہ کا نوجوان فرزند یا 19 لانسرز کا کیپٹن مسعود کیانی شہید جو علامہ اقبال کے شیدا راجہ حسن اختر کا فرزند تھا اور نوائے وقت کے مشہور قلمکار ظہور اختر کا چھوٹا بھائی اور بلوچ پلٹن کے میجر نسیم رضوی۔ یہ صرف میرے ساتھی ہی اور ماتحت نہ تھے جنہوں نے لاہور کی زمین کو اپنے خون کے ساتھ سینچا اور اللہ تعالیٰ کے راستے پر قربانی دی۔ میرے رفقا نے جگہ جگہ بہادری کے مظاہرے کئے کہ میری دوستی کا اصول ''حب للہ اور بغض للہ ہے'' اور اللہ تعالیٰ والے ہر میدان میں سرخرو ہوتے ہیں۔

وہی ہے بندہ حر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری!
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انہیں کی خاک میں ہے وہ چنگاری

چونڈہ کی لڑائی پر کوئی پردہ نہ رکھا جا سکتا تھا اور جھوٹ بھی زیادہ نہ بولے گئے سوائے بریگیڈیئر عبدالعلی ملک قادیانی کی بہادری کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا۔ اس عبدالعلی نے کشمیر 1948ء کے جہاد میں جو غداری کر کے ''ریچھ'' اور فیڈک کی پہاڑیوں سے فرار اختیار کیا تھا اس کی سزا ہم آج تک بھگت رہے ہیں ورنہ بھارت کشمیر کے اتنے وسیع علاقوں پر قبضہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ کہانی کشمیر کی کوتاہیوں اور غداریوں کے ساتھ بیان کی جا سکتی ہے۔ تو بہر حال میں یہ کہوں گا کہ چونڈہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھ رہا کہ بہت کچھ اخباروں میں آ چکا ہے کہ دشمن کے حملہ کو روک دیا گیا اور 14 ستمبر کو صاحبزادہ یعقوب بھی پہلے بکتر بند کے دو بریگیڈوں کے ساتھ اس محاذ پر پہنچ گیا اور جو پلٹنیں نئی کھڑی کی گئی تھیں وہ بھی محاذ پر پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ اب بھارتی فوجوں یا بکتر بند اور دونوں پیدل ڈویژنوں کو تہس نہس کر کے جموں' کٹھوعہ روڈ پر قبضہ کرنا بالکل آسان تھا اور یہ کچھ کر کے اگر فائر بندی کرتے تو تاشقند میں بہت کچھ حاصل کرتے اور لڑائی جاری رکھی جا سکتی تھی اور صاحبزادہ صاحب کو ایسی پیش قدمی کی تجویز بنانے کیلئے بھی کہا گیا جو انہوں نے دیر سے 19 ستمبر کو اوپر بھیجی اور ساتھ ہی سفارش کی کہ اب فائر بندی ہو رہی ہے تو بہتر ہے اس تجویز پر عمل نہ کیا جائے۔ ایوب خان پہلے ہی ''دل چھوڑ'' چکا تھا۔

میں صاحبزادہ صاحب کو 1946ء سے جانتا ہوں اور اس کو بہت نزدیک سے دیکھا۔ اس آدمی نے جس طرح ''زبان دانی'' کا لبادہ اوڑھ کر اور مغربی تہذیب کو اپنا کر اپنی شخصیت بنا رکھی ہے اور پاکستان کے دشمنوں کا کھلونا بن کر ہمارا نقصان کیا ہے میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ رب کی ذات پاک نے اس کو اتنی لمبی رسی کیوں دی ہے۔ ہر سلطانی پارٹی کا وہ ''مشیر'' رہتا ہے اور ہمیں اہل مغرب کا غلام بنایا ہوا ہے۔ بہر حال سیالکوٹ تو بچ گیا لیکن ہماری کوتاہیوں کی وجہ سے یہاں برتر طاقت ہوتے ہوئے ہم بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن افسوس صاحبزادہ یعقوب کی کم دلی اور بریگیڈیئر عبدالعلی کے غلط مشورہ کی وجہ سے بھارتی فوجی مشینری تباہی سے بچ گئی جس کو ہم جموں پٹھانکوٹ روڈ پر تہس نہس کر سکتے تھے۔ اور کشمیر کو حاصل کرنے کا ہم نے ایک نادر موقع کھو دیا۔ تو چلئے اب سب سے پہلے کھولے گئے چھمب جوڑیاں کے محاذ کی طرف واپس جا کر ستمبر 65ء کی جنگ کو اختتام تک پہنچاتے ہیں۔

زمینی لحاظ سے اور تزویرات کے لحاظ سے چھمب جوڑیاں کے علاقے کا اس کارروائی کیلئے استعمال صحیح نہ تھا۔ ایسے کام کیلئے بہتر جگہ جموں، کٹھوعہ روڈ یعنی شکرگڑھ کے بالمقابل سانبہ کا علاقہ تھا اور بہت تھوڑی فوج سے وہاں بہت اچھے نتائج حاصل کئے جا سکتے تھے اور وقت بھی بڑا موزوں تھا کہ بھارتی بکتر بند ڈویژن اس زمانے میں وہاں ''اجتماع'' کر رہا تھا اور وہ ''بیٹھا بٹھایا'' ہمارے جال میں پھنس جاتا۔ چھمب جوڑیاں میں محدود کامیابی حاصل ہو سکتی تھی جو ہوئی لیکن راقم اس کو ''سازش'' کہے گا کہ اسی جگہ سے تھوڑا دور کالی دھر پہاڑی کے نزدیک بھوٹ اور بھمبر کے علاقوں میں دسمبر 1948ء میں ایک ایسا ہی ''ڈرامہ'' رچایا گیا تھا۔ جس سازش میں یہ عاجز بھی اپنی لاعلمی کی وجہ سے ایک ''اہم ایکٹر'' تھا کہ بریگیڈئر بعد میں میجر جنرل شیر علی کا میں انٹیلی جنس افسر تھا جو اس ڈرامے کا بڑا ایکٹر تھا جنوری 1949ء میں فائر بندی کر کے جہاد کو جمود دیا گیا۔ یہ ڈرامہ بریگیڈئر شیر علی سے ہمارے انگریز جنرلوں نے کرایا تھا جس کی تفصیل یہ عاجز جموں وکشمیر کے جہاد کی غداریوں اور کوتاہیوں کے بیانات کے ساتھ لکھے گا تو کشمیر میں گوریلا کارروائی کے طریقہ کا مشورہ بھی بھٹو اور اختر ملک کو اینگلو امریکن بلاک کے ''دانشوروں'' نے دیا تھا اور چھمب جوڑیاں کی کارروائی کا طریقہ بھی انہی لوگوں نے اختر ملک کو سمجھایا ہو گا کہ یہاں کچھ زیادہ حاصل بھی نہ ہو گا اور بھارت اور پاکستان میں جنگ شروع ہو جائے گی۔ نوابزادہ شیر علی اور صاحبزادہ یعقوب خالہ زاد بھائی ہیں۔ پاکستان کے شہری بن جانے کے باوجود ان کے دلوں میں بھارت کیلئے ایک ''نرم گوشہ'' موجود رہتا ہے۔ کہ وہ چاہتے رہے کہ ہم بھارت کے ''چھوٹے بھائی'' بن کر گزارا کریں۔ یہی بہت بڑا المیہ ہے کہ ہمارے ملک میں سینکڑوں اُن کے ''ہم خیال'' ہیں۔ اور ایم کیو ایم کے الطاف آج کل اس نظریہ کے بڑے رہنما ہیں۔

چھمب جوڑیاں کی زمین سے پیش قدمی کا راستہ ایک ''قیف'' (Funnel) کی طرح تھا کہ آگے زمین تنگ ہو جاتی تھی اور ہماری نااہل فوجی قیادت نے یہاں سے کچھ حاصل کرنے کی غلط امید لگائی اور یحیٰی خان اکھنور کو فتح کرنا تو دور تھا اکھنور۔ نوشہرہ سڑک کو بھی نہ کاٹ سکا اور چار بریگیڈ یا بارہ پلٹنیں خواہ مخواہ اس محاذ پر دشمن کے ساتھ ''بندھ گئیں'' جو کسی اور جگہ بہتر طور پر استعمال ہو سکتی تھیں۔ اس کارروائی کی شروع کی کامیابی کہ دشمن کی ایک پوری توپخانہ یونٹ پر قبضہ کیا۔ میرے جاننے والوں میجر شاہ نواز شہید، کرنل صدیق رانگھڑ اور میرے پرانے گروپ

کو دو پلٹنوں 13 پنجاب اور 14 پنجاب یا بکتر بند دستوں اور میرے دوستوں میجر محمد شیر اور میجر سرور وغیرہ لوگوں نے جو بہادریاں دکھائیں، ہماری عسکری تاریخ میں سنہری الفاظ میں لکھی پڑی ہیں لیکن ہمارا کوئی مقصد حاصل نہ ہو سکا کہ بھارت نے سارے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا۔

پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے کہ رب کی ذات پاک نے ہمیں بچا تو لیا لیکن جو کچھ ہم حاصل کر سکتے تھے اس کیلئے تیاری نہ کی تو کچھ حاصل نہ کر سکے اور قوم کو خوب بیوقوف بنایا کہ یہ جنگ ہماری فتح تھی اور ریڈیو اور ٹی وی سے تکبرانہ گانے گائے کہ ''جنگ کھیڈ نہیں ہوندی زنانیاں دی'' اور بھارت کو طعنے دیئے لیکن آنے والے وقت کیلئے تیار نہ ہوئے کہ اپنی غلطیوں کا تجزیہ نہ کیا۔

بھٹو اور وزارت خارجہ نے فوج کو خوب بیوقوف بنایا لیکن جنگ کے دوران ہی ''مکر'' گئے کہ انہوں نے اتنی تسلی تو نہ دی تھی۔ کہنے لگے دفاع والوں کو اپنا دفاع کرنا چاہیئے تھا۔ بھٹو نے سیکورٹی کونسل میں بھی مداری والے تماشے کیئے اور ''رونے'' کا ڈرامہ رچایا۔ ایک ''ہزار سال'' لڑائی لڑنے کے فلسفہ کے اعلان سے قوم کو خوب بیوقوف بنایا۔ جنگ نے ایوب کو ادھ موا کر دیا۔ اس نے کہا ''میری توبہ'' لیکن اصلی چیز کی طرف نہ آیا کہ عشق بلاخیز کا قافلہ تو قوم میں موجود ہے۔ حاضر و موجود سے بیزار کرنے والے رہنما موجود نہیں۔ اس جنگ نے ہمیں ''ننگا'' کر دیا کہ مشرقی پاکستان کے دفاع کیلئے مغربی پاکستان کی جارحانہ حرکت سے دہلی کیلئے کوئی خطرہ نہ پیدا کر سکے۔ کشمیر اور بھارت کے درمیان سپلائی کے ذرائع کو کاٹ کر کوئی خلل نہ پیدا کر سکے۔

اینگلو امریکن بلاک کی مسلمانوں کے خلاف سازش نے آدھی کامیابی حاصل کر لی۔ گو اس وقت ڈنکن سنڈے کی خواہش کے مطابق مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان سے نہ کاٹا جا سکا لیکن چھ سال بعد ایسا کر لیا گیا اور اسی جاری سازش کے بارے اس عاجز نے جنرل یحییٰ خان اور اس کے حواریوں کو ستمبر 1970ء میں بھی تنبیہہ کی اور جنرل نیازی اور جنرل رحیم کو ڈھاکہ کے مقام پر اگست 1971ء تنبیہہ کی کہ مشرقی پاکستان میں عزت بچانے کی کوشش کریں۔ لیکن ہم نے دسمبر 1971ء میں پاکستان کو دولخت کرانے والے ذوالفقار بھٹو کو اپنا رہنما بنا لیا اور بے نظیر کو اب بھی کچھ لوگ قوم کی ''تقدیر'' سمجھتے ہیں۔

اے لاالہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتار دلبرانہ کردار قاہرانہ





دوسرا سلسلہ

تحریکِ پاکستان کے دِنوں میں
ہر مُسلم لیگی مجھے فرشتہ لگتا تھا

تحریکِ پاکستان کے دِنوں میں ہر مُسلم لیگی مجھے فرشتہ لگتا تھا

یہ کچھ تو 14 اگست 1947ء کو ظاہر ہو گیا تھا کہ چودہ سو سالوں کے بعد پہلی دفعہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ کے نام پر اس جہاں دنیا یا عالم خلق میں ایک خطہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وجود میں آنے کا دن اتفاقاً ماہ رمضان کے جمعہ کا دن بھی تھا اور لیلۃ القدر اور لیلۃ المبارکہ کے سلسلہ میں کافی اہل نظر لوگوں کا خیال ہے کہ اسی رات ظاہر ہوئی لیکن دنیا میں اسلام کے آمد یا عظمت سے عروج کی کوئی ہل چل نہ مچی اور آج تک اس مملکت میں اسلام بھی پورے طور پر نافذ نہ ہوا اور جو لوگ اسلام کی آمد کے لئے بڑے پر امید تھے لیکن ان میں سے کچھ ''مایوس'' ہونے کے بعد اب عالم امر میں پہنچ چکے ہیں۔ یہ عاجز جب کبھی بڑھاپے کی تکالیف کو برداشت نہیں کر سکتا یا ویسے مایوس ہو جاتا ہے تو غیبی آواز آتی ہے کہ تمہیں لگاتار ہدایت مل رہی ہے۔

''جاتا ہے جدھر بندہ حق تو بھی ادھر جا''

اصلی بات اور زندگی کا بڑا راز یہ ہے کہ انسان صراط مستقیم پر رواں دواں رہے۔ اور انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ان کو دوزخ کی آگ سے بچایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کئی طرح سے امتحان جاری رکھتا ہے۔ مشکلات سے بھی گزارتا ہے۔ فتوحات بھی دیتا ہے۔ اس کے ہاں نہ دیر ہے نہ اندھیر' ساری بات سعادت کی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سعادت ہمیشہ اہلِ حق کو عطا فرماتا ہے۔ حضور پاک ﷺ کی بعثت اللہ تعالیٰ کے گھر میں ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ کے گھر میں حق کے بول کو بالا کرنے کے لئے اُن ﷺ کو کن مراحل سے گزرنا پڑا۔ پہلے تیرہ سال مکی زندگی کے زمانہ نبوت کی تکالیف کی طرف دھیان دیں اور پھر مدنی زندگی کے پہلے پانچ سالوں پر نظر دوڑائیں کہ باطل حملے پہ حملے کر رہا تھا اور آخر آٹھ ہجری کو جا کر اللہ تعالیٰ کے گھر کو کفر سے پاک کیا۔ تو پاکستان سے ''اسلام کے ایک بہت بڑے سیلاب'' کی ہماری امید شاید ''جلد بازی'' تھی کہ اللہ تعالیٰ دنیاوی معاملات کو قضا و قدر کے اصولوں کے تحت چلاتا ہے جس کو آسان دیہاتی زبان میں تو اس طرح بیان کریں گے کہ ایک شرپسند انسان نے ایک دوسرے جانے والے کو اچانک ''اڑنگا'' دے کر گرا دیا۔ تو وہ آدمی اٹھ کر اس کو جب غور سے دیکھنے لگا تو آگے سے شرپسند بول اٹھا ''دیکھتے کیا ہو؟ تم تو کہتے ہو کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کرتا ہے'' تو اس شریف آدمی نے کہا ''کہ ہاں! وہی کچھ دیکھ رہا ہوں۔ لیکن معلوم کر رہا ہوں کہ اُس اللہ تعالیٰ کی ذات پاک نہ منہ کس کا کالا کیا ہے''۔

رب کی ذات پاک نے قرآن پاک سورۃ آل عمران کی آیہ مبارکہ 106 اور کئی مقامات روز قیامت پر نور چہروں اور سیاہ چہروں والوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اور ہم ان مضامین میں پاکستان کے وجود میں آ جانے کے ''مواقع تقدیر'' کو زیر بحث لا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں پچھلے کئی سالوں سے بلکہ تحریک پاکستان کے وقت

سے ہم مسلمانوں کے لئے روز قیامت کے وقت کے پرنور چہروں کے ساتھ ہونے کے بڑے مواقع مہیا فرمائے اور یہ سعادت کن لوگوں کو نصیب ہو رہی ہے اور کون لوگ بدکرداری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

جناب عبدالرحمٰنؓ بن قتادہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مجلس میں ہمارے آقا ﷺ حضور پاک نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی ذات پاک نے حضرت آدمؑ کو پیدا کر کے مخلوق کو ان کی پشت سے نکالا اور پھر ارشاد ہوا ''یہ بہشت میں جائیں گے مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ یہ دوزخ میں جائیں گے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ ''حضور پاک ﷺ کی یہ بات سن کر مجلس سے ایک شخص نے عرض کی ''یا رسول اللہ ﷺ اگر یہی بات ہے تو پھر ہم عمل کس بناء پر کریں'' تو رحمتہ العالمین ﷺ نے فرمایا ''مواقع تقدیر کی بناء پر۔''

اگرچہ اس حدیث مبارکہ کی وہاں مزید وضاحت نہیں ہے لیکن ہمارے آقا ﷺ نے اس ضرورت کو کئی الفاظ یا بیانات میں واضح فرمایا۔ اور ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے الفاظ بھی ہمارے آقا ﷺ نے اسی کلیہ کی وضاحت کے طور پر ہمیں باور کرائے۔

جناب فاروق اعظمؓ نے جب حضرت علیؓ کو اپنی خلافت کیلئے مدینہ منورہ میں اپنے نائب چھوڑنے کے بعد دوسری دفعہ ملک شام کا سفر کیا تو راستے میں معلوم ہوا کہ ملک شام میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی ہے تو آپ نے شام کے اسلامی سپہ سالار جناب ابوعبیدہؓ بن جراح کو جابیہ کے مقام پر ہی بلا بھیجا اور کچھ ارادہ کیا کہ کسی طرح یا کسی بہانے جناب ابوعبیدہؓ کو بھی ملک شام سے نکال لیں لیکن بات چیت ایسے کسی فیصلہ کی طرف پیش رفت نہ کر سکی تو جناب فاروقؓ نے جناب ابوعبیدہؓ کو بتایا کہ وہ آگے ملک شام کا دورہ نہ کریں گے اور جناب ابوعبیدہؓ بھی اپنی افواج کو اونچائی والے صحت افزا مقامات کی طرف منتقل کریں۔ اب جناب ابوعبیدہؓ اور خلیفہ دوم بڑی حد تک ''یک نفس'' تھے اور ایک دوسرے کی رائے کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے لیکن خلیفہ وقتؓ کے اس رویہ نے سپہ سالار اعظمؓ کو کچھ حیران کر دیا' جو اپنی جان ہر وقت ہتھیلی پر رکھے ہوئے تھے اور جناب ابوعبیدہؓ اپنی سوچ پر پردہ نہ رکھنا چاہتے تھے۔

تو جناب ابوعبیدہؓ نے عرض کر دی ''کہ کیا امیر المومنین آپ ''تقدیر'' سے بھاگ رہے ہیں؟'' تو خلیفہ دومؓ نے فرمایا۔ ''نہیں امین الامت! میں تقدیر سے تقدیر کی طرف جا رہا ہوں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ایک وادی کے دو کنارے ہوں ایک سبز اور ایک خشک تو ظاہر ہے آپ سبز والی طرف میں قیام کریں گے یا اس کو استعمال کریں گے''!! لیکن جناب ابوعبیدہؓ کے چہرہ پر تجسس پھر بھی موجود رہا۔ تو جناب عبدالرحمٰنؓ بن عوف بھی ساتھ تھے تو ان کے حوالے سے جناب عمرؓ نے حضور پاک ﷺ کی حدیث مبارکہ بھی سنائی کہ انسان کا اپنا کام ہے کہ وہ اپنے لئے بہتر راستہ چنے یا اختیار کرے۔

حضور پاک ﷺ کا حوالہ سن کر جناب ابوعبیدہؓ نے ''سمعنا واطعنا'' عرض کی کہ وہ ویسے بھی سورۃ الفاتحہ کے مطابق رب کی ذات پاک سے سیدھا راستہ مانگتے تھے۔ اور ان لوگوں کا راستہ جو انعام یافتہ ہیں کہ رب کی ذات پاک نے سورۃ البلد آیت مبارکہ 10 کے مطابق ہمارے لئے دونوں راستوں کی نشاندہی کر دی اور سورۃ الشمس کی آیات مبارکہ 8 اور 9 کے مطابق اللہ تعالیٰ ہمارے لئے فجور اور تقویٰ دونوں القاء فرماتے ہیں۔ لیکن مراد

وہ حاصل کرتا ہے جو پاکیزگی یا تقویٰ کو اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ تحریک پاکستان اچانک ایک معجزہ کی طرح ہمارے سامنے آئی۔ اور بے شک علامہ اقبالؒ کے 1930ء کے خطبہ میں ہم مسلمانوں کیلئے اپنے الگ وطن کی ضرورت کو ہمارے مقصود کے طور پر پیش کر دیا تھا لیکن ہم لوگ بات کو سمجھ نہ رہے تھے۔ مسلم لیگ نے جو مارچ 1940ء میں مسلمانوں کے لئے الگ ملک کا مطالبہ کر دیا تو جس مسلمان میں ذرہ بھر اسلامی غیرت تھی۔ وہ مسلم لیگ کا سپاہی بن گیا اور خاص کر پنجاب میں 1944ء میں خضر حیات ٹوانہ کی قائداعظم کے ساتھ بغاوت اور اس کو مسلم لیگ سے نکالنے میں مسلم لیگ' جس کو کچھ لوگ ٹوڈیوں یا نوابوں اور جاگیرداروں کی جماعت کہتے تھے۔ مسلم لیگ کو رب کی ذات پاک نے اس الزام سے پاک کر دیا اور اگلے تین سال میں پاکستان حاصل کرنے کا معجزہ یا کل سات سال کی معمولی جدوجہد سے ایک اتنا بڑا ملک حاصل کر لینا' ایک بہت بڑا معجزہ اور اللہ تعالیٰ کا راز ہے۔

پنجاب میں بوڑھے مولانا ظفر علی خان کی اخبار زمیندار میں ''گرجیں'' اور ''احسان'' کے معتدل مزاج نور الٰہی کی کوششوں کو جب نوجوان حمید نظامی کی اسلامی غیرت کی ستھری اور نڈر صحافت کی مدد حاصل ہوگئی تو پنجاب جاگ اٹھا۔ ہر مسلم لیگی چہرے سے پہچانا جاتا تھا اور سورۃ القیامت کی آیت مبارکہ 22 اور 23 میں جو قیامت کے روز ''30 ناضرہ'' ''اور باسرہ'' چہروں کا ذکر ہے۔ یہ صورت حال دنیا میں بھی کچھ آثار ظاہر کرتی ہے۔ کہ خدا کی قسم! قارئین اس کو میری خودنمائی نہ سمجھنا۔ ہر مخلص مسلم لیگی مجھے ان زمانوں میں فرشتہ نظر آتا تھا اور وہ چہروں سے پہچانا جاتا تھا۔ محکمہ تعلقات میں ہونے کی وجہ سے اس عاجز نے 1943ء سے لے کر جون 1947ء میں جو بذریعہ ہوائی جہاز یا ریل گاڑی یا فوجی جیپ میں سفر کئے یا جتنے لوگوں کے ساتھ ملاقات کی۔ اس کو کئی ہزاروں میل سے زیادہ کہنے میں مجھے کوئی مبالغہ نظر نہیں آتا۔

46-1945ء میں محکمہ تعلقات عامہ میں دن کے وقت ہم سب گیارہ بجے کے قریب اکٹھی چائے پینے آتے تھے۔ جہاں غیر ملکی صحافی بھی ہوتے تھے اور جہاں ہندوستان پاکستان کے بارے سیاسی پہلو خوب زیر بحث آتے تھے اور ہندو افسران صرف ایک رٹ لگاتے تھے کہ یہ مسلم لیگی ''آزادی'' نہیں چاہتے ''پاکستان'' چاہتے ہیں۔ پہلے آزادی تو حاصل کر لیں۔ اندرونی معاملات بعد میں طے کر لیں گے۔ مسلم لیگ کیلئے اکثر مجھ اکیلے کی آواز ہوتی تھی کہ باقی مسلمان کچھ ''مصلحت'' کرتے تھے۔ چراغ حسن حسرت سمیت کچھ لوگ پاکستان کی مخالفت کرتے تھے اور کچھ اپنے آپ کو ''لبرل اور ماڈرن'' ظاہر کرتے تھے۔ جن میں فیض احمد فیض یا علوی یا طبیب حسین یا حسن عسکری وغیرہ کافی لوگوں کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر میرا جو ردعمل ہوتا تھا وہ ردعمل دوسرے دن قائداعظم یا کسی بڑے مسلم لیگی لیڈر کا دوسرے دن اخباروں میں شائع ہو جاتا تھا۔ تو ایک دن ایک امریکی صحافی کہنے لگا کہ امیر افضل کو ضرور بر ضرور مسلم لیگ سے کوئی ہدایت ملتی ہے کہ جو کچھ یہ زبانی کہتا ہے' وہی دوسرے دن ہم اخباروں میں مسلم لیگ کے نقطہ نظر کے طور پر پڑھتے ہیں۔ تو اٹلی والا ایک جنگی قیدی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بول اٹھا کہ اس نے اس پہلو کا خوب مطالعہ کیا ہے کانگریس والے جس کو ''آزادی'' کہتے ہیں مسلم لیگ کیلئے یہ ''غلامی'' ہے کہ انگریزوں کے بعد وہ ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے۔ ان کی آزادی پاکستان حاصل کرنے میں ہے۔ چونکہ سب مسلم لیگیوں کی اس سوچ میں وحدت فکر ہے تو ان کے ردعملوں میں بھی وحدت فکر ہے کہ وہ لوگ ہم خیالوں کے

زمرہ میں آتے ہیں۔

حیرانگی کی بات یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے بارے ان کے چہروں پر اس عاجز کو شک پڑا کہ وہ مکمل طور پر پرنور نہ ہوتے تھے۔ یہ لوگ ''فصلی بٹیرے'' ثابت ہوئے کہ سیاسی طور پر مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ تھے۔ لیکن پاکستان ان لوگوں نے بنایا جو عقائد کے لحاظ سے مسلم لیگی یا اوّل اور آخر مسلمان تھے۔ اس عاجز نے اس زمانے میں کانگریس کے بڑے بڑے لیڈروں گاندھی، نہرو، پٹیل راج گوپال اچاریہ، راجندر پرشاد گوبند ولبھ پنتھ، پرشوتم داس، ٹنڈن اچاریہ کرپلانی اور مرار جی ڈیسائی وغیرہ سے لے کر چھوٹے چھوٹے لیڈروں اور کانگریسی یا ہندو اخبار نویسوں کو دور سے بھی دیکھا اور بہت نزدیک سے بھی دیکھا۔ ہندو قوم بڑی خوش قسمت تھی کہ ان کو ایسے مخلص لیڈر ملے یا میتسر ہوئے جو ہندوؤں کے لئے ''رام رام'' اور مسلمانوں کے لئے ان کی ''بغل'' میں چھری ہوتی تھی۔

انگریزوں کی دشمنی اور اتنی چالاک ہندو لیڈروں کا مقابلہ کر کے قائداعظم یا مسلم لیگ کی مخلص قیادت والے چند رہنماؤں یا مولانا ظفر علی اور حمید نظامی قسم کے چند دانشوروں نے اس تحریک کی ہراوّل میں کام کر کے اللہ تعالیٰ کے اس معجزہ کی رونمائی میں جو سعادت حاصل کی افسوس قوم نے آج تک اس تحریک کے باطنی اور روحانی پہلوؤں کی طرف دھیان ہی نہیں دیا کہ یہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز معلوم ہوتا ہے کہ قائداعظم کو اللہ تعالیٰ نے بے حساب مومن کی فراست عطا کر دی اور جو لوگ مخلص مسلم لیگی تھے، ان سب کو اللہ تعالیٰ کی یہ عطا حاصل تھی کہ وہ ہندوؤں کی ذہنیت کو پوری طرح سمجھ گئے کہ ہندوؤں کی آزادی کے زمانے میں جو لیڈر شپ تھی، ان سب کے پاس مسلمانوں کے لئے شر ہی شر تھا اور اب بھی یہی حال ہے۔

میں جب آج کچھ لوگوں کے ہندوؤں کے بارے بیانات پڑھتا ہوں تو میرا خون کھولنا شروع کر دیتا ہے۔ قائداعظم یا مخلص مسلمان لیڈر یا اسلامی غیرت والے اخبار نویس مولانا ظفر علی یا حمید نظامی وغیرہ کبھی بھی گاندھی کو ''مہاتما'' کہنے کو تیار نہ تھے کہ مہاتما الفاظ ''مہا آتما'' کا مخفف ہے، جس کے معنی عظیم روح ہے لیکن بھیڑ چال کے طور پر آج ہمارے دانشوروں نے اس اسلام دشمن متعصب بنیا کو ''مہاتما'' کہنا شروع کر دیا ہے۔ نعوذ باللہ وہ مسلمان دشمن عظیم روح کیسے ہوسکتا ہے۔

1936ء میں اکثر ادی۔ باسیوں اور بھارت کی نچلے درجہ والی قوموں نے اسلام کے دائرہ میں آنا شروع کر دیا۔ گاندھی نے سازش کے طور پر اپنے بیٹے دیوداس سے مسلمان ہونے کا اعلان کرا دیا۔ مسلمانوں نے اس کا نام عبداللہ رکھ کر اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ دو ماہ بعد اس مردود نے واپس ہندو ہونے کا اعلان کر دیا اور اسلام پر وہ دقیق حملے کئے کہ اس نے اندر جا کر دیکھ لیا، اسلام بڑا بوگس مذہب ہے تو ادا باسیوں نے مسلمان ہونا بند کر دیا۔ ہمارے کچھ لبرل اور ماڈرن مسلمان جواہر لعل نہرو کے بڑے مداح تھے اور اب بھی کچھ ایسے آدمی موجود ہیں۔ نہرو سخت بے کردار اور بہروپیا تھا۔ اوپر سے سوشلسٹ اور لبرل بنا پھرتا تھا، اس کے سرہانے چانکیا کی کتاب ہوتی تھی اور نہرو چانکیا سے بھی بدتر اور فراڈ تھا۔

''تین الف'' پاکستان کے محافظ ثابت ہوئے

نہرو کی بہن وجے لکشمی اپنا دل ایک مسلمان سید حسین کو دے بیٹھی اور اس کی محبّت میں پاگل ہو رہی تھی۔

تو گاندھی کی مدد سے نہرو نے ایک نہایت خوبصورت ہندولڑ کا رنجیت پنڈت تلاش کیا۔ جو پڑھا لکھا بھی تھا اور اس کو اپنے گھر لے آئے کہ وجے لکشمی جو سید حسن کے عشق میں پاگل ہو رہی تھی۔ اُس کو ایک خوبصورت ہندولڑکے کی گود میں ڈالنے کیلئے کئی پاپڑ بیلے کہ وہ مسلمانوں کے گھر جا کر مسلمان نہ ہو جائے۔ ایک اور ہندو مدراسی برہمن راج گوپال اچاریہ۔ بڑا ''غیر متعصب'' ہندو بنا ہوا تھا۔ گاندھی کے ساتھ کچھ رشتے ناطے بھی کئے تھے اور گاندھی سے ہدایات لے کر ہمارے علامہ مشرقی کی بڑی ''برین واشنگ'' کی۔ جوان دنوں میں مدراس میں نظر بند تھا۔ اور علامہ صاحب کو ''باور'' کرا دیا کہ مسلمانوں اور اسلام کو متحدہ ہندوستان میں کوئی خطرہ نہیں کہ آزادی کے بعد وہ اور مضبوط ہو جائیں گے۔ یہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ کی ''تنگ نظری'' ہے کہ اسلام جیسے وسیع مذہب کو ایک خطہ میں ''محدود'' کر رہے ہیں۔ اس سے بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوگا۔ اب لطف کی بات یہ ہے کہ اقلیتی صوبوں یعنی موجودہ بھارت کے مسلمان تحریک پاکستان کے ہر اول میں تھے کہ مضبوط پاکستان ان کی بھی پرسان حالی کرے گا اور ایسا کچھ اس زمانے میں ٹائم میگزین میں شائع بھی ہوا کہ پہلے صفحے پر تصویر تھی کہ بھارت کو ہندوؤں کی ایک گائے کے طور پر دکھایا گیا۔ اور اس کے مغرب اور مشرق میں مسٹر جناح کے دو شیر دکھائے گئے کہ پاکستان شیر ہے اور ہندوؤں کی گائے اس کے ڈر سے کانپ رہی ہے اور قارئین یہ حقیقت ہے اگر ہم پاکستانی مسلمان اور مومن بن جائیں تو افسانوی عقائد کا ہندوازم ختم ہو جائے گا اور یہ برصغیر کفر سے پاک ہو جائے گا اور ایک دن ایسے ہونا ہے اور یہ بیانات لکھنے میں ایک بڑا مقصد پہلے ہی کی تحریروں میں بار بار دہرایا جا رہا ہے ''کہ اے مسلمانو! اپنے آقا ﷺ کے اس فرمان پر عمل کرو کہ اپنے نفس کو پہچانو۔ تو رب کی ذات پاک کی معرفت تمہیں حاصل ہو جائے گی اور یہ جہاں تو کچھ چیز نہیں محمدؐ کی وفا سے تو تمہیں لوح و قلم حاصل ہو جائیں گے۔ کہ وہ کب سے تمہارے منتظر ہیں۔''

قہاری ، غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!

یہ عاجز تحریکِ پاکستان کے زمانے میں ان مسلمانوں کے رویہ سے حیران ہوتا تھا جو ہندوؤں کے ''پچھ لگ'' بنے ہوئے تھے۔ گاندھی سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ہندو میں مکاری، فتنہ، اسلام دشمنی، تعصب اس طرح عیاں طور پر نظر آتے تھے کہ یہ مضمون کئی کتابوں میں بھی ختم نہیں ہوسکتا۔ البتہ پٹیل کے بارے یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندو مہاسبھا کے لیڈروں ڈاکٹر مونجے اور شیام پرشاد مکرجی کی طرح اس کی اسلام دشمنی ظاہراً بھی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے دانشوروں نے آج کل اس آدمی کو ''حقیقت پسند'' قرار دینا شروع کر دیا ہے کہ وہ کہتا تھا کہ حیدر آباد ہندوؤں کو مل جائے اور قائداعظم اس میں روڑے نہ اٹکائیں اور مسلمان کشمیر لے لیں لیکن ہماری غلط پالیسی کی وجہ سے ہمیں کچھ بھی نہ ملا۔ غلط پالیسی والی بات تو صحیح ہے لیکن اس ''غلطی'' کی بھی صحیح نشاندہی کی ضرورت ہے اور میرے ان بیانات کے مقاصد ہیں لیکن یہ ''شوشہ'' کہ پٹیل حقیقت پسند تھا نوابزادہ جنرل شیر علی اور ان لوگوں کا چھوڑا ہوا ہے جو بھارت کا ''چھوٹا بھائی'' بن کر یعنی ریاست بھوٹان اور ریاست سکم کی طرح پاکستان کو بھارت کا ایک ''طفیلی'' ملک بنانا چاہتے ہیں اور یہی کچھ سیاسی لیڈروں اور ہمارے کئی دانشوروں کی سوچ یا مقاصد ہیں۔

پٹیل نے کانگریس کو ''لنگڑا لولا'' پاکستان منظور کرنے کی ضرور تجویز دی کہ اس کو خیال تھا کہ وہ جلد پاکستان کو اندرونی سازشوں اور بیرونی جارحانہ رویوں سے ختم کر دیں گے۔ جواہر لعل نہرو تو مہاراجہ کشمیر کو ناراض کر بیٹھا تھا کہ شیخ عبداللہ کی کچھ زیادہ مدد کر دی لیکن پٹیل تو نہ صرف مہاراجہ کشمیر کے ساتھ کب سے رابطے میں تھا اور مسٹر مینن جو ماؤنٹ بیٹن کا مشیر خاص تھا اور بعد میں بھارت کا ریاستی سیکرٹری بنا اس کی مدد سے پٹیل اور ماؤنٹ بیٹن نے جس سازش سے سری نگر میں ''اندھیرا گھپ'' کر دیا اور مہاراجہ کو فرار کرا کے جموں لے جایا گیا۔ ہماری قوم نے سچ اب تک تلاش ہی نہیں کیا۔ قبائلی لشکروں کی سری نگر کی طرف پیش قدمی کا مقصد سری نگر کو آزاد کرانا ہرگز نہ تھا بلکہ مہورا بجلی گھر پر قبضہ کر کے مہاراجہ کیلئے ''اندھیرا گھپ'' کرنا تھا اور یہ سب کچھ ہمارے انگریز نوکر' سرحد کا گورنر جارج کنگھم اور فوج کا سربراہ جنرل میسیوی ماؤنٹ بیٹن کے حکم کے تحت کر رہے تھے اور یہ عاجز جب اس سلسلہ میں اپنے مشاہدات' شہادتیں اور واقعات کے نتائج کے اثرات پیش کرے گا تو قوم حیران ہو گی کہ ان سازشوں اور اعمال کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ذات پاک نے اس ملک کو قائم رکھا ہوا ہے۔

ستمبر 65ء کی جنگ کی ایک حقیقت مشہور ہے کہ پاکستان کو ''تین الفوں'' نے بچایا۔ اول اللہ تعالیٰ نے جو ذکر تو میں اختصار سے کرتا رہتا ہوں پھر اللہ تعالیٰ نے دوسرے الف۔ ایئر فورس کو وہ توفیق دی کہ انہوں نے کم تعداد کے باوجود فضائی برتری حاصل کر کے' بھارتی بری فوج کے پیش قدمی کو تہس نہس کر دیا اور تیسرے الف۔ آرٹلری نے کئی بھارتی جارحانہ کوششوں کو ایسا تہس نہس کیا کہ ان کو ''جنم'' ہی نہ لینے دیا۔ قارئین! یہ عاجز اس صورتحال کا عینی شاہد ہے کہ میں لاہور محاذ کا سب سے آگے والا کمانڈر تھا۔ میں نے تو یہ نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اگر نور خان اب سیاست میں آ کر دل چھوڑ گیا ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے وہ کچھ کر کے کوشش کرتا کہ آئندہ اس سے بہتر کیا جائے۔ راقم کا تعلق پیدل فوج سے ہے اور بے شک پیدل فوج نے بڑی قربانی دی کہ ہماری دفاعی لائن اتنی پتلی تھی کہ سپاہیوں نے چند فٹ مٹی کے ڈھیروں کی مدد سے دشمن کو روکا۔ اپنے آپ کو پہچانے اور دشمنوں کو پہچانے اور اینگلو امریکن بلاک والے ہمارے بڑے دشمن اور ان کی اور بھارت کی کئی اقدار مشترک ہیں۔ اس لئے بہت اختصار کے ساتھ ہندو ذہنیت کے علاوہ' انگریزوں کے مقاصد اور ہمارے انگریز نوکروں نے جو ہمیں بے وقوف بنایا جو ہمارے ساتھ غداریاں کیں قوم کیلئے ان میں سے چند باتوں کی نشاندہی اس لئے ضروری ہے کہ ہم اب بھی جو ان انگریزوں کی روایات کے ''پچھ لگ'' بنے ہوئے ہیں' ان روایات یا علوم کو بحیرہ عرب میں ڈبو دیں۔

اس سلسلہ میں راقم کی سب کتابوں میں بڑی تفصیل ہے کہ راقم کی کتاب ''جہاد کشمیر'' پر سید شبیر حسین نے 13 اکتوبر 1991ء کے پاکستان ٹائمز میں یہ تبصرہ کیا تھا کہ اس عاجز نے انگریزوں کی اس برصغیر میں مسلمانوں کے خلاف سازش کو طشت از بام کر دیا ہے۔ بریگیڈئر صدیق ستی مرحوم جو جہاد کشمیر کا ایک عظیم مجاہد تھا۔ اس نے اس کتاب پر لمبا چوڑا تبصرہ کیا تھا جو انگریزی اخبار ''نیوز'' میں 9 فروری 1995ء کو شائع ہوا۔ جس میں بریگیڈئر مرحوم کے چند الفاظ یہ ہیں کہ مصنف نے ٹھیک طور پر ثابت کیا ہے کہ انگریز جنرل گریسی کو پوشیدگی میں جو احکام ملتے تھے تو وہ کشمیر محاذ سے اچھے افسروں کو ہٹا کر اپنی مرضی کے افسران تعین کر دیتے تھے جو وہاں کام انگریزوں کی مرضی کے مطابق کرتے تھے۔ بریگیڈئر صدیق انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی بدمعاشیوں کے پس منظر کو پیش کرتے بڑے

دکھ کے ساتھ گزارش کرتے ہیں کہ ہم نے یہ انگریز نوکر رکھ کر بڑی غلطی کی اور اس کا خمیازہ اب بھی بھگت رہے ہیں وغیرہ۔ اب یہ عاجز پاکستان کے وجود میں آنے کے روحانی پہلوؤں اور واقعاتی پہلوؤں کو شیر وشکر کر کے صرف ان واقعات کی جھلکیاں دے گا جو سبق آموز ہیں یا جہاں قوم کو بیوقوف بنایا گیا یا جھوٹ مار کر حق و سچ پر پردہ ڈالا گیا یا کون لوگ تھے جو ابن الوقت اور بے کردار تھے کہ سازشیوں کے ہاتھ میں کھیلے یا ہم نے کسی طرح باطل نظریات اپنا لیے اور ان غلط فلسفوں اور غیر اسلامی روایات سے اب چھٹکارا کیسے حاصل کریں اور کون لوگ ''جانتے ہوئے'' آج بھی اہل مغرب کی ڈگڈگی پر ناچتے رہتے ہیں اور کون لوگ ''بن جاتے'' اس سلسلہ میں استعمال ہو رہے ہیں۔ ان کو خبردار کرنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر قائداعظم کے کشمیر میں فوج کے داخلے کا حکم کیوں نہ مانا گیا تو اس سلسلہ کے ''کرداروں'' کا کچھ تعارف پہلے لکھنا پڑے گا۔

تو سب سے پہلے پاکستان کے وجود میں آنے کے کچھ روحانی پہلوؤں کو سامنے لایا جائے گا۔ ہر واقعہ پہلے روحانی فضا میں جنم لیتا ہے حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ کی ایک حدیث مبارکہ کے الفاظ ہیں ''کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ازخود چھپا ہوا خزانہ اور طاقت تھا۔ جب اس نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو اپنا عارف پیدا کیا اور پھر اس عارف کیلئے زمان ومکان کا جوڑا پیدا کیا' جن حدود میں اس عارف نے اعمال کرنے تھے کہ اب بھی سب فیصلے پہلے عالم بالا یا عالم امر میں ہوتے ہیں تو پھر یہ واقعات عالم خلق میں نازل ہوتے ہیں' کہ سورۃ الصٰفٰت کے مطابق جنات اور شیاطین عالم بالا عالم امر میں جانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ یہ خبریں چرالیں کہ ان پر شہاب ثاقب پھینکے جاتے ہیں۔ بہرحال یہ واقعات جب دنیا میں نازل ہوتے ہیں تو وہ باطنی اور روحانی صورت میں نازل ہوتے ہیں کہ کوئی قوم جو کچھ حاصل کرنا چاہے تو اس کیلئے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے کہ روحانی طاقتیں پیدا ہوں وغیرہ یہاں پاکستان کی تحریک میں جس کی عملی صورت پر آگے تبصرہ ہے اور کچھ پس مناظر بھی ہوں گے وہاں کوئی جدوجہد (Struggle) یعنی زوردار عمل سامنے نظر نہیں آ رہا۔ سوائے درجن بھر اسلام کے فرزند جن کو ایک ہی ادا نے غازی اور شہید دونوں شان عطا کرا دیئے کہ وہ ناموس رسول ﷺ یا اسلام کیلئے اللہ تعالیٰ کے راہ میں قربان ہو گئے یہ کچھ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی عرصہ یا بہتر ہوگا یہ کہیں کہ 1940ء کے لاہور رزولیوشن سے پہلے پندرہ سال کے عرصہ میں ہوا۔ راقم پر یہ واردات اس لئے ہوئی کہ میں جو کچھ آج ہوں' اس میں بڑا حصہ میرے ان ماتحت اور رفیق شہدا کا ہے جو ستمبر 1965ء کے میدان جنگ میں میرے لئے بہت کچھ چھوڑ گئے۔ میں اس جنگ کے اپنے تمام مشاہدات اور تاثرات لکھنے سے کچھ ڈرتا ہوں۔ پس یہ سمجھ لیں کہ میری زندگی ہی تبدیل ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے ڈر کے بغیر سب ڈر میرے دل سے نکل گئے کہ جنگ کے بعد پستول میرے ہاتھ میں تھا اور بڑے کوتاہ میرے سامنے سے فرار کر جاتے تھے۔

شہادت کا عملی پہلو بھی اس عاجز پر ستمبر 65 کے میدان جنگ میں کھلا کہ ہر شہید پر شہادت سے پہلے شہادت آ کر اس کو اپنے محیط میں لے لیتی ہے کسی پر ایسی کیفیت چند دن پہلے سے شروع ہو جاتی ہے اور کسی پر چند لمحے پہلے کہ ان کا رویہ دوسرے اور عام لوگوں سے مختلف اور الگ قسم کا ہو جاتا ہے۔ سب ڈر سوائے اللہ تعالیٰ کے ڈر کے ان کیلئے ختم ہو جاتے ہیں۔ اکثر اپنی شہادت کا اظہار بھی کسی طرح سے کر دیتے تھے اور سید زادے

لیفٹیننٹ افتخار جعفر جیسے صاحبان نے مجھے ان کی کہانیاں لکھنے کی خبر بھی دے دی کہ میں اس جنگ میں شہید نہ ہوں گا بلکہ کچھ میری ''حفاظت'' کیلئے ہر وقت اپنی جان نثار کرنے کی بات کر کے مجھے حیران کر دیتے تھے اور اس عاجز کو تقریباً ایک صد ایسے شہیدوں کی ایسی رفاقت نے اسلامی فلسفہ حیات کو میرے لئے کافی حد تک کھول دیا تھا جس کا پہلا عملی سبق اس عاجز کے ہمارے سلطان مہدی صاحبؒ جو جناب سلطان باہوؒ کے ہمعصر اور رفیق تھے کے مزار پر ایک کشف سے حاصل ہوا تھا کہ زندگی جاری ہے اور موت صرف برزخ یا پردہ کا دروازہ ہے اور کون زندہ ہے یا مردہ ہے کہ جاہل اور کافر کو بھی مردہ کہا گیا اور شہید تو مکمل طور پر زندگی حاصل کر لیتے ہیں کہ سورۃ البقرہ کی آیت مبارکہ 154 کے مطابق ہم شہدا کی اسی زندگی کو سمجھنے کا شعور نہیں رکھتے۔

بہر حال شہیدوں کے ساتھ اس ''رفاقت'' نے میرے لئے اسلام کے عظیم فرزندوں اور حضور پاک ﷺ کے عاشقوں اور غلاموں، یعنی صحابہ کرام، علماء، فقراء، مجاہدین اور صالحین وغیرہ سے ایسا تعلق پیدا کر دیا کہ اکثر تصور میں وہ میرے قریب ہوتے ہیں کہ وفات یا آنکھوں سے اوجھل ہونے کے بعد ہمارے آقا ﷺ کے فرمان کے مطابق مومن کی طاقتیں ستر گنا بڑھ جاتی ہیں اور سورۃ ق کی آیت مبارکہ 22 کے مطابق ان کی نظر بہت تیز ہو جاتی ہے کہ ان کے زمان و مکان کے وقفے اور فاصلے کم اور نزدیک ترین ہو جاتے ہیں تو سورۃ المومن کی آیات مبارکہ 7 اور 8 کے مطابق جو ان صاحبان کی بخشش کی دعا مانگنے کے احکام ہیں۔ اس میں دراصل ہم زندوں کو شعوری اور باطنی طور پر بہتر ایمان حاصل ہوتا ہے۔ اور فوت شدہ صاحبان کے ساتھ روحانی رابطہ بندھ جاتا ہے۔

اس ساری تحریر کا مقصد یہ ہے کہ قوم کو ان درجن کے قریب شہدا سے متعارف کرایا جائے اور اس سلسلہ میں مزید تحقیق کی دعوت دے رہا ہوں کہ وہ صاحبان ایک ہی ادا سے شہید اور غازی دونوں سعاتیں حاصل کر گئے اور ان کی اس ادا کی وجہ سے ہم مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک نے یہ ملک عطا فرما دیا، جو اس کی ذات پاک کا بہت بڑا راز ہے۔ ان میں ایک غازی عبدالرشید شہید ہیں جس نے دہلی میں حضور پاک ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کا سر قلم کیا۔ یہ واقعہ 1925ء یا 1926ء کے قریب کا ہے۔ انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کے میجر خالد علی نے بچپن میں یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ دوسری ہستی غازی علم الدین شہید ہیں، جس کا تعلق لاہور سے ہے اور ان کی قبر بھی لاہور میں ہے۔

اخباری دنیا کے مولوی محمد سعید جو پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے غازی صاحب کے جنازہ میں شرکت کی تھی۔ ان کی تحریروں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ تیسرے صاحبان غازی عبدالقیوم شہید ہیں جن کا تعلق ضلع ہزارہ سے تھا اور کراچی میں کوچوان کا کام کرتے تھے۔ کچہری میں مقدمہ کے دوران وہ ہندو گستاخ جس نے حضور پاک ﷺ کی شان کی بے ادبی کر کے ایک کتاب لکھی تھی۔ غازی عبدالقیوم نے ایک چھری کے وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔

چوتھے صاحب غازی ملک میاں محمد شہید ہیں جو تلہ گنگ کے رہنے والے تھے۔ وہ فوج میں تھے اور ان کی پلٹن مدراس میں مقیم تھی۔ جہاں ایک ڈوگرہ نے ہمارے آقا ﷺ کی شان کو ٹھیس پہنچائی۔ ملک میاں محمد یہ کچھ برداشت نہ کر سکے اور اس ڈوگرہ کو گولی سے اڑا دیا، فوج ہی نے ان کو موت کی سزا سنائی۔ عاشق رسول میجر غلام

یاسین مرحوم ایک پلٹن میں اس زمانے میں کلرک تھے۔ کہ اُن کی پلٹن میں ملک میاں محمد زیر حراست رہے۔ غلام یاسین نے ان کی بڑی خدمت کی اور ملک صاحب کے چھوٹے بھائی ملک نور محمد اب تک زندہ ہیں۔ پانچویں صاحب غازی مرید حسین شہید ہیں جن کا ضلع چکوال' چوآ سیدن شاہ سڑک پر چکوال سے چند میل کے فاصلے پر بھلا کریالہ گاؤں سے ہے اور آپ ''غازی مرد'' کے نام سے مشہور ہیں کہ 1934 یا 1935 میں ضلع رہتک' حصار میں جا کر اس ہندو ڈاکٹر کو واصل جہنم کیا۔ جس نے ہمارے آقا ﷺ کی شان میں بے ادبی کی۔ بے ادبی لکھنے کی ہمارے قلم کو ہمت نہیں ہو پاتی' خاص کر جہلم سے چکوال تک آپ کی جسد کو جب لایا گیا تو راستے میں لوگوں نے پھول نچھاور کیے۔

چھٹے صاحب غازی دوست محمد شہید ہیں جس کے سلسلہ میں افسوس کرنا پڑتا ہے کہ انگریزوں کے ڈر سے ان کے متعلق کسی اخبار میں کبھی کوئی خبر تک نہ شائع ہوئی کہ انہوں نے اپنے انگریز کرنل اور انگریز ایجوٹنٹ اور سکھ صوبیدار وغیرہ چند لوگوں کو گولی سے اڑا دیا تھا۔ یہ دوسری جنگ سے تھوڑا پہلے کا واقعہ ہے کہ مسلمانوں سے ماہِ رمضان زیادہ مشقت کرائی جاتی تھی اور عید کی چھٹی بھی نہ دی جاتی۔ انگریز کرنل نے ہمارے آقا ﷺ کی شان میں بے ادبی کی۔ پلٹن کا نمبر 4/2 پنجاب تھا اور پلٹن صوبہ سرحد کی کسی علاقہ میں مقیم تھی اور ان افسران کو قتل کرنے کے بعد کہ دوست محمد جب بچ کر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا تو ان پر فائر سے ان کو شہادت نصیب ہوئی یہ پلٹن توڑ دی گئی اور کئی مسلمانوں کو بغیر پنشن کے گھر بھیج دیا گیا تھا اور کچھ کو دوسری پلٹنوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ایک سپاہی لال محمد ہماری پلٹن 3؟ محمدی میں بھی آیا تھا۔ بریگیڈئر صاحب صاحب داد مرحوم کا تعلق اسی پلٹن سے تھا۔ غازی دوست محمد کا تعلق بھی اُس زمانے کی تحصیل پنڈ دادنخان کے علاقہ کہوں کسی گاؤں سے تھا۔

ان چھ صاحبان کے علاوہ چار اور ایسے صاحبان ہیں۔ یہ عاجز تصور میں ان چھ غازیوں کے ساتھ دیکھتا ہے۔ کے بارے کہیں کچھ پڑھایا مجھے بالکل سمجھ نہیں آتی کہ ان صاحبان کے نام مجھے کیسے یاد رہے کہ ان کا نام غازی صدیق شہید' غازی محمد عبداللہ شہید' غازی امیر احمد شہید' غازی محمد منیر شہید ہیں اور کسی ایک کا تعلق جنڈیالہ گاؤں سے تھا۔ ان شہدا کے ساتھ تصور میں مجھے سید اکبر بھی نظر آتا ہے۔ جس نے لیاقت علی کو اُس کی کافرانہ حرکتوں کی وجہ سے قتل کیا تھا کہ اُس نے اپنے آپ کو لئی کے کنارے شہید کے طور پر خواب میں دیکھا تھا۔ بہر حال اس سلسلہ میں خدا بھلا کرے محمد متین خالد کا انہوں نے اب ایک کتاب میں متعدد شہدا پر بہت کچھ لکھ دیا ہے۔ البتہ دوست محمد شہید اور محمد منیر شہید کا اسما وہاں بھی نہیں۔ اس کتاب کا ناشر بھی گل فراز احمد ہے جو میری اس کتاب کا ناشر ہے۔ دونوں صاحبان کو گذارش کہ اس کام میں مزید تحقیق جاری رکھیں اور ان سب شہدا کے ملک میں مناسب مقامات پر کچھ یادگاریں بھی بننا چاہئیں۔

بھٹو نے پاکستان کے بارے میں بُرا سوچا، وہ عبرتناک انجام سے دوچار ہوا

بریگیڈئر صدیق ستی 9 فروری 1995ء کے اخبار ''نیوز'' میں کہتا ہے ''پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی کشمیر میں تحریک جاری رکھنے کی بجائے اپنے مفاد اور نئے ملک میں اپنے وزیراعظم ہونے کی ''جڑیں'' مضبوط کرنے کے کھیل میں مصروف تھے۔ ان کی اس کمزوری کا انگریز جنرلوں نے خوب فائدہ اٹھایا کہ انگریز اس بات کی

اہمیت کو جانتے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان بین الاقوامی دنیا میں اہمیت حاصل کرے۔ کرنل حسن مرزا اپنی کتاب ''شمشیر سے زنجیر تک'' میں کہتا ہے لیاقت کی حکومت دراصل برطانوی ہائی کمشنر مقیم کراچی کی حکومت تھی۔ 1951ء میں جو انہوں نے ''مکہ'' اٹھایا تھا یہ بھی ڈرامہ تھا کہ اس کے بعد جا کر لیاقت علی خاں نے بھارت کے ساتھ ''سمجھوتہ'' کر لیا۔ جس کو ''نہرو لیاقت'' پیکٹ کہتے ہیں یہ کشمیر لیاقت علی ہی بھارت کو دے گئے تھے کہ ہمیں دریائے چناب کے مشرق اور سیالکوٹ سے محاذ نہ کھولنے دیا' ورنہ ہم رام بن اور بانہال وغیرہ تک پہنچے ہوئے تھے اور دو تہائی کشمیر آزاد ہو چکا تھا۔

بقول مس فاطمہ جناح' قائداعظم کے ساتھ زیارت میں لیاقت علی کی آخری ملاقات کے بعد کیوں قائداعظم کی آنکھوں میں آنسو تھے اور پھر قائداعظم کے کوئٹہ سے کراچی کے سفر کے وقت ایک بھی سرکاری نمائندہ ہوائی اڈے پر موجود نہ تھا۔ کیا قائداعظم لیاقت علی کی مرضی کے خلاف کراچی آ کر کوئی اہم اعلان کرنا چاہتے تھے؟ پھر قائداعظم کیلئے جو ایمبولینس بھیجی اس کا پٹرول راستے میں ختم ہو گیا۔ کیا قائداعظم نے اس گرمی کی شدت سے اسی وقت یا بعد میں گورنر جنرل ہاؤس میں جان دے دی؟ ان بیانات کے لکھنے میں ایسے ہی تجسس اور تحقیقات کی ضرورت ہے کہ بے شک یہ عاجز تمام واقعات کا ''چشم دید'' گواہ بھی ہے اور اس عاجز نے آنکھیں اور کان کھول کر حالات کو پرکھا اور اللہ تعالیٰ نے مواقع بھی خوب عطا فرمائے۔

1989-90ء میں جنرل اسلم بیگ نے فیصلہ کیا، کہ محکمہ تعلقات عامہ سیمینار کرا کے اور لوگوں سے انٹرویو لے کر اور کتابوں کی مدد سے جہاد کشمیر 48-1947ء کے حقائق تلاش کرے اور متعلقہ پس منظروں سمیت قوم کے سامنے صحیح صورت حال پیش کرے کہ ہم اپنی کوتاہیوں سے اسباق حاصل کریں۔ اس سلسلہ میں ایک سال سے کم عرصہ میں نو مقامات یعنی کراچی' لاہور' راولپنڈی' پشاور' گلگت' سکردو' مظفر آباد' کوئٹہ اور جہلم میں سیمینار ہوئے۔ جن میں سے اکثر مقامات پر یہ عاجز حاضر تھا اور جہاں نہ حاضر ہو سکا اس کے مجھے ویڈیو سنا دیئے گئے اور ایک دو سیمینار کے بعد زبانی فیصلہ ہو گیا تھا کہ راقم ان واقعات کو بہتر طور پر سمجھتا ہے اور راقم ہی یہ کتاب لکھے گا کہ جنرل ریاض اللہ نے لکھ کر میرے ساتھ دسمبر 1990ء میں معاہدہ بھی کیا کہ کتاب کے مواد میں کوئی ایڈیٹوریل تبدیلی نہ ہو گی۔ کتاب محکمہ تعلقات عامہ شائع کرے گا اور مجھے کتاب کی لاگت کا 18 فیصد اعزازیہ ملے گا۔ مجھے تقریباً دو سو کتابوں سے مطالعہ کرنے کے ذرائع مہیا کئے جائیں گے اور اس سلسلہ میں بھارتی سرکاری تاریخ سمیت متعدّد غیروں کی لکھی ہوئی کتابیں مجھے لائبریریوں سے مہیا کیں۔ تمام سرکاری ''ٹاپ سیکرٹ'' کاغذات کو اب ''کھلا'' قرار دے کر مجھے ان کی کاپیاں مہیا کی گئیں۔ میرے سوالات کے جوابات مجھے کشمیر میں لڑنے والے جنرل اکبر طارق کی زبانی مہیا کئے گئے۔ کشمیر کے کئی مجاہدین وغیرہ بریگیڈئر صدیق ستی اور سخی دلیر وغیرہ سے میرے لئے ملاقات کا بندوبست کیا گیا اور راقم از خود نے اس جہاد میں حصّہ لیا تھا۔ اخباروں میں اشتہار دیئے اور فوجی یونٹوں کو خط لکھے گئے کہ وہ میری مدد کریں اور مجھے ایک سال کی مہلت دی گئی کہ میں یہ کام مکمل کروں۔

لیکن قدرت کے راز نرالے ہیں کہ میں کوئی کام آسانی سے مکمل نہیں کر پاتا کہ شاید مخالفت کی ہوا کے ذریعہ سے مجھے اونچا اڑانا مقصود ہوتا ہے۔ جب پہلے 1980ء سے اس عاجز نے ایسے ہی معاہدوں سے حضور

پاک ﷺ کی جنگی حکمت عملی اور خلفائے راشدین کی جنگی حکمت عملی پر جنرل احسان الحق ڈار مرحوم و مغفور سے معاہدہ کے طور پر کتابیں لکھنا شروع کیں اور اسلام کی پوری عسکری تاریخ لکھنے کا پروگرام تھا تو جنرل ضیاء الحق نے جنرل احسان الحق ڈار کو فوج سے فارغ کر دیا اور معاہدہ پورا نہ کیا۔ چند کتابیں مشکل سے شائع ہوئیں اور خلفائے راشدین کی جنگی حکمت عملی کی کتابوں کے سلسلہ میں جو روڑے اٹکائے گئے' یہ سب دلخراش داستانیں ہیں۔ جنرل احسان الحق پھر زیادہ عرصہ زندہ بھی نہ رہے اور مجھے اس ''میدان'' میں اکیلا چھوڑ گئے۔ میرے لئے یہ ایک بہت بڑا المیہ تھا۔ اب دوسرا المیہ اگست 1991ء میں ظہور پذیر ہوا کہ جہاد کشمیر کی کتاب کے کام کرانے والا جنرل ریاض اللہ بھی مجھے اس ''میدان'' میں اکیلا چھوڑ گئے اور اکتوبر 1991ء میں جب اس عاجز نے جہاد کشمیر پر معاہدوں کی کتاب کا مسودہ جنرل ریاض اللہ کے جانشین میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ کو پیش کیا تو جو کچھ رویہ اس نے میرے ساتھ اپنایا یا میرے منہ بولے بیٹے جنرل آصف نواز نے اپنایا۔ جس کے ساتھ میری تین پشتوں کی خاندانی دوستی تھی وہ پوری باتیں لکھ کر میں یہاں بدمزگی پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ موٹے لفظوں میں مجھے کہا گیا کہ یہ ''سچ'' اگر میں ردی کی ٹوکری میں پھینک دوں' یعنی اللہ تعالیٰ اور رسول پاک ﷺ کا چور بن جاؤں تو تب مجھے میرے اس کام کی ''مزدوری'' مل سکتی ہے۔ ورنہ سب معاہدے ختم ہیں۔ اور میرے اتنے خرچ کے باوجود مجھے اس محنت کیلئے حکومت نے ایک پیسہ بھی نہ دیا۔

قارئین! یہ کچھ برداشت کرنے کی مجھے رب کی ذات نے طاقت جو عطا کی کہ میں نے یہ معاملہ صدر پاکستان غلام اسحاق کو بھی پیش کیا۔ شرعی عدالت میں درخواست دی کہ مجھے ''سچ'' پر پردے ڈالنے کے احکام مل رہے ہیں لیکن میری کہیں بھی شنوائی نہ ہوئی۔ رب نے توفیق دی کہ مسودوں پر ''نظر ثانی'' کر کے ان کو ایک کتاب میں ''اختصار'' دیا۔ کوڑی کوڑی جوڑ کر لاکھوں روپے خود خرچ کر کے کتاب اپنے ذرائع سے شائع کر کے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دی کہ قیمت اتنی کم رکھی کہ مجھے میری لاگت بھی واپس نہ ملی۔ لیکن لفظ لفظ کسی حوالے سے لکھا کہ تقریباً ایک ہزار حوالے ہیں کتاب سپریم کورٹ میں بھیج دی کہ اس ''سچ'' پر اگر کوئی بندش لگانے کی کوشش کرے تو سپریم کورٹ وجوہات معلوم کرے اور میرا ''قصور'' یہ تھا کہ بقول سید شبیر حسین اس عاجز نے اس خطہ میں اینگلو امریکن بلاک کی سازشوں کو طشت از بام کر دیا تھا اور آصف نواز کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ امریکہ والے بچپن سے اس کو Groom کر کے ''ایوب ثانی'' بنانے پر لگے ہوئے تھے۔ ہماری بری فوج یا افواج کا وہ پہلا سربراہ تھا جس کو امریکہ کے کہنے پر ''بھارت یاترا'' کی دعوت ملی تھی اور آصف نواز بھارتی جنرل کے ناپاک قدموں سے اس کو واپس دعوت دے کر شالا مار باغ کی سرزمین کے تقدس کو ''مجروح'' کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس کو یہ بھی خیال نہ آیا کہ اس کا چھوٹا بھائی ناصر نواز ستمبر 65 کی جنگ میں میرے ساتھ تھا جب ہم نے عظیم قربانی دے کر بھارتیوں کو شالا مار پر نظر ڈالنے کی اجازت بھی نہ دی تھی۔

رب کی ذات پاک نے آصف نواز کو نامرادی اور ناکامی سے دو چار کیا۔ پاکستان کے ساتھ جو کوئی جو کچھ کرتا ہے یہاں وہ عبرتناک انجام سے دو چار ہوگا۔ آصف نواز کی موت پر بھی بڑے بڑے آنسو بہائے گئے کہ بڑا عظیم جنرل تھا۔ حالانکہ اس نے ستمبر 65ء اور دسمبر 71 کی جنگوں میں دھیلے کا کام نہ کیا تھا۔ غلام اسحاق نے بھی

اس کی بیوہ کو ''مظلوم'' قرار دیا تو اس زمانے میں اس عاجز نے غلام اسحاق کو لکھا کہ اس کو نظر نہیں آتا کہ میں بھی ''مظلوم'' ہوں۔ دو سال ایک معاہدہ کے تحت دن و رات کام کر کے سچ تلاش کیا۔ اپنے پاس سے ہزاروں روپے خرچ کئے لیکن میرے لئے مزدوری بھی ''مشروط'' کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول پاک ﷺ کا چور بنوں لیکن میری جدوجہد جاری ہے۔ میں اس کو جہاد نہ کہوں گا کہ قرآن پاک کے مطابق جہاد جان و مال سے ہوتا ہے۔ گو میں نے بھی کتاب جہاد کشمیر پر لاکھوں خرچ کئے لیکن کچھ لاگت واپس آ گئی ہے اور کچھ کتابیں ابھی میرے پاس موجود ہیں تو ان حقائق کی کچھ مختصر جھلکیاں قوم کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اور آصف نواز کی بے مقصد ''قبر کشائی'' سے جو فضا میں بدبو پھیلی اس میں سب کوتاہوں اور غداروں کیلئے عبرت تھی۔

1937ء تک اس عاجز نے مسلم لیگ کا نام بھی نہ سنا تھا جب اس سال انتخاب ہوئے تو جاگیرداروں کا زور تھا۔ ٹوانے اور نون ہمارے ضلع سرگودھا پر چھائے ہوئے تھے اور صوبہ کے وزیراعلیٰ کو بھی اس زمانے میں وزیراعظم کہتے تھے۔ وہ لوگ یعنی ٹوانے اس کے ''امیدوار'' تھے لیکن مشتاق احمد گورمانی اور ممتاز دولتانہ کے والد احمد یار دولتانہ نے سر سکندر حیات جو ریزرو بنک میں چلا گیا تھا اس کو پنجاب کی سیاست میں واپس لے آئے کہ وہ انہیں وزیر بنائے گا۔ سر سکندر حیات نے گورمانی کو تو پارلیمنٹری سیکرٹری بنایا جو چیز اس کو منظور نہ تھی اور وہ کچھ عرصہ بعد مرکز میں چلا گیا اور انگریزی حکومت کے ساتھ ایسے ''رابطے'' باندھے کہ آزادی کے وقت انگریزوں نے اسے بہاولپور ریاست کا وزیراعظم بنوایا ہوا تھا۔ احمد یار دولتانہ کو سر سکندر حیات نے جاگیرداروں کی یونینسٹ پارٹی بنا کر اس کو صوبائی ممبروں کیلئے ''چیف وپ'' بنا کر ''ٹرخا'' دیا لیکن وزارت نہ ملنے کا ''صدمہ'' وہ برداشت نہ کر سکا اور جلد راہی عدم ہوا۔ اس ''برتاؤ'' اور خضر حیات ٹوانہ کے وزیر بن جانے نے احمد یار کے بیٹے ممتاز دولتانہ کو ایک عجیب و غریب سیاسی ذہن کا ''غلام'' بنا دیا کہ اس کی ساری عمر سیاسی چالوں میں گزر گئی اور اس کی یہ سیاسی چالیں بہت گہری اور جچی تلی ہوتی تھیں۔ لیکن ان پر عمل کرتے کئی دفعہ وہ خود اپنی سیاسی چالوں کا ''شکار'' ہو جاتا تھا اور بڑی ناکام سیاسی زندگی گزاری، جس سے پاکستان کو بھی نقصان پہنچا کہ اسلام گندی سیاست کی اجازت نہیں دیتا۔

موجودہ مغربی پنجاب کے اس وقت لاہور، ملتان اور راولپنڈی تین ڈویژن تھے اور ضلع سرگودھا بھی راولپنڈی ڈویژن کا حصہ تھا اور گورمانی یا احمد یار دولتانہ کو خیال بھی نہ تھا کہ سکندر دوسرا وزیر بھی راولپنڈی ڈویژن سے لے گا لیکن انگریزوں کے حکم کے تحت سکندر کو خضر حیات ٹوانہ کو وزیر بنانا پڑا۔ جو نوجوان اور ناتجربہ کار تھا لیکن انگریزوں کی وفاداری اس میں خاندانی طور پر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اس شخص نے جتنا پاکستان اور مسلمانوں کا نقصان کیا اتنا نقصان صرف کانگرسی مولوی آزاد نے کیا اور خاص کر 1946ء میں ان دونوں کے ''غیر فطری اتحاد'' کی وجہ سے پنجاب کے مسلمانوں کا بہت نقصان ہوا۔ سرحد میں پاکستان مخالف طاقتیں یعنی خان عبدالغفار خان کا خاندان یا صوبہ سندھ میں پاکستان مخالف طاقتیں یعنی جی ایم سید اور سمرو خاندان عملی طور پر کسی نقصان پہنچانے میں کچھ نہ کر سکے کہ ان کے لئے وہاں حالات سازگار نہ تھے۔ البتہ 1937ء کے انتخابات کے بعد اس برصغیر میں پنجاب اور بنگال کو چھوڑ کر ہر جگہ کانگریس برسر اقتدار آ گئی کہ صوبہ سرحد میں کانگریسی ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت تھی۔ سندھ میں کانگریسی اللہ بخش سومرو کی حکومت تھی اور ہندو اکثریت کے سب صوبوں (یعنی موجودہ

بھارت) میں ہر جگہ کانگریس کی حکومت تھی۔ صرف پنجاب میں سر سکندر کی یونینسٹ پارٹی کی حکومت تھی کہ مسلم لیگ کے صرف وہ ممبر تھے جہلم سے راجہ غضنفر علی اور جالندھر سے ملک برکت علی بنگال میں فضل الحق کی کرشکا پارٹی کی حکومت تھی اور مسلم لیگ کے صرف تین چار ممبر تھے جو فضل الحق کے ساتھ ہو گئے۔

حضور پاک ﷺ نے خود ذاتی طور پر قائداعظم کا چناؤ فرمایا

اب جگہ جگہ ان کانگریسی حکومتوں نے جو افسانوی ہندو عقائدوں کا پرچار شروع کیا اور ''بندے ماترم'' کے تحت دھرتی کی پوجا کو اپنی روایات اور سکولوں میں تعلیم کا حصّہ بنایا اور اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو جو اچھوتوں والا مقام دیا تو وہاں کے مسلمان چیخ اٹھے اور دراصل انہی صوبوں میں مسلم لیگ نے زوردار طور پر جنم لیا اور جب 1939ء کی جنگ شروع ہو گئی اور کانگریس نے انگریزوں کے ساتھ ٹکر لینے کیلئے اور بہتر مراعات کیلئے احتجاجاً حکومتوں سے استعفیٰ وغیرہ دیئے تو یہ چال ہندوؤں کیلئے الٹی پڑی اور مسلمانوں کے لئے باعث رحمت ثابت ہوئی اور انگریزوں نے بھی اپنی ہمدردیاں، کچھ مسلمانوں کے ''پلڑے'' میں ڈال دیں کہ سر سکندر حیات اور فضل الحق بھی ''بالجماعت'' یعنی اپنے سارے ممبروں سمیت مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور قارئین یہ ہے ولی خان کا ''انکشاف'' کہ مسلم لیگ انگریزوں کی جماعت تھی اور انگریزوں نے پاکستان بنوایا۔ الحمدللہ اگر اس چیز نے ہمیں کوئی فائدہ دیا' تو ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے کہ اس کے بنانے میں اس کی ذات پاک نے اسلام دشمن طاقتوں سے بھی کام لیا اور ہم ہندو کی غلامی سے بچ گئے۔ جس غلامی میں ولی خان اور ان کا خاندان ہمیں پکے طور پر باندھ دینا چاہتے تھے۔

قارئین! ہم تو کب کا تسلیم کر چکے ہیں کہ لنگڑا لولا پاکستان انگریزوں کی بھی ضرورت تھی اور میر علی احمد تالپور کے اس ''انکشاف'' سے ان مضامین کو شروع کیا تھا لیکن وہ لوگ یعنی انگریز تو اتنا پاکستان بھی نہ چاہتے تھے۔ وہ لوگ ہندوستان کے ٹکڑے کرنے میں دلچسپی ضرور رکھتے تھے اور ہندوستان کے تین چار ٹکڑے کرنا چاہتے تھے لیکن بعد میں ان کی پالیسی تبدیل ہو گئی کہ ایشیا میں افیون کے نشے میں سوئی ہوئی چینی قوم کو جاپان کے ان پر حملے نے جگا دیا تھا۔ ایک طرف چیانگ کائی شیک کی قیادت میں نیشنلسٹ چینی اور دوسری طرف ماؤزے تنگ کی قیادت میں کمیونسٹ چینی دوسری جنگ عظیم سے پہلے سے طاقت اختیار کر رہے تھے۔

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے۔ ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے۔''

تو چین کے مقابلہ کیلئے بھارت کو ایشیا میں ایک طاقت کے طور پر ابھرنے کی مدد اینگلو امریکن بلاک کی پالیسی کا حصّہ ہو گئی تھی جو 1949ء کے بعد اور تبدیل ہو گئی کہ چین میں کمیونسٹ حکومت بن گئی لیکن 1939ء سے انگریز کی پالیسی یہ نظر آ رہی تھی کہ برصغیر و ہند کا بٹوارہ ضرور ہو کہ بھارت' ''مہا بھارت'' نہ بن سکے گا لیکن بھارت ایک طاقتور اور پاکستان کو ایک برائے نام ملک کے طور پر انگریز یا امریکہ ان کو ایک کو دوسرے کے خلاف کھڑا کر کے ایشیا میں اپنی بالادستی کو قائم رکھ سکیں۔ بے شک حکومت برطانیہ زوال پذیر تھی اور اس کے حکمرانوں کو سلطنت کے ''معماروں'' کی کمی آ گئی تھی لیکن سلطنت کے زوال کی وجوہات غلام قوموں کی بیداری تھی۔ انگریز خود قوم کے طور پر زوال پذیر نہ تھے اور آج بھی دنیا کے بڑے ملکوں میں شامل ہیں۔ یورپ کی سرد ہواؤں کو گلف کی سٹریم جو

گرمائش پہنچاتی ہے تو معتدل مزاج انگریز قوم کے ''حیلہ ءفرنگ'' کو علامہ اقبال بھی تسلیم کرتا ہے۔
چنانچہ ولی خان کے ''انکشافات'' کو چیلنج کرنے کی ہرگز ''ضرورت'' نہیں اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انگریز کی پالیسی بھی پاکستان کو وجود میں لانے کی کوشش ثابت ہوئی لیکن انگریزوں کی پالیسی میں تبدیلی کی نہیں بٹوارہ صرف لنگڑا لولا پاکستان کے طور الگ ہونے کیلئے تو سرسید کو ''ہندی مسلمان'' کے الگ قوم ہونے کے پر چار کی اجازت تھی اور مذہب کو ہر کسی کا نجی معاملہ تسلیم کر کے ہی کمال ترکی والا ''بے دین نظریہ'' نافذ کرنا مقصود تھا۔ لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ کسی زمانے میں تو علامہ اقبال بھی ''ہندوستان ہمارا'' کے نغمے گا رہے تھے لیکن بعد میں جب ''حرم کی پاسبانی'' کیلئے امت مسلمہ کے اکٹھے ہونے کے گیت علامہ اقبال نے گائے تو انگریز بھی لرز گیا۔ اس لئے ہمارے ''پلڑے'' کو انگریز بہت کم سہارا دیتا تھا چنانچہ ہندوؤں اور کانگریس کے جنگ عظیم دوم میں رویہ نے انگریز کو مجبور کر دیا کہ اس نے مارچ 1940ء میں لاہور کے مسلم لیگی اجتماع اور اس کے الگ ملک کے مطالبہ کے وقت کوئی روڑے نہ ڈالے۔ صرف کسی چھپے ہاتھ نے خاکساروں سے کچھ کرایا جو بڑی غلط بات تھی اور خاکساروں کے خلاف کارروائی ہوئی وہ بھی بڑی ظالمانہ کارروائی تھی لیکن قائد کی مومنانہ فراست نے نہ کانفرنس کی تاریخ کو معطل ہونے دیا اور نہ خاکساروں سے دوری اختیار کی کہ آپ خاکسار زخمیوں کی عیادت کو پہنچ گئے۔

قائداعظم نے مسلم لیگ میں نئے شامل ہونے والوں کو عزت نفس عطا کر کے خوب پذیرائی دی کہ اس کیلئے الگ ملک کے مطالبہ کی قرارداد کا ڈرافٹ تیار کرنے کی سعادت پنجاب کے وزیراعظم سر سکندر کو فرمائی۔ میزبانی کے فرائض سارا پنجاب اور نواب شاہ نواز ممدوٹ ادا کر رہے تھے۔ قرارداد کے پیش کرنے کا شرف شیرِ بنگال فضل الحق وزیراعظم بنگال کو عطا کیا اور مسلم لیگی اور اقلیتی صوبوں کے لیڈروں چودھری خلیق زمان وغیرہ کو قرارداد کو پذیرائی دینے کی سعادت دی۔ قرارداد میں ملک پاکستان نام کا ذکر نہ تھا۔ جمال الدین افغانی کی اس برصغیر میں آمد اور واپس جاتے ہندوستان، افغانستان سرحد کیلئے ''سرحد پاک'' کے الفاظ کے استعمال اور لفظ کی پاکیزگی یا چودھری رحمت علی، اسلم خٹک اور دوسرے لوگوں کے لفظ پاکستان کے استعمال نے خود بخود لفظ پاکستان کو وہ اوج عطا کر دیا اور ''لے کے رہیں گے پاکستان'' کہ جگہ جگہ نعرے شروع ہو گئے کہ ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'' اور یہاں سے مسلم لیگ کی تحریک شروع ہوئی۔

لیکن اس سلسلہ میں ''زیادہ کام'' ہندو لیڈروں اور ہندو بنیئے خاص کر لاہور کی ہندوؤں کے ''ملاپ'' اور ''پرتاپ'' وغیرہ اردو اخباروں نے ''غیر ارادی'' طور پر کیا' کہ انہوں نے پاکستان کی بہت مخالفت کی بلکہ بعد میں کانگریس کے بڑے بڑے اخباروں بمبئی کرانیکل' ہندو مدراس' دہلی کے ہندوستان ٹائمز' لکھنؤ کے نیشنل ہرلڈ اور پاونیئر کلکتہ کے امر کہ بازار پتریکا او ہندوستان سٹینڈرڈ وغیرہ نے اس زور سے پاکستان مخالفت کی کہ مسلمانوں کو یقین ہو گیا' کہ پاکستان ہندوؤں کیلئے ایک ''ریڈ رَیگ'' ہے کہ مسلمانوں کی آواز دہلی سے ایک چھ صفحات کی ''ڈان اخبار'' شاید 1943ء میں اور کلکتہ کی چار صفحے کی انگریزی کی اخبار ''مارننگ نیوز'' شاید 1944ء میں آنا شروع ہوئیں یعنی پاکستان ایک ایسا اللہ تعالیٰ کا راز ہے کہ کافرانہ پریس نے اس کی مخالفت کی تو مسلمانوں نے اس کو حاصل کرنے کیلئے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا لیا لیکن جنگ عظیم دوم کے ان سالوں میں قائداعظم نے جو مومن

کی فراست کا مظاہرہ کیا تو کچھ لوگوں کے ان خوابوں کو تسلیم کرنا پڑتا ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ دیانتداری اور اسلامی غیر تمندی کی وجہ سے حضور پاک ﷺ نے ذاتی طور پر قائداعظم کا چناؤ فرمایا کہ بات وکالت کی ہے وہ مسلمانوں کی وکالت کرے اور یہ ایک اور روحانی پہلو ہے جو تحقیق کے لئے ہمیں دعوت دے رہا ہے۔ کہ اس سلسلہ میں جناب حسرت موہانی' اشرف علی تھانوی وغیرہ متعدد لوگوں کو خوابوں میں اشارے ہوئے کہ مسلمانوں کی قیادت کیلئے قائداعظم کا چناؤ ہمارے آقا ﷺ نے خود فرمایا' بلکہ حضور ﷺ نے ازخود قائداعظمؒ کو مسلمانوں کی وکالت کی بشارت دی۔

قائداعظم کا ایک امتحان 1941ء میں ہوا، کہ سر سکندر اور فضل الحق' قائداعظم سے اجازت لئے بغیر وائسرائے ہند کی تشکیل شدہ ''دفاعی کونسل'' کے ممبر بن گئے اور قائداعظم کو یہ تب معلوم ہوا جب وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے قائداعظم کو دعوت دی کہ وہ خود اور مسلم لیگ کے چنیدہ ممبر اس کونسل کے ممبر بنیں قائداعظم نے فرمایا کہ وہ جنگ کے دوران حکومت کیلئے مسائل تو نہ پیدا کریں گے کہ کسی تحریک کو چلائیں یا اس میں حصہ لیں لیکن سیاسی صورتحال ان کو اس حد تک اجازت نہیں دیتی کہ وہ انگریزوں کی ''نوکری'' شروع کر دیں تو وائسرائے نے ان کو بتایا کہ تمہارے دو وزیراعظم تو کونسل کے ممبر بن چکے ہیں' یہ تھا مسلم لیگ کیلئے ربط و ضبط اور اصولوں کا معاملہ۔ قائداعظم نے فوراً سر سکندر اور فضل الحق کو اس کونسل سے مستعفی ہونے کا حکم سنا دیا۔ سر سکندر میں کچھ نہ کچھ مومنانہ فراست بھی تھی اور اسلامی غیرت بھی۔ وہ تو انگریزوں کو کوئی اور ''سبز باغ'' دکھا کر کہ وہ قائداعظم سے اجازت لے کر سمندر پار فوجیوں کا دورہ ضرور کرے گا اور فی الحال دفاعی کونسل سے مستعفی ہونا ایک سیاسی ضرورت اور قائداعظم کی عزت اور مسلم لیگ کی عزت کا معاملہ ہے اور سر سکندر نے قائداعظم کا حکم مان لیا۔ ویسے بھی سر سکندر نے کچھ مسلمانوں کی خدمت کی تھی کہ چھوٹو رام سے مل کر زمینداروں کو کچھ حفاظت مہیا کرائی اور بنیوں کے کچھ قرضوں سے ان کی جان چھڑائی۔ بادشاہی مسجد کی مرمت کا بندوبست کرایا اور اگر وہ زندہ رہتا تو ہم خضر حیات کے شر سے بچ جاتے جو ذکر آگے آ رہا ہے۔ رب کی ذات پاک نے سر سکندر کو بادشاہی مسجد کے سامنے دفن ہونے کی سعادت بھی عطا فرما دی۔

لیکن فضل الحق بدقسمت رہا اور بڑی خراب طرح ڈال گیا۔ اس نے کہا کہ مسٹر جناح کون ہوتا ہے مجھے سیاست میں نیچا دکھائے۔ میں نے مسلم لیگ کو طاقت دی ہے' میں تو سیاست میں جواہر لعل نہرو کو ''پاکٹ میں ڈالنے'' (بنگالی لہجہ میں) سکتا ہے۔ میں دفاعی کونسل سے بھی مستعفی ہوتا ہوں اور مسلم لیگ سے بھی۔ قائداعظم نے صرف ''اتنا فرمایا'' کہ فضل الحق نے اپنے ہاتھوں سیاسی خودکشی کر لی ہے۔'' اور چند دنوں بعد سب مسلم لیگی اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور اس کو مستعفی ہونا پڑا کہ خواجہ ناظم الدین نے مسلم لیگ کے لیڈر کے طور پر بنگال کی حکومت سنبھال لی۔ فضل الحق نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا اور 1946ء کے انتخابات میں بھی وہ بری طرح مار کھا گیا لیکن قائداعظم کی وفات کے بعد لیاقت علی نے اسی فضل الحق کو سیاسی زندگی میں واپس آنے میں مدد کی اور 1954ء کے متحدہ محاذ میں اس شخص نے منفی سیاست سے مجیب الرحمٰن جیسے لوگوں کو ''طاقت'' دی اور مغربی پاکستان میں غلام محمد' سکندر مرزا' مشتاق گورمانی اور عزیز برادران تو نے جو فضل حق' ابوحسن سرکار' عطاء الرحمٰن اور مجیب الرحمٰن ان دشمنانِ پاکستان کو

پذیرائی دی ان باتوں سے پوری قوم آگاہ ہے کہ پاکستان قائم ہے۔ یہ بدقسمت لوگ تھے جو ''مواقع تقدیر'' سے فائدے اٹھانے کے سلسلہ میں اچھی مثالیں نہ چھوڑ سکے۔

دسمبر 1941ء میں جاپان کی جنگ میں شمولیت اور امریکہ کے اتحادیوں کے ساتھ شامل ہونے کے باوجود شروع شروع میں جاپان کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی تو ہندو کانگریس نے بنگالی لیڈر سبھاش چندر کو پٹھان کا لباس پہنوا کر ''گنگا'' یعنی بے زبان بنا کر خان عبدالغفار اور صوبہ سرحد کے دوسرے بے دین سیاستدانوں کی مدد سے مزار شریف کی زیارت کے بہانے افغانستان پہنچا دیا' جہاں سے وہ پہلے جرمنی پہنچا اور بعد میں جاپان پہنچ گیا اور برصغیر ہندو پاکستان کے ملایا وغیرہ میں قید ہونے والے فوجیوں سے ایک ''آزاد ہند فوج'' بنالی۔ اس بات نے پھر انگریزوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی امداد کو مسلم لیگ کے پلڑے میں ڈالیں تو قائداعظم نے بھی حالات کا فائدہ اٹھایا کہ صوبہ سرحد' صوبہ سندھ اور آسام میں بھی مسلم لیگ والوں نے حکومتیں بنالیں اور اس طرح مسلم لیگ ایک طاقت بن کر ابھرنا شروع ہوگئی۔ اب کانگریس نے انگریزوں کی جاپان اور جرمنی سے کئی مقامات پر شکستوں کا خوب فائدہ اٹھایا اور اکتوبر 1942ء میں انگریزوں کے خلاف ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک شروع کر دی کہ قائداعظم کو بھی دعوت دے دی کہ وہ ان کا ساتھ دیں۔ قائداعظم' ہندو کا پروردہ بننے کیلئے ہرگز تیار نہ تھے بلکہ اس تحریک میں قائداعظم کو صحیح طور پر حقیقت کی سمجھ آ گئی کہ ہندو جلد سے جلد حکومت حاصل کرنا چاہتا ہے کہ مسلمانوں کو پاکستان یا ان کے حقوق نہ دینے پڑیں اور قائد نے ایسا اعلان کر دیا۔ کانگریس کے بڑے بڑے لیڈر جیل میں ضرور چلے گئے لیکن یہ تحریک بُری طرح ناکام ہوئی کہ قائداعظم کی ہدایت پر پنجاب کے وزیراعظم سکندر حیات نے اس تحریک کو پنجاب میں اٹھنے ہی نہ دیا اور پنجاب ہی کی انگریزوں کو مدد کی ضرورت تھی کہ فوج کیلئے بھرتی پنجاب سے مل رہی تھی۔ گو سکندر حیات دسمبر 1942ء میں وفات پا گئے۔ لیکن ان کے جانشین خضر حیات نے بھی اس وقت مسلم لیگ کی وفاداری کا اعلان کیا اور سکندر حیات کے بیٹے سردار شوکت حیات کو قائداعظم سے درخواست کر کے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر اسمبلی کا ممبر بنا کر وزارت بھی عطا کر دی تو 1943ء میں قائداعظم نے مسلم لیگ کو اور مضبوط کر لیا کہ عام لوگوں نے بھی پاکستان کا نام سن لیا اور اس تحریک میں کچھ جان پڑنا شروع ہوئی۔

کانگریس کو جلد اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ لیڈر شپ تو جیل میں تھی لیکن ٹاٹا اور برلا کی دولت اور باقی ہندوؤں کے پاس بے پناہ دولت تھی تو انہوں نے مسلمانوں کی دوسری جماعتوں خاص کر احرار پارٹی سے رابطہ باندھا۔ اس پارٹی میں کام کے آدمی صرف دو تھے مولانا گلشیر جو اس وقت تک قتل ہو چکے تھے اور چودھری افضل حق جس نے اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان دکھی دلوں کی آواز ہے۔ وہ وفات پا چکے تھے۔ باقی مولوی اظہر علی (ادھر علی۔ ادھر) یا حبیب الرحمٰن لدھیانوی قسم کے لوگ تھے۔ صرف عطاء اللہ شاہ بخاری کچھ صحیح آدمی تھا جس نے پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد اپنی غلطی تسلیم بھی کی۔ یا جمیعت العلمائے ہند تھی جس کے حسین احمد مدنی کے بارے تو بعد میں جواہر لعل نہرو کا ایک بیان بھی آ گیا تھا کہ اکیس ہزار روپے (آج کل اکیس لاکھ سے بھی دس گنا) تو ایک مہینہ ہوا ہے حسین احمد کو دیئے ہیں اب روز روز کتنے پیسے دیں۔ قائداعظم نے تو صاف اعلان فرمایا تھا کہ ہم ''مولویوں'' کو نہیں خرید سکتے۔ بہرحال ان پارٹیوں کے لوگوں نے کانگریس سے خوب دولت حاصل کی اور

ان مولویوں نے مسلم لیگ کے خلاف اودھم مچا رکھا تھا۔ مودودی جیسا آدمی جو مسلم قومیت کے اصول کو تسلیم کرتا ہے وہ بھی اپنے مولوی ''ساتھیوں کی وجہ سے پاکستان کی مخالفت کرتا رہا اور صوبہ سرحد میں خان برادران کی مدد سے کانگریس دولت لٹا رہی تھی۔ جس سلسلہ میں دسمبر 1945ء میں قائداعظم نے کلکتہ کی ایک میٹنگ میں ثبوت پیش کئے جو اس عاجز نے اپنے کانوں سے سنے۔ علامہ مشرقی ویسے مسلم لیگ سے دور تھا اور کانگرسی مولوی آزاد محلہ مدن پور کے وجہ سے مدنی نام اپنائے والے حسین احمد کی پاکستان مخالفت کے بیانات ثابت کرتے ہیں کہ یہ لوگ مومن کی فراست سے عاری تھے اور اتنی مخالفتوں کے باوجود رب کی ذات پاک نے تحریک پاکستان کو کامیاب کیا'' یہ فطرت کا عظیم راز ہے۔

کانگریس والے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور لڑائی کی صورت حال بھی انگریزوں کے حق میں جانے لگی تو ہندو لیڈر شپ نے پینترا تبدیل کیا اور بہانوں سے جیل سے نکلنا شروع کیا۔ پہل چالاک بنیا کرم چند گاندھی نے کی کہ وہ شروع 1944ء میں جیل سے نکل آیا اور چالاک مدراسی برہمن راج گوپال اچاریہ تو جیل گیا ہی نہ تھا تو ہندوؤں کو مسلم لیگ کی طاقت کا اندازہ ہونا شروع ہو گیا تو چالاک گاندھی نے راج گوپال اچاریہ کی مدد سے قائداعظم پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے کہ وہ مسلمانوں کو آزادی کے بعد سب حقوق دے دیں گے اور صوبائی خود مختاری ابھی سے دینے کو تیار ہیں اور ہم مل کر معاملات کو طے کریں۔ قائداعظم کا سیدھا جواب ہوتا تھا کہ پاکستان دینے کے مطالبہ کو تسلیم کرو اور مل کر یہ طے کر سکتے ہیں کہ طریق کار اور مرحلات کیا ہوں گے۔ چالاک بنیا کرم چند گاندھی نے اس پر یہ اعلان کر دیا کہ انگریزوں سے حکومت لے کر ہم جو پہلی حکومت بنائیں گے اس کا وزیراعظم محمد علی جناح کو بنانے کو تیار ہیں اور مسلم لیگ پہلے انگریزوں سے انتقالِ اقتدار میں ہماری مدد کرے۔ اپنے اندرونی معاملات بعد میں طے کر لیں گے۔ قائداعظم نے جواب دیا کہ جہاں تم ہندو ''بادشاہ گر'' ہو تو میں تمہارا Show Boy نہیں بن سکتا۔ میرے سامنے مقصد میری قوم کیلئے ان صوبوں کی حکومت دلانا ہے جہاں وہ اکثریت میں ہے۔ یعنی میں کانگریسی مولوی آزاد کی طرح تمہارے لئے ''بچہ جمہورا'' نہیں بن سکتا۔

خضر ہمارا بھائی ہے کے نعرے قائداعظم نے خُود بند کرائے

آخری حربہ کے طور پر چالاک بنیا نے کہا کہ وہ غیر مشروط طور پر قائداعظم کے ساتھ کچھ معاملات طے کرنا چاہتا ہے اور جولائی 1944ء میں بمبئی میں قائداعظم کے گھر اس کے ساتھ ملاقات کر کے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہے تو قائداعظم نے مشروط طور پر ملاقات کیلئے رضامندی کا اظہار کیا کہ مسلمانوں کا مرنا جینا پاکستان کے حصول میں ہے۔ گاندھی ملاقات کیلئے بمبئی پہنچ گیا اور چند دن روزانہ ملاقات ہوتی تھی چانکیہ کے پیروکار ہندوؤں اخبار نویسوں نے گاندھی اور راج گوپال اچاریہ کی مدد سے ملاقات اور بات چیت کو اخباروں میں جس پیرائے میں اور جس مکاری کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی اس سازش کو صرف قائداعظم کو مومن کی فراست ٹھیک طور پر سمجھتی تھی کہ قائداعظم ایک فقرہ میں ان کی مکاریوں کو طشت ازبام کر دیتے تھے کہ سارا مقصد ہمیں پاکستان کے مطالبہ سے دستبردار کرانے کا ہے یا مسلمان قوم کو تقسیم کرنا ہے کہ ہم متحد نہ ہوں وغیرہ۔

لیکن انگریزوں کی عیاری نے اب پھر اپنا زور ہندو کانگریس کے پلڑا میں ڈالنا شروع کر دیا۔ کانگریس

نے 1942ء کی تحریک ''ہندوستان چھوڑ دو'' کے تحت انگریزوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا لیکن مکار انگریز کو معلوم تھا کہ ہندوؤں اور ان کے درمیان کئی ''اقدار'' مشترک ہیں اور ان کی نظر دور رس تھی کہ برصغیر کے ہندوؤں کے ساتھ ان کو بنا کر رکھنا ہوگا اور جنگ کی صورت حال بہتر ہو جانے کی وجہ سے انہوں نے کئی کانگریسی لیڈروں کو جیل سے رہا کر دیا اور پنجاب میں اپنے پروردہ خضر حیات کو حکم دیا کہ وہ مسلم لیگ کو زیادہ طاقت نہ پکڑنے دے کہ اس کی یونینسٹ حکومت کسی طرح مسلم لیگ کے تابع نہیں۔ وہ اور اس کے وزیر یا یونینسٹ پارٹی کے ممبر ذاتی طور پر مسلم لیگ کے ممبر ہیں اور باقی معاملات میں وہ مسلم لیگ کی تابعداری کریں گے۔ پنجاب مسلم لیگ کی صدارت نوجوان افتخار حسین ممدوٹ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل سیکرٹری ممتاز دولتانہ تھا' جو ''سوشلسٹ'' بھی بن جاتا تھا لیکن خضر حیات کے ساتھ خاندانی دشمنی کی وجہ سے اور ضلع سرگودھا میں خضر کے خاندان کے مخالف محمد حیات قریشی کے خاندان کے ساتھ رشتے ہو جانے کی وجہ سے مسلم لیگ اُس کیلئے ''جائے پناہ'' بھی تھی۔

خضر حیات کو ایک طرح ''باور'' ہو گیا تھا' کہ مسلم لیگ میں اس کیلئے کوئی اہم مقام نہیں ہے۔ ویسے انگریز کی غلامی اس کی گھٹی میں تھی تو اب قائداعظم نے پنجاب کے لیڈروں کے ساتھ مشورہ کیا تو سینئر لوگوں میں سے بھی راجہ غضنفر علی' ملک برکت علی' فاروق لغاری کے دادا جمال خان لغاری' صادق حسین قریشی کے باپ عاشق قریشی وغیرہ اور نوجوان لیڈروں میں سردار شوکت حیات نے ان کو وفاداری کا یقین دلایا تو قائداعظم خضر حیات کے ساتھ معاملات طے کرنے کیلئے لاہور پہنچ گئے۔ خضر حیات نے انگریز گورنر لارڈ گلانسی سے مشورہ کیا اور اس کو بتایا کہ اس کی پارٹی کے لوگ قائداعظم کے زیادہ وفادار ہیں تو گلانسی نے خضر حیات کو مشورہ دیا کہ وہ قائداعظم کے خلاف ڈٹ جائے۔

قارئین! وسط 1944ء میں قائداعظم کی لاہور میں آمد اور خضر کے ساتھ مُلاقاتوں یا مسلم لیگ کے لیڈروں کے رویوں کا مضمون ایک کتاب میں بھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ ہماری قومی زندگی یا کچھ پنجابیوں کے ابن الوقت ہونے کا ایک ایسا المیہ ہے کہ اس نے ہمیں بہت زیادہ نقصان پہنچایا کہ یہ واقعات آزادی تک پھیلے ہوئے ہیں اور 1945ء کے انتخابات پر ان واقعات کے بھرپور طور پر برے اور اچھے دونوں قسم کے اثرات ہوئے۔ لیکن اچھا اثر صرف یہ ہوا کہ مسلم لیگ ایک عوامی جماعت بن گئی۔ لیکن خضر حیات سمیت جن لوگوں نے مسلم لیگ یا مسلمانوں کے مفاد کے ساتھ غداری کی' میرے لئے وہ منافقین اور کافروں سے بدتر ہیں اور جاگیرداری سے بھی پنجاب کی خلاصی نہ ملی۔ یہ سیاست بازی آج تک جاری ہے۔ ملک برکت علی' راجہ غضنفر علی اور سردار شوکت حیات نے مکمل طور پر قائداعظم کو وفاداری دکھائی اور شوکت حیات نے وزارت پر بھی لات مار دی لیکن گلانسی نے جمال خان لغاری اور صادق قریشی کو ذراسی دھمکی دی تو وہ ''لمبے'' پڑ گئے اور انگریزوں کی عظمت کے وہ گن گائے کہ ان دونوں کو وزارت سے بھی نواز دیا گیا۔ گلانسی کے جانشین جانکنز نے بھی مسلم لیگ دشمنی جاری رکھی اور 1945ء کے الیکشن میں مظفر علی قزلباش' میاں ابراہیم برق اللہ بخش ٹوانہ' چودھری سلطان علی ننکیانہ' چودھری اصغر علی وغیرہ متعدد لوگ یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹوں پر کامیاب ہو گئے بلکہ سخت مقابلہ کرنے والوں میں فیروزپور سے سرور بودلہ لاہور سے ڈاکٹر عالم لوٹا وغیرہ پاکستان کے مخالفوں کا ایک گروہ تھا۔ مذہبی جماعتیں احرار' خاکسار اور جمعیت العلماء ہند الگ

تھیں کہ مفتی محمود تو اعلان کر گیا کہ وہ پاکستان بنانے کے ''گناہ'' میں شریک نہ تھا۔ علماء سے تو صرف شبیر احمد عثمانی نے کچھ ہمت کی اور مسلم لیگ کا ہم نوا بن گیا۔ البتہ فقرا میں سے متعدد سجادہ نشیں یعنی سیال شریف، طونسہ شریف، مانکی شریف، موسیٰ زئی شریف اور زکوڑی شریف وغیرہ مسلم لیگ کے ساتھ تھے لیکن کافی سجادہ نشین غیر جانبدار بھی تھے۔ اب سرحد میں کانگریسی مسلمانوں کا زور تھا سندھ میں کانگریسی مسلمانوں کے علاوہ ذاتی انا پر جی ایم سید نے بھی پاکستان کی مخالفت میں چھلانگ لگا لی لیکن کسی ایک ہندو کا نام کبھی سننے میں نہ آیا کہ جس نے پاکستان کے حق میں بات کی ہو کہ یہ مسلمانوں کا حق ہے۔ اب قارئین خود اندازہ لگائیں کہ انگریزوں اور ہندوؤں میں اتنے اقدار مشترک تھے اور انگریز صرف مجبوراً تھوڑے عرصہ کیلئے اپنی طاقت مسلمانوں کے پلڑے میں ڈالتا تھا لیکن زیادہ حمایت ہندوؤں کی کرتا تھا۔ سارے ہندو مخالف اور مسلمانوں خود اتنی بڑی تعداد میں یا مسلمانوں کی تنظیموں نے مخالفت کی لیکن رب کی ذات پاک پھر بھی پاکستان کو وجود میں لے آئی۔ اگر ہم متحد ہوتے تو دہلی تک کے علاقے آسانی سے حاصل کر لیتے لیکن فطرت تو ''مواقع تقدیر'' پیدا کر رہی تھی۔ یہ اپنی اپنی قسمت کی بات تھی کہ کون سعادت حاصل کر گئے اور کون مسلمان ہوتے ہوئے مسلمانوں کے دشمن ثابت ہوئے۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ ان ہی دنوں خضر حیات ٹوانہ کی بیٹی عمر زادی کو قائداعظم مسلم لیگ نے قومی اسمبلی کی ممبری سے نواز دیا ہے' یہ کس خدمت میں؟ عورت کا نام ظاہر کرتا ہے کہ انگریزوں کے بہت بڑے ٹوڈی اس کے دادا عمر حیات پر بھی خاندان فخر کرتا ہے۔ اسلام باپ کے کردار سے اولاد کو کوئی سزا دینے کیلئے تو نہیں کہتا کہ قریش کے شیطان عقبہ کے بیٹے ولیدؓ کو اور ابو جہل کے بیٹے عکرمہؓ کو حضور پاک ﷺ اور خلفاء راشدین نے بڑے رتبے عطا کئے کہ وہ لوگ اپنے والدین کے کردار سے سخت نفرت کرتے تھے۔ خضر حیات 1946ء اور 1947ء کے پہلے چند ماہ میں خضر کے کانگریسی مولوی آزاد سے غیر فطری اتحاد کے ساتھ اپنے ساتھیوں مظفر علی قزلباش' ابراہیم برق بھیم سن' سچر اور بلدیو سنگھ کی مدد سے پاکستان کے خلاف کیا کچھ نہ کرتا رہا۔ عمر زادی اپنے باپ کے کردار پر لعنت بھیجتی۔ اگر اس وقت حکومت مسلم لیگ کی ہوتی تو مسلمانوں کو 47-1946ء میں کچھ منظم کر لیتی تو ان کا یہ قتل عام نہ ہوتا اور بٹوارہ بھی کچھ بہتر صورت میں ہوتا۔ قائداعظم کو خضر حیات کے نام سے نفرت تھی لیکن افسوس ہماری قوم پاکستان کے دشمنوں کو جلد گلے لگا لیتی ہے۔ خضر حیات نے جب مارچ 1947ء میں اس کے خلاف مسلم لیگ تحریک کے آگے ہتھیار ڈال کر وزارت سے استعفیٰ دے دیا تو کچھ سادہ مسلمانوں نے اس کے حق میں نعرے لگائے۔ ''خضر ہمارا بھائی ہے'' جو نعرے جلدی بند ہو گئے۔ یہ عاجز اس وقت دہلی میں تھا۔ راجہ غضنفر علی سے ملتا رہتا ہے۔ راجہ صاحب نے مجھے بتایا کہ یہ نعرے قائداعظم نے بند کرائے کہ خضر نے مسلمانوں کا بہت نقصان کیا ہے۔

جن خاندانوں نے پاکستان کی مخالفت کی وہ دل سے کبھی پاکستان کے بارے اچھا نہیں سوچتے۔ ہم نے ڈاکٹر خان صاحب کو وفاق میں وزارت دی تو اس نے وزارت کشمیر کا چارج لینے سے انکار کر کے کشمیر کے کاز (Cause) کو بہت نقصان پہنچایا۔ ہم نے ڈاکٹر خان صاحب کو مغربی پاکستان، کو ون یونٹ بنا کر اس کا وزیر اعلیٰ بنایا تو اس نے مسلم لیگ کو ایک ہی رات میں ری پبلکن پارٹی بنا ۔ ون یونٹ بنا کر الٹا صوبائی تعصب کو زیادہ ہوا دی اور پھر اس کو توڑ دیا گیا یا توڑنا پڑا۔

"بے اصلاں دی یاری وچوں، کدے نہ کسے پھل پایا
ککر تے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا"

بے کردار لوگوں کی قدر کرنا' انگوروں کو کانٹوں سے چھلنے کے مترادف ہے کہ قوم کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ خدارا مخلص لوگوں کو تلاش کرو اور "مصلحانہ انداز" چھوڑ دو۔ قرآن پاک میں واضح احکام ہیں کہ جو طاغوت یعنی شیطانوں کے ساتھ کفر نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ اس کو کبھی اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف نہ لائے گا۔ اس عاجز کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ توفیق دیتا رہا کہ میں نے اپنے بڑوں اور ہر بے کردار آدمی کو اس کے منہ پر کہا کہ وہ کس "قماش" کا آدمی ہے اور کیسے عبرتناک انجام سے دوچار ہوگا۔ میرا تو کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔

پہلے سے گزارش کرتا آ رہا ہوں کہ یہ عاجز تاریخ کو نہیں دہرا رہا بلکہ تاریخ کا بامقصد مطالعہ کر کے صرف وہ نکتے اور واقعات قوم کے سامنے اختصار سے پیش کر کے چند الفاظ میں اپنے لئے اسباق اور نشان راہ بیان کرتا ہوں کہ کس طرح حق و باطل سورۃ الانعام کے مطابق اللہ تعالیٰ کے "ایک تماشا" کے طور پر ٹکرا رہے ہیں اور مسلمانوں میں بھی کون بدقسمت "مواقع تقدیر" کا صحیح استعمال نہیں کر رہے کہ سورۃ القیامہ کے مطابق بگڑتے ہوئے یا "باسرہ" چہرے لئے پھرتے ہیں تو 1945-46ء کے انتخابات میں مسلمانوں کو مسلم لیگ کے ذریعہ سے بڑی کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ لیکن انگریزوں اور ہندوؤں کے "مشترکہ اقتدار" ان کو ان کا پورا حق دلوانے میں آڑے آ رہے تھے۔ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ وہاں بھی صرف سندھ اور بنگال میں حکومت بنا سکے اور سندھ میں بھی غیر یقینی صورتحال تھی کہ دوسری دفعہ کے انتخابات میں مسلم لیگ نے اپنے اندر مسلمان دشمنوں جی ایم سید' سومرو اور بھگوڑی خاندانوں پر "جھاڑو" پھیر دیا تو انگریزوں کو مسلمانوں کی طاقت کا کچھ اندازہ ہوا۔ پنجاب میں انگریز کے پروردوں جاگیرداروں کو شکست فاش ہو چکی تھی لیکن دھاندلی سے جتواتے ہوئے انگریزوں کے پچھ لگ خضر حیات کو کانگریس اور اکالیوں کی مدد سے مسلمانوں پر براجمان کیا ہوا تھا اور سرحد میں گو ووٹ زیادہ مسلم لیگ کو ملے لیکن سسٹم نے کانگریسی ڈاکٹر خان صاحب کو ان پر براجمان کر دیا تو ان دونوں صوبوں کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے اور 1946-47ء میں جو تحریک چلی تو انگریز نے اس برصغیر سے جانے کی پکی تیاری کر لی کہ پہلے ایک طرف برہما' ملایا میں سبھاش چندر کی فوج آزاد ہند میں اس خطہ کے فوجی قیدیوں کی شمولیت اور بعد میں بحری فوج میں بغاوت یا بری فوج کی سگنل رجمنٹوں میں بغاوت' انگریز کیلئے اب بستر اگول کرنے کے علاوہ چارہ نہ تھا۔ حکومت پر لیبر پارٹی آ گئی تھی' جس میں سٹیفورڈ کرپس وغیرہ۔ ہندو کانگریس کے "دوست" تھے تو انگریز قوم نے کئی فیصلے بہت پہلے کر لئے تھے۔ لیکن ہم پر یہ فیصلے عیاں بہت بعد میں ہوئے۔

اور ان فیصلوں کے واقعاتی پہلوؤں کو سمجھنے کے بعد قارئین کو ولی خان کے "الزامات" اور بہتر طور پر سمجھ آ جائیں گے کہ انگریز ہندوؤں کے ساتھ تھا یا مسلمانوں کے ساتھ ..... اور ہم ثابت کریں گے کہ 1945-46ء کے انتخابات کے بعد' انگریزوں نے اپنا سارا زور ہندو کانگریس کے پلڑے میں ڈال دیا۔ برطانیہ کی حکومت کو معلوم ہو گیا کہ ان کا بوڑھا فوجی فیلڈ مارشل ویول' شملہ کانفرنس کر کے بری طرح ناکام ہوا تھا اور ان کو کسی نوجوان "مکار" کی ضرورت تھی جو ان کی "دور رس" بین الاقوامی پالیسی کو ایسا بنا جائے کہ اس برصغیر کو چھوڑ جانے کے بعد بھی وہ

''بندر بانٹ'' میں حصہ لیتے رہیں۔ تو ان کی نظر نوجوان ایڈمرل ماؤنٹ بیٹن پر پڑی جو ویول کا کامیاب فوجی جانشین ثابت ہوا تھا اور جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد سنگاپور سے انگریزوں کی ''بعد از جنگ'' ڈپلومیسی کو ان علاقوں میں نافذ کر رہا تھا۔ تو سب سے پہلے 1946ء ہی میں اس کا رابطہ جواہر لعل نہرو سے بندھوا دیا۔ حالانکہ کانگریس کا صدر تو Show Boy مولوی آزاد تھا۔ بہانہ یہ بنایا گیا کہ برصغیر ہندو پاکستان کے جو لوگ جنگ عظیم کے دوران جاپان کے وہاں قبضہ سے تکالیف میں رہے۔ ان کی پرسان حالی کی ضرورت تھی۔ اب ان لوگوں میں جو ہندو تھے وہ تو کانگریس کے ممبر اور نہرو کے رفیق سبھاش چندر بوس کی سمندر پار آزاد ہند حکومت کے کارندے تھے۔ کچھ تکلیف ہوئی تو مسلمانوں کو ہوئی۔ ان کی ''پرسان حالی'' کسی مسلمان رہنما کو کرنا چاہیئے تھی۔ یہ صرف بہانہ تھا۔ جواہر لعل نہرو کو حکومت میں لایا جا رہا تھا اور پہلی دفعہ ہندوستان کی خارجہ پالیسی بھی انگریزوں نے اپنے ہاتھ میں رکھنے کی بجائے چند ماہ بعد نہرو کو دے دی۔ نہرو کی ''اہمیّت'' بڑھائی جا رہی تھی اور انگریزوں نے اپنی سب ہمدردیاں ہندو کانگریس کے پلڑے میں ڈال دیں' اب ولی خان اور اُن کے خاندان سے پوچھیں کہ کیا انگریز ہندو کا ''یار'' نہ تھا۔

کہ جلد برصغیر میں کابینہ مشن کو بھی بھیجا گیا۔ جس کا اہم آدمی ہندو کانگریس کا دوست سر کرپس تھا اور لیڈر پیتھک لارنس پر کرپس کے بہت اثرات تھے تو کابینہ مشن نے جو تجاویز دیں۔ اس سلسلہ میں آئے دن ہمارے اخباروں میں کم علمی اور مومن کی فراست کی کمی کی وجہ سے لوگ عجیب وغریب تبصرے کرتے رہتے ہیں کہ برصغیر کے معاملات کا وہ بہترین حل تھا اور قائداعظم یا مسلم لیگ نے وہ غلطی کی یا فلاں بات سے فائدہ نہ اٹھایا تو یہ عاجز ''چشم دید گواہ'' کے طور پر بہت اختصار کے ساتھ ساری صورتحال کو واضح کرے گا کہ ہندوستان کو تین گروپوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ گروپ (A) میں دہلی تک یعنی مشرقی پنجاب تک پورا موجودہ پاکستان تھا۔ گروپ (B) میں بنگال اور آسام کو بھی چھوڑ کر موجودہ بھارت تھا اور گروپ (C) میں سارا بنگال اور صوبہ آسام تھا۔ ان تینوں گروپوں نے دس سال ایک وفاق میں کام کرنا تھا۔ ان کی ایک قانون ساز اسمبلی تشکیل کر دی گئی جن کو صوبوں کے ممبروں نے چننا تھا۔ اور اِن چنیدہ ممبروں نے ہر ''گروپ'' کی حکومت تشکیل دینی تھی' یہ تھی لمبے عرصے کی تجویز جس کے ساتھ کچھ لیگل فریم ورک آرڈرز بھی تھے کہ تمام کام انگریز گورنر جنرل کی رہنمائی میں ہونا تھا۔ البتہ دس سال بعد جو گروپ وفاق سے الگ ہونا چاہے وہ الگ ہو کر اپنا خود مختار ملک بنا سکتا تھا۔ یہ لمبے عرصہ کی تجویز تھی۔

اس کے ساتھ دوسری عبوری (Interm) تجویز تھی۔ جس کیلئے انگریزوں نے کانگریس کے کچھ آدمیوں اور مسلم لیگ کے کچھ آدمیوں کو برابر برابر نمائندگی دے کر اور اقلیتوں سے عیسائیوں' سکھوں اور پارسیوں وغیرہ کا ایک ایک نمائندہ لے کر کچھ آدمیوں کے ناموں کا اعلان کر دیا کہ یہ لوگ حکومت بنائیں گے۔ کانگریس کی طرف سے صرف ہندوؤں کے نام دیئے اور مسلمانوں کی پوری نمائندگی مسلم لیگ کو دے دی اور اعلان کیا کہ جو پارٹی دونوں لمبے عرصہ اور ''عبوری'' تجویز دونوں کو قبول کرے گی وہ حکومت بنائیں گے یا حکومت میں شامل ہو سکیں گے۔ کانگریس نے لمبے عرصہ کی تجویز کو فوراً قبول کر لیا کہ اس میں فوری طور پر ملک کے بٹوارہ کا معاملہ التوا میں پڑ گیا تھا اور پاکستان کا ''ہوا'' جو ہندو کیلئے مسئلہ بنا ہوا تھا' وہ وقتی طور پر ''ٹل'' گیا تھا لیکن عارضی اور ''عبوری'' تجویز

کو مسترد کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی نمائندگی اکیلی مسلم لیگ کو نہ دینا چاہتے تھے اور غیر مسلم لیگیوں کے انتخابات میں اتنی سخت شکست کے باوجود کانگریس اپنے آپ کو مسلمانوں کی نمائندہ بھی سمجھتی تھی۔

لیکن قائداعظم اور مسلم لیگ نے انگریز اور کانگریس دونوں کو حیران کر دیا کہ دونوں تجاویز تسلیم کر لیں کہ دس سال کے انتظار کے بعد مسلمانوں کو مقرر شدہ اور پکی حدود والا پاکستان مل رہا تھا اور یہ حدود موجودہ حدود کی طرح ''غیر فطری'' نہ ہوتیں۔ وہ فطری ہوتیں کہ دہلی تک سارا علاقہ مسلمانوں کو مل جاتا اور مشرق میں بنگال اور آسام مل کر ایک الگ فطری حدود والا ملک بھی ہو سکتا تھا۔ یا مسلمان دونوں علاقوں میں ایک ملک رکھتے یا Confedration بناتے۔ معاملات پر امید تھے اور عارضی حکومت میں مسلم لیگ کو سو فیصدی مسلمانوں کی نمائندگی مل رہی تھی۔ اب اعلان کے مطابق انگریزوں کو حکومت مسلم لیگ اور اقلیتی نمائندوں کے حوالے کر دینا چاہیئے تھی۔ لیکن ہندو کانگریس کے بغیر وہ دس سال یا کچھ عرصہ کیسے حکومت کرتے؟ تو انہوں نے اپنے اعلان کو اپنے مرضی کے معنی پہنانے شروع کر دیئے۔ یہی نہیں بلکہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ کانگریس کو عارضی حکومت سونپ دی اور ان کو ایک مسلمان کانگریسی آصف علی کو بھی نامزد کرنے کی اجازت دے دی اور اقلیتوں کی نمائندگی بھی برقرار رکھی۔ جواہر لعل نہرو کو کونسل کا وائس پریذیڈنٹ بھی تسلیم کر لیا جس کا وائسرائے پریذیڈنٹ تھا۔ اب ہم ولی خان سے پوچھیں گے کہ انگریز ہندوؤں کا یار تھا یا مسلمانوں کا وہ یہ جواب دیں۔ مسلم لیگ نے ایسی صورت حال میں اس حکومت میں شرکت سے انکار کر دیا۔ تو اور ٹوڈی مسلمانوں چند دن پہلے کی پنجاب کی وزیر شاہین عتیق الرحمان کے نانا سر شفاعت احمد اور بمبئی کے شکست خوردہ شیعہ لیڈر سجاد ظہیر کو بھی ممبروں میں شامل کر دیا اور دو مزید ''ٹوڈیوں'' کی تلاش تھی۔ کانگریسی اور ہندو پریس نے خوشیاں منائیں کہ پنڈت جی ''وزیر اعظم'' ہو گئے ہیں تو جگہ جگہ مسلمان بپھر گئے اور احتجاجوں نے وہ صورت اختیار کی کہ ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے۔

یہاں سے خانہ جنگی کی بنیاد بندھ گئی اور کلکتہ وغیرہ عظیم ''مقتل'' بن گئے۔ یا مسلم لیگی لیڈروں نے کچھ سخت بیانات دیئے تو پولیس اور افواج میں بھی ہل چل مچ گئی اور حالات کنٹرول سے باہر ہونے والے تھے کہ انگریزوں نے اعلان کر دیا کہ وہ 1948ء تک ہندوستان کو چھوڑ دیں گے اور وائسرائے کو بھی تبدیل کر دیا کہ ویول صاحب کی جگہ ماؤنٹ بیٹن آ رہے ہیں۔ جو پارٹی حکومت سے تعاون کرے گی انگریز حکومت اس پارٹی کے حوالے کر دیں گے۔

قائداعظم کا خود گورنر جنرل بننے کا فیصلہ نہایت مناسب تھا

اب کانگریس کو شہ مل گئی۔ انہوں نے قانون ساز اسمبلی کا اجلاس بلا لیا جس کا مسلم لیگ نے بائیکاٹ کرنے کا اعلان کر دیا اور ہندو کانگرس نے اجلاس میں جو وطیرہ اختیار کیا کہ انگریزوں نے جو لیگل فریم ورک آرڈر بنائے ہیں وہ ان کے پابند نہیں اور گروپوں کو الگ ہونے کی پوری آزادی نہیں اور گروپوں کی حدود بھی پکی نہیں۔ ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے یعنی کانگریس نے لمبے عرصے کی تجویز کی بھی ''دھجیاں'' اڑانا شروع کر دیں۔ تو قائداعظم نے بڑا مومنانہ اعلان فرمایا کہ لمبے عرصے کی تجویز ایک ایسی گولی تھی جس کے اوپر شکر چڑھی ہوئی تھی۔ وہ اب اتر گئی ہے تو باقی کڑوی گولی ہندو کانگریس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی۔ یعنی اس تجویز نے وقتی طور پر پاکستان کے

مطالبہ کو التوا میں ڈالا تو ہندو کانگریس خوش ہوگئی تھی۔ لیکن اب ان کو اس میں فطری حدود والا پاکستان نظر آ رہا ہے تو گھبرا گئے ہیں اور ہر چیز کو حسب معمول اپنی مرضی کے معنی پہنا رہے ہیں۔

قارئین! یہ تھی قائداعظم کی مومن کی فراست کہ قائد نے کچھ مسلمان لیڈروں سے اعلان کروا دیا کہ موت کا ایک دن معین ہے۔ ہم نے ہر چیز امن اور انصاف کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ہمارے حقوق کو روندا جا رہا ہے۔

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اب انگریز گھبرا گیا تو نواب آف بھوپال کی مدد سے مسلم لیگ والوں کو گزارش کرائی کہ وہ کسی ہندو یا اچھوت کو اپنا نمائندہ بنا کر کانگریس کے ساتھ برابری کے طور پر حکومت میں شریک ہو جائیں کہ کانگریس اگر مسلمانوں کی نمائندہ ہے تو مسلم لیگ والے اکثریتی مسلمان صوبوں میں ہر قوم کی نمائندہ ہیں۔ تو اس طرح لیاقت علی کے تحت جوگندر ناتھ منڈل کو ساتھ شامل کر کے 1946ء کے آخری حصہ میں برابری کے طور پر مسلم لیگ نے حکومت میں شرکت اختیار کر لی۔ نہرو نے وائس پریذیڈنٹ کے طور پر تمام ممبروں کی میٹنگ بلائی تو مسلم لیگ کے ممبروں نے اس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ دراصل دہلی میں اس دن سے دو حکومتیں قائم ہو گئیں تھیں۔ کانگریسی ممبروں کے تحت بھارتی حکومت اور مسلم لیگی ممبروں کے تحت پاکستانی حکومت۔ دیکھیں قدرت کے راز وہ مخالفتوں کے باوجود پاکستان کو وجود میں لا رہی تھی۔

نئے سال کے شروع میں ہی لارڈ مونٹ بیٹن دہلی پہنچ گیا اور وائسرائے کی گدی سنبھال لی۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کی وجہ سے ہماری قوم صرف ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف کو اپنا دشمن سمجھتی ہے۔ پوری انگریز قوم ہماری دشمن ہے۔ لمبے عرصے کی کابینہ مشن کی تجویز پر کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلاف اتنے زیادہ تھے کہ دسمبر 1946ء میں قائداظم اور لیاقت ایک طرف اور نہرو و بلدیو سنگھ دوسری طرف سب کو لندن بلایا گیا کہ تجویز دینے والے ممبروں کی مدد سے وضاحتیں کی جائیں کہ حقیقت کیا ہے اور کون صحیح ہے۔ قائداعظم کی مومنانہ فراست نے انگریزوں اور نہرو کو تحیر میں ڈال دیا اور قائداعظم نے اپنی سوچ کے لفظ لفظ کو صحیح ثابت کیا کہ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مسلم لیگ اکیلی ہی مسلمانوں کی نمائندہ ہے اور ''A'' یا ''C'' گروپ پاکستان کی بنیاد کو مضبوط بنیادوں پر باندھنے کی بسم اللہ ہے۔ تو اب چالباز مکار اور عیار انگریز نے مسلمانوں کو ماؤنٹ بیٹن کے ذریعے سے ایک لنگڑا لولا پاکستان دینے کی تجویز بنائی۔ یہ اکیلی لیبر پارٹی نہ تھی۔ چرچل کی ٹوری پارٹی بھی اس سازش میں شریک تھی کہ ماؤنٹ بیٹن کا چیف ایڈوائزر میجر جنرل اسے تھا۔ جو دوسری جنگ عظیم میں مسٹر چرچل کا پولیٹیکل اور ملٹری سیکرٹری تھا اور ہماری آزادی کے بعد لارڈ اسے ٹوری حکومت میں کامن ویلتھ کے محکمے کا وزیر رہا۔ بھارت سے ایک ہندو مدراسی سول سروس کا افسر مسٹر مینن جو سردار پٹیل کا ''چیندہ'' تھا۔ اس کو ماؤنٹ بیٹن کا مشیر مقرر کیا گیا۔

جو کچھ ماؤنٹ بیٹن نے ہمارے ساتھ کیا اور تقسیم کیلئے جو بھونڈے طریقے اختیار کئے گئے کہ کوئی اصول نہ تھا ایک اصول جو ایک جگہ صحیح مانا گیا دوسری جگہ اس اصول کی دھجیاں اڑا دی گئیں۔ کانگریس کو پنجاب اور بنگال کو تقسیم کرانے کے لئے کوئی محنت نہ کرنا پڑی۔ کانگریسی مولوی آزاد کی کتاب ''انڈیا ونز فریڈم'' کے صفحہ 88-187 پر

لکھا ہوا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے ہندو کانگریس کو بہت پہلے بتا دیا تھا کہ وہ لوگ ملک کے بٹوارے کیلئے تیار ہو جائیں کہ مسلم لیگ کو زمین کے چند ٹکڑے ملیں گے۔ اور کانگریس کو پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کرنے کی ضرورت نہ پڑے گی کہ ایسا ماؤنٹ بیٹن خود کرے گا'' اور صوبہ سرحد پر پاکستان کا ہرگز حق نہیں۔ وہاں تو کانگریس کی حکومت ہے اور وہاں کے مسلمان ہمارے ساتھ ہیں اور کشمیر کے راستے ہم سرحد کے ساتھ ملاپ رکھیں گے۔ اس لئے مسٹر جواہر لعل نہرو ذرا وہاں کا چکر لگا آئیں۔ خاص کر قبائلی علاقہ کے پٹھان بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر خان صاحب اور اس کے بھائی غفار خان، اس ''شو'' یا ''خوش آمدید'' کا بندوبست کریں گے۔ لیکن جب نہرو صوبہ سرحد اور خاص کر قبائلی علاقوں میں پہنچا تو اس کی جو ''جوت پرشاد'' ہوئی اور اس کے خلاف جو مظاہرے ہوئے دنیا حیران ہو گئی کہ غیرتمند پٹھان ایک پنڈت کو جو صبح و شام پاکستان اور مسلمان کے خلاف باتیں کرتا ہے اس کو اپنی پاک سرزمین پر قدم نہ رکھنے دیں گے اور وہ ایک مکار ہندو کو اپنا حکمران اور رہنما نہیں بنا سکتے۔ ''اے پنڈت تم واپس جاؤ'' اور صوبہ سرحد کے پاکستان میں شامل ہونے کا اصلی ریفرنڈم تو انہی دنوں ہو گیا تھا اور ہندو انگریز دونوں جو ایک برائے نام لنگڑا لولا پاکستان بنانے کی مشترک قدر پر خفیہ سمجھوتہ کر چکے تھے۔ وہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔

اپریل 1947ء سے خبریں آنا شروع ہو گئیں کہ ہندوستان کا بٹوارہ ہو رہا ہے لیکن ہندو ہر روز پاکستان کے خلاف کسی نئی سازش کو جنم دیتے تھے۔ ساتھ خبریں آنے لگیں کہ دونوں ملکوں کا دفاع متحد ہو گا۔ یا افواج کا بٹوارہ نہ ہو گا اور فیلڈ مارشل آکنلیک افواج کا سربراہ اس سازش میں ہندوؤں کا ہمنوا تھا۔

بہر حال اس سازش کو تو قائداعظم کے ایک فقرہ کے مومنانہ اعلان نے ختم کر دیا کہ انگریزوں کی باجگزار ریاستوں میں فوج کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ اپنی الگ فوج کے بغیر کسی آزاد ملک کا تصور احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف ہے۔ اب سازش نے رنگ تبدیل کیا کہ ہندو اخباروں اور لیڈروں نے کہنا شروع کر دیا ''کہ جو لوگ پاکستان کی فوج میں جانا چاہیں گے وہ فوج سے مستعفی ہو جائیں اور پھر پاکستان اپنی فوج بناتا رہے''۔ اب دہلی میں کافی ہم خیال سرکاری نوکروں نے مسلم لیگ کی تنظیم بنائی ہوئی تھی۔ جہاں راجہ غضنفر علی، یا مسلمان اخباروں اور اخبار نویسوں اور دہلی کے مسلم لیگ کے کچھ لیڈروں ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سے ہمارا رابطہ تھا۔ تو مئی 1947ء میں ہی ہم لوگوں نے فوج کے بٹوارے کی ایک تجویز مسلم لیگ کی اخباروں میں شائع کرنا شروع کر دی کہ کون کون سی رجمنٹ یا یونٹیں یا ادارے پاکستانی فوج کا حصہ بنیں گے اور بٹوارہ کیسے ہو گا۔ اس چیز نے بعد میں بڑا فائدہ دیا کہ کافی حد تک منظم فوج کے تیسرا حصہ کو پاکستانی فوج میں شمولیت نے بہت معاملے حل کر دیئے۔ گو بھارت نے ہمارے حصے کا فوجی سامان ہمیں وعدہ کے مطابق نہ دیا کہ یہ ذمہ داری متحدہ سپریم کمانڈر آکنلیک کی تھی، جو اپنی ذمہ داری میں بری طرح فیل ہوا یعنی ہماری دھیلے کے برابر مدد نہ کر سکا۔

بے شک کوئی انگریز ہمارے لئے اچھا ثابت نہ ہوا لیکن جنہوں نے ہمیں بے حساب نقصان پہنچایا ان میں ماؤنٹ بیٹن پہلے نمبر پر ہے اور ہمارے جو لوگ آج کل بیان دیتے رہتے ہیں کہ اگر ہم اس کو پاکستان کا گورنر جنرل بنا دیتے تو وہ ایسا نقصان نہ پہنچاتا وہ لوگ حالات کی تہ تک کبھی نہیں گئے۔ اگر ہم ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل بنا دیتے تو شاید پاکستان چند ماہ میں ختم ہو سکتا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کے ایک تعصب کا ذکر تو کر چکا ہوں۔ کہ وہ مغربی

بنگال اور مشرقی پنجاب ہندوؤں کو پلیٹ پر پیش کر چکا تھا اور بٹوارے کی تجویز کا جو خاکہ بنا کہ 19 مئی لندن سے منظور کرانے کے لئے لے گیا اس سلسلہ میں مسٹر موسلے کی کتاب ''لاسٹ ڈیز آف برٹش ایمپائر'' کے صفحات 125 تا 126 یا صفحات 153 تا 156 میں بڑے انکشافات ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن یہ بٹوارے کا خاکہ نہرو کو 9 مئی 1947ء کو دکھا چکا تھا۔ اور اس سے وعدہ لے چکا تھا کہ بھارتی اس کو بھارت کا گورنر جنرل بنائیں گے۔ قائداعظم کو لندن جانے سے دو دن پہلے صرف اتنا بتلایا کہ ملک کا بٹوارہ ہو رہا ہے اور دونوں ملکوں کا گورنر جنرل ایک ہونا چاہئے۔ قائداعظم نے مومنانہ جواب دیا کہ گورنر جنرل تو دونوں ملکوں کے الگ الگ ہونے چاہئیں۔ تم چند ماہ دونوں پر ''منصف'' کا کام کرنا یعنی تم کو نہ پاکستان کا گورنر جنرل بننا چاہیے نہ بھارت کا لیکن ماؤن بیٹن نے انگریز وزیراعظم ایٹلی کو تسلی دی کہ دونوں ملکوں کا متحدہ گورنر جنرل وہی ہوگا یعنی پاکستان کا تو وہ ''دھونس'' سے گورنر جنرل بن جائے گا اور یہ بڑی غلط بات تھی کہ بٹوارہ کا فیصلہ کرنے والا ''منصف'' رہنے کی بجائے بھارت کا گورنر جنرل بن گیا۔

اب قائداعظم نے 3 جون کے اعلان کے بعد سارے فیصلے کرا کر 5 جولائی 1947ء کو لیاقت علی کو بتایا کہ وہ ماؤنٹ بیٹن کو بتا دے کہ قائداعظم از خود پاکستان کا گورنر جنرل ہوگا۔ اور اس کے بعد بھی ماؤنٹ بیٹن کو امید تھی کہ وہی گورنر جنرل ہوگا کہ نواب بھوپال کو کئی دفعہ قائداعظم کے پاس بھیجا۔ لیکن مسلمانوں کے خلاف پہلے سے اس کے تعصب کی حالت یہ تھی کہ اس کے مشیروں میں صرف ایک انگریز مسٹر کورفیلڈ کچھ دیانتدار آدمی تھا جس نے ماؤنٹ بیٹن کو مشورہ دیا تھا کہ حیدر آباد اور کشمیر دونوں کا مسئلہ ایک قسم کے اصول کے تحت حل ہو۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن کہتا تھا کہ ''کشمیر میں ایک جلسہ کر کے لوگوں کی رائے پوچھ لی جائے اور حیدر آباد میں انگریز افسروں کے تحت رائے شماری کرائی جائے'' کہ ماؤنٹ بیٹن فراڈ کر کے کشمیر بھارت کی جھولی میں ڈالنا چاہتا تھا۔ تو جون کے اعلان کے بعد ایک بہانہ کر کے کہ وہ مہاراجہ کشمیر کو 1921ء سے جانتا ہے جب وہ اس وقت کے پرنس آف ویلز (بعد میں ایڈورڈ ہشتم) کے اے ڈی سی کے طور پر ہندوستان آیا تھا تو اب 19 جون 1947ء کو وہ مہاراجہ کو ملنے کشمیر چلا گیا اور اس کے ساتھ وعدہ کر آیا کہ لندن سے مشورہ کر کے وہ جلدی گلگت ایجنسی مہاراجہ کے حوالے کر دے گا اور یہ عاجز اپنے پہلے مضامین میں گزارش کر چکا ہے کہ جولائی 1947ء میں انگریزوں نے ہمارے ساتھ یہ بے ایمانی بھی کر دی کہ گلگت جو چترال کے ساتھ پولیٹیکل محکمہ کے ماتحت تھا وہ مہاراجہ کو واپس کر دیا۔ اور کشمیر کی موجودہ بے یقینی کی صورت حال کی ساری ذمہ داری کی بنیاد ماؤنٹ بیٹن باندھ گیا قائداعظم نے خود گورنر جنرل بن کر جس اسلامی غیر تمندی کا مظاہرہ کیا اور ہماری جو بنیاد باندھ گئے اس وجہ سے یہ ملک قائم ہے اور یہ کچھ میں آنے والے مضامین میں ثابت کروں گا کہ اگر وہ زندہ رہتے تو کبھی فائر بندی کی اجازت نہ دیتے کہ ایک دفعہ چودھری محمد علی نے ایسا ''اشارہ'' کیا تو وہ سخت ناراض ہوئے تھے اور جب تک ان کی سانس آتی رہی۔ بھارت کو حیدر آباد پر حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور کشمیر کے بارے ہماری اکثر کارروائیوں اور پالیسیوں کے بارے قائداعظم کو ''اندھیرے'' میں رکھا گیا لیکن وہ بیمار تھے اور مجبور تھے ہم نے ان کو مایوس کیا۔ میں سب کوتاہیوں سے پردے اتاروں گا کہ ہماری کم علمیوں اور مومن کی فراست سے عاری ہونے کی وجہ سے ہم پاکستان بنانے کے مقاصد حاصل نہ کر سکے۔ ماؤنٹ بیٹن اتنا بے ایمان تھا کہ جب وہ کشمیر گیا تو اپنے دیانتدار مشیر کورفیلڈ کو ساتھ ہی نہ لے

گیا۔ ہم اگر اس کو اپنا گورنر جنرل بنا دیتے تو معلوم نہیں وہ ہمارا کیا کر جاتا کہ سرحد کا ریفرنڈم جیت کر ہم جو موجودہ پاکستان حاصل کر رہے تھے یہ کچھ انگریز کی مرضی کے خلاف ہو رہا تھا۔

یہ عاجز 3 جون کے اعلان اور متعلقہ واقعات کے تاریخی واقعات کو زیر بحث نہ لائے گا کہ یہ مضامین تاریخ کی کہانی نہیں۔ یہ عاجز صرف 14 اگست 1947ء کے بعد اپنی کچھ غلطیوں کی نشاندہی کرے گا کہ ہم نے قوم کے طور پر نہ پاکستان بنانے کے مقاصد کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کی، نہ کوئی تحقیقی ادارہ بنایا کہ ان مقاصد اور اسلام کے نفاذ کے سلسلہ میں تحقیق کریں کہ اسلام کیا ہے اور اس کا نفاذ کیوں اور کس کیلئے ہو؟ ہم ''خود کون ہیں'؟ اور ہماری زندگی کے مقاصد کیا ہیں؟ اور کیا پاکستان ہم نے اس لئے بنایا کہ لوٹ مار یا جس طرح ہو سکے بس اپنا پیٹ بھریں اور فلاحی مملکت اور جنت ارضی کے غلط نعرے لگاتے رہیں۔ کیا ہم حضور پاک ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کے جانشین ہیں؟ یا جارج ششم کے۔ کیا ہم نے پاکستان غیروں کے باطل نظریات اور مادر پدر آزاد جمہوریت کی پیروی کرنے کیلئے بنایا تھا؟ یا باطل نظریات پر اسلامی لیبل لگا کر ان کو ''اسلامی'' بنا رہے ہیں، جیسے سؤر پر تکبیر پڑھ کر اُس کا گلا کاٹ دیا جائے اور اعلان کر دیں کہ یہ حلال ہو گیا ہے۔ ہمارا منہ خانہ کعبہ کی طرف کیوں نہیں ہو رہا کہ پہلے مضامین میں گبریلے کی مثال دی تھی کہ خوشبو دار پھولوں کی بجائے اس کو گوبر سے زیادہ ''محبت'' ہے کہ ہم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت میں ''شرکت'' دے رہے ہیں۔ اور 1949ء کی لیاقت علی کی ''قرارداد مقاصد'' ایک کافرانہ عمل ہے۔ سمجھ نہیں آتی کہ شبیر احمد عثمانی جیسے عالمِ دین نے اس کافرانہ مسودہ کی حمایت کیوں کر دی۔ اللہ تعالیٰ کی پوجا کے ساتھ وطن کی ''پوجا'' بھی کرتے ہیں۔ اپنے اماموں، پیروں فقیروں اور رہنماؤں کو رسول پاک ﷺ کی نبوت میں ''شرکت'' دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ یہ ساری باتیں تفصیل سے زیر بحث لانے کیلئے کئی کتابوں کی ضرورت ہے، جس سلسلہ میں یہ عاجز بہت کچھ لکھ چکا ہے لیکن ان مضامین میں صرف اپنے مشاہدات میں آنے والی چند غلطیوں کے واقعات اور ان کے عملی پہلوؤں کو زیر بحث لائے گا کہ آؤ ہم اپنے آپ کو بھی پہچانیں اور اپنے دشمنوں کو بھی پہچانیں اور اس سلسلہ میں سب سے بڑی غلطی ہم نے یہ کی کہ ہم نے کچھ انگریزوں کو نوکر رکھ لیا جنھوں نے ہمارے ساتھ بڑی غداریاں کیں اور ہمارے رخ کو غلط طرف موڑ گئے جواب بھی صحیح نہیں ہو رہا۔ بریگیڈئر صدیق کا اس سلسلہ میں تبصرہ پہلے زیر بحث آ چکا ہے۔

انگریزوں نے بٹوارے میں جو ہمارے ساتھ بے ایمانیاں اور ناانصافیاں کیں اس کے بعد اس قوم سے ہم جتنی دوری رکھتے۔ اس میں ہمارا بھلا ہوتا اور فطرت کسی اور طرف سے ہمیں مالا مال کر دیتی۔ اول تو پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا کوئی جواز نہ تھا اور آسام کا صوبہ ہندو صوبہ نہ تھا۔ وہ بھارت کو دینے میں کوئی تک نہ تھا۔ اب جو یہ اضلاع مسلم اکثریت والے ہمیں دیئے گئے ان میں صرف تحصیل پٹھانکوٹ میں، ہندوؤں کو مسلمانوں پر کچھ تھوڑی اکثریت تھی لیکن بھارت کو جو اضلاع دیئے گئے ان میں ضلع امرتسر کی تحصیلوں، اجنالہ اور ترن تارن میں ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر اور ضلع فیروز پور میں تحصیل زیرہ اور تحصیل فیروز پور میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ اب پٹھانکوٹ بھارت کو دینے کیلئے اس کے ملحقہ ہماری اکثریت والی تحصیلیں بٹالہ اور گورداسپور بھی بھارت کے حوالے کر دیں اور ہماری اکثریت والی پانچوں کی پانچوں تحصیلیں، بھارت کے پاس رہنے دیں حالانکہ وہ ہمارے ملحقہ

علاقوں کے ساتھ آسانی سے ملائی جا سکتی تھیں۔ اگر ہمارا یہ حق ہمیں مل جاتا تو میدانی علاقے کے دریائے راوی پر ہمارا قبضہ ہوتا اور مادھو پورن ہیڈ ورکس، پاکستان کے حصہ میں آتا اور دریائے راوی کے پانی کا بھارت اس طرح مالک نہ بن جاتا۔ جس طرح اب بن گیا ہے۔ علاوہ ازیں پہلے فیصلہ کے مطابق فیروز پور ہیڈ ورکس، تحصیل فیروز پور اور تحصیل زیرہ، ہمارے حق کے طور پر ہمیں دیئے گئے تھے اور یہ کچھ پنجاب کے گورنر جینکنز کی میز پر 12 اگست کو ہمارے مقرر کردہ گورنر سر فرانسس مودی نے اپنی آنکھ سے دیکھا بلکہ قائداعظم کو شک پڑ گیا کہ گورداسپور کا ضلع بھارت کو دیا جا رہا ہے تو انہوں نے 9 اگست کو چودھری محمد علی کو خصوصی طور پر دہلی بھیجا کہ وہ ماؤنٹ بیٹن کے مشیر خاص یا نائب میجر جنرل اسمے سے علیحدگی میں بات کریں کہ انگریز قوم ہمارے ساتھ اتنی بے انصافی نہ کرے کہ جنرل اسمے کا تعلق چرچل پارٹی سے تھا تو جنرل اسمے نے بالکل صاف صاف جواب دیا کہ ایسی باتوں کے ساتھ نہ اس کا کوئی تعلق ہے نہ اس کو کوئی اطلاع دی جاتی ہے لیکن اس کے دفتر میں چودھری محمد علی نے وہ نقشہ دیکھ لیا جو اس نقشہ کی کاپی تھی جو 12 اگست کو ہمارے نامزد گورنر مودی نے دیکھا جس میں باقی بے ایمانیاں تو موجود تھیں۔ لیکن فیروز پور کا ہیڈ ورکس، تحصیل فیروز پور اور تحصیل زیرہ پاکستان کو مل رہی تھیں تو محمد علی نے جنرل اسمے کو اس کی طرف متوجہ کیا تو وہ کہنے لگا کہ کوئی آدمی اپنا اندازہ لگا تا رہا ہے۔ توبہ میرے اللہ

لیورڈ موسلے اور کیمبل جانسن کی کتابوں میں انکشاف ہے کہ 8 اگست کو حد بندی کا فیصلہ ریڈ کلف اور ماؤنٹ بیٹن نے کر لیا تھا کہ گورداسپور تو بھارت کو دے دیا لیکن فیروز پور کی دونوں تحصیلیں پاکستان کو دیں اور 14 اگست کو ان کے اعلان سے پہلے "خاص انگریزوں" کو یہ نقشے دے دیئے گئے اور ماؤنٹ بیٹن نے یہ کچھ جواہر لعل نہرو کو بھی بتا دیا۔ اب راجہ بیکانیز اور راجپوتانہ کے کئی راجے، نہرو کو بتا چکے تھے کہ وہ اس ملک میں شامل ہوں گے جس کو فیروز پور ہیڈ ورکس ملے گا تو نہرو نے فیروز پور کے سلسلہ میں فیصلہ کی تبدیلی کی گزارش کی۔ اب ماؤنٹ بیٹن سب کچھ برطانیہ کی حکومت کے ایما پر کر رہا تھا تو نہرو کے اس مطالبہ کو نہ صرف برطانیہ کی حکومت نے ماننا تھا بلکہ چرچل کی اپوزیشن سے بھی اجازت لینا تھی۔ جس پر دیر لگ گئی اور یہ فیصلہ 14 اگست کو جاری نہ ہو سکا البتہ ریڈ کلف سے ماؤنٹ بیٹن نے اس تاریخ کے دستخط لے کر "چپکے" سے اس کو تو 15 اگست کو لندن روانہ کر دیا کہ برطانیہ سے "ہاں" میں فیصلہ 16 اگست کو پہنچا اور ماؤنٹ بیٹن نے فیصلہ کا اعلان 17 اگست یعنی وعدہ کے تین دن بعد کیا۔ قارئین۔ ولی خان ہماری ناسمجھ قوم کو اسی طرح بے وقوف بنا رہا ہے، جس طرح ہر سازش کر کے انگریز ہمارا دوست بنا ہوا ہے۔ اب ولی خان یا اُس کے مداح اس سلسلہ میں کیا کہتے ہیں راقم کے کئی انگریز افسر "دوست" تھے جو جنگ کے فوراً بعد ریٹائر ہو گئے تھے کہ بہت بڑے اخبار نویس تھے اور میری ان کے ساتھ خط و کتابت رہی۔ وہ لکھتے رہتے تھے کہ تمہارے ساتھ لیبر پارٹی نے بڑی "ناانصافیاں کیں" جب ٹوری پارٹی دوبارہ برسر اقتدار آئے گی تو پاکستان کی ہر طرح مدد کرے گی۔ قارئین۔ یہ سب لیپا پوتی ہے۔ انگریز قوم کے "حیلوں" کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔

آج سے دس بارہ سال پہلے بھی ہماری پنجاب رجمنٹ کے ری یونین میں چند انگریز افسر آئے جن میں سے کافی افسروں کو برادرم کرنل محمد اسلم مرحوم یا کرنل محبوب مرحوم اور یہ عاجز جانتے تھے اور ہمیں اپنی رجمنٹ نے بھی خصوصی ہدایات دیں کہ ہم اس تقریب میں ضرور شامل ہوں۔ یہ انگریز بڑے دوستی کے "دم بھرتے" رہے اور کہتے تھے کہ

لیبر پارٹی نے ہمارے ساتھ بے انصافیاں کیں۔ اس عاجز نے اس زمانے میں یہ سب تحقیقات کر لی تھیں اور میں نے ان کو صاف بتایا کہ ہمارے ساتھ یہ کچھ تم پوری قوم نے کیا۔ یہ سن کر وہ عجیب وغریب قسم کی ہنسی سے کچھ باتیں تسلیم کر کے ساتھ یہ اضافہ بھی کر دیتے کہ اب بھی ان کے ملک میں ہمارے ''ہمدرد'' موجود ہیں تو یہ میرے اللہ۔ رب کی ذات پاک نے کیسی قوم اور ان کی یا اینگلو امریکن کی بین الاقوامی پالیسی کا ہمیں ''شکار'' بنایا ہے۔

ریڈکلف ایوارڈ ایک ڈرامہ تھا

قارئین! ریڈکلف کا ایوارڈ ایک ''ڈرامہ'' تھا اور بے شک ہمارا مقدمہ وغیرہ بھی ممتاز دولتانہ وغیرہ نے ٹھیک طور پر تیار نہ کیا۔ ہمارا قادیانی وکیل ظفر اللہ ہمارا وفادار کم اور قادیانیوں کا وفادار زیادہ تھا۔ جسٹس منیر جو ججوں میں ہمارا نمائندہ تھا وہ بے دین تھا اور اس نے پاکستان میں ہر قانون کی دھجیاں اڑائیں لیکن میں ان چیزوں پر بحث نہیں کرتا کہ یہ کوتاہیاں نہ بھی ہوتیں تو انگریز نے ہمارے ساتھ وہی کچھ کرنا تھا جو کیا اور قائداعظم کو پہلے سے شک تھا۔ انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ حد بندی کا فیصلہ اقوام متحدہ سے کرایا جائے۔ انگریزوں نے انکار کر دیا کہ اقوام متحدہ دو خود مختار ملکوں کے درمیان فیصلہ کراتی ہے۔ تمہارا ملک ابھی وجود میں نہیں آیا قائد نے فرمایا۔ اچھا تین لارڈز کو مقرر کیا جائے جو یہ فیصلہ دیں۔ جواب دیا گیا وقت تھوڑا ہے گرمیوں کے موسم میں وہ اس علاقے کا سفر نہیں کر سکتے۔ قائد نے فرمایا معلوم کیا جائے کہ کچھ لارڈ شاید اس کام کے لئے اور گرمیوں میں سفر کرنے کو تیار ہو جائیں جواب دیا گیا' اتنا وقت موجود نہیں۔ بہت جلدی ہے۔ 1948ء کی بجائے ہم 1947ء میں اس ملک سے جا رہے ہیں۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

اور جن انگریزں نے بڑی وفاداری کا دم بھر کے ہماری نوکری قبول کی ان کی بیوفائی اور غداریوں کی داستانیں نہ ختم ہونے والی کہانیاں ہیں جن کے مختصر تعارف کے بعد آنے والے بیانات میں کچھ واقعات میں ان کے کردار سے پردے اتارے جائیں گے۔ صوبہ سرحد کیلئے قائداعظم نے ایک بہترین قسم کے انگریز منتظم جارج کننگھم کو چنا اور وہاں کا گورنر بنایا۔ اس شخص نے ایک طرف ہمارے لیڈروں کو شہ دی کہ ہم قبائلی لشکروں سے کشمیر ''فتح'' کرالیں اور دوسری طرف بھارت کے انگریز کمانڈر انچیف جنرل راب لاکھرٹ کو خبر دے دی کہ ایسا ہو رہا ہے جو خبر بھارتی اخباروں میں بھی شائع ہوگئی تو اس آدمی سے تو دو ماہ کے اندر ہی چھٹکارا حاصل کر لیا لیکن پوری سازش اور نقصانات کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ پنجاب کیلئے قائداعظم نے سر فرانسس موڈی کو گورنر چنا کہ صوبہ سندھ میں اس نے انصاف سے کام کیا تھا۔ اس شخص نے ہمیں جو نقصانات دلوائے ہمیں بہت دیر کے بعد سمجھ آئے جن میں سے کچھ باتیں آگے واقعات میں آ رہی ہیں کہ اسی شخص نے غلام کذاب کے پوتے ایم ایم احمد کو سیالکوٹ کا ڈپٹی کمشنر بنایا کہ آزادی کشمیر کیلئے جموں محاذ نہ کھولنے دیا یا بعد میں سارے سیالکوٹ کے علاقہ سے مجاہدین کا صفایا کرایا۔ اسی شخص نے تین سو ٹرکوں میں فوجی حفاظت کے تحت قادیان سے غلام کذاب کے مرکز کو پہلے لاہور ''شفٹ'' کرایا اور ممتاز دولتانہ کے ذریعے سے قائداعظم کی وفات کے ایک ہفتہ کے اندر قادیانیوں کو ربوہ کی زمین

کوڑیوں میں دلوائی اور پاکستان کے مرکز میں قادیانیوں کا پودا لگوایا۔ لیاقت علی سے مل کر ممدوٹ اور دولتانہ
اور کیا کچھ نہ کیا۔

بری فوج کی سربراہی کیلئے قائداعظم نے ہمارے مشورہ سے جنرل فرانس ٹکر کا نام دیا لیکن انگریزوں نے ہمیں ایک ''کھچرا'' قسم کا جنرل فرینک میسروی دیا جو آدمی 1922ء سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا دوست تھا کہ ماؤنٹ بیٹن شہزادہ ایڈورڈ کا اے ڈی سی تھا اور میسروی وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ کا اے ڈی سی تھا اور ادھر سیالکوٹ ہی میں ہمارے موجود تیرھویں رسالہ کا 1938ء میں کرنل بن گیا کہ میری آنکھوں کے سامنے اس رجمنٹ میں گھوڑوں کی بجائے بکتر بند گاڑیاں آئیں۔ اس ''کھچرے'' انگریز کے ساتھ اس زمانے میں بھی اس کے عجیب وغریب کردار کی کئی کہانیاں وابستہ تھیں۔

قبائلی مجاہدین کو مشرقی پنجاب میں داخل کر دیا جاتا تو جہاد خود بخود ہمارا طرزِ زندگی بن جاتا

پاکستان بننے کے دس پندرہ سال بعد بھی ولایت میں اس شخص کی بے راہ روی کی باتیں اخباروں میں آئیں۔ اس آدمی نے جاگیرداروں اور خاص کر ٹوانوں کے ساتھ بڑی ''دوستیاں'' بنائی ہوئی تھیں اور اپنے ''لچر'' قسم کے ہمراہیوں کے ساتھ چھٹیاں ان جاگیرداروں کے ہاں مناتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں اپنے بکتر بند ڈویژن کو افریقہ میں بری طرح سے شکست سے دوچار کیا اور اپنے رینک کو اتار کر ''بوڑھا ٹامی'' بن کر قید سے بچ گیا کہ جرمن جنرل رومیل کو اس پر ''ترس'' آ گیا تھا تو اس کو برما میں پیدل ڈویژن کی کمانڈ دے دی گئی۔ وہاں جاپانیوں کے سامنے ''پاجامہ'' پہنے بھاگ کھڑا ہوا اور ''پاجامہ جنرل'' مشہور ہوا' لیکن ماؤنٹ بیٹن اس کا سپریم کمانڈر تھا۔ اس نے اس کو بہادری قرار دیا اور لیفٹیننٹ جنرل بنوا دیا اور اب انگریزوں نے اس کو ہمارے سر ''مڑھ'' دیا کہ ماؤنٹ بیٹن کی پالیسی اور احکام کو پاکستان میں نافذ کرے کہ آتے ہی فیصلہ دیا کہ پاکستان غریب ملک ہے یہ موٹر گاڑیاں اور بکتر بند گاڑیوں والی فوج نہیں رکھ سکتا۔ خچر اور گھوڑوں کو فوج میں لایا جائے۔ اخباروں میں تو صرف جارج کننگھم کی تار کی خبر ہے کہ اس نے بھارت کی فوج کے انگریز جنرل لاکھارٹ کو خبر دی کہ قبائلی مجاہدین کشمیر پر حملہ کر رہے ہیں لیکن اب یوسف صراف وغیرہ اپنی کتابوں میں وہ ٹیلی فون نمبر بھی لکھ چکے ہیں جن سے جنرل میسروی اور اس کا نائب جنرل ڈگلس گریسی۔ بھارت میں جنرل لاکھارٹ اور اس کے نائب جنرل بوچر کے ساتھ بات کر کے قبائلی مجاہدین کی پوری حرکتوں سے آگاہ کرتے رہے ایلن کیمبل اپنی کتاب میں یہی کچھ لکھتا ہے اور بھارت تیار تھا کہ بارہ گھنٹوں کے اندر ایک بریگیڈ فوج سری نگر میں اتار دی۔ بہرحال اس ''کھچرے'' قسم کے جنرل سے تو شروع 1948ء میں ''چھٹکارا'' حاصل کر لیا گیا اور قائداعظم نے دوبارہ جنرل فرانسس ٹکر کی ڈیمانڈ دی اور حکومت برطانیہ مان گئی۔ جنرل ٹکر' کراچی پہنچ بھی گیا لیکن ماؤنٹ بیٹن نے یہ تقرری رکوالی اور انگریزوں نے ماؤنٹ بیٹن کی مرضی کا دوسرا آدمی میسروی کا نائب جنرل گریسی ہم پر ''مڑھ'' دیا۔ البتہ جنرل میسروی سے ''چھٹکارا'' ضروری تھا کہ آگے پوری کہانی آ رہی ہے کہ جب قائداعظمؒ نے بھارتی فوج کے سری نگر میں لینڈنگ کے بعد دو پلٹنوں سے جموں' کٹھوعہ روڈ کاٹ دینے کا حکم دیا تو یہ میسروی صاحب ''مچھلیوں'' کے شکار کا شوق فرما رہے

تھے کہ دور دراز جگہ ذمہ داری سے دور تھا کہ پاکستان کے کسی ردعمل پر وہ کارروائی کو التوا میں ڈال دے یا کارروائی سے بچ جائے۔

میسروی کا جانشین جنرل گریسی بھی دوسری جنگ عظیم کے دوران برہما محاذ پر اور جنگ کے بعد ہند چینی (ویت نام وغیرہ) میں ماؤنٹ بیٹن کے ماتحت کام کر چکا تھا یہ گورکھا یونٹوں کا افسر تھا۔ راقم نے البتہ اس کو 1939ء میں دیکھا تھا جب وہ میجر تھا اور سگنل کور میں تبدیل ہوا تھا اور برہما محاذ پر میری اس کے ساتھ دوسری جنگ عظیم میں اور شناسائی بڑھی اور خاص کر 50-1949ء میں اس عاجز نے راولپنڈی جی ایچ کیو میں اس کے سٹاف میں کام کیا۔ عزت نفس اس شخص میں ذرا برابر نہ تھی۔ دیکھنے میں ''مٹی کا مادھو'' تھا۔ باطن میں مکمل شیطان تھا۔ لیاقت علی، سردار نشتر وغیرہ ہر پاکستانی وزیر یا گورنر کے ساتھ بات چیت اتنے ادب سے کرتا تھا جتنا کوئی رنگروٹ اپنے استاد سے کرتا ہے۔ اس کا جواب ''بسروچشم'' ہی ''بسروچشم'' ہوتا تھا۔ خواہ وہ بات اس کو منظور نہ ہوتی۔ یا اس عمل میں ماؤنٹ بیٹن یا انگریزوں کے مفاد کو نقصان پہنچ رہا ہوتا اور اسی ''بسروچشم'' کے ''نسخے'' سے یہ ہماری سادہ لیڈر شپ سے فیصلے بھی تبدیل کرا دیتا تھا۔ کسی ماتحت پر غصہ کرنا۔ اس کی پالیسی میں نہ تھا اگر کوئی اس کے خلاف بھی بات کرتا تو ظاہراً وہ کوئی ردعمل نہ ظاہر کرتا تھا۔ اس عاجز نے کسی جگہ کہہ دیا تھا کہ ہمارے لئے انگریز کمانڈر انچیف کی بجائے ایک لانس نائک بہتر فوجی سربراہ ہوگا۔ یہ بات اس کو ''پہنچ'' گئی تھی اور مجھ سے ایک دن یہ بات پوچھ لی اور میں نے ''ہاں'' میں جواب دیا تو وہ بغیر غصہ کے گھنٹہ بھر مجھے ''برین واش'' کرتا رہا کہ زمانہ تبدیل ہو گیا ہے اب ہم مسلمانوں کو اہل یورپ کی کچھ باتوں کو اپنانا ہوگا اور کہتا تھا کہ بین الاقوامی ضرورت کے تحت، کئی ملک اپنے اصولوں سے ''دستبردار'' ہو کر ''سانجھی دولت'' (کامن ویلتھ) کے اصول کو اپنا رہے ہیں۔ مجھے تو وہ کبھی متاثر نہ کر سکا لیکن ''میٹھی چھری'' کے طور اس نے حکومت پاکستان کو بے وقوف بنا کر ہمارا بڑا نقصان کیا کہ دو سال کی سربراہی میں ہمارا رخ ایسا لندن اور واشنگٹن اور باطل نظریات کی طرف موڑا اور کشمیر کے حصول میں ہمارا جو نقصان کر گیا اس کی تلافی اب بھی نہیں ہو رہی۔ تفصیل آگے آ رہی ہے۔

جنرل گریسی کی اس اسلام اور پاکستان دشمن پالیسی کو پروان چڑھانے میں خاص کام لیفٹیننٹ جنرل سرراس میکے نے کیا جو پہلے پشاور میں نویں ڈویژن کا کمانڈر تھا اور قبائلی مجاہدین کو غلط وقت پر غلط طریقے سے استعمال کی سازش کی جو کہانی آگے آ رہی ہے اس میں اہم کام کیا۔ پھر لیفٹیننٹ جنرل بن کر راولپنڈی جی ایچ کیو میں جنرل گریسی کا نائب اور چیف آف سٹاف بن گیا۔ گریسی کے 1951ء میں چلے جانے کے بعد بھی یہ جنرل میکے 1954ء تک ایوب خان کے ساتھ ''وابستہ'' رہا اور ایوب کو مکمل طور پر اینگلو امریکن کی ''جھولی'' میں ڈالنے کے بعد یہاں سے رخصت ہوا۔ جنرل گریسی کی کشمیر میں عملی سازش کو پروان چڑھانے میں ایک اور انگریز میجر جنرل لافٹس ٹاٹھم نے سارا کام کیا جو جنوری 1950ء تک ہمارے ساتویں ڈویژن کا کمانڈر تھا لیکن برطانوی اپنے سامراجی سورج کے غروب ہونے کے بعد جو نئی قسم کی سازشوں کا جال بچھا رہے تھے اور جو اپنی ''کھیپ'' یا ''روایتیں'' چھوڑ رہے تھے وہ کام میجر جنرل کا تھورن کر رہا تھا جو کراچی میں ہمارا ڈپٹی چیف آف سٹاف تھا اور متحدہ سروسز کا سربراہ تھا اور سکندر مرزا کا ''لنگوٹیا یار'' تھا جس کو 1958ء میں سکندر مرزا نے بڑی گالی بھی نکالی تھی

جب اس کو قید کر کے کوئٹہ لے جا رہے تھے۔ یہ آدمی راقم کے پرانے سولہویں گروپ سے تعلق رکھتا تھا اور محکمہ تعلقات عامہ میں ہوتے جب میں کراچی جاتا اور کسی جگہ ہمارا ملاپ ہو جاتا تو یہ آدمی میرے ساتھ ''گپ شپ'' لگا لیتا تھا۔ میجری کے بعد اس نے ساری نوکری انگریزوں کی خفیہ سروس میں کی اور ہمارے ملک میں یورپ کی نقالی میں ہماری حکومتوں کے رواج میں جو غلط طریقے چل رہے ہیں۔ اُن سب کی بنیاد یہی کا تھورن باندھ گیا ہے۔

اپنا سر پیٹنا پڑتا ہے کہ 60 سال گزر جانے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے اس عظیم راز پاکستان کے وجود میں آنے کے مقاصد اور اس میں ہماری ذمہ داریوں کے سلسلہ میں آج تک ذرا بھر تحقیق تک نہیں ہوئی اور نہ ان باتوں کا مناسب جائزہ لیا ہے کہ ہم نے کون کون سی بڑی غلطیاں کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مواقع پر مواقع۔ یعنی ''مواقع تقدیر'' عطا فرما رہا ہے کہ ہم اپنے نفس کو بھی پہچانیں اور جہاد کو پوری قوم طرز زندگی کے طور پر اپنائے۔ ہم نے فوائد بھی نہ اٹھائے اور تحقیق کا راستہ بھی نہ اختیار کیا۔ قائداعظم کو معلوم تھا کہ ہمیں ایک لنگڑا لولا پاکستان ملا ہے لیکن اپنی جھونپڑی، غلامی کے بنگلوں سے بہتر ہوتی ہے۔ ''زوال بندہ مومن بے زری سے نہیں سبب اور ہیں'' بہر حال بھارت نے جو مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا تو خان عبدالقیوم نے لیاقت علی کو مشورہ دیا کہ قبائلی مجاہدین کو وہاں داخل کر دیا جائے۔ اگر ایسا کر لیتے تو بھارت میدان جنگ بن جاتا اور جہاد طرز زندگی کے طور پر خود بخود عود کر آتا۔ ستر ہزار جو نوجوان عورتیں مشرقی پنجاب میں کفار کے پاس چھوڑیں۔ اس ذلت سے بھی بچ جاتے اور اس کے بعد قبائلی مجاہدین کو کشمیر میں داخل کرتے تو بھارت مہاراجہ کشمیر کی مدد نہ کر سکتا اور کشمیر ہمارے ساتھ شامل ہو جاتا اور پاکستان کی تکمیل ہو جاتی۔ یہ سنہری موقع تو ہم نے ضائع کر دیا لیکن رب کی ذات نے ضلع پونچھ اور میرپور وغیرہ میں خود بخود جہاد کو شروع کرا دیا اور یہ عاجز سب سدھن اور عباسی مجاہدین خاص کر بڑے کیپٹن خان، اور چھوٹے کیپٹن خان، کیپٹن محمد حسین شہید، سخی دلیر، کرنل شیر احمد، کرنل سالار یہ، میجر محمد افضل شہید اور محمود خان وغیرہ سینکڑوں مجاہدین رہنماؤں، باقی قبیلوں کے اور ہزاروں مجاہدین کو سلام کرتا ہے کہ انہوں نے پونچھ اور میرپور کے وسیع علاقے کو آزاد کرا لیا اور اکتوبر کے آخری ہفتہ میں اپنی آزاد حکومت بھی قائم کر لی۔ تفصیل میری کتاب جہاد کشمیر میں ہے۔

اب اس جہاد کو حکومت پاکستان کئی طریقوں سے تقویت دے سکتی تھی لیکن جس بھونڈے طریقہ سے حکومت نے کام کیا اور جو بھیانک نتائج نکلے افسوس آج تک اس کی چھان بین بھی نہ کی کہ یہ سارا کام ایسے شروع ہوا۔ جنرل اکبر خان طارق اپنی کتاب ''کشمیر کے حملہ آور'' میں لکھتا ہے کہ اس کے ساتھ میاں افتخار الدین نے مشورہ کیا اور اس سے کشمیر کو آزاد کرانے کی تجویز کا خاکہ مانگا اور یہ بھی کہا کہ بڑا حملہ سری نگر اور شمال میں ہو کہ پوشیدگی آسان ہوگی اور انگریز جنرلوں سے بھی پوشیدگی رکھنا ہوگی۔

اکبر خان نے اس کو جو تجویز دی۔ اس کی اہم ضرورتیں یہ تھیں۔ کہ حملہ دسمبر سے پہلے نہ ہو۔ بلکہ برف باری کا انتظار کیا جائے اور جب جموں، سری نگر راستے میں بانہال کے درہ کی وجہ سے سڑک پر کچھ رکاوٹ بنے تو تب حملہ کیا جائے۔ دوسری ضرورت یہ ہے۔ کہ سری نگر کی طرف پیش قدمی سے پہلے کچھ چھپے دستوں کو بڈگام ہوائی اڈہ تک پہنچا دیا جائے کہ اس اڈے کو ناکارہ کر دیا جائے کہ بھارتی فوج وہاں لینڈ نہ کر سکے۔ جموں پر اگر حملہ نہ کیا

جا سکے تو کٹھوعہ، جموں روڈ پر کئی مقامات پر حملہ کر کے سڑک کو بلاک کر دیا جائے کہ بھارتی امداد کے پہنچنے میں رکاوٹیں ڈالی جائیں۔ اکبر خان اس وقت کرنل تھا اور جی ایچ کیو میں ہتھیاروں کی سپلائی کا انچارج تھا۔ پنجاب پولیس نے چار ہزار رائفلیں مانگی تھیں۔ اکبر خان نے ان کے دینے کے احکام دے دیئے کہ ان ہتھیاروں سے پنجاب کے مجاہدین کو لیس کیا جائے جو سیالکوٹ سے کام کریں گے اور سری نگر پر حملہ کیلئے ایبٹ آباد والے راستے سے جو مجاہدین آئیں گے ان کے پاس رائفلیں ہوں گی اور کچھ ایمونیشن کی بربادی کے حکام انگریز جاری کر گئے تھے کہ پرانا ہو گیا ہے سمندر میں پھینک دیا جائے۔ اکبر خان نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ کہ مجاہدین اُس کو استعمال کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں اکبر خان لاہور میں ایک کانفرنس کا ذکر کرتا ہے جو غیر سرکاری طور پر لیاقت علی نے کرائی جس میں اکبر خان کو بھی غیر سرکاری طور پر مدعو کیا کہ سارا کام اپنے انگریز نوکروں سے ''پردے'' میں رکھا جا رہا تھا۔ اس کانفرنس میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ، سرحد کے وزیر اعلیٰ خان قیوم کے علاوہ وزیر خزانہ غلام محمد، میاں افتخار الدین، پنجاب کا ایک وزیر سردار شوکت حیات، ایک میجر ریٹائرڈ خورشید انور، سبھاش چندر کی فوج آزاد ہند کی فوج کے محمد زمان کیانی اور کچھ اور لوگوں کی شرکت کا اکبر خان ذکر کرتا ہے۔ کانفرنس گورنر ہاؤس میں ہوئی، تو انگریز گورنر سر مودی سے کون سی پوشیدگی ہو گی؟ واللہ اعلم، اکبر خان کے مطابق کانفرنس اس کی دی ہوئی تجویز کے مطابق ہوئی کہ سردار شوکت حیات نے اسی تجویز کے تحت عملی کارروائی کے لئے راولپنڈی اور سرحد کے علاقوں سے پیش قدمی کی ذمہ داری خورشید انور کو دی اور سیالکوٹ محاذ سے محمد زمان کیانی کو۔ اکبر خان حیران تھا کہ تجویز میں تفصیلات نہ تھیں۔ لیکن اس نے جان بوجھ کر سنجیدہ مسائل بھی پیش نہ کئے کہ شاید اس مرحلہ میں صرف تجویز کا خاکہ بنایا گیا ہے۔ کانفرنس ختم ہوئی، تو میجر خورشید انور نے آ کر اکبر خان کو کہا کہ وہ سردار شوکت کا کوئی حکم نہ مانے گا۔ وہ اپنی ''خود مختاری'' میں کسی کو دخل نہ دینے دے گا۔ وہ الگ ہوا۔ تو سردار شوکت، اکبر خان کے پاس آیا اور کہا کہ اس کو خورشید انور پر ذرا ''اعتبار'' نہیں۔ اکبر خان نے شوکت حیات کو کہا کہ ان کو خورشید انور ''گندا انڈا'' نظر آتا ہے۔ لیاقت علی کو کہا جائے کہ اس کی بجائے کوئی بہتر آدمی رکھ لیں۔ صوبہ سرحد کا کوئی آدمی تلاش کریں۔ کہ قبائلی لشکروں کیلئے وہ زیادہ موزوں ہوں گے۔ اکبر خان اس بداعتمادی اور پریشانی کا ذکر اپنی کتاب میں کرتا ہے۔ لیکن وہ کس کے ساتھ بات کرتا۔ معاملات پوشیدگی میں رکھے گئے تھے۔

اب 22 اکتوبر کو کارروائی صرف خورشید انور نے ایبٹ آباد، مظفر آباد سے کی۔ سردار شوکت کو منظر سے کب اور کیوں ہٹایا گیا۔ اس کے ساتھ خود اس عاجز نے کئی دفعہ رابطے باندھے۔ اس نے جواب دیا کہ بات بڑی لمبی اور گہری ہے وہ پوری کتاب لکھ رہا ہے۔ اس نے بعد میں کتاب لکھی بھی۔ لیکن اس کی وضاحت نہ کی۔ محمد زمان کیانی سے رابطہ باندھا گیا۔ اس نے مجھے بھی بتایا اور اخباروں میں بیان بھی دیا کہ ان کو کارروائی سے روک دیا گیا تھا اور ہم نے جو مجاہدین کو اکٹھا کیا تھا ان کو روپوچک میں روک لیا گیا۔ اس نے آخر میں اور بھی بہت کچھ کہا کہ بعد میں ان کو دریائے چناب کے مشرق میں ساری کارروائیاں روک دینے کے احکام لیاقت علی کی طرف سے آ کر چودھری محمد علی دے گیا تھا۔ نواب ممدوٹ کے ساتھ اس عاجز کی اتفاقاً فروری 1954ء میں ریل کے سفر

میں ملاقات ہوگئی۔ قدرتی طور پر میرے پرانے مہربان راجہ غضنفر علی بھی ہمارے ہم سفر بنے۔ محکمہ تعلقات عامہ کے میجر بعد میں کرنل مسعود احمد بھی ساتھ تھے۔ بڑی گپ شپ رہی اور یہ معاملہ بھی زیر بحث آیا کہ خان قیوم کہتا ہے کہ صوبہ سرحد نے حسب وعدہ سری نگر کی طرف پیش قدمی کیلئے مجاہدین بھیجے۔ پنجاب نے جموں کی طرف مجاہدین بھیجنے کا وعدہ پورا نہ کیا۔ تو ممدوٹ نے کہا کہ ان کو لیاقت علی نے ایسا کرنے سے روک دیا تھا اور میں نے ایسی بات پہلی دفعہ سنی تھی تو باقی تحقیقات بھی مجھے اسی نتیجہ پر لے گئیں اور اب تو یہ عاجز بہت تحقیقات کر چکا ہے۔

تو ظاہر ہے کہ جو کچھ ہوا' لیاقت کے ایما پر ہوا کہ اگلا سوال اٹھتا ہے کہ اکبر خان کی وہ بات کیوں رد کر دی گئی کہ بانہال پاس پر برف پڑنے کے بعد یہ کارروائی کی جائے۔ میری اس بات کا جواب مجھے کسی نے نہ دیا۔ اکبر خان طارق کو بھی ایسے سوالات بھیجے اس نے بھی کہا کہ مجھے علم نہیں ہے۔ شوکت حیات نے بھی کہا کہ اس کے پاس اس کی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس عاجز نے بہت تلاش کے بعد معلوم کر لیا کہ یہ کچھ بھارت کی ''ضرورت'' تھی اور کچھ ماؤنٹ بیٹن کے احکام پر ہمارے انگریز جنرلوں نے ہمیں کشمیر جلدی فتح کرنے کی ''شہ'' دے کر کرایا اور جموں کی طرف کارروائی سے کئی وجوہات سے منع فرمایا اور ان کا ''حکم'' مانا گیا۔ فی الحال یہ مدنظر رکھیں کہ سری نگر کی طرف پیش قدمی کے لئے قبائلی مجاہدین کی کمانڈ کسی سنجیدہ پٹھان افسر کو کیوں نہ دی گئی؟ شوکت حیات' خورشید انور کو ناپسند کرتا تھا۔ حالانکہ اس کو اس وقت خورشید انور کے بارے میں یہ کچھ معلوم نہ تھا جو کچھ اب اس عاجز نے ''تلاش'' کر لیا ہے۔ کرنل سلطان علی شاہ کی کتاب ''شامت اعمال'' میں خورشید انور کے بارے میں کہا گیا ہے کہ مشرقی پنجاب سے برآمد کی ہوئی مسلمان مغوی عورتوں کی خورشید انور نے ''تجارت'' شروع کر دی اور یہ عاجز خورشید انور کی سب کارروائیوں کو بیان کرنے کے بعد قوم پر واضح کرے گا کہ وہ کس ''قماش'' کا آدمی تھا۔ لیاقت نے اس کو کیوں گلے لگایا کہ شوکت حیات اس کو لیاقت علی کا ''خاص الخاص'' آدمی کہتا ہے۔ ہم یہ کچھ جانتے ہیں کہ خورشید انور کی دوستی لیاقت علی کے پولیٹیکل سیکرٹری نواب صدیق علی خان سے دوسری جنگ عظیم میں بھارت کے علاقہ ناگپور میں ہوئی۔ ورنہ وہ پنجاب کی چھوٹی ریاست مالیر کوٹلہ کا رہنے والا تھا اور ''فراڈ'' قسم کا آدمی تھا اور لیاقت نے اس سے کئی ''کام'' لئے۔ اور کشمیر کے سلسلہ میں اس ''غداری'' جو کہ بیان ہو رہی ہے کے باوجود لیاقت کے قتل تک اس کے ''تعلقات'' لیاقت علی کے ساتھ بڑے اچھے تھے۔

چنانچہ اگلے بیانات سے ثابت ہوگا۔ جو کچھ خورشید انور نے کیا' وہ وقت کے لحاظ سے بھی بھارت کی ''ضرورت'' تھی اور لیاقت یا انگریز جنرلوں نے یا جس نے بھی خورشید انور سے یہ سری نگر کی طرف پیش قدمی کا ''ڈرامہ'' کرایا۔ ان کے سامنے بھارت کے مقاصد اور ''ضروریات'' تھے۔ جواہر لعل نہرو کے خود اپنے تعلقات مہاراجہ کشمیر کے ساتھ بہت خراب تھے کہ نہرو نے شیخ عبداللہ کی ''کچھ زیادہ'' حمایت کر دی تھی۔

نہرو نے پٹیل کو خط لکھا کہ سردیوں میں مہاراجہ کی فوج حالات کا مقابلہ نہیں کر سکے گی

مہاراجہ کشمیر تذبذب میں تھا اور وہ بھارت کے ساتھ الحاق کیلئے ہچکچاہٹ کر رہا تھا کہ وہ خود ہندو ہوتے ہندوؤں کی ذہنیت سے آگاہ تھا کہ کانگریسی ہندو اس کو مہاراجہ نہ رہنے دیں گے۔ مشرقی پنجاب میں جو فسادات کرائے گئے اور اس کا ردعمل مغربی پنجاب میں ہوا اور آبادی کا تبادلہ ہوا تو اس میں مہاراجہ کو ڈرایا جا رہا تھا کہ مسلم

پاکستان میں بھی اس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ لیکن مہاراجہ کو پھر بھی مسلمانوں پر زیادہ بھروسہ تھا ساتھ ہی وہ خود مختار کشمیر کا بھی سوچ رہا تھا' جس سلسلہ میں ماؤنٹ بیٹن اس کو تنبیہہ کر آیا تھا' کہ ایسا نہ ہو سکے گا۔ بہر حال اس سلسلہ میں سردار پٹیل نے مہاراجہ کشمیر کے ساتھ رابطہ باندھا ہوا تھا اور ''نیولائٹ آن کشمیر سردار پٹیل کارسپانڈنس'' کے گہرے مطالعہ سے بڑے رازوں کا انکشاف ہوتا ہے کہ 3 جولائی 1947ء کو گوپال داس کو تفصیلی خط دے کر پٹیل نے مہاراجہ کے پاس بھیجا۔ 13 ستمبر کو سردار پٹیل نے وزیر دفاع سردار بلدیو سنگھ کو خط لکھا کہ وہ کرنل کشمیر سنگھ کٹوچ کو مہاراجہ کے پاس بھیجے کہ اس کی ضروریات معلوم کر کے ان کو پورا کیا جائے۔ 21 ستمبر 1947ء کو مہاراجہ نے ایک پنجابی ہندو کو پٹیل کی سفارش پر وزیر اعظم بنا دیا۔ جو ریڈکلف کے ساتھ حد بندی میں بھی جج تھا اس کا نام مہر چند مہاجن تھا جس نے مہاراجہ کشمیر اور شیخ عبداللہ میں صلح کرانا تھی کہ 27 ستمبر 1947ء کو جواہر لعل نہرو نے سردار پٹیل کو خط لکھا کہ سردیوں میں مہاراجہ کشمیر کی فوج حالات کا ''مقابلہ'' نہ کر سکے گی کہ اکتوبر' نومبر 1947ء میں ''اہم واقعات'' رونما ہونے والے ہیں۔ کیا نہرو فقیر تھا کہ اس کو معلوم تھا کہ کیا ہوگا وہ بات تھی ہی کچھ اور ...... اگلے بیانات سے ساری ''سازش'' کو سمجھیں۔ کہ نہرو پٹیل کو لکھتا ہے کہ مہاراجہ کو اب بھارت کے ساتھ الحاق میں جلدی کرنا چاہیئے اور شیخ عبداللہ کو رہا کر دینا چاہیئے اور پٹیل نے اسی دن مہاراجہ کے ساتھ رابطہ باندھ کر دو دن بعد 29 ستمبر کو شیخ عبداللہ کو رہا کرا لیا اور مسلم کانفرنس کے بے قصور چودھری غلام عباس مزید ایک سال اور اللہ رکھا ساغر دو سال مزید مہاراجہ کی قید میں رکھے گئے کہ پاکستان والوں اور جموں کے پاکستان نواز مسلمانوں میں رابطہ نہ ہو۔ علاوہ ازیں کشمیر کا بذریعہ ریل' سڑک' ٹیلی گراف' ٹیلی فون اور وائرلیس یا ڈاک کے ذریعے سے رابطہ صرف پاکستان کے ساتھ تھا اور 12 اگست 1947ء کو پاکستان کی عارضی حکومت کے ساتھ ان معاملات کو پاکستان کی تحویل میں رکھنے اور حالات کو ''جوں کا توں'' رکھنے کا معاہدہ بھی کیا ہوا تھا لیکن سردار پٹیل نے چوری چھپے یہ سارے رابطے کشمیر اور بھارت کے درمیان جوڑ دیئے اور مہاراجہ کشمیر کو 12 اکتوبر 1947ء کو اس کی خبر بھی دے دی۔

اب خورشید انور کی کارروائی اور سری نگر کی طرف پیش قدمی کا ڈرامہ نہرو کے 27 ستمبر کے خط کے ''اہم واقعات'' کو رونما کرنے کیلئے ایک عمل تھا اور سری نگر کی فتح ہرگز ''مقصود'' نہ تھی۔ بہت اختصار سے قارئین واقعات سنیں۔ مہاراجہ کی طرف سے مظفر آباد اور کوہالہ پل وغیرہ سب مقامات کا دفاع چوتھی کشمیر بٹالین کر رہی تھی۔ جس کی آدھی نفری مسلمان تھی اور کیپٹن محمد شیر اور کیپٹن محمد اعظم دو کمپنی کمانڈر بھی مسلمان تھے۔ ان سے خفیہ رابطہ سے یہ سب علاقے 22 اکتوبر کو فتح کر لئے گئے۔ ہندو نفری کرنل نارائن سنگھ سمیت کچھ ماری گئی۔ کچھ بھاگ گئی اور یوسف صراف کے مطابق خورشید انور نے 23 اکتوبر کو پلٹن مسلمان نفری کی دعوت کی اور ان کو آگے اپنے ساتھ نہ لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ لوگ زبردستی ساتھ چلے گئے۔ کہ قدرتی طور پر میجر بعد میں بریگیڈیئر محمد اسلم جو اصغر خان کا بھائی تھا وہاں پہنچ گیا۔ کہ وہ خود اپنے باپ کی تلاش کیلئے سری نگر جا رہا تھا۔ گڑ بڑ سن کر مہاراجہ کا چیف آف سٹاف بریگیڈیئر راجندر سنگھ کچھ نفری لے کر آگے بڑھا لیکن 24 اکتوبر کو قبائلی مجاہدین کے ساتھ خورشید انور نے اوڑی پر اور 25 اکتوبر تک مہورا بجلی گھر اور بارہ مولا کو آزاد کرا لیا تھا۔ ''راجندر سنگھ مارا گیا تھا کچھ نفری قید ہو گئی کچھ تتر بتر ہو کر سری نگر کی طرف بھاگ رہی تھی۔ مہاراجہ حالات سے کافی ''بے خبر'' تھا جبکہ بھارت والوں کو ہمارے

انگریز جنرل مجاہدین کی پیش قدمی کی گھڑی گھڑی کی خبریں دے رہے تھے۔ بھارتی ریاستی سیکرٹری مینن نے مہاراجہ کو تنبیہہ کی کہ قبائلی مجاہدین سری نگر پہنچنے والے ہیں اب اس کو بھارت ہی بچا سکتا ہے۔ وہ بھارت سے جلد الحاق کا اعلان کرے۔ تو مہاراجہ نے کہا کہ آج شام دسہرہ کی تقریب ہے جہاں مہاراجہ نے لوگوں سے تحفے وصول کرنے تھے اور مہر چند مہاجن اور مینن کو بھی اس تقریب میں شرکت کی دعوت دی کہ تقریب کے بعد تفصیلی بات کریں گے۔

بارہ مولا تک چڑھائی والا راستہ تھا۔ بارہ مولا سے آگے وادی تھی۔ سری نگر ایک گھنٹہ کا راستہ تھا کہ مخالفت یا مقابلہ ختم ہو گیا تھا خورشید انور اگر سارا لشکر ساتھ نہ بھی لے جاتا تو اکبر خان کی سوچ کے مطابق جموں و کشمیر پلٹن کے مسلمان فوجیوں کو بھیج کر بڈگام ہوائی اڈہ پر قبضہ کر سکتا تھا کہ مہاراجہ کو بھارت والے مدد وہاں نہ اتار سکیں لیکن خورشید انور بارہ مولا اور مہورا کے علاقوں میں بیٹھا رہا۔ یہ سب کچھ ہمارے اخباروں میں تسلیم کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا بنگلوں کی بانٹ ہو رہی تھی کسی نے کہا خورشید انور نے سری نگر کے لوگوں سے رابطے کیلئے آدمی بھیج دیئے تھے کہ وہ لوگ خورشید انور اور قبائلی مجاہدین کو خوش آمدید کریں۔ ہمارے ریڈیو نے بھی خبر نشر کر دی کہ مجاہدین ایک گھنٹے کے بعد سری نگر میں داخل ہو جائیں گے اور ہماری کم علم قوم نعرے بلند کر رہی تھی۔ کراچی میں اس وقت سکندر مرزا دفاعی سیکرٹری کی بیٹی کی نکاح کی رسم ہو رہی تھی اور یہ کہانی مجھے سابق مسلم اخبار کے مالک آغا مرتضیٰ پویا نے خود سنائی کہ اس تقریب میں نکاح خوان ان کے والد تھے اور لوگوں نے ایک دوسرے کو سری نگر کے آزاد ہونے کی مبارکیں بھی دینا شروع کر دیں۔ تو وہاں برطانیہ کا ہائی کمشنر مسٹر گلبرٹ بھی بیٹھا تھا' وہ خوب ہنسا اور کہنے لگا یہ ناممکن ہے کہ ہر اہم انگریز آگاہ تھا کہ خورشید انور نے تو سری نگر جانا ہی نہیں۔ اس سے یہ ''ڈرامہ'' کسی اور مقصد کیلئے ''چھپے ہاتھ'' کرا رہے تھے۔

تو مقصد کیا تھا؟ کہ خورشید انور کو سازش والوں نے وقت دیا ہوا تھا کہ فلاں وقت دسہرہ کی تقریب جم جائے گی۔ عین اس وقت خورشید انور نے مہورا بجلی گھر سے سری نگر کی بجلی کاٹ دی اور سری نگر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اور دسہرہ کی تقریب پر ''اندھیرا گھپ'' چھا گیا تو مینن نے مہاراجہ کو کہا کہ تم نے میری بات نہ سنی۔ ہم اب تمہیں سری نگر میں بھی حفاظت نہیں مہیا کر سکتے ہیں۔ ہاں جموں کی ''حفاظت'' کا ہم نے بندوبست کر لیا ہے اور جلدی بذریعہ سڑک وہاں بھارتی فوج بھی بھیج دیں گے تم اسی رات بھاگ کر جموں پہنچو۔ میں دہلی واپس جا رہا ہوں۔ کل الحاق کے کاغذات لے کر جموں پہنچوں گا تم ان پر دستخط کر دو۔ تو بھارت تمہاری اور تمہاری ریاست کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھا لے گا۔ اسی رات قیمتی سامان تقریباً سو ٹرکوں میں لاد کر مہاراجہ کو جموں پہنچا دیا گیا۔

اب جموں تو پاکستانی سرحد سچیت گڑھ سے صرف پندرہ میل دور ہے وہاں مہاراجہ کو کیسے ''حفاظت'' پہنچائی جا سکتی تھی یا جموں' کٹھوعہ روڈ کو کاٹ کیوں نہ دیا گیا۔ تو یہاں سیالکوٹ چھاؤنی میں ابھی سکھ ڈوگرہ فوجی اپنے ہتھیاروں سمیت موجود تھے جن کو جنرل والے راستے پاکستان بننے کے ایک ہفتہ کے اندر بھارت بھیجا جا سکتا تھا۔ مسلمان اور خاص کر پٹھانوں کی نفری والے فرنٹیئر فورس سنٹر کو اگست 1947ء میں ہی سیالکوٹ سے ایبٹ آباد بھیج دیا گیا اور اس کی جگہ پندرھویں پنجاب سنٹر نے انبالہ سے آنا تھا وہ لوگ سیالکوٹ پہنچے نہ تھے تو اس لئے سولہ پنجاب کے کرنل ھوبرٹ اور سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر غلام کذاب کے پوتے ایم ایم احمد نے مجاہدین کو جموں محاذ نہ

کھولنے دیا۔ فوج کے سربراہ جنرل میسروی نے بھی ایسا حکم دیا کہ جموں محاذ نہ کھولا جائے قارئین بہانہ یہ تھا کہ جموں کو ''حفاظت'' مہیا کرنا تھی ورنہ محاذ شکر گڑھ کی طرف سے کھولا جا سکتا تھا۔ کٹھوعہ روڈ پر کارروائی کیوں نہ کی گئی۔ بلکہ مارچ 1948ء میں یہاں مجاہدین کی تعداد پچیس ہزار تک پہنچ گئی۔ تو جنرل افتخار نے بریگیڈیئر موسیٰ (بعد میں جنرل) سے جنرل گریسی کے حکم کے تحت ان مجاہدین پر ''جھاڑو'' پھرا دیا اور یہی افتخار نومبر 1947ء میں سیالکوٹ میں ہمارا پہلا مسلمان بریگیڈیئر متعین ہوا اور اتنا انگریز پرست نکلا کہ ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس عاجز نے اس افتخار کو فروری 1947ء میں میجر دیکھا اور فروری 1948ء میں وہ میجر جنرل بن گیا تھا۔ یہ جہاز کے حادثے میں 1949ء میں ہلاک ہو گیا تھا اور لوگ اس کو پاکستان کا پہلا بری فوج کا کمانڈر انچیف بتاتے رہتے ہیں' (ملک حبیب اللہ بھٹا کا 9 دسمبر کا مضمون) وہ ایوب سے جونیئر تھا اور جنرل گریسی کے ایک بیان کی غلط رپورٹنگ سے یہ شوشہ ختم نہیں ہوتا بہرحال ایوب خان میں تو کچھ رکھ رکھاؤ تھا۔ افتخار میں تو وہ بھی نہ تھا کہ ہماری قسمت ہی ایسی ہے کہ لیڈر کیسے کیسے ملے۔

تو کشمیر کے واقعات کی طرف واپس مڑتے ہیں۔

کہ مہاراجہ جو سیدھے طور پر بھارت سے الحاق نہ کر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بھی جوڑے۔ جان کی امان مانگی۔ قیمتی سامان سوٹرکوں میں لادا گیا۔ مہاراجہ خود اور اس کے خاندان کے لوگ کاروں میں بیٹھ کر آدھی رات کے قریب جموں روانہ ہو گئے۔ جموں پہنچ کر مہاراجہ نے دوائی کی گولیاں کھا کر سو جانے کی کوشش کی اور اے ڈی سی کو حکم دیا کہ اگر مینن حسب وعدہ نہ پہنچے تو اس کو گولی مار کر سوتے میں ہی ہلاک کر دیں کہ مینن نے مہاراجہ کو فکر مند رکھنے کیلئے کہا تھا کہ بھارت جموں میں بھی مہاراجہ کی حفاظت دینے کو جوا کھیل رہا تھا۔ جو شاید کامیاب نہ ہو اور یہ بات صحیح ہے کہ جموں کو آزاد کرانا سری نگر کے آزاد کرانے سے زیادہ آسان تھا بہرحال 26 اکتوبر کو مینن جموں پہنچ گیا ہے نیم بے ہوشی میں مہاراجہ نے دستخط کیئے یا مشہور کر دیا کہ دستخط ہو گئے۔ بھارتی فوج نے تو 26 اکتوبر کو ہی سری نگر اتر جانا تھا کہ فوج بریگیڈ نمبر 161 نے جالندھر سے جانا تھا۔ پرانے زمانے کے سخت سیکرٹ کوڈ اور کمانڈ کے طریقے کے تحت جالندھر کیلئے احکام لاہور آتے تھے' تو احکام لاہور آئے تو ہمارا سائیفر افسر لیفٹیننٹ قیصر بیگ یہ احکام کرنل موسیٰ جو وہاں اس وقت ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں جی ون تھا کے پاس لے آیا۔ جس نے راولپنڈی جی ایچ کیو میں بریگیڈیئر شیر خان کو خبر دی لیکن کیا ہو سکتا تھا۔ بھارت والوں کو بھی شاید اس غلطی کا احساس ہوا۔ انہوں نے زبانی حکم دیئے تو بھارتی فوج 27 اکتوبر صبح کو سری نگر اترنا شروع ہو گئی۔ یعنی میجر خورشید انور کو فطرت نے ایک اور دن مہیا کر دیا تھا۔ لیکن وہ بارہ مولا میں بیٹھا رہا۔ بھارتی فوج نے جلدی سے ہوائی اڈہ کو حفاظت دے کر بارہ مولا کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور شام تک بارہ مولا پہنچ گئے اور مجاہدین کے ساتھ ایک جھڑپ کا ''ڈرامہ'' کیا۔ کہ خورشید انور کو یہ ''تسلی'' ہو جائے کہ بھارتی پہنچ گئے تھے اور پھر بھارتی فوج نے سری نگر کی طرف فرار شروع کر دیا تو اب میجر خورشید انور نے قبائلی مجاہدین سے 28 اکتوبر کو سری نگری کی طرف پیش قدمی کرائی اور اگلے ہفتہ بھر کی لڑائی میں کھلے میدانوں میں بھارتی ہوائی جہازوں سے جو سری نگر پہنچ گئے تھے قبائلی مجاہدین کیلئے ایسی تباہی

بچوائی کہ جہاد کا کیڑا ان کے دماغ سے نکل جائے۔

میری خوش قسمتی کہ مجھے اس سارے ڈرامہ کی آنکھوں دیکھی کہانی سنانے کیلئے ایک اپنا ساتھی کرنل چراغ شاہ مل گیا۔ جو اس زمانے میں طالب علم تھا اور میجر خورشید انور سے متاثر ہو کر اس کے ''معاون خصوصی'' کا کام کرتا رہا۔ کہ خورشید انور کی کئی ''شخصیتیں'' تھیں۔ لیکن چراغ شاہ پر اس کی شخصیتوں کے اندھیرے پہلو ذرا دیر سے ظاہر ہوئے۔ جب اس نے خورشید انور کی ایک خاص کار میں قیمتی لوٹ کا مال دیکھا۔ جس کو لے کر خورشید کا ڈرائیور فرار ہو گیا تھا لیکن چوروں پر مور پڑ گئے وہ مال کسی اور کے ہتھے چڑھ گیا کہ روداد خان کا والد جو مظفر آباد کا منتظم بنایا گیا تھا ڈرائیور اُس کے ''قابو'' میں آ گیا اور آخر جب خورشید انور فرار ہو کے اوڑی کے قریب پہنچا تو خود اپنی ران میں گولی مار کر ساری جنگ سے ہمیشہ کیلئے فرار اختیار کر گیا کہ ہماری حکومت اس سے سری نگر ''فتح'' کرا رہی تھی؟ کہ دیکھیں ہمارے انگریز نوکر ہمیں کس طرح بے وقوف بناتے رہے۔ ہماری قوم اب بھی اس حقیقت سے بے خبر ہے۔

قائداعظم نے جب 27 اکتوبر کو بھارتی فوج کی کشمیر میں داخل ہونے کی خبر سنی۔ تو ان کا ردعمل قوم کو 1950ء میں معلوم ہوا۔ جب ایلن کیمپل کی کتاب شائع ہوئی جس میں ذکر تھا کہ انہوں نے گورنر مودی کی وساطت سے پنڈی میں جنرل میسروی کو حکم بھیجا کہ جلدی سے دو پلٹنیں بھیج کر جموں۔ کٹھوعہ روڈ بند کر دی جائے۔ میسروی مچھلیوں کا ''شکار'' کر رہا تھا اس کے نائب جنرل گریسی نے جواب دیا کہ وہ جنرل میسروی کو تلاش کر رہا ہے اور اس کو لاہور بھیجے گا اور کوئی کارروائی کرنے کیلئے ان کو فیلڈ مارشل آکنلیک کے ساتھ مشورہ کرنا ہو گا...... اور جنرل گریسی نے قائد کے احکام کے بارے آکنلیک کو آگاہ کر دیا اور معاملہ التوا میں پڑ گیا۔

اوّل اس زمانے میں لیاقت علی سے 1950ء میں اس سلسلہ میں پوچھا گیا تو اس کا جواب تھا کہ ''لڑائی بھی لڑ کر دیکھ لی۔ کشمیر حاصل نہ کر سکے۔ اب رائے شماری کیلئے تیاری کرو۔'' اور پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔

ہم اس سلسلہ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سری نگر کی طرف جو کارروائی کی گئی اس سلسلہ میں قائداعظم کو ''لاعلم'' رکھا گیا۔ اگر قائد کو بتایا جاتا کہ ''پیش قدمی'' صرف سری نگر کی طرف کی جائے گی۔ تو قائداعظم اس غلط طریق کار کی کبھی اجازت نہ دیتے کہ قائداعظم نے مومنانہ فراست کا ثبوت دے دیا کہ وہ جموں کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب خورشید انور کی سازش سے یہ سب کچھ ہو گیا تو قائد کو آدھی بات بتائی گئی کہ یہ کچھ رضا کاروں اور قبائلی مجاہدوں خود نے کیا۔ تو قائداعظم کے مومنانہ فراست کا یہ بڑا صحیح فیصلہ تھا کہ پاکستان اب مجاہدین کی کارروائی کو جموں کا محاذ کھول کر ''امداد'' دے اور پاکستان جموں و کشمیر کے مسئلہ میں ایک ''پارٹی'' بھی بن جائے اور یہ پاکستان کا قانونی حق تھا کہ مہاراجہ کا 12 اگست سے ہمارے ساتھ (جوں کا توں) کا معاہدہ تھا اور وہ یک طرفہ اعلان سے معاہدہ نہ توڑ سکتا تھا اور لاکھوں کی اکثریت کی مسلمان آبادی کو وہ اس طرح غلامی میں نہ دے سکتا تھا کہ اپنی حفاظت کیلئے یہ کچھ کرے۔ کشمیر کو جغرافیائی، تاریخی، روحانی اور قانونی لحاظ سے 14 اگست 1947ء سے پاکستان کا حصہ بن جانا چاہیئے تھا۔ لیکن سازش بہت گہری تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے 26 اکتوبر کو اسٹیٹمین کے ایڈیٹر کو جو کچھ باتیں پاکستان کے حق میں لکھ دیتا تھا، بلا کر کہا کہ میں نے تمہارے جناح کے کشمیر پر ''قانونی حقوق'' کو پاش پاش کر دیا ہے کہ بھارت کے گورنر جنرل کے طور پر مہاراجہ کی بھارت کے ساتھ الحاق کی گزارش آج ہی منظور کر لی

ہے اور ہماری کم علم قوم میں کچھ آج بھی کہتے ہیں کہ ہم نے ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان کا گورنر جنرل بنانا تھا۔ اب ماؤنٹ بیٹن نے آکنلیک کے ساتھ مل کر ایک اور ڈرامہ کیا کہ وہ نہرو اور پٹیل کو لے کر 2 نومبر 47 کو لاہور آ رہا ہے۔ اور وہاں حکومت پاکستان کے ساتھ مل کر کشمیر میں فوجوں کے داخلے اور دوسرے تمام معاملات حل کر لئے جائیں گے۔

قارئین۔ پاکستان جو اللہ تعالیٰ کا راز ہے' اس کے لئے رب کی ذات پاک نے شیطان کو بھی کھلی اجازت دی ہوئی ہے۔ اب ذرا سازشوں کا اندازہ لگائیں۔ 31 اکتوبر کو بھارتی اخباروں میں خبریں شائع ہو گئیں کہ 2 نومبر کو پٹیل کے پتا جی کی برسی ہے۔ وہ پاکستان نہیں جا سکتے۔ کچھ نے گرہ لگائی۔ باپوجی (گاندھی) پٹیل کو کیسے اجازت دیں گے کہ بھارت ماتا کے ٹکڑے (پاکستان) میں جائیں۔ پھر تردید بھی شائع ہوئی اور کچھ نے کہا کہ نہیں نہرو پٹیل سے سارے اختیار لے کر اکیلا جائے گا۔ لیکن 2 نومبر کو ''اکیلا'' ماؤنٹ بیٹن آیا کہ نہرو نے بھی بیماری کا بہانہ بنا لیا۔ حالانکہ چودھری محمد علی کتاب اور تحقیق کے مطابق نہرو کو کئی لوگوں نے اس دن دہلی میں صحت مند حالت میں دفتر جاتے دیکھا۔ یہ تو ہمارے دشمنوں کے اوچھے ہتھیار تھے۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ اپنی کوئی پالیسی نہ تھی۔ قارئین! میری کتاب جہاد کشمیر پڑھیں۔ کہ سازش کتنی گہری تھی۔ قائداعظم اور وزیراعظم لیاقت علی دونوں لاہور میں تھے۔ قائداعظم گورنر ہاؤس سے۔ سرکٹ ہاؤس میں بیٹھے لیاقت علی اور اس کی کابینہ کے چند چیدہ آدمی جو اس کے ساتھ تھے حکم پر حکم دے رہا تھا کہ کشمیر میں کچھ فوجی یا سویلین رضا کار جموں محاذ پر داخل کرو۔ قائداعظم کا اُس وقت کا اے ڈی سی اور بعد میں ایڈمرل' احسن اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ لیاقت کی کابینہ کوئی فیصلہ نہیں کرتی تھی اور اکبر خان کہتا ہے کہ لیاقت علی نے جموں محاذ پر اُس کی ایک ہزار قبائلی لشکر کے استعمال کی تجویز رد کر دی۔ ظاہر ہے لیاقت علی اور انگریز جنرل جو ہمارے نوکر بھی تھے وہ ''ملے'' ہوئے تھے اور وہ کشمیر بھارت کو دینا چاہتے تھے۔

ہمیں لڑانے والوں کے مقاصد ''ایک جیسے'' تھے

تو ماؤنٹ بیٹن کی لاہور آ کر کانفرنس کرنا جو ایک ڈرامہ تھی میں ''فیصلہ'' ہو گیا کہ بھارتی فوج اور پاکستان سے کشمیر میں داخل ہتھیار بند دستے' اڑتالیس گھنٹوں کے اندر تمام فائر بند کریں اور ہفتہ کے اندر وہ اپنے ملکوں کو واپس چلے جائیں اور بھارت و پاکستان کی مشترکہ ذمہ داری کے تحت رائے شماری ہو۔ ماؤنٹ بیٹن نے بھارتی کابینہ سے منظوری کی مہلت مانگی۔ قائد مشکل سے ایک ہفتہ کی مہلت دے سکے لیکن دس دن تک کوئی جواب نہ آیا۔ بھارت کو یاد دہانی کرائی گئی تو انہوں نے مزید ایک ہفتہ کی مہلت مانگی۔ لیکن بھارتی جواب نہ آنا تھا نہ آیا۔ قارئین! یہ عاجز اخباروں میں کشمیر پر لوگوں کے اوٹ پٹانگ مضامین پڑھ کر تنگ آ گیا ہے کہ کم علمی اور حالات کی ادھوری خبروں پر کیا کچھ نہیں لکھا جاتا تو یہ عاجز قوم کے سامنے صحیح صورت حال حوالوں کی مدد سے پیش کرنا چاہتا ہے۔ کہ کیا کیا غداریاں ہوئیں یا کوتاہیاں ہوئیں اور ہم کیا کچھ کر سکتے تھے اور اب بھی اللہ تعالیٰ ہماری توبہ و ندامت کا منتظر ہے۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ لکھتا ہوں کہ سرحد کے جس گورنر سر جارج کنگھم کی غداری کا ذکر کیا گیا ہے وہ

امریکہ میں آباد ہو گیا تھا اور کسی مصلحت یا پالیسی کے تحت وہاں اس نے اس خطہ کے لوگوں کے لئے اپنے دروازے ''کھلے'' رکھے ہوئے تھے۔ میرا عظیم رفیق بریگیڈئر اختر علی اور آفتاب شیر پاؤ کے بڑے بھائی کرنل ودود مرحوم۔ جب کیپٹن تھے تو 1955ء میں امریکہ ایک کورس کیلئے گئے' جارج کنگھم کے ویسے بھی شیر پاؤ فیملی سے تعلقات تھے تو یہ دونوں افسران اس کو ملنے چلے گئے اور کافی گپ شپ رہی تو اختر علی نے جلد ہی سوال کر دیا کہ گورنر صاحب کے تعلقات پاکستان کے ساتھ کیوں کشیدہ ہو گئے کہ وہ اتنا جلدی گورنری چھوڑ کر واپس آ گئے۔ جارج کنگھم کہنے لگا۔ ''تم نوجوان آدمی ہر قوم کی بین الاقوامی ضرورتوں کے معاملات کو شاید پوری طرح نہ سمجھ سکو۔ ہر آدمی کا فرض ہے کہ وہ ترجیح اپنی قومی ضرورت کو دے'' دوسرے لفظوں میں جارج کنگھم نے تسلیم کیا کہ اس نے پاکستان کے ساتھ ''غداری'' اور بے وفائی انگریزوں کی فوجی اور قومی ضرورت کے اصول کے تحت کی تھی۔

پشاور کے 1990ء کے مسئلہ کشمیر کے سلسلہ میں سیمینار میں بریگیڈئر محمود جان جو طارق ہیڈ کوارٹر میں جہاد کشمیر کے آخری دنوں میں میجر اور سینئر سٹاف افسر تھے۔ اس نے کشمیر کی 48-1947ء کی جنگ کے بارے کہا کہ یہ جنگ کم اور ''دو طرفہ'' جنگی مشق زیادہ تھی' اونچا کنٹرول وار آفس لندن کے پاس تھا۔ ان کا بڑا نمائندہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن۔ دہلی میں بیٹھا تھا۔ ایک لوئر کنٹرول اس کے ماتحت دہلی میں کام کر رہا تھا۔ دوسرا لوئر کنٹرول راولپنڈی بیٹھا تھا۔ پاکستان اور بھارت کو دور شمالی کشمیر میں جنگی مشقوں کے طور پر ''لڑایا'' جا رہا تھا اور جب ان کی ضرورت کے مطابق فوجیں موجودہ فائر بندی لائن یا کنٹرول لائن پر آ گئیں۔ تو ایک آتش بازی کی طرح فائر کا ڈرامہ کرا کے دونوں ملکوں کو ہزاروں میل لمبی لائن پر بٹھا دیا کہ تم لوگ یہاں ''ٹھک ٹھک'' کرتے رہو کہ ہم اپنا فوجی سامان جو ہماری ضرورت کا نہ ہو۔ تم لوگوں کو بیچتے رہیں اور تم دونوں ملکوں کو بین الاقوامی دنیا میں اپنی انگلیوں پر نچاتے رہیں۔

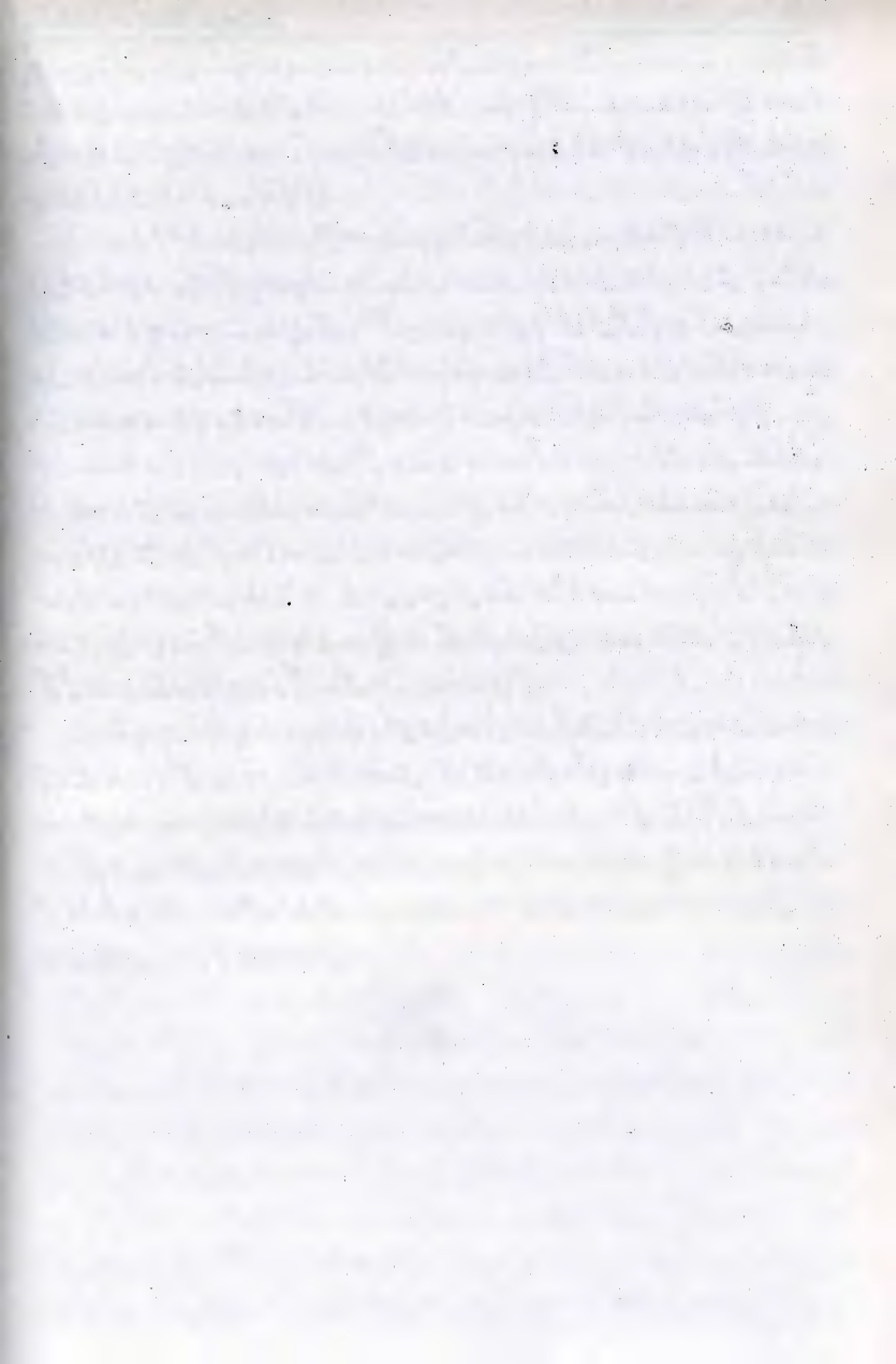
قارئین! شروع اکتوبر 1947ء میں جنرل میسروی نے جی ایچ کیو لیکچر ہال میں بھارتی میجر جنرل کری آپا جو بعد میں بھارتی بری فوج کا سربراہ بن گیا تھا کی موجودگی میں افسروں کو اپنے خطاب میں کہا کہ کچھ سر پھرے لوگ کشمیر حاصل کرنے کیلئے بھارت کے ساتھ جنگ کا سوچ رہے ہیں۔ خبردار! بھارت کی فوج پاکستان سے تین گنا بڑی ہے پاکستان بھارت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ صرف اکبر خان طارق نے جو اس وقت کرنل تھا' اس نے لکھ کر پروٹیسٹ کیا اور یہ کچھ ہمیں 1973ء میں معلوم ہوا۔ جب اس کی کتاب پڑھی کہ لڑائیاں قوت ایمانی سے لڑی جاتی ہیں۔ راقم کو یہ دلچسپی اس لئے تھی کہ ''ہز ماسٹر وائس'' کے طور پر سیالکوٹ میں ہمارا پہلا پاکستانی بریگیڈ کمانڈر افتخار خان نومبر 1947ء میں ہمیں یہی ''لوری'' دے رہا تھا۔ راقم اکیلے نے پروٹیسٹ کیا۔ یہ آدمی میجر جنرل بن کر 1950ء کے شروع میں حادثہ کا شکار ہوا۔ کہا جاتا ہے اُس نے ہماری بری فوج کا سربراہ بننا تھا توبہ میرے اللہ۔ وہ ایوب سے بھی گیا گزرا تھا۔ اب دیکھیں کہ ان سب سازشوں اور کوتاہیوں کے باوجود جہاد کے ذریعہ ہم نے نومبر' دسمبر 1948ء تک آدھے کشمیر کو آزاد کرا لیا تھا۔ تو یہی انگریز جنرل کس بھونڈے طریقے سے غلط وقتوں اور غلط جگہوں پر پاکستان فوج کو کشمیر میں بغیر توپخانے کی مدد کے داخل کرتے رہے اور مٹی کا مادھو بن کر جنرل گریسی نے 20 اپریل 1948ء کے اپنے خط سے جو ہماری حکومت کو بے وقوف بنایا تھا، کہ نوشہرہ' جھنگڑ پونچھ' اوڑی لائن سے مغرب کے کشمیر کے علاقے پاکستان کی ''حفاظت'' کیلئے پاکستان کی ضرورت ہیں لیعنی باقی علاقے اگر بھارت کے

پاس رہیں تو کوئی ''حرج'' نہیں اور ایسے ہی ہوا اور اس سے بھی کچھ زیادہ علاقے جب بھارت کے پاس چلے گئے تو فائر بندی سے برائے نام جہاد کو بھی جمود دے دیا۔ حالانکہ یہ عاجز اپنی کتاب میں سات ایسے سنہری اوقات کو واضح کر چکا ہے کہ اپنی فوج کو مجاہدوں کی مدد کے صحیح استعمال سے ہم بھارتی فوجی مشینری کو تباہ کر سکتے تھے کہ وہ حیدر آباد کی طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکتے۔

ہماری کم علم اور نادان قوم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ انگریز جنرلوں نے یہ فیصلہ بھی اکتوبر 1947ء کے شروع میں کر لیا تھا کہ کتنا کشمیر پاکستان کو ''دینا'' ہے۔ اس سلسلہ میں جنرل محمد موسیٰ کا اخبار ڈان میں ایک مضمون شائع ہوا تھا' جو یوسف صراف نے اپنی کتاب ''کشمیر یز فائیٹ فار فریڈم'' میں بھی نقل کیا ہے کہ اس زمانے میں جنرل موسیٰ لاہور ڈویژن کے جی ون تھے کہ خبر آئی کہ راولپنڈی سے جنرل گریسی اور جنرل میسروی اور دہلی سے جنرل لاکھارٹ اور جنرل بوچر لاہور پہنچ رہے ہیں اور ہوائی اڈے پر ہی ان کیلئے ایک کمرہ خالی کرایا گیا۔ جہاں انہوں نے ملاقات کی کہ کسی پاکستانی کو وہاں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی اور وہاں کوئی خاص باتیں طے ہوئیں۔ نومبر 1948ء میں ایسی ایک میٹنگ پاکستان کی طرف سے جنرل گریسی اور بھارت کی طرف سے جنرل بوچر کے درمیان کراچی میں ہوئی جس کا ذکر بعد میں آئے گا اور اس کانفرنس کے بعد جنرل گریسی نے جو ''ٹاپ سیکرٹ'' خط لکھ کر حکومت پاکستان کو ''بے وقوف'' بنایا۔ مجھے اس کی کاپی اس خط کو ''کھلا'' قرار دے کر مہیا کی گئی تھی کہ کشمیر کے سلسلہ میں باقی ریکارڈ تو انگریز اپنے جانے سے پہلے جلوا گئے۔ اس خط کی کاپی وزارتِ دفاع میں کسی فائل سے مل گئی تھی اور اس کے بعد فائر بندی کی گئی اور ہمیں مزید بے وقوف بنایا گیا۔

تو یہ عاجز قوم کو باور کرانا چاہتا ہے کہ کیسی لڑائی اور کونسی لڑائی تھی؟ کہ ہمیں لڑانے والوں کے مقاصد ایک تھے اور ان کا تعلّق ایک قوم سے تھا اور لاہور میں اکتوبر 1947ء میں انگریز جرنیلوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ دونوں ملکوں بھارت اور پاکستان کو لڑاتے لڑاتے جب موجودہ فائر بندی کی لائن پر آئیں گے تو کشمیر کی جنگ بند کر دیں گے۔ قارئین سوچیں ایسی فائر بندی اُس وقت کیوں نہ ہوئی جب ہم درہ بانہال تک پہنچے ہوئے تھے اور لیاقت علی نے انگریز جرنیلوں کے مشورہ سے ہمیں دریائے چناب کے مشرق میں جہاد کیوں نہ کرنے دیا۔ ایک ایک غداری کیلئے میرے پاس کئی ثبوت موجود ہیں۔





تیسرا سلسلہ

مُسلمان مُسلمان کا دُشمن نہیں ہو سکتا

مُسلمان مُسلمان کا دُشمن نہیں ہو سکتا

پچھلے مضامین میں ''مواقع تقدیر'' کے پہلو کو خوب واضح کیا اور ساتھ یہ اشارہ بھی کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک نے دنیا کے زمان و مکان میں اس خطہ کو جو سعادت عطا فرمائی کہ اس کی ذات پاک کے نام پر یہ اس ذات پاک کا اپنا ملک ہے لیکن یہاں ہمارے آقا ﷺ کے فرمان کے مطابق غزوات الہند بھی اب پایہ تکمیل کو پہنچنے والے ہیں کہ اس برصغیر کے کفر سے پاک ہونے کا وقت قریب ہے۔ اب سوال یہ سامنے آ رہا ہے کہ یہ سہرا کس کے یا کن لوگوں کے سر بندھتا ہے؟ اور کون لوگ ''مواقع تقدیر'' سے صحیح فوائد اٹھا سکتے ہیں۔

اس عاجز نے ستمبر 65 کی جنگ کے سلسلہ میں بھی یہ باور کرایا کہ گو یہ غیروں کی سازش تھی کہ انہوں نے اپنے چنے ہوئے وقت پر ہماری کم علمیوں کا فائدہ اٹھا کر ہمیں جنگ میں دھکا دینے کا فیصلہ کیا لیکن ہمارے پاس ذرائع بھی تھے اور وقت کو بھی ہم اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر کے ستمبر 65ء میں بھارت کو شکست بھی دے سکتے تھے یا اس کی فوجی مشینری کو اس طرح تباہ کر سکتے تھے کہ بھارت کا مرکز پاش پاش ہو جاتا اور بھارت ٹکڑوں میں بٹ جاتا لیکن مومن کی فراست سے عاری ہماری قیادت یعنی ایوب خان' موسیٰ خان کی کردار کی کمی اور نااہلی کی وجہ سے پاکستان یہ فتوحات حاصل نہ کر سکا۔

لیکن 1947ء میں تو اور بہتر مواقع تھے کہ غیر جو سازش کر کے یا اہل مغرب اور بھارت کے متحدہ ایک جیسے اقدار ہونے کی وجہ سے کشمیر کے معاملات میں ہمارے ساتھ بے ایمانی کر رہے تھے اور ہم اپنے پچھلے مضامین میں اکتوبر نومبر 1947ء تک پہنچ گئے ہیں کہ کس طرح لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ہمارے انگریز نوکروں نے کشمیر سے ہمیں ''قانونی'' طور پر الگ کرنے کی سازش کی اور قائد اعلان فرما رہے ہیں کہ کشمیر پر پاکستان کا نہ صرف روحانی' تاریخی اور جغرافیائی حق ہے بلکہ قانونی طور پر بھی کشمیر پر ہمارا حق ہے اور جس اصول یعنی مسلمانوں کی اکثریت کے اصول کے تحت برصغیر کا بٹوارہ ہوا ہے' اس اصول کے تحت کشمیر پاکستان کا حصہ ہے اور اگر ہمیں اس زمانے میں کشمیر پلیٹ میں مل جاتا تو تاریخ کا دھارا کیا صورت حال اختیار کرتا؟ اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ شاید ہم ایسے ڈھیلے پڑ جاتے اور مادیت میں ایسے گھس جاتے کہ ویسے ہی ہمیں زوال آ گیا ہوتا۔ لیکن اس زمانے میں رب کی ذات پاک نے جہاد کو جاری کرنے کے مواقع بھی مہیا کر دیئے تھے اور بذریعہ جہاد بھارت کی فوجی مشینری کو تہس نہس کرنے کے رب پاک بے شمار مواقع عطا فرما رہا تھا۔ لیکن ہم نے اپنے پاکیزہ جہاد کی باگ دوڑ اپنے انگریز نوکروں کے ہاتھ میں دے دی اور انہوں نے ہماری فوج کو جس طرح بھونڈے طریقے سے غلط اوقات پر اور غلط جگہوں پر استعمال کر کے ہمارے سروں سے ''جہاد کا کیڑا'' نکالنے کی سازش کی یا توپوں کی آتش بازی کے

ڈرامے سے فائر بندی کا ڈھونگ رچا کر جہاد کو پکا جمود دے گئے یا ہمارا جو رخ مکہ و مدینہ کی طرف ہو رہا تھا' اس کو لندن اور واشنگٹن کی طرف موڑ گئے تو افسوس ہماری قوم نے نہ اس سلسلہ میں کوئی تحقیق کی ہے' نہ یہ سوچا ہے کہ پچھلے 60 سالوں سے ہم اس تذبذب کی زندگی سے کیوں دوچار ہیں۔

1947-48ء کے جہاد کشمیر کے واقعات کی تحقیق ایک نرالی صورت حال کی نشاندہی کرتی ہے اور اس جہاد کے ہماری قومی زندگی پر کیا اثرات ہوئے اور انگریز کس طرح ہمیں ''سانجھی دولت'' (COMMON WEALTH) کا ایک ''بے وقعت'' ممبر بنا گئے کہ ہم جنہوں نے پوری اسلامی دنیا کو ایک کرنا تھا وہ خود غیروں اور باطل قوتوں کے ''پچھ لگ'' بنے پھرتے ہیں۔ پچھلے مضامین میں ایک صورت حال واضح کی کہ سری نگر کی طرف پیش قدمی کا ایک ڈرامہ ''رچایا'' گیا تھا۔ چلو مان لیتے ہیں کہ غلطیاں ہوگئیں اور اگر میجر خورشید انور بڈگام کے ہوائی اڈہ پر قبضہ کر لیتا اور بھارتی فوجیں سری نگر میں نہ اتر سکتیں تو کیا کشمیر ہمیں مل جاتا؟ اور اگر مجاہدین جموں' کٹھوعہ روڈ کو کچھ عرصہ کیلئے بند کر دیتے تو کیا بھارت والے خاموش ہو جاتے؟ راقم کا خیال ہے کہ ایسا نہ ہوتا۔ اس کفر اور اسلام کی جنگ نے جاری رہنا تھا اور جاری رہنا ہے اور تب تک جاری رہے گی جب تک بھارت کفر سے پاک نہیں ہو جاتا۔ بات صرف ''مواقع تقدیر'' کے صحیح استعمال کی ہے کہ سعادت کن کو نصیب ہوتی ہے اور روز قیامت کن کے چہرے پرنور ہوں گے اور کن کے چہرہ سیاہ ہوں گے۔

قائداعظم کا فوج کی مداخلت کا حکم ہر لحاظ سے قانونی تھا۔ اس پر عمل پیرانہ ہونے کیلئے ہر قسم کے روڑے اٹکائے گئے کہ وقتی ٹکر سے بچاؤ کے بہانے' ماؤنٹ بیٹن اور فیلڈ مارشل آکنلیک نے ''التوا'' کی سازش کرائی کہ پاکستان کے انگریز نوکروں کو ''استعمال'' کر کے قائداعظم کو باور کرایا جائے کہ پاکستان کے پاس صرف دو پیدل بریگیڈ اور ایک بکتر بند بریگیڈ فوج ہے جو بھارت کے ساتھ مقابلہ میں لائی جا سکتی ہے۔ قائداعظم نے ساری فوج کے بارے میں ''پرسش'' کی تو ان کو بتایا گیا کہ باقی فوج رزمک' میران شاہ' وانا' منزئی لنڈی کوتل اور ساری ڈیورنڈ لائن کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے۔ قائد نے حکم دیا کہ وہ ساری فوج وہاں سے ہٹا کر پاکستان کی مشرقی سرحدوں پر تعینات کی جائے تو قائداعظم کو باور کرایا گیا کہ افغانستان دنیا کا واحد ملک ہے جس نے اقوام متحدہ میں ہمارے ممبر بننے کی مخالفت کی ہے۔ فقیر اپی اور کچھ قبائلی رہنما بھی پاکستان کی مخالفت کر رہے ہیں۔ قائداعظم نے فرمایا ''کرنے دو'' یہ کم علمی اور ناسمجھی ہے۔ مسلمان' مسلمان کا دشمن نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ غلط ڈپلومیسی ہے افغانوں کے حکمرانوں کی ان غلط پالیسیوں کے افغانستان کیلئے تباہ کن اثرات ہو سکتے ہیں۔ میرا حکم اٹل ہے ہم افغانوں کے حملوں کا دفاع نہ کریں گے۔ قبائلی لوگ' خاصہ دار اور سکاؤٹس ان علاقوں میں جاہل لوگوں کی شرارتوں کا جواب دیں۔ رائل افغان آرمی ہماری حدود میں داخل نہ ہوگی' ہمیں ہمارے دشمن صرف تنگ کرا رہے ہیں''۔

قائداعظم کا یہ حکم بڑی ''التواؤں'' اور ''ریزرویشنوں'' کے بعد مانا گیا کہ نومبر 1947ء میں ''آپریشن کرزن'' کے کوڈ کے نام سے ڈیورنڈ لائن کے ساتھ سے فوجیں ہٹائی گئیں لیکن قارئین ظاہر شاہ سمیت افغانستان کے حکمرانوں نے ہمارے ساتھ جو رویہ رکھا خود بھی ذلیل و خوار ہوئے اور اپنے ملک کو تباہی سے دوچار کیا۔ یہ ہے نتیجہ' مسلمان کے مسلمانوں کے ساتھ بے وجہ دشمنی کرنے کا اور طالبان کو چھوڑ کر یا حکمت یار یا حقانی یا نبی محمدی کو

چھوڑ کر اس زمانے کے افغان حکمرانوں کو بھی جب بھی موقع ملتا ہے تو وہ بھارت کی جھولی میں گرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اس زمانے کے برہان الدین ربانی کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ وہ ''چیتھڑوں'' میں ہمارے پاس پہنچا۔ ہم نے اس کو افغانستان کی حکمرانی تک پہنچایا تو حکمران بن کر وہ آدمی بھی بھارت کے ساتھ پینگیں بڑھانے سے باز نہ آیا۔ اور اب ہمارا ''پروردہ'' کرزئی بھارت یاترا کرتا پھرتا ہے' ہماری بلا سے ہماری جزا اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

پاکستان کے مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی رحمت یہ ہے کہ دنیا میں مسلمانوں پر جہاں مصیبت آئے خواہ یہ چیچنیا ہو یا بوسنیا یا شرق الہند کا کوئی ملک ہو یا کسی علاقے میں مسلمان جہاں اقلیت میں ہوں' ان کیلئے ہمارے دل دکھتے ہیں۔ یاسر عرفات ہمیشہ بھارت کے گیت گاتا رہا ہے ترکی کا بلند ایجوت بھی ہندوؤں کا یار تھا لیکن خواہ عرب ہوں یا ترک ہم ان کو مسلمان سمجھ کر ان کے ساتھ ہمدردی کرتے ہیں اور پاکستان کے بننے کا ایک یہ بھی راز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اول اور آخر مسلمان بننے کی راہ پر لگا دیا ہے۔ ہم مسلم قومیت کے نظریہ کے تحت پوری امت کی وحدت کے دعویدار ہیں تو انشاء اللہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اسی خطہ سے آگے عروج حاصل کرے گی۔ ہمارے بیچ جو چھوٹی ''قومیتوں'' کے چکر میں ہیں ہمارا اللہ ان کو ہدایت دے۔

تو قائداعظم کے رویوں کی طرف واپس آتے ہیں کہ ڈیورنڈ لائن سے فوج کے مشرقی سرحدوں پر آ جانے کے بعد بھی انگریز جنرلوں کے بہانے جاری تھے کہ ہمارے تو فوج کے تربیتی ادارے یعنی' پندرہ پنجاب سنٹر' سولہ پنجاب سنٹر اور انجینئر سنٹر سیالکوٹ میں ہیں یا آٹھویں پنجاب کا اور میڈیکل کور کا سنٹر لاہور میں ہیں جو سرحد کے نزدیک ہیں اور قارئین 1951ء میں یعنی انگریز جنرلوں کے جانے کے بعد ہم ان اداروں کو اندرون پاکستان میں لے آئے بلکہ فرسٹ پنجاب اور چودھویں پنجاب کے سنٹر تو 1956ء کے بعد مردان تبدیل کیے گئے۔ یہ بات ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ انگریزوں یا اہل مغرب کی بھارت کے ساتھ بہت زیادہ ''مشترکہ اقدار'' ہیں۔ لنگڑا لولا پاکستان اور بھارت کا ''چھوٹا بھائی'' بن کر رہنے والا پاکستان' اینگلو امریکن بلاک کی ضرورت ہے۔

قائداعظم کے سلسلہ میں یہ عاجز پھر گزارش کرے گا کہ ان کی کابینہ' حکومت پاکستان کے نوکروں اور ہماری ساری قوم نے انہیں بہت مایوس کیا۔ وہ بیمار تھے۔ ان تک حالات صحیح طور پر نہ پہنچائے جاتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ ان کا سیدھا رابطہ بہت کم تھا۔ نہ ان کو خان قیوم خان کے قبائلی مجاہدین کو مشرقی پنجاب میں داخلہ کے مشورہ سے آگاہ کیا اور نہ جموں کٹھوعہ روڈ کی سڑک پر مجاہدین کو لیاقت حکومت کے خود روک لینے کی بات بتائی گئی تو ظاہر ہے کرنل اکبر خان کی یہ تجویز بھی قائداعظم کو نہ بتائی گئی ہوگی کہ ان کو جموں کے علاقے سے قبائلی مجاہدین کو استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔ قبائلی مجاہدین اس وقت اور آج بھی ہمارا بہت بڑا اثاثہ ہیں لیکن ان کو ریگولر فوج کی طرح استعمال کرنا بڑی جہالت یا حماقت ہے۔ فوج ان کے لئے کوئی مضبوط مستقر بنائے۔ جہاں سے نکل کر وہ وقتی طور پر دشمن پر چھاپے مار کر اور دشمن کو تہس نہس کر کے اس مستقر میں واپس آ جائیں۔ کھلی لڑائی یا ان سے دشمن کی دفاعی پوزیشن پر حملہ کرانا جہالت ہوگی۔ بہرحال قائداعظم بار بار کہہ رہے تھے کہ پاکستانی فوج کو کسی وقت مجاہدین کی مدد کرنا ہوگی اور ہمارے انگریز نوکر فوج میں نفری اور ہتھیاروں کی کمی کا بہانہ بنا رہے تھے تو قائداعظم نے حکم دیا کہ ہر ضلع میں نیشنل گارڈ کے طور پر ایک ایک پلٹن کھڑی کر دی جائے۔ اس اکیلے حکم سے ایک

دن میں 36 پلٹنیں کھڑی ہو گئیں یعنی چار ڈویژن فوج تیار تھی جو قوت ایمانی اور نیزوں بھالوں سے لڑ کر بھی جہاد کو جاری رکھ سکتے تھے۔ بھاری اور بہتر ہتھیار انعام خداوندی ہے لیکن رب کی ذات پاک نے بھارتیوں کو کشمیر میں جو EXTERIOR LINE پر لڑنے میں ''پھنسا'' دیا تھا۔ اس وقت ہم اس قابل تھے کہ بھارت کو بھرپور چوٹ لگا سکتے تھے' جس سے وہ اپنی موت مر جاتا۔

ہم ہر ضلع میں نیشنل گارڈ پلٹنوں کی تعداد بڑھا کر پوری قوم کیلئے جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنانے کی راہ پر لگا سکتے تھے اور اگر انگریز نوکر ہمارے اوپر ''براجمان'' نہ ہوتے تو اکبر خان اور اس جیسی فراست والے صدیق ستی' حسن مرزا' شیر محمد اور حفیظ آفریدی یا نوشیروان کی قسم کے لوگ کشمیر میں بھارت کے ساتھ وہ کرتے جس کی ہم کچھ جھلکیاں آگے دیں گے کہ ان لوگوں کی کمر میں انگریزوں نے رسی ڈالی ہوئی تھی۔ جب وہ کچھ کر لیتے تھے تو انگریز ان کو پیچھے کھینچ لیتے تھے اور فوج کا بڑا ہی بھونڈا استعمال ہوا' کہ راقم خود اس کا چشم دید گواہ ہے اور قائداعظم کو اندھیرے میں رکھا گیا' جو کچھ ہے میرے پاس صرف ایک ثبوت ہے کہ قائداعظم کے ساتھ یہ وعدہ ضرور کیا گیا کہ بھارت جب حیدر آباد پر حملہ کرے گا تو ہم کشمیر بھارت سے لے لیں گے اور یہ تجویز بنائی گئی تھی لیکن قائداعظم کی وفات کی وجہ سے اس تجویز پر عمل روک دیا گیا۔ پورا ثبوت زمان کی پیش رفت کے ساتھ واقعاتی طور پر سامنے آئے گا۔

بھارت والوں کی ہم نے ایسی تیسی کر دی تھی کہ بھارت معاملہ اقوام متحدہ میں لے گیا لیکن ظفر اللہ کو وزیر خارجہ بنانے کی ''سازش'' کو اس سے پروان چڑھایا گیا اور ہمارے جہاد کو ''معطل'' کرایا کہ ہم دو تہائی کشمیر کو آزاد کرا چکے تھے اور بھارتی فوج کو تہس نہس کرنے والے تھے کہ ہمیں سازش کے ذریعہ سے موجودہ فائر بندی لائن یا کنٹرول لائن پر لایا گیا کس نے کیا کچھ کیا؟ اور کون سازش کی کڑی تھے؟ کون سازش میں بن جانے استعمال ہوئے؟ یہ عاجز ثبوتوں کے ساتھ قوم کے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا چاہتا ہے کہ آؤ اپنے اندر بے کردار لوگوں کی نشاندہی کریں یہ عاجز سب مجاہدین سے معذرت کرے گا کہ میں ان سب کی بہادریوں کی کہانیاں نہ لکھ سکوں گا۔ صرف تواتر اور سبق آموز باتوں کا خیال رکھ کر بہت اختصار سے گذارش کروں گا کہ جو کچھ ہوا اس کی اکثر باتوں سے قوم بے خبر ہے اور غلط کہانیوں اور فضول باتوں پر بحث ہوتی رہتی ہے۔

بات بڑی سیدھی ہے کہ خورشید انور ''منظر'' سے ایسا غائب ہوا کہ اس نے جو کچھ کرنا تھا اس سے کرا کے ہم سب کو خوب بے وقوف بنایا گیا اور اب قبائلی مجاہدین یا سدھن اور عباسی یا ضلع پونچھ اور ضلع میرپور کے مقامی مجاہدین اکیلے بھارتی فوج کا کیسے مقابلہ کرتے تو قائداعظم کے حکم کے تحت سورۃ النساء کی آیت مبارکہ 75 کے تحت جو لوگ خوشی سے رضا کارانہ طور پر ان مجاہدین کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ ان کی مدد حکومت پاکستان کا فرض تھا اور قائداعظم نے اس کا کھلم کھلا اعلان کر دیا اور آج تک جو مجاہدین کی مدد ہو رہی ہے اس کی بنیاد قائداعظم باندھ گئے تھے۔ بے چارے مودودی کو اس زمانے میں یہ بات سمجھ نہ آ سکی۔ اُس نے اوّل تو قرآن پاک سورۃ الانعام کی آیت مبارکہ 159 کی رد کر کے ہمیں۔ پاکستانی، کشمیری اور قبائلی تین گروہوں میں بانٹ دیا۔ صرف کشمیریوں کے جہاد کو برحق کہا اور قبائلی مجاہدین کے جہاد کو ''مسترد'' کر دیا۔ کہ وہ باعمل مسلمان ہوں۔ حضور پاک ﷺ نے تو ایسی شرط نہ لگائی تھی۔ لیکن مودودی نے ہم پاکستانیوں کیلئے تو کشمیر کے جہاد میں شمولیت کو حرام قرار دے دیا اور

سورۃ النسا کی آیت مبارکہ 75 کو رد کر دیا ہے۔ مودودی کی کم علمیوں، گستاخیوں اور بے ادبیوں پر یہ عاجز اب کئی کتابیں لکھ چکا ہے، خدا کا شکر ہے اب جماعت اسلامی والے بات کو سمجھ گئے ہیں اور قائداعظم یہ اعلان بھی فرما گئے تھے کہ بھارتی کارروائی سے اگر پاکستان کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو ہم فوج کو بھی استعمال کریں گے اور اپریل 1948ء میں ہم نے اقوام متحدہ میں تسلیم بھی کر لیا کہ ہم نے فوج بھیجی ہے اور کشمیر کے معاملہ میں ہم "پارٹی" ہیں اور بھارت اگر اقوام متحدہ کے احکام کو تسلیم نہیں کرتا یا ان قراردادوں کو رد کرتا ہے تو ہم کشمیر میں کوئی کارروائی کرنے میں حق بجانب ہیں۔ لیکن افسوس ہمارے بیچ غیروں کے ایجنٹ اس سلسلہ میں ہمیں پوری تیاری نہیں کرنے دیتے اور یہی رونا ستمبر 65ء کی جنگ کے سلسلہ کے مضامین میں رویا گیا اور کشمیر 48-1947ء کی کوتاہیوں اور غداریوں سے کچھ پردے اتارے جاتے ہیں۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ قائداعظم کے ایسے کھلے اعلانات کے باوجود لیاقت حکومت کشمیر کی آزادی کیلئے کوئی صحیح پالیسی وضع نہیں کرتی تھی اکبر خان کی کتاب کے مطابق اور اس کی سفارش پر ایک لبریشن کمیٹی ضرور بنائی گئی جس کے صدر جسٹس دین محمد اور ممبروں میں سردار ابراہیم اور اس وقت وزیر خزانہ غلام محمد، ریاستی امور کے سیکرٹری کرنل اے ایس بی شاہ، راولپنڈی کا کمشنر عبدالرحیم تھے اور فوجی ممبر کرنل اکبر خان تھا جو لیاقت علی کا فوجی مشیر تھا اور سب کام شروع شروع میں انگریز جنرلوں سے پوشیدگی میں کرنا تھا لیکن یہ کمیٹی کوئی خاص کام نہ کر سکی۔ علاوہ ازیں آزاد کشمیر کا ایک فوجی ہیڈ کوارٹر بھی کرنل محمد زمان کیانی کے ماتحت تشکیل کیا گیا لیکن یہ لوگ راولپنڈی میں بیٹھ کر کشمیر کو "آزاد" کراتے رہتے تھے۔ خوش قسمتی سے ضلع پونچھ اور ضلع میر پور کے علاقوں میں مقامی مجاہدین نے اپنے آپ کو کافی منظم کر لیا تھا اور ان کی مدد کیلئے ریاست دیر وغیرہ سے کچھ منظم لشکر بھی پہنچ رہے تھے اور صوبہ پنجاب سے کچھ پرانے فوجی بھی ان علاقوں میں پہنچ گئے تھے اور ہم ان علاقوں کے جہاد کا مختصر خاکہ اگلے مضامین میں پیش کریں گے، لیکن وادی کشمیر یا مظفر آباد تک علاقوں میں کوئی مقامی مجاہدین نہ تھے۔ سب کارروائی قبائلی مجاہدین نے کی تھی جو تتر بتر ہو رہے تھے تو بھارتی فوج مظفر آباد اور کوہالہ پل تک پہنچ سکتی تھی کہ وہاں تجربہ کار انگریز جنرل بھارتی فوج کی رہنمائی کر رہے تھے اور یہاں ہم نے اپنے انگریز سربراہوں سے "چوری چھپے" بھارت کے اس "سیلابی" حملہ کو روکنا تھا اپنی قسمت کا اندازہ لگائیں۔

پورے کشمیر میں جہاد کا کنٹرول اکبر خان کے ہاتھوں میں دیا جائے

ہمارے سرکاری ریکارڈ اور اخبارات اس بھیانک صورت حال کے بارے میں بالکل "خاموش" ہیں لیکن اکبر خان کی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ 6/7 نومبر کی رات کو پنجاب کا وزیراعلیٰ نواب ممدوٹ اور سرحد کا وزیراعلیٰ خان قیوم، ریاستی سیکرٹری کرنل اے ایس بی شاہ، راولپنڈی میں اکبر خان کے گھر پہنچ گئے اور بڑی پریشانی اور مایوسی کی حالت میں اکبر خان کو بتایا کہ بھارتی پیش قدمی کو روکنا ضروری ہے۔ خورشید انور نے ہاتھ کھڑے کر دیئے ہیں۔ کہ اُس نے تو سازشیوں کی گیم کھیلنی تھی اور اُس کے مقاصد پورے ہو گئے تھے۔ بہر حال ان لوگوں نے پشاور، راولپنڈی، نوشہرہ اور ایبٹ آباد میں کئی افسروں کے ساتھ ملاقات کی ہے۔ کوئی آدمی خورشید انور کی جگہ لینے کو تیار نہیں لیاقت حکومت کشمیر میں مداخلت پر ہرگز تیار نہیں اور کسی سرکاری افسر کو سرکاری حیثیت میں کچھ کرنے کی

اجازت نہیں لیکن ساتھ ہی وزیر اعظم لیاقت کا کہنا ہے کہ کم از کم اگلے تین ماہ کشمیر میں کچھ جنگ جاری رکھی جائے۔
اور دراصل یہ بھی سازش والوں کی ضرورت تھی کہ ہمارے ساتھ وہ کرنا تھا جو ہوا۔

قارئین !خود سوچیں کہ کیا پاکستان اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا راز نہیں ؟ کہ لیاقت حکومت ایک مہمل ضرورت کے تحت جنگ صرف تین ماہ جاری رکھنا چاہتی تھی اور خود اس سلسلہ میں کچھ کرتی بھی نہیں ۔ پنجاب اور سرحد کی قیادت کو ''استعمال'' کر رہی ہے اور قائداعظم کے صحیح اعلانات اور صحیح رہنمائی کے باوجود لیاقت حکومت عملی طور پر کوئی پکی تجویز نہیں بناتی اور ''ڈنگ ٹپاؤ'' تجاویز پر گزارا ہے ۔ اکبر خان کا ردعمل بڑا صحیح تھا اور وہ کہتا ہے کہ کسی نہ کسی نے یہ کام کرنا ہے ۔ ''اکبر خان تو اٹھ اور تو ہی اس کام کو سرانجام دے'' اکبر خان اس محاذ کے دو چکر اکتوبر کے آخری ہفتوں میں لگا چکا تھا ۔ بہر حال اب جب اکبر خان مختصر سے چلتے پھرتے ''ہیڈ کوارٹر'' کے ساتھ اوڑی پہنچا تو بچے کھچے قبائلی مجاہدین بھی جہاد کو ''الوداعی سلام'' کر رہے تھے کہ حکومت پاکستان، جس نے ہمیں اس جہاد پر بھیجا ہے وہ بھارتی ہوائی جہازوں کے مقابلہ کے لئے اپنے ہوائی جہاز کیوں نہیں بھیجتی کہ ہمیں ان حملوں سے بچائے اور ایک دفعہ صورت حال یہ ہوگئی کہ میجر محمد اسلم (بعد میں بریگیڈئر) سمیت اکبر خان کے پاس لڑنے والے مجاہدین کی تعداد دو درجنوں سے زیادہ نہ تھی، جن سے پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھارتی پیش قدمی کرنے والوں پر فائر کرا کے یا پتھر لڑھکوا کر ان کی پیش قدمی کو روکے ہوئے تھے ۔ اگلے ڈیڑھ ماہ میں کچھ تازہ دم قبائلیوں کی مدد سے جو کچھ اکبر خان کر سکا، اس کی تفصیل بھی میری کتاب میں موجود ہے کہ ان واقعات کو دنیا کی عسکری تاریخ میں اتنا اونچا مقام حاصل ہے کہ ''ان ہونی'' جو کبھی کبھی ہوتی ہے، اکبر خان کے مجاہدین نے اس کو اپنی ''نوکرانی'' بنایا ہوا تھا اور بھارت کو اتنا نقصان اٹھانا پڑا کہ جن نقصانات کی وجہ سے بھارت نے جنوری 1948ء میں اقوام متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان میں باقی محاذوں پر بھارتیوں کے نقصانات کے علاوہ اس محاذ پر 22/21 نومبر کو اوڑی سے پونچھ جانے والی بھارتی کالم کی تباہی، دسمبر 1947ء کے دوسرے تیسرے ہفتہ مہمندوں اور مسعودوں کے قبائلی مجاہدین کے گوہالن اور بنگراں کے مقام پر بھارتی سکھ رجمنٹ کو تہس نہس کرنے کی کاروائیوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ اکبر خان کی فوجی فراست ایک کتاب کا مضمون ہے اور یہاں جو کچھ زمین کے صحیح استعمال سے اپنے چنے ہوئے وقت پر قبائلی مجاہدین سے اس نے وہ کچھ کرایا جو دسمبر 1948ء تک قائم رہا کہ بھارتی اوڑی کے راستے پونچھ کے ساتھ رابطہ قائم کر کے آزاد کشمیر کے ہمارے سدھن اور عباسی لشکروں کو تہس نہس کرنا چاہتے تھے جس میں وہ بری طرح ناکام ہوئے۔ اکبر خان کے اس محاذ پر پہنچتے ہی جب اس کے پاس صرف دو درجن مجاہدین رہ گئے تھے کہ وہ اپنی ''کشتیاں جلا چکا'' تھا اور اس نے ''طارق'' کا نام بھی اپنا لیا تھا لیکن اس نے قبائلی مجاہدین کو خورشید انور کی طرح استعمال نہ کیا ۔ وہ جانتا تھا کہ قبائلی مجاہدین نہ کسی بڑی پکی دفاعی پوزیشن پر سیدھا حملہ کر سکتے ہیں نہ خود ایک عام زمین پر دفاع میں رہ سکتے ہیں ہاں پہاڑی علاقوں کا دفاع کر سکتے ہیں لیکن یہ قبائلی مجاہدین رائفل کی ''گولی'' بھی ہیں اور توپ کا ''گولہ'' بھی اور ان کی اس خاصیت کو یعنی ''فائر پاور'' ہونے کو صحیح حرکت دے کر اس سے ہدف کو تباہ کرایا جائے ۔

اکبر خان کی فوجی فراست کے یہ نتائج جب لبریشن کمیٹی والوں اور خان قیوم اور نواب ممدوٹ تک پہنچ

گئے تو انہوں نے لیاقت علی کو مجبور کیا کہ پورے کشمیر میں جہاد کا کنٹرول اکبر خان کے ہاتھوں میں دے دیا جائے اور اس طرح اکبر خان اوڑی محاذ کی کمانڈ کرنل محمد شریف کے حوالے کر کے دسمبر کے تیسرے ہفتہ راولپنڈی پہنچ گئے جہاں طارق ہیڈ کوارٹر کی بنیاد ڈالی کہ بھارتیوں کے سامنے بڑا مقصد ہمارے پونچھ اور میر پور کے ضلع کے مجاہدین کو تہس نہس کرنا تھا۔ جب پونچھ سے وہ لوگ رابطہ نہ کر سکے تو نوشہرہ' جھنگڑ والے راستے انہوں نے کوٹلی اور راولاکوٹ کی طرف پیش قدمی کی تجویزوں پر عمل شروع کر دیا۔ منگ کے فوجی سردار افسر خان ایم سی اعوان کے دو بھتیجوں نے جہاد کی بسم اللہ کی کہ 15 اکتوبر میں شہادت کے سلسلہ میں جو بارش کی پہلی بوندیں بننے کی مثال دی کہ باقی مجاہدین نے برین گن والے ڈوگرہ دستہ کو ہلاک کر دیا پھر ڈوگروں کے تین سو کے لشکر نے جو علاقے کے دو ہزار مکان جلا کر تباہی مچائی کہ مری میں ٹھہرے ہوئے غیر ملکیوں نے بھی دھوئیں کے غبار دیکھے تو میجر بوستان خان کیپٹن حسین خان شہید نے اس ڈوگرہ لشکر کو راولاکوٹ میں محصور ہونے کے لئے مجبور کر دیا اور بڑے کیپٹن خان محمد نے بڑھاپے میں اور علاقے کے باقی شرفاء نے جس طرح اپنی جانوں کو ہتھیلی پر رکھا' ان کی قدر وہی لوگ جانتے ہیں جو خود ایسے حالات سے گزرے ہوں۔

البتہ سخی دلیر جس کا ذکر یہ عاجز اپنے پہلے مضامین میں کر چکا ہے کہ اس کی ''چالوں اور کیپٹن حسین خان شہید'' کے مجاہدوں نے جس طرح موجودہ آزاد پتن جو اس وقت پھمن پتن کہلاتا تھا' اس پر قبضہ کر کے آزاد علاقوں کا پاکستان کے علاقوں سے رابطہ باندھا' وہ ایک عظیم کامیابی ہے اور اتنے زیادہ علاقے آزاد کرا لئے گئے کہ 24 اکتوبر 1947ء کو تراڑ کھیل کے مقام پر آزاد کشمیر کی اپنی حکومت بھی قائم ہو گئی اور گیارہ نومبر تک راولاکوٹ سے بھی ڈوگروں کو بھگا دیا گیا اور ان کے تعاقب میں تولی پیر کے مقام پر اسلام کے ''عظیم فرزند کیپٹن حسین خان'' نے بھی شہادت کی سعادت حاصل کر لی اور تمام ڈوگروں نے تو پونچھ میں پناہ لے لی جس کا سدھنوں اور عباسیوں کے لشکروں نے محاصرہ کر لیا تھا اور اوڑی کے محاذ سے بھارتیوں نے 20 نومبر کو پونچھ کے ساتھ رابطہ باندھنے کی کوشش کی اس سلسلہ میں اکبر خان اور قبائلی مجاہدین نے اس رابطہ کی کوشش کی تو تہس نہس کر دیا لیکن بھارتی بریگیڈئر پریتم سنگھ کچھ کمک لے کر پونچھ پہنچ گیا تھا اور اس نے محاصرین کی کمانڈ سنبھال کر پونچھ کے دفاع کو مضبوط کر دیا۔ اگر خورشید انور یہ کارروائی اکتوبر میں نہ کرتا اور یہ بھارتی کمک نہ پہنچ جاتی تو نومبر کے آخر تک پونچھ ہماری جھولی میں گر چکا ہوتا اور پونچھ کے آزاد ہونے کے بعد ہم کشمیر کی آزادی کی آدھی جنگ جیت چکے ہوتے اور جس طرح اکبر خان نے جموں کی فوجی اہمیت کا ذکر کیا ہے اسی طرح پونچھ کی فوجی اہمیت' سری نگر سے زیادہ تھی کہ لوگ ہمارے ساتھ تھے تو خورشید انور کے ''ڈرامے'' جگہ جگہ ہمیں لے ڈوبے۔ ہم پونچھ کی باقی کارروائیوں کا ذکر ''زمان'' کے حساب سے اپنے وقتوں پر کریں گے اور مجاہدین کی باقی فتوحات کا ذکر اختصار سے کرتے ہیں۔

بھمبر اور میر پور کے علاقوں کے سب مجاہدین کو یہ عاجز سلام کرتا ہے' خاص کر میجر محمد افضل شہید کو جس نے میجر حسن خان فاتح گلگت اور متعدد مسلمان افسروں سے بہت پہلے رابطہ باندھا ہوا تھا کہ مہاراجہ کشمیر نے اگر جلدی پاکستان کے ساتھ الحاق نہ کیا تو وہ لوگ بذریعہ جہاد کشمیر کو آزاد کرائیں گے میجر افضل نے پاکستان سے اور بھمبر کے علاقے سے پانچ سو مجاہدین کا ایک جتھا تیار کر لیا اور 21 اکتوبر سے بھمبر کو جو اکھنور یا نوشہرہ کی طرف سے

راستے آتے تھے ان کی ناکہ بندی کر لی تھی کہ بھمبر کا دفاع مہاراجہ کے گھوڑ سوار رسالہ کا ایک سکواڈرن کر رہا تھا ہمارا گیارھواں رسالہ بھی نزدیک پاکستان کی سرحدوں میں موجود تھا۔ اس کے کرنل مسعود سے رابطے کے بعد کیپٹن (بعد میں کرنل) محمد نواز سے ٹینکوں کے فائر کی مدد بھی مانگی ہوئی تھی اور یہ مدد حاصل کر کے میجر افضل نے 24 اکتوبر 1947ء کو بھمبر کو آزاد کرا کے اس پر پاکستان کے جھنڈے لہرا دیئے اور کچھ دستے اس علاقے کی حفاظت کیلئے چھوڑ کر میجر افضل باقی لشکر کے ساتھ میر پور پہنچ گئے جہاں ڈوگرہ پلٹن کی ایک کمپنی بڑے پکے دفاع میں تھی۔ میر پور کے لوگ بھی جہاد میں شریک ہو چکے تھے خاص کر مفتی عبدالحکیم' قاضی محمد بشیر' فوجی سرداراں' محمد حسین' منگا خان' محمد اسماعیل' امام علی' محمد فاضل' دلاور خان اور مولوی کرم الٰہی وغیرہ کا ذکر ضروری ہے لیکن ان کے پاس درہ آدم خیل کی بنی ہوئی کل چالیس رائفلیں تھیں تو وہ لوگ ڈوگرہ کمپنی کا صفایا نہ کر سکے لیکن اب میجر افضل کے علاوہ چھوٹا خان یعنی کیپٹن خان آف منگ بھی مجاہدین کی مدد کیلئے ایک دستہ لے آئے اور ایک کیپٹن نصیر ریاست دیر سے بھی لشکر لے آئے۔ 15 اور 17 نومبر کو بھارتی ہوائی جہازوں نے ڈوگرہ کمپنی کیلئے کچھ سامان گرایا لیکن مجاہدین نے محاصرہ کو تنگ کر کے 24 نومبر 1947ء کو میر پور پر بھی اسلامی جھنڈا لہرا دیا اور یہ سارے لشکر بعد میں جھنگڑ۔ دھر مسال کی عظیم فتح میں بھی شامل ہوئے جو کہانی بعد میں بیان کی جائے گی۔

کوٹلی کے گرد اگرد ڈوگرہ فوجی تھروچی قلعہ' اوون' اور سینہ وغیرہ کے مقامات پر بھی پھیلے ہوئے تھے۔ سخی دلیر کا تعلّق انہی علاقوں سے تھا اور اس نے متعدّد ڈوگرہ گشتی دستوں کو گھات لگا کر ہلاک کیا بلکہ ان کے اپنے ایک رشتہ دار سیف علی کا سر قلم کیا جو ڈوگروں کیلئے مخبری کرتا تھا لیکن تھروچی قلعہ کی فتح کا سہرا کیپٹن (بعد میں کرنل) محمود خان کے سر ہے۔ جس نے ڈوگرہ فوج میں میجر (بعد میں کرنل) رحمت اللہ سالاریہ سے رابطہ باندھ کر کافی مجاہدین اکٹھے کر لئے اور سب ڈوگروں کو تہ تیغ کر دیا۔ رحمت اللہ اور محمود خان نے کوٹلی کا محاصرہ کر لیا لیکن ڈوگروں کا دفاع بہت مضبوط تھا۔ اسی دوران میجر رحمت اللہ کی ملاقات سخی دلیر سے ہوگئی تو میجر رحمت اللہ جو سلجھا ہوا فوجی تعزیرات کا ماہر تھا کہ دوسری جنگ عظیم میں حصّہ لے چکا تھا تو وہ جھنگڑ دھر مسال کی اہمیّت کو سمجھتا تھا اس لئے سخی دلیر اور دو سو مجاہدین کو ساتھ لے کر جھنگڑ پر چھاپہ مارنے کی کوشش کی کہ کوٹلی کے محاصرہ کی ذمہ داری کیپٹن محمود خان کو گئے۔ لیکن جھنگڑ میں کچھ بھارتی فوجی امداد پہنچ گئی تھی اس لئے یہ چھاپہ کامیاب نہ ہوا لیکن رحمت اللہ اور سخی دلیر دونوں اسلام کے عظیم فرزند اور ان تھک مجاہد تھے۔ ان کو خبر ملی کہ راجوری میں ڈوگرہ فوج کی صرف دو پلٹونیں ہیں تو انہوں نے کچھ مجاہدین جھنگڑ کی دیکھ بھال کیلئے چھوڑ دیئے اور خود چھاپہ مار کر راجوری کو فتح کر لیا جس نے مجاہدین کیلئے خوراک کے سارے مسائل حل کر دیئے کہ راجوری بہت زرخیز علاقہ ہے۔ وہاں اناج خاص کر چاولوں کے جگہ جگہ ڈھیر لگے ہوئے تھے کہ بدامنی کی وجہ سے ان کی منڈیوں میں نہ لے جایا سکا تھا۔ بہرحال یہ بہت بڑی کامیابی تھی کہ راجوری سے آگے سارے ادھم پور کے ضلع میں کوئی ڈوگرہ فوج نہ تھی اور اب راجوری سے بڑھ کر مجاہدین جموں' سری نگر روڈ کے علاقوں رام بن اور بانہال تک بغیر روک ٹوک کے جا سکتے تھے اور اس سڑک کی ناکہ بندی کر سکتے تھے۔ ساتھ ہی شمال میں تھنہ منڈی' شوپیاں اور پیر پنجال کے علاقوں میں بھی کوئی ڈوگرہ فوج نہ تھی اور مجاہدین ان سب علاقوں کو اپنے قلمرو میں لے سکتے تھے۔

البتہ تدبیرات اور تعزیرات کے تحت بھارتیوں کیلئے زیادہ اہمیت کوٹلی اور پونچھ کی تھی۔ سری نگر محاذ سے بھی وہ اوڑی سے پونچھ کا رابطہ باندھنے کی کوشش کر رہے تھے جو ذکر ہو چکا ہے کہ محصورین کو کمک پہنچ گئی۔ اب بھارت کا پچاسواں بریگیڈ' بریگیڈئر پرانجاپے کے ماتحت جموں پہنچ چکا تھا اور بھارت کے وزیر سردار پٹیل اور بلدیو سنگھ بھی جموں پہنچ گئے کہ بھارتی بریگیڈ کے ساتھ ایک بکتر بند رجمنٹ اور ایک توپخانے کی رجمنٹ اور انجینئر وغیرہ سب کچھ تھے اور اس بریگیڈ کو حکم ملا کہ وہ 19 نومبر 1949ء تک کوٹلی پہنچ کر مہاراجہ کی پلٹن جو وہاں محاصرہ میں تھی۔ اس کے ساتھ مل کر آگے پونچھ کے ساتھ رابطہ باندھے 3'5'9 اور 11 نومبر کو بھارتی ہوائی جہازوں نے کوٹلی میں گھری ہوئی فوج کیلئے امدادی سامان گرایا اور ان کو خبردار کیا کہ وہ ہتھیار نہ ڈالیں۔ اب ہماری بدقسمتی ہمارے انگریز نوکروں کی سازش اور لیاقت علی کی ملی بھگت کی وجہ سے کہ سیالکوٹ کے مغرب میں بھی مجاہدین کو ہیڈ مرالہ سے یا آگے ضلع گجرات کے علاقہ سے بھارتی ذرائع آمدورفت میں خلل نہیں ڈالنے دیا جا رہا تھا اور بھارتی بریگیڈ اس طرح پیش قدمی کر رہا تھا جس طرح انگریز قبائلی علاقوں میں ''کالمس'' نکالتے تھے۔ تو یہ بھارتی بریگیڈ آسانی کے ساتھ 17 نومبر کو نوشہرہ پہنچ گیا کہ مجاہدین میرپور کی طرف گئے ہوئے تھے لیکن کچھ مزاحمت ضرور ہوئی کہ نوشہرہ سے جھنگڑ دھرمسال یہ بریگیڈ 19 نومبر کو پہنچا لیکن جھنگڑ سے کوٹلی تک اتنی مزاحمت ہوئی کہ یہ بھارتی بریگیڈ مشکل سے 26 نومبر کو کوٹلی پہنچا۔ 24 نومبر کو میرپور بھی فتح ہو چکا تھا۔ تو اب سارے مجاہدین کوٹلی اور جھنگڑ روڈ کے گرد اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔

بھارتی بریگیڈئر پرانجاپے کو راقم آزادی سے پہلے ذاتی طور پر جانتا تھا۔ وہ فوجی معاملات کو خوب سمجھتا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ کوٹلی سے پونچھ کا ملاپ تو بہت مشکل ہے بھارتی فوج کوٹلی میں بھی محصور ہو جائے گی اس لئے اس نے خیریت اسی میں سمجھی کہ محاصرین کو جلد وہاں سے نکال کر جلدی سے وہ جھنگڑ واپس جائے لیکن بھارتیوں نے ظلم کی انتہا کر دی کہ جو مسلمان کہیں نظر آیا اس کو شہید کرتے گئے اور ایک مسلمان افسر لیفٹیننٹ سردار علی جو مہاراجہ کی فوج میں تھا اُس کو بھی شہید کر دیا کہ بھارتیوں کو خبر ملی کہ اس کا بڑا بھائی میجر شیر علی مجاہدین میں شامل ہو گیا ہے۔ بہرحال بھارتی بریگیڈ جب جھنگڑ واپس پہنچا تو وہاں بھی ہر طرف مجاہدین ہی مجاہدین نظر آتے تھے۔ تو پرانجاپے نے ایک پلٹن جھنگڑ چھوڑی اور باقی نفری کے ساتھ خود نوشہرہ چلا گیا کہ زمینی لحاظ سے نوشہرہ کا دفاع قدرتی تھا کہ نوشہرہ' توی اور ساتھ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور جموں سے نوشہرہ آنے تک کوئی رکاوٹ نہ تھی اور مزید بھارتی دو پلٹنیں نوشہرہ پہنچ گئی تھیں' لیکن بھارتی احکام کو پرانجاپے کی یہ حرکت پسند نہ آئی۔ انہوں نے اس کو بے عزتی سے فوج سے نکال دیا اور اس کی جگہ بریگیڈئر عثمان کو بھیجا جس نے نوشہرہ کے دفاع کو بہت مضبوط کر دیا اور نوشہرہ بھارتی افواج کا ایک بہت بڑا مستقر بن گیا کہ بچی کھچی ڈوگرہ یونٹوں کو بھارت کی فوج کا حصہ بنا دیا گیا۔

لیکن ہمارے مجاہدین کا جوش و خروش بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا اور بھارتی اس قابل نہ تھے کہ جلدی جلدی جھنگڑ سے کوٹلی یا راجوری کی طرف پیش قدمی کریں کہ مجاہدین کی اللہ اکبر کی صداؤں سے سب ماحول قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے زمانے کی یاد تازہ کرتا تھا۔ بھمبر سے مجاہدین نوشہرہ کے جنوب میں ''ریچھ'' اور ''فیڈی'' کی پہاڑیوں تک پہنچے ہوئے تھے۔ راجوری سے مجاہدین نوشہرہ کے شمال مشرق میں چنگس تک پہنچے ہوئے تھے اور نوشہرہ

جھنگڑ روڈ کے مغرب میں مجاہدین ہی مجاہدین نظر آتے تھے کہ میر پور کی فتح کے بعد میجر افضل اور کوٹلی سے بھارت کی پسپائی کے بعد کیپٹن محمود خان آف منگ یعنی چھوٹا خان' دریوں کا لشکر' کشمیر خان کا لشکر' ڈھنڈ کے کے نزدیک پہنچے ہوئے تھے لیکن افسوس کہ اوّل کوئی مرکزی ہیڈ کوارٹر مقامی طور پر وہاں موجود نہ تھا۔ کرنل زمان کیانی اور حبیب الرحمن وغیرہ راولپنڈی میں بیٹھے تھے اور یہاں آزاد ہیڈ کوارٹر سے احکام چلا رہے تھے لیکن یہاں تو اکبر خان جیسے کسی فوجی فراست والے صاحب کی ضرورت تھی' کہ نوشہرہ اور جھنگڑ کی تمام افواج کو تہس نہس کرنے کا دسمبر 1947ء میں ایک عظیم موقع تھا لیکن اس کی ایک اور ضرورت بھی تھی کہ جموں اور نوشہرہ کے درمیان بھارتی رابطہ کو منقطع کیا جائے یا اس میں خلل ڈالا جائے۔ دسمبر کے تیسرے ہفتہ میں اکبر خان نے پنڈی پہنچ کر طارق ہیڈ کوارٹر کچھ بنا ضرور لیا تھا اور اس ضرورت کی طرف دھیان دیا کہ کرنل (بعد میں جنرل) سید غواص کو دسمبر 1947ء میں دریائے چناب کے کنارے سید پور کے مقام پر تعین کیا اور ایک ''برق فورس'' کو بھی کہ انہوں نے بہت کچھ کرنا تھا۔ لیکن سازش اتنی گہری تھی کہ ان لوگوں کو کچھ نہ کرنے دیا گیا۔ حالانکہ جنوری 1948ء میں سیالکوٹ کے علاقوں میں مجاہدین کی نفری پچیس ہزار سے تجاوز کر رہی تھی۔ دریائے چناب کے مشرق سے مجاہدین کو کوئی کارروائی نہ کرنے دی گئی اور اس وجہ سے ہم اپنے جہاد کے آدھے مقصود حاصل کر سکے اور ہم گذارش کر چکے ہیں کہ لیاقت علی نے چودھری محمد علی اُس وقت حکومت کے سیکرٹری جنرل بعد میں وزیر خزانہ اور وزیراعظم کے ذریعہ سے سخت احکام دیئے تھے کہ مجاہدین دریائے چناب کے مشرق میں کوئی کارروائی نہ کریں گے۔

اب نوشہرہ اور جھنگڑ کے اردگرد اتنے مجاہدین اکٹھے ہو گئے تھے کہ ان سے کوئی کارروائی نہ کرائی جاتی تو ان کو کنٹرول کرنا بہت مشکل تھا یا کچھ لشکر کہیں لوٹ مار نہ کرنے لگ جاتے۔ بے قاعدہ افواج کو محدود کرنا مشکل ہو جاتا ہے' اس لئے مقامی کمانڈروں میں میجر افضل' خان آف منگ کرنل شیر احمد' کیپٹن محمود خان' کشمیرا خان' دریی لشکر کے نمروز خان وغیرہ نے جھنگڑ اور نوشہرہ کے زیادہ سے زیادہ علاقوں کو فتح کرنے اور بھارتی فوج کو تہس نہس کرنے کی جو تجویز بنائی اور جس پر عمل بھی کیا' وہ بہت تفصیلی بیانات ہیں۔ یہ لڑائی 23 دسمبر سے 25 دسمبر 1947ء تک جاری رہی۔ بھارتیوں کو بکتر بند گاڑیوں' توپخانہ اور ہر قسم کے ہوائی جہازوں کی امداد حاصل تھی۔ اس کے باوجود بھارتیوں کو جھنگڑ سے فرار اختیار کرنا پڑا۔ بھارتی پنجاب رجمنٹ کا اتنا نقصان ہوا کہ اس کو دوبارہ تیار کرنے اور کھڑا کرنے میں چھ ماہ لگے۔ بھارتیوں کی چار آرمرڈ کاریں ہمارے ہاتھوں میں آئیں۔ متعدد مارٹر' مشین گنیں چھوٹے خودکار ہتھیار اور سینکڑوں رائفلیں بھی ہمیں حاصل ہوئیں۔ بے شمار بھارتی گاڑیاں ضائع ہوئیں اور کچھ ہمارے ہاتھ لگیں۔ بھارتیوں کے زخمیوں اور مرنے والوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی کہ صرف خان آف منگ کے ''پھندہ'' میں تین سو بھارتی مارے گئے اور ٹھنڈکہ کے کشمیرا خان کی ناکہ بندی میں دوسو بھارتی واصلِ جہنم ہوئے اور مجاہدین نوشہرہ کے گردونواح میں پہنچ گئے۔ اسی دسمبر میں اوڑی اور پونچھ محاذ کے بھارتی نقصانات اور بھارتیوں کی جھنگڑ کی ہزیمت نے بھارتیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ کشمیر کا مقدمہ اقوام متحدہ میں لے گئے کہ اس سے پہلے اکتوبر نومبر 1947ء میں گلگت کی مجاہدین کی فتوحات اور وہاں سے آگے پیش قدمیوں نے بھی بھارت کو مخمصے میں ڈالا ہوا تھا۔

نہرو نے بھارت کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچا لیا

قارئین یہ کشمیر کے جو چند حصے ہمارے پاس ہیں' یہ آسانی سے نہیں حاصل ہوئے تھے۔ اس جھنگڑ کی لڑائی میں ہمارے بھی ایک صد کے قریب مجاہدین شہید ہو گئے اور جنوبی علاقوں کے جہاد کے روح رواں میجر افضل سخت زخمی ہوئے اور چند دن کے بعد شہادت سے سرفراز ہوئے۔ یہ اتنا بڑا نقصان تھا جس کی تلافی نہ ہو سکی اور ان کی شہادت کے بعد کامیابیوں کی بجائے ہم نے بڑے نقصانات اٹھائے۔

کشمیر میں ''زمان'' کے حساب سے ہماری فتوحات کے تانے بانے ملانے کیلئے اوڑی' پونچھ محاذ اور نوشہرہ محاذ پر اکتوبر 1947ء کی فتوحات کے جلد ہی بعد یکم نومبر 1947ء کو میجر حسن خان نے گلگت پر بھی پاکستان کا جھنڈا لہرا دیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے بڑی ڈھٹائی سے جولائی 1947ء میں گلگت جو صوبہ سرحد کے پولیٹیکل حکام کے تحت چترال کے ساتھ انتظامی طور پر وابستہ تھا۔ ان نظاموں کو ختم کر کے پوری گلگت ایجنسی مہاراجہ کشمیر کو دے دی اور حالات اتنے خراب تھے کہ مہاراجہ کے ایک رشتہ دار کرنل بلدیو سنگھ پٹھانیہ نے گلگت کی گورنری لینے سے انکار کر دیا اور مہاراجہ نے بریگیڈئر گھنسارا سنگھ کو گلگت کا گورنر بنایا۔ گلگت سکاؤٹس کی ساری نفری مسلمانوں پر مشتمل تھی اور ایک انگریز میجر براؤن تقریباً آٹھ سو کی اس نفری کا کمانڈر تھا' جس کے دو ونگ تھے۔ ایک ونگ کا کمانڈر ایک انگریز' کیپٹن میتھیسن تھا۔ جو چلاس میں تعین تھا اور گلگت کے ونگ کا کمانڈر کیپٹن محمد سعید تھا' جس کے ماتحت ایک اور مسلمان افسر لیفٹیننٹ غلام حیدر بھی تھا۔ گھنسارا سنگھ کی مدد کیلئے مہاراجہ کی چھٹی جموں کشمیر پلٹن بونجی میں تھی۔ جس کا مسلمان کرنل عبدالمجید' مہاراجہ کا بہت وفادار تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے راز نرالے ہیں۔ میجر حسن خان جو سری نگر میں ایک دوسری پلٹن میں تھا۔ مہاراجہ کو اس سے خطرہ پڑ گیا اور اس کمپنی کو اور میجر حسن خان کو بونجی بھیج بیٹھا۔ بعد میں کرنل عبدالمجید کو بڑے پیغام بھیجے کہ وہ حسن خان کو گرفتار کر لے لیکن پلٹن کا ہیڈ کلرک گلاب دین (بعد میں کیپٹن) بھی حسن خان اور پاکستان کا ہمدرد تھا تو حسن خان نے تمام مسلمان نفری اور سکاؤٹوں کے افسروں وغیرہ سے مل کر اپنی اور پاکستان کی ہمدردی کی پوزیشن کو اتنا مضبوط کر لیا تھا، کہ کرنل عبدالمجید کو اس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔

بہر حال جب 27 اکتوبر کو مہاراجہ نے کشمیر کا الحاق' بھارت سے کر دیا تو حسن خان اور سکاؤٹوں کے سارے افسر اور تمام مسلمان نفری تیار تھی کہ وہ گلگت کا نظام سنبھال لیں اور گھنسارا سنگھ نے جب بونجی سے کرنل عبدالمجید سے ایک سکھ کمپنی کو گلگت منگوانے کے احکام دیئے تو مسلمان افسروں نے اس کو ایسے نہ کرنے دیا اور حسن خان کی کمپنی کو 30 اکتوبر گلگت بھیجا اور سب مسلمانوں نے مل کر گھنسارا سنگھ اور میجر براؤن کو حراست میں لے لیا اور یکم نومبر کو گلگت کی آزادی کا اعلان کر دیا اور حکومت پاکستان سے رابطہ کر کے ایک پولیٹیکل ایجنٹ بھی منگوا لیا کہ گلگت کے انتظام کو سنبھالے۔ بعد میں میجر حسن خان نے کرنل عبدالمجید کو بھی اپنی حراست اور حفاظت میں لے لیا اور چلاس یا استور اور گریز تک تمام علاقوں کے پاکستان میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ البتہ سکردو کی طرف بعد میں مہمات بھیجیں۔

بھارتیوں نے جان بوجھ کر پروپیگنڈا کیا کہ یہ کام میجر براؤن نے کیا ہے کہ وہ لوگ ماؤنٹ بیٹن کے

تعصب پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے اور پاکستان کو انگریزوں کی ''پیداوار'' کہتے ہیں اور یہاں بھی یہ مہم چلائی کہ میجر براؤن نے انگریزوں کی پالیسی کے تحت پاکستان کے ساتھ یہ ''ہمدردی'' کی۔ (توبہ میرے اللہ) اس زمانے میں تو ہماری حکومت نے ساری سچی کہانی جو میری کتاب میں بھی ہے' بیان کر کے بھارتیوں کو خاموش کر دیا اور گلگت کی فتح صحیح طور پر میجر حسن خان اور اس کے ساتھیوں کی محنتوں اور اعمال کے تحت تسلیم کر لی گئی۔ لیکن 1951ء میں جب حسن خان بھی پنڈی سازش کے مقدمہ میں شامل کر لیا گیا تو میجر حسن خان کی ساری خدمات پر لکیر مارنے کیلئے گلگت کا فاتح کبھی صوبیدار میجر بابر کو بنایا جاتا ہے جو وہاں ان دنوں موجود ہی نہیں تھا اور کبھی پھر میجر براؤن کو آگے لایا جاتا ہے اور پچھلے دنوں میں میجر براؤن کی بوڑھی بیوہ اس سلسلہ میں پاکستان سے کچھ ''انعام'' لینے کیلئے آئی ہوئی تھی۔ (توبہ میرے اللہ) میجر حسن خان اسلام کا ایک عظیم فرزند اور پاکستان کا محسن تھا اور اس نے گلگت کی فتح کے بعد جن مشکل حالات میں جہاد میں جو کچھ کیا اور بانڈی پورہ تک پہنچ گیا تھا۔ وہ ذکر اختصار سے آگے آ رہا ہے۔

دسمبر کے وسط تک کشمیر جہاد کے تمام واقعات کے تانے بانے ملانے کے بعد اب کشمیر کے جہاد کے سب سے بڑے ہیرو اکبر خان طارق کے اپنی ''کشتیاں جلانے کے بعد'' پنڈی میں طارق ہیڈ کوارٹر بنانے کی کہانی اور کشمیر کے جہاد کے عملی پہلوؤں اور واقعات کی طرف آتے ہیں اس سلسلہ میں بھی اکبر خان نے میرے ساتھ جنرل سید غواص کے ذریعہ رابطہ باندھا تھا کہ میں اس وقت محکمہ تعلقات عامہ میں تھا اور میں نے فوٹو بھی مہیا کئے اور جو کچھ پوچھ بھیجا۔ وہ سب کچھ بتایا لیکن اکبر خان لوگوں اور جگہوں کے نام بھول چکا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی کتاب کو صرف چند اصولوں تک محدود رکھا' لیکن 1990ء میں جب اس عاجز کو یہ تحقیقی کام سونپا گیا تو محکمہ تعلقات عامہ کی مدد سے اس عاجز کو ضلع جہلم کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر سے اکبر خان کے 19 دسمبر 1947ء کے خط کی کاپی بھی مل گئی جس میں اکبر خان کی ساری تجاویز تھیں' اور صوبہ سرحد سے 11 جنوری 1948ء کا خط بھی مل گیا۔ علاوہ ازیں جن لوگوں کو اکبر خان نے زبانی ہدایات دے کر جو الگ الگ سیکٹر کھولے ان میں سے ہندواڑہ سیکٹر اور بعد میں جھنگڑ کے علاقہ میں بجلی سیکٹر کے کمانڈر کرنل شیر محمد' جنہوں نے کرنل خالد کا نام اپنایا ہوا تھا اور بعد میں راولاکوٹ میں سیکٹر کمانڈر رہے یا گلگت کے علاقہ کے بڑے کمانڈر تھے۔ انہوں نے پورا سال بھر میرے ساتھ اس تحقیق پر کام کیا اور اس عاجز نے جہاد کشمیر میں حصہ لینے والے سینکڑوں مجاہدین' جنرل ملک شیر بہادر' بریگیڈیئر صدیق ستی جنرل سید غواص کرنل محمد اسلم عباسی' ایم سی بریگیڈیئر اکابر حسین' بریگیڈیئر دلاور حسین' میجر محبوب نیازی' بریگیڈیئر اسلم نیازی' میجر سرفراز کرنل محمد اکبر' میجر سلیمان' اپنے رفقاء اور جاننے والوں اور نہ جاننے والے سخی دلیر' کرنل عبدالحق وغیرہ تقریباً تقریباً دو سو صاحبان سے صورت حال' تجاویز اور عملی پہلوؤں کی خوب چھان بین کر کے جو کتاب کیلئے بریف نوٹ تیار کئے' وہ محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر جنرل ریاض اللہ کو دیئے۔ جس خود نے بھی سب کچھ پڑھا' اور ایک کاپی کراچی میں جنرل اکبر خان طارق کو جا کر دکھائی' جس کیلئے میں نے کچھ سوالات بھی بھیجے تھے۔ جنرل اکبر یہ سب کچھ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ آخر کسی نے حق اور سچ تلاش کر لیا ہے اور میرے سوالوں کے جوابات بھی دیئے۔

اکبر خان سب کام کی ایک مختصر تمہید باندھتا ہے کہ بھارت نے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کے دخل کے وقت بڑ ماری تھی کہ وہ دو ہفتہ میں مجاہدین کو کشمیر سے باہر پھینک دے گا۔ اب دو مہینے ہونے کو آئے ہیں۔ بھارت دو

سے زیادہ ڈویژن فوج جس میں توپخانہ انجینئر' بکتر بند فوج سب لوگ شامل ہیں اور ان کو ہوائی فوج کی مدد بھی میسر ہے۔ مہاراجہ کی آٹھ پلٹنیں بھی ان کے پاس ہیں لیکن بنیادی تھوڑی کامیابی کے بعد اب ہر جگہ بھارتیوں کو ہزیمت ہو رہی ہے۔ ان کے مرنے والوں کی تعداد ہزار سے بڑھ گئی ہے۔ متعدد گاڑیاں اور فوجی سامان تباہ کرا بیٹھے ہیں اور ہماری کامیابیاں جاری ہیں جواہر لعل نہرو طعنہ کے طور پر ہمیں ''حملہ آور'' قرار دیتا ہے۔ ہم ضرور حملہ آور ہیں اور ہم نے یہ حملہ مظلوموں کی امداد اور غلاموں کو غلامی سے چھڑانے کیلئے کیا ہے۔ اگر انگریزوں کا رہنما کرام ویل ایک ہاتھ میں انجیل ہونے اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہونے کی بات کر سکتا ہے تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ایک ہاتھ میں قرآن پاک اور دوسرے میں تلوار ہے۔

میں لمبی چوڑی کانفرنسوں میں یقین نہیں رکھتا۔ میں سارے کشمیر کو متعدد سیکٹروں میں بانٹ رہا ہوں۔ سب سے اوپر شمالی سیکٹر ہوگا جو گلگت' سکردو سے آگے پیش قدمی کریں گے اور ان کے لئے میں الگ مختصر ہدایات لکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد نمبر ون یا پہلا سیکٹر ہوگا' جس کے دو حصے ہوں گے۔ ''الف'' ہندواڑہ سیکٹر' جس کے کھولنے کا میں بندوبست کر رہا ہوں اور ''ب'' اوڑی پونچھ سیکٹر' جس کی ہدایات میں زبانی کرنل محمد شریف کو دے آیا ہوں۔ دوسرا سیکٹر پونچھ کا ہوگا۔ جہاں سدھن اور عباسی لشکر پہلے ہی پونچھ کو محاصرہ میں لئے ہوئے ہیں۔ میں ان کے لئے قبائلی مجاہدین بھی بھیجوں گا اور ان کو خاص قسم کی جو مدد کی ضرورت ہے میں اس کا بندوبست بھی کر رہا ہوں۔ تیسرا سیکٹر کوٹلی کا ہوگا' جس کو وسعت دے کر میں راجوری تک بڑھا رہا ہوں اور یہ بڑا اہم سیکٹر ہے جس کیلئے میں کچھ قبائلی مجاہدین بھیج رہا ہوں۔ لیکن کشمیر کو فتح کرنے کیلئے ہمیں یہاں بہت کچھ کرنا ہوگا جو ہدایات میں وقتاً فوقتاً دیتا رہوں گا۔ چوتھا سیکٹر میرپور اور بھمبر ہوگا جو نوشہرہ تک وسعت حاصل کر چکا ہے۔ یہ بھی بہت اہم سیکٹر ہے اور تیسرے اور چوتھے سیکٹروں کی تجاویز کے تانے بانے ایک دوسرے کے ساتھ ملانے ہوں گے کہ چوتھے سیکٹر میں کامیابی تب حاصل ہو سکتی ہے کہ ہم اس سیکٹر کو ''مشرق'' تک پاکستان کی سرحدوں میں بڑھائیں کہ یہاں ہم پر جو ''پابندیاں'' لگی ہوئی ہیں ان کو آہستہ آہستہ مکمل طور پر ختم کرنا ہوگا۔

اب ان عملی تجاویز کیلئے ساتھ ہی اکبر خاں' پشاور کوہاٹ' بنوں ڈیرہ اسماعیل خان' ڈیرہ غازی خان' ملتان' ماڑی' انڈس' میانوالی' دریا خاں' پاکپتن' سلیمانکی' پھلروان' سرگودھا' بھلوال اور جھنگ وغیرہ میں مجاہدین کے اجتماع یا تربیتی اداروں کی تجویز بھی بھیجی۔ جہاں ہر کیمپ میں مجاہدین کی تعداد ان کی رہائش اور خوراک کے بندوبست کیلئے تجاویز تھیں اور آگے کشمیر میں ان مجاہدین کیلئے ایڈوانس کیمپ ایبٹ آباد' راولپنڈی' جہلم' گجرات' سیالکوٹ' نارووال اور شکر گڑھ میں بنانے کی ساری تفصیل تھی کہ راولپنڈی' جہلم اور گجرات کے بڑے بنیادی کیمپوں کیلئے اور تفصیلی ہدایات تھیں کہ ہر جگہ کیمپ کمانڈر اور ان کے بندوبستی عملے کی تفصیل تھی اور اس طرح اکبر خان نے پورے ملک کو ایک فوجی قلعہ میں تبدیل کر دیا۔

ساتھ ہی ہر محاذ پر کام کرنے والے افسروں کو اکبر خان نے الگ الگ اور بعض دفعہ اکٹھے طور پر بلا کر جو ہدایات دیں۔ وہ تفصیل یہاں بیان نہیں ہو سکتی۔ قارئین کی دلچسپی کیلئے کرنل محمد اسلم عباسی ایم سی کی زبانی بارہ رضاکار افسروں کی بریفنگ کی ایک کہانی دی جاتی ہے کہ دسمبر 1947ء میں ایک کورس کے بہانے ان کو راولپنڈی

جی ایچ کیو میں بلایا گیا اور وہاں ان کی ملاقات ایک کرنل اکبر خان سے کرائی گئی' جن کو طارق صاحب کہا جاتا تھا تو طارق صاحب نے کہا کہ کورس وغیرہ کوئی نہیں۔ ان کا ریکارڈ دیکھ کر ان کو کشمیر کے جہاد میں شرکت کیلئے بلایا گیا ہے اور صورت حال واضح کی جائے گی۔ اس کے بعد جو آدمی اس جہاد میں شریک نہ ہونا چاہے وہ خوشی سے اپنی یونٹ میں واپس چلا جائے۔ اس کے ساتھ کوئی ناراضگی نہ ہو گی اور کچھ ''مجبوریاں'' ہیں کہ تم لوگوں کو فوج سے ''بھگوڑا'' قرار دیا جائے گا۔ اگر تم میں سے کوئی بھارت کی قید میں چلا گیا تو پاکستانی فوج اس کا ذمہ نہ قبول کرے گی۔ سوم شہید ہو جانے کی صورت میں ہوسکتا ہے کہ لواحقین کو پنشن بھی نہ ملے۔ البتہ تنخواہ ملتی رہے گی۔ چہارم اسلحہ اور بارود ضرور مہیا کیا جائے گا لیکن پوری یقین دہانی نہیں ہوسکتی۔ پنجم رسد و رسانی کا کام بھی خود کرنا ہوگا۔ البتہ آزاد کشمیر ہیڈ کوارٹر کو اس سلسلہ میں کچھ منظم کیا جائے گا اتنی عجیب وغریب صورت حال کے باوجود سب افسر جہاد پر تیار ہو گئے اور پھر ہر افسر کو الگ الگ کرنل اکبر خان نے اس کی ذمہ داری سمجھائی اور کرنل محمد اسلم جو اس زمانے میں میجر تھے۔ ان کو ریکارڈ والوں نے کیپٹن بنا دیا اور جو چھ ماہ انہوں نے اس جہاد پر گزارے تو کیپٹن کی تنخواہ ملی۔

قارئین ان مجبوریوں کے ہونے کے باوجود جہاد جاری رہا اور ہر سیکٹر کی جنگ کی کچھ مزید تفصیل سے پہلے یہ عاجز گزارش کرے گا کہ لندن اور دہلی دونوں جگہوں پر بھونچال آیا ہوا تھا اور شاید ہمارے انگریز افسروں کو کچھ ''بھنک'' لگ گئی کہ ان کو ''حکم'' مل گیا کہ وہ اپنے طور پاکستان کے ''ہمدرد'' بن کر اس جہاد کو کچھ ''کنٹرول'' کر کے اپنی مرضی سے چلائیں لیکن قائداعظم کو جنرل میسروی تو ہرگز قبول نہ تھا اور اس نے پھر جنرل ٹکر کا نام دیا لیکن جنرل گریسی نے ''مٹی کا مادھو'' بننے کا ڈرامہ کر کے اپنی ''خدمات پیش'' کر دیں کہ وہ حکومت پاکستان کا ہر حکم مانے گا تو قائد اعظم نے مجبوراً اس کو قبول کیا۔

لیکن قارئین! یہ کچھ فروری 1948ء کے پہلے ہفتے میں ہوسکا کہ اکبر خان نے کچھ مزید کارروائیاں کر لیں تھیں اور فروری 1948ء کے بعد پھر ہمارے جہاد میں ان انگریزوں نے بے حساب روڑے اٹکائے اور فوج کا بڑا غلط استعمال کرایا لیکن مجبوری یہ تھی کہ اکبر خان بھی اس حقیقت کو سمجھتا تھا کہ اب وقت آ گیا تھا کہ مجاہدین کی کامیابیوں کو پکی فوج سہارا دے یا کچھ امداد بھی دے کہ بھارتی فوج کے ساتھ مجاہدین سیدھی لڑائی نہ لڑ سکتے تھے اور ہماری فوج انگریزوں کے ماتحت تھی۔ بھارت والے بہت پریشان ہو رہے تھے تو ان کو ماؤنٹ بیٹن نے مشورہ دیا کہ وہ کشمیر کا مقدمہ اقوام متحدہ میں لے جائیں، تا کہ پاکستان کے انگریز نوکروں کی مدد سے وہ پاکستان کے مجاہدین پر کچھ ''کنٹرول'' کرا سکے گا اور قارئین یہ بہت بڑی سازش تھی کہ اس سے نہ صرف لیاقت علی حکومت نے جہاد کو ''ٹھنڈا'' کرنے کے احکام دے دیئے بلکہ ظفر اللہ کو ہمارا وزیر خارجہ بنا کر ہماری وزارت خارجہ کو قادیانیوں اور بے دین آدمیوں سے بھر دیا گیا کہ ہمارے ملک میں اقوام متحدہ میں ظفر اللہ کی کارکردگی کو ایک سازش کے طور پر اس طرح کامیاب اور بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا تھا کہ ہماری بھولی قوم نے ظفر اللہ کو اپنا ''محسن'' سمجھنا شروع کر دیا۔ (توبہ میرے اللہ)

ظفر اللہ خاں نے پاکستانی سفارت خانوں کو مرزائیت کے اڈے بنا دیا

آج کل واجپائی حکومت یا کئی ہندو جو کہتے رہتے ہیں کہ جواہر لعل نہرو نے کشمیر کا مقدمہ اقوام متحدہ میں

لے جانے کی بڑی غلطی کی۔ افسوس ہماری قوم میں کوئی رہنما موجود نہیں جو بھارتیوں کو بتائے کہ نہرو نے تو بھارتیوں کو کشمیر کا جواتنے عرصہ سے ''مالک'' بنا دیا یا اس وقت بھارت کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچالیا۔

ہم ان دنوں میں جہاد کے ذریعہ سے کشمیر ہندوؤں سے چھین کر پاکستان کا حصّہ بنانے والے تھے اور ایسا کرنے سے پاکستانی قوم کے اندر صحیح اسلامی قوت خود بخود جنم لیتی تو ہندوؤں کے افسانوی عقائداور یہ ذات پات سے برہمن قوم کی بھارت میں حکومت پر براجمان رہنااور سارے معاملات ختم ہو جاتے کہ بھارت کے مغرب اور مشرق میں جس دن صحیح قسم کا اسلام نافذ ہو جائے گا۔اس کے بعد بھارت کے کفر سے پاک ہونے میں کوئی دیر نہ لگے گی۔ انگریزوں اور نہرو کے کشمیر کے مقدمہ کو اقوام متحدہ میں لے جانے سے جو لیاقت علی نے جہاد میں ''ٹھہراؤ'' پیدا کرا دیا تو اس وقت بھی قائداعظم کو چھوڑ کر ہماری باقی قیادت مومن کی فراست سے عاری تھی اور ان کے سر بھی یہ سہرے نہ بندھنے تھے تو ان مضامین میں زیادہ وہی نکات سامنے لائے جائیں گئے کہ انگریزوں اور بھارتیوں کی جو''متحدہ اقتدار'' یا اقدار''مشترک'' تھے، ان کو وہ حاصل کرنے میں اس لیے کامیاب ہو جاتے ہیں کہ ہم مومن کی فراست سے عاری ہیں اور وہ لوگ ہمیں خوب بے وقوف بنا کر اپنے مقاصد حاصل کر لیتے ہیں۔

یہ آج کی بات نہیں ۔ اس عاجز کو کئی باتیں ان زمانوں میں ہی سمجھ آ جاتی تھیں کہ ہماری حکومت غلط عمل کر رہی ہے تو تب کی اپنی قومی کوتاہیاں قوم کے سامنے اب پیش کر رہا ہوں کہ بھارت والوں نے چانکیا والی چالاکی سے اپنا مقدمہ اقوام متحدہ کے سامنے پیش کیا کہ بیانات میں کشمیر کا تو پہلے کئی فقروں میں ذکر ہی نہ کیا اور تمہید یہ باندھی کہ پاکستان سے حملہ آور بھارت کے اندر داخل ہو رہے ہیں تو بھارت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ بھارت اس جارحانہ کارروائی کو روکنے کیلئے ان حملہ آوروں کے ان مستقروں پر حملہ کرے جو پاکستان میں ہیں اور اس طرح دونوں ملکوں میں ٹکراؤ ہو سکتا ہے' تو اقوام متحدہ پاکستان کو مجبور کرے کہ وہ لوگ ان حملہ آوروں کو کشمیر میں داخلے سے منع کرے یا اپنی زمین ان کو نہ استعمال کرنے دے۔

اس عاجز نے بھارتی مقدمہ کا اختصار پیش کر دیا ہے کہ کشمیر کا نام آخر میں لے کر' مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کا مسئلہ نہ بننے دینے کی ایک بڑی ہی مکارانہ اور عیارانہ کوشش تھی جس پر بھارت والے آج بھی قائم ہیں اور آج بھی اسی قسم کا یا اس سے ملا جلا ''راگ'' الاپتے رہتے ہیں اور اس مقدمہ میں شروع میں بھارت والوں نے جان بوجھ کر پاکستان کو''جارح'' نہ قرار دیا۔ یہ ''ڈفلی' بھارت نے بعد میں رائے شماری سے بچنے کیلئے بجانا شروع کی۔ ہمارا جوابی دعویٰ بڑا بھونڈا تھا اور اور ہم نے اس سلسلہ میں تین الگ الگ مسودے پیش کئے۔ اوّل بڑی جہالت سے ہم نے تسلیم کیا کہ'ہم نے قبائلی مجاہدین کی کشمیر میں داخلے کی حوصلہ شکنی کی تھی اور اب بھی کرتے رہیں گے۔ یعنی ہم نے یہ بھی ''تسلیم'' کر لیا کہ قبائلی مجاہدین پاکستان کے ماتحت نہیں اور ہمارے ملک کی زمین کو بھی وہ زبردستی استعمال کر لیتے ہیں۔ دوم بھارت نے اپنے ملک میں مسلمانوں کیلئے جینا حرام کیا ہوا ہے اور بیچ میں خواہ مخواہ جونا گڑھ کا معاملہ لے آئے کہ بھارت نے ان لوگوں کے پاکستان کے ساتھ الحاق کو تسلیم نہیں کیا اور وہاں اپنی فوج داخل کر دی ہے۔ اگر یہ بات کہنی بھی تھی' تو کہتے کہ ہم نے بھی کشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق تسلیم نہیں کیا اور اقوام متحدہ بھارت کی فوجوں سے کشمیر کو خالی کرا لے ورنہ ہم بھی بھارت کے باقی علاقوں میں اپنی مرضی کے وقت داخل

ہو کر بھارتی فوج کی جارحیت اور غاصب ہونے میں خلل ڈالیں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہہ دیا کہ بھارت ہمارے حصے کا فوجی سامان ہمیں نہیں دے رہا' وہ سامان ہمیں دلایا جائے اور بھارت اور ہمارے درمیان کئی معاملات حل طلب ہیں۔ ان کا فیصلہ کر دیا جائے۔

بات بڑی سیدھی تھی' کہ پاکستان اپنا جوابی دعویٰ یہ پیش کرتا کہ ہم نے تو پہلے ہی دونوں ملکوں کے لئے حد بندی کیلئے اقوام متحدہ کے کمیشن کیلئے درخواست دی تھی۔ انگریزوں نے ہمارے ساتھ بے ایمانی کر کے (مصلحت کیلئے صرف ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف کے نام لیتے) مسلمان اکثریت کے ضلع امرتسر اور گورداسپور کے علاقے بھارت کو دے دیئے کہ سازش یہ معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان اکثریت والی ریاست کشمیر پر بھی غاصبانہ طور پر بھارت قبضہ کر لے۔ ہم یہ کچھ کبھی تسلیم نہ کریں گے اور ہم نے اپنے انگریز نوکروں کو حکم دیا تھا کہ پٹھانکوٹ' جموں روڈ کی ناکہ بندی کریں' لیکن انہوں نے ماؤنٹ بیٹن اور فیلڈ مارشل آرکنلیک کو بیچ لا کر ہمیں فوجی کارروائی سے روک دیا اور پھر ماؤنٹ بیٹن ہمارے ساتھ آ کر فیصلہ کر گیا تھا کہ بھارت اور پاکستان دونوں کی فوجیں یا ہتھیار بند دستے کشمیر کو خالی کر دیں گے اور وہاں پر دونوں ملک مل کر رائے شماری کرائیں گے۔ اس معاملہ کو نومبر کے مہینہ میں التوا میں ڈال دیا گیا اور ہم اقوام متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹانے کو تیار ہو رہے تھے تو بھارت نے نہایت عیاری سے مقدمہ غلط طور پر پیش کر کے مسئلہ کشمیر کو ثانوی حیثیت دینے کی کوشش کی ہے۔ اصلی مسئلہ اکثریت مسلمان آبادی کا ہے۔ اقوام متحدہ اپنی فوجیں بھیج کر کشمیر کا کنٹرول سنبھالے اور وہاں رائے شماری کرائی جائے اور غلط حد بندی کو بھی صحیح کیا جائے وغیرہ

لیکن غلط طور پر مقدمہ پیش کرنے میں کئی مقاصد تھے کہ فضول بحث مباحثہ میں ظفر اللہ سے کئی گھنٹے تقریریں کرا کے ظفر اللہ کے نام کو اونچا کرنا تھا کہ ہم نے ظفر اللہ کو وزیر خارجہ بنا دیا اور اس نے غیر ملکوں میں ہمارے سفارت خانوں کو قادیانیوں اور بے دین لوگوں سے بھر دیا کہ کرنل سلطان علی شاہ اپنی کتاب ''شامتِ اعمال ما'' میں کہتا ہے کہ 1958ء میں جب وہ لندن گیا' تو ہائی کمیشن کا تمام مسلمان عملہ جمعہ والے دن اپنی مسجد میں انتظار کر رہا ہوتا تھا کہ قادیانی مسجد سے ایک قادیانی آ کر ان کو جمعہ کی نماز پڑھاتا تھا۔ ہماری وزارت خارجہ جس طرح ملکی معاملات میں داخل اندازی کرتی رہی۔ یہ ہماری تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ جس کے کچھ پہلوؤں کا ذکر یہ عاجز اپنے ستمبر 65 کی جنگ کے سلسلہ میں مضامین میں کر چکا ہے کہ کس طرح وزارت خارجہ نے ہمیں لاہور محاذ پر بروقت فوج بھیجنے سے روکے رکھا۔ کن لوگوں کو پاکستان کی نمائندگی کرنا چاہیئے اور ہماری وزارت خارجہ کی کیا پالیسی ہو۔ اس سلسلہ میں یہ عاجز 1990ء کے ایک سیمینار میں آغا شاہی کو کھری کھری سنا چکا ہے کہ ان لوگوں نے ہمیں غرق کر دیا اور ''مصالحانہ'' پالیسی کے تحت ہم سے کافرانہ اعمال کرائے جاتے ہیں لیکن اس وسیع مضمون پر قلم اٹھانے سے پہلے ہمیں پھر اس بنیادی پہلو کو سمجھنا ہو گا کہ ہم کون ہیں؟ اور ہمارے پیدا کرنے میں رب کی ذات پاک کے مقاصد کیا تھے۔ جب یہ بحث کسی حتمی اختتام پر پہنچے گی تو خارجہ پالیسی پر بھی کچھ مضامین لکھے جا سکیں گے۔

بہر حال یہاں ہمارے غلط ''جوابی دعوے'' کے سلسلہ میں اضافہ کریں گے کہ ہم نے فضول بحث میں پڑ کر خود بخود کشمیر کے مسئلہ کو الجھانے میں اور لمبا کرنے میں بھارتیوں کی مدد کی۔ بجائے اس کے' کہ ہم اقوام متحدہ

میں معاملات صرف کشمیر اور مسلمان اکثریت یا اقوام متحدہ کے تحت رائے شماری تک محدود رکھتے ہم نے بھارت کی ''ضرورت'' پوری کی اور یہ دعویٰ پیش کیا کہ اقوام متحدہ ایک کمیشن مقرر کرے' جو دونوں ملکوں کے ''الزامات'' کی چھان بین کرے اور اس کے بعد جنگ بند ہو۔ طرفین کی فوجیں باہر نکلیں اور پھر رائے شماری ہو۔ یہ معاملات کو ''گڈ مڈ'' ہم سے کرایا جا رہا ہے کہ آج کل بھی بھارت کہتا ہے پاکستان اور بھارت کے ''معاملات'' اور ان ''معاملات'' میں کشمیر کو بھی کبھی کبھی ثانوی حیثیت دے دی جاتی ہے۔

فروری 1948ء میں بھارت کے گھاگ نمائندہ گوپال سوامی نے اقوام متحدہ میں اس بحث کو التوا میں ڈالنے کی گزارش کی کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی حکومت سے ''مشورہ'' کرنے دہلی جانا چاہتا ہے تو ہمارے اخبار نویسوں سے ''سرخیاں'' لگوائی گئیں کہ بھارتی نمائندہ ظفر اللہ خان کے سامنے سے بھاگ گیا ہے۔ بھارتی نمائندہ واپس اقوام متحدہ میں گیا تو بڑی ڈھٹائی سے اقوام متحدہ پر ''احسان'' جتا کر کمیشن مقرر کرنے کی تجویز کو کچھ مانا اور ہماری ناسمجھ قوم کو خوش کرنے کیلئے برطانیہ کے نمائندے مسٹر فلپ نیول بیکر نے اقوام متحدہ میں کہہ دیا کہ کشمیر کا مسئلہ بھارت اور پاکستان کے درمیان حل طلب ہے (سیکورٹی کونسل ریکارڈ نمبر 243 آف 1948) اور اس کا حل اقوام متحدہ کے تحت رائے شماری ہے اور بھارتی فوج کو وہاں سے نکلنا ہوگا وغیرہ۔'' بس پھر کیا تھا ظفر اللہ کی کامیابی پر قوم نے وہ ڈونگرے بجائے جیسے کشمیر ہمیں مل گیا اور ہم نے انگریزوں کو اپنا محسن سمجھنا شروع کر دیا۔ جواہر لعل نہرو نے برطانیہ سے کچھ ناراضگی کا بھی اظہار کیا لیکن جلد خاموشی ہوگئی کہ معلوم ہے برطانیہ نے ''حیلہ فرنگی'' کے طور نہرو کو سمجھا لیا ہوگا کہ یہ صرف کہنے والی باتیں ہیں اور نتیجہ ہماری قوم کے سامنے ہے کہ برطانیہ نے اس سلسلہ میں دھیلے کا عملی کام نہ کیا۔

اقوام متحدہ نے مارچ 1948ء میں میٹنگ نمبر 230 کے تحت تین ممبروں کا ایک کمیشن بنایا اور پھر ان کی تعداد پانچ کر دی' جو برصغیر میں چار ماہ بعد جولائی 1948ء میں پہنچے۔ بھارت نے جس عیاری سے اپنے مطالبات پیش کئے تو اس پر تبصرہ کر کے اپنا سر پیٹنا پڑتا ہے کہ وہ ایک ہی بات جانتے ہیں ''کہ پرنالہ کا رخ ادھر ہوگا'' اور ہمارے غیر ملکی مشیر ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ ہم مصلحت سے کام لیں کہ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ ہم اقوام متحدہ والوں کے سامنے بھارتیوں کی گندی ذہنیت بھی پوری طرح واضح نہیں کرتے۔ بہرحال نتیجہ قوم کے سامنے ہے کہ 5 جنوری 1949ء کی اقوام متحدہ کی ریزولیوشن ایک مہمل دستاویز ہے۔ جس میں عمل کیلئے کوئی حکم نہیں بلکہ یہ مہمل سفارشات ہیں نہ مسئلہ کو حل کرنے کی میعاد مقرر ہوئی کہ اس ریزولیوشن کے تحت بھارت کو رائے شماری پر مجبور نہ کیا جا سکا کہ آج تک معاملات لٹکے ہوئے ہیں کہ اب تو بھارت نے اس قرارداد کو بھی رد کر دیا ہے اور اقوام متحدہ کے مبصروں کو بھی مراعات دینا بند کر دی ہیں۔ بھارت جو کشمیریوں پر ظلم ڈھا رہا ہے۔ ہماری حکومتیں اور خاص کر وزارت خارجہ اس سلسلہ میں دنیا میں ہل چل مچا سکتے ہیں لیکن افسوس کہ ہم نے نہ فرد کے طور پر خود کو پہچاننے کی کوشش کی اور نہ قوم کے طور پر اپنی طاقت کو سمجھ سکے اور کشمیر میں ہمارے مجاہدین کو چور' ڈاکو کیا کچھ نہ کہا گیا۔ بلکہ آج کل تو ان کو ''دہشت گرد'' کہا جاتا ہے کہ کمزور کی امداد کرنے والے بھی باطل نظریات والی دنیا کی حکومتوں کے سامنے دہشت گردی کے زمرہ میں آتے ہیں۔

اس صورت حال کی کیا وجوہات ہیں کہ ہم نے سارے اعمال غلط طریقے سے کئے اور اگر کسی نے سچ اور حق بات کی تو اس کو ہم نے وقعت نہ دی۔ تحریک پاکستان کے وقت صوبہ سندھ کے صف اول کے لیڈروں میں ایک صاحب ہاشم گزدر ہوتے تھے جو صوبہ سندھ مسلم لیگ کے نائب صدر بھی تھے۔ ان زمانوں میں بہت کم پاکستانی امریکہ جا سکتے تھے۔ ہاشم گزدر امریکہ گئے تو ان کو ظفر اللہ کے بارے میں اس کی ''غداریوں'' کی خبریں ملیں تو ہاشم گزدر نے واپس پاکستان آ کر وزیراعظم لیاقت علی اور ان کی حکومت کے ہر اہم آدمی تک سب باتیں پہنچانے کی کوشش کی لیکن سب نے سنی ان سنی کر دی تو 2 جون 1948ء میں مسلم پارٹیز کنونشن میں ان کی ایک تقریر کے کچھ اقتباسات جو 3 جون کو کراچی کے کچھ اخباروں میں شائع ہوئے تھے' ان کا خلاصہ یہ تھا:

''جن دنوں مسٹر ظفر اللہ کشمیر کا مقدمہ پیش کرنے کیلئے لیک سیکسیس گئے تھے' میں بھی وہاں تھا وہاں لابی میں مشہور تھا کہ ظفر اللہ وہی کچھ کرتا ہے جو بھارت چاہتا ہے۔ میں نے تمام باتوں سے حکومت پاکستان کے کرتا دھرتاؤں کو مطلع کیا۔ اس کے بعد میں کئی اور ملکوں میں گیا تو دیکھا کہ ہمارے سفارت خانے مرزائیت کی تبلیغ کے اڈے بنے ہوئے ہیں۔ ظفر اللہ کے انگریزوں اور ہندوؤں کے ساتھ گہرے مراسم ہیں اور ظفر اللہ پاکستان کی نسبت اپنے امام بشیر کا زیادہ وفادار ہے اور میرے کئی جاننے والے محض دنیاوی فوائد حاصل کرنے کیلئے قادیانی ہو گئے ہیں اور ایسے لوگوں میں سے ستر فیصدی ہمارے ملک کی کلیدی اسامیوں پر فائز ہیں۔

جون' جولائی 1948ء میں متحدہ ہندوستان کی مسلم لیگ کے مایہ ناز لیڈر راجہ آف محمود آباد نے زیارت میں قائداعظم کے ساتھ ملاقات کی تھی تو قائداعظم نے جو باتیں راجہ محمود آباد صاحب سے کیں وہ پردہ میں رہیں کہ قائداعظم کو ہماری پوری قوم نے بہت مایوس کیا تھا اور وہ بڑے نالاں تھے لیکن راجہ صاحب جب 64-1963ء میں دوبارہ پاکستان آئے تو انہوں نے کئی انکشافات کئے کہ قائداعظم نے جو لیاقت علی کے ساتھ آخری ملاقات کی' اس میں قائداعظم نے زیادہ تر کشمیر اور ظفر اللہ کے رویہ پر بات کی ہو گی کہ قائد نے راجہ صاحب کو بتایا تھا کہ انہوں نے لیاقت علی کو بلا بھیجا ہے کہ کراچی کی اخباروں میں جو کچھ ہاشم گزدر کی وساطت سے شائع ہوا تھا' قائداعظم نے اس کی چھان بین کر لی تھی۔ اس سلسلہ میں راجہ محمود آباد پر بڑے سوالات ہوئے لیکن وہ بڑے مخلص اور سچے انسان تھے۔ وہ کوئی مفروضہ سننے کو تیار نہ تھے اور نہ کوئی مبالغہ والا بیان دیتے۔

اب ہمارے پاس کسی سرکاری ذریعہ سے یا پکے طور پر قائداعظم اور لیاقت علی کی ملاقات کے بارے کوئی خبر نہیں کہ کیا باتیں ہوئیں۔ سوائے اس کے کہ مس فاطمہ جناح نے ''بے بس'' قائداعظم کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے اور بعد کے کئی اخباروں میں کئی ''مفروضے'' شائع ہوئے کہ لیاقت علی خان نے قائداعظمؒ کو یہ ''باور'' کرا دیا تھا کہ حکومت پر لیاقت کا پکا کنٹرول ہے۔ قائداعظم کے اچانک کراچی آنے اور وفات کے سلسلہ میں بھی اخباروں میں کئی ''مفروضے'' شائع ہو چکے ہیں کہ قائد لیاقت حکومت کو ڈسمس کرنے کیلئے آئے اور یہ کہ قائداعظم کی موت بھی طبعی نہیں تھی اور فاطمہ جناح کو ہدایت اللہ غلام حسین کے ذریعہ سے چپ کرایا گیا۔ ہم کسی مفروضے پر اپنا جائزہ نہ پیش کریں گے۔ قوم کی توجہ صرف قائداعظم کی وفات کے بعد کے تین واقعات کی طرف دلائیں گے کہ ان تینوں واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائداعظم' قادیانیوں کی سازش کو سمجھ گئے تھے اور قادیانیوں کی سازش بہت گہری ہے۔

اوّل ظفر اللہ نے جان بوجھ کر قائداعظم کے جنازہ سے الگ کھڑے ہو کر قائداعظم کے ساتھ اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ یعنی وہ ''خاموشی'' یا ''مصلحت'' بھی کر سکتا تھا کہ لائن میں کھڑا رہتا اور جنازہ کی دعائیں نہ پڑھتا اور وہ اتنا مذہب کا پابند نہ تھا کہ راقم از خود نے اس کو ہم مسلمانوں کے ساتھ عید کی نماز پڑھتے ایک سے زیادہ دفعہ دیکھا اور ویسے مجھے ذاتی طور پر اُس کے کردار کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔ کہ ظفر اللہ ہرگز باعمل اور پاکباز نہ تھا۔ پھر ظفر اللہ نے قائداعظم کے جنازہ سے الگ رہنے کے بارے میں اپنے بیان کو ذو معنی بنوا کر خوب اچھالا کہ مجھے کافر حکومت کا مسلمان وزیر کہہ لو یا مسلمان حکومت کا کافر وزیر' یہ ہمارے منہ پر تھپڑ تھا کہ ہم لوگ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

1953ء میں جب اینٹی قادیانی تحریک شروع ہوئی اور علماء نے ظفر اللہ کو وزارت خارجہ سے ہٹانے کا مطالبہ کیا تو ظفر اللہ نے کہا کہ اگر اس کو وزارت سے ہٹایا گیا تو وہ ایک دن بھی پاکستان نہ ٹھہرے گا اور 1954ء تک وہ محمد علی بوگرہ کی حکومت میں بھی ہمارا وزیر خارجہ تھا اور پھر جا کر بین الاقوامی عدالہ، کا جج بن گیا۔

دوم۔ قائداعظم کی وفات کے تیسرے دن یعنی 14 ستمبر 1948ء کو لیاقت علی کی شہ پر اور پنجاب کے انگریز گورنر سر مودی کی سفارش پر پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ سے پوچھے بغیر صوبہ پنجاب کے ریونیو اور مال کے وزیر ممتاز دولتانہ نے ڈگیاں (ربوہ) گاؤں کے 1033 ایکڑ سات کنال' آٹھ مرلے زمین ایک آنہ فی مرلہ کے حساب سے -/10339 روپوں پر قادیانیوں کو فروخت کر دی۔ انتقال کے کاغذات تیار تھے۔ صرف قائداعظم کی وفات کا ''انتظار'' تھا۔

سوم۔ بھارتی افواج بھی ریاست حیدر آباد کے گرد تیار کھڑی تھیں۔ انہوں نے بھی 14 ستمبر 1948ء کو حیدر آباد پر حملہ کر دیا کہ قائداعظم کی وفات کا انتظار تھا۔ قائداعظم کو کشمیر کے بارے میں کس طرح ''دھوکے'' میں رکھا گیا کہ پہلے بریگیڈئر شیر خان کو بھیج کر (جو خبر اخباروں میں نہ شائع ہوئی تھی) قائداعظم کو کشمیر میں پاکستانی افواج کے داخلے کی پوری تجویز بتائی گئی تھی۔ یہ تجویز لیاقت حکومت نے کس طرح ''کینسل'' کی۔ یہ عاجز اس کو جہاد کشمیر کے زمان و مکان کے پیش رفت میں بیان کرے گا۔

البتہ بھارت کے مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ میں لے جانے اور اقوام متحدہ سے غلط امیدیں وابستہ کر کے ہم نے جہاد کشمیر کو کیا کیا نقصانات پہنچائے اور جو کامیابیاں حاصل کر لیں ان کو کیسے ناکامیوں میں تبدیل کیا' یہ عاجز بہت اختصار سے ہر محاذ کی کہانی کو زمان کے لحاظ سے پیش رفت دے کر جہاد کشمیر کو جمود دینے کے وقت تک اس سلسلہ مضامین جاری رکھے گا۔

ہم نے جہاد کی باگ ڈور ''انگریز نوکروں'' کے ہاتھ میں تھما دی تھی

سب سے پہلے شمالی محاذ کا ذکر کریں گے کہ گلگت سے بونجی اور استور کے علاقوں پر تو میجر حسن خان اسلامی جھنڈے لہرا چکا تھا اور میجر حسن خان نے کیپٹن نیک عالم کی طرف سکردو میں ایلچی بھیجا کہ وہ بھی سکردو پر اسلامی جھنڈے لہرا دے لیکن وہ ڈر گیا تو بھارتیوں نے لداخ کے مقام سے کرنل تھاپا کو بھیج کر اور کارگل سے کیپٹن پربھات سنگھ وغیرہ کو بھیج کر سکردو کو دفاع کو تساری تک مضبوط کر دیا۔ میجر حسن نے حکومت پاکستان سے ہتھیاروں

اور مجاہدین کی مدد مانگی کہ ساتھ ہی ان شمالی علاقوں کی مزید فتوحات کی تجویز کا ایک ''خاکہ'' بھی بھیجا' جس کو منظور کرتے۔ طارق ہیڈ کوارٹر سے اکبر خان نے میجر محمد اسلم کے ماتحت دسمبر 1947ء کے تیسرے ہفتہ میں کچھ مجاہدین اور سازوسامان' گلگت بھیجا اور شمالی علاقوں کی فوجی کمانڈ بھی میجر اسلم کے سپرد کر دی جو ریاستی فوج میں حسن خان سے سینئر تھا اور اوڑی محاذ پر اکبر خان کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ یہ صاحب ہماری فوج سے بعد میں بریگیڈئر کے طور پر ریٹائر ہوئے اور ائر مارشل اصغر خان کے بڑے بھائی تھے۔ ان کو خاص ہدایات دی گئیں کہ ہر طرح سے حسن خان کی سوچ' جذبہ اور اعمال سے فائدہ اٹھائیں لیکن میجر اسلم کو حسن خان کے مقابلہ میں اپنی ''کمتری'' کا احساس بری طرح ''شرمندہ'' کرتا رہتا تھا کہ آزادی سے پہلے بھی حسن خان نے مہاراجہ سے چھٹکارے کیلئے جب ریاست کی فوج کے مسلمان افسران کے اجتماع کئے تو میجر اسلم نے مخالفت کی اور بعض دفعہ کچھ ''شکایات'' مہاراجہ تک بھی پہنچا دی تھیں کہ مہاراجہ کشمیر حسن خان کی گرفتاری کی بھی کوشش کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ دونوں میں اس چپقلش کی وجہ سے وہ کچھ تو نہ حاصل کیا جا سکا جو حسن خان چاہتا تھا لیکن جو کچھ حاصل کیا وہ ہمارے جہاد کا سنہری باب ہے اور سخت سردی میں نقطہ انجماد سے کئی ڈگری نیچے' سطح سمندر سے دس بارہ ہزار بلند علاقوں سے گزر کے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ نتیجتاً ان علاقوں کے زیادہ لوگ آزادی میں سانس لے رہے ہیں۔

اس کارخیر کی انجام دہی کیلئے گلگت سے دوہری کالمیں نکالی گئیں کہ سب سے پہلے 29 جنوری 1948ء کو میجر احسان علی کے ماتحت دو اڑھائی سو مجاہدین کو سکردو کو آزاد کرانے کیلئے بھیجا گیا جو گلگت سے 150 میل دور ہے۔ بونجی تک علاقے آزاد ہو چکے تھے۔ حرموش سے کچھ مزدور ساتھ لئے اور رونڈو کے مسلمان راجہ نے بھی تین سو مجاہدین دیئے جن کے پاس مزل کی طرف سے بارود لوڈ کرنے والی رائفلیں تھیں اور تیزی سے میجر احسان نے پیش قدمی کر کے سکردو کے آگے تساری وغیرہ کے علاقوں میں تو ڈوگرہ فوج کو تہس نہس کر دیا اور نائک بشیر احمد کی مدد سے کیپٹن نیک عالم اور مسلمان فوجیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا لیکن کرنل تھاپا سکردو کے قلعہ میں بند ہو گیا اور محاصرین کے پاس نہ محاصرہ توڑنے کے ہتھیار تھے اور نہ کوئی توپ تھی اور ایک آدھ مارٹر جو پاس تھی اس کا بھی محدود ایمونیشن پاس تھا۔ سکردو پر قبضہ کرنے کے لئے 10 فروری سے 6 مارچ 1948ء تک جو لڑائیاں ہوئیں یا جو حملے کئے گئے ان میں ہمارے ایک ایک مجاہد کی کارکردگی پر اس عاجز نے اپنی کتاب میں ساری تفصیل لکھی ہے کہ عسکری تاریخ میں یہ لڑائیاں انیسویں صدی کی جنگوں کی متشابہ تھیں کہ گولہ بارود اور ہتھیار بہت پرانے تھے اور میجر محمد خان جرال' کیپٹن بابر ایک ایک کمانڈر کو خراج تحسین پیش کرنے کے ہمارے پاس الفاظ موجود نہیں لیکن بھارتی اپنا دفاع آسانی سے کر رہے تھے۔ ہوائی جہاز ان کیلئے سامان گرا جاتے تھے اور ہم کوئی رکاوٹ نہ پیدا کر سکتے تھے اور ہمارے مجاہدین وہاں ''بندھ'' گئے کہ اگست 1948ء کو چترال سے ایک چھوٹی توپ منگوا کر چترال کے کرنل متاع الملک نے اس توپ کے استعمال سے سکردو کو آزاد کرایا۔ اس کارروائی پر خواہ مخواہ اتنی دیر کر دی۔

مارچ 1948ء میں البتہ میجر احسان نے بڑی عقلمندی کی کہ محاصرین دشمن کا اندازہ لگا کر سکردو کے محاصرہ کیلئے دشمن کے محاصرہ کیلئے اہم مقامات پر صرف دو سو محاصرین چھوڑے اور زیادہ کام سویلین مخبروں سے لینا شروع کر دیا اور باقی مجاہدین لے کر آگے ''گول'' تک دریاؤں کے سنگم تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا بلکہ اپنی مخبری

کو آگے اولڈنگ اور کارگل کے علاقوں تک بڑھا دیا اور نزدیک وادی شگریا سکردو سے مشرق کے علاقوں پر بھی اسلام کے جھنڈے لہرا دیئے۔ اس مخبری کے بڑے فائدے ہوئے کہ مارچ 1948ء کے پہلے ہفتے خبر ملی کہ بریگیڈئر فقیر سنگھ اور میجر کورٹس ایک پلٹن کی نفری کے ساتھ کارگل اور دوسائی کے علاقے سے چار سو مسلمان مزدوروں اور فوجی سامان سے لدے ہوئے دو سو پہاڑی ٹٹوؤں اور خچروں وگھوڑوں کے ساتھ سکردو کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔ مجاہدین نے دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنے کی بجائے دریا کی تنگ گھاٹی اور پرکوٹا کے علاقے میں تھورگو پڑی اور شمشالی کے چٹانوں کے علاقے میں راستے سے اوپر سخت سرد علاقے میں صرف ڈیڑھ سو مجاہدین سے ایک ایسا لمبا چھپاؤ لگا لیا کہ دشمن کو اپنے نرغہ میں آنے دینا تھا۔ دریا کی ایک طرف کیپٹن محمد خان جرال تھا اور دوسری طرف کیپٹن نیک عالم' 17 مارچ 1948ء دن کے ساڑھے گیارہ بجے دشمن ''چھپاؤ'' کے علاقے میں داخل ہو گیا اور فضاؤں میں سکردو نظر آ رہا تھا کہ فقیر سنگھ نے زمین کا دوربین سے جائزہ لیا اور ''سب ٹھیک'' نظر آنے پر کالم کو روکا اور کھانا کھانے کیلئے بیٹھ گئے۔ مجاہدین کیلئے یہ بڑی صبر آزما گھڑیاں تھیں۔ رب کی ذات پاک نے انہیں صبر عطا فرمایا۔ آرام سے کھانا کھانے کے بعد زیادہ بھروسے کے ساتھ کہ شام تک وہ سکردو پہنچ جائیں گے۔ فقیر سنگھ نے کھانا کھانے کے بعد کوچ کا حکم دے دیا۔ پس صرف بیس گز چلے ہوں گے کہ حوالدار نذیر کے خود کار فائر نے آگے والے سکاؤٹس اور سیکشن کو ڈھیر کر دیا تو دریا کی دوسری طرف سے مارٹر کا فائر شروع ہو گیا یا جو آدمی نظر آئے اس کو رائفلوں کے فائر سے مارنے کا کام شروع ہو گیا کہ اوپر سے پتھر لڑھکنے شروع ہو گئے کہ مجاہدین نے علاقہ کے مزدوروں کی تقریباً تین سو نفری کو اوپر سے پتھر لڑھکانے کے کام پر لگایا ہوا تھا۔

بریگیڈئر فقیر سنگھ اور میجر کورٹس دونوں زخمی حالت میں اور تقریباً سو آدمی کارگل واپس پہنچ سکے۔ گو بھارتی تاریخ والے صرف سو ڈیڑھ سو آدمیوں کا نقصان بتاتے ہیں لیکن ہمارے مجاہدین نے مردے گنے جن کی تعداد چار سو تھی اور کچھ دریا میں گر گئے وہ الگ تھے۔ سارا سامان مجاہدین کے ہاتھ لگا۔ یہ ایک معجزاتی کارروائی تھی۔ قارئین! خود اندازہ لگا لیں کہ بھارتی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے اور صرف بیس مجاہدین کی نفری کے ساتھ صوبیدار اسماعیل نے اولڈنگ کے مقام تک ان کا تعاقب کیا۔ اب اگر سکردو ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو درہ زوجیلہ تک ہمارے مجاہدین کو کوئی نہ روک سکتا تھا اور سری نگر کیلئے شمال کی طرف سے بڑا خطرہ پیدا کیا جا سکتا تھا۔ مجاہدین نے زیادہ پیش قدمی نہ کی اور نہ کر سکتے تھے اور بھارت کی اس سلسلہ میں دوسری کوشش کا ''انتظار'' شروع کر دیا کہ بریگیڈئر فقیر سنگھ کا کورٹ مارشل ہوا اور اس کو فوج سے نکال دیا گیا۔ قدرت کا معجزہ دیکھیں کہ ان دور دراز علاقوں میں ہم تو مجاہدین کو ہتھیار اور بارود نہیں پہنچا سکتے تھے۔ یہ سب کچھ رب کی ذات پاک نے کر دیا کہ کالم کے ساتھ جو مسلمان مزدور تھے وہ تو گولیوں کی آواز سن کر پتھروں کے ساتھ لیٹ گئے اور ایک دو کو چھوڑ کر سب بچ گئے لیکن بھارتی سورماؤں نے فرار ہونے کی کوشش کی تو سامنے سے مارٹر کے گولوں یا رائفل کے فائر اور اوپر سے پتھروں کے لڑھکنے سے زیادہ لوگ ہلاک ہو گئے یا دریا میں گر کر ڈوب گئے۔ مجاہدین نے دشمن کے ان ہتھیاروں سے اپنے آپ کو مضبوط کر لیا اور اپنی نفری بھی بڑھا لی۔

بھارتیوں کیلئے یہ بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ ان کی جنوبی کشمیر کی فتوحات میں خلل پڑ گیا کہ اکھنور سے زیڈ

بریگیڈ جو نوشہرہ جا رہا تھا اور جس نے جھنگڑ پر حملہ کر کے پونچھ سے ساتھ رابطہ باندھنا تھا' اس کو واپس جموں سے سرینگر پہنچا کر کرنل سمپورن سنگھ کے ماتحت پانچویں اور ساتویں لائٹ پلٹون کو مارچ 1948ء کے آخری ہفتہ کارگل پہنچا دیا گیا کہ وہ جلد سکردو پہنچیں۔ لِہ سے ایک کمپنی بھی کارگل کے راستے سکردو بھیجنے کا بندوبست کیا۔ اور بریگیڈیر کرپال سنگھ نے سری نگر سے زیادہ کمک لے کر سکردو بریگیڈ کی کمانڈ جا کر 24 اپریل 48ء کو سنبھال لینا تھی لیکن مجاہدین نے پہلے کی طرح چھاپۂ لگانے کی بجائے اب ایسا بلی چوہے والا کھیل شروع کر دیا کہ ہر اہم زمین کو چند مجاہدین نے سنبھال کر دشمن کی پیش قدمی میں اتنے خلل ڈالے کہ کسی دن کوئی بھارتی کالم دو میل سے زیادہ سفر نہ کر سکتی تھی اور جہاں موقع ملتا دشمن پر گھات بھی لگاتے اور حملہ بھی کرتے جس کو ''ریڈ'' کہتے ہیں اور دشمن کے کالموں کو آپس میں رابطہ تو باندھنے ہی نہ دیا۔ سمپورن سنگھ 19 اپریل تک ''سرمک'' گاؤں کے اردگرد پھنسا ہوا تھا۔ لِہ والی کمپنی ابھی دریائے یشوک کے ساتھ چکر لگا رہی تھی اور کرپال سنگھ 24 اپریل کو سکردو پہنچنے کی بجائے 29 اپریل کو ابھی کارگل کے نزدیک باغیچہ تک پہنچ سکا۔ 8 مئی تک کی ان لڑائیوں میں ہمارے مجاہدین نے ان بھارتیوں کے ساتھ بعض مقامات پر دوبدو لڑائی لڑ کر قرونِ اولیٰ کے مجاہدین کی یاد تازہ کر دی کہ میری کتاب میں سب تفصیل ہے۔ یہاں یہ گزارش کریں گے کہ 15 مئی کو مجاہدین نے محسوس کیا کہ کرپال سنگھ کی فوج میں کچھ افراتفری ہے اور وہ کچھ پسپائی کر رہے ہیں تو میجر جرال نے کیپٹن نیک عالم اور صوبیدار دوست محمد کے سو ڈیڑھ سو مجاہدوں کو ایک چھوٹے انحرافی راستے سے کھرمنگ گاؤں کے نزدیک ایک ''پھندا'' لگا دیا۔ بھارتی دستے ایک ایک کر کے 20 مئی صبح سے کھرمنگ پہنچ رہے تھے۔ مجاہدین نے شام چار بجے تک انتظار کیا اور جب ڈوگروں نے شام کا کھانا پکانا شروع کیا اور کچھ ستا رہے تھے تو مجاہدین کے فائر کی تھرتھراہٹ سے ساری وادی گونج گئی۔ تین سو آدمی تو ادھر ہی کھیت رہے۔ باقی بھاگنے والوں کے ساتھ راستے میں کیا ہوا۔ سمپورن سنگھ صرف 20 آدمی لے کر لِہ پہنچا کہ تین سو بھارتی قید بھی ہوئے تھے۔ لِہ سے جو کمپنی آ رہی تھی وہ لوگ جان بچا کر نکل گئے اور کرپال سنگھ ایک ماہ بعد پندرہ آدمیوں کے ساتھ سری نگر پہنچا۔

یہ کیسے ہوا؟ کہ گلگت سے استور، چلم چوکی' درہ برزل اور گل تاری کے راستے مجاہدین ''سکیمو فورس'' یا ''دوسائی فورس'' کے طور پر نہ صرف اہم مقام کارگل پر قبضہ کر چکے تھے بلکہ دراس کی ڈوگرہ کمپنی کو بھی 10 مئی سے مجاہدین گھیرے میں لے چکے تھے۔ اور سری نگر کے ساتھ بھارتی فوجیوں کے سب رابطے کاٹے جا چکے تھے۔ ہماری اس کارروائی کو بھارتی سرکاری تاریخ والے بھی **Brilliant STRONKE** (شاندار گھونسہ) تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن افسوسناک پہلو یہ ہے کہ میجر اسلم جس نے جنرل پاشا کا نام اپنایا ہوا تھا اور علاقے کا بڑا کمانڈر تھا۔ اس فیصلہ کن گھڑی کے وقت بھی گلگت بیٹھا رہا۔ حالانکہ اس کو معلوم تھا کہ یہ کچھ ہونے والا ہے' کہ سکیمو فورس اور سکردو فورس والے شمالی علاقوں کے اہم مقام کارگل ''پر جنکشن'' کرنے والے ہیں تو اس کو یکم مئی سے میدان جنگ میں پہنچ جانا چاہیئے تھا اور وہ ان فتوحات کے ثمرات حاصل کرتا کہ اس فتح کے بعد لِہ پر قبضہ کرنا تھا (قارئین شمالی علاقوں میں کارگل کا مقام اس لئے اہم ہے کہ سری نگر سے لِہ جانے والا راستہ یہاں آ کر ملتا ہے) صرف اس طرف پیش قدمی کر کے تھوڑی بھارتی نفری کو قیدی بنایا جا سکتا تھا اور زوجیلہ درہ پر قبضہ کر کے سونا مرگ کی طرف سے سری نگر

کیلئے خطرہ پیدا کیا جا سکتا تھا۔ بھارتی بڑی بری حالت میں تھے اور وہ بہت زیادہ نقصان کرا بیٹھے تھے۔ میجر اسلم میرا ذاتی دوست بھی رہا۔ دراصل بات یہ تھی کہ گلگت آنے کے بعد وہ بیوپار میں لگ گیا اور کئی بیوپاریوں کا وہ حصہ دار بن گیا کہ اس کے پاس پیسے تھے کہ پاکستان سے خچروں اور ٹٹوؤں پر جو ضروری سامان شمالی علاقہ میں آتا تھا۔ میجر اسلم اس کاروبار میں شریک ہو گیا۔ راقم کو یاد ہے کہ نومبر 1949ء میں جب جنرل مارٹن کے ساتھ میجر اسلم جو اس وقت کرنل بن چکا تھا اور یہ عاجز بذریعہ ہوائی جہاز گلگت اور سکردو گئے۔ جہاز بہت نیچا اڑتا رہا اور کرنل اسلم نے کئی دفعہ مجھے جہاز سے ٹٹوؤں کی وہ کانوائیاں دکھائیں جن کے ذریعہ کرنل اسلم تجارت کر رہا تھا۔ وہ اپنے زمانے میں ہماری فوج کا امیر ترین آدمی مانا جاتا تھا اور ان کے بھائی اور سارا خاندان' پاکستان میں کروڑوں میں کھیلتا ہے لیکن ہم نے جو ان فتوحات کے ثمرات حاصل نہ کئے ان کی بڑی وجہ ایک اور بھی ہے کہ ہم نے اپنے پاکیزہ جہاد کی باگ ڈور اپنے انگریز نوکروں کے ناپاک ہاتھوں میں تھما دی تھی۔ اکبر خان کو بھی طریقے کے ساتھ طارق ہیڈکوارٹر سے مارچ کے پہلے ہفتے سے ''نکال'' دیا گیا تھا۔

اب ہم گلگت سے ''سکیموفورس'' اور ٹائیگرفورس'' کی ''کاری ضرب'' یا ''کاری گھونسے'' کے بارے میں گزارش کرتے ہیں کہ ٹائیگر فورس کو لے کر میجر حسن تو بہت جلد بانڈی پورہ کی طرف پیش قدمی کر گئے کہ اکبر خان طارق جو نمبر ون سیکٹر میں ضلع ہندواڑہ میں کرنل خالد سے جو کارروائی کرا رہے تھے' اس کارروائی اور بانڈی پورہ کی کارروائی کو شیر وشکر کرنا تھا۔ میجر حسن خان 27 اپریل کو بانڈی پورہ کے سامنے نمودار بھی ہو گیا اور بھارتی فوج کے ایک بریگیڈ کو چکر چڑھا دیئے۔ میجر حسن کی یہ کارروائی بھی ہماری تاریخ کا سنہری باب ہے کہ سطح سمندر سے 18566 اونچی کاوَیلی گلی کو عبور کرنا تھا اور برف پر چلنے والے ٹھیلے ہاتھوں سے چلا کر اپنا کئی دن کا راشن بھی خود اٹھانا تھا اور پہلے مرحلہ میں منی برگ اور چوروان کے راستے گریز کی طرف پیش قدمی کی۔ اور کئی ماہ طراگبل کے ارد گرد بھارتی فوج کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلتا رہا کہ بھارتی کسی اور محاذ پر کوئی کارروائی نہ کر سکے تو اس مہم کے وقتی فوائد تو بڑے ہوئے لیکن افسوس جس کام کیلئے اکبر خان طارق نے یہ کالم بھجوائی تھی کہ ہندواڑہ میں کرنل خالد کی کالم سے رابطہ کرے کہ بھارتیوں کو تتر بتر کر کے ان کی تکا بوٹی کی جائے۔ اس پر عمل روک دیا گیا کہ بعد میں اکبر خان کو ہی طارق ہیڈکوارٹر سے ہٹا دیا گیا تھا۔

''سکیموفورس'' جن لوگوں نے 115 میل کا سفر کر کے اہم مقامات کارگل اور دراس پر قبضہ کرنا تھا' وہ لوگ 29 اپریل 1948 کو چلم چوکی پہنچے۔ یکم مئی کو جب رات کا پہلا حصہ گزر گیا' تو قدرتی طور پر آسمان صاف تھا اور چاند کی چاندنی عجیب سماں پیدا کر رہی تھی۔ سب مجاہدین اپنے یخ بستہ چھوٹے خیموں میں اٹھ کھڑے ہوئے تو زور سے اللہ اکبر کی صدا دی کہ چلم چوکی کی فضا ان نعروں سے ایسی گونجی کہ اس کے بعد آج تک کافر اس علاقے کی طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکا۔ چلم چوکی کے بعد ان مجاہدین نے سطح سمندر سے چودہ ہزار بلند بزرل درہ کو پار کرنا تھا۔ ہر آدمی نے اپنا کمبل' سات دن کا کھانا اور بارود اٹھایا ہوا تھا کچھ برف پر چلنے والے SLEDGE (ٹھیلے) تھے۔ جن کو جوان خود کھینچتے تھے۔ تمام درخت اور جھاڑیاں 15 فٹ برف کے نیچے دبی ہوئی تھیں۔ برف کے طوفان بھی آتے تھے۔ مجاہدین ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر یا پشت ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر کچھ

گرمائش حاصل کر لیتے تھے۔ کچھ مجاہدین اور مزدوروں کے پاؤں میں بوٹ نہ تھے۔ انہوں نے جانوروں کی کھالوں کو پاؤں سے لے کر پنڈلیوں تک لپیٹا ہوتا تھا۔

تین دن مزید سفر کر کے یہ لوگ ساٹھ میل کا فاصلہ طے کر کے گلتری پہنچ گئے۔ جہاں سے تھوڑے آگے نکل کر ''سکیموفورس'' نے دو حصوں میں تقسیم ہو جانا تھا کہ تقریباً 180 مجاہدین کے ساتھ 10 مئی کو کیپٹن عظمت نے کارگل پر اسلامی جھنڈے لہرا دیئے۔ اور ستر مجاہدین کے ساتھ صوبیدار شیر علی مشہور مسکی نالہ کو استعمال کر کے دراس پہنچ گیا اور ایک ٹوٹی پھوٹی ڈوگرہ کمپنی کو محاصرہ میں لے لیا۔ جنہوں نے دو ہفتے بعد ہتھیار ڈالے۔ تو بھارتی کرنل سمپورن سنگھ اور کرنل کرپال سنگھ، جو ہمارے میجر محمد خان جرال کی تھوڑی سی فوج کے سامنے سے پسپا ہو رہے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہماری ''سکیموفورس'' کارگل کو آزاد کرا چکی تھی۔

پونچھ کو آزاد نہ کرا کے ہم کشمیر کی آدھی جنگ ہار بیٹھے

اب ہم نمبر ایک سیکٹر کی کہانی بیان کرتے ہیں جس کے اکبر خان نے دو حصے کر دیئے کہ اوڑی کے علاقے سے دشمن کے خلاف کچھ نہ ہو سکتا تھا کہ اکبر خان، دشمن پر کوئی بڑا حملہ نہ کرتا تھا کہ مجاہدین کے پاس نہ ہوائی جہازوں کی مدد تھی نہ توپخانہ کا فائر پاور بلکہ اکبر خان نے مجاہدین کو توپ کا گولہ بنایا ہوا تھا یا چھوٹی سطح پر رائفل کی گولی کہ ان کو حرکت دے کر اپنی مرضی کے وقت اور مرضی کی جگہ گولہ یا گولی کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں حکومت پاکستان نے راولپنڈی کیمپ میں کچھ سابق فوجیوں کو تازہ تربیت دے کر ایک پلٹن کے برابر سات سو نفری تیار کی تھی جن کے پاس کچھ پکی رائفلیں اور کچھ درہ کی بنی ہوئی رائفلیں تھیں اور صرف چار خود کار گنیں تھیں۔ اس دستے کی کمانڈ میرے محسن کرنل شیر محمد مرحوم و مغفور کو دی گئی، جو اس وقت ہماری فوج کے سینئر افسروں میں کافی سینئر میجر تھے۔ ہم غائبانہ طور پر اپنے رشتہ داروں کی وجہ سے ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے تھے لیکن سرکاری نوکری میں یہ ملاپ 1949ء میں ہوا اور 1952ء تک ہم راولپنڈی چھاؤنی میں جو ایک دوسرے کو ملنا شروع ہوئے تو یہ ایک ایسا رابطہ تھا، جس نے ہمیں ''یک نفس'' کر دیا۔ عمر میں ہم تقریباً برابر تھے لیکن عہدہ کے لحاظ وہ مجھ سے بہت سینئر تھے لیکن 1952ء سے لے کر ان کی 1999ء میں وفات تک ہم تقریباً ہر روز ملتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ بحث کر کے جو علم اور زندگی کے مقاصد کے پہلو ایک دوسرے سے حاصل کئے۔ شاید دنیا میں اس کی مثال نہ ہو یعنی اللہ اور رسول ﷺ کی باتیں...... مومن کی زندگی کے مقاصد اور اسلامی فلسفہ جہاد اور بین الاقوامی معاملات پر روزانہ دو گھنٹے بات چیت ہوتی۔ افسوس کہ افواج پاکستان اور نہ قوم نے ان کی سوچوں کا فائدہ اٹھایا۔ ائر مارشل اصغر خان اور صاحبزادہ یعقوب خان وغیرہ ان کے ''نمبری'' تھے اور وہ کہاں پہنچ گئے۔ شیر محمد ''اسلام کا فرزند'' تھا اور ایوب خان اپنی کتاب میں خود تسلیم کرتا ہے کہ کشمیر میں جن لوگوں نے اپنے عہدوں سے بڑھ کر کام کیا۔ ان کو ان کے قد کے مطابق ''تراشنے'' کی ضرورت تھی۔ اور شیر محمد اور متعدد مجاہدین کشمیر اس ضرورت کے ''شکار'' بنائے گئے اور شیر محمد آخری ایام میں کچھ ''مایوس'' ہو گئے تھے۔

تو بہر حال کرنل شیر محمد، کرنل خالد کا نام اپنا کر جنوری 1948ء میں مظفر آباد سے آگے کیرن پہنچ گئے کہ

اکبر خان طارق نے ان کو کہا کہ اس علاقے میں وہ دشمن کے ساتھ بلی چوہے کا کھیل کھیلیں گے اور آپ اس بلی چوہے کے کھیل کا رابطہ بانڈی پور تک بڑھا دیں گے کہ گلگت سے مجاہدین کو لے کر اپریل کے وسط تک میجر حسن خان وہاں پہنچ جائے گا کہ اس طرح ہم بھارتی فوج کو پورے کشمیر میں تتر بتر کر کے ایسا تہس نہس کریں گے کہ ان کو سب "جارحیتیں" اور یہ غاصبانہ کارروائیاں بھول جائیں گی کچھ بارود وغیرہ بھیجنے کا وعدہ کیا لیکن رسد و رسانی کا سامان خود کرنا ہوگا وغیرہ۔ کرنل خالد فروری 1948ء میں عین برف باری کے موسم میں گلیات کے راستے ہندواڑہ کی وادی میں بجلی بن کر دشمن پر گرے کہ ایک پوری بھارتی پلٹن ہندواڑہ سے فرار کر کے سوپور پہنچ گئی اور سرینگر میں بھارتی جنرل "تھمایا" کی مظفر آباد کو فتح کرنے کی تجویزیں دھری کی دھری رہ گئیں کہ صرف اوڑی اور بارہ مولا یا سوپور کے دفاع کیلئے اس نے دہلی سے ایک بریگیڈ کی مدد مانگ لی لیکن کرنل خالد اپنی کمزوری دشمن پر ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ بھی خورشید انور کی طرح حروش کر کے دشمن کا پیچھا کرتا۔ ایسے مقاصد حاصل کرنے کیلئے شیر محمد نے ہندوواڑہ میں صرف چند دن قیام کیا۔ اور پھر حفاظت سے پیچھے آ کر پہلے تریگام میں ایک مستقر بنا لیا۔ بھارت نے مجاہدین سے نبٹنے کیلئے دو پلٹنیں تیار کر لیں۔ کرنل خالد نے دشمن پر ایک جھپٹا مارا اور پھر آہستہ سے نکل کر مارچ 1948ء میں پیچھے آ کر نتھا چھنا گلی والی پوزیشن اختیار کر لی۔ حیرانگی کی بات ہے کہ کرنل خالد کے لشکر میں ضلع گجرات کے ایک مجذوب فقیر سید حنیف علی شاہ بھی تھے اور وہ کرنل شیر محمد کو جو مشورہ دیتے تھے اس کے نتائج بہت اچھے ہوتے تھے۔ اور شاہ صاحب کو کچھ "خود آگاہی" بھی ہوتی تھی اور اس بلی چوہے کے کھیل میں بھارت کا اتنا زیادہ نقصان ہوا کہ کرنل خالد ان کیلئے طلسمی شخصیت بن گئے اور بھارتیوں کو بریگیڈیر ہربخش سنگھ کا پورا بریگیڈ اس محاذ پر لانا پڑ گیا۔ یہی ہربخش ستمبر 1965ء کی جنگ میں لاہور کے سامنے کور کمانڈر تھا اور یہ عاجز اس کا ذکر اپنے پہلے مضامین میں کر چکا ہے کہ امریکی مہمانوں کے ساتھ اس نے افسر بھیج کر جنرل چودھری کو خبر دی تھی کہ محاذ خالی ہے۔ تو تب شاستری کو جنگ میں دھکا دیا گیا تھا۔

کرنل خالد کی اس محاذ کی ساری کارروائیوں کی تفصیل میری کتاب میں موجود ہے کہ موسم جب ذرا کھل گیا تو نتھا چھنا گلی سے اتر کر کرنل خالد نے دشمن کو پھر تنگ کرنا شروع کر دیا لیکن پیچھے خبر دی کہ جب موسم زیادہ کھل جائے گا تو بھارتی اس راستے سے مظفر آباد پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہے ہیں اور مئی کے پہلے ہفتہ تک کم از کم ایک پلٹن فوج بھیج کر نتھا چھنا گلی کے مستقر کو آ کر سنبھال لیں۔ ورنہ مٹھی بھر مجاہدین بھارت کا مقابلہ نہ کر سکیں گے لیکن اکبر خان طارق ہیڈ کوارٹر سے جا چکا تھا۔ حکم ملا کہ دشمن کے خلاف اپنی کارروائیاں محدود کریں کہ کشمیر کا معاملہ اقوام متحدہ میں چلا گیا ہے۔ یہ بڑی غلط پالیسی تھی تو جو نتیجہ نکلا وہ ہم زماں کے لحاظ سے بعد میں بیان کریں گے کہ بھارتیوں نے اس محاذ پر اتنا سخت حملہ کیا کہ ایک پلٹن کی بجائے ہمیں پورا بریگیڈ ادھر بھیجنا پڑ گیا۔ ورنہ بھارتی ہمیں ان علاقوں سے باہر پھینک دیتے اور بانڈی پور میں یہی کچھ میجر حسن خان کے ساتھ ہو رہا تھا لیکن ان کی مدد کیلئے تو فوج ہم بھیج ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ انگریز جنرلوں نے اب فیصلہ کیا ہوا تھا کہ جو علاقے ہم نے آزاد کرا لئے ہیں ان میں سے بھی کچھ علاقے وہ بھارت کو واپس دینا چاہتے تھے کہ ہمارے جنرل گریسی نے 20 اپریل 1948ء کو حکومت پاکستان کو خط لکھ کر ہمیں جو بے وقوف بنایا اس خط کے "مندرجات" اور مقاصد پر

ایک دفعہ سب محاذوں کی ہماری کامیابیوں کے کہانی بیان کرنے کے بعد جو آزاد علاقے جن اوچھے طریقوں سے انگریز جنرلوں نے بھارتیوں کو واپس دلائے۔ کشمیر کی جہاد کی کہانیوں کے یہ سیاہ ابواب ہیں۔

اب ہم بہت بڑے اہم سیکٹر نمبر دو کی طرف جاتے ہیں جس کو پونچھ کا سیکٹر بھی کہہ سکتے ہیں یا کہتے ہیں۔ پونچھ کو آزاد نہ کرا کر ہم کشمیر کی آدھی جنگ ہار بیٹھے۔ انگریز خاص کر ماؤنٹ بیٹن پونچھ شہر کی اہمیّت کو سمجھتا تھا اور ہمارے پاس ثبوت موجود ہیں کہ اس نے جواہر لعل نہرو کو پونچھ سیکٹر سے چمٹے رہنے کی بھی تاکید کی اور ہمارے انگریز نوکروں کی مدد سے پونچھ کو بھارت کے قبضہ میں رکھا گیا حالانکہ بھارت کی سرکاری تاریخ میں یہ گواہی موجود ہے کہ بھارتی فوج کے سربراہ جنرل لاکھارٹ نے دو دفعہ پونچھ کو چھوڑ دینے کی سفارش کی کہ پونچھ پر قبضہ بھارت کو بہت مہنگا پڑ رہا ہے۔ ہمارے لئے پونچھ کی اہمیّت سرینگر سے بھی زیادہ تھی اور ہمارے مجاہدین اگر پونچھ کو آزاد کرا لیتے تو یہ مجاہدین بانہال' سرینگر اور بارہ مولا کی سڑکوں پر بھارتی فوجیوں کی تکا بوٹی کر دیتے۔ پونچھ کے بارے میں یہ جائزے اور واقعات اور ہمارے کچھ لوگوں کی کمزوریاں' کچھ کی کوتاہیاں اور ایک آدھ کی غداری وغیرہ سب باتیں کئی مضامین میں ختم نہیں ہوتیں۔

نومبر 1947ء میں اکبر خان نے بھارتیوں کو اوڑی اور پونچھ کا زمینی رابطہ نہ باندھنے دیا۔ البتہ بریگیڈئر پریتم سنگھ کماؤں پلٹن اور کچھ امداد لے کر پونچھ کے دفاع کا کمانڈر بن گیا۔ جنوب سے بھی نومبر 1947ء میں بریگیڈئر پرانجاپے نے اس رابطے کی کوشش ہی نہ کی اور کوٹلی سے بھی فرار اختیار کر گیا اور جھنگڑ پہنچ گیا اور دسمبر کے آخری ہفتہ میں مجاہدین نے جھنگڑ دھرمسال بھی فتح کر لیا۔ تو بھی بھارتی اب پونچھ سے بہت دور نوشہرہ میں موجود تھے۔ بھارتیوں کا پونچھ کا دفاع بہت زیادہ مضبوط تھا۔ ایک بریگیڈ سے زیادہ فوجی نفری اور ہزار دو ہزار نیم فوجی اور کچھ نوجوان ہندو سویلین رضا کار بھی تھے۔ چھوٹی توپوں کی توپخانہ کی ایک بیٹری بھی فائر سپورٹ کے لئے تھی۔ سب مسلمان سولین لوگوں کو شہر سے نکال دیا گیا تھا اور چھوٹے سے ہوائی اڈے میں مسلمانوں کے قبرستان کو ساتھ شامل کر دیا تھا۔ تو ڈکوٹا ہوائی جہاز بھی اتر جاتا تھا۔ جو بارود وغیرہ یا دوائیاں پہنچا جاتا تھا اور بیماروں اور زخمیوں کو بھی لے جاتا تھا۔ رسد بھی آ جاتی تھی اور مسلمانوں کو نکالنے کی وجہ سے شہر میں غلہ بھی موجود تھا اور بھارتی فوجی اس قابل تھے کہ شہر سے فائر کے نیچے دو تین میل باہر نکل کر نزدیک دیہاتوں سے غلہ وغیرہ بھی لوٹ کر لے آتے تھے اور پانی بھی موجود تھا کہ دریائے پونچھ شہر کے بیچ سے گزرتا تھا۔

علاقے کے سدھن اور عباسی یا ملے جلے قبائل کے لشکر جن کی نفری ہزاروں میں تھی۔ وہ باہر محاصرہ میں بیٹھے رہتے تھے کہ بھارتی کسی وقت پونچھ سے نکل کر نزدیک ان کے گھروں میں تباہی نہ مچا دیں۔ لیکن کچھ قبائلی مجاہدین اور بے قاعدہ لشکر بھی پونچھ کے گرد ''بندھے'' رہتے کہ فتح کی صورت میں کچھ لوٹ ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔ خواہ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی ہو۔ کہ اس ''لوٹ مار'' پر مکمل کنٹرول نہیں کیا جا سکتا کہ پونچھ میں یہ ''کشش'' تھی جو ہم آگے واضح کریں گے کہ نوشہرہ میں ایسی ''کشش'' نہ تھی۔ اکبر خان طارق سب معاملات کو سمجھتا تھا۔ لیکن اس کو معلوم تھا کہ یہ مجاہدین اکیلے یا بے قاعدہ لشکر پونچھ کو فتح نہیں کر سکتے۔ فتح کیلئے انہیں توپخانے کے فائر کی بھی ضرورت ہو گی اور ایک آدھ پکی پلٹن کی بھی ضرورت ہو گی کہ شاید کسی مشکل مقام پر حملہ یا کسی مشکل مقام پر قائم

رہنے کا کام صرف باقاعدہ فوج ہی کر سکتی ہے اور اب وقت آ گیا تھا کہ پاکستانی فوج کو ضروری ''اوقات'' پر ضروری جگہوں پر استعمال کیا جائے اور وہ لبریشن کمیٹی کو باور کرا رہے تھے کہ حکومت پاکستان کو مجبور کریں کہ وہ بروقت جاگیں ورنہ ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ بھی کھو دیں گے۔

دوسری ضرورت ایسے تجربہ کار افسر کی تھی جو یہ کچھ کرا سکے کہ زمان کیانی یا اس کے ماتحت میجر تجمل حسین وغیرہ، اکبر خان کو اس کام کے لئے ''اہل'' نظر نہ آتے تھے اور پکی فوج سے کرنل ظہیر الدین جو رضا کار کے طور پر پونچھ گیا تھا۔ وہ بھی اکبر خان کے مطابق معاملات کو نہ سمجھ سکا۔ اس لئے دسمبر 1947ء اور جنوری 1948ء میں پونچھ کے اردگرد جو خونریز جنگیں ہوتی رہیں۔ ان سے دو اڑھائی ماہ میں کوئی بڑا نتیجہ حاصل نہ ہو سکا۔ خوش قسمتی سے فروری کے شروع میں ولایت میں کیمرلے کورس سے واپس آئے کرنل صدیق ستی نے اس محاذ پر رضا کارانہ طور پر کام کرنے کیلئے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ جو صاحب بعد میں بریگیڈئر بننے کے بعد راولپنڈی سازش کے مقدمہ میں بھی اکبر خان کے ساتھ دھر لئے گئے تھے۔ راقم کے یہ صاحب بھی 1944ء سے برما محاذ کے وقت کے دوست تھے وہ آزاد کشمیر کی ہمسائیگی میں تحصیل کہوٹہ کے علاقہ لہتراڑ کے رہنے والے تھے اور اس محاذ کیلئے نہایت موزوں آدمی تھے۔ فروری سے ہمارے انگریزوں جنرلوں نے بھی ہم پر ''احسان'' کر کے کشمیر کے جہاد میں ''خفیہ'' طور پر شرکت کی ہوئی تھی اور جنرل گریسی بھی برما محاذ کے وقت سے کرنل صدیق ستی کو جانتا تھا۔ تو اس نے ان کو بلا بھیجا اور کچھ ''برین واشنگ'' شروع کی کہ قانونی طور پر ہم کشمیر میں لڑائی نہیں لڑ سکتے۔ اس لئے صدیق ستی بڑی فتوحات کا خیال نہ کرے۔ محدود طور پر کارروائیوں پر گزارا کیا جائے وغیرہ۔ لیکن صدیق ستی انگریزوں کی ''بندوق اٹھانے والے'' باقی لوگوں سے مختلف تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں اس کی وفاداری ''نوکری'' کے اصول پر تھی۔ اب وہ ایک آزاد ملک کی فوج کا سینئر افسر تھا۔ اس نے جنرل گریسی کو کہا کہ جنگ، جنگ ہوتی ہے۔ دشمن ہمارے سر پر چڑھا بیٹھا ہے۔ ہمارے لئے موت اور زندگی کا مسئلہ ہے۔ اور عزت کی موت بے غیرتی کی زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔ ہم مسلمانوں کیلئے تو ویسے بھی ''شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن'' کے اصول کو ترجیح ہوتی ہے۔ آپ انگریز لوگ بھی ہمارے ساتھ وہی وفاداری دکھائیں جو ہم تمہارے ساتھ دکھا چکے ہیں۔ گریسی بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ وہ تاڑ گیا کہ صدیق ستی اس کا اس طرح ''کٹھ پتلی'' نہ بنے گا جیسے کئی بے کردار پاکستانی آفیسر بنے ہوئے تھے۔ تو حیلہء فرنگی کے تحت اس نے مصلحتاً صدیق کے جوش جہاد کو خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ اس کا مقصد اپنے ''نوجوان دوست'' کو محتاط کرنا تھا کہ وہ میانہ روی والا رویہ اختیار کرے۔ ویسے وہ اس کی اس محاذ پر صدیق ستی کی پوری مدد کرے گا اور وہ کسی وقت بھی سیدھے طور پر اس کے ساتھ بات کر سکتا ہے۔

صدیق ستی فروری کے تیسرے ہفتہ پونچھ محاذ پر پہنچا کہ سارا سفر پیدل کیا کہ احکام تھے کہ کشمیر میں کوئی سڑک نہ بنائی جائے۔ کہ کسی مقام پر بھارت کا قبضہ ہو گیا تو وہ لوگ ان سڑکوں سے فائدہ اٹھائیں گے۔ صدیق ستی تراڑ کھیل میں رک گیا اور حکومت آزاد کشمیر سے ملاپ کر کے رضا کاروں کے ذریعہ سے اور انجینئر کے میجر ریاض کے ذریعہ سے آزاد پتن سے لے کر پونچھ تک کچھ پرانی سڑکوں کو ٹھیک کیا اور کچھ نئی سڑکیں بنوائیں۔ مجاہدین کیلئے پانچ ہزار من گندم اور دو ہزار من چاول اکٹھے کئے کہ وہ لوگ صرف لڑائی کا کام کریں اور تمام لشکروں کو منظم کیا۔

دین محمد اور حکومت آزاد کشمیر سے بھی دباؤ ڈلوایا اور اکبر خان پہلے دباؤ ڈال رہا تھا تو پہاڑی توپوں کی دو بیٹریاں میجر عدالت اور کیپٹن گلزار کے ماتحت پونچھ محاذ پر مارچ کے پہلے ہفتے پہنچ گئیں۔ لیکن ساتھ گریسی کا حکم بھی پہنچ گیا کہ ان سے فائر اس کی اجازت کے بعد کرایا جائے گا کہ وہ ایک پکی پلٹن بھی بھیج رہے ہیں۔ صدیق ستی نے پونچھ پر حملہ کی تجویز 8 اور 9 مارچ کیلئے بنائی۔ لیکن کچھ بارشیں بھی شروع ہو گئیں اور توپوں کا ایمونیشن بھی نہ پہنچا اور گریسی نے فائر کی اجازت 17 مارچ کیلئے دی۔ تو حملہ کی تاریخ وہی مقرر کر دی اور پونچھ کے محاصرہ کو تنگ کیا گیا اور حملے کی تجویز شام کیلئے بنائی کہ بھارتی جہازوں کے حملوں سے بچتے رہیں گے اور یہ تجویز اس تجویز کے ساتھ ملتی جلتی تھی جو 25/26 جنوری کو بنائی گئی تھی کہ آزاد مجاہدین نے مغرب سے اور قبائلی مجاہدین نے جنوب سے حملہ کرنا تھا وغیرہ۔

صدیق ستی کی حیرانگی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ 15 مارچ کو فوج کا ایک بہت سینئر افسر بریگیڈئر حیاالدین جو شیر خان اور اکبر خان سے بھی سینئر تھا۔ وہ پونچھ محاذ پر پہنچ گیا اور ساتھ پوری پلٹن کے لانے کے بجائے موجودہ نویں ایف ایف کی کیپٹن محمد نواز کے تحت صرف ایک کمپنی تھی اور حیاء الدین نے صدیق ستی کو کہا کہ وہ تو صرف ''مشیر'' اور ''مبصر'' ہے۔ البتہ جنرل گریسی کے احکام ہیں کہ اس کمپنی کو اس سے وائرلیس پر حالات واضح کرنے اور اجازت لینے کے بعد ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حیاء الدین، برما محاذ پر راقم کا بھی دوست رہ چکا تھا کہ وہ مسلم لیگ کا ہمدرد تھا لیکن وہ سخت قادیانی تھا اور جنرل گریسی کے ماتحت برما میں بھی کام کر چکا تھا اور اب ہماری فوج میں وہ جنرل گریسی کا خاص الخاص آدمی بنا ہوا تھا۔ بعد کے واقعات سے ظاہر ہو گا کہ حیاء الدین کو جنرل گریسی نے اس لئے بھیجا تھا کہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ صدیق ستی اس کی ''گیم'' نہ کھیلے گا اور حیاء الدین جنرل گریسی کو گھڑی گھڑی کی خبر دے رہا تھا کہ اس سلسلہ میں میرا ایک اور دوست کرنل چراغ شاہ بھی چشم دید گواہ ہے' جو اس زمانے میں طالب علم رضا کار کے طور پر پونچھ محاذ پر کام کر رہا تھا۔

جہاد صرف اعلان کرنے سے نہیں ہو جاتا

حملہ تجویز کے مطابق 17 مارچ شام کو شروع ہو گیا اور چھوٹی پہاڑی توپوں کا پونچھ پر یہ پہلا فائر تھا۔ اور بھارتی تاریخ والے خود تسلیم کرتے ہیں کہ پونچھ میں کھلبلی مچ گئی اور آگے والے بھارتی سورماؤں نے فرار اختیار کیا۔ محسود لشکروں نے خانیستر سے نکل کر چندک کے مقام سے دریا کو عبور کرتے دائیں کنارے سے پیش قدمی کر کے بھارتیوں کے دفاع کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ مغرب سے آزاد مجاہدین نے بھارتی چوکیوں کو ختم کر کے مائینز فیلڈ کے اندر سے ''گزرگاہیں'' تلاش کرنا شروع کر دیں اور جنوب سے بھی آزاد مجاہدین سلوتری اور بھیانچ پہاڑی سلسلہ کے ساتھ ساتھ دریائے پونچھ تک پہنچ گئے۔ کہ سدھن اور آزاد بریگیڈروں کو دو آزاد پلٹنوں کی کمک بھی پہنچ گئی تھی اور مجاہدین تین اطراف سے پونچھ کے در و دیوار تک پہنچ گئے۔ لیکن ہماری کوتاہیوں کی شاید قدرت سزا دینا چاہتی تھی یا تنبیہ کرنا چاہتی تھی اور کوئی امتحان تھا کہ کھرے کھوٹے کی پہچان ہو جائے۔ عین اسی وقت موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور چاندنی رات اندھیرے میں تبدیل ہو گئی اور مجاہدین جہاں تک پہنچے تھے وہیں دبک گئے۔ حالانکہ ہوائی اڈہ چند سو گز دور تھا اور اس پر تو قبضہ ہو سکتا تھا اور اگر کوئی باقاعدہ فوج اتنی بنیادی کامیابی حاصل کر لیتی

تو پونچھ کی اینٹ سے اینٹ بج سکتی تھی۔

صدیق ستی نے حیاء الدین کو گزارش کی کہ جب ہم پاکستانی باقاعدہ فوج کا توپخانہ استعمال کر رہے ہیں تو نویں ایف ایف کی کمپنی سے سویلین کپڑوں کے ساتھ رات کے اندھیرے میں ہوائی اڈہ پر قبضہ کرا لیں اور سویرے وہاں مجاہدین بھیج دیں گے۔ حیاء الدین نے کہا کہ وہ جی ایچ کیو سے مشورہ کئے بغیر ایسا نہیں کر سکتا لیکن ہمارے جی ایچ کیو میں پر امن زندگی بسر کرنے والے میں آدھی رات کیسے بات سنتے؟ صدیق ستی کہا کرتا تھا کہ اس نے اپنے ماتحت افسروں کرنل خانزادہ اور میجر تجمل سے مشورہ کیا کہ حیاء الدین کو عارضی طور پر حراست میں لے کر منظر سے ہٹا دیتے ہیں اور فوجی کمپنی کو استعمال کر لیتے ہیں لیکن انہوں نے کہا کہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ 18 مارچ کو جی ایچ کیو کے ساتھ ملاپ ہوا تو گریسی نے فوجی کمپنی کے استعمال کی اجازت نہ دی۔ لیکن صدیق ستی اور مجاہدین بہت کچھ حاصل کر چکے تھے ہمارے توپخانہ کے فائر سے بھارتیوں کا ایک ڈکوٹا جہاز تباہ ہو چکا تھا اور دوسرے کو اترتے وقت سخت نقصان پہنچا۔ پریتم سنگھ اب پونچھ کا دفاع تب کر سکتا تھا کہ اس کو 25 پونڈر توپیں دی جاتیں جن کی مدد سے وہ ہماری پہاڑی توپوں کو ہوائی اڈے سے دور پوزیشن لینے پر مجبور کر دیتے اور وائرلیس سے کچھ خبر ہمارے مجاہدین نے سن لی کہ پریتم سنگھ 25 پاؤنڈروں کے بغیر پونچھ کا دفاع چند دن بھی نہیں کر سکتا۔

بھارتی تاریخ والے تسلیم کرتے ہیں کہ 21 مارچ کو وہ 25 پاؤنڈ توپوں والا ڈکوٹا پونچھ میں نہ اتار سکے۔ تو اسی دن پریتم سنگھ جو ڈیرہ ڈون میں صدیق ستی کا ''نمبری'' تھا اس نے وائرلیس پر غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے کی پیش کش کی۔ کہ سب سویلین کو بھارت جانے کی اجازت ہو اور ہماری سرکاری تاریخ کے مطابق بھارتی فوج کے سربراہ کے جنرل گریسی کے ساتھ پہلے فون اور پھر سگنل سے ایسی گزارش کر دی اور تین دن کیلئے عارضی فائر بندی 23 مارچ سے ہونا تھی کہ پونچھ میں جو بھارتی زخمی ہو گئے تھے ان کو جلد علاج کیلئے دہلی پہنچانا تھا۔ اور اس کے لئے بھارتی جہازوں کو پونچھ اترنے کی اجازت دی جائے۔ صدیق ستی کو اس میں سازش نظر آئی اور وہ کچھ تذبذب میں تھا کہ جنرل گریسی نے حیاء الدین کے ذریعے سے اسے حکم دیا کہ یہ معاملہ حکومت پاکستان کی مرضی سے طے ہوا ہے اور یہ حکم ماننا پڑے گا۔ چنانچہ نرسوں کو لے کر 24 مارچ کو جو بھارتی ڈکوٹا اترا اس میں صدیق ستی نے 25 پاؤنڈر توپ دیکھ لی اور خود بخود فائر بندی توڑ دی۔ تو جنرل گریسی نے اس کو کمانڈ سے ہٹا کر حیاء الدین کو محاذ کا کمانڈر بنا دیا۔ جس نے فائر بندی کی بھی نگرانی کی اور مجاہدین کو بھی پرانی پوزیشن پر لے آیا اور صرف چند دن وہاں ٹھہرا اور پونچھ کے محاذ کی کمانڈ کرنل صدیق راجہ کو دے کر واپس راولپنڈی آ گیا کہ یہاں اس کے لئے ''انعام'' کے طور پر لندن میں ہمارے فوجی مشیر کا ''عہدہ'' تیار تھا اور ڈیڑھ سال بعد اس کو میجر جنرل بنا دیا گیا۔ یہ صدیق راجہ آگے واقعات میں انگریزوں کا بہت بڑا ایجنٹ ثابت ہوگا۔ اور سلطانی گواہ۔

اس ساری کہانی کو حکومت آزاد کشمیر کا سابق چیف سیکرٹری مسٹر سہروردی اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے لکھتا ہے کہ ہمارا وزیر اعظم لیاقت علی اگر ذرا بھر جرأت کا مظاہرہ کرتا تو پونچھ شہر آزاد ہو گیا ہوتا۔ وہ جنگ کا پس منظر بھی بیان کرتا ہے۔ اور یہ اضافہ کرتا ہے کہ بھارت نے مکر و فریب سے کام لیا اور لیاقت علی کو بے وقوف بنایا۔ جنرل گریسی نے لیاقت علی کی منظوری سے یہ سب کچھ کیا اور حیاء الدین نے سختی سے فائر بندی پر عمل کرایا اور مجھے

محمد زمان کیانی نے بتایا تھا کہ ایک ہفتے کے وقفہ میں بھارتیوں نے زخمیوں کو نکالنے کے بہانے تازہ دم فوج اور 25 پاؤنڈز کی توپیں بھی بھیج دیں وغیرہ۔ سہروردی کے بیانات سر آنکھوں پر لیکن ہماری تحقیق ذرا زیادہ گہرائی والی ہے کہ لیاقت علی کو صرف بے وقوف نہ بنایا گیا۔ لیاقت اور ہمارے انگریز جنرلوں نے بھارت کی کئی ''خواہشات'' پوری کیں اور ہمارے انگریز جنرلوں کے ''پروردے'' ہمارے اندر موجود تھے۔ بھلا صرف ایک کمپنی کیوں بھیجی گئی؟ پوری پلٹن کیوں نہ بھیجی گئی اور اگر اس کمپنی کو ''استعمال'' نہ کرنا تھا تو یہ کمپنی کیوں بھیجی گئی؟ یہ کمپنی حیاء الدین کی ''حفاظت'' کیلئے بھیجی گئی تھی اور حیاء الدین نے پونچھ کو بھارت کے پاس رہنے دینے کیلئے جنرل گریسی کا ہر حکم ماننا تھا۔ تو مجاہدین حیاء الدین پر حملہ بھی کر سکتے تھے۔ جیسے صدیق ستی نے اس کو حراست میں لینے کا سوچا اور قارئین! اس رات وہ اکیلی کمپنی جو کچھ کر سکتی تھی۔ بعد میں دو بریگیڈ بھی وہ کچھ حاصل نہ کر سکتے تھے۔ جنگیں زمان و مکان کے صحیح استعمال کے تحت لڑی جاتی ہیں۔ لیکن افسوس ہم اپنی کوتاہیوں سے کوئی سبق نہیں سیکھ رہے اور لیاقت علی کے کردار پر دھیان رکھیں۔

پونچھ کو ہم آزاد نہ کرا سکے اب زمان کے لحاظ سے اس محاذ پر ہم نومبر 1948ء میں واپس آئیں گے۔

جب جنوب سے راجوری اور جھنگڑ کے علاقوں کے ساتھ بھارتی رابطہ باندھنے میں کامیاب ہو گئے اور سازش سے ہمیں مینڈھر کی وادی سے بھی باہر پھینک دیا گیا۔ اب تیسرے کوٹلی، جھنگڑ اور راجوری سیکٹر میں چلتے ہیں جو جنوری 1948ء میں تو ایک ''خاموش'' سیکٹر نظر آتا تھا لیکن یہ سب سیکٹروں سے وسیع سیکٹر تھا اور اکبر خان طارق اس سیکٹر میں بہت کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن وہ کچھ تب ہو سکتا کہ ہم شمال میں پونچھ کو آزاد کرا لیتے جس میں ہم مارچ 1948ء میں بری طرح ناکام ہوئے اور جنوب میں نوشہرہ کو آزاد کرانا تھا جو چوتھا سیکٹر تھا۔ فی الحال بہت اختصار سے اس تیسرے سیکٹر کی زمینی اور فوجی اہمیّت اور اس سلسلہ میں اکبر خان کی تجاویز اور چند ماہ کے واقعات کا ذکر کرتے ہیں کہ ہم اکبر خان طارق کے جن بارہ افسران کو بلانے کا ذکر کر چکے ہیں۔ ان میں ایک میجر محمد اسلم عباسی ایم سی بھی تھے۔ جو اب مغفور و مرحوم ہیں اور اسلام کے عظیم فرزند تھے اور میرے استاد بھی تھے اور یہ استادی اور شاگردی اتنا عروج کر گئی کہ بعد میں ان کو میرے پوتوں کے نانا ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ کوٹلی میں امن تھا۔ دسمبر 1947ء میں جھنگڑ بھی فتح ہو چکا تھا تو میجر اسلم جو بعد میں فوج سے کرنل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ ان کو قبائلی مجاہدین کے ساتھ راجوری کو مرکز بنانے کے احکام ملے۔ راجوری کا علاقہ بڑا زرخیز ہے چاولوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جو بدامنی کی وجہ سے کہیں پہنچائے نہ جا سکے۔ میجر اسلم نے کیپٹن شاہ پال کو سپلائی افسر بنا کر تمام رسد و سامان اکٹھے کئے اور دوسرے محاذوں کے کمانڈروں کو دعوت دی کہ وہ سامان خوراک اپنے مجاہدین کیلئے لے جائیں۔ علاقے کے شرفاء مرزا محمد حسین اور ساری جرال قوم والے اسلام کے عظیم فرزند تھے۔ اور انہوں نے میجر اسلم کی بڑی مدد کی اور گو وہ لوگ فن سپہ گری کی طرف پہلے زیادہ مائل نہ تھے لیکن اسلامی جذبے کی وجہ سے مقامی مجاہدین بھی تیار ہونے شروع ہو گئے۔

فوجی لحاظ سے میجر رحمت اللہ سالاریہ جس نے راجوری کو آزاد کرایا تھا اور یہ ذکر ہو چکا ہے۔ میجر اسلم کا مضبوط دایاں بازو بن گیا اور چنگس کے مقام پر وہ بھارتی بریگیڈ کے نوشہرہ سے راجوری کی طرف پیشقدمی کو روکے

ہوئے تھا۔ ریاستی فوج کے ایک کرنل علی بہادر نے پونی بارکھ سے اندر کی طرف بیڑی پتن اور اکھنور کے درمیان بھارتی سپلائی لائن پر حملے جاری کئے ہوئے تھے۔ میجر اسلم نے اس کو اپنی کمانڈ میں لے لیا۔ مشرق میں میجر اسلم نے مجاہدین کو کیپٹن نوشیروان اور کیپٹن عبدالحق وغیرہ کے ماتحت رام بن اور بانہال تک ضلع اودھم پور میں پھیلایا ہوا تھا کہ جموں سے سری نگر والے راستے پر چھاپے ماریں۔ اور شمال میں تھنہ منڈی، شوپیاں اور پیر پنجال کے وسیع علاقوں کو اپنے نظام میں لے لیا۔ لیکن افسوس کہ اکبر خان کے ہیڈ کوارٹر سے چلے جانے کے بعد اور حکومت کے دریائے چناب کے مشرق میں تمام کارروائیوں کو روک دینے سے ان علاقوں سے جہاد کو تجویز کے مطابق نہ بڑھایا گیا اور فائر بندی سے پہلے بڑے بھیانک اور بھونڈے طریقوں سے سینکڑوں مربع میل یہ علاقے ہم سے بھارتیوں کو دلوا دیئے گئے۔ اس سیکٹر کا چوتھے سیکٹر یعنی نوشہرہ والے سیکٹر کے ساتھ چولی دامن والا ساتھ تھا۔ اور نوشہرہ میں ہماری ناکامیوں کے بعد راجوری دشمن کیلئے تر نوالہ تھی۔ اس لئے اب ہم چوتھے یعنی نوشہرہ سیکٹر کی کہانی بیان کرتے ہیں۔

ہم دسمبر 1947ء کے آخری ہفتہ میں جھنگڑ کی فتوحات اور میجر محمد افضل کی شہادت کا ذکر کر چکے ہیں کہ بھارتیوں کا اتنا جانی نقصان ہوا کہ ان فتوحات یا چند دوسری فتوحات کے اثرات تھے کہ بھارتی کشمیر کے مسئلہ کو اقوام متحدہ میں لے گئے کہ جھنگڑ کی فتح کے بعد مجاہدین، نوشہرہ کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے اور نوشہرہ پر چھاپے مار رہے تھے۔ تو اکبر خان نے ان تمام مجاہدین کو منظم کر کے نوشہرہ کو پانچواں سیکٹر بنا دیا۔ یہاں کافی لشکروں کے کمانڈر کرنل بنے ہوئے تھے۔ تو اکبر خان نے میجر سرفراز کو صلاح الدین کا نام دے کر بریگیڈئر بنا دیا کہ وہ ان تمام لشکروں کی کمانڈ سنبھال کے، بھارتیوں پر نوشہرہ میں دباؤ ڈالے کہ بھارتیوں کے جھنگڑ سے بھاگنے والے ٹوٹے پھوٹے بریگیڈ کو دو پکی پلٹنوں کی کمک پہنچ گئی تھی اور ٹوٹا پھوٹا مہاراجہ کا بریگیڈ بھی وہاں موجود تھا۔ تو بھارتیوں نے بریگیڈئر عثمان کو اس تقریباً چھ پلٹنوں کے بریگیڈ کی کمانڈ سونپ دی۔ جن کے پاس توپخانہ کی بھی تقریباً ڈیڑھ رجمنٹ تھی۔ صلاح الدین نے نوشہرہ سے دس میل دور کلیسان کو اپنا مرکز بنایا اور جو سامان دشمن سے ملا تھا۔ وہ سب لشکروں میں بانٹ دیا اور راجوری محاذ سے غلہ منگوا کر رسد و رسانی کا بندوبست بھی کر دیا۔ سدھن پلٹنوں کا ایک بریگیڈ بنا کر ان کی کمانڈ کرنل شیر احمد کو سونپی جو نوشہرہ کے شمال میں جھنگڑ روڈ کی طرف پیترا دیسر میں متعین کیا کہ راجوری محاذ کے میجر رحمت اللہ سلاریہ سے چنگس کے علاقہ میں رابطہ رکھیں۔ چھوٹے خان آف منگ کو ٹائیں کے علاقہ میں رکھا۔ کشمیرا خان کو بھی نوشہرہ کے نزدیک لایا گیا اور میجر رحمت اللہ کے ماتحت ایک سدھن لشکر کو بھی ان کے ساتھ کر دیا۔ انہی دنوں میجر آفریدی کی ماتحت اورکزئیوں کا ایک لشکر پہنچا تو ان کو کنگروٹ کے نزدیک متعین کیا۔ دیر کے لشکروں کو ریزرو میں رکھا ہوا تھا۔ جنوب میں بھمبر کی طرف سے کلال اور کمان گوشہ کے علاقوں صوبیدار عبداللہ کے ماتحت منگل اور توری مجاہدین کو متعین کیا۔

یہ سب کچھ لکھنے کے مقاصد یہ بھی ہیں کہ ہماری قوم عسکری اور سپہ گری کے معاملات کو سمجھے کہ خالی اعلان کرنے سے جہاد نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے بڑی تیاری اور انتظاموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب زمینی لحاظ سے نوشہرہ نالوں کی وجہ سے بھارتیوں کے لئے بہترین دفاعی پوزیشن مہیا کئے ہوئے تھا۔ طرفین کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ لیکن مجاہدین کے پاس کل 20 مارٹریں تھیں جو انہوں نے دشمن سے چھینی تھیں اور بھارتیوں کے پاس اس

سے تین گنا زیادہ مارٹریں بھی تھیں اور ڈیڑھ رجمنٹ توپخانہ اور بکتر بند گاڑیاں تھیں۔ مجاہدین اس خیال میں تھے کہ چونکہ نوشہرہ کے تین اطراف پر ہمارا قبضہ تھا۔ چوتھی طرف بھی قبضہ کر کے حملے پر حملے جاری رکھ کر جلدی سے جلدی بھارتیوں سے توپخانہ وغیرہ بھی چھین لیا جائے کہ آئندہ مقابلے برابر کے ہو جائیں گے۔ لیکن اکبر خان اور صلاح الدین کو معلوم تھا کہ صرف جذبہ جہاد سے نوشہرہ کو فتح کرنا مشکل ہے' ہم حملہ کر کے اپنا سر پھوڑیں گے اور نقصان اٹھائیں گے۔ ان کے مطابق اب وقت آ گیا تھا کہ کم از کم ایک پکی پلٹن بھارتی پیش قدمیوں کو روکنے کیلئے جھنگڑ روڈ پر آ جائے اور مجاہدین کو اکھنور سے لے کر نوشہرہ تک پھیلا دیا جائے۔ جو بھارتیوں پر اپنی مرضی کے وقتوں اور ہر مرضی کی جگہوں پر حملے کرتے رہیں۔ بلکہ ایسے حملوں کو مزید وسعت دینے کیلئے اکبر خان کرنل سید غواص اور متعدد لشکروں کو ہیڈ مرالہ بھیج چکے تھے اور گزارش کر رہے تھے کہ روپو چک میں کرنل عنایت کیانی کے ماتحت سیالکوٹ کے مشرق میں جو پندرہ ہزار مجاہدین اکٹھے ہو چکے تھے۔ ان سے بھی پٹھانکوٹ اور جموں کے راستوں پر حملے کرائے جائیں۔ تو نوشہرہ کے بھارتی پکے ہوئے پھل کی طرح ہماری جھولی میں گر جائیں گے بلکہ جو مجاہدین بچ جائیں' ان کو ضلع اودھم پور کے علاقوں رام بن اور بانہال میں بھیج کر یہی کچھ جموں اور سری نگر روڈ پر کیا جائے کہ بھارتی ہمارے جال میں پھنس چکے ہیں۔ ہم ان کو تہس نہس کر دیں۔

ان عملی تجاویز کو ہم اپنی قوم کو فوجی اصولوں اور اصطلاحوں کی مدد سے بہتر طور پر سمجھائیں گے کہ فن جنگ میں جو Exterior Lines یعنی باہر نکل کر لڑنے کی مشکلات اور Interior Lines اندرونی طاقت کے صحیح استعمال کے سلسلہ میں سب فلسفہ اور حکمت کے سہرے اٹھارہویں' انیسویں صدی کے جرمن کلاسیوٹز کو باندھے جاتے ہیں۔ دراصل اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے جنگی اصولوں اور حضور ﷺ پاک کی سنت کے ذریعہ سے ہمیں اتنا کچھ سمجھایا ہے کہ میری کتابیں ان اصولوں اور کارروائیوں یا اعمال سے بھری پڑی ہیں کہ ہجرت سے لے کر جنگ خندق تک قریش مکہ کے Exterior Lines پر ہونے کے مشکلات کا ہمارے آقا ﷺ نے جو Interior Lines سے اپنی کم طاقت کے باوجود کفار کے ساتھ جو توازن پیدا کر لیا۔ اور پھر خود آپ ﷺ نے Exterior Lines کو بہتر طور پر استعمال کیا۔ ہم نے ان جنگی اصولوں' تدبیرات یا تعزیرات کے سلسلہ میں کسی سے کچھ نہیں سیکھنا۔ سب کچھ ہمارے پاس قرآن پاک اور سنت نبوی ﷺ میں موجود ہے۔ اور یہ 48-1947ء کا کشمیر کا جہاد اس سلسلہ میں بڑی ہی عملی مثال تھی کہ بھارتی Exterior Lines پر تھے اور ہم Interior Lines پر۔ جہاں ہم نے ان اصولوں کو صحیح طور پر نہ استعمال کیا اور ہم گھاٹے میں رہے کہ اس سلسلہ میں پہلی غلطی ہم نے یہ کی کہ پٹھانکوٹ سے جموں تک کی سڑک کو کاٹنے کی کوئی کوشش نہ کی تو جموں کا مستقر بھارت کی Interior Lines کا حصّہ بن گیا۔ اب اگر ہم جموں سے نوشہرہ کے علاقے تک اپنی Interior Lines کا صحیح استعمال نہ کریں گے اور نہ کیا تو نوشہرہ بھی بھارت کی Interior Lines کا حصّہ بن جائے گا اور بن گیا کہ اسی راستے اور اوڑی کے مقابلہ میں بہت لمبے راستے سے بھارتیوں نے نومبر 1948ء میں پونچھ کے ساتھ رابطہ بھی قائم کر لیا۔ لیکن اگر جنوری 1949ء میں بھارتی فائر بندی نہ کراتے تو صرف کشمیر ہی میں وہ لوگ نوشہرہ سے پونچھ تک Exterior Lines پر کام کر رہے تھے اور آزاد کشمیر کے مجاہدین' ان علاقوں میں بھارتیوں کی ایسی تیسی کرتے

رہتے اور معاملات وسعت بھی اختیار کر جاتے کہ ہم پٹھانکوٹ سے جموں اور جموں سے اکھنور اور اکھنور سے نوشہرہ کے راستوں پر کسی بھی جگہ حملوں میں اپنی بہتر چنی ہوئی جگہوں پر حملے کر کے بھارت کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن سازش اتنی گہری ہے کہ ستمبر 1965ء کی جنگ میں بھی ہم نے اپنی اس برتری کا فائدہ نہ اٹھایا اور یہ عاجز جنوری 2003ء کے اپنے مضامین میں یہ رونا رو چکا ہے اور 1971ء میں تو اور زیادہ جہالتیں کیں۔ جو مضامین بعد میں لکھے جا سکتے ہیں۔

جموّں کو ہم نے چھوڑ دیا، جموّں ہم کو کہیں کا نہ چھوڑے گا

تو قارئین! سیالکوٹ سے بھی مجاہدین پر ''جھاڑو'' پھیر دیا گیا۔ ہیڈ مرالہ سے بھی مجاہدین کو نکال دیا گیا اور اکھنور سے توبیڑی پتن کے علاقوں کے خلاف بھی کارروائیاں روک دیں کہ راجوری میں میجر اسلم کو حکم دیا کہ کرنل علی بہادر کو بھی پونی بارکھ سے واپس بلایا جائے اور محمد زمان کیانی اخباروں میں بیان دے گیا کہ چودھری محمد علی اس کو حکم دے گیا کہ خبردار دریائے چناب کے مشرق میں کوئی کارروائی نہ کرنا کہ ہمارے انگریز جنرلوں نے ہماری حکومت کو بے وقوف بنایا ہوا تھا۔ یا لیاقت علی خود اس سازش کا حصہ تھا۔ تو کشمیر کے آئندہ ہونے والے واقعات کو تو اس عاجز نے ایک پیرا میں بیان کر دیا۔ اب مجاہدین کو ایک طرف بھارتی سورماؤں سے مار دلائی جا رہی تھی اور یہ عاجز ان پکے فوجیوں میں شامل تھا۔ جن کو توپخانہ کی امداد کے بغیر کشمیر کے جہاد میں شرکت کرنا پڑی اور غلط وقت اور غلط جگہوں پر فوج کو استعمال کر کے بھارتی سورماؤں کا مورال بڑھانا تھا۔ جنہوں نے اس زمانے میں بھی راقم سمیت پروٹیسٹ کیئے یا بعد میں بھی پروٹیسٹ کرتے رہے۔ تو میرے جیسے جونیئر لوگوں کو ایڈورس رپورٹ پر رکھ دیا اور کچھ کو بعد میں راولپنڈی سازش کے مقدمہ میں دھر لیا گیا کہ ''ایجنٹ پرووکیٹر'' بھی پیدا کیئے اور کچھ لوگ شاہد یا گواہ بن جانے کیلئے استعمال ہوتے رہے۔

جب مجاہدین کیلئے کسی اور جگہ ''شکار'' موجود نہ تھا۔ تو آخر وہ کتنے دن نوشہرہ کے گرد ''بندھے'' بیٹھے رہتے لوگوں نے ''کھسکنا'' شروع کر دیا۔ ادھر بھارتی بریگیڈیئر عثمان کو احکام ملے ہوئے تھے کہ اس نے 15 فروری سے پہلے جھنگڑ کو فتح کرنا ہے اور اس نے 31 جنوری سے مجاہدین پر سخت حملے شروع کیئے ہوئے تھے کہ جنوب میں کلال کے علاقوں اور شمال میں ٹھنڈ کے اور ٹائیں کی طرف کچھ کامیابیاں بھی حاصل کر لی تھیں۔ لیکن صلاح الدین نے 6 فروری کو ایک نہایت اعلیٰ پایہ کی تجویز سے کہ ساری کارروائی 5/6 رات کی چاندنی میں کرنا تھی اور پو پھٹنے پر محاذ سے خاموشی سے حملے کیئے کہ ویسے ایسی کارروائی کیلئے پورے ایک ڈویژن کی ضرورت تھی۔ پوری تجویز اور واقعات تفصیل سے میری کتاب جہادِ کشمیر میں موجود ہیں کہ دوپہر تک مجاہدین نے آدھے نوشہرہ پر قبضہ کر لیا اور کچھ مقامات پر بھارتی توپوں کہ اتنے نزدیک پہنچ گئے کہ اپنی مارٹروں سے فائر کر کے ان توپوں کو کارروائی کیلئے ناکارہ کر دیا اور دشمن ان توپوں کو جہاں لڑائی میں لے جانا چاہتا تھا۔ اس طرف سے مجاہدین نے بھارتی کمکوں کی آمد کی جو ناکہ بندی کی ہوئی تھی۔ لیکن اس پوزیشن پر مجاہدین زیادہ نہ ٹھہر سکتے تھے۔ اس جنگ میں دشمن کا بے پناہ نقصان ضرور ہوا یہ عاجز اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ میجر سرفراز جنہوں نے صلاح الدین کا نام اپنایا ہوا تھا مردان کے پٹھان تھے اور شروع 1951ء میں ہم دونوں نے جہلم میں کچھ دن اکٹھی نوکری کی تھی کہ انہی دنوں میں راولپنڈی سازش مقدمہ میں جنرل اکبر طارق گرفتار ہو چکا تھا اور میجر سرفراز کو بھی خطرہ تھا کہ ان کو بھی شاید گرفتار کر لیا جائے

کہ وہ مجھے بتاتے تھے کہ نوشہرہ کی اس آدھی عظیم فتح سے نتائج حاصل کرنے کیلئے صرف ایک پلٹن اور دو پہاڑی توپوں کی مدد کی ضرورت تھی کہ جو اہم علاقے ہم نے دشمن سے چھین لئے تھے۔ وہاں پکی پلٹن دفاع لیتی اور مستقر بناتی۔ تو ہم مجاہدین آگے نکل کر یا دائیں بائیں سے آ کر نوشہرہ توی کی دوسری طرف بھارتی پوزیشن کو تہس نہس کر دیتے کہ اس پوزیشن کیلئے گہرائی نہ تھی کہ دشمن توپیں ہمارے سامنے سے نکال کر وہاں لے جاتا۔ لیکن بیڑی پتن کے راستے اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ دشمن کو جو مدد پہنچ رہی تھی وہ عارضی طور پر بند تھی کہ ہوائی جہاز جو کچھ گراتے اس میں سے کچھ مجاہدین کے ہاتھ لگ جاتا اور نوشہرہ کی مدد کو جو راستہ مجاہدین نے روکا ہوا تھا۔ اگر کوئی مضبوط بھارتی کمک پہنچ جاتی تو وہاں مجاہدین ایک یا دو دن سے زیادہ یہ رکاوٹ قائم نہ رکھ سکتے تھے۔

میجر سرفراز نے بتایا کہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کیلئے 9/8 فروری رات کو وہ خفیہ طور پر نوشہرہ سے نکل کر 9 فروری طارق ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا اور اکبر خان سے ملاقات کی۔ اکبر خان خود مایوسی کی حالت سے طارق ہیڈ کوارٹر سے جا رہا تھا اور بریگیڈئر شیر خان کو یہ اضافی ذمہ داری دی جا رہی تھی۔ اکبر خان نے شیر خان کے ذریعہ سے جنرل گریسی کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر سرفراز کی ایک پلٹن اور دو توپوں سے مدد نہیں کی جاتی تو آج سے وہ طارق ہیڈ کوارٹر میں کام بند کر دے گا۔ لیکن جنرل گریسی وغیرہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا کہ وہ تو کب سے اکبر خان سے ''چھٹکارا'' چاہتے تھے تو میں یعنی میجر سرفراز نے بھی احتجاجاً صلاح الدین ہیڈ کوارٹر کی سربراہی سے استعفیٰ دے دیا تو میجر رحمٰن گل (بعد میں جنرل اور سندھ کے گورنر اور اب مرحوم) کو میرے ساتھ نوشہرہ کی کمانڈ مجھ سے لینے کیلئے بھیج دیا گیا۔ حالانکہ رحمٰن گل نے مارچ کے پہلے ہفتہ سٹاف کالج کوئٹہ کورس کیلئے پہنچنا تھا۔ رحمٰن گل نے حالات کا مطالعہ کیا تو اس نے میجر سرفراز کی ہر بات سے اتفاق کیا اور مجاہدین جہاں پہنچ چکے تھے' اس حالت میں وہ صرف ایک ہفتہ رہ سکے کہ بھارتیوں کو کمک اور مزید توپیں بھی پہنچ گئیں کہ کمکوں کا راستہ بند نہ کیا ہوا تھا اور رات کے اندھیرے میں مجاہدین کے سامنے والی توپوں کو بھی بھارتی گہرائی میں لے گئے اور ہمارے مجاہدین جو محدود علاقے میں اکٹھے تھے ان پر توپوں اور ہوائی جہازوں سے ایسی بمباری شروع کر دی اور میجر سرفراز کے چارج دیتے دیتے رحمٰن گل کو مجاہدین کو حملہ سے پہلے والے پوزیشنوں پر واپس لانا پڑا۔

جب اکبر خان نے مجاہدین کو منظم کر کے ذمہ داریاں دینا شروع کیں تو اکبر خان کے خلاف کچھ ''چھپے ہاتھوں'' نے مہم شروع کر دی، کہ وہ جنوری 1948ء میں آس نے تجویز دی کہ بھارت دو سے زیادہ ڈویژن فوج کشمیر میں جھونک چکا ہے مجھے کشمیر کے جہاد میں بھارتیوں کے ساتھ طاقت کا توازن پیدا کرنے کیلئے کم از کم دو بریگیڈ فوج کی ضرورت ہو گی اور اب بھارت پاکستان پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تو میرے خلاف اور کہانیاں گھڑی گئیں کہ میں پاکستانی فوج کا آپریشنل کنٹرول سنبھالنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے CMA سے ایک خط ملا کہ تم فوج سے بغیر چھٹی کے غیر حاضر ہو تو میں چپ کر گیا کہ شاید یہ آڈٹ کی ضرورت ہو گی لیکن جب تنخواہ کی سلپ ملی تو اس میں صرف تنخواہ تھی میری کمانڈ یا سٹاف پے پیچ سے کاٹ لی گئی تھی' میں پھر بھی چپ رہا لیکن معلوم ہوا کہ مجھ سے دو جونیئر کرنل شاہد حامد اور کرنل ایم اے لطیف جن کا ''گنگا جمنی'' ہونے کی وجہ سے لیاقت علی کے ساتھ ''رابطہ'' تھا۔ میرا نمبر کاٹ کر ان کو بریگیڈئر بنایا جا رہا ہے بلکہ مجھ سے بہت جونیئر محمد موسےٰ کے بارے

بھی افواہ تھی کہ وہ بریگیڈئر بن رہا ہے تو میں نے وزیراعظم لیاقت علی کے ساتھ جب بات کی تو معلوم ہوا کہ اس کو سب کچھ معلوم تھا اور یہ اس کی مرضی سے ہو رہا تھا کہ وہ کہنے لگا کہ میں جس جگہ کام کر رہا ہوں یہاں پر موشن نہیں مل سکتا۔ مجھے اپنے پکے عہدہ پر رہنا ہوگا اگر میں بریگیڈئر بننا چاہتا ہوں کہ کسی بریگیڈ کی کمانڈ سنبھال لوں یعنی اس کے "مشاورت" کے عہدے کو اپ گریڈ نہیں کیا جا سکتا۔

قارئین! بریگیڈئر اس زمانے میں بہت بڑا عہدہ تھا۔ پاکستانی میجر جنرل کے عہدے پر صرف پانچ صاحبان تھے تو کرنل اکبر طارق کو کوہاٹ کا بریگیڈ کمانڈر بنا دیا گیا اور یکم فروری سے جہاد کی باگ ڈور جنرل گریسی اور میجر جنرل ہٹن کو جو دے دی گئی تھی اور اب بریگیڈئر شیر خان ڈائریکٹر ملٹری آپریشن اکبر خان سے یہ اضافی ذمہ داری لے رہا تھا کہ اکبر خان نے 9 فروری کو ہی احتجاجاً طارق ہیڈ کوارٹر کا کام کرنا چھوڑ دیا۔ شیر خان اور اکبر خان کی شخصیتوں کا موازنہ کا مضمون کئی صفحات میں ختم نہیں ہوتا کہ یہ عاجز دونوں صاحبان کو 47-1946ء دہلی کے فوجی ہیڈ کوارٹر کے وقت سے جانتا تھا۔ اختصار سے گزارش ہے کہ اکبر خان عملی طور یا ذہنی طور پر تو اسلام کی طرف زیادہ مائل نہ تھا لیکن اس کو اپنی مسلمان قوم اور مسلمانی پر ضرور فخر تھا۔ وہ ایک عزت مند پٹھان اور پاکستانی تھا۔ فوجی فراست میں وہ محمود غزنوی علاؤ الدین خلجی اور شیر شاہ سوری کے پایہ کا آدمی تھا۔ افسوس ہم اس کی فوجی فراست سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ بریگیڈئر شیر خان ایک رحم دل قسم کا مسلمان آدمی تھا جو اول مسلمان تھا اور بعد میں پاکستانی یا پٹھان۔ وہ مذہب کی طرف بھی کچھ مائل تھا۔ میرے ایک اور کرم فرما کرنل سلطان علی شاہ البتہ نے اپنی کتاب "شامتِ اعمال ما" میں شیر خان کو انگریزوں کا پروردہ اور ابن الوقت آدمی قرار دیا ہے بلکہ اس شک کا بھی اظہار کیا ہے کہ شاید شیر خان قادیانی تھا۔ یہ شاید اس وجہ سے ہو کہ شیر خان کا چھوٹا بھائی اس زمانے کا میجر شیر بہادر اور بعد میں لیفٹیننٹ جنرل کی بیوی قادیانی تھی۔ لیکن بعد کے واقعات ہیں کہ ان دونوں کا نباہ نہ ہوا۔ مجھے شیر خان ہمیشہ ایک مخلص مسلمان کے طور پر بہت متاثر کرتا رہا اور میرے خیال میں وہ مصلحت کے طور انگریزوں کے ساتھ "گزارا" کرتا رہا اور ان کے جانے کے بعد وہ بہتر حالات کا امیدوار تھا۔ ویسے جنرل گریسی شیر خان کو بہت پسند کرتا تھا اور اس کی تعریف بھی کرتا تھا اور مجھے کہتا تھا کہ ہم جونیئر لوگ اس کو اپنا Ideal بنائیں لیکن شیر خان نجی مجلسوں میں ہمیں یہ نصیحت کرتا تھا کہ "ان انگریزوں کے اپنے مقاصد ہیں۔ ہم چوکنے رہ کر ان کے ساتھ گزارا کریں۔"

اکبر خان کی طارق ہیڈ کوارٹر سے "چھٹی" کے بعد جنرل گریسی نے فروری 1948ء کے دوسرے حصے میں سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جتنے مجاہدین سیالکوٹ کے ایریا میں ہیں ان کو ان کے گھروں میں بھیج دیا جائے۔ سیالکوٹ کے معاملات حکومت کیلئے بھی مسئلہ بنے ہوتے تھے اور اخباروں میں کبھی کچھ آ جاتا کہ سیالکوٹ کی طرف سے کوئی محاذ کیوں نہیں کھولا جاتا تو لیاقت علی نے جس فوجی چھاؤنی کو وزیراعظم کے طور پر پہلی دفعہ معائنہ کیلئے چنا وہ سیالکوٹ چھاؤنی تھی اور یونٹ ہمارا سولھواں پنجاب سنٹر تھا جس کے کرنل ہوبرٹ نے غلام کذاب قادیانی کے پوتے ایم ایم احمد سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر کے ساتھ مل کر سیالکوٹ محاذ نہ کھلنے دیا تھا۔ سیالکوٹ کی سرحد سے پندرہ میل دور بھارتی فوجوں کی کنوائیاں گزر رہی تھیں جو ایک طرف وادی کے مسلمانوں کو اپنی غلامی میں لے رہے تھے دوسری طرف جموں سے نوشہرہ یعنی جنوبی اور مرکزی کشمیر کے مسلمانوں کو غلام بنانے کیلئے رواں دواں

رہتے تھے۔ جموں میں قتل عام شروع تھا۔ ہم ان کے دکھ میں بھی شریک نہ ہوئے۔ چودھری غلام عباس بھی جموں کے تھے اور ان کا دایاں بازو اللہ رکھا ساغر کا تعلق بھی جموں سے تھا۔ اللہ رکھا ساغر میرے ذاتی دوست تھے۔ انہوں نے جہاد کشمیر کتاب کے سلسلہ میں میری بڑی مدد کی تھی۔ لیاقت علی اکبر خان کی قبائلی مجاہدین کو وہاں سے کام کرانے کی پیشکش ٹھکرا چکے تھے اور اکبر خان بار بار کہتا تھا ''جموں کو ہم نے چھوڑ دیا جموں ہم کو کہیں کا نہ چھوڑے گا'' سیالکوٹ چھاؤنی میں تین ٹریننگ سنٹروں نے کام شروع کر دیا تھا اور صوبہ سرحد سے چار پلٹن سیالکوٹ چھاؤنی پہنچ گئی تھیں اور سیالکوٹ ملک کی سب سے بڑی چھاؤنی بن چکی تھی۔ جموں سے آئے مہاجرین جب فوجیوں کو ملتے تھے تو طعنے دیتے تھے کہ ''تم نے ہماری مدد نہ کی'' سیالکوٹ کے لوگ اور جو مجاہدین وہاں اکٹھے تھے وہ بھی فوجیوں کو طعنے دیتے تھے کہ نہ ان کو جموں محاذ کھولنے دیا اور نہ فوجی خود کچھ کرتے ہیں لیکن انگریزوں کی پالیسی یہ بھی تھی کہ سیالکوٹ چھاؤنی میں نومبر کے پہلے ہفتے تک ہندو وسکھ فوجی رکھے ہوئے تھے اور کہتے تھے خبردار ادھر سے کچھ نہ کرنا ورنہ دونوں ملکوں کی فوجوں کی لڑائی ہو جائے گی پھر جو فوجی آ رہے تھے ان میں غلام کذاب کے پوتے کرنل داؤد کی یونٹ پندرھویں پنجاب اور اختر ملک، عبدالعلی ملک وغیرہ قادیانیوں کی سولھویں پنجاب کئی یونٹوں پر قادیانیوں کے اثرات تھے۔ اور ان میں کافی لبرل لوگ تھے جو انگریز جنرلوں کے ''پروردہ'' تھے کہ کرنل سلطان علی شاہ جو اسلام کا عظیم فرزند تھا وہ اپنی کتاب ''شامت اعمال ما'' میں لکھتا ہے کہ اس کی یونٹ سیالکوٹ جانے لگی تو ان کو ڈیرہ اسماعیل خان تبدیل کرا دیا۔ اس نے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر (بعد میں جنرل) ناصر علی سے انٹرویو مانگا تو اس نے کہا ''تم سیالکوٹ نہیں جا سکتے تم وہاں گئے تو بھارت اور ہماری لڑائی کرا دو گے''۔

تو لیاقت علی نے سیالکوٹ کے خود دورہ کرنے سے پہلے مرکزی وزیر راجہ غضنفر علی کو ایک دفعہ اور صوبائی وزیر ممتاز دولتانہ کو کئی دفعہ سیالکوٹ بھیجا کہ لوگوں کو ''ٹھنڈا'' کریں۔ یہ آزادی کے بعد ہم فوجیوں کو بھی احکام ملے تھے کہ ان وزیروں کی سول میٹنگوں میں کچھ ''رابطہ افسروں'' کو بھیجا جائے اور راقم ہر جگہ ایسے ''رابطوں'' کیلئے جاتا تھا تو اب لیاقت علی خود آیا کہ حالات کا مطالعہ کرے۔ تو نہ صرف سویلین آبادی بلکہ فوجی لوگوں نے آگے سے بڑا سخت رویہ اختیار کیا۔ لیاقت کے ساتھ اس وقت کے ملک کے چوٹی کے اخبار نویس میاں محمد شفیع اور ممتاز احمد وغیرہ کے علاوہ متعدد صحافیوں کو کرنل مجید ملک لے آیا تھا تو ان کے سامنے بھی لوگوں نے سخت شکایات کیں کہ اگر باقی جگہوں سے مجاہدین کشمیر میں داخل ہو سکتے ہیں تو سیالکوٹ سے ایسا کیوں نہیں ہو سکتا اور لیاقت کو رپورٹ ملی کہ فوج والے اس سے سخت نالاں ہیں تو لیاقت علی سازش کی کڑی تھا یا انگریزوں کے اس پر ''اثرات'' تھے۔ میں صرف واقعات اور عملی پہلوؤں کا ذکر کروں گا خود اپنی رائے نہ دوں گا کہ چند دن بعد سیالکوٹ میں چھ فٹ دراز قد والا لمبا چوڑا پاکستان کا پہلا بریگیڈیئر سیالکوٹ پہنچا جس کی چھاتی پر ''وار میڈل اور انڈیا سروس میڈل'' صرف دو ''تکمیاں'' تھیں کہ ہم جیسے جونیئر لوگ بھی پانچ چھ تمغوں کی پٹڑیاں لگائے پھرتے تھے۔ یہ بریگیڈیئر ہمارے پیچھے پڑ گیا اور سیالکوٹ چھاؤنی کو ایک امن پسند چھاؤنی بنانے کیلئے اینٹیں چونا گیری اور پھول لگانے کی جو مہم شروع کی اور جس سختی سے ہمیں امن کے زمانے کی تربیتوں پر لگا دیا اور جس سختی سے ہمارے ساتھ پیش آتا تھا ایسی سختی نئے رنگروٹوں کے ساتھ ڈرل اِنسٹرکٹر ہی کرتے ہیں اور ہمیں ڈرا دیا اور چند دن بعد چھاؤنی کے سب آفیسران اور سرداروں کو

چھاؤنی کی سینما ہال میں اکٹھا کر کے بڑی سخت تقریر ''جھاڑ'' دی کہ سب لوگ سہم گئے۔ پھر کہنے لگا ''کچھ سر پھرے لوگ کہتے ہیں کہ جموں محاذ کیوں نہیں کھولا جاتا؟ ہم بھارت کے ساتھ لڑائی نہیں لڑ سکتے اس کی فوج ہمارے سے تین گنا ہے وغیرہ۔

سوالوں کی اجازت دی تو کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ کوئی سوال پوچھے۔ صرف یہ عاجز کھڑا ہو گیا اور عرض کی کہ ہم لڑائی نہیں لڑ سکتے تو فوج کو توڑ دیا جائے'' کہ مجھے بھی میرے ساتھیوں نے پکڑ کر بٹھا دیا کہ ''پاگل'' کے ساتھ کیوں متھا مارتے ہو' اور میری بات بھی شاید آدھے لوگوں نے سنی کہ میں غصے سے کانپ رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد بھی نہیں کہ کہیں کچھ اور بھی کہا۔

بہرحال چند دن بعد میری وہاں سے راہوالی میں تبدیلی ہو گئی اور دو اڑھائی ماہ بعد ان بریگیڈیئر افتخار خان کو میجر جنرل بنا کر ہمارے لاہور ڈویژن کا کمانڈر بنا دیا گیا۔ فروری 1947ء میں انہی صاحب کو اس عاجز نے جی ایچ کیو دہلی ہی میں میجر دیکھا تھا اور اس سے جونیئر حیاء الدین اور شیر علی فل کرنل تھے اور اکبر خان و شیر خان لیفٹینٹ کرنل۔ اب ان صاحب کی پرانی سنیارٹی کے کاغذات نکال کر ان سے اب اہم کام لینا تھا کہ ان کی جگہ سیالکوٹ میں' ایران میں انگریزوں کی خفیہ سروس میں لمبا کام کرنے والے کرنل موسیٰ کو بریگیڈیئر بنا کر تعین کیا جا رہا تھا جو ستمبر 1965ء میں ہماری بری فوج کا کمانڈر تھا اور اس کی کارکردگی پر یہ عاجز نوائے وقت میں بہت کچھ لکھ چکا ہے۔ اب فروری' مارچ 1948ء میں ان دونوں جنرل افتخار اور بریگیڈیئر موسیٰ نے سیالکوٹ میں مجاہدین کی ''بیخ کنی'' کر دی۔ روپوچک کے گرد و نواح میں پندرہ ہزار سے بڑھ کر مجاہدین کی تعداد پچیس ہزار ہو گئی تھی۔ کرنل عنایت جان کیانی کو حکم دیا کہ ان سے رائفلیں اور بارود لے کر ان کے گھر بھیج دیا جائے۔ اور ان مجاہدین کو کسی اور جگہ لڑنے کی دعوت نہ دی جائے۔ کشمیر کا مقدمہ اقوام متحدہ میں پہنچ گیا ہے اور ہر جگہ جہاد کو ڈھیلا کیا جا رہا ہے۔ ہیڈ مرالہ سے سید غواص کی برق فورس' کیپٹن گل خان اور کیپٹن حمید کے ماتحت وہاں پہنچے احمد زئی' اتمان زئی' وزیر داوڑ' محسود سب قبائلی مجاہدین کو اپنے علاقوں میں واپس کر دیا۔ اسی افتخار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے پاکستانی فوج کا پہلا کمانڈر انچیف بننا تھا۔ خیر یہ تو غلط بات ہے کہ راقم اس غلط خبر کے پھیل جانے کا چشم دید گواہ ہے کہ سیالکوٹ میں جنرل گریسی نے ہوائی جہاز کے حادثہ جس میں افتخار اور شیر خان ہلاک ہوئے کے بارے کہا کہ ان میں ایک پاکستانی فوج کا مستقبل کا کمانڈر انچیف تھا تو اخباروں نے اپنی طرف سے افتخار کا نام لکھ دیا۔ جنرل گریسی نے اس خبر کو ناپسند کیا کہ اس کا مطلب شیر خان سے تھا۔ پہلا نہیں بلکہ دوسرا کمانڈر انچیف اور مجھے حکم دیا کہ راولپنڈی جا کر سب اخباروں کے تراشے اس کے سامنے پیش کئے جائیں۔ وہ ہمیں مزید ہدایات دیں گے۔

اس عاجز نے حکم مانا لیکن گریسی اب اور ''چکروں'' میں پڑ چکا تھا کہ وہ خود پاکستان میں زیادہ ٹھہر جائے گا اور مجھے کہا کہ خاموش ہو جائیں۔ کسی مرے ہوئے کے لئے کچھ اچھی بات شائع ہو جائے تو تردید نہیں کرنا چاہیئے۔

ایک مُسلمان بھی بھارت کا قیدی بننے کو تیار نہ تھا

قارئین! ہماری قسمت کہ ہمارے ''بڑے لوگوں'' میں کیسے کیسے لوگ تھے۔ یہ تو ہمیں بہت بعد میں معلوم ہوا کہ افتخار خان کا سیالکوٹ کا خطاب ''ہز ماسٹر وائس'' تھا کہ یہی ''لوری'' جنرل میسروی اکتوبر 1947ء میں جی ایچ

کیو میں سب افسروں کو دے رہا تھا کہ پاکستان بھارت کے ساتھ جنگ نہیں لڑ سکتا تو لکھ کر صرف اکبر خان طارق نے پروٹیسٹ کیا۔ بہرحال جو کچھ افتخار خان اور موسیٰ نے کیا بھارتی اس کا پٹھانکوٹ سے جموں تک تو پہلے بھی فائدہ اٹھا رہے تھے کہ دوسرے درجہ کی ایک مدراس پلٹن ...... اکیلی اس سارے لمبے چوڑے راستے کی حفاظت پر مامور تھی۔ اب جو جموں محاذ کے سامنے سے بڑی حد تک مجاہدین کا صفایا کیا' تو پانچ پلٹون کا ایک بھارتی بریگیڈ جو اس لمبے چوڑے علاقے کی حفاظت کر رہا تھا۔ اس کو فارغ کر کے یہ حفاظت کا کام ایک دوسرے درجہ کی بہار پلٹن کے سپرد کر دیا گیا۔ دریائے چناب کے مشرق میں ہماری کارروائیوں کے ختم ہونے کی وجہ سے وہاں بھی حفاظتی کام دوسرے درجہ کے فوجیوں کے سپرد کر کے کچھ امداد بر ینگر محاذ پر بھیجی جو ذکر ہم بعد میں کریں گے اور نوشہرہ میں بھارتیوں کے ایک پورے ڈویژن نے اس محاذ کی ذمہ داری لے لی اور میجر جنرل کلونت سنگھ ان کا کمانڈر بن گیا۔ جن کو حکم ملا کہ فروری کے تیسرے یا زیادہ سے زیادہ آخری ہفتہ تک یہ لوگ جھنگڑ کو فتح کریں۔ قارئین! ذرا اندازہ لگائیں کہ ہمارے انگریز جنرل کس طرح مجاہدین کو باندھ کر محدود کر رہے تھے۔ اور بھارتی فوج آزادہ علاقوں میں پیش قدمی کر رہی تھی۔

اس نوشہرہ۔ جھنگڑ محاذ کا ہمارا کمانڈر میجر رحمٰن گل (بعد میں جنرل) بھی راقم کا مہربان رہا اور سرکاری ریکارڈ یا بھارتیوں کی تاریخ کے مطالعہ یا رحمٰن گل کی 1990ء کے پشاور میں کھری کھری باتوں کے مطابق بھارتی یہ کام تین مرحلوں میں 18 مارچ تک کر سکے۔ حالانکہ ہمارے مجاہدین نے جھنگڑ کی فتح کے 24 گھنٹوں کے اندر نوشہرہ پر وار کرنے شروع کر دیئے تھے۔ نوشہرہ کے حملہ کی ناکامی کی وجہ سے مجاہدین ''کھسکنے'' شروع ہو گئے تھے لیکن رحمٰن گل نے اپنی کمزوری بھارتیوں پر ظاہر نہ ہونے دی اور اوپر والوں کو خبر دی کہ دو پلٹن پکی فوج اور توپخانہ کی ایک بیٹری مدد کے لئے بھیج دو تو پورے بھارتی ڈویژن کو دو ہفتوں میں تہس نہس کر دیں گے۔ یہ نہیں کر سکتے تو ایک پکی پلٹن بھیج دو اور چند توپیں۔ تو وہ دشمن کو جھنگڑ فتح نہ کرنے دیں گے۔ اب جی ایچ کیو نے ساتویں ڈویژن کے کمانڈر میجر جنرل ٹاٹھم کو کشمیر کے جہاد کی ذمہ داری دے دی تھی۔

مجاہدین کو سہارا دینے کیلئے وہ فوج کو استعمال کر سکتا ہے تو اس نے بریگیڈئر محمد اعظم (بعد میں جنرل) کے بریگیڈ سے دو پلٹنوں 8 پنجاب اور 13 پنجاب کو کشمیر میں داخل کرا دیا لیکن ان کے استعمال کی اجازت نہ دی تو بھارتیوں نے 16 فروری 1948ء سے ہی نوشہرہ سے آگے بڑھنا شروع کر دیا اور 20 فروری کو ایک بھارتی بریگیڈ نے ڈھنڈ کے کے علاقہ پر حملہ کر دیا۔ کرنل محمود نے تو اپنے علاقے کے حملہ کو پسپا کر دیا لیکن کشمیرا خان کے قبائلیوں نے کچھ زمین چھوڑ کر جنوب کا رُخ کیا اور بھارتیوں نے کچھ زمین پر قبضہ کر لیا اور اس کا فائدہ اٹھاتے 25 فروری کو دوسرا حملہ کیا۔ جہاں کچھ دست بدست لڑائی بھی ہوئی اور بھارتی حملہ ناکام ہو گیا تو اس بریگیڈ کو چوتھی پلٹن دی گئی اور بکتر بند دستوں اور پورے ڈویژن کے توپخانہ کی مدد سے 29 فروری، کمان گوشہ اور سگانہ گلی کی اہم پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔ اب رحمٰن گل سے کمانڈ میجر اسحاق نے لے لی جو آج سے چند سال پہلے وفات پا چکے ہیں اور بریگیڈئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ بڑے مخلص انسان اور میرے بڑے عظیم دوست تھے لیکن جس دن انہوں نے کمانڈ لی بھمبر محاذ اور جھنگڑ محاذ الگ الگ ہو چکے تھے اور راجوری محاذ کے رحمت اللہ کا بھی جھنگڑ محاذ والوں

سے رابطہ ٹوٹ چکا تھا تو بھارتیوں نے ہر محاذ پر الگ الگ وقتوں میں کارروائیاں کیں اور یکم مارچ سے سارا زور جھنگڑ محاذ پر میجر اسحاق کے خلاف لگا دیا کہ ڈھنڈ کے کے علاقہ پر قبضہ کر لیا تو میجر اسحاق کو اپنا مرکز کلسیاں سے نکال کر پہلے بوہانی لانا پڑا اور پھر جھنگڑ کے نزدیک متلاشی پہاڑی پر۔ بھارتیوں نے جب ٹائیں دھار، اور ٹانڈا پر دوطرفہ حملہ کر کے قبضہ کر لیا تو دیریوں نے جوابی حملہ تلواروں کی مدد سے کیا لیکن بھارتیوں کو بچاؤ کرنا آ گیا تھا کہ وہ اپنا سر مورچوں میں کر لیتے تھے۔ پہلے جو بھارتی ،تلواروں سے کاٹے جاتے تھے وہ دیریوں کا مقابلہ کرتے مارے جاتے تھے لیکن دیری چلتے چلتے تلوار زنی کرتے گزر جاتے تھے تو جس کا سر مورچہ میں ہوتا وہ بچ جاتا تھا۔

اب میجر اسحاق کوئی معجزہ تو کر نہ سکتے تھے۔ بھارتیوں نے اس کے مٹھی بھر مجاہدین کے خلاف دو بریگیڈوں کو باری باری آگے بڑھانا شروع کر دیا اور کرنل محمود، کیری گاؤں کے پاس نوشہرہ محاذ کی آخری چٹاں بنے رہے تو میجر اسحاق نے جھنگڑ دھرمسال اور متلاشی کی پوزیشنوں کو ایک حصار میں تبدیل کرنے کی کوشش کی کہ کچھ قبائلی مجاہدین کی مدد پہنچ گئی تھی۔ متلاشی پہاڑی بڑی اہم پوزیشن تھی لیکن ہوائی جہازوں کیلئے آسان ٹارگٹ بھی تھا۔ اگر مجاہدین کے پاس جہازوں کے خلاف فائر کرنے والی گنیں ہوتیں یا اپنی ہوائی فوج کی مدد ہوتی تو متلاشی کی زمین کی مدد سے مجاہدین اس دفاع کو کبھی نہ چھوڑتے لیکن بھارتی جہاز سارا دن اس پوزیشن کو نشانہ بناتے رہتے تھے اور قبائلی مجاہدین وہاں زیادہ دن نہ ٹھہر سکے کہ 18 مارچ تک بھارتی جھنگڑ اور متلاشی پر قابض ہو گئے۔ ہماری دو پلٹنیں جو مجاہدین کو ''سہارا'' دینے کیلئے آئی تھیں وہ دور بیٹھی رہیں۔ اگر فروری کے آخری ہفتہ میں ان کو ڈھنڈ کے ،چنکس لائن پر دفاع میں لگا دیا جاتا تو اس مستقر کے ساتھ بھارتی سر پھوڑتے رہتے اور سب مجاہدین کیلئے یہ دریائے چناب کے پار نہ کرنے کی شرط نہ لگائی جاتی اور کشمیر میں ہر جگہ حملے ہوتے رہتے تو بھارتی کبھی بھی جھنگڑ پر قبضہ نہ کر سکتے اور ہمارے انگریز جنرلوں نے یا ہمارے انگریز سفارتی نمائندوں نے حکومت پاکستان کو ایک غلط فہمی میں ڈالا ہوا تھا کہ دریائے چناب کے مشرق میں بعض مقام پر مسلمان اقلیت میں ہیں تو خبردار! اس طرف پاکستان والے گئے تو ساری دنیا ان کی مخالف ہو جائے گی۔ اس لئے ہماری حکومت نے یہ غلط مشورہ مان لیا۔ اگر انگریزوں نے پاکستانی حکومت کو تسلی دلائی ہوئی تھی کہ دریائے چناب کے مغرب کے علاقے پاکستان کو مل جائیں گے تو کیا بارگیننگ یا بہتر پوزیشن میں ہونے کیلئے اگر ہم چناب کے مشرق کے علاقے حاصل کر لیتے یا وہاں چھاپے مارتے رہتے تو یہ ایک عسکری ضرورت تھی۔ جب ہم نے یہ عسکری ضرورت پوری نہ کی تو جو علاقے ہم نے آزاد کرا لئے تھے ان پر بھی بھارت نے قبضہ کرنا شروع کر دیا۔

جھنگڑ کی بہت زیادہ عسکری اہمیت تھی۔ یہ فوجی تلمیحات کے لحاظ سے ''جنکشن پوائنٹ'' تھا۔ اس پر قبضہ کے بعد راجوری میں تو ہم ایک ہفتہ بھی نہ رہ سکتے تھے لیکن بھارتیوں نے کچھ زیادہ حاصل کر لینے کیلئے پہلے جھنگڑ کے ساتھ پیر ستواں پر قبضہ کیا جو اہم پہاڑی تھی اور ''پیر'' کشمیر میں پہاڑی یا پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں اور دو تین دن بعد بھارت کی بکتر بند رجمنٹ جس کے پاس سٹیورٹ ٹینک تھے۔ اس سے جھنگڑ سے کھیورٹہ کے راستے کوٹلی کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور پہلا ٹینک مائی طوطی کے مزار کے قریب پہنچا اور وہاں رُکا کہ دوسرا ٹینک آگے بڑھے تو سدھن بریگیڈ کا ایک مجاہد جس کا اعوان قبیلہ سے تعلق تھا۔ آہستہ سے ٹینک کے پاس آیا اور اس کے کپولا کے اندر

ایک 36 نمبر گرنیڈ پھینک دیا کہ سارے CREW ہلاک ہو گئے۔ ٹینک اپنے نزدیک فائر نہیں کر سکتا۔ بھارتی یہ دیکھ کر گھبرا گئے۔ ویسے بھی نوشہرہ سے جھنگڑ تک کا بارہ میل فاصلہ انہوں نے بیس دنوں میں طے کیا تھا کہ یہ مجاہدین کا علاقہ ہے۔ بھارتیوں نے بے حساب نقصان اٹھایا تھا اور ان کا مغربی بازو مجاہدین کی زد میں تھا۔ اس لئے بھارتیوں نے کوٹلی فتح کرنے کا خیال چھوڑ دیا کہ ابھی چنگس سے لے کر راجوری تک میجر اسلم اور میجر رحمت اللہ کے کچھ مجاہدین باقی تھے جن کے خلاف بھارتیوں نے 30 مارچ کو کارروائی شروع کی اور ایک پورے بریگیڈ سے نوشہرہ سے راجوری کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ ہم ان مجاہدین کو سلام کرتے ہیں کہ انہوں نے پورے پندرہ دن بھارتیوں کا مقابلہ کیا۔ ایک اکیلے نائک شاہ ولی نے اپنی سیکشن سے تین دن دشمن کو روکے رکھا لیکن میجر اسلم نے آخر 15 اپریل کو راجوری چھوڑ دی اور شمال میں بھمبر گلی کو اپنا مرکز بنایا تو اب تقریباً سارے ضلع اودھم پور سے مجاہدین کے چھوٹے چھوٹے دستوں کو نکلنا پڑا اور رام بن اور بانہال سے میجر نوشہرواں بھی بھمبر گلی پہنچ گیا۔ صرف چند مجاہدین شوپیاں اور پیر پنجال میں رہ گئے اور ہم نے وسیع علاقے جو آزاد کرائے تھے' ان پر بھارتیوں نے قبضہ کر لیا یہ علاقے بھی کچھ غیر فوجی تھے۔ کچھ لوگ مہاجرین بن کر پاکستان آ گئے باقی آج کل بھی غلامی کی زنجیروں میں بھارت کے ظلم سہ رہے ہیں۔

میجر اسلم عباسی نے بھی سٹاف کالج جانا تھا۔ ان علاقوں کی ذمہ داری جنرل ٹاٹھم نے بریگیڈئر محمد اعظم کے پچیسویں بریگیڈ کو دے دی اور اعظم نے بڑی لجاجت اور اپنی بدقسمتی کو تسلیم کرتے میجر اسلم سے وائرلیس پر رابطہ باندھا کہ وہ کمانڈ میجر رحمت اللہ کو دے کر راولپنڈی پہنچ جائے اور مانا کہ وہ ہاتھوں پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور قیمتی وقت گزر گیا اور میجر اسلم کو مبارک دی کہ وہ خوش قسمت لوگ تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں انشاء اللہ سرخرو ہوں گے کہ میجر اسلم کی میجر کے طور پر جو 1400 روپے تنخواہ تھی۔ ان دنوں کیپٹن کی 500 روپے کی ماہانہ تنخواہ ملی۔ بریگیڈئر اعظم آگے کشمیر میں بڑا ناکام رہا اور اس کے خلاف طرح طرح کی باتیں کی جاتی ہیں۔ مجھے بریگیڈئر اعظم کے خلوص پر کبھی شک نہ پڑا اور بعد میں اس نے پاکستان میں بڑے عہدوں یعنی وفاقی وزیر یا مشرقی پاکستان کے گورنر کے طور پر بھی کام کیا۔ بیشک اس نے اکبر خان کی طرح انگریزوں سے ٹکر نہ لی۔ اگر وہ ٹکر لیتا تو اس کا حشر اکبر خان طارق کی طرح ہوتا کہ جیل کی ہوا کھانا پڑتی۔ یا جنرل افتخار خان کے بڑے بھائی جنرل اکبر خان رنگروٹ والا حشر ہوتا جو اذکار ہم بعد میں تفصیل سے کریں گے کہ حیلہ فرنگی کے تحت ہمارے انگریز نوکروں نے ہمیں خوب بیوقوف بنایا کہ بریگیڈئر اعظم کو جو پلٹنیں کشمیر کے جہاد کا دور سے ''نظارہ'' کر رہی تھیں۔ جنرل ٹاٹھم نے حکم دیا کہ ان کو جھنگڑ کے نزدیک لایا جائے۔

اور 20 اپریل 1948ء کو جنرل گریسی نے ہماری حکومت کو جو رپورٹ دی ہماری سرکاری تاریخ اور سرکاری کاغذوں سے اس کے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

''بھارتی فوج کو جو آسان فتوحات، خصوصاً کشمیر کی وادی اور مظفر آباد کے علاقوں میں حاصل ہوئیں اس سے یقیناً یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ قبائلی لوگ پاکستان سے براہ راست مدد نہ ملنے کی وجہ سے ناراض ہوئے ہوں گے اور وہ لوگ پاکستان کے خلاف بھی اٹھ سکتے ہیں۔ اس لئے اگر پاکستان چاہتا ہے کہ اسے کشمیر سے بے گھر کئے

ہوئے پچپن لاکھ مہاجرین کا سامنا نہ کرنا پڑے اور اگر پاکستان چاہتا ہے کہ بھارت کو اپنے دروازے یا عقب میں یا پہلو پر بیٹھنے کی اجازت نہ دی جائے اور یہ خیال ہو کہ شہری اور فوجی مورال خطرناک حد تک متاثر نہ ہو پاکستان چاہتا ہے کہ تخریب کارقوتوں کی حوصلہ افزائی نہ ہو اور وہ پاکستان پر ٹوٹ نہ پڑیں تو ضروری ہے کہ بھارتی فوج کو اوڑی، پونچھ، نوشہرہ کی لائن سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔''

قارئین! یہ عاجز آپ کو دعوت دیتا ہے کہ اس رپورٹ کا خود تجزیہ کریں کہ ہمارے انگریز نوکر ہمیں کس طرح بے وقوف بناتے تھے اور میں جو چند الفاظ اس پر تبصرہ کیلئے لکھ رہا ہوں وہ ہماری حکومت کی ''سادگی'' یا ''نااہلی'' قارئین پر واضح کرنے کیلئے لکھ رہا ہوں کہ کن الفاظ کے تحت ہماری حکومت نے اس رپورٹ کو ایک ''مقدس مسودہ'' (سیکورٹی کونسل ایس پی وی 8 فروری 1950) کے طور پر اقوام متحدہ میں پیش کیا کہ ''مظلوم'' بن کر عرض کی کہ جناب ہمارا ایک غیر ملکی نوکر بھی ہمیں کہتا تھا کہ پاکستان سخت خطرات سے دوچار ہونے والا ہے۔ اس لئے مجبوری کے تحت ہم اپنی محدود فوج، محدود کارروائی کیلئے اور محدود علاقوں میں داخل کر بیٹھے ہیں اور کوشش کریں گے کہ بھارتی فوج کے ساتھ ''تصادم'' نہ ہو تو قارئین سوچیں کہ فوج کو بھارت کے سامنے نکو بنانے کیلئے بھیجا گیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ''تصادم'' کا ارادہ نہیں تو یہ فوج رکاوٹ کیسے پیدا کرے گی کہ جنرل گریسی کو چھ ماہ بعد یاد آیا کہ ہم نے قبائلی مجاہدین کی اکتوبر 1947ء میں کوئی مدد نہ کی تھی اور بھارتی جہازوں نے کشمیر وادی میں ان کے دماغ سے ''جہاد کا کیڑا'' نکالا اور کہا کشمیر قبائلی مجاہدین کا مسئلہ ہے۔ ہمارا مسئلہ نہیں تو پھر مودودی کا فتویٰ ''ٹھیک'' تھا کہ اس نے قبائلی مجاہدوں کے جہاد کو تو ''مشروط'' طور پر جائز قرار دیا تھا کہ اگر وہ باعلم مسلمان ہوں صرف ہم باقی پاکستانیوں کے کشمیر کے جہاد میں شمولیت کو ناجائز قرار دیا کہ قرآن پاک کی سورۃ النساء کی آیت مبارکہ 75 جہاں کمزوروں اور ناتوانوں کیلئے لڑنے کے احکام ہیں۔ وہ شاید ان دنوں مودودی کے ذہن سے خارج ہوگئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جماعت اسلامی تو ''صبح کو بھولی شام کو گھر آ گئی ہے'' اور اب کشمیر کے جہاد کو جائز قرار دیتی ہے اور شاید اس زمانے میں کوئی ''چھپے ہاتھ'' مودودی سے بھی وہی ''کھیل'' کھلا رہے ہوں جو ہمارے انگریز نوکر کھیل رہے تھے کہ دشمن کو صرف نوشہرہ، پونچھ، اوڑی لائن سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ باقی کشمیر پر وہ ''قابض'' رہ سکتے ہیں کہ کیا سامبہ یا سچیت گڑھ سے 1965ء اور 1971ء میں دشمن ہمارے دروازے یا عقب یا پہلو سے آ کر ہم پر حملہ آور نہ ہوا تھا۔ جنرل گریسی ان مقامات کا ذکر کیوں نہیں کرتا بلکہ ان کے سامنے کے علاقوں سے تو اکھنور اور بیڑی پتن تک جنرل گریسی مجاہدین پر ''جھاڑو'' لگوا چکا تھا اور گریسی کو ہمارے فوجی اور شہری مورال کو صرف ''خطرناک'' حد تک متاثر ہونے کی فکر ہے۔ چھوٹی موٹی بے عزتیاں ہم برداشت کرتے رہیں اور قارئین سازش یہ تھی کہ ہمیں آہستہ آہستہ بے غیرت بنایا جائے ورنہ 48-1947ء میں ایک مسلمان بھی بھارت کا قیدی بننے کو تیار نہ تھا اور میرے یہ مضامین لکھنے کا بڑا مقصد یہ ہے کہ بھارتی سورماؤں سے ہمیں 1948ء اور پھر 1965ء میں مار دلوا کر اور باطل فلسفوں کی پیروی کرتے اور زندگی کے اقدار کو غیروں کی باطل طرزوں کے تابع کرتے کرتے اتنا بے غیرت بنانا تھا کہ 1971ء میں ہم نے نوے ہزار فوجیوں سے ہتھیار ڈلوا دیئے اور ان مضامین میں اصلی نکتہ میرے سامنے یہی ہے کہ اس عاجز کے ماتحت ستمبر 65ء آخری آدمی اور

آخری گولی تک لڑے بھارت کی قید ان کو قابل قبول نہ تھی اور جنرل گریسی نے جو لکھا ہے کہ ''تخریب کار، یا شرپسند قوتوں'' کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔ اس طرف بھی دھیان دیں کہ ہمارے اندر جو حق پسند یا اللہ والے ہوں یا مجاہد ہوں، اینگلو امریکن بلاک آجکل بھی ان کو شرپسند اور تخریب کار کہتا ہے اور ان کے مطابق پاکستان کی حکومت پر مغرب زدہ لوگ براجمان رہیں۔ اس رپورٹ کے فوری مقاصد یہ تھے۔ پاکستان کو صرف ماؤنٹ بیٹن کی ہدایت کے مطابق نوشہرہ، جھنگڑ، پونچھ اور اوڑی کے مغرب کے علاقے دینے تھے۔

بھارتیوں کے پاس جتنی فوجی طاقت اس محاذ پر اکٹھی ہوگئی تھی اس طاقت سے اس وقت تک آگے پونچھ کے ساتھ رابطہ نہ باندھا جا سکتا تھا۔ جھنگڑ کی زمین کو دفاعی حصار میں تبدیل کرنا آسان تھا تو بھارتیوں نے چار پلٹنوں سے تاریں اور مائنز لگا کر اس علاقے کو ایک دفاعی حصار میں تبدیل کر دیا کہ توپخانہ کی ڈیڑھ رجمنٹ بھی پاس تھی۔ بکتر بند دستے بھی حرکتی فائر سپورٹ کیلئے تھے کہ نوشہرہ سے جھنگڑ تک کے بارہ میل کی دیکھ بھال چھوٹی پوسٹوں اور ان حرکتی دستوں سے ہوتی تھی اور جھنگڑ، راجوری کے درمیان کی رکھوالی کی ضرورت بھی پوری کی جاتی تھی۔ میجر اسحاق اور میجر رحمت اللہ بھارتیوں کی آگے پونچھ کی طرف پیش قدمی کو روکے ہوئے تھے۔ اب جو بریگیڈئر اعظم کا بریگیڈ یہاں آ گیا تھا تو دو پلٹنیں اس علاقہ میں مستقر بنائیں اور ایک بھمبر کی طرف اور مجاہدین کو ان علاقوں میں کھلے ''شکار'' کی اجازت دے دی جاتی اور اکبر خان کی تجویز کے مطابق ان کو ''گولا'' یا ''گولی'' بنا کر دشمن کے خلاف استعمال کیا جاتا تو بھارتی ابھی تک ہمارے ''جال'' میں تھے۔ بھارتیوں کا اتنا نقصان ہوتا کہ وہ مزید کوئی جارحانہ کارروائی نہ کر سکتے لیکن انگریز جنرل ٹاتھم نے حکم دیا کہ مجاہدین جھنگڑ پر تین اطراف سے حملہ کریں اور ان میں سے دو اطراف کے مجاہدین کے پیچھے دو پکی پلٹنوں کی دو دو کمپنیاں ان کی پیش قدمی کو سہارا دیں گی جس کے لئے کرنل صدیق راجہ کو نویں ایف ایف اور کرنل غلام محمد کی تیرھویں پنجاب کو نامزد کیا گیا۔

بھارتی سمجھتے تھے کرنل خالد کے پاس طلسماتی طاقتیں ہیں

کرنل غلام محمد بعد میں بریگیڈئر 1938ء سے میرے مہربان تھے اور تیرھویں پنجاب کے بچہ بچہ کو میں جانتا تھا۔ صدیق راجہ کا ذکر ہو چکا ہے کہ انگریزوں کے اس ''پروردے'' نے کئی روپ ''دھارے'' ہوئے تھے کہ اس کے ماتحت کبھی اس کو ''کمال ترکی'' کے پایہ کی شخصیت بناتے تھے۔ کبھی وہ عربی لباس پہن کر قرون اولیٰ کے مسلمان جنرل کا روپ دھارنے کی کوشش کرتا تھا۔ آزادی سے پہلے وہ سکھوں کی پلٹن میں تھا تو وہ سکھوں کے ''گرو'' والی حرکتیں کرتا تھا۔ یہی شخص راولپنڈی سازش کے مقدمہ کا بڑا ''سلطانی گواہ'' تھا۔ اس کارروائی کا فوری مقصد یہ تھا کہ پاکستانی فوج کو بھارتی سورماؤں سے مار دلائی جائے اور آئندہ بھی سیدھے طور پر ان کو کسی مقصد کیلئے مستقر وغیرہ میں نہ استعمال کیا جائے اور بھارت کو کوئی پاکستانی جنگی قیدی دلایا جائے کہ پاکستان کو اقوام متحدہ میں بڑی لجاجت سے ''تسلیم' کرنا پڑے' کہ وہ کشمیر کی جنگ میں چھپ چھپا کر ''چوروں اور ڈاکوؤں'' کی طرح کام کر رہے ہیں اور مجاہدین بھی چور اور ڈاکو ہیں۔ ساتھ ہی لیپا پوتی بھی ہو جائے کہ فوج بھی کشمیر میں تو گھسی ہوئی ہے لیکن برتر بھارتی طاقت کا مقابلہ مشکل ہے چنانچہ 9/10 مئی 1948ء رات پڑتے ہی سدھن بریگیڈ کی دسویں

آزاد پلٹن اور محسود وزیری لشکروں نے بغیر فائر کی امداد کے دو الگ الگ مقصودوں پر حملے کر دیئے اور آگے والی کافی چوکیوں پر قبضہ کر لیا لیکن جھنگڑ گاؤں والے دفاعی حصار میں داخل نہ ہو سکے۔ تیرھویں پنجاب متلاشی پہاڑی کے حملہ میں مجاہدین کو سہارا دے رہی تھی کہ آدھی رات کو معلوم ہوا کہ آگے جو لشکر ہے، ان کو جب کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے ''غائب'' ہونا شروع کر دیا تو تیرھویں پنجاب نے کمال دلیری سے متلاشی پہاڑی پر قبضہ کر لیا لیکن جیسے روشنی ہوئی، دشمن نے توپوں اور ہوائی جہاز کے فائر سے ان کے ساتھ وہی کچھ کیا جو وہ جھنگڑ پر حملہ کے وقت محسودوں کے ساتھ کر چکا تھا۔ کمپنی کمانڈروں نے جو حالات پیچھے بتلائے اور کرنل غلام محمد خود بھی دیکھ رہا تھا تو پانچ گھنٹے وہاں رہنے کے بعد ان کو واپسی کے احکام ملے۔ دونوں کمپنیوں نے پسپائی بڑی ترتیب سے کی اور صرف چھ جوان شہید ہوئے۔ چار زخمی ہو کر دشمن کی قید میں چلے گئے اور پچیس زخمیوں کو ساتھی دشمن کے نرغے سے نکال لے آئے۔

نویں ایف ایف کے صدیق راجہ نے دو کمپنیوں سے ایسی ہی کارروائی ایک چند ماہ نوکری والے سیکنڈ لیفٹیننٹ محبوب نیازی سے کرائی اور خود پلٹن کے میجر اور کیپٹن ''تماشا'' دیکھتے رہے۔ اول تو قبائلی لشکروں اور مجاہدین نے یہاں بھی یہی کیا کہ جب مقصود پیر ستواں پر قبضہ نہ ہو سکا تو وہ ''غائب'' ہو گئے اور پلٹن کی دونوں کمپنیاں مائن فیلڈ میں پھنس گئیں جب سورج نکلا تو دشمن نے جو بے پناہ فائر ان پر کیا۔ میں سب مجاہدین کو سلام کرتا ہوں کہ انہوں نے تین گھنٹے یہ فائر برداشت کیا تو دشمن نے بکتر بند دستوں کے حرکتی فائر کی مدد سے ان پر جوابی حملہ کر دیا۔ 75 جوان شہید یا زخمی ہوئے۔ جن میں سے کافی زخمی دشمن کے قیدی بنے، جن کو دشمن کے نرغے سے نکالا بھی نہ جا سکا اور لیفٹیننٹ محبوب نیازی بڑی مشکل سے خود زخمی ہونے کے باوجود کوئی ایک سو مجاہدین کو دشمن کے نرغے سے نکال کر لے آیا جس کیلئے کئی دفعہ دست بدست لڑائی بھی لڑنا پڑی۔ محبوب بعد میں فوج سے میجری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور ان کو صحیح طور پر ستارہ جرأت سے بھی نوازا گیا۔ چند سال ہوئے وفات پا چکے ہیں اور میرے عظیم دوست تھے۔ اس عظیم قربانی پر اکثر آنسو بہاتے تھے، کہ بڑی غلط کارروائی تھی اور یہ قربانی رائیگاں گئی لیکن نہیں قربانی رائیگاں تو نہیں جاتی کہ بھارتیوں کو بھی معلوم ہو گیا کہ پاکستان کی فوج کے ساتھ مقابلہ مشکل ہے اور وہ بھی تین چار ماہ کیلئے دبک کر بیٹھ گئے۔ بہرحال جنرل ٹاٹھم نے کرنل صدیق راجہ کو مبارک کی چٹھی لکھی کہ اس کا ''مقصد'' حل ہو گیا تھا۔ بھارت کو پاکستانی فوج کے کشمیر میں ہونے کا ثبوت مہیا ہو گیا اور ممکن ہے ٹاٹھم نے بھارتیوں کو حملے کی ساری تجویز سے آگاہ کر دیا ہو کہ اس عاجز کے پاس کئی ثبوت ہیں اور بھارتی تاریخ کے بیانات ان ثبوتوں کو صحیح بنا دیتے ہیں کہ جہاں ہم نے کوئی جارحانہ حرکت کی۔ بھارتی ''تیار'' ہوتے تھے۔ چلو اس محاذ کو یہاں چھوڑ کر اب سری نگر اور شمالی محاذوں کی طرف جاتے ہیں کہ اگلے چند ماہ میں وہاں کیا ہو رہا تھا۔

سری نگر اب ایک بہت بڑا بھارتی فوجی مستقر بن چکا تھا۔ یعنی اس علاقے میں بھی بھارتی انٹیریر لائنز پر ہو گئے اور ہم ان علاقوں میں ویسے بھی انٹیریر لائنز پر تھے۔ ہم نے جو دریائے چناب کے مشرق میں کارروائی بند کر دی تھی، تو اس وقت سے جموں، سری نگر روڈ کو بھارتی بے خطر استعمال کر کے تمام فوجی سامان اور افواج وادی کشمیر میں اکٹھے کر رہے تھے اور اب راجوری پر بھارتیوں کے قبضہ کے بعد ہمارے چھوٹے دستے جو رام بن اور بانہال

کے قریب تھے۔ وہ بھی وہاں سے آ گئے تو سری نگر اور وادی کشمیر بھارت کے ''حصے'' بن گئے۔ وہاں جنرل تھماپا کے پاس تقریباً چھ بریگیڈ تھے اور ہر بریگیڈ میں پانچ پلٹنیں تھیں۔ ایک بریگیڈ کارگل کے ہمارے مجاہدین جو درہ زوجیلہ پہنچ گئے تھے' ان کے سامنے تھا۔ دوسرا بریگیڈ بانڈی پور کے علاقہ میں میجر حسن کے خلاف، تیسرا بریگیڈ، ہندواڑہ میں کرنل خالد کے خلاف اور چوتھا بریگیڈ بارہ مولا، آڑی محاذ پر، کرنل محمد شریف کے خلاف، دو بریگیڈ ریزرو میں تھے کہ کوئی بریگیڈ کہیں پیش قدمی کرنا چاہے تو اس کی مدد کو بھیجے جا سکتے تھے اور وہ جو کچھ چاہے فتح کر سکتے تھے اور پھر وہاں کم نفری سے بھی بیٹھ جاتے یا دفاع کرتے تو چند مجاہدین ان کو وہاں سے کیسے اکھیڑ سکتے؟ جواہر لعل نہرو نہ صرف مظفر آباد تک کے علاقے فتح کرنے کے احکام دے چکا تھا بلکہ بھارتی تاریخ کے مطابق تمام بھارتیوں کو مجاہدین کو سکردو اور گلگت کے علاقوں سے باہر پھینکنے کے احکام مل چکے تھے۔

ہمارے انگریز جنرل صورت حال کو بالکل سمجھتے تھے' بلکہ ان کے بھارتیوں کے ساتھ ''رابطوں'' کی بھی گواہیاں ہیں اور وہ لوگ ہمیں شکست سے دوچار کرنا چاہتے تھے کہ انہوں نے شمالی علاقوں میں تو فوج بھیجنے کی مخالفت کی کہ اتنی فوج اپنے پاس موجود نہیں لیکن ہندواڑہ اور اوڑی محاذ پر خطرہ کی صورت میں پکی فوج کی کچھ یونٹوں کو محاذ پر بھیجنے کی انگریزوں نے ''اجازت'' دے دی کہ وہ اب ''خفیہ'' طور پر ہمارے جہاد کا حصّہ تھے بلکہ ان میں جنرل ٹاٹھم کچھ ''بڑ'' مارنے کا بھی عادی تھا اور کچھ پاکستانی افسروں کو اپنا ''خاص الخاص'' بنایا ہوا تھا کہ ان کے ساتھ ''اہم'' باتیں بھی کر لیتا تھا، جو ہم متعلقہ واقعات کے ساتھ لکھتے رہیں گے۔ یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ اس عاجز کو موجودہ نویں ایف ایف کے ریکارڈ سے ان کے بہروپیا کرنل صدیق راجہ جو انگریزوں کا پروردہ تھا' اس کی ایک لکھت ملی کہ ٹاٹھم نے اس کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وسط مئی میں بھارت والے ہندواڑہ سے اوڑی محاذ پر بہت بڑی ''رائیٹ ہٹ'' (دائیں ضرب) مارنے والے ہیں۔ اب افسوس کا مقام ہے کہ یہ انگریز جنرل جو ہماری کشمیر کی جنگ کا عملی انچارج تھا' اس نے واقعاتی طور پر اس سلسلہ میں کوئی تیاری ہم سے نہ کرائی۔

مارچ 1948ء میں ہندواڑہ سے کرنل خالد، راولپنڈی طارق ہیڈ کوارٹر سے آئندہ کی کارروائیوں کو زیرِ بحث لا کر ہدایات کیلئے گئے تو اکبر خان وہاں سے جا چکا تھا اور اس کو بتایا گیا کہ کچھ محسود لشکر اس کی مدد کیلئے بھیجے جا رہے ہیں۔ وہ بانڈی پور کی طرف میجر حسن خان کے ساتھ رابطہ کی تجویز کو بھول جائے۔ کشمیر کا مقدمہ اقوام متحدہ میں چلا گیا ہے اور خالد اپنے محاذ پر اپنی کارروائیوں کو ''محدود'' کر دے تو کرنل خالد نے کہا کہ کارروائیوں کو محدود یا ساکن ''کر کے وہ وہاں ایک ہفتہ بھی نہیں ٹھہر سکتا، اس کے پاس سب سے بڑا ہتھیار ''حرکت'' اور جذبہ جہاد ہے۔ اپریل کے شروع میں برف پگھلتے ہی وہ دشمن کے خلاف جارحانہ کارروائیاں شروع کر دے گا لیکن 15 اپریل تک کم از کم ایک پکی پلٹن نتھا چھنا گلی میں آ کر دفاع لے کر ایک پکا مستقر بنا لے تو مجاہدین دشمن کے بریگیڈوں کو ان پہاڑوں کے اندر الجھا دیں گے اور مظفر آباد کو ٹھٹوال محاذ سے دشمن کوئی خطرہ نہ پیدا کرے گا اور کرنل خالد کے ساتھ وعدہ کیا گیا کہ ایک پلٹن اپریل کے شروع میں ''نتھا چھنا گلی'' پہنچ جائے گی۔ مارچ کے آخری ہفتہ میں کرنل خالد کے پاس میانوالی سے امیر عبداللہ روکڑی کے ماتحت پچاس مجاہدین اور جلال پور شریف سے حزب اللہ کے 70 مجاہدین، ایک محسود لیبر بٹالین کی دو کمپنیاں کمک کے طور پر پہنچ گئیں اور اپنے پاس بھی پرانی نفری سے آدھے آدمی

موجود تھے۔ ایک سو کے قریب مقامی مجاہدین تیار کئے کہ سترہ پنجاب سے صوبیدار اشرف، صوبیدار اعظم اور صوبیدار شریف بھی پہنچ گئے تو کرنل خالد نے سب نفری کو تین لشکروں میں تقسیم کر کے اور صوبیداروں کو مقامی طور پر میجروں کے عہدے دے کر اپریل کے پہلے ہی ہفتہ دوبارہ ہندواڑہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ بھارتیوں پر جو کرنل خالد کی شخصیت کے طلسماتی اثرات تھے تو بھارتی تاریخ اس کو 6150 مجاہدین کے اس وادی میں حملہ کا ذکر کرتی ہے۔ حالانکہ سب ملا کر مجاہدین کی تعداد ہزار بارہ سو سے زیادہ نہ تھی۔ البتہ بعد میں دوسو کے قریب سواتی لشکر بھی پہنچ گیا۔

کرنل خالد کے یکم اپریل سے 19 مئی تک بھارت کے ہربخش سنگھ کے پانچ پلٹنوں کے بریگیڈ نمبر 163 کے ساتھ بلی چوہے والی جنگ ہماری عسکری تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے کہ صحیح طور پر کرنل خالد (شیر محمد) کو اس کارروائی کے عوض ستارہ جرأت سے بھی نواز دیا گیا تھا اور ان دنوں شلورا، مہورا، تریگام، ڈولی پورہ، کپواڑہ کے علاقوں کو ہمارے شہداء نے اپنے خون سے بھی سینچا کہ حنیف علی شاہ مجذوب قلندر بھی شہادت کی سعادت حاصل کر گئے تو ظاہر ہو رہا تھا کہ موسم کی کروٹ کے ساتھ بھارتی فوج بھی کروٹ لینے والی ہے کہ مجاہدین نے ان کو بھی بہت نقصان پہنچایا لیکن بھارتیوں پر مجاہدین کی یہ کمزوری بھی واضح ہو گئی تھی کہ وہ کسی جگہ کا دفاع نہیں کر سکتے۔ ہمارے انگریز جنرلوں نے البتہ ایک پلٹن وہاں بھیجنے کی بجائے گائیڈ پلٹن سے کیپٹن (بعد میں جنرل) محمد اقبال کی ایک کمپنی بھیجی اور ان کو بھی دریائے نیلم کو پار کر کے آگے نتھا چھنا گلی کی طرف جانے کی اجازت نہ تھی۔ مئی کے پہلے ہفتہ میں کرنل خالد نے پیچھے خبر بھیجی کہ دشمن کے پانچ پلٹنوں والے بریگیڈ کو دو اور پلٹنیں مل گئی ہیں جو ان کی پیش قدمی والے ذرائع آمدورفت کی حفاظت کریں گے۔ اور دشمن کے پاس بکتر بند دستے بھی ہیں کہ برف پگھلنے کے بعد دشمن کی حرکت میں تیزی آجائے گی۔ اب بھی فوج آگے آ کر ایک پلٹن کے ساتھ ہمارے لئے مستقر بنائے تو ہم پیش قدمی کرنے والے بھارتیوں کو پہاڑوں اور گلیات میں اس طرح پھیلا دیں گے کہ وہ دریائے نیلم کو پار بھی نہ کر سکیں گے اور ہمارے ''ہدف'' رہیں گے۔ اور چند ماہ بعد یا مون سون کے موسم میں ہم پھر دشمن میں پہلے والی تباہی مچانا شروع کر دیں گے۔ لیکن انگریزوں کے علاوہ ہمارے باقی افسروں نے بھی اس دفعہ غلطی کھائی کہ انہوں نے سمجھا کہ کرنل خالد کے پاس کچھ ''طلسماتی'' طاقتیں ہیں وہ بھارتیوں کو دریائے نیلم پار نہ کرنے دے گا۔ اگر کچھ طلسماتی یا روحانی طاقتیں تھیں بھی تو وہ حنیف علی شاہ کی شہادت کے بعد ختم ہو چکی تھیں کہ کرنل خالد نے یہ کچھ ''محسوس'' کر لیا تھا کہ اب وہ ''اکیلا'' ہے۔

18 مئی سے بھارتیوں نے دو الگ الگ راستوں پر بڑی تیزی سے ایک دوسرے کی مدد کر کے پیش قدمی شروع کر دی۔ تو کرنل خالد نے راولپنڈی خبر بھیجی کہ 20 مئی تک سب مجاہدین اس پیشقدمی کے سامنے تتر بتر ہو جائیں گے اور بھارتیوں کی یہ پیشقدمی اتنی تیز تھی کہ اوڑی محاذ کے مجاہدین نے خبر دی کہ بھارتی ان کے پیچھے پہنچنے والے ہیں۔ تو ہماری حکومت جاگی اور ایبٹ آباد سے حاجی افتخار احمد کے دسویں بریگیڈ کو حکم ملا کہ پورا بریگیڈ محاذ پر پہنچے۔ اس وقت دو پلٹنیں آپس میں ہاکی کھیل رہی تھیں اور میچ ادھورا چھوڑ کر محاذ پر جانے کے احکام ملے۔ کرنل خالد کسی مقام پر جم کر لڑائی کرتا تو اس ایک مقام پر دشمن کو چند دن روکا جا سکتا تھا لیکن دوسرے مقام سے

دشمن کرنل خالد کے پیچھے پہنچ جاتا۔ اس لئے کرنل خالد نے تدبیرات ایسی بنائیں کہ ہر جگہ مقابلہ کر کے اپنی پسپائی کو پھیلاؤ دیا کہ دشمن کی بھی پانچوں کی پانچوں پلٹن پھیلاؤ میں چلی گیں اور کرنل خالد جب نتھا چھنا گلی پہنچا تو اس کے اپنے ساتھ صرف چار مجاہدین تھے لیکن اس زمین کی افادیت کے تحت کرنل خالد سواتی لشکر اور کچھ مجاہدین کو وہاں اکٹھا کر سکا لیکن وہاں اب لڑائی نہیں لڑی جا سکتی تھی۔ تو کرنل خالد نے 23 مئی کو ٹھوال کے پاس دریائے نیلم کو عبور کیا اور نوسہری میں آ کر دفاع اختیار کیا تو گائیڈ پلٹن کا کیپٹن اقبال جو حالات دیکھ سن رہا تھا۔ اس نے کرنل خالد سے مشورہ کیا کہ ان کو دوبدو دشمن کے ساتھ لڑنے کا احکام نہیں ہیں۔ وہ کیا کریں تو خالد نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ ان کے عقب میں آ کر پوزیشن لیں۔ دو دن کے بعد اس بریگیڈ کی پلٹن سترھویں پنجاب سے میجر محمد اکبر (بعد میں کرنل اور میرے عظیم دوست) بریگیڈ کی ایڈونس پارٹی لے کر نوسرسہری پہنچ گئے اور کرنل خالد سے چارج لے لیا لیکن اس وقت تک اتنی طاقت نہ تھی کہ دشمن کو دریائے نیلم پار کرنے سے روکا جائے۔ البتہ دشمن کو کرنل خالد نے جو پہاڑوں اور وادیوں میں ایک طرح سے تتر بتر کر دیا تھا۔ وہ لوگ آگے بڑھ کر مظفر آباد کے لئے تو کوئی خطرہ نہ پیدا کر سکے لیکن دریا کے مغرب کی طرف کی "چھج" والی اہم پہاڑی پر قبضہ کر لیا اور دشمن اپنی ان کامیابیوں پر بہت خوش تھا بلکہ کرنل خالد کی طلسماتی شخصیت کے جو بھارتی فوجیوں پر اثرات تھے۔ ان کو ختم کرنے کے لئے سری نگر ریڈیو سے کئی دفعہ یہ خبریں نشر کیں کہ کرنل خالد کی ناکامی کی وجہ سے اس کو ڈومیل کے پل پر پھانسی دے دی گئی ہے اور کئی دن اس کی لاش پل کے ساتھ لٹکتی رہی ہے۔

اس محاذ پر فائر بندی تک کیا کچھ ہوتا رہا، خاص کر جون، جولائی 1948ء کی جنگیں اور "چھج" کی پہاڑی پر ہمارے دوبارہ قبضہ اور بھارتیوں کو دریائے نیلم کی دوسری طرف پھینک دینے کی کارروائیاں ہماری عسکری تاریخ کے سنہرے ابواب ہیں۔ پانچ بریگیڈوں کے بھارتی بریگیڈ کو وسط مئی تک صرف ایک پلٹن کی مدد سے دریا کے مشرق میں روک کر مجاہدین کے چھاپوں سے بے جان کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اب جو دشمن نے پھیلاؤ اختیار کر لیا تو زمینی حالات ایسے تھے کہ دشمن دریائے نیلم کے دونوں طرف بہت بڑی دفاعی پوزیشنوں میں بھی پھیلا ہوا تھا اور ہم تین پلٹنوں کے بریگیڈ کے ساتھ بڑی مشکل سے علاقے کا دفاع کر رہے تھے لیکن دریائے نیلم کے مغرب کی طرف جو دشمن نے چھج کی پہاڑی پر قبضہ کیا ہوا تھا یہ ہمارے لئے اس طرح تھا کہ دشمن نے ہمارے سینہ میں تلوار گھونپی ہوئی ہے۔ یہ عاجز بریگیڈ کمانڈر حاجی افتخار احمد (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) اور بریگیڈ کی پلٹنوں کے کافی لوگوں کو جانتا تھا۔ لیکن سترھویں پنجاب تو میرے گروپ کی پلٹن تھی۔ ان کے کرنل نوشیروان سمیت یہ عاجز ان کے بچہ بچہ کو جانتا تھا اور انہوں نے جو بہادریاں دکھائیں وہ سب کہانیاں غور سے سنیں اور آج تک روحانی طور پر یہ عاجز ان جنگوں میں اپنے آپ کو بھی شریک سمجھتا ہے۔ بریگیڈ کمانڈر افتخار صاحب کا تعلق بکتر بند دستوں سے تھا۔ اس لئے انہوں نے سب تدبیرات کے لئے کرنل نوشیروان اور باقی پیدل دستوں کے کمانڈروں پر پورا بھروسہ کیا اور خود انتظامی کارروائیوں کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اس محاذ پر جنوب میں بیکہ سیرو سے لے کر شمال میں کیرن تک یا گہرائی میں میری کلسی، رچمار گلی، کوٹ اور بانڈی وغیرہ کے مقامات پر جو جنگیں ہوئیں یا "چھج" کے مقام سے دشمن کو ہٹانے کے لئے بار بار حملے کئے۔ کوئی کم تر طاقت عسکری تاریخ میں ایسے مقاصد حاصل کرنے کے لئے نہ اتنی

قربانی دے سکی ہو گی اور نہ وہ کچھ حاصل کر سکی ہو گی جو کچھ اس بریگیڈ کی تینوں پلٹنوں گائیڈ' سترہ پنجاب اور فرنٹیئر فورس نے کیا۔

البتہ چج کی آخری فتح کا سہرا زیادہ تر سترہ پنجاب اور توپخانہ کے سر بندھتا ہے۔ گو حملے کو آگے پیش رفت دینے اور کامیابی کے پورے ثمرات حاصل کرنے میں باقی دونوں پلٹنوں کے نوجوانوں کے سر بھی روز قیامت میں بلند رہیں گے کہ ان کے ساتھ کچھ قبائلی لشکر بھی شامل ہیں۔ چج کی لڑائی اس حملے کے تجویز قرون اولیٰ کے مسلمان مجاہدین کی سنت کے طور پر بگل اور نقارے بجا کر حملہ کی بسم اللہ کرنا۔ ہر عمل اور ہر ادا نرالی ہے اور دشمن سے اور اونچائی پر توپیں لے جانا اور گڑھا کھود کر توپوں سے اونچائی سے نیچائی پر فائر کر کے دشمن کو حیران کر دینا کہ یہ توپ سطح سمندر سے بھی 9444 فٹ بلند چوٹی پر تھی اور دشمن از خود سات ہزار فٹ کی بلندی پر تھا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ ایک دن پہلے وہاں سے سکھ پلٹن چلی گئی تھی اور مدراس پلٹن آئی تھی اور سترہ پنجاب کی صرف دو کمپنیوں کی کارروائی نے دشمن کو ایسی ہزیمت سے دوچار کیا کہ 8 جولائی 1948ء کی یہ کارروائی' کامن ویلتھ کے کئی سٹاف کالجوں میں آج تک زیر مطالعہ ہے کہ اس کے بعد دریائے نیلم کے اس طرف کے پورے بھارتی بریگیڈ نے مغرب کے یہ علاقے خالی کر دیئے اور دریا کی دوسری طرف جا کر پناہ لی۔ یہ عاجز صرف ایک سبق پر زور دے گا کہ کاش مسلمان مجاہدین کو کوئی لڑانے والا مل جائے تو ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اور یہ عاجز بار بار اپنی ناکامیوں کی ذمہ داری اپنے نااہل افسروں اور نااہل ہائی کمانڈ پر دے رہا ہے کہ اس فتح نے بھارت کی فوج کے ایک بڑے حصے کو دریا کی دوسری طرف باندھ کر رکھ دیا کہ وہ لوگ اپنی مرضی سے یہاں کی نفری کو کسی اور جگہ استعمال نہ کر سکتے تھے کہ نومبر 1947ء تک میرے موجودہ گروپ کی شیر دل پلٹن کے کرنل عبدالجبار اور میرے عزیز دوست کیپٹن (بعد میں بریگیڈیئر) محمد اسلم نیازی نے کیرن سے شمال سائرہ گلی پر قبضہ کر کے بھارتیوں کو اس محاذ پر چکروں میں رکھا۔

ہماری کوتاہیوں کے باوجود بھارتی مظفر آباد پر قبضہ نہ کر سکے

بے شک پاکستان اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا راز ہے کہ ہماری کوتاہیوں کے باوجود بھارتی اس محاذ کی طرف سے مظفر آباد پر قبضہ نہ کر سکے کہ یہ ایک طرح کی انحرافی کارروائی تھی۔ بڑی اور سیدھی کارروائی اوڑی محاذ پر کرنا تھی۔ جہاں ہماری فرنٹیئر فورس کی ایک پلٹن کے مقابلہ میں جنرل تھمایا دو بریگیڈوں نمبر 77' اور 161 کو ایک بکتر بند یونٹ اور پورے ڈویژن کا توپخانہ بھی مہیا کر چکے تھے اور مئی کے آخری ہفتہ میں یہاں بھی پیش قدمی شروع کر دی گئی تھی تو ہماری حکومت نے بھی مجبوراً کوہاٹ سے بریگیڈ نمبر 101 کو آگے مقابلہ کیلئے بھیجا' جس کا کمانڈر اکبر خان تھا۔ انگریز جنرلوں نے 15 مئی 1948ء کو اکبر خان کو شمالی محاذ پر تبدیل کرنے کی ''سازش'' کی جس کا ذکر اکبر خان اپنی کتاب میں کرتا ہے لیکن یہ سازش پروان نہ چڑھی۔ اس محاذ کی جنگ کی کہانی بہت لمبی ہے۔ صرف خاص نکتوں کو بیان کیا جاتا ہے کہ گیارہ بھارتی پلٹنوں کے مقابلہ میں اکبر خان کے پاس تین پلٹنیں تھیں۔ چوبیس بھارتی توپوں کے مقابلہ میں اس کے پاس دو توپیں تھیں۔ بھارتی بکتر بند طاقت یا ٹینک اور بنکر توڑ توپوں یا ہوائی جہازوں کے مقابلہ میں اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا تو فوجی تعزیرات کے ماہر اکبر خان نے فیصلہ کیا

کہ وہ اپنی یونٹوں کے جوانوں کو بھارتی ٹڈی دل فوج سے دو بدو مقابلہ میں نہ الجھائے گا۔ اس لئے یہ عاجز اگر مرزا حسن خان یا صدیق ستی یا خالد وغیرہ اپنے فوجی فراست والے افسران کی جنگوں کی ہر موقع اور ہر وقت کیلئے نئے سے نئے اور نرالے طریقوں کا ذکر کرتا آ رہا ہوں تو ساتھ یہ افسوس کرتا ہوں کہ ہماری افواج کے ''بڑوں'' نے آج تک ان باتوں کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ علاوہ ازیں جنوبی محاذ پر بے چارے بریگیڈئر اعظم خان کو تو انگریز ''باندھ'' کر لڑاتے رہے لیکن اس محاذ پر اکبر خان کو کوئی مشورہ دینے کی ان میں سے کسی کو بھی ''ہمت'' نہ ہوتی تھی۔ 22 مئی 1948ء سے جولائی 1948ء کے آخری ہفتہ تک اپنے سے پانچ گنا برتر فوجی طاقت کے ساتھ گھمسان کی جنگوں میں اکبر خان نے جو اپنی فوج کو بھارتیوں کے دوبدو بھی نہ ہونے دیا اور پانڈو کی عظیم فتح سے جو بھارتیوں کو بھگا دیا کہ بھارتی کور کمانڈر جنرل کری آپا نے محاذ کے کمانڈر جنرل تھمایا کو اوڑی تک پسپائی کے احکام دے دیئے لیکن انگریز جنرلوں نے اکبر خان کو چھوٹا قاضی ناگ سے آگے نہ بڑھنے کے احکام دے دیئے کہ ہماری زیادہ پیش قدمی دونوں ممالک میں کھلی جنگ کی صورت اختیار کر لے گی۔ اور اقوام متحدہ میں ہمارا معاملہ کمزور پڑ جائے گا۔ لعنت ہے ایسی پالیسی پر۔ اقوام متحدہ نے ہمیں کیا دیا؟

ایسی جنگ وہی کمانڈر لڑا سکتا ہے جو جنگ کی ایسی نبض شناسی کر سکے کہ اس کے سامنے زمین کا چپہ چپہ بول اٹھے کہ وہاں دشمن کیا کچھ کر سکتا ہے یا کر رہا ہے اور یہ زمین ہمارے کس کام کس وقت کیسے آ سکتی ہے، نہ کہ جنرل سرفراز اور بریگیڈئر قیوم شبیر کی قسم کے لوگ کہ ستمبر 65ء میں لاہور کا قصہ بیان ہو چکا ہے کہ یہ بھی نہ سوچ سکتے کہ جب اپنی ساری پوزیشنیں قائم ہیں تو بھارت کے تین ٹینک سائفن پار کر بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ اور ایوب خان و موسیٰ خان کی ہماری نااہل ہائی کمانڈ نے دونوں کو بہادریوں کے تمغوں سے بھی نواز دیا۔ یہاں اکبر خان نے دیکھ لیا تھا کہ بھارتی بہت وسیع محاذ پر پیش قدمی کر رہے تھے۔ وہ دو محاذوں پر پیش قدمی کرتے تھے۔ ایک چناری کی طرف اور دوسرے ''سدرن سویپ'' یعنی جنوب کی طرف ''جھاڑو'' دینا کہتے تھے اور اس محاذ پر انہوں نے باغ تک کو قبضہ میں لینے کا سوچا ہوا تھا۔ لیکن دونوں ''مقصودوں'' کا اصلی مدعا مظفر آباد پر قبضہ تھا۔ انگریزوں نے اکبر خان کو بھی اس محاذ پر بھیجنے میں دیر کی۔ اگر اکبر خان ذرا پہلے پہنچ جاتا تو وہ اپنے دفاع کا حصار پانڈو کے اردگرد بناتا لیکن جب تک اکبر خان محاذ پر پہنچا اور اپنی تینوں عظیم پلٹنوں، ساتویں ایف ایف آٹھویں ایف ایف اور گیارہویں بلوچ یا ساتھ مجاہدین اور قبائلی لشکروں کو جیسے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ وہ تجویز بنانے تک بھارتی آگے آ گئے تھے کہ ان کو دونوں بریگیڈوں کو پیش قدمی کیلئے ہر وقت پورے ڈویژن کی توپیں اور بکتر بند گاڑیوں کا حرکتی فائر میسر ہوتا تھا کہ وہ ان کے پیچھے درمیان میں پیش قدمی کر رہے تھے۔ یہ عاجز اپنے سب مجاہدین کو سلام کرتا ہے کہ ان کا دفاع کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ہر بھارتی پیش قدمی کا وہ بھرپور دفاع کر کے بھارتیوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچاتے تھے اور اکثر پیش قدمیوں کو روک لیتے تھے۔ اگر حملہ اور پیش قدمی زیادہ زور دار ہوتی تو وہ آگے سے ہٹ جاتے تھے اور پہاڑوں کی اوٹ میں بھارتیوں کے بازوؤں پر حملہ کر دیتے تھے اور بھارتی ایک ماہ میں دو میل سے زیادہ پیش قدمی نہ کر سکے کہ ہمارے مجاہدین نے ان کو چھلنی کر دیا اور اب جوابی حملہ کی ہماری باری تھی۔

چنانچہ 8 جولائی کو اکبر خان نے بھارتیوں کی پیش قدمی کو پانڈو کے مقام پر تہس نہس کرنے کیلئے

گیارھویں بلوچ کے کرنل ملک شیر بہادر بعد میں جنرل کو تجویز بنانے کے احکام دیئے۔ بھارتیوں نے پانڈو کی فتح کی سکیم کو ''کراچی کی فتح'' کا نام دیا تھا تو اکبر خان نے ملک شیر بہادر کی تجویز کو منظور کرتے ہوئے اس کا نام ''دہلی کی فتح'' رکھا اور 17 جولائی 1948ء کے حملے کے پورے احکام دیئے اور 20/21 جولائی کو حملے کے تمام شرکاء نے اپنے مقصودوں کی طرف خاموشی سے پیش قدمی شروع کر دی۔ لڑائی کی پوری کارروائی میری کتاب میں ہے۔ پانڈو کی چوٹی اور گاؤں کے علاقے پر ایک پوری بھارتی بہار پلٹن قابض تھی۔ نزدیک ہی سکھ پلٹن کی دو کمپنیاں تھیں اور ہماری گیارھویں بلوچ کو صرف 19 بلوچ کی ایک فالتو کمپنی اور چند قبائلی مجاہدین مدد کیلئے دیئے گئے تھے اور گو حملہ کیلئے تین گنا برتر طاقت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس برابر کے مقابلہ میں گیارھویں بلوچ اور خاص کر پلٹن کی میجر حفیظ آفریدی کی ڈی کمپنی نے جذبہ جہاد سے جس طرح اس کارروائی کو قرونِ اولیٰ کے مسلمان مجاہدین کے جذبہ کی یاد کو تازہ کر دیا' تو جہاد کشمیر کے واقعات میں ہماری کامیابیوں کا یہ سنہرا باب ہے۔ اس میں کمزوری صرف کیپٹن قیوم شیر کی وجہ سے بی کمپنی نے دکھلائی کہ وہ وقت پر اپنا مقصود حاصل نہ کر سکی اور دوسرے مجاہدین نے مزید قربانی دے کر اس کمی کو پورا کیا۔ قیوم شیر کو اکبر خان نے ایڈورس رپورٹ پر رکھا اور اس کی ترقی بند کر دی لیکن 1951ء میں جب اکبر خان سازش کے مقدمہ میں دھر لیا گیا تو قیوم شیر نے اس کے خلاف غلط سلط گواہیاں دے کر اپنی رپورٹ صحیح کرالی اور ستمبر 65ء کی جنگ میں لاہور محاذ پر بریگیڈئر بن گیا اس کے رویوں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے کہ غلط قسم کے لوگ ہماری فوج میں کس طرح ترقیاں کرتے رہے اور تب ہی لاہور میں قیوم شیر کی کوتاہیوں پر پہلے تبصرہ ہو چکا ہے۔

بہرحال پانڈو کی جنگ میں بھارتی بہار پلٹن بالکل تہس نہس ہو گئی اور تقریباً ایک بریگیڈ کی نفری کو فرار اختیار کرنا پڑا کہ ہم پہلے گزارش کر چکے ہیں کہ بھارتی اوڑی تک پسپائی کر گئے اور سری نگر سے جو بریگیڈ شمال میں درہ زوجیلہ اور کارگل میں کمک کیلئے جا رہا تھا۔ ان کو اوڑی محاذ پر پہنچنے کے احکام مل گئے اور آدھی نفری وہاں پہنچ بھی گئی کہ ہمارے انگریز جنرلوں نے اکبر خان کو قاضی ناگ سے آگے بڑھنے سے روک دیا تو وہ نفری واپس سری نگر چلی گئی اور اس کے زوجیلہ پر حملہ کی کہانی ہم بعد میں بیان کریں گے کہ اوڑی محاذ میں ہماری ان فتوحات نے بھارت پر ظاہر کر دیا کہ وہ مظفر آباد کو فتح نہیں کر سکتے اور فائر بندی تک اس محاذ پر بے شمار چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں اور ہماری دوسری پنجاب کے کیپٹن سرور شہید نے عظیم قربانی دے ''کرتل پترا'' کے مقام پر دشمن کو تہس نہس کیا اور خود پاکستان کے پہلے نشان حیدر کے اعزاز کے حامل بنے کہ ان سب علاقوں میں جنگ اتنی زیادہ وسعت اختیار کر گئی کہ ٹانٹھم کے ساتویں ڈویژن سے یہ علاقے لے کر جنرل نذیر احمد کے نویں ڈویژن کے حوالے کر دیئے گئے اور ساتواں ڈویژن صرف پونچھ اور اس کے جنوب کا ذمہ دار رہ گیا جہاں انگریز جنرلوں نے سازشیں کیں۔

باندی پورہ کے محاذ پر میجر حسن خان دو سو مجاہدین کے ساتھ بھارتیوں کو الجھائے ہوئے تھا۔ برف پگھلنے کے بعد حالات کچھ بہتر ہوئے تو بھارتیوں نے وہاں ایک بریگیڈ بھیج دیا۔ میجر حسن خان نے البتہ اپنی کمزوری بھارتیوں پر ظاہر نہ ہونے دی اور بھارتیوں کو تراغ بل کی وادیوں اور گلیات میں پھنسائے رکھا۔ میجر اسلم نے گلگت بیٹھ کر اپنے لئے تو پاکستان آرمی میں پکی نوکری بھی حاصل کر لی تھی اور بعد میں جنرل گریسی سے ''اسلم انسٹرکشن''

کے تحت سنیارٹی بھی حاصل کر لی تھی۔ وہ پوسٹ وار میں خاندان کے لئے بہت کچھ حاصل کرنے کیلئے اپنے بھائی میجر نصر اللہ کیلئے بھی کافی کچھ حاصل کرتے رہے تو سب سے چھوٹے انور کو بھی کیپٹن بنا کر بانڈی پور کے پیچھے گریز کے علاقے میں سپلائی افسر بنایا ہوا تھا کہ گذارش ہو چکی ہے کہ پورا خاندان' سپلائی کے ٹھیکوں سے خوب کمائی کر رہا تھا۔ جون میں ان کو فرنٹیئر کانسٹیبلری سے فلووائی' کولواں والے راستے گریز کیلئے کوئی دو ہزار مجاہدین کی مدد مل گئی۔ میجر اسلم نے میجر حسن خان کو بھی پاکستانی فوج میں پکا کمیشن دلانے کے بہانے محاذ سے ہٹا کر راولپنڈی انٹرویو کے لئے بھیج دیا اور اس محاذ کی کمانڈ اپنے نوجوان بھائی کیپٹن انور کو دے دی کہ اس کا بھی نام ہوگا۔ لیکن موسم کے کھل جانے کی وجہ سے بھارتی فوج کروٹ لے چکی تھی اور چند مجاہدین اُن کیلئے تر انوالہ تھے کہ بھارتیوں نے ان کو گریز کے قریب تر دھکیل دیا بریگیڈئر شیر خان نے جلدی سے میجر حسن خان کو اس محاذ پر بھیجا لیکن جو کچھ بھارتی حاصل کر چکے تھے۔ ان سے اب واپس لینے کے اوقات گزر گئے تھے۔ البتہ میجر حسن خان نے بھارتیوں کی مزید چلم چوکی اور دوسائی کی طرف پیش قدمی روک دی لیکن گریز تک وہ اب بھی قابض ہیں۔

کہ 15 مئی 1948ء کو اکبر خاں کو پانچ ہزار قبائلی مجاہدین کے ساتھ شمالی علاقوں میں کام کرنے کی پیشکش کے ذریعہ سے جو اوڑی محاذ سے ہٹانے کی کوشش کی گئی تھی تو اکبر خان کا جواب بڑا ''فوجی' تھا کہ یہ بہت اچھی تجویز ہے لیکن اب مجاہدین کو اکٹھا کرنے اور سب بندوبست طے کرنے میں اتنا وقت لگے گا کہ اس تجویز کی اچھائی کا وقت گزر گیا ہے کہ بھارتی فوج کروٹ لے چکی ہے۔ اگر اکبر خان کو طارق ہیڈ کوارٹر سے نہ ہٹایا جاتا تو اس کی تجویز کے تحت ہم جو کارگل اور دراس کے اہم مقامات کی جو فتوحات حاصل کر چکے تھے۔ ان فتوحات کو آگے بہت آسانی سے سری نگر کی تمام شمالی حدود تک بڑھایا جا سکتا تھا بلکہ لِہ کا علاقہ تو کب کا ہماری جھولی میں گر چکا ہوتا کہ بھارتیوں نے ایک دو دفعہ لِہ کو خالی کرنے کی تجویز بھی بنائی اور اب چند سال پہلے جو ہم نے کارگل کی کچھ پہاڑیوں پر قبضہ کیا تو واشنگٹن اور دہلی میں ہل چل مچ گئی۔ اس زمانے میں لِہ حاصل کرنے کے علاوہ ہم مجاہدین کو سری نگر کے مشرق میں ضلع اسلام آباد اور کشتواڑ کے علاقوں میں بھی پیش قدمی کرا سکتے تھے تو بھارتی فوج ہمارے چنگل میں پھنس کر تہس نہس ہو جاتی اور اب بھی فطرت نے بھارتیوں کو بیرونی جارحیت میں ایسا پھنسایا ہوا ہے کہ سات لاکھ فوج پر بے مقصد خرچ کر رہے ہیں۔ صرف اس '' قافلہ سخت جان'' کے ظاہر ہونے کا شاید فطرت کو انتظار ہے کہ بھارت کفر سے پاک ہو تو پاکستان کے وجود میں آنے سے ہنود اور یہود کی کسی آخری تباہی کے آثار بھی کچھ صاحب نظر لوگوں کو نظر آتے ہیں لیکن 1948ء میں جو قدرت نے ہمیں بھارتی فوجی مشینری کو کشمیر میں تباہ کرنے کے مواقع عطا فرمائے' ہم ان کا استعمال نہ کر سکے کہ ہر کام ادھورا یا بے دلی سے کیا۔ بیچ میں خود غرضی والے لوگ بھی تھے اور جائیدادیں اور مال بھی بٹ رہے تھے۔ یاد رہے کہ جب تک ہم مسلمان قوم سورۃ الانعام کی آیت مبارکہ 162 کے تحت اپنے مرنے جینے اور سب اعمال کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع نہیں کرتے۔ یہ ذلتوں کے ایام ختم نہ ہوں گے۔

کارگل' دراس اور پنڈراس سے آگے درہ زوجیلہ ایک بہت اہم مقام ہے۔ 12 جون سے 22 جون تک میجر محمد خان جرال نے جس طرح سترہ ہزار بلند علاقوں کو بازوؤں سے عبور کرا کے اپنے عظیم ماتحتوں لیفٹینٹ شاہ

خاں اور صوبیدار رستم وغیرہ کی مدد سے بھارت کی پوری پٹیالہ بٹالین کو شکست دی اور زوجیلہ کو فتح کیا' وہ بھی جہاد کشمیر کی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے کہ 3 جولائی تک ہوائی جہازوں کی مدد سے بھارتی جوابی حملے بھی کرتے رہے لیکن ہمارے مجاہدین وہاں پر چٹان کی طرح جم گئے تھے بلکہ مجاہدین نے کارگل سے رنسکار کے راستے لہ کیلئے بھی پیش قدمی شروع کی ہوئی تھی کہ علاقہ رنسکار میں مردوں کی بجائے عورتیں' مردوں کو بیاہ کر لے آتی ہیں اور وہاں کی سرخ گالوں اور چھریرے بدن والی خوبصورت عورتوں کے مقابلہ میں مرد ثانوی حیثیت رکھتے ہیں تو انہوں نے مجاہدین کو خوش آمدید کہا۔ حالانکہ لوگ مسلمان نہ تھے کچھ نیم بدھ مذہب اور کچھ لامذہب قسم کے لوگ تھے تو زوجیلہ پاس کی طرف واپس جاتے میجر محمد خان اور اُس کی ''پنجابی'' نفری نے علاقے کے مجاہدین کے ساتھ مل کر جن میں ہنزہ اور گلگت کے کئی علاقوں کے مجاہدین شامل تھے 23 ستمبر تک اس علاقے میں جو بھارتی حملے پسپا کیئے کہ خاص کر 11 ستمبر کو قائداعظم کی وفات کے بعد جنرل تھمایا کو حکم ملا کہ وہ اپنی نگرانی میں یہ حملے کرائے لیکن زمین کا صحیح استعمال کر کے مجاہدین نے یہ حملے پسپا کیئے البتہ سازش بڑی گہری تھی اور اب آخری فائر بندی والی سازش سے جہاد کو جمود دلوانے کا وقت قریب آ گیا تھا تو جس طرح بعد میں جنوبی محاذ پر سازشیں کر کے یا انگریزوں کے پروردہ افسروں سے کوتاہیاں کرا کے راجوری' جھنگڑ کے ساتھ پونچھ کا رابطہ بندھوا کر اکتوبر اور نومبر 1948ء میں وسیع آزاد علاقے بھارت کو دلا دیئے۔ زوجیلہ دہ اور کارگل دشمن کے حوالے کرا کے شمالی علاقوں سے بھی وسیع آزاد علاقے بھارت کو دلا دیئے گئے۔

اول میجر اسلم کی جگہ کمانڈ ایک قادیانی کرنل غلام جیلانی کو دی گئی جو بعد میں ہماری فوج میں میجر جنرل بھی بن گیا۔ اور میجر محمد خان اور اس کی ''پنجابی'' نفری کو اچھے کام کا ''بہانہ'' کر کے چھٹی پر بھیج دیا۔ اور نئی نفری سے ایک میجر قریشی جس کا تعلق پشاور سے تھا اور انگریزوں کا نہ صرف ''پروردہ'' تھا۔ بلکہ اس کو جس نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ الفاظ لکھتے مجھے شرم آتی ہے۔ اس کو زوجیلہ اور کارگل کے علاقہ کا بڑا کمانڈر بنایا گیا۔ جس نے پرانے اور اپنے نئے دستوں کو ملا کر 800 نفری کا نام ''جابر فورس'' رکھا۔ پرانے مجاہدین نے رپورٹ دی کہ بھارتی توپوں اور ٹینکوں کو آگے لانے کیلئے سونا مرگ سے زوجیلہ تک سڑک چوڑی کر رہے ہیں اور علاقے میں کچھ ٹینک بھی دیکھے گئے ہیں کہ مجاہدین کو چھوٹے ٹینک توڑ ہتھیار ''انرگا'' یا ''ایم نائن ون'' دیئے جائیں۔ کرنل جیلانی نے اس رپورٹ کو صحیح ماننے سے انکار کر دیا کہ اتنی اونچائی پر اکتوبر میں سٹیورٹ ٹینک نہیں لائے جا سکتے۔ تو کرنل جیلانی اور میجر قریشی نے زوجیلہ کے دفاع کو تین کمپنیوں کی بجائے صرف چار پلٹونوں کی ذمہ داری پر رکھا کہ سردیوں میں دشمن ادھر حملہ نہ کرے گا یعنی چھ سو نفری کو' ڈیڑھ' دو سو کر دیا اور بچی ہوئی نفری کو لے کر میجر قریشی خود بھی زوجیلہ کو چھوڑ کر مقابلتاً کم بلند مقام ''دراس'' پر گیا اور کرنل جیلانی نے تو جوابی حملوں کو روکنے کی جا کر مجاہدین کو مبارک بھی نہ دی تھی۔ کہ ''رنسکار'' کے علاقوں سے لہ کی طرف پیش قدمی والوں کی نزدیک سے حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس محاذ پر گشتی کارروائیوں کو بھی محدود کر دیا گیا۔ بھارتیوں نے ایک بریگیڈ اور چند ٹینکوں کے ساتھ 20 اکتوبر 1948ء کو حملہ کی تجویز بنائی اور اس دن بارش ہو گئی تو بھارتی تاریخ کے مطابق اوپر سے حکم ملا کہ بارش کی پرواہ نہ کی جائے۔ وقت ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے اور 21 اکتوبر کو بھارتی راجپوت اور پٹیالہ پلٹنوں نے

دوطرفہ حملہ کیا۔ ٹینک فائر کی مدد دے رہے تھے۔ بارہ گھنٹے آگے والی دو پلٹونوں نے مقابلہ کیا اور بارہ گھنٹے پیچھے والی دو پلٹونوں نے۔ مجاہدین نے ٹینک نہ دیکھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ "لوہے کے گھوڑے" آگئے ہیں اور پتھروں سے کچھ سڑک بلاک کی۔ لیکن کیسے مقابلہ کرتے۔

22 اکتوبر کو بریگیڈ کی تیسری گورکھا پلٹن نے آگے پیش قدمی شروع کر دی۔ میجر قریشی نے صرف اپنے سے آدھی نفری پنڈراس بھیجی۔ برفباری اور سڑک کو چوڑا کرنے میں بھارتیوں کو آٹھ دن صرف کرنے پڑے اور یکم نومبر کو انہوں نے پنڈراس پر قبضہ کرلیا اور 16 نومبر کو بھارتی دراس پر بھی قبضہ کر چکے تھے کہ میجر قریشی کے بارے میں خبر نہ ملی کہ کہاں ہے، کہ نومبر کے آخری دنوں میں مارول کے مقام پر "ظاہر" ہوا کہ اکثر مجاہدین گلتری کی طرف چلے گئے تھے۔ کرنل جیلانی "زنسکار" کے علاقے میں یہ خبریں سن کر سر پر پاؤں رکھ کر جب کارگل پہنچا' تو اس وقت بھارتی دراس سے آگے کارگل کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ تو کرنل جیلانی بھی بھاگ کر مارول میں جا کر میجر قریشی کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں پنجابی کی یہ مثال بغیر ترجمہ کے بڑی موزوں رہے گی۔"

"جتھوں دی کھوتی اُتھے ہی ونج کھلوتی"

جہاد کشمیر کے سلسلہ میں راولپنڈی کے پہلے سیمینار میں میجر جنرل غلام جیلانی موجود تھا اور وہ گھبرا گیا تھا کہ یہاں تو لوگ سچ بول رہے ہیں اور جب میجر محمد خان جرال' غلام جیلانی کی کوتاہیوں کے بیان پر آیا تو اس کا وقت پورا ہو گیا۔ سامعین نے شور مچایا کہ محمد خان کو تقریر جاری رکھنے دی جائے۔ لیکن فیصلہ ہوا کہ اگلے سیمینارز خاص کر مظفر آباد اور سکردو کے سیمینار میں پوری بحث ہو سکتی ہے کہ جنرل غلام جیلانی کو جواب کا موقع بھی دیا جانا چاہیئے۔ جنرل جیلانی نے اس وقت "ہاں" بھری۔ لیکن کوشش کے باوجود جنرل جیلانی کسی جگہ سیمینار میں نہ آیا۔ میجر محمد خان کی "پنجابی نفری" کا مطلب مہاراجہ کشمیر کی پلٹنوں کے پونچھ اور میر پور کے مسلمان کے نوجوان تھے۔ (جن کو پنجاب کے نزدیکی اضلاع سے ہونے اور اُن کی زبان پنجابی ہونے کی وجہ سے یہ نام دیا جاتا تھا) جو حسن خان اور محمد خان کے ساتھ گلگت کی آزادی کی کارروائی میں شریک تھے۔ محمد خان اور ان میں سے چند پرانے مجاہدین اور سکردو میں علاقے کے کئی مجاہدین سیمینار میں موجود تھے۔ وہ زوجیلہ کو "درہ دانیال" کا نام دیتے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ میجر قریشی اگر اپنی آٹھ سو کی نفری زوجیلہ میں رکھتا اور ان کے پاس ٹینک توڑ ہتھیار ہوتے تو بھارتی حملہ آور پہلے حملوں کے مقابلہ میں اور زیادہ نقصان اٹھاتے کہ زوجیلہ کے بعد بھی زمین ایسی تھی کہ صرف چار پلٹونوں نے ایک ماہ تک دشمن کا مقابلہ کیا۔

جنرل جیلانی قادیانی تھا اور مشہور قادیانی مبلغ کیپٹن فضل الرحمٰن کا داماد تھا اور پونچھ میں جنرل گریسی کی "گیم" کھیلنے والے جنرل حیاء الدین قادیانی کا ہم زلف تھا۔ اب ہم جنوبی محاذ پر واپس جاتے ہیں کہ وہاں کرنل وحید حیدر قادیانی (بعد میں بریگیڈئر) اور عبدالعلی ملک قادیانی (بعد میں جنرل) اور اختر ملک کے چھوٹے بھائی کی ملی بھگت اور سازش سے کس طرح "ریچھ" اور "فیڈک" کی پہاڑیاں بغیر لڑائی کے خالی کر دی گئیں کہ بھارتی ذرائع آمدورفت کو نوشہرہ کے فوجی مستقر سے کوئی خطرہ باقی نہ رہ جائے کہ بھارتی راجوری اور جھنگڑ سے پونچھ تک زمینی رابطہ قائم کر لیں۔ جنوبی محاذ پر بھارتی جھنگڑ اور راجوری پر قابض ہونے کے باوجود' آگے پونچھ کے ساتھ رابطہ نہ

باندھ رہے تھے کہ پٹھانکوٹ سے جموں یا جموں سے اکھنور وغیرہ تک تو مجاہدین پر ''جھاڑو'' پھیر دینے کی وجہ سے ان کے ذرائع آمدورفت کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ لیکن اکھنور سے آگے بیٹری پتن والے راستے نوشہرہ کے ذرائع آمدورفت خطرہ میں تھے کہ پہلے گذارش ہو چکی ہے کہ نوشہرہ پر ہمارے حملے کی ناکامی کے بعد بھمبر محاذ الگ ہو گیا تھا اور نوشہرہ کے نزدیک یا جنوب میں بھمبر محاذ پر ہمارا دفاع قدرتی طور پر بہت محفوظ تھا کہ بھارتی نوشہرہ کی طرف سے اس محاذ پر حملہ نہ کر سکتے تھے کہ کھڑی چٹانیں تھیں اور ان پہاڑیوں کو ہم اُن کی شکل کی وجہ سے ان کو ''ریچھ'' اور ''فیڈک'' کی پہاڑیاں کہتے تھے کہ باغسر اور امرگڑھ قلعہ یا کبوتر گلہ یا کالی دھار سے یہ پہاڑیاں ایسی شکل میں نظر آتی تھیں کہ درمیان میں سوانی وادی ہے' جہاں آج کل بھی اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔

مئی 1948ء سے ان پہاڑیوں پر ہماری شاہین مجاہد پلٹن تھی جس کی کمانڈ میجر عبدالعلی ملک کر رہا تھا۔ ساتھ اعظم پلٹن مغرب میں تھی اور خان آف منگ اور کشمیر اخان کا لشکر بھی تھا۔ بھارت اگر ان سب علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا تو اس کی ایک ڈویژن سے زیادہ فوج کی ضرورت صرف ان علاقوں پر قابض رہنے کیلئے تھی کہ زمینی حالات ایسے تھے۔ بھارت نے ایک دفعہ بھمبر محاذ پر بکتر بند دستوں کی مدد سے چھمب جوڑیاں سے اسٹر کے علاقوں تک قبضہ کرنے کی کوشش کی' تو بہت جانی نقصان اٹھایا اور کچھ بھی حاصل نہ کر سکا۔ اس لئے بھارت کو صرف اتنی دلچسپی تھی کہ سب علاقے کی بجائے نوشہرہ کے نزدیک ان دو پہاڑیوں جن کو ''ریچھ'' اور ''فیڈک'' کہتے ہیں اگر ان پر اس کا قبضہ ہو جائے تو نوشہرہ کے ذرائع آمدورفت کیلئے سب خطرے ختم ہو جائیں گے۔ ان مقامات کو جو بغیر لڑائی کے چھوڑ دیا گیا اور بھارتیوں نے ڈر ڈر کر وہاں تین دن بعد قبضہ کیا اور ہمارے اوپر والوں یعنی علاقے کے سیکٹر کمانڈر بریگیڈئر خالد مسعود شیخ (بعد میں جنرل اور وفاقی وزیر) کو کافی دیر کے بعد پہلی ایف ایف کے کرنل بختیار رانا (بعد میں جنرل) کی وساطت سے اطلاع ملی کہ ان کے ایک اہم پوزیشن ''ریچھ'' اور ''فیڈک'' سے ان کا میجر عبدالعلی ملک شاہین پلٹن کو بھگا کر پندرہ میل پیچھے اسٹر کے علاقے میں لے گیا ہے اور کرنل رانا نے مزید بتایا کہ ان کو بھاگتے دیکھ کر ان کا ایک میجر مسعود باغسر اور کبوتر گلہ کے علاقوں سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ لیکن کرنل رانا چوکنا تھا۔ تو سینئر سردار کی مدد سے وہ تو اپنے پوزیشن پر قائم ہے۔ (قارئین کی دلچسپی کیلئے۔ کرنل رانا نے میجر مسعود کو ایڈورس رپورٹ دے کر اپنی یونٹ سے نکال دیا تھا۔ لیکن کوئی پلٹن مسعود کو لینے کو تیار نہ ہوئی۔ ایک سال اس نے سٹاف پر کام کیا۔ پھر فوج چھوڑ گیا)۔ لیکن میجر عبدالعلی کے سلسلہ میں بریگیڈئر شیخ نے کرنل سرفراز (بعد میں جنرل) کو بھیجا کہ حالات کا جائزہ لیا جائے اور ساتھ ہی میجر (بعد میں کرنل) راجہ محمد عنایت کو بھیجا کہ وہ عبدالعلی کی جگہ لے کر شاہین پلٹن کو واپس محاذ پر لے جائے۔ میرے پاس تمام لوگوں خاص کر کرنل راجہ عنایت کی ہاتھ کی لکھی ہوئی رپورٹ موجود ہے۔ عبدالعلی کے دفاع میں ایک گواہی موجود نہیں۔ لیکن ذمہ داری سیکٹر کمانڈر پر ڈالی جاتی ہے کہ اس نے عبدالعلی کے خلاف کارروائی نہ کی کہ وہ 18 پنجاب کا کرنل (بعد میں بریگیڈئر) وحید حیدر تھا اور وہ بھی قادیانی تھا۔

راقم نے بعد میں اسی علاقے میں جہاد میں حصہ لیا اور کئی دفعہ گشتی دستوں کے ساتھ ان دونوں پہاڑیوں ''ریچھ'' اور ''فیڈک'' کی دیکھ بھال کیلئے رات کے وقت گیا اور دن کو سوانی وادی یا نزدیک سے زمین کے اکثر

علاقوں کے جائزے تیار کرنے تھے' کہ دسمبر 1948ء میں یہ پہاڑیاں دشمن سے واپس لینے کو ''مقصود'' بنا کر اس علاقے میں توپوں کی ''آتش بازی'' سے جو ''ڈرامہ'' رچا کر فائر بندی کی' راقم ان سب ''غداریوں'' کا چشم دید گواہ ہے کہ مجھے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ کچھ لوگوں سے ''غداری'' کرا کے یہ پہاڑیاں بھارت کو دی گئی ہیں۔ یہ بھارت سے کبھی واپس نہ لی جائیں گی اور اب جو سیمینار ہوئے تو اس عاجز نے راولپنڈی کے سیمینار میں اس زمانے کے ڈرامے کے بڑے ''ایکٹر'' بریگیڈئر بعد میں جنرل نوابزادہ شیر علی کو جو سچ سنایا تو وہ مائیک چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ قارئین' راقم کسی طرح اس زمانے میں ایڈورس رپورٹ پر رہا اور پھر میری وہاں سے تبدیلی کر دی گئی۔ سب واقعات بیان کرنے سے بات لمبی ہو جائے گی۔ مختصر بات یہ ہے کہ اس عاجز نے سچ تلاش کر لیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ''غداری'' جنرل گریسی اور ٹاٹھم نے اپنے ''چنیدہ'' آدمیوں سے کرائی۔ جس سلسلہ میں شروع کے مضامین میں بریگیڈئر صدیق ستی کا حوالہ دے چکے ہیں کہ ایسے ہوتا رہتا تھا۔ یہ شاہین پلٹن ایک آزاد پلٹن تھی جو ایک محمد نواز نے کھڑی کی تھی اور ان اہم پہاڑیوں پر تعینات تھی۔ مئی 1948ء میں محمد نواز کو ہٹا کر موجودہ تیرھویں پنجاب کے میجر عبدالعلی ملک کو اوپر کے ''احکام'' کے تحت اس پلٹن کی کمانڈ دی 30 مئی کو بریگیڈئر اعظم کے بریگیڈ کو کشمیر کے اس لمبے چوڑے محاذ سے تبدیل کر کے' بریگیڈئر شیخ کے بریگیڈ نے ذمہ داری لینا تھا۔ 70 میل کی لمبائی میں پھیلے ہوئے محاذ جس کے سات چھوٹے چھوٹے سیکٹر تھے اس میں ذمہ داریاں تبدیل ہو رہی تھیں تو بھمبر کے چھوٹے سیکٹر میں خاص کر اٹھارویں پنجاب کے کرنل وحید حیدر قادیانی کو عارضی ذمہ داری دی کہ بعد میں یہ ذمہ داری چھٹی پنجاب کے کرنل سرفراز (بعد میں جنرل) نے سنبھالنا تھی۔

اسی تبدیلی کے دوران 2 جون کو عبدالعلی شاہین بٹالین کو لے کر اس علاقے سے فرار کر گیا' کہ دشمن توپخانہ فائر زیادہ کرتا ہے جس کے کچھ اثرات اعظم آزاد پلٹن پر بھی ہوئے' لیکن ساتھ خان آف منگ اور کشمیرا خان اپنی پوزیشنوں پر ڈٹے رہے۔ پہلے گزارش ہو چکی ہے کہ بریگیڈئر شیخ کو یہ خبر چند دن بعد ملی کہ 4 جون کو بھارتی تاریخ کے مطابق بھارتیوں نے ان پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔ کرنل سرفراز اور میجر عنایت' عبدالعلی اور اس کی پلٹن کو پاکستانی علاقے اسٹر سے لے کر 6 جون کو ان پہاڑیوں کے دامن میں پہنچے تو ان کو کشمیرا خان اور خان آف منگ کے مجاہدین نے بتایا کہ اب بھارتی ان پہاڑیوں پر قبضہ کر چکے ہیں۔ عبدالعلی کو تیرھویں پنجاب میں واپس بھیج دیا کہ وحید حیدر انکوائری کرے گا کہ غلطی تھی یا مجبوری تھی کہ پلٹن والوں نے کیوں فرار اختیار کیا۔ وحید حیدر نے عبدالعلی کو اتنی اچھی رپورٹ دی کہ اس اچھی رپورٹ پر بعد میں وہ کرنل بن گیا اور ستمبر 1965ء میں اچھی رپورٹ لے کر جنرل بن گیا۔ قارئین یہ عاجز نہ صرف عبدالعلی بلکہ اس کے بڑے بھائی اختر ملک کو بچپن سے جانتا ہے اور ان کے باپ غلام نبی کو بھی جو ہمارے ضلع کا سکول انسپکٹر بھی رہا تھا۔ 55-1954ء میں کاکول میں اس کے ساتھ ملاقات ہوئی' کہ اپنے تیسرے بیٹے مجید کے افسر بننے کی تقریب پر آیا ہوا تھا۔ تو مجھ سے پوچھا ''بچوں کو تعلیم کس سکول سے دلا رہے ہو۔'' عرض کی ''سرسید سکول سے۔'' کہنے لگا کہ ''کسی مشن سکول میں کیوں نہیں بھیجتے'' تو عرض کی کہ ''عیسائیت'' کے اثرات سے بچنے کیلئے کہنے لگا۔ بڑی غلطی کر رہے ہو۔ ہم سب نے ''عیسائی'' ہو جانا ہے۔ بہتر ہے کہ عیسائی اداروں میں تعلیم حاصل کر کے ''اچھے عیسائی'' بنیں۔ قارئین اس بات کو معمولی بات نہ سمجھنا۔

غلام نبی، غلام کذاب کا ''حواری'' تھا۔ مرزا غلام کذاب اور اس کے نزدیک والوں کو معلوم تھا کہ مرزا غلام کذاب نے جھوٹ اپنایا ہوا ہے اور یہ کچھ انہوں نے ''پکھنڈ'' بنایا ہوا تھا کہ لوگوں کو مسلمان نہ رہنے دو اور اہل مغرب کی غلامی اختیار کرو۔

قائداعظم کو اللہ تعالیٰ نے مومن کی فراست عطا کی تھی

قادیانیزم ایک ٹریڈ یونین ہے۔ یہ عاجز جو قادیانیوں کے خلاف شرعی عدالت اور سپریم کورٹ میں پیش ہوکر قادیانی سازش کو جیسے ''طشت از بام'' کر چکا ہے۔ اخبار نویس معاملات کی تہ تک نہ جا سکے اور جسٹس شفیع الرحمٰن کا کیا کردار تھا کہ خدا بھلا کرے جسٹس عبدالقدیر چودھری اور جسٹس لون وغیرہ کا کہ وہ میری بات کو کچھ سمجھ گئے اور انہوں نے شفیع الرحمٰن کی گیم کا حصہ بننے سے انکار کر دیا۔ بہر حال اخباروں میں کچھ شائع ضرور ہوا تھا۔ لیکن سازش بہت گہری ہے کہ اس عاجز نے سپریم کورٹ کے سامنے ثابت کیا تھا کہ غلام کذاب اور سرسید کو کسی ایک ہی جگہ سے ایک جیسی ہدایات ملتی تھیں اور ایسی سازشوں کے مہرے کبھی کمال ترکی کے روپ میں۔ کبھی عرب ازم کے روپ میں اور کبھی بعث پارٹی کے روپ میں، اندر سے اسلام کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ اور غلام کذاب کی اس کارروائی کو ایک تاریخی حادثہ کہہ سکتے ہیں۔ آج اگر کوئی ایسا کرے تو اُس کو مرتد کی سزا دی جائے گی۔ چنانچہ سب قادیانی شر پسند ہیں اور اسلام پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ تو اُن سب کو کہا جائے کہ وہ توبہ کریں ورنہ اُن کے لئے دیس نکالا ہے یا مرتد کی سزا۔ علاوہ ازیں ملک خداداد پاکستان میں جھوٹے نبی کا مرکز نہیں ہوسکتا۔ اس کو دریا برد ہونا چاہیے۔ یہی کچھ اس عاجز نے جنرل یحیٰی خان اور اس کے حواریوں کو ستمبر 1970ء میں ایوب ہال میں بتایا اور یہی کچھ جولائی 1971ء میں جنرل نیازی اور جنرل رحیم کو ڈھاکہ میں بتایا کہ ہم لوگوں میں سے کچھ جانتے ہوئے اور کچھ بن جانے ان غیروں کی گیم کھیل رہے ہیں۔ ہمارے اندر آ کر لارڈ ہمفرے، لارنس اور پروفیسر آرنلڈ قسم کے ''مستشرقین'' جو کچھ کرتے رہے۔ یہ ''کھیلیں'' جاری ہیں کہ ہم اپنے معمولی فقہی اختلافات اور فرقہ داری کے اسباب پر اب تک غور کرنے کو تیار نہیں اور باطل نظریات پر اب ان اثرات کی وجہ سے اسلام کے لیبل لگا کر ان کو اپنے ایمان کا حصہ بنا چکے ہیں۔ کاش میں اس سلسلہ میں کھل کر عملی مثالیں پیش کر سکتا۔ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کو یہ کامیابیاں اس لئے ہوئیں کہ علامہ اقبالؒ نے حضور پاک ﷺ کے اس پیغام کو بہت پھیلایا کہ ''اپنے نفس کو پہچانو۔'' اور قائداعظمؒ کو آپ ﷺ کی ذات پاک نے مومن کی فراست عطا کر دی اور وہ مسلمانوں کے دشمنوں کو پہچانتے تھے اور یہ عاجز اس سلسلہ میں کافی عملی ثبوت مہیا کر چکا ہے۔ لیکن میں زیادہ کھل کر لکھوں تو شاید وہ شائع نہ ہو سکے۔

بھارتیوں کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ حیدر آباد پر حملہ کر سکیں

کشمیر کے جہاد کی طرف واپس آتے ہوئے گزارش ہے کہ جون 1948ء میں میجر عبدالعلی کی ''غداری'' کے بعد بھارت کیلئے کشمیر کے ذرائع آمد ورفت کی زیادہ حفاظت کی ضرورت نہ رہی تھی۔ تو جولائی۔ اگست 1948ء میں بھارتیوں نے کشمیر کے محاذ کو کافی حد تک ''ساکن'' رکھا ہوا تھا اور میجر جنرل چودھری کے ماتحت بھارت والوں

نے حیدر آباد دکن کے گرد فوجی ''اجتماع'' شروع کر دیا کہ وہ کسی ''وقت'' کا انتظار کر رہے تھے کہ جب وہ ''گھڑی'' آئے تو وہ حیدر آباد پر ''پولیس ایکشن'' کا نام لے کر قبضہ کر لیں۔ اکبر خان طارق، صدیق ستی اور حسن مرزا اور کئی ہمارے افسران اور جونیئر افسران پر واضح ہو گیا تھا کہ مغربی پاکستان میں ہمارے مقابلہ کیلئے بھارت کے پاس صرف دو پیدل اور دو بکتر بند بریگیڈ رہ گئے تھے۔ تو اب سیالکوٹ سمیت یا چناب کے مشرق کسی جگہ پر ہم کوئی بھرپور حملہ کر کے کسی بھارتی مقبوضہ علاقے کو آزاد کرا لیتے۔ تو بھارت ہماری بین الاقوامی سرحد کو پار نہ کر سکتا تھا کہ مقابلہ میں ہمارے پاس لاہور۔ سیالکوٹ محاذ پر ایک ڈویژن پیدل فوج اور ایک بکتر بند بریگیڈ ریزرو میں موجود تھے۔ نہ بھارت والے ہمارے مجاہدین کے کشمیر کے چھاپوں کی تاب لا سکتے تھے۔ خاص کر جنوبی محاذ پر اگر ایسی فتوحات حاصل کر لیتے جیسی شکل میں ''چچ'' اور ''پانڈو'' کے مقامات پر حاصل کی تھیں۔ تو یہاں ''ڈھنڈ کے چنگس'' کے علاقے، یا بیٹری تین پر سے رابطہ کاٹنے یا اکھنور کے علاقے میں کارروائیوں سے جو کچھ حاصل کر سکتے تھے اس کے ثمرات بہت زیادہ تھے کہ مجاہدین آگے بڑھ کر پھر رام بن اور بانہال پہنچ جاتے اور ابھی تک شوپیاں اور تھنہ منڈی پر ہمارا قبضہ تھا۔ تو پہلے ہم نوشہرہ کے بھارتی ڈویژن کو تہس نہس کر دیتے اور پھر پونچھ پر بھرپور حملہ کر کے اس کو بھی آزاد کرا لیتے کہ ہمارے پاس جنرل ''ٹانھم'' کا ڈویژن اکیلے طور پر مجاہدین کی مدد سے باری باری یہ سب کچھ کر سکتا تھا اور شمال کی ذمہ داری ویسے بھی بعد میں جنرل نذیر کے نویں ڈویژن کو دینا پڑی۔ وہ ذمہ داری ان کو پہلے دینا تھی اور اگر ایسے ہوتا تو جنرل نذیر، بریگیڈیئر اکبر طارق کو قاضی ناگ سے آگے پیش قدمی کرنے سے ہرگز نہ روکتے۔ جس طرح ٹانھم نے ان کو روک دیا تھا کہ وہ مہورا بجلی گھر اور بارہ مولا کو آزاد کرانے والے تھے اور شمال میں اور بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا۔

لیکن ہم نے کچھ بھی نہ کیا۔ صرف ہندواڑہ محاذ سے فارغ ہونے والے کرنل خالد کو جنوبی محاذ پر لے آئے کہ وہ راجوری اور جھنگڑ کے علاقوں کے شمال اور شمال مغرب میں ایک ''بجلی سیکٹر'' کی بنیاد ڈالیں اور تمام مجاہدین کو اپنے کنٹرول میں لے کر بھارتیوں کو راجوری سے پونچھ کی طرف پیش قدمی نہ کرنے دیں۔ کرنل خالد اپنی ''طلسماتی'' شخصیت سے کتنا کچھ حاصل کر سکتے تھے؟ جون 1948ء کے آخر میں بھارتیوں کا ایک بریگیڈ راجوری سے بکتر بند دستوں اور توپخانے اور انجینئروں کی مدد سے۔ انگریزوں کے ''فرنٹیئر وارفیئر'' کے طریقہ کو استعمال کر کے نہ صرف پونچھ کے ساتھ رابطہ باندھ آیا۔ بلکہ جولائی میں واپس بھی آ گیا کہ گو بھارتیوں کے پاس اتنی نفری نہ تھی کہ جہاں سے گزرتے وہاں فوجی چوکیاں بھی قائم کرتے جاتے۔ لیکن یہ بات اب بالکل ظاہر ہو گئی تھی کہ جس دن بھارتیوں کے پاس مزید نفری آ گئی۔ راجوری سے پونچھ کا سیدھا راستہ تو وہ اسی دن قائم کر لیں گے۔ لیکن وہ ایسا رابطہ جھنگڑ، کھوئی رٹہ اور کوٹلی والے بہتر راستے سے کرنا چاہیں گے اور کشمیر میں جو کچھ ہمارے انگریز نوکر بھارتیوں کو دینا چاہتے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ حاصل کر لیں گے۔ کرنل خالد نے اس واقعہ کے بعد علاقے کے بڑے کمانڈر بریگیڈیئر شیخ کو جولائی۔ اگست 1948ء میں ایسی رپورٹ دی اور یہ رپورٹ اوپر بھی بھیجی گئی لیکن انگریز جنرلوں کا جواب تھا کہ بھارتی اس وقت حیدر آباد کے گرد کچھ کرنے والے ہیں۔ سب محاذوں کو ''ساکن'' رکھا جائے کہ بھارتیوں کے حیدر آباد پر حملہ کے بعد ہم کشمیر کو اپنی تجاویز کے تحت آزاد کرا لیں گے۔ انگریزوں کے حکم یا

ہمیں بے وقوف بنانے کی وجہ سے یا ویسے اپنی کمزوریوں کی وجہ سے بریگیڈیئر شیخ کا پورا بریگیڈ اور اس کے چھوٹے سیکٹر کمانڈر کرنل سرفراز وغیرہ نے جنوبی محاذ پر جو صرف ''ٹھک ٹھک'' سے گزارا کیا۔ کشمیر کے ہمارے جہاد کا کئی لحاظ سے یہ بدترین زمانہ ہے۔ حالانکہ یہ دونوں صاحبان پاکستان کی بری فوج کی سربراہی کے ''امیدوار'' تھے اور اپنے اپنے زمانوں میں اس عہدے کے ''نزدیک'' پہنچ گئے تھے کہ ان کو ہماری فوج کے مانے ہوئے پیشہ ور جنرل مانا جاتا رہا۔ لیکن اس عاجز کی تحقیق کے مطابق انہوں نے کشمیر کے جہاد میں دھیلے کا کام نہ کیا اور پھر سرفراز نے ستمبر 65ء کی جنگ میں لاہور محاذ پر چاند چڑھائے اور شیخ نے جنرل کے عہدے پر رہ کر اور ایوب کے ایک وزیر کے طور پر جتنا پاکستان کا نقصان کیا۔ وہ موسیٰ خان اور یحییٰ خان یا حمید کی کارکردگیوں کے بعد دوسرے نمبر پر ضرور آتا ہے۔ لیکن ان آخری تینوں نے تو کشمیر 48-1947ء کے جہاد کے وقت کشمیر کے اندر قدم بھی نہ رکھا اور اس وجہ سے وہ ''بلندیوں'' پر پہنچا دیئے گئے اور جنہوں نے کشمیر جہاد میں کچھ کام کیا یا ان کو کال کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا یا ایوب خان کی کتاب کے مطابق۔ ان کو ان کے ''قد'' کے مطابق ''تراش'' دیا گیا۔ حیرانگی کی بات ہے کہ ایسے ''رویوں'' کے باوجود پاکستان ابھی تک قائم ہے کہ فطرت کو تو صرف یہ دلچسپی ہے کہ روز قیامت سورۃ القیامت کے مطابق ''ناضرہ'' چہرے کن کے ہوں گے اور ''باسرہ'' چہرے کن کے ہوں گے۔ اور ہم ''مواقع تقدیر'' کے مضمون کا جائزہ پیش کر چکے ہیں اور وجہ یہ ہے کہ مومن کی فراست سے عاری لوگ ہمارے رہنما بنے ہوئے ہیں۔

اور حیرانگی کی بات ہے کہ بھارتیوں کو معلوم تھا کہ قائداعظم چند دنوں کا مہمان ہے اور وہ حیدر آباد کے گرد دو ماہ سے انتظار کر رہے تھے کہ ''مرد بیمار'' کے آخری سانس تک ان کو ہمت نہ ہو رہی تھی کہ حیدر آباد پر حملہ کریں اور کون ان کو گھڑی گھڑی کی خبریں دے رہا تھا۔ کیا لیاقت علی جولائی۔ اگست میں قائداعظم کے ساتھ آخری ملاقات میں یہ بھی ''دیکھنے'' کیلئے گیا تھا کہ ''بوڑھا'' کتنے دن مزید زندہ رہے گا۔ یہ عاجز اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہ لکھے گا۔ لیکن ظفر اللہ کے اقوام متحدہ میں ''کردار'' اور ہاشم گزدر کے ''انکشافات'' یا قائداعظم نے راجہ آف محمود آباد کو کیا بتایا۔ ان باتوں کو ذہن میں رکھیں لیکن جو چیز آج تک قوم کو نہیں بتائی گئی اور یہ ''انکشافات'' راقم کے سامنے کچھ پہلے بھی آئے تھے اور اب واقعاتی ثبوت پیش کرتا ہوں کہ بارہ ستمبر 1948ء کو بجلی سیکٹر کے کرنل خالد کو بریگیڈیئر شیخ نے اپنے ہیڈ کوارٹر میں بلایا۔ جو قاضی باقر (جہلم کے نزدیک) تھا کہ وہ کشمیر کے تمام جنوبی محاذ کی کمانڈ سنبھالنے کیلئے تیار ہو جائیں۔ کرنل خالد نے قائداعظم کی وفات کی خبر وہاں سنی۔ ان کو دو تین دن کی چھٹی دی گئی کہ وہ 15 ستمبر تک قاضی باقر پہنچ جائیں۔ وہاں اُن کا ہیڈ کوارٹر ہو گا۔ بریگیڈیئر شیخ کا بریگیڈ جموں کا رابطہ بھارت سے کاٹ دیں گے اور ان کو احکام پہلے سے ملے ہوئے تھے۔ صرف عمل باقی ہے کہ بھارت حیدر آباد پر حملہ کرنے والا ہے اور اس حملہ کے بعد تجویز کے مطابق پاکستانی افواج کشمیر میں داخل ہو کر کشمیر کو آزاد کرا لیں گی۔ کرنل خالد جب 15 ستمبر کو قاضی باقر پہنچا تو بریگیڈیئر شیخ کو وہاں نہ پایا کہ راولپنڈی میں ٹاتھم کو ملنے گیا ہوا تھا کہ کوئی اور ''گھر مکہ'' پک رہا تھا۔ اس کے بریگیڈ میجر بہادر شیر (بعد میں جنرل) اور ڈی کیو میجر فضل رحمٰن (بعد میں بریگیڈیئر) کو بریگیڈیئر شیخ بتا گیا کہ کرنل خالد کو اپنے بجلی سیکٹر میں واپس بھیج دینا اور بتانا کہ وہ ایمرجنسی اور تجاویز ختم ہو گئی ہیں۔ اب کوئی نئی ''تجاویز'' بن رہی ہیں۔ پہلی تجاویز کیا تھیں۔ ان کے بارے انگریز جانے سے پہلے

سب کاغذات جلوا گئے تھے۔ البتہ جنرل شوکت علی شاہ بریگیڈئر قاضی رحیم اور بریگیڈئر محمود جان وغیرہ طارق ہیڈ کوارٹر میں کام کرنے والوں کے ذریعہ سے ہم جانتے ہیں کہ جنرل گریسی نے بریگیڈئر شیر خان کو قائداعظم کے پاس بھیج کر پوری تجویز سے قائداعظم کو آگاہ کیا ہوا تھا اور اس کا ''خاکہ'' بھی مجھے مل گیا تھا لیکن میں اس تجویز کے عملی یا نہ عملی ہونے کا جائزہ اس لئے نہ پیش کروں گا کہ یہ عاجز پہلے ہی جائزہ پیش کر چکا ہے کہ ہم کیا کچھ کر سکتے تھے اور میرے محسن جنرل فضل مقیم مرحوم و مغفور کی کتاب ''تگ و دو'' میں اس سلسلہ میں بہت کچھ ہے۔ بلکہ جنرل حبیب اللہ کے جولائی 1991ء میں نیوز اخبار میں کئی مضامین آئے کہ وہ جنرل ٹاٹھم کے جی ون تھے اور ٹاٹھم نے ان کو کئی دفعہ کہا کہ کشمیر تو ایک ہفتہ کے اندر آزاد کرایا جا سکتا ہے لیکن پاکستان کو ''قانونی'' طور پر ایسے حقوق حاصل نہیں اور یہ عاجز ماؤنٹ بیٹن کی اس سازش کا ذکر بار بار کر رہا ہے کہ انگریز ہمیں کس طرح بے وقوف بناتے رہے۔ ورنہ بھارتی فوج کو کشمیر میں تہس نہس کرنا بہت آسان تھا۔

یہ نئی تجاویز کیا تھیں؟ سازش تھی۔ قائداعظم کی وفات کا انتظار تھا۔ 14 ,13 ستمبر کو بھارت والوں نے حیدر آباد پر حملہ کر دیا اور چار دن کے اندر اس پر قبضہ کر لیا۔ 14 ستمبر 1948ء کو ربوہ کی زمین کا قادیانیوں کے نام انتقال کر دیا گیا اور قائداعظم کی وفات کے سوگ اور صدمہ کو تین دن محدود کرنے کی بجائے۔ قوم کو ''حیران ہوں کہ روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں'' اس راستے پر لگا دیا۔ یعنی جس طرح مرزا غالب مردہ ''مغل'' اور ''اودھ'' کی تہذیبوں کی نوحہ خوانی کرتا ہے ہماری پوری قوم کو اس راستے پر لگا دیا جائے۔

قائداعظم کی زندگی کے آخر ایام میں تو ان کی پوری دیکھ بھال بھی نہ کی گئی اور کراچی ہوائی اڈہ پر ان کو خوش آمدید کہنے والا کوئی نہ تھا۔ اب ان کو قوم کا ''روحانی باپ'' بنا کر قوم کو ''یتیم'' قرار دینے کی سازش شروع ہو گئی۔ حضور پاک ﷺ کے اس دنیا سے اوجھل ہونے کے بعد جناب صدیق اکبرؓ نے تو جناب اسامہؓ بن زیدؓ کی مہم کو ختم نہ کیا۔ بلکہ مدینہ منورہ کو خطرے کے باوجود مہم ملک شام تک بھیجی گئی۔ یہاں بھارتیوں کے حیدر آباد پر حملہ کے بعد قائداعظم کی وفات کا بہانہ بنا کر کشمیر کو آزاد کرانے کی ساری تجاویز ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں اور انگریزوں نے وہ کیا جو وہ کرنے کی تجاویز بنا چکے تھے۔ کیا یہ سب کچھ لیاقت علی کی شہ یا مرضی سے ہو رہا تھا۔ قارئین یہ اندازے خود لگائیں۔ حیدر آباد پر قبضہ کو قائم رکھنے کیلئے صرف ایک بریگیڈ کی ضرورت تھی۔ وہاں سے بھارتی فوج کو فارغ کر کے کشمیر بھیج دیا گیا۔

بھارتی پہلے ہی راجوری سے سرن وادی سے پونچھ تک جاتے ہوئے اور پونچھ سے مینڈھر وادی تک واپسی کی ''مشق'' جون 1948ء کے آخری ہفتہ میں کر چکے تھے۔ اب انہوں نے جھنگڑ میں لاؤ لشکر اکٹھے کرنے شروع کر دیئے۔ کرنل خالد نے بہت شور مچایا کہ اب بھی پکی فوج بھیج کر ان راستوں پر رکاوٹ ڈالی جائے۔ تو ان کو کچھ توپخانہ بھیجا گیا۔ بھارتیوں نے اکتوبر کے وسط میں جھنگڑ، کھوئرٹہ، کوٹلی والے راستے پونچھ کے ساتھ آخری دفعہ رابطے باندھنے کی تیسری کوشش کی۔ تو کرنل خالد کے ماتحت آزاد مجاہدین اور میجر میر باز کی چند توپوں اور خاص کر کیپٹن برہان علی کی آزاد پلٹن سے بھارتیوں کی اس کوشش کو تو ناکام بنا دیا۔ لیکن ٹاٹھم نے پکی فوج کی مدد بھیجنے میں بہت دیر کر دی اور اکتوبر کے آخر میں بریگیڈئر اعظم صرف ایک پلٹن کے ساتھ جنوبی محاذ پر پہنچا کہ بریگیڈیر شیخ

کو اب صرف بھمبر محاذ پر رہنے دیا اور جھنگڑ' راجوری محاذ کے شمالی علاقوں کی ذمہ داری بریگیڈئر اعظم کو سونپی گئی اور کرنل خالد سے ساری ذمہ داری بریگیڈئر اعظم نے سنبھال لی۔ اعظم اس سلسلہ میں کافی ''بدنام'' ہے اور تمام ناکامیاں اس کے سر تھونپی جاتی ہیں کہ ایک دفعہ 1949ء میں اس کو جنرل بنانے کا نمبر بھی کاٹ دیا گیا تھا۔ لیکن اس عاجز کو اعظم کے خلوص پر کوئی شک نہیں۔ وہ اکبر خان طارق والا رویہ تو اختیار نہ کر سکا اور فوجی سپہ گری اور فراست میں بھی وہ بالکل ''گزارا'' تھا اور جو حالات اس کے سامنے ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ ان پر کنٹرول کرنا اس کی فوجی فراست کے قابو میں نہیں آ سکتا تھا۔ تو ہمارے اس جہاد کشمیر کے اس المیہ کو یہ عاجز بہت اختصار سے بیان کر رہا ہے کہ حالات اعظم خان کے کنٹرول یا بس سے باہر تھے۔ اس کو صرف ایک پلٹن تیرھویں پنجاب دی گئی۔ جو اس نے ٹھیک طور پر جھنگڑ کے شمال اور مغرب میں تعین کر دی کہ بھارتی جھنگڑ' کھوریٹہ' کوٹلی والے راستے پونچھ کے ساتھ رابطہ نہ کر سکیں اور باقی جو دو پلٹنیں مانگیں۔ ان میں سے اس کو صرف کرنل وحید حیدر کی اٹھارویں پنجاب ملی۔ جو صرف دو کمپنیوں کے ساتھ آیا اور بریگیڈ اعظم نے وحید حیدر کو مینڈھر کے دفاع کی ذمہ داری دے دی۔ کوئی شرارت تھی یا وحید حیدر قادیانی کی باقی دو کمپنیاں مینڈھر کے علاقہ میں بہت دیر کے بعد پہنچیں۔ یہ واقعات ہم تھوڑی دیر کے بعد اکٹھے لکھیں گے۔

ادھر بھارت والے اتنا لاؤ لشکر اکٹھا کر چکے تھے کہ حیدر آباد حملے سے پہلے لیفٹیننٹ جنرل سری نگیش 2 ستمبر کو جموں پہنچ چکا تھا اور ایک کور ہیڈ کوارٹر کو وہاں براجمان کر چکا تھا۔ حیدر آباد پر جلدی قبضہ کرنے کے بعد اس نے ڈویژن کمانڈر میجر جنرل آتما سنگھ سے 22 ستمبر 1948ء کو بھارتیوں کے راجوری بریگیڈ سے شوپیاں اور تھنہ منڈی پر قبضہ کرا لیا تھا۔ اور پیر پنجال کسی وقت بھی بھارت کی جھولی میں گر سکتا تھا۔ بھارتی پانچواں اور انیسواں بریگیڈ پوری کور کے توپخانہ اور لڑاکا طیاروں کے دسویں سکواڈرن کے ساتھ دو ''رخوں'' یعنی سرن وادی اور مینڈھر وادی میں پیش قدمی کر رہے تھے اور 16 اکتوبر کو انہوں نے پیر بڈیسر پر قبضہ کر لیا۔ تیسرا اور ریڈ بریگیڈ پیچھے پیچھے قبضہ کئے ہوئے علاقوں میں فوجی چوکیاں قائم کر رہا تھا۔ یہ عاجز کرنل رحمت اللہ سلیریا اور ہمارے اس علاقے کے آزاد مجاہدین کے حیدری بریگیڈ وغیرہ کی ٹوٹی پھوٹی آزاد پلٹون کے سب مجاہدین کو سلام کرتا ہے کہ بھمبر گلی اور رام گڑھ قلعہ کے علاقوں میں انہوں نے دشمن کا بڑا بہادری سے مقابلہ کیا کہ بھارتی سیدھے طور پر مینڈھر پر تو قبضہ نہ کر سکے کہ جھیکا گلی پر کچھ دستوں کو چھوڑ کر دونوں بھارتی بریگیڈوں کو ہمارے صرف رائفلوں سے لیس مجاہدین نے پورا ایک مہینہ روکے رکھا لیکن آخر بھارتیوں نے نہ صرف 20 نومبر تک پونچھ سے رابطہ قائم کر لیا۔ بلکہ وہاں سے ایک بریگیڈ نے واپس مڑ کر 23 نومبر کو مینڈھر پر بھی قبضہ کر لیا کہ وحید حیدر قادیانی نے اپنی پلٹن کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے غلط مقامات پر پہلے صرف دو کمپنیوں کو شکست سے دوچار کیا کہ باقی دو کمپنیاں ایسے وقت پہنچیں کہ ان کو بھی شکست کا حصہ بننا پڑا۔ بریگیڈئر اعظم نے مزید مدد مانگ لی تھی اور کرنل شوکت علی شاہ کے ماتحت آٹھویں فرنٹیئر فورس چالیس میل پیدل چل کر پہنچی، جنہوں نے باقی آزاد مجاہدین سے مل کر سونا گلی کے علاقوں میں دفاع اختیار کر کے بھارتیوں کی مزید پیش قدمی کو روک دیا۔ بھارتی بھی اب اتنا کچھ حاصل کر چکے تھے کہ یہ کچھ ''ہضم'' کرنا ان کے لئے مشکل تھا کہ کافی پلٹنیں اب کشمیر کے اس محاذ پر پہنچ چکی تھیں۔ جن کو غلط وقت پر ایک ایک کر کے غلط

مقامات پر استعمال کرا کے انگریزوں نے جو کچھ کرانا تھا وہ کرا دیا لیکن اب جو پکے فوجیوں نے جگہ جگہ آواز اٹھانا شروع کی جو کہ کارروائی کا طریقہ غلط تھا۔ تو مکار انگریز جنرلوں نے جوابی ''ضرب کاری'' کے الفاظ کو استعمال کر کے جہاد کشمیر میں ''آخری مکاری'' کی۔

بھارتی فوج کا انگریز جنرل بوچر جنوری 1949ء میں ریٹائر ہونے والا تھا۔ اس کے بعد انگریز جنرل رسل نے صرف تین ماہ یہ سربراہی کر کے مارچ 1949ء میں ریٹائر ہو جانا تھا۔ انگریزوں نے جو ''گھر مکہ'' پکایا تھا۔ اس کو مارچ سے پہلے تکمیل دینا تھی اور پاکستان کی حکومت کی اجازت سے بھارتی فوج کا سربراہ جنرل بوچر نومبر 1948ء کے آخر میں ہمارے جنرل گریسی کو کراچی میں مل چکا تھا۔ تو جنرل گریسی نے 28 نومبر 1948ء کو جو حکومت پاکستان کو بے وقوف بنانے کیلئے ''ٹاپ سیکرٹ'' خط لکھا تھا اس عاجز کو اس خط کو ''کھلا'' قرار دے کر دے دیا گیا تھا کہ یہ خط ایک ''لیپا پوتی'' تھی۔ جو کچھ گریسی اور بوچر کے درمیان طے پایا وہ چیز آگے واقعات سے ثابت ہوتی ہے کہ کوئی ڈرامہ کرنا تھا کہ فائر بندی کی جائے۔ لیکن گریسی نے ہمارا ہمدرد بن کر اس خط میں یہ لکھا کہ بھارتی جو کچھ حاصل کر چکے ہیں وہ ان کیلئے ''ہضم'' کرنا مشکل ہے۔ اگر ہم کسی جگہ بھارتیوں پر ''جوابی ضرب کاری'' کریں تو بوچر کہتا ہے کہ بھارتی فائر بندی پر تیار ہو جائیں گے۔ اور بوچر سفارش کرے گا کہ بھارتی مینڈھر اور زوجیلہ کے علاقے خالی کر دیں اور پھر کشمیر کا معاملہ اقوام متحدہ کی قرارداد کے تحت حل کیا جائے وغیرہ گریسی نے کہا کہ اس نے اس جوابی ''ضرب کاری'' کیلئے تیاری پہلے سے شروع کی ہوئی ہے۔ اس کو اب اس پر عمل کرنے کی ''اجازت'' ہو۔ ہماری حکومت اور جن کو یہ خط پہنچ گیا' وہ ''باغ باغ'' ہو گئے کہ کشمیر ہمیں ''پلیٹ'' میں مل رہا ہے۔

جنرل گریسی نے ہمارے سب سے سینئر میجر جنرل اکبر خان کو اس کے آٹھویں ڈویژن ہیڈ کوارٹر سمیت کوئٹہ سے بلا کر کہوٹہ میں تعین کیا کہ وہ ٹاٹھم سے پونچھ محاذ کا چارج سنبھال لے اور یہاں جوابی ضرب کاری کی تجویز بنائے کہ زیادہ پروٹیسٹ یہی جنرل اکبر خان رنگروٹ کرتا تھا۔ اس کا جنرل گریسی ایک طرح سے ''منہ'' بند کر رہا تھا۔ یہ اکبر خان' افتخار خان کا بڑا بھائی تھا اور اس کے سنیارٹی والے جنرل کری آپا کو اپریل 1949ء سے بھارت والے بری فوج کی سربراہی دے رہے تھے۔ ہمارے اس اکبر خان نے اسلام پر کافی کتابیں بھی لکھی ہیں اور اپنی کچھ یادیں بھی چھوڑی ہیں جو راقم نے حاصل کر لی تھیں۔ یہ اپنے بھائی سے مقابلتاً بہتر آدمی تھے۔ زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے لیکن ان کا اسلام انگریزوں کو ناپسند تھا اور وہ ان کو ''دقیانوسی'' آدمی کہتے تھے اور اس کی بجائے ایوب خان کو بری فوج کا سربراہ بنا گئے جو ان سے آٹھ سال جونیئر تھا۔ اکبر خان کی ''یادوں'' سے مجھے انگریزوں کی مکاریاں سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ جن کے یہ عاجز کچھ متعلقہ واقعات کے ساتھ حوالے بھی دے گا۔ بہر حال اکبر خان پہلا میجر جنرل ہے جس نے کشمیر کے اندر قدم رکھا اور بہت کچھ مطالعے کئے اور اپنے محاذ کیلئے بڑی عملی جوابی ضرب کاری کی تجاویز بنائیں لیکن انگریزوں نے ان پر عمل سے پہلے اپنی آخری مکاری سے ہمارے کشمیر کے جہاد کو ''جمود'' دے دیا۔ جس کا راقم ''چشم دید'' گواہ ہے۔

جنرل ٹاٹھم نے اب جنرل ''پاشا'' کا نام اپنا لیا اور لاہور سے بریگیڈیئر شیر علی کے چودھویں بریگیڈ سے اس ''جوابی ضرب کاری'' کا ڈرامہ کرایا گیا کہ نومبر کے آخری ہفتہ میں راقم بریگیڈ کے تین اور افسروں کے ساتھ

ہمارے کرنل رشید احمد کی سربراہی میں ایڈوانس پارٹی کے طور پر کھاریاں پہنچا‘ جہاں ٹاتھم کے دو انگریز افسروں کے ساتھ ہماری ملاقات ہوئی‘ جنہوں نے ہمارے پروٹیسٹ کے باوجود ہمیں گرینڈ ٹرنک روڈ کے جنوب میں ''جمگاہ'' بنانے کے احکام دیئے کہ سڑک کے شمال میں ''جمگاہ'' سے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم کشمیر میں کوئی کاروائی کر رہے ہیں۔ ہم نے بہت شور کیا کہ لاہور سے آ کر پہلے جنوب میں ''جمگاہ'' کریں گے اور پھر سڑک کو پار کر کے شمال کی طرف جائیں گے تو ''ڈبل حرکت'' ہوگی‘ لیکن ہماری کوئی بات نہ سنی گئی کہ سب ڈرامے تھے اور فوجوں کے اجتماع کو جان بوجھ کر عام کرنا تھا۔ بہرحال بریگیڈ کے پہنچنے سے پہلے راقم کی بہت ذمہ داری تھی کہ سارے علاقے کی دیکھ بھال کر آئے‘ کہ آگے محاذ پر جانا تھا اور وہاں موجودہ پہلی ایف ایف سے اسٹر کے علاقے میں اور چھٹی پنجاب سے بھمبر کے علاقوں میں جا کر آگے باغسر۔ امر گڑھ قلعہ‘ کبوتر گلہ‘ کالی دھار سب علاقوں کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ جہاں تک جیپ جا سکتی‘ وہاں تک سوار ہو کر اور آگے ''ریچھ'' اور ''فیڈک'' کی پہاڑیوں کو بھی نظر سے دیکھا۔ جہاد کے حالات سن کر بڑی مایوسی ہوئی۔ چھوٹے عہدے والے افسر اور مجاہدین اپنے بڑے افسروں یعنی سیکٹر کمانڈر اور کرنل سرفراز وغیرہ سے بڑے نالاں تھے۔ وہاں ہی اسلام کے عظیم فرزند کیپٹن ظفر اقبال کی کہانی سنی کہ وہ کس طرح ''ریچھ'' پہاڑ پر شہید ہوئے کہ ان کے ساتھ غداری وہاں تعین ایک قادیانی پلٹن کے ساتھیوں نے کی اور حیران ہوئے کہ محاذ پر آگے ایک بڑی حفاظت والی جگہ قادیانیوں کی ایک ''فرقان'' پلٹن متعین تھی کہ باقی مجاہدین تو گڑ‘ چنا پر گزارہ کرتے تھے۔ ان لوگوں کے پاس ڈبوں میں بند دودھ اور پھل اور بسکٹ کی سہولت موجود تھی کہ ہماری بھی ''میزبانی'' کیلئے یہ سب ''تحائف'' لے آئے لیکن یہ عاجز چند لمحے پہلے اپنے جھولے سے اپنا کھانا کھا چکا تھا۔ تو رب کی ذات پاک نے ان کی ''میزبانی'' سے بچا لیا۔ قادیانی واحد فرقہ تھا جس کو ایسی ''اجازت'' دی گئی تھی اور دراصل وہاں قادیانیوں کو سپہ گری کی ''تربیت'' دی جاتی تھی اور جہاد کشمیر کے ختم ہونے کے بعد اس پلٹن کے لوگ ہتھیار اپنے ساتھ گھر لے گئے کہ سب کو کوئی خاص لائسنس بنا کر دیئے گئے۔

1953ء میں غلام کذاب کے پوتے کرنل داؤد نے ایسے ہی لوگوں سے قادیانیت کے خلاف تحریک میں شامل ہونے والوں کو شہید کرایا۔ قادیانیوں کے خلاف یہ تحریک دراصل اسلام کے خلاف تحریک تھی اور ہمیں بے وقوف بنایا گیا۔

بھمبر سے آگے علاقوں میں بریگیڈیئر شیر علی کے چودھویں بریگیڈ کی تیسری پنجاب‘ راقم کی پندرھویں پنجاب اور تیسری ایف ایف تین پلٹنوں کو متعین کیا گیا اور وہاں موجود پہلی ایف ایف اور چھٹی پنجاب کو بھی وہاں لایا گیا۔ علاوہ ازیں گیارھویں رسالہ کا ایک سکواڈرن اور انیسویں لانسرز کا ایک سکواڈرن بھی مدد کیلئے نزدیک ہی تھے اس کے علاوہ دسویں اور گیارھویں پنجاب سے ایک ایک مشین گن کمپنی بھی وہاں لائی گئی۔ توپخانہ کی طرف سے چوتھی اور ساتویں فیلڈ رجمنٹیں‘ تیسری ایس پی رجمنٹ کی ایک بیٹری‘ بھاری اینٹی ایئر کرافٹ کی دو توپیں‘ زمینی ہدفوں کیلئے امدادی فائر کیلئے موجود تھیں۔ علاوہ ازیں ایک میڈیم رجمنٹ کی ایک بیٹری اور کسی فیلڈ رجمنٹ سے ایک اور بیٹری اور دو ''پہاڑی'' توپیں بھی بعد میں لائی گئیں۔ اکبر خان طارق کی کتاب ''حملہ آور'' کے صفحہ 186 پر ہے کہ کل توپوں کی تعداد پچاس سے کم نہ تھی۔ کاش! کوئی آدمی پوری توپیں گن کر جائزہ پیش کرتا کہ ساری جنگ

میں ہم ایک ایک توپ کیلئے ترستے رہے اور یہاں اتنی توپیں کسی ''ڈرامہ'' کیلئے اکٹھی کی گئیں کہ بعد میں ان سے جو فائر کرایا گیا۔ اس سے تو کوئی فائدہ نہ اٹھایا گیا۔

قارئین! اس عاجز نے اس زمانے میں بھمبر، بوٹ اور لکڑ منڈی کی تمام چھوٹی موٹی توپوں کی گنتی کی۔ 65 تھیں اور کچھ ہیوی مارٹرز الگ تھیں۔

اکبر خان طارق مزید کہتا ہے کہ حیرانگی کی بات ہے کہ چند دن پہلے جب بھارت والے پونچھ کے ساتھ رابطہ باندھ رہے تھے، وہاں ایک پکی پلٹن بھی بروقت نہ بھیجی گئی اور یہاں سات سے زیادہ پکی پلٹنیں اکٹھی کر دی گئیں اور کل تقریباً پچیس ہزار نفری اکٹھی کی، جس سے نہ حملہ کرایا اور نہ اس ''اکٹھ'' کا کوئی فائدہ اٹھایا گیا کہ سات پکی پلٹنوں کے علاوہ پانچ آزاد پلٹنیں، دو تین قبائلی لشکر، ایک پولیس بٹالین اور تین نیشنل گارڈ پلٹن بھی اس علاقے میں لائی گئیں۔

عملی کارروائی کیلئے صرف اتنا ڈرامہ کیا۔ بریگیڈیئر شیر علی نومبر کے آخری ہفتہ اپنے چودہویں بریگیڈ کے کمپنی کمانڈروں اور راقم کو انٹیلی جنس افسر کے طور پر اور جی ایچ کیو کے ایک سٹاف افسر اور تینوں کرنیلوں کو بھمبر لے گئے۔ جہاں رات ٹھہر کر دوسرے دن ایک ایک کر کے ہم سب لوگ باغسر سے گزر کر امر گڑھ قلعہ میں پہنچ گئے۔ جہاں کرنل سرفراز اور اس کی چھٹی پنجاب کی ایک کمپنی موجود تھی۔ جنہوں نے مہربانی سے ہماری دوپہر کے کھانے سے بڑی تواضع کی۔ کھانے کے بعد بریگیڈیئر شیر علی ہمیں ایک کھلی جگہ پر لے گئے اور اشارہ کیا کہ یہ سامنے ''ریچھ'' پہاڑ ہے۔ اس پر حملہ کرنل سرفراز کی چھٹی پنجاب کرے گی۔ اور وہ علاقے کو جانتے ہیں۔ ساتھ ''فیڈک'' پہاڑی ہے۔ اس پر حملہ کرنل رشید احمد کی پندرہ پنجاب کرے گی۔ انٹیلی جنس افسر (یعنی راقم) اس کی دیکھ بھال کر چکا ہے۔ اور مزید نزدیک سے دیکھ بھال جاری رکھی جائے۔ حملہ کی تاریخ اور وقت بعد میں بتایا جائے گا۔ تم لوگ واپس کھاریاں کے علاقوں سے اپنے جوانوں کو اس اگلے محاذ پر لے آؤ کہ باقی دو پلٹنوں نے حفاظتی دفاع میں رہنا ہے۔ اور ہر ایک کو میں ان کے علاقے سمجھا دونگا۔ 15 پنجاب کبوتر گلہ کے علاقہ میں فارورڈ جمگاہ بنائے جہاں سے وہ حملہ کرینگے۔ ہم لوگ یہ کام مشکل سے 7 دسمبر تک مکمل کر سکے اور یہ عاجز روزانہ گشتی دستے آگے لے جاتا تھا کہ راستوں کی دیکھ بھال کرتے تھے اور رات کو ''فیڈک'' پہاڑی تک پہنچ کر دشمن کے حالات کو نزدیک سے بھانپتے رہتے تھے۔ لیکن مزید نہ کوئی حملے کی تجویز بنی کہ کونسا راستہ جائیں گے۔ کہاں جائیں گے کس حد تک جائیں گے۔ تمام معاملات ''بھول بھلیاں'' نظر آتے تھے کہ حملہ صرف ان دو پہاڑیوں پر کرنا ہے تو اتنا لاؤ لشکر یہاں کیوں اکٹھا کیا گیا ہے۔ کہ جتنی توپیں اکٹھی کی ہیں۔ تو اگر ہمیں فائر کرنے دیں تو بیٹری پتن سے لے کر نوشہرہ شمال۔ ڈھنڈ کے تک کے علاقہ کو ہماری یہ نفری روند کر رکھ دیتی۔ اور دس بارہ ہزار کے قریب بھارتی یا مارے جاتے یا زخمی ہوتے یا ہماری قید میں آ جاتے اور آگے جو پونچھ تک تقریباً دو ڈویژن بھارتی فوج تھی اس کا رابطہ بھارت سے کٹ جاتا اور وہ ہمارے رحم پر تھے کہ بریگیڈیئر اعظم کا بریگیڈ اور اس کے ساتھ آزاد لشکر ان سب کی ایسی تیسی کر دیتے۔

لیکن ہم نے کچھ بھی نہ کیا۔ اور نہ ہم سے کوئی کام لیا گیا۔ اچانک 14 دسمبر 1948ء کو توپوں کے منہ کھول دیئے گئے اور ہماری ان توپوں نے تقریباً پانچ سو گولے ''ریچھ۔ فیڈک'' پہاڑیوں اور نوشہرہ کے علاقوں پر

گرائے۔ بیڑی پتن پل پر فائر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ہمارے کچھ توپچیوں نے ''حکم عدولی'' کر کے اس پر بھی کچھ گولے گرا دیئے اور وہ پل برباد ہو گیا لیکن بھارتیوں نے اس پل کو تین دن کے بعد مرمت کر لیا۔ یہ ریکارڈ میں ہے اور میجر جنرل شیرین دل نیازی ایک مضمون میں ذکر بھی کر چکے ہیں کہ بیڑی پتن پر فائر کرنے والوں سے بعد میں جواب طلب کیا گیا کہ توپ خانے کے فائر کو بھی ہمارے توپ خانے کا ایک انگریز کرنل کنٹرول کر رہا تھا اور ایک بڑا کمانڈر بھی ایک انگریز بریگیڈئر تھا کہ بھارت کے فوجیوں کو فائر سے صرف ''ڈرانا'' مقصود تھا۔ ان کے ذرائع آمدورفت کا نقصان کرنا نہ تھا اور ان کو ڈرایا بھی اس لئے جا رہا تھا کہ بھارت والے بھی فائر بندی کو مان جائیں کہ پاکستان ان کا کتنا نقصان کر سکتا ہے اور ان کے اوپر والوں کو تو تسلی تھی کہ جو کچھ انہوں نے حاصل کرنا تھا اب وہ اس کو مشکل سے ''ہضم'' کر سکیں گے۔ کہ فائر بندی ان کی ''ضرورت'' ہے۔ ورنہ پاکستان کسی علاقے میں چند توپیں اکٹھی کر کے ان پر فائر گرا کر ان کے سومیل سے زیادہ لمبے ذرائع آمدورفت پر مجاہدین یا پکی پلٹن سے قبضہ کر سکتا ہے۔ اور بیڑی پتن سے نوشہرہ اور جھنگڑ ہوتے ہوئے مینڈھر وادی سے گزرتے پونچھ تک بھارت والے کتنی فوجی چوکیاں، کس نفری کی بناتے۔ جن کو ''اکھیڑا'' نہ جاسکے یا ''ادھیڑا'' نہ جا سکے۔

اب قارئین اگلا سوال پوچھیں گے کہ حملہ نہ کرنا تھا تو اتنا زیادہ فائر کیوں کیا۔ تو وہ ہمارا منہ بھی تو بند کرنا تھا کہ حملہ کرنے کی بجائے فائر سے سب کچھ حاصل کر لیا گیا ہے کہ بھارت والے فائر بندی پر تیار ہو گئے ہیں اور اب کشمیر کا فیصلہ اقوام متحدہ کرے گی اور کشمیر ہمیں ''پلیٹ'' میں مل جائیگا۔ پھر مشہور کر دیا کہ بھارت کا بہت زیادہ جانی نقصان ہوا ہے اور بھارت والے فائر بندی پر تیار ہو گئے ہیں۔ بھارت والے ڈر ضرور گئے ہوں گے لیکن ان کا اتنا نقصان نہیں ہوا ہو گا کہ سوائے کچھ پٹرول ڈپوؤں کے جن سے دھواں نکلتا نظر آیا۔ جانی نقصان درجن بھر سے زیادہ نہ ہو گا کہ بھارت والوں نے بھی جواباً ہماری پوزیشنوں پر سو ڈیڑھ سو گولے پھینکے اور ہمارا نقصان صرف تین جوان زخمی ہوئے۔ اور ایک توپ کو کچھ نقصان پہنچا۔ قارئین دفاع اور مورچوں پر توپ خانے کا فائر زیادہ جانی نقصان نہیں کرتا۔ یہ عاجز ستمبر 65ء کی اپنی کہانی پہلے بیان کر چکا ہے کہ ہم نے زیادہ وقت توپخانہ کے فائر کے نیچے گزارا کیا، کہ دس دن لگا تار اس سے زیادہ فائر روزانہ ہم پر ہوتا تھا۔ یہ فائر صرف سر دباتا ہے اور ڈر پیدا کرتا ہے۔ ہمارا زیادہ نقصان دوبدو لڑائی کی وجہ سے ہوا تھا۔

ایک سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ''ڈرامے'' کیلئے اتنی زیادہ نفری کیوں اکٹھی کی۔ اس کا جواب بھی اسی زمانے میں سمجھ آ گیا۔ اتنی زیادہ توپوں کو ''محدود'' علاقے میں اکٹھا کرنا فوجی لحاظ سے ایک خودکشی کے مترادف تھا۔ بھارت کا کوئی من چلا سینئر افسر۔ ہوائی جہازوں کی مدد سے بکتر بند دستوں اور پیدل دستوں کے ساتھ ایک طرف سے حملہ کر کے کچھ توپوں کو قبضے میں لے لیتا تو پاکستان کا بہت نقصان ہوتا اور جنرل گریسی کی عزت خاک میں مل جاتی اس لئے علاقے کا دوہرا بلکہ اس سے بھی زیادہ دفاع کیا گیا تب ہی یہ بہت ''گہرا'' دفاع تھا۔ بکتر بند دستے بھی امداد کیلئے نزدیک رکھے، اپنی ہوائی فوج کو بھی چوکنا کیا ہوا تھا اور توپخانہ کی ایس پی رجمنٹ کی ایک بیٹری بھی رکھی ہوئی تھی۔

سوالوں کا کوئی حساب نہیں۔ لیکن ایک آخری اور اہم سوال یہ ہے کہ تھوڑا سا بھی حملہ کیوں نہ کیا؟ تو

جواب ہے کہ اگر ہم حملہ کرتے تو کامیابی اسی وقت ہماری جھولی میں گر جاتی۔ اور ''ریچھ'' یا ''فیڈک'' کے پہاڑوں سے ہم اور آگے بھی بڑھ جاتے لیکن انگریز جنرل جو کچھ بھارت کو دے چکے تھے وہ اس سے کچھ بھی واپس لینے کا نام بھی نہ لیتے۔ ہر وہ علاقہ اور ہر وہ چھوٹی پہاڑی جو بھارت کو اپنے مقبوضہ علاقے کی حفاظت کے لئے ضروری تھی ''دلوا'' دی گئی۔ تو فائر بندی کر دی گئی۔ گریسی نے جو اپنے خط میں مینڈھر کے علاقے یا زوجیلہ کے علاقے کی واپسی کا ذکر کیا تھا بعد میں ایسی باتوں کا کہیں ذکر ہی نہیں ملتا۔ بلکہ بریگیڈئر شیر خان کی مرضی کے بغیر دہلی میں جنرل گریسی جس فائر بندی کی لائن پر بھارتیوں کو دستخط کر کے دے آیا' اس میں جھنگڑ کے نزدیک کرنل خالد اور کیپٹن برہان نے جوٹائیں پہاڑی کا بھرپور دفاع کیا تھا۔ جنرل گریسی وہ علاقہ اور کوٹلی اور راولاکوٹ کے درمیان ''تاپانی'' کے نزدیک ایسی جگہ بھی بھارت کو دے آیا جو ہم آزاد کرا چکے تھے۔ قارئین! اس فائر بندی پر جنرل اکبر خان رنگروٹ اور جنرل اکبر خان طارق نے بہت پروٹیسٹ کیئے۔ لیاقت علی نے تمام پروٹیسٹ رد کر دیئے کہ ہم نے اپنا اصلی مقصد حاصل کر لیا ہے۔ اور کیا ہوا جو جنرل گریسی چند مربع میل کا علاقہ بھارتیوں کو دے آیا ہے سال ڈیڑھ کی بات ہے۔ ہم تیاری کریں رائے شماری سے سارا کشمیر ہمیں مل جائے گا۔ اکبر خان طارق نے رائے شماری کیلئے اقوام متحدہ کی 5 جنوری 1949ء کی قرارداد کو ایک مہمل دستاویز قرار دیا کہ اس کے ساتھ بھارت کو رائے شماری کیلئے مجبور نہیں کیا جا سکتا تو اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ ایسا ہی ہوا اور اب تو 1954ء سے بھارت نے اس دستاویز کو ماننے سے بھی انکار کر دیا ہے اور 1973ء سے فائر بندی لائن کنٹرول لائن بن گئی ہے۔ بھارت' کشمیر میں اقوام متحدہ کے مبصروں کو بھی ''گھاس'' ڈالنے کو تیار نہیں۔ صرف پاکستان کی ''دراندازی'' کے خلاف ایسے شور مچاتا ہے جیسے اس کی بین الاقوامی سرحد کو کوئی پار کرتا ہے۔ بات سیدھی ہے کہ اقوام متحدہ کی قرارداد منظور کرنا اور اس کیلئے فائر بندی کرنا ایک بے مقصد اور لاحاصل مشق تھی اور اب اس عاجز نے قوم کے سامنے سچ کھول کر رکھ دیا ہے کہ یہاں تک پہنچنے کیلئے کتنی سازشیں ہوئیں۔ کتنی غداریاں ہوئیں۔ کس طرح آزاد کرائے ہوئے کشمیر کے علاقے بھارت کو واپس دلائے گئے کہ انگریز اپنی مرضی کا لنگڑا لولا پاکستان تو نہ دے سکے اور صوبہ سرحد اور بلوچستان ہمارے ساتھ مل گئے تو اینگلو امریکن پالیسی کے مطابق کشمیر تو ہمیں ہرگز نہ دینا تھا۔ یہ کچھ تھوڑا سا جو ہمارے پاس ہے یہ صرف لیپاپوتی ہے اور انگریز جنرلوں نے بعد میں فیصلہ کیا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ جنرل محمد موسیٰ جب لاہور میں 1947ء میں کرنل تھے تو بھارت اور پاکستان کے انگریز سربراہوں نے اس سال کی آخری سہ ماہی میں ایک خفیہ کانفرنس کی اور بریگیڈئر محمود جان نے پشاور کے سیمینار میں ثابت کیا کہ یہ کشمیر کی لڑائی۔ انگریزوں نے ایک دوطرفہ جنگی مشق کے طور پر چلائی۔

ہمارے ہاں جنرل اکبر خان رنگروٹ نے بھی پروٹیسٹ کیا یا کچھ کیا۔ ہوا وہ جو انگریز چاہتے تھے کہ پہلے ہم انگریزوں کے نوکر تھے اب انگریز ہم پر ان فوجیوں اور سویلین لوگوں کو براجمان کر کے جانا چاہتے تھے جو ان کے ''چنیدہ'' تھے اور ان میں سے اکثر نے انگریزوں کی گیم بھی کھیلی اور فائر بندی کو خوش آمدید کہا کہ ایسی ہی لابی کا ایک ہمارا افسر مجھے کہنے لگا کہ کشمیر جیسا خوبصورت علاقہ کوئی لڑائی لڑنے کی جگہ ہے؟ یہ تو ''ہنی مون'' منانے کیلئے بہترین جگہ ہے کچھ فوجی گڑ' چنے پر گزارہ کر کے کشمیر کے جہاد میں ضرور دل سے شامل تھے۔ لیکن میں اپنے

پہلے پاکستانی بریگیڈئر افتخار خان (بعد میں جنرل) کا ذکر کر چکا ہوں کہ اس نے سیالکوٹ چھاؤنی کو "لٹل یورپ" بنانے کے احکام دیئے۔ اور باقی چھاؤنیوں میں کلبوں کی زندگی۔ یا بیوی بچوں کے ساتھ رہائش کچھ کہہ لیں۔ مشکل زندگی گزارنے کیلئے بہت ایمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ان مضامین کے لکھنے میں میرے سامنے بہت مقاصد ہیں۔ کہ اول قوم کے سامنے سچ پیش کروں۔ کہ ہم قوم کے طور پر مومن کی فراست سے عاری ہیں اور ہمارے ہاں بے کردار لوگ' زندگی کی کسی مد میں ہوں سول یا فوجی یا تجارت پیشہ یا اخبار نویس۔ ان کے طور طریقوں کی کچھ نشاندہی کروں کہ انگریز جو اس سلسلہ کو جاری کر گئے ہیں اس کو ختم کر کے ہم پاکستان بنانے کے مقاصد تلاش کریں جس کے تانے بانے تخلیق کائنات اور تخلیق انسان کے مقاصد سے ملانے ہونگے کہ غیروں کے "پروردہ" ہمیں بے وقوف نہ بنائیں۔ کہ ستمبر 1965ء کے سلسلہ میں ثابت کر چکا ہوں کہ جنگ کے بعد ہمیں بہت بے وقوف بنایا گیا کہ یہ ہماری فتح ہے۔ تو نتیجہ ہم نے 1971ء میں دیکھ لیا۔ اسی طرح اس کشمیر کے فائر بندی کے ڈرامے کے ساتھ فوج کی اکثریت اور تمام سویلین کو جس طرح بے وقوف بنایا گیا' اس کے نتائج تو یہ عاجز بیان کر چکا ہے ہم کچھ بھی نہ حاصل کر سکے۔ لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ اب تک قوم کو صورتحال کی پوری سمجھ نہیں آ رہی اور قوم کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے اور سب حالات کو غلط طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

جہاد کشمیر پر 1990ء کے راولپنڈی سیمینار میں بریگیڈئر (بعد میں جنرل) شیر علی کی شخصیت پاش پاش ہوگئی۔ اب بیان ہو چکا ہے کہ یہ صاحب اس فائر بندی کے بڑے ایکٹر تھے۔ تو یہ عاجز پنڈی سیمینار کی پوری کہانی لکھتا ہے جس میں سینکڑوں اخبار نویس' کشمیر کے جہاد میں حصہ لینے والے اور کئی دانشوروں اور مدبروں نے شرکت کی تھی۔ سیمینار کے شروع ہونے سے پہلے یہ عاجز جنرل شیر علی کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی آزادی سے پہلے 1945ء سے اس کے اور میرے درمیان بہت جھگڑے ہوئے کہ کئی دفعہ انہوں نے مجھے حراست میں لینے کی دھمکیاں بھی دیں کہ میں ان کی یونٹ میں آ کر ان کے جوانوں کے ساتھ پاکستان کے فوائد کی باتیں نہ کروں اور جنرل صاحب پاکستان کے سخت مخالف تھے۔ لیکن فروری 1948ء میں انہوں نے میرے بریگیڈ کمانڈر بن جانے کے بعد مجھ سے اپنے پہلے رویوں کی معذرت کی اور بریگیڈ کے باقی افسروں کے سامنے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ غلطی پر تھے اور نواب بھوپال کے صحیح مشورہ کے نتیجہ میں وہ پاکستان آئے۔ یہ بڑی کردار کی بلندی ہے۔ لیکن انہوں نے جو کچھ دسمبر 1948ء میں کشمیر میں کیا۔ اس وقت بھی اس عاجز نے اس پر پروٹیسٹ کیا اور مجھے ایڈورس رپورٹ پر رکھا گیا۔ اور آپ کا عمل صحیح نہ تھا اب کشمیر کے جہاد کے سلسلہ میں ہم سچ تلاش کر رہے ہیں۔ میں آپ کو گزارش کروں گا کہ جب آپ کے بولنے کی باری آئے تو آپ سچ بولیں اور جو غلطیاں کی ہیں ان کو تسلیم کریں۔ اور آؤ ہم مل کر ان غلطیوں پر ندامت کریں اور قوم کیلئے مل کر نشان راہ تلاش کریں اس عاجز نے کب سے انگریز سرکار کی بندوق اٹھانے اور پاکستان بننے کے بعد اپنی یونٹوں کے سو سالے منانے کی باتوں پر ندامت شروع کی ہوئی ہے اور اس عاجز نے کئی اوروں کو بھی ایسے مشورے دیئے۔ اور کئی لوگ خود بھی تیار تھے کہ وہ سچ بولیں گے کہ یہ پہلا سیمینار تھا اور اس کی روئیداد پر اگلے سیمینارز میں ان "سچوں" کو پیش رفت دینے کی ضرورت تھی۔

بریگیڈئر عطا ملک نے اوڑی سیکٹر کیلئے' بریگیڈئر صدیق ستی نے پونچھ سیکٹر کیلئے' میجر محمد خان جرال نے

گلگت سکردو اور زوجیلہ کی لڑائی تک کے سچ بول کر سامعین سے واہ واہ کرائی۔ لیکن کچھ لوگوں نے مصلحت سے کام لیا اور اپنی شخصیت بنانے کی کوشش کی جن میں کرنل مختار گیلانی بھی شامل تھا جو اسی بھمبر سیکٹر میں تیسری پنجاب میں کیپٹن تھا اور اپنی شخصیت کے گرد کچھ قلعے تعمیر کئے اور اس فائر بندی کی کارروائی کی بڑی تعریف کی۔ تو راقم خاموش نہ رہ سکا اور ان سے پوچھا کہ نتیجہ کیا حاصل ہوا؟ اور تمہاری پلٹن نے توپوں کے دفاع کے بغیر کیا کچھ کارروائی بھی کی؟ تو سب لوگ ہنس پڑے تو گیلانی نے یہ کہہ کر کہ اوپر سے احکام ہی ایسے تھے کہہ کہ اپنی جان چھڑائی۔ بریگیڈیر صدیق ستی نے پونچھ میں حیاء الدین کے کردار کو ہماری بدقسمتی قرار دیا۔

حمودالرحمٰن کمیشن نے اپنا اور قوم کا وقت ضائع کیا

جب جنرل شیر علی کی باری آئی تو وہ کہنے لگے کہ وہ امریکہ تھے اور پہلے دہلی آیا کہ بھارتیوں نے مجھے کہا کہ تم ادھر ہی رہ جاؤ۔ ہم سال کے اندر اندر تم کو جنرل بنا دینگے (شیر علی اس وقت کرنل تھے) میں نہ مانا تو سردار پٹیل نے مجھے کہا کہ مجھے مل کر جانا اور مجھے کہا کہ اپنے بادشاہ سلامت (مسٹر جناح) کو جا کر سمجھانا کہ وہ (حق پسند) رویہ اختیار کرے۔ اور بھارت کی دشمنی مول لینے سے گریز کرے۔ میں تب سے اہل پاکستان کو سمجھا رہا ہوں کہ ہم بھارت کے ساتھ بہتر تعلقات قائم رکھیں کہ وہ ہمارا ہمسایہ ہے اور بہت بڑا ملک ہے۔ پہلے بھی وہ ہم سے تین چار گنا بڑا تھا اور اب تو بھارت کے مقابلہ میں ہم بہت چھوٹا ملک ہیں اور کشمیر کی ہماری پالیسی صحیح نہیں۔ یہ جو تھوڑا سا آزاد کشمیر ہمارے پاس ہے اس کو بھی جنرل حیاء الدین اور میں نے کچھ تجاویز بنا کر بچا لیا۔ اور ایسے ہی ہم دونوں کو ہلال جرأت سے نہ نواز دیا گیا ہے۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے محاذوں پر بڑے اعلیٰ درجے کی تجاویز بنائیں وغیرہ وغیرہ اور یہ فائر میں نے کھلوایا کہ بھارت والے فائر بندی پر تیار ہو گئے تو موجودہ آزاد کشمیر ہمیں مل گیا۔

سیمینار میں خورشید حسن میر اور چند دانشوروں نے ضرور پروٹیسٹ کیا کہ جنرل صاحب آپ نے سردار پٹیل کو کیسے اپنا "ہمدرد" سمجھ لیا ہے۔ اور وہ کون ہوتا تھا ہمیں حقیقت پسند ہونے کی لوری دینے والا وغیرہ لیکن میری آنکھوں میں خون اتر آیا کیونکہ نئے لوگوں نے چلتے مائیک والوں کے ہاتھ سے مائیک چھین لیا اور شور اٹھا۔ کہ اس سلسلہ میں امیر افضل کا کلمہ حق پہلے سننا چاہئے' اس عاجز نے عرض کی۔ جناب جنرل صاحب! آپ نے میرا صحیح والا مشورہ نہ مانا۔ لیکن بلی تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔ آپ جب ہمارے چیف آف دی جنرل سٹاف تھے تو اس زمانے میں بھی آپ نے ہمیں بھارت کا چھوٹا بھائی بن کر رہنے کی لوری دی تھی۔ تو آگے سے بڑی لے دے ہوئی تھی۔ اور ملٹری انٹیلی جنس کے کرنل رزاق اور آپ کے درمیان تلخ کلامی بھی ہوئی تھی تو اسی وجہ سے 1956ء میں آپ کا اور کئی آپ جیسوں کا نمبر کاٹ کر محمد موسیٰ کو چیف آف دی سٹاف بنا دیا گیا تھا۔ تو آپ نے فوج سے پنشن لے لی تھی۔ اور بھارت جانے کو تیار ہو گئے تھے لیکن آپ کے بیوی بچوں نے آپ کا ساتھ نہ دیا تھا۔ خدارا اگر پاکستان میں رہنا ہے تو ہمیں سکم اور بھوٹان بنانے کی کوشش نہ کریں۔ کہ پہلے آپ نے کتنا عرصہ فیلڈ مارشل اکنلیک جس نے ہمارے ساتھ غداریاں کیں اس کو پاکستان کا ایک "معزز مہمان" بنائے رکھا۔ اور ہماری غیرت کو ٹھیس پہنچاتے رہے لیکن ان باتوں کو چھوڑیں میں آپ سے ایک سوال پوچھتا ہوں۔ کہ کیا ہلال جرأت' جرأت کا

مظاہرہ کرنے پر دیا جاتا ہے کہ جرأت کا عمل کیا جائے؟۔ یا تجویز بنانے پر اور ایسی تجویز جس پر عمل نہ کیا جائے اس پر تو تمغہ نہیں دیا جاتا۔ آپ کی تجویز صرف اتنی تھیں کہ دو پلٹنیں ''ریچھ اور فیڈک'' پر حملہ کریں گی کب؟ کیسے؟ اس سلسلہ میں ذرا بھر تیاری نہ کی گئی۔ کہ میں چشم دید گواہ ہوں اور توپ خانہ کے فائر کی تجویز ایک انگریز کرنل بناتا رہا اور اس پر ایک انگریز بریگیڈیئر بھی تھا اور فائر کا حکم آپ نے اپنی طرف سے کیسے دیا کہ آپ کے ہیڈ کوارٹر میں 14 دسمبر کو جنرل ٹانھم آیا ہوا تھا جس کی معیت میں اس عاجز نے آپ کو دیکھا کہ آپ دونوں وہاں سے اکٹھے توپ خانہ کے مرکزی سنٹر پہنچے اور چند لمحے کے بعد فائر شروع ہو گیا افسوس آپ نے میرا مشورہ نہ مانا اور آج بھی توبہ و ندامت نہ کی۔

جنرل شیر علی نے یہ سن کر مائیک چھوڑ دیا اور اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا اور اس عاجز نے سامعین کو گزارش کی کہ جناب میری تحقیقات کا کوئی حساب نہیں۔ ستمبر 65ء کی جنگ میں بھی ایسی ہی غداریاں ہوئیں۔ حمود الرحمن کمیشن نے اپنا بھی وقت ضائع کیا اور قوم کا وقت بھی ضائع کیا۔ سب سچ اس عاجز کے پاس موجود ہیں اور نشان راہ کا خاکہ بھی ہے۔ کہ آؤ توبہ و ندامت کر کے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں اور تخلیق کائنات والے رب العالمین نے تخلیق انسانیت کیلئے جو اپنے حبیب ﷺ کو رحمتہ اللعالمین ﷺ کے طور پر ذکر للعالمین عطا فرما کر اس دنیا محمد ﷺ کے طور پر ارسال فرمایا۔ اس کی وفا کرتے ایک امت بن جائیں۔ اول بھی مسلمان اور آخر بھی مسلمان

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں ہے چیز کیا لوح و قلم تیرے ہیں

سیمینار میں ایک شور اٹھا۔ سب سیمینارز میں میجر امیر افضل حاضر ہو اور وہی پاکستان کی بامقصد تاریخ لکھے اور قارئین یہ تھا پس منظر جس کے تحت میرے ساتھ لکھ کر معاہدہ کیا جس کی میرے منہ بولے بیٹے آصف نواز اور جہانگیر نصر اللہ نے دھجیاں اڑا دیں۔ اگست 1992ء میں جنرل معین الدین حیدر (بعد میں سندھ کا گورنر اور وفاقی وزیر) کو ثالث بنا کر مجھے یہ پیشکش کرا دی کہ میں اپنی دو لاکھ کے قریب اس کام کی مزدوری لے سکتا ہوں۔ اگر جو سچ تلاش کیا ہے اس کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دوں۔ معین الدین کی مدد کیلئے کرنل رمضان قانونی مشیر بھی موجود تھا اور مجھے باور کرایا گیا کہ اس معاہدہ میں خامیاں ہیں۔ میں اپنا ''اعزازیہ'' قانونی طور پر حاصل نہ کر سکوں گا تو اس عاجز نے گزارش کی میرے لئے زبانی اور وعدہ کی اہمیّت لکھائی سے زیادہ ہے۔ میں تمہارے یعنی موجودہ سب فوجی لوگوں کیلئے باپ کی طرح ہوں اور آپ مجھے دو لاکھ کے عوض اللہ تعالیٰ اور رسول پاک ﷺ کا چور بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ (کیا آپ کے سامنے میری اتنی تھوڑی ''قیمت'' ہے۔ یہ سچ چھپا نہ رہے گا۔ یہ سچ ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جو کچھ کو) اس دنیا میں بھی اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ لیکن روز قیامت تو اس سے کوئی نہ بچ سکے گا۔ جہنّم میں جائیں دو لاکھ روپے۔ میرا دال روٹی پر گزارا ہے۔

ایوب خان جو کشمیر میں داخل تک نہ ہوئے انہیں بھی ہلال جرأت مل گیا

قارئین! میں نے ابھی قوم کو بہت کچھ بتانا ہے کہ ان کوتاہیوں کے اثرات کیا ہوئے۔ یہ عاجز بہت

اختصار سے لفظ لفظ کسی مقصد کے تحت لکھتا ہے۔ آپ نے جنرل شبیر علی کی آدھی کہانی سنی ہے۔ ستمبر 1965ء کی جنگ میں سیالکوٹ محاذ سے آگے پیش قدمی نہ کرنے والا صاحبزادہ یعقوب ان کا خالہ زاد بھائی ہے، جو اگست 1947ء میں کیپٹن کے طور پر گورنر جنرل باڈی گارڈ کے ساتھ پاکستان آئے تھے۔ گو ان کا تعلق بکتر بند دستوں کے ساتھ تھا۔ جن کی ناکامیوں کے وہ بھی برابر کا ذمہ دار ہیں لیکن کشمیر کے اس آخری ڈرامہ میں ان کو کرنل بنا کر تیسری پنجاب پلٹن کی کمانڈ دی ہوئی تھی۔ جس کی بھمبر محاذ پر موجودگی کا ذکر یہ عاجز کر چکا ہے کہ شیر علی کی ''لابی'' کو مضبوط کیا جا رہا تھا۔ شیر علی اور صاحبزادہ یعقوب نے ہمیشہ ہمیں بھارت کا ''چھوٹا بھائی'' بنانے میں کوئی کثر نہ چھوڑی، ضیاء الحق جو بڑا پاکستانی بنتا تھا، وہ بھی صاحبزادہ یعقوب کے بغیر ''گزارا'' نہ کر سکا۔ لیکن پاکستان کی بری فوج کی سربراہی کیلئے ایوب خان کے بعد جنرل محمد موسیٰ کو کیوں چنا گیا کہ شیر علی سے جو کچھ کام لینا تھا وہ لے لیا گیا تھا۔ محمد موسیٰ بھی ساری نوکری برٹش خفیہ سروس میں کر چکے تھے اور اس سے اور جنرل افتخار خان سے فروری 1948ء میں سیالکوٹ کے مجاہدین پر ''جھاڑو'' لگوایا گیا تھا۔

ستمبر 65ء کی جنگ کا مختصر ذکر پہلے اور اس جنگ کا ذکر بعد میں کرنے میں اس عاجز کے سامنے کئی مقاصد تھے کہ میں قارئین کو اپنے ساتھ ساتھ رکھوں کہ ستمبر 65ء کے واقعات سمجھنے آسان تھے کہ چند دن کی لڑائی تھی۔ کشمیر کی تقریباً پندرہ ماہ کی جنگ کی کہانی کو اس طرح متوازن طریقے سے زمان و مکان کو پیش رفت دینا بڑا مشکل کام تھا کہ یہ عاجز ساتھ ساتھ اشارتاً کچھ واقعات کا پوسٹمارٹم بھی کرتا رہا۔ لیکن اب ذرا مشکل عمل شروع ہو گا کہ یہ عاجز 1949ء سے 1965ء کے واقعات کے تناظر میں ایسی بیان شدہ تحقیقات کا پوسٹمارٹم ساتھ ساتھ کرے گا اور یہ سچ سننا مشکل ہو گا کہ سچ بہت کڑوا ہوتا ہے۔

اگست 1971ء میں اس عاجز نے جنرل نیازی اور جنرل رحیم کو ڈھاکہ میں کیا بتایا کہ خدارا کچھ کریں اور ہمیں اس آنے والی بے غیرتی اور بے عزتی سے بچائیں اور اس سے پہلے ستمبر 1970ء میں یحییٰ خان اور اس کے حواریوں کو ایوب ہال راولپنڈی میں بتایا کہ فوج کا چھاتہ پاش پاش ہونے والا ہے اور یحییٰ خاں ملک کے دولخت ہونے پر صدارت کرے گا۔ میری تحقیق کے مطابق جو کچھ 1971ء میں ہوا اس کی بنیاد 48-1947ء میں کشمیر میں باندھی گئی اور وہ کچھ 1965ء میں ہو جاتا۔ لیکن فطرت نے ہمیں بچا لیا اور اس عاجز نے پستول ہاتھ میں لے کر بڑوں کو تنبیہہ کی کہ سنبھل جائیں اور کیا نہ کیا کہ لوگوں نے کہا کہ کون ہوتا ہے یہ چھوٹا سا میجر ہماری رہنمائی کرنے والا۔ سقوط ڈھاکہ ایک بہت بڑا سیاسی، مذہبی، تاریخی، روحانی اور فوجی المیہ ہے۔ جنرل نیازی ٹیپو سلطان نہ بن سکا۔ لیکن جنرل تجمل اور چند جوانوں کو چھوڑ کر کوئی بھی ٹیپو سلطان بننے کو تیار نہ ہوا۔ کیا زندگی اتنی قیمتی ہے؟ یہ عاجز ستمبر 65ء میں اپنے بارے میں گزارش کر چکا ہے کہ اگر اسلام میں خودکشی کی اجازت ہوتی تو 6 ستمبر بہترین دن تھا کہ ہم اپنی عورتوں کی حفاظت نہ کر سکے۔ پھر 22 ستمبر 65ء کو دعا کرنا پڑی کہ ''اے میرے رب، کافر کی قید کی ذلت سے بچا''۔ تو اوپر سے گھیرا توڑنے کی اجازت مل گئی تھی۔ لیکن اگر اجازت نہ ملتی تو ہم دشمن کی قید کی بجائے مرنے کو ترجیح دیتے اور اپنے آپ گھیرا توڑنے کی کوشش کرتے کہ میرے ماتحت اور ساتھی آخری آدمی اور آخری گولی تک لڑتے رہے۔ لیکن نہ ان شہیدوں کی کوئی یادگار بنائی گئی نہ ان کے نام سے کسی سڑک کو موسوم

ہوئے دیا اور چند کو جو بہادری کے تمغے دیئے' وہ بھی میرے پستول اٹھانے اور میرے ڈر کی وجہ سے دیئے۔ لیکن نشان حیدر یا باقی تمغے ایسے مقامات پر دیئے گئے جہاں ایک دن لڑائی ہوئی یا لڑائی نہ ہوئی اور یہی کچھ کشمیر میں ہوا کہ شیر علی کے تمغہ کی کہانی تو آپ نے سن لی۔ حیاء الدین نے جو کچھ کیا وہ اسی سیمینار میں بریگیڈئر صدیق ستی نے بیان کر دیا کہ کیا غداریاں ہوئیں اور ایوب خان جو کشمیر میں داخل بھی نہ ہوا اس کو بھی ہلال جرأت مل گیا۔



چوتھا سلسلہ

یحییٰ خان چاہتا تھا کہ
بھٹو اُس کا جانشین بنے

مضامین کا چوتھا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے جو مضامین شائع ہو چکے ہیں ان کے سلسلہ میں قارئین کے ردعملوں پر کچھ تبصرہ ضروری ہے کہ یہ عاجز جن مقاصد کو مدنظر رکھ کر مضمون لکھ رہا ہے' ان کو بہتر طور پر اجاگر کر کے قارئین اور ہم ساتھ ساتھ چلیں۔

ہماری قومی بدقسمتی اور یہ چال بے ڈھنگی ویسے بھی عام ہے کہ یہ لوگ تاریخ برائے تاریخ لکھتے ہیں۔ ہماراقرآن پاک ہمیں یہ سکھلاتا ہے کہ ہم بامقصد تاریخ لکھیں کہ فلاں واقعہ کے نتائج کیا تھے؟اور اس عاجز نے ستمبر 65ء کی جنگ اور 48۔1947ء کے جہاد کشمیر پر بہت کچھ قوم کے سامنے پیش کر دیا ہے لیکن اب اثرات کی بامقصد تاریخ کے پہلوؤں کو اس چوتھے سلسلہ ہائے مضامین میں ایک خاص طرز میں پیش کرنے کی کوشش ہوگی۔

ہمارے اکثر دانشور یا مورخین یا لکھنے والے صاحبان ہماری اس ضرورت کے ساتھ انصاف نہ کر سکے کہ ہماری عادت ہے کہ جس طرح اندھوں نے ہاتھی کو دیکھ کر جس حصّہ کو جو کچھ محسوس کیا اسی کو ''ہاتھی'' سمجھ لیا تھا' تو ہم بھی اپنے مشاہدات سے جو کچھ ہمیں نظر آئے اس کو ہی سب کچھ سمجھ لیتے ہیں کہ ایک صاحب نے میری اس سوچ کو کہ انگریزوں کو بھی ایک لولے لنگڑے پاکستان کی ضرورت تھی' میری ''فروگزاشت'' قرار دیا۔ یہ عاجز واقعات کے ذریعے سے اپنے مضامین میں یہ ثابت کر چکا ہے کہ انگریز موجودہ مغربی پاکستان کو اس سے بھی زیادہ لولا لنگڑا رکھنا چاہتے تھے اور ضلع گورداسپور اسی وجہ سے بھارت کو دے گئے کہ وہ لوگ کشمیر ہمیں ہرگز نہ دینا چاہتے تھے۔ یہ موجودہ آزاد کشمیر یا شمالی علاقہ جات یا صوبہ سرحد جو ہمیں مل گئے ہیں' یہ انگریزوں کی مجبوری تھی۔ وہ لوگ ہمیں اتنا کچھ بھی نہ دینا چاہتے تھے۔

ہم لوگ ایسی کم علموں اور ہاتھی کے اندھوں والے تصور پر کام کر کے اپنی سب مصیبتوں کا ذمہ دار ماؤنٹ بیٹن کو قرار دیتے ہیں۔ وہ آدمی مارچ 1947ء میں آ کر متحدہ ہندوستان کا گورنر جنرل بنتا ہے اور 9 مئی 1947ء کو ملک کے بٹوارے کی تجویز جواہر لعل نہرو کو بھی دکھا دیتا ہے کہ 19 مئی 1947ء کو انہیں تجاویز پر مہر لگانے کیلئے لندن پہنچ جاتا ہے۔ کیا یہ ساری تجویز ماؤنٹ بیٹن نے دو ماہ کے عرصہ میں تیار کر لی تھی؟ انگریز قوم کی پچھلی پانچ سو سالوں کی تاریخ پر نظر کریں کہ یورپ کی سرد ہواؤں میں گلف سٹریم کی گرم رو نے اس قوم کو معتدل مزاج بنا دیا ہے۔ چھوٹا سا ملک ہو کر انہوں نے دنیا پر ایسی حکومت کی کہ دوسری جنگ عظیم تک ان کی سلطنت پر سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ اب جو زوال آیا ہے تو یہ ان کی قوم کی کمزوری نہیں بلکہ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ دنیا کی غلام قومیں غلامی کا بوجھ اتار پھینکنے کے قابل ہو گئیں تو انگریز نے ''سانجھی دولت'' کے تصور کے تحت اب بھی اپنے ساتھ ایک بھان متی کا کنبہ اکٹھا کیا ہوا ہے اور اب تک دنیا کی اہم قوموں میں شمار ہوتے ہیں۔

البتہ ان کی سلطنت قائم تو نہ رہ سکی لیکن 1956ء سے انہوں نے دنیا کی ایک بڑی سلطنت امریکہ کو اپنا ''بڑا بھائی'' اور اتحادی بنا لیا اور آج بھی وہ لوگ امریکہ کے ساتھ ''چمٹے'' ہوئے ہیں۔ پچھلے پانچ سو سالوں میں دنیا

کی ہر مشہور جنگ یا لڑائی میں وہ شریک تھے۔ وہ ضرورت کے مطابق اپنے ''اتحادی'' بھی تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ 19ویں صدی کے شروع تک یورپ میں فرانس ان کا بڑا دشمن تھا لیکن جب روس نے طاقت حاصل کرنا شروع کی تو ان لوگوں نے 19ویں صدی کے درمیانے زمانے میں فرانس اور سلطنت عثمانیہ کو ساتھی بنا کر ان کا الٹا نقصان شروع کیا کہ سلطنت عثمانیہ کو زوال دینے میں اہم حصہ انہی انگریزوں نے لیا۔ 20ویں صدی میں جب جرمنی نے طاقت پکڑنا شروع کی تو انگریزوں نے صدیوں کے اپنے دشمن فرانس کو اپنا اتحادی بنا لیا اور جرمنی کو بڑی طاقت نہ بننے دیا۔ امریکہ کسی زمانے میں انگریزوں کی حکومت کا حصہ تھا۔ وہاں سے شکست کھانے کے بعد انگریز' امریکیوں کے ساتھ ساری دشمنیاں بھول گئے اور ان کے پکے اتحادی بن کر دنیا کی دو عظیم جنگوں میں اس سے بہت فائدہ اٹھایا اور 1956ء سے جب اپنے یہ ''پینچی'' اس خطہ میں امریکیوں کے حوالے کی تو امریکہ والوں کو تلاش تھی کہ انگریزوں کی طرف سے پاکستان میں ان کی خفیہ سروس امریکیوں کو تمام حالات سے آگاہ کرے اور امریکن بڑے مایوس ہوئے اور آخر میجر جنرل کاتھورن کو تلاش کیا گیا جو 1951ء تک پاکستانی بری فوج میں نوکری بھی کرتا تھا اور انگریزوں کی ضرورتوں کو بھی پروان چڑھاتا رہا۔ یہ صاحب اب آسٹریلیا کے شہری بن چکے تھے تو تمام اوپر والی سطحوں پر ملاپ کر کے 1956ء میں اس آدمی کو پاکستان میں آسٹریلیا کا ہائی کمشنر بنایا گیا اور یہ عاجز اپنے مضامین میں گذارش کر چکا ہے کہ یہ صاحب سکندر مرزا ہمارے دفاعی سیکرٹری کا بڑا دوست بنا ہوا تھا اور اب 1956ء کے بعد سکندر مرزا پاکستان کا صدر بنا ہوا تھا اور کاتھورن کے امریکہ سے تعلقات کی وجہ سے سکندر مرزا کو یقین تھا کہ وہ امریکہ والوں کو بھی منظور ہے اور وہ پاکستان کی حکومت پر براجمان رہے گا۔

1954ء سے اینگلو امریکن بلاک کی نظر ایوب خان پر تھی اور میں پوری کہانی لکھ چکا ہوں کہ نوری السعید کو انہوں نے خاص کر ایوب خان کو ''پرکھنے'' کیلئے بھیجا تھا اور ایوب خان بے چارے کو اُس زمانے میں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ نوری سعید عراق کا ''بادشاہ گر'' تھا اور اینگلو امریکن بلاک کا خاص الخاص آدمی تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے ایوب کو نوری السعید کی ''اہمیت'' سمجھائی اور میں یہ بھی لکھ چکا ہوں سکندر مرزا کچھ ایران' پاکستان کی فیڈریشن اور رضا شاہ پہلوی کو دونوں ملکوں کے شہنشاہ بنانے کے سلسلے میں بھی کام کرتا تھا لیکن اینگلو امریکن بلاک مسلمان ممالک کے اتحاد کو پسند نہیں کرتے خواہ وہ کچے دھاگے سے ہو تو امریکیوں نے 1956ء میں اپنے جنرل ڈیکر کو خاص کر پاکستان بھیجا کہ وہ پاکستان کی فضائی فوج کی سربراہی اصغر خان کو دلوا گیا جو ایوب خان کے ''گروپ'' سے تعلق رکھتا تھا اور سکندر مرزا کے پسندیدہ ائر کموڈور رضا کو اوپر نہ آنے دیا۔ اس لئے 1958ء میں سکندر مرزا کو بے وقوف بنایا گیا کہ مارشل لاء نافذ کرے اور پھر وہ مارشل لاء ایوب کے حوالے ہو گیا۔ تب ہی جب سکندر مرزا کو قید کر کے پہلے کوئٹہ لے جا رہے تھے تو ساتھ بریگیڈئر (بعد میں جنرل اور اب مرحوم) بہادر شیر اور کرنل (بعد میں بریگیڈئر) خورشید ربانی ''حفاظت'' کا کام کر رہے تھے تو ان کو ہوائی اڈہ ڈرگ روڈ پر روک دیا گیا کہ ایوب خان کی خاص اجازت سے آسٹریلیا کا ہائی کمشنر جنرل کاتھورن' سکندر مرزا کو مل لے تو تب اس کو کوئٹہ لے جانا۔ تو کاتھورن کو دیکھتے ہی سکندر مرزا بول پڑا ''کہیں کے حرامی مجھے بتا تو دیتے کہ میں اب نمبر ون نہیں رہا'' تو کاتھورن نے کہا ''الیگزینڈر! حرامیوں نے مجھے بھی بالکل بے خبر رکھا ہوا ہے'' قارئین یہ لیپا پوتی تھی۔ امریکہ اور انگریزوں کی خارجہ

پالیسی ہمیشہ ایک ہوتی ہے بلکہ آسٹریلیا کو بھی ساتھ ''نتھی'' رکھا جاتا ہے۔ دیکھ لیں 45 سال بعد آج عراق پر حملہ میں یہ سب ایک ہیں۔

یحییٰ خان چاہتا تھا کہ بھٹو اُس کا جانشین بنے

قارئین! ہمارے ملک میں وہ کچھ ہوتا ہے جو کچھ اینگلو امریکہ بلاک والے چاہتے ہیں۔ چھوٹا موٹا فرق پڑ جاتا ہے کہ جب ایوب خان کی چھٹی ہو رہی تھی تو اینگلو امریکن بلاک والے اصغر خان کو اوپر لانا چاہتے تھے لیکن ان کا ''خاص الخاص'' آدمی ذوالفقار علی بھٹو نہ مانا کہ اس کو معلوم تھا کہ یحییٰ خان کو بے وقوف بنانا آسان ہے اس کو جلد چلتا کرے گا۔ اصغر خان کے ساتھ دوسرے سیاستدان مل گئے تو بھٹو کے لئے طاقت میں آنا مشکل ہو جائے گا اور جب یحییٰ خانؒ جا رہا تھا تو امریکیوں کا خیال تھا تاج کہ اصغر خان کے سر پر رکھیں لیکن یحییٰ خان چاہتا تھا کہ بھٹو اس کا جانشین بنے۔ یہ عاجز قوم کو ساری چھپی باتیں سمجھا دے گا کہ ایسی چھوٹی موٹی باتوں پر امریکی زور نہیں دیتے کہ ان کے سامنے ایک تجویز ''الفا'' ہوتی ہے۔ اس تجویز کو لانے میں کچھ رکاوٹ ہو تو ان کی متبادل تجویز ''بریوو'' ہوتی ہے پھر کئی تجاویز پروان نہیں چڑھتیں۔ مثال کے طور پر اینگلو امریکن بلاک والے گوہر ایوب اور آصف نواز جب کیپٹن تھے تو ان کو ''گروم'' کر رہے تھے اور ان کو کامیابی ہوگئی کہ آصف نواز کو بری فوج کی سربراہی تک لے آئے اور اس کو ''ایوب ثانی'' بنا کر اس کے ہاتھ سے بہت کچھ کرانا تھا لیکن فطرت نے یہ تجویز نہ چلنے دی۔ میرے پاس ثبوت موجود ہیں کہ جنرل ضیاء الحق اور جنرل اعجاز عظیم جب 1956ء میں میجر تھے تو امریکہ والے ان کو ''گروم'' کر رہے تھے تو ضیاء الحق امریکہ والوں کے بڑے کام آیا۔ بھٹو کو پھانسی صرف ضیاء الحق جیسا آدمی چڑھا سکتا تھا اور بھٹو کو پھانسی دینا امریکہ کی سخت ضرورت تھی کہ بے نظیر کو یہ معلوم ہے کہ اس کے باپ کو امریکہ والوں نے پھانسی چڑھایا اس کے باوجود وہ امریکہ کا ہر حکم ماننے کو تیار ہے کہ ''تخت'' بھی وہی لوگ دیتے ہیں۔

بھٹو نے تو کھلم کھلا اعلان کر دیا تھا کہ ''اے لوگو! یہ امریکہ والے میرے درپے ہیں'' لیکن یہ منافقت تھی۔ اس عاجز نے اسی دن بھٹو کے ملٹری سیکرٹری جنرل امتیاز کو لکھا تھا کہ بھٹو قوم کو پوری بات بتائے کہ اس نے قوم کے ساتھ کیا غداری کی کہ امریکہ کا پروردہ بنا۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے تو بچ سکتا ہے لیکن افسوس وہ اس طرف نہ آیا۔ اختر ایوب بھی ایوب کی حکومت کے آخری ایام میں میرے پاس آیا تھا کہ ''لالہ آپ نے جو پیش بینیاں کیں وہ سب پوری ہو رہی ہیں اور وہی لوگ خان جی کے بے وفا نکلے جن کی آپ نے نشاندہی کی تھی۔ اب کوئی علاج بتاؤ'' تو یہ عاجز 4 نومبر 95ء کے نوائے وقت میں نواز شریف کو جو کھلا خط لکھ چکا ہے وہاں اس پس منظر کی جھلکی بھی ہے کہ اس عاجز نے اختر ایوب کو سمجھایا کہ میرے پاس تو ''اسلام کی چھتری'' ہے۔ تمہارے خان جی وہ اوڑھ لیں تو ان کے دونوں جہاں سنور جائیں گے اور جن مقاصد کیلئے پاکستان وجود میں آیا وہ بھی پورے ہونے شروع ہو جائیں گے۔ لیکن ایوب بے چارا جو مومن کی فراست سے عاری تھا' اگر اس کے بیٹے نے میرا ''مشورہ'' اس تک پہنچایا بھی تو وہ اس کو سمجھ نہ سکا یا عمل نہ کر سکا۔ نتائج قوم کے سامنے ہیں۔

ہم لوگ مانیں یا نہ مانیں ابھی تک پاکستان اینگلو امریکن بلاک کی ڈگڈگی پر ناچ رہا ہے اور وہ لوگ

یہاں مکمل طور پر کمال ترکی والا بے دین نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں اور یہ ذکر پہلے مضمون میں ہو گیا تھا۔ ہمارے ملک کی کئی سیاسی پارٹیاں خاص کر پیپلز پارٹی یا ولی خان کی عوامی پارٹی یا خطوں کے نام پر بنائی گئی۔ کئی پارٹیاں یا پاکستان کو ''قومیتوں'' والا ملک کہنے والی ساری پارٹیاں بڑے فخر کے ساتھ بے دین نظاموں کے پیروکار ہیں۔ حالانکہ صحیح بخاری کے مطابق ''ہر مرنیوالے سے جو منکر ونکیر سوالات پوچھتے ہیں ان میں پہلا سوال انسان کے رب کے بارے میں ہوتا ہے کہ تمہارا رب کون ہے؟'' اور ہمارا جواب ہونا چاہیئے ''ہمارا رب' ربی نبی محمد ﷺ یعنی اکیلا رب ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور دوسرا سوال دین کے بارے میں ہوگا کہ تمہارا دین کیا ہے؟ اور ہمارا جواب سورۃ آل عمران کی آیت مبارکہ 19 کے مطابق کا ہونا چاہیئے کہ ہمارا دین ہمارے رب کا دین اسلام ہے۔ اب جو لوگ بے دین نظاموں کے پیروکار ہیں' ظاہر ہے کہ ان کا جواب ہوگا کہ ان کا کوئی دین نہیں کہ اسلام کوئی ذاتی معاملہ نہیں ہے کہ جو کچھ مرضی ہے وہ کچھ کیا جائے تو میرے لحاظ سے ایسے لوگوں کے مرنے کے بعد نہ قرآن خوانی ہونا چاہیئے اور نہ ان کا جنازہ پڑھا جائے۔ اس عاجز نے پاکستان کے سابق وزیر خارجہ سردار آصف احمد علی کو ایک سیمینار میں صاف کہا کہ وہ جو بے دین نظاموں کا پرچار کر رہا ہے تو یہ عاجز تو اُس کے جنازہ میں شریک نہ ہوگا تو ہماری قوم ایک عجیب وغریب صورتحال سے دوچا۔ ہے ہم نے پاکستان بنانے کے مقاصد پر تحقیق نہیں کی کہ کیا ہم حضور پاک ﷺ اور خلفاء راشدینؓ کے جانشین ہیں یا جارج ششم کے؟

یہ 1974ء یا 1975ء کی بات ہے کہ ایک ''ڈرامہ'' کے طور پر ذوالفقار علی کامن ویلتھ یعنی ''دولت مشترکہ'' سے تو الگ ہو چکے تھے لیکن پھر بھی برطانیہ کا اس وقت کا وزیراعظم مسٹر کاہن ہمارے ملک میں آ دھمکا۔ اس مسٹر کاہن نے ہماری پارلیمنٹ میں جو تقریر کی اس کے کچھ الفاظ مجھے یاد ہیں کہنے لگا کہ ''مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ میں ایسے ملک میں آیا ہوں جن کی اور ہماری پچھلے دو سو سالوں کی تاریخ بھی سانجھی ہے'' اس پر پارلیمنٹ ہاؤس تالیوں سے گونج اٹھا اور تالیوں کی آواز جاری تھی کہ کہنے لگا کہ ''زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہم دونوں ملکوں کا سیاسی نظام بھی ایک جیسا ہے'' یعنی ہم دونوں قومیں جمہوریت کو اپنا ''ایمان'' سمجھتی ہیں۔ اس پر اور زور سے تالیاں بجیں اور وقفے وقفے سے حیلہ فرنگی کے ماہر اس انگریز بچہ نے دونوں ملکوں کے ایک جیسے تعلیمی اور معاشی نظام یا رومن قانون کے تحت عدلیہ کے نظام یا ایک جیسے دفاعی فلسفہ کا ذکر کر کے ہماری پارلیمنٹ سے خوب خراج تحسین وصول کیا اور انگریز قوم اور ہم ''ایک ماں جائے'' یعنی ایک ماں کے بیٹے بن گئے۔

مسٹر کاہن جب ''سانجھی تاریخ'' کی بات کر رہا تھا تو تالیاں بجانے والوں میں سے کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ سوچتے کہ ان دو سو سالوں میں انگریز ہمارے ''آقا'' تھے اور ہم ان کے ''غلام'' تھے۔ جب ایک جیسے سیاسی نظام جمہوریت کی بات کر رہا تھا تو کسی کو خیال نہ آیا کہ یہ جمہوریت ہمارا ''ایمان'' کیسے ہو سکتی ہے کہ تم لوگوں نے تو مرد کی مرد کے ساتھ شادی جائز قرار دیدی ہے۔ ہم بھی اس مادر پدر آزاد جمہوریت کو اپنا کر ''تم ادھر اور ہم ادھر'' تو ہو چکے ہیں تو ہمارے ضیاء الحق نے ہم کو ''اسلامی'' بنانے کی ناکام کوشش کی۔ جہاں تک ایک جیسی تعلیم کی بات ہے' ہمیں تو تمہارا لارڈ میکالے ایسی راہ پر لگا گیا ہے کہ اس تعلیم سے ہم صرف ''بابو''، ''ابن الوقت'' اور ''ڈنگ ٹپاؤ'' لوگ پیدا کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآنی تعلیم کی طرف مائل کرے۔ جہاں تک معاشی نظام کا

تعلق ہے تو اس سود نے ہمیں بھی ''یہودی'' بنا دیا ہے اور سود لینا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خلاف جنگ قرار دیا تھا اس کو اپنا کر ہم بھی اللہ تعالیٰ سے بغاوت کر رہے ہیں کہ تمہاری ایسی تعلیم کی وجہ سے ''پڑھے لکھے' بیچ رہے ہیں ایمان''

اور ایک جیسے دفتری اور سول سروس نظام نے ہمارے اندر ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا ہے جو ''کالے انگریز'' ہیں۔ قانون اور عدلیہ کے ایک جیسے ہونے کے بارے ہمارے اکبر الہ آبادی جو کچھ کہہ گئے ہیں وہ تو میری قلم نہ لکھ سکے گی البتہ اس ہماری عدلیہ نے جو اپنی مرضی کے فیصلے کئے کہ دو دفعہ حکمرانوں کے آئین کو توڑ دینے اور کئی دفعہ آئین کو معطل کرنے میں حق بجانب قرار دے چکی ہے یا ہماری عدالتوں میں جو بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں کہ ایک چیز کو ایک عدالت جائز قرار دیتی ہے تو اسی چیز کو دوسری عدالت ناجائز قرار دے دیتی ہے اور جو ڈرامے ہماری عدالتوں میں ''رچائے'' جاتے ہیں' انسان کو سر پیٹنا پڑتا ہے اور انگریز جیسی دفاعی پالیسی اور حکمت عملی نے تو ہمارا بیڑہ ہی غرق کر دیا کہ ہم 90 ہزار فوجیوں سے ہتھیار ڈلوا کر اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگوا چکے ہیں۔ انگریزوں کے فیلڈ مارشل ویول کی کتاب ''سولجر اور سولجری'' کے مطابق سپاہی ایک چور ہے' ڈاکو ہے اور رہزن ہے' جبکہ اسلام کے لحاظ سے ہر سپاہی مجاہد ہے اور جہاد ایک پاکیزہ عمل ہے کہ مومن اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرتا ہے۔ اس میں دنیاوی فوائد کی ثانوی حیثیت بھی نہیں۔

اور قارئین چند الفاظ میں یہ ہے وہ ''تضاد'' جس کے ہم فکری طور پر اور عملی طور پر بری طرح شکار ہیں اور یہ عاجز اپنے 12 مارچ کے مضمون میں قوم کو کھلی دعوت دے چکا ہے کہ ہم فیصلہ کریں کہ ہم رسول پاک ﷺ اور خلفائے راشدین کے جانشین ہیں یا جارج ششم کے؟ اس تضاد کو دور کرنے کیلئے ہمیں زندگی کے تمام معاملات کا گہرا مطالعہ کرنا ہوگا اور حق اور باطل کو الگ الگ خانوں میں بانٹنا ہوگا کہ حضرت عمرؓ کا فرمان ہے کہ جو حق و باطل میں فرق نہیں کر سکتا' وہ اسلام کو پاش پاش کر دے گا۔ اس لئے ہمیں صرف قرآن پاک اور قرآن پاک کے تابع سنت سے رہنمائی حاصل کرنا چاہیئے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ پکا نعرہ یہ لگائیں کہ ہر زمانے کیلئے ''رہبر و رہنما مصطفیٰ ﷺ'' ہیں ۔

ہے وہی ترے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر اے دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے

اب مثال کے طور پر ہم نے سرسید کو اپنا ایک ''رہنماء'' بنا لیا ہے کہ وہ دو قومی کے نظریئے کا بانی ہے تو ہم اس کو خدائی میں ''شرکت'' دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک کی سورۃ المجادلہ میں حزب اللہ اور حزب الشیطان' دو قوموں میں ہمیں بانٹ دیا اور جگہ جگہ کافر اور مسلمان دو الگ قوموں کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں سرسید اپنے آپ کو ''نیچریہ'' کہتا تھا۔ حیات بعد الموت کا قائل نہ تھا۔ دوزخ اور جنت کے الفاظ کو ''استعارے'' قرار دیتا تھا۔ اس عاجز نے 1993ء میں سپریم کورٹ میں قادیانیوں کے مقدمہ کے سلسلہ میں یہ ثابت کیا کہ سرسید اور غلام کذاب دونوں کو کسی ایک جگہ سے ایک جیسی ''ہدایات'' ملتی تھی کہ دونوں نے جہاد کو ترک کیا اور ملکہ معظمہ

وکٹوریہ کی وفاداری کیلئے اپنی تحریروں میں الفاظ بھی ایک جیسے استعمال کیئے ہیں اور ادھر ہم لوگ جمال الدین افغانی کے پین اسلام ازم کی تحریک سے بھی متاثر ہیں۔ تو اگر ان کی تحریریں پڑھی جائیں تو وہ سر سید کو انگریزوں کا ''پٹھو'' کہتے تھے اور سر سید کا موازنہ برصغیر ہندو پاکستان کی اس زمانے کی ایک ''سنگروہی'' قوم سے کیا جن کا نہ کوئی دین یا ایمان ہوتا تھا اور نہ اصول اور یہ ایک کمین قوم تھی جو ہر ذلیل پیشہ کو اپنانے کو تیار ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ سر سید جو تعلیم کا سلسلہ جاری کر گیا اس کو ہم ''لارڈ میکالے'' کی تعلیم کہتے ہیں کہ ایسی تعلیم نے ہمارا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔

اب ذرا اپنے سیاسی نظام، جمہوریت، پارلیمنٹ، آئین، قانون اور ملک کے سربراہوں کے عبرتناک انجاموں پر نگاہ ڈالیں کہ نہ کسی پارلیمنٹ نے اپنی مدت پوری کی نہ کسی ملک کے سربراہ نے عزت کے ساتھ اپنی ''کرسی'' خالی کی، نہ کوئی آئین چل سکا بلکہ جو آئین بنایا اس کا پہلا ہدف آئین بنانے والا تھا۔ جس آدمی نے انتخابات کرائے، اس کے بڑے دشمن یہی ''منتخب'' لوگ بن گئے۔ آخر قوم یہ سوچتی کہ ہمارے ساتھ یہ کچھ یا ایسے کیوں ہو رہا ہے؟ تو اس عاجز نے اس سلسلہ میں کافی تحقیق کی ہے اور اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ بھی چکا ہوں کہ یہ ملک چونکہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور رسول پاک ﷺ کے احکام کے نفاذ کیلئے بنایا تھا اور اس کی حاکمیت اعلیٰ، اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع ہے لیکن ہم جب انسان کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق ''حاکم'' بن جاتے ہیں تو انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے تحت اسمبلیاں یا پارلیمنٹ اپنے وقت سے پہلے ختم ہو جاتی ہیں کہ اکثر بڑی بے عزتی سے حکومت کی کرسی خالی کرنا پڑتی ہے اور سب اسمبلی کے ممبروں کو برطرف کر دیا جاتا ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ پچھلے 59 سالوں میں کوئی ایک حکمران یا سیاستدان سامنے نہ آیا جس پر بددیانتی کا الزام نہ لگا ہو کہ اصلی قصور یہ ہے کہ ہم لوگ اس ملک میں اللہ تعالیٰ کا قانون نافذ نہیں کر رہے تو ہر حکمران سے فطرت غلطیاں بھی کراتی ہے جن کی تفصیل ہر ایک کے سلسلہ میں یا اختصار بعد کے مضامین میں پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ہر ایک کے عبرتناک انجام کا اختصار یہاں ہی دیا جا رہا ہے۔

ملک کا پہلا وزیر اعظم اپنوں کی گولی کا شکار ہوا۔ اس نے ملک کے بانی کے ساتھ کیا برتاؤ اختیار کیا۔ کہ قائداعظمؒ کو خوش آمدید کہنے والا ایک سرکاری نوکر بھی ہوائی اڈے پر نہ تھا۔ جب مرض الموت میں مبتلا قائداعظمؒ کوئٹہ سے کراچی پہنچے یا لیاقت علی کی کشمیر کی پالیسی کیا تھی؟ یا میجر خورشید انور کی سرینگر کی طرف پیشقدمی کے ''ڈرامہ'' میں لیاقت کا کیا ''رول'' تھا، وغیرہ۔ ابھی کئی معاملات پر بھرپور تبصرہ کی ضرورت ہے لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ خواجہ ناظم الدین نے کس سازش کے تحت گورنر جنرل کا عہدہ چھوڑ دیا اور بغیر انتخاب کے وزیر اعظم بن گیا۔ گورنر جنرل کے عہدہ پر ایک سول بیوروکریٹ غلام محمد کیسے پہنچ گیا کہ دو سال بعد 1953ء میں ناظم الدین کو وزیر اعظم کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا اور ایک اور بنگالی محمد علی بوگرہ کو امریکہ سے درآمد کر کے کٹھ پتلی وزیر اعظم بنایا گیا جس کو دو سال ایک ''پتلی'' کی طرح نچایا گیا اور آخر غلام محمد کو بھی گھسیٹ کر گورنر جنرل ہاؤس سے باہر ''پھینک'' دیا گیا تو سکندر مرزا ہمارا گورنر جنرل بن گیا بلکہ یہ سکندر مرزا پاکستان کا پہلا صدر بھی بن گیا۔

میں نے یحییٰ خان کو اُن کے مُنہ پر کری کھری سُنائیں

سکندر مرزا کو صدر بنانے والوں میں ایک سول بیوروکریٹ چودھری محمد علی بھی تھا جو نہ صرف ملک کا

وزیراعظم بن گیا بلکہ ملک کیلئے 1956ء میں ایک آئین بھی بنوا ڈالا لیکن خود اس آئین کا پہلا ''ہدف'' بن گیا اور بے عزتی سے وزیراعظم کی کرسی سے خود ہار مان کر الگ ہوگیا کہ اس کے بعد 1958ء تک تین اور سیاستدانوں کو وزیراعظم کی کرسی پر باری باری براجمان بھی کیا گیا اور بے عزتی سے اس کرسی سے ہٹایا بھی گیا' یعنی حسین شہید سہروردی' اسماعیل ابراہیم چندریگر اور فیروز خان نون کو باری باری چند مہینے وزیراعظم رکھا گیا۔ ایسا کرنے والے میر جعفر کے پوتے سکندر مرزا نے 1958ء میں 1956ء کے آئین کے پرخچے اڑا کر مارشل لاء بھی لگا دیا لیکن اس مارشل لاء کا پہلا ''ہدف'' بھی وہ خود بنا کہ پہلے اس کو قید کر کے کوئٹہ لے گئے۔ پھر لندن میں دیس نکالا دیا گیا۔ سکندر مرزا کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے والا ایوب خان کبھی اس ملک کے بادشاہ بن جانے کے خواب بھی دیکھتا رہا کہ موروثی طور پر اس کی اولاد اس کے بعد بادشاہ ہو سکے کہ گوہر ایوب کسی زمانے میں ''پرنس آف ویلز'' کے طور پر جانا جاتا تھا حالانکہ اختر ایوب اس سے بڑا تھا۔ لیکن جب ایوب خان کے خلاف نعرے بلند ہوئے اور ایوب کے اپنے ''پروردے'' یحییٰ خان اور ذوالفقار علی بھٹو اس تحریک کے ''ڈرامے'' کے بڑے ایکٹر تھے اور ایوب کو نکال کر وہ کیسے ہمارے سربراہ بن گئے۔ خاص طور پر یحییٰ خاں نے جو بے حیائی والی زندگی کھلم کھلا اپنائی ہوئی تھی تو اس کے صدر بن جانے پر ایک غیر ملکی نے تبصرہ کیا کہ مسلمان جو مرنے کے بعد جنت میں حوروں کے امیدوار ہیں' یحییٰ خان نے اپنی دنیاوی زندگی کو جنت کی زندگی بنایا ہوا ہے کہ یحییٰ خان سے پہلے ایوانِ صدر کا کچھ رکھ رکھاؤ بھی ہوتا تھا۔ یحییٰ خان کے صدر بننے کے بعد ایک عورت بھی تعارفی کتاب میں اپنا نام درج کرانے کیلئے پہنچ گئی اور کتاب میں لکھا ۔

''چارے چوکاں تیرا دیوا بلدا
پنجواں میں بالن آئی آں''

یعنی یحییٰ خان تو اتنا عظیم آدمی ہے کہ تیرے اردگرد چاروں طرف روشنی ہی روشنی ہے' جس میں وہ مزید ایک چراغ جلا کر روشنی میں اضافہ کرنا چاہتی ہے۔ دراصل بہتر اور موزوں شعر تو یہ ہوتا ۔

''چارے چوکاں تیریاں چکڑ ڈبیاں
کہڑی نوں مل مل دھویے''

یعنی اے یحییٰ خان تیرے چاروں طرف ذلت کے ڈھیر ہیں' کوئی کس طرف سے اس ذلت کو ہٹائے۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں کی وجہ سے ملک دولخت ہوا اور 90 ہزار فوجیوں سے جو ہم نے ہتھیار ڈلوائے' تاریخ اسلام میں اس سے بڑھ کر کوئی بڑا المیہ موجود نہیں۔ بے شک پہلا سقوط بغداد جو 1258ھ میں ہوا' وہاں بھی کچھ لوگوں نے بھیڑوں اور بکریوں کی طرح قربانی دی لیکن سقوط ڈھاکہ کا ایک پہلو مجھے اب تک سمجھ نہیں آیا کہ صرف 24 سال پہلے اپنے لئے ایک ملک حاصل کرنے والی قوم اور چھ سال بعد 1965ء میں اس طرح بہادری سے لڑنے والی قوم 1971ء والی بے غیرتی سے دوچار ہوئی۔ حمود الرحمٰن کمیشن نے اس سلسلہ میں اپنا بھی وقت اور قوم کا کیوں وقت اور پیسہ ضائع کیا تو یہ عاجز اپنی اس سلسلہ کی پوری تحقیق قوم کے سامنے بعد میں پیش کرے گا کہ ایکٹر یحییٰ خان جیسے ''گندے انڈے'' کن کافرانہ سیاسی اور دفاعی عوامل کو اپنانے سے ایسے ''مقامات'' تک پہنچ گئے۔ یہ عاجز اپنے

رفقاء کو تنبیہہ پر تنبیہہ کرتا رہا کہ ان ''گندے انڈوں'' کو اپنے اندر سے باہر پھینکیں۔ یحییٰ خان خود کو اس کے منہ پر کئی دفعہ کھری کھری سنائیں کہ مجھ پر اس کا ''جادو'' اور ''شعبدہ بازی'' اثر نہ کرے گی اور آخر ستمبر 1970ء کو بھرے ایوب ہال میں یحییٰ خان اور اس کے حواریوں کو آخری تنبیہہ بھی کر دی کہ شراب کی بوتلیں توڑ کر توبہ وندامت کر کے قوم کو بھی اسلام کے راستے پر لگاؤ ورنہ تم ملک کے ٹکڑے ہونے پر صدارت کرو گے اور فوج کا ''چھاتہ'' پاش پاش ہو جائے گا اور یہ کچھ لکھ کر بھی 5 اکتوبر 1970ء کو یحییٰ خان کو دیا' جس کی کاپی اب بھی میرے پاس موجود ہے۔

پھر جس ذلت سے ہم دسمبر 1971ء میں دو چار ہوئے' اس کا دوسرا بڑا ایکٹر ذوالفقار بھٹو' یحییٰ خان سے بھی بڑا شعبدہ باز اور ''مداری'' تھا۔ ستمبر 1965ء میں لاہور بھارت کو دینے کی ''سازش'' میں یحییٰ اور بھٹو دونوں شامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے داتا کی نگری کو بچا لیا۔ لوگ معجزہ کو پھر بھی نہیں سمجھ پائے تو بھٹو نے اقوام متحدہ میں ''رونے کا ڈرامہ'' رچا کر ہماری پوری قوم کو بیوقوف بنایا کہ ہزار سال جنگ کا ''شوشہ'' چھوڑا۔ تاشقند کے صلح نامہ کا ڈرافٹ خود تیار کیا اور تاشقند کے اصلی رازوں کے ''اظہار'' کا شوشہ چھوڑ کر ایوب خان کو مخمصے میں ڈال دیا اور پوری قوم کو خوب بیوقوف بنایا۔

مجیب الرحمٰن نے بنگالیوں کو گمراہ کر کے اسلام کے راستے سے ہٹا کر پھر ''بنگالی'' بنا دیا۔ یہ ہیں اس کافرانہ سیاست کے کارہائے نمایاں کہ ''بھٹو کیلئے پھانسی اور مجیب کیلئے گولی'' گکھڑ بابا کی یہ پیشنگوئی بھی پوری ہوئی اور جنرل نیازی ذلت کی سزا سے دوچار ہوا۔

بھٹو کو یہ عاجز فروری 1972ء میں تنبیہہ کر چکا تھا کہ کوا بھی بڑا ہوشیار ہوتا ہے لیکن دھتکار اور پھٹکار سے بچ نہیں سکتا ہے۔ اس نے جو کچھ قوم کے ساتھ کیا ہے ''حذر اے چیرہ دستیاں کہ سخت ہیں فطرت کی تقدیریں'' بھٹو نے اپنے ''آقاؤں'' کے ساتھ بھی شعبدہ بازی شروع کر دی اور نیوکلیئر طاقت بن کر ملک کی فوج کو ثانوی حیثیت میں لے جانے کا پروگرام بنایا تو اس کے آقاؤں نے اس کو ''تنبیہہ'' کی کہ خبر دار باز آ جاؤ ورنہ تمہارے لئے پھانسی کا پھندہ تیار ہے'' بھٹو یہ خط لے کر سڑکوں پر آ گیا کہ امریکہ والے اس کے ''درپے'' ہیں۔ اس عاجز نے اسی دن بھٹو کے ملٹری سیکرٹری جنرل امتیاز کو لکھا کہ بھٹو پورا سچ بتا کر توبہ وندامت کرے اور قوم کو بھی اسلام کے راستے پر لگائے ورنہ اس کے ساتھ وہ کچھ ہو گا جو ہونا ہے اور جہاں اس نے غداری سے ''تخت'' حاصل کیا تھا' وہاں سے ہزار گز کے ''فاصلہ'' پر ''تختہ'' پر چڑھ گیا۔ بھٹو کو آگے لانے والے جی ایم سید اور محمد ایوب کھوڑو کے ''سندھ کارڈ'' سے نالاں تھے اور ان کے ''سندھ کارڈ'' کو ختم کرنے کیلئے بھٹو کو آگے لایا گیا تو اب بے نظیر نے ''سندھ کارڈ'' پکڑ لیا ہے اور جس کی خواہشات پوری نہ ہوں وہ ''سندھ کارڈ'' پکڑ لیتا ہے اور پاکستان میں ''قومیتوں'' کے سہارے اپنی سیاست کو چمکانے والے ایسے لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں لیکن فطرت نے یہ ملک اسلام کیلئے بنایا ہے تو سب شعبدہ باز عبرتناک انجام سے دوچار ہوئے ہیں۔

لیکن غیر یا باطل طاقتیں اسلام کا لبادہ اوڑھنے والے ''بہروپیوں'' کو بھی تیار رکھتی ہیں اور 1956ء میں میجری کے عہدے والے ضیاء الحق کو اسلام کا لبادہ اوڑھوا کر تیار کیا جا رہا تھا اور اس کو بھٹو کے ''فرمانبرداروں'' میں شامل کر کے تیار کیا جا رہا تھا کہ ضرورت پڑی تو بھٹو کو اس کے ہاتھوں سے پھانسی چڑھوایا جائے گا اور ایسا ہو

گیا۔ ضیاء الحق البتہ خوش قسمت تھا کہ روس افغانستان میں پھنس گیا اور ایران میں انقلاب شروع ہو گیا اور فطرت کو ایسا منظور تھا کہ اسلام کے لبادہ کی وجہ سے اس کو اتنا وقت بھی مل گیا اور اس کا جنازہ بھی ''شاندار'' تھا اور گو اس سے پہلے صرف ایک سربراہ لیاقت علی خان کو ایسا جنازہ نصیب ہوا تھا کہ خواہ اس کی وفاداریاں تبدیل ہوتی رہیں لیکن تحریک پاکستان میں اس نے جو اپنا کام کیا تھا تو اللہ تعالیٰ بھی کچھ ''رکھ رکھاؤ'' سے کام لیتا ہے۔ ورنہ ایک صاحب نظر نے لیاقت کے جنازے کے منظر کو ایک رات پہلے خواب میں دیکھا تو اس کو بتایا گیا کہ ''یہ تمہارے نظام کا جنازہ ہے''۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ملک میں جب تک اس ذات پاک کا قانون نافذ نہیں ہوتا' ملک کا ہر سربراہ ایسے ہی عبرتناک انجام سے دوچار ہوتا رہے گا۔

آصف نواز کی موت نے اینگلو انڈین امریکن بلاک کے پروگرام میں تعطل پیدا کر دیا

ضیاء الحق کے جانے کے بعد بے نظیر بھٹو اور نواز شریف جیسے سیاستدانوں کو وہی ناچ نچایا گیا جو 1954ء سے لے کر 1958ء تک کے سیاستدانوں کو نچایا گیا کہ یہ عاجز اپنے مضامین میں 1954ء میں نوری سعید کی آمد اور ایوب خان کی ''موزونیت'' شروع ہی میں بیان کر چکا ہے۔ اس عاجز کو 1962ء سے معلوم تھا کہ کیپٹن گوہر ایوب اور کیپٹن آصف نواز کی ''جوڑی'' میں سے دونوں میں سے کسی ایک کو ''ایوب ثانی'' بنا کر ہم پر کسی دن براجمان کیا جائے گا کہ اس خطہ میں امریکہ کے ایجنڈے کو وہ مکمل طور پر پروان چڑھائیں تو ایک طرف فطرت نواز شریف اور بے نظیر جیسے سیاستدانوں کو باری باری برخاست کرا رہی تھی تو اینگلو امریکن بلاک کا نمائندہ آصف نواز بھی ''تیار'' ہو چکا تھا۔ اس کو بھارت یاترا کی دعوت مل چکی تھی اور ہماری فوج کا وہ پہلا سربراہ تھا جس کو ایسی دعوت ملی اور وہ جوابی دعوت نامے کے طور پر اپنے بھارتی مہمان جنرل کی دعوت کا بھی شالامار باغ میں بندوبست کر چکا تھا لیکن فطرت کو شالامار باغ کا تقدس منظور تھا کہ ستمبر 1965ء میں آصف نواز کے چھوٹے بھائی ناصر نواز سمیت اس عاجز کے رفقاء اور ماتحتوں کو اللہ تعالیٰ نے سیسہ پلائی دیوار بنا دیا تھا کہ ہم نے بھارتی دشمنوں کو بی آر بی سے پرلی طرف روک لیا تھا کہ وہ لوگ شالامار باغ کو میلی نظر سے بھی نہ دیکھیں۔

تو آصف نواز کی اچانک موت نے اینگلو امریکن بلاک کے سب پروگرام میں تعطل پیدا کر دیا لیکن فطرت کی ضرورت بھی پوری ہوتی رہی اور بے نظیر' غلام اسحاق' فاروق لغاری' نواز شریف ملک کے ہر سربراہ کو بے عزتی کے ساتھ دارالحکومت سے رخصت ہونا پڑا اور اینگلو امریکن بلاک کی ضرورت ایک آمر اور برائے نام جمہوریت ہے۔ جن دونوں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر وہ اپنی ''ضرورتیں'' پوری کرتے ہیں اور اس خطہ میں وہ پاکستان سے وہ کچھ کراتے ہیں جو کچھ وہ چاہیں۔ خیر اور شر دونوں کا ایک ہی اللہ تعالیٰ ہے۔ منافق بھی اسی کی پیداوار ہیں۔ امریکہ کے پروردوں یا اسلام نہ نافذ کرنے والے حکمران کیلئے نہ یہ دنیا ہے' نہ آخرت اور دیکھ لیں کہ وہ کیسے عبرتناک انجاموں سے دوچار ہوتے رہے بلکہ اس کافرانہ سیاسی نظام نے صوبائی حکمرانوں میں سے بھی اکثر کو بے عزتی سے دوچار کیا یا کچھ کو زبردستی حکومت سے ہٹایا گیا۔

پاکستان بننے کے بعد پنجاب کا پہلا وزیراعلیٰ خان آف ممدوٹ ایک شریف اور مخلص انسان تھا لیکن اس کافرانہ نظام میں لیاقت علی اور ممتاز دولتانہ نے قدم قدم پر اس کو ڈگمگانے کی کوشش کی اور آخر گورنر مودی سے اس

کو برخاست کرایا۔ ممتاز دولتانہ از خود جھرلو انتخابات سے 1950ء میں پنجاب کا وزیراعلیٰ بن گیا اور اپنی طرف سے اسمبلی میں بڑے ''وفادار'' لوگ اکٹھے کئے لیکن اس کافرانہ نظام میں 1953ء میں جب ممتاز دولتانہ کو برخاست کیا گیا اور اس کی جگہ فیروز خان نون کو لایا گیا تو کسی ایک آدمی نے ممتاز دولتانہ کی وفاداری نہ کی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے چنیدہ لوگوں میں عبدالحمید دستی یا محمد خان لغاری (فاروق کا باپ) جیسے لوگ تھے جو ہر چڑھتے سورج کی پرستش کرتے تھے یا اس نے مظفر علی قزلباش جیسے غدار خضر حیات ٹوانہ کے حواریوں کو بھی اسمبلیوں کا ممبر بنا دیا تھا جنہوں نے فیروز خان نون کو آتے دیکھتے ہی اس کے چرنوں میں بیٹھنا ''فخر'' سمجھا لیکن سال ڈیڑھ سال بعد جب فیروز خان نون کو بھی اس کافرانہ نظام میں برخاست ہونا پڑا تو مرکزی حکومت کے بیوروکریٹس کا حکم مان کر عبدالحمید دستی پنجاب کا وزیراعلیٰ بن بیٹھا۔

تھوڑا عرصہ بعد مشرقی پاکستان کے ساتھ برابری کیلئے جب مغربی پاکستان کا ایک صوبہ بنایا گیا تو کسی صوبہ کے حکمرانوں نے آگے سے چوں بھی نہ کی کہ اس کافرانہ نظام میں ان کو وزارتوں سے نواز دیا گیا اور غفار خان کے ''پختون کارڈ'' کو ختم کرنے کیلئے ڈاکٹر خان صاحب کو وزیراعلیٰ بنایا گیا۔ وہ اتنا نکما ثابت ہوا اور اس نے پہلے مرکز میں وزارت کشمیر نہ قبول کر کے کشمیر کے کاز کو نقصان پہنچایا پھر ایک رات میں اکثر مسلم لیگیوں کو ری پبلک پارٹی کا ممبر بنا دیا اور اس نے پنجاب کے خلاف اتنی نفرت پھیلائی کہ وہ خود نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا' وزارت بھی گئی اور قتل بھی ہوا تو اس کی گدی سردار عبدالرشید کو دی گئی جو آئی جی پولیس تھا اور خان قیوم نے اس کو سرحد میں اپنا ''جانشین'' چنا تھا اور وہ سرحد کا وزیراعلیٰ بن گیا تھا۔ یہ آدمی اتنا ناکام ہوا کہ چند ماہ کے بعد منظر سے غائب ہو گیا کہ مغربی پاکستان کی وزارت اعلیٰ کا تاج سکندر مرزا کے ہم عقیدہ مظفر علی قزلباش کے سر پر رکھا گیا جو خضر حیات ٹوانہ کا خاص حواری تھا اور خضر کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا بہت نقصان کرایا اور چند ماہ بعد مارشل لاء نافذ کر دیا گیا کہ سیاستدانوں کا تگڑم ناچ انتہا کو پہنچ گیا تھا۔

غیر یقینی حالات نے ہمیشہ خلاء پیدا کیا اور فوجی اقتدار کی راہ ہموار کی

پاکستان بنتے ہی صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو ختم کرنا پڑا کہ انہوں نے پاکستان کے جھنڈے کو سلامی دینے سے انکار کر دیا تو وزارت اعلیٰ کا تاج خان عبدالقیوم کے سر پر رکھا گیا اور اقلیت میں ہوتے اس نے ڈنڈے کے زور سے تین سال خوب حکومت چلائی اور صوبہ سرحد نے خوب ترقی کی۔ 1950ء میں خان عبدالقیوم نے بھی جھرلو انتخاب کرا کے کٹھ پتلی لوگوں کی اسمبلی بنائی کہ مرکزی مسلم لیگ کے سیکرٹری یوسف خٹک یا مشہور مسلم لیگی لیڈر ابراہیم جھگڑا جیسے لوگوں کو بھی کامیاب نہ ہونے دیا اور سرحد کے ''مردِ آہن'' کے طور پر مشہور ہوا' جو چیز مرکزی حکومت کو پسند نہ تھی لیکن لیاقت علی کو کچھ ''کرنے'' کا وقت نہ ملا۔ ناظم الدین ''کچھ'' کرنے کے قابل نہ تھا۔ خان عبدالقیوم کی بڑی خدمت یہ تھی کہ پاکستان دشمن لوگوں یعنی غفار خان' ولی خان خاندان اور ان کے ''حواریوں'' کو ان کے ''مقامات'' پر رکھا تو غلام محمد گورنر جنرل پہلے تو غفار کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کو مرکز میں لے آیا کہ اس کو مرکزی وزیر بنا کر قیوم صاحب کی ''طاقت'' کچھ کم کرے لیکن اس کے مطلوبہ نتائج نہ نکلے تو

1955ء میں غلام محمد نے قیوم خان کو سرحد سے ہٹا کر زبردستی مرکز میں وزیر بنا دیا لیکن سرحد اسمبلی ایسے کٹھ پتلی لوگوں کی بنی ہوئی تھی کہ قیوم خان کے چلے جانے کے بعد وہ کسی کو اپنا ''رہنماء'' بھی نہ چن سکی اور قیوم خان کو گزارش کی کہ وہ کسی کو ان کا لیڈر بنا دیں۔ پوری اسمبلی میں قیوم خان کو ایک آدمی بھی نظر نہ آیا' جس کو وہ پہلے نامزد کرتا' تو پہلے تو یہ ''تاج'' اپنے پرائیویٹ سیکرٹری غلام اسحاق (بعد میں ملک کے صدر) کے سر پر رکھنا چاہا لیکن وہ اتنی جلدی اکٹھی ترقی کرنے سے ڈرتا تھا کہ ''گراوٹ'' بھی جلدی ہوگی اور اس عزت افزائی کو ''منظور'' نہ کیا تو خان قیوم نے یہ تاج انسپکٹر جنرل پولیس سردار عبدالرشید کے سر پر رکھ دیا جس کا تعلق ایک سرکاری اور ابن الوقت سردار خیل خاندان سے تھا۔ اس آدمی نے خان قیوم کی وفاداری کو چند ماہ بھی ''قائم'' نہ رکھا کہ اگلی دفعہ قیوم خان سرحد کے دورے پر آیا تو اس کا ''استقبال'' کالی جھنڈیوں سے کیا گیا۔ مرکز حکومت کو اسی صورتحال کا ''انتظار'' تھا۔ انہوں نے چند ماہ بعد خان قیوم کی مرکز سے چھٹی کر دی اور سردار عبدالرشید کی بھی چھٹی کر دی اور اس کی جگہ سردار بہادر خان' ایوب کے بھائی کو لایا گیا کہ سرحد والوں کو جب ایک یونٹ میں شامل کیا جائے تو وہاں کوئی چوں نہ کرے اور ہمارے صوبائی رہنماء بھی بے عزتی والے ''حشروں'' سے دوچار ہوتے رہے۔

صوبہ سندھ کے پہلے وزیراعلیٰ محمد ایوب کھوڑو کو تو ایک سال بھی پورا نہ کرنے دیا اور پاکستان بننے کے چند ماہ بعد اس کو اس لئے برخاست کر دیا گیا کہ وہ لیاقت علی کے ''آدمیوں'' کو ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مال کی پوری لوٹ و مار نہ مچانے دیتا تھا اور اپنے ''آدمیوں'' کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ مال دولت اکٹھی کریں۔ اس کا جانشین ایک کمزور آدمی الٰہی بخش کو بنایا گیا' جس کی قسمت میں ہر طرف سے ''دھکے'' ہی ''دھکے'' تھے۔ مرکزی حکومت اس کو اپنے ''نوکر'' کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ اور سندھ کے سیاستدان اس کو خاطر میں نہ لاتے تھے کہ ان کے سامنے اس بے چارے کی کوئی وقعت نہ تھی۔ اس لئے وہ بھی زیادہ دیر نہ چل سکا۔ اور اس کے جانشین قاضی فضل اللہ' غلام علی تالپور اور پیرزادہ عبدالستار وغیرہ سب کو باری باری لا کر بے عزتی سے برخاست کر دیا کہ بے عزتی ہر ایک کے مقدر میں لکھی تھی کہ مشرقی پاکستان میں نور الامین جیسا شریف انسان 1954ء کے انتخابات میں ایک طالب علم لیڈر سے شکست کھا گیا۔ یہ تھی صورت حال جس کے ساتھ صوبائی لیڈر شپ ون یونٹ کے بننے تک ''ہچکولے'' کھاتی رہی۔ اور ون یونٹ کے ''کرتا دھرتاؤں'' کا کچا چٹھہ پہلے کھولا جا چکا ہے کہ پھر 1958ء میں مارشل لاء لگ گیا۔ تو صوبائی لیڈر مکمل طور پر مرکزی حکومت کے پروردے بنے رہے۔

یحییٰ خان نے جب مغربی پاکستان کے صوبے بحال کر دیئے اور آج تک جو صوبے بحال ہیں تو پچھلے تیس سالوں میں ہر صوبے کے ہر وزیراعلیٰ کو یا برخاست کیا گیا یا اس کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا کسی کو وقت پورا نہ کرنے دیا۔ پنجاب میں معراج خالد' مصطفیٰ کھر' حنیف رامے' نواز شریف' غلام حیدر وائیں' شہباز شریف کسی نے عزت کے ساتھ اپنا دفتر نہ چھوڑا۔ صرف نواز شریف نے ترقی کی لیکن اس کو جو اونچان ملی تو گراوٹ بھی بہت زیادہ تھی۔ نوائے وقت نے بڑی مہربانی سے 4 نومبر 95ء کو میرا اس کے نام کھلا خط شائع کر کے اس کو بھی اور پوری قوم کو بھی بڑی بروقت تنبیہہ کی تھی کہ اسلام نافذ کرنے کا پکا وعدہ کرو۔ ورنہ اس کے لئے ذلت ہی ذلت ہے۔ رہبر

1996ء میں اس عاجز نے نواز شریف، فاروق لغاری اور پوری قوم کو ایک کھلے خط کی ہزاروں کاپیاں بانٹیں کہ نواز شریف تم اسلام کی طرف نہیں آ رہے۔ اس کافرانہ نظام میں اوّل تو تم وزیراعظم بن نہ سکو گے اور اگر بن گئے تو پہلے سے زیادہ ذلت کے ساتھ اس کرسی کو خالی کرو گے۔ اور اس خط میں یہ سارا پس منظر بھی اختصار سے موجود تھا کہ آج تک ملک کا ہر سربراہ یا بڑے لوگ کس طرح عبرتناک انجاموں سے دوچار ہوتے رہے کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا کر یعنی ان کو طاقت کا سرچشمہ قرار دے کر ان کی طرف سے خود ملک کے والی بن جاتے رہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے قانون کی بجائے انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کو عملی طور پر نافذ کرتے رہے۔ کافر یا غیر تو ایسا کر سکتے ہیں۔ ان کے لئے اللہ تعالیٰ ان کے انجام کیلئے اور طریقے استعمال کرتا ہے۔ لیکن اللہ کے نام پر بنائے ہوئے ملک میں ایسے مخالف عمل کرنے والوں کو ظاہراً ذلت سے ضرور دوچار ہونا چاہیئے۔

باقی صوبوں کے وزرائے اعلیٰ یعنی سرحد کے حیات شیرپاؤ، مفتی محمود، نصر اللہ خٹک، صابر شاہ، سردار مہتاب وغیرہ، سندھ کے ممتاز بھٹو، مصطفیٰ جتوئی، جام صادق، عبداللہ شاہ، بلوچستان کے عطاء اللہ مینگل، ان کا بیٹا اختر، جمالی، مگسی، بھلا کس نے عزت کے ساتھ کرسی چھوڑی کہ عبداللہ شاہ تو اب بھی کسی غیر ملک میں "چھپا" بیٹھا ہے اور لطف کی بات ہے کہ ملک کی تین پارٹیوں کے سربراہ یعنی نواز شریف، بے نظیر بھٹو اور الطاف حسین ملک سے باہر بیٹھے ہیں کہ ملک کی عدلیہ میں اپنے اوپر الزامات کا دفاع نہیں کر سکتے۔ یا بینظیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ "سکیورٹی رسک" ہے تو جو لوگ اس سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں وہ بھی "سکیورٹی رسک" ہیں اور نواز لیگ یا مہاجر قومی موومنٹ کا ہر ممبر اپنے رہنما کی طرح ہے۔ یعنی چوروں اور شرپسندوں کے کارکن بھی چور اور شرپسند ہیں۔ دیکھ لیں کافرانہ نظام کے نتائج۔

پاکستان بنانے کے ہمارے سامنے کئی مقاصد تھے اور سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ عالم اسلام کو متحد کیا جائے اور مسلمان ایک قوم ہیں تو اس ملک کے باشندوں کی یہ نظریاتی ضرورت ہے کہ وہ اول بھی مسلمان یا مومن ہوں اور آخر بھی مسلمان اور مومن وہ کسی بے دین ادارہ یا تنظیم کے ممبر یا کارکن نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اصولاً کسی کو یہ اجازت نہیں دینا تھی کہ وہ کوئی بے دین سیاسی پارٹی بنائے۔ کسی کو جغرافیائی نیشنلزم یا خطوں یا صوبوں کی چھوٹی قومیتوں کی تنظیم اور پارٹی بنانے کی اجازت نہ دی جائے۔ اسلام ہرگز مادر پدر آزادی کی اجازت نہیں دیتا۔ ہم اللہ تعالیٰ کے محکوم ہیں اور مسلمان ایک قوم ہیں سورۃ الانعام کے مطابق اسلام میں فرقہ واریت کی بھی اجازت نہیں تو مختلف مکاتیب فکر والوں کو بھی کسی فقہ حنفیہ یا فقہ جعفریہ یا اہل سنت یا اہل حدیث تنظیم بنانے کی اجازت نہیں ہونا چاہئے تھی کہ ہم نے ملک کو اسلامی نظریہ کو اپنا کر حاصل کیا اور اس کو چلانے کیلئے غیروں کے ہر باطل نظریہ خواہ جمہوریت ہو خواہ سوشلزم ہو اور باطل نظام خواہ صدارتی نظام ہو یا پارلیمانی نظام ان چیزوں پر اسلام کے لیبل لگا دیئے اور ان باطل نظریات کو اپنے ایمان کا حصہ بنا لیا تو نتائج نظر آتے رہے کہ ہمارا ہر سربراہ یا رہنما ذلت والے یا عبرتناک انجام سے دوچار ہوا۔ اور سویلین یا سیاسی رہنما ہمیشہ بری طرح فیل ہوتے رہے۔

اس افراتفری اور ان ناکامیوں اور غیر یقینی حالات نے ہمیشہ ایک "خلا" پیدا کیا۔ اور ہمارے ملک کی افواج جو مقابلتاً بہتر طور پر منظم تھیں۔ انہوں نے اس "خلا" کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان حالات میں ملک کی باگ و

ڈور سنبھال لی۔ لیکن ایسا کچھ فوج والے تب کر سکے جب بری فوج کا سربراہ از خود حکومت کا تختہ الٹنے کی کارروائی میں شامل تھا۔ اس لئے ایوب خان، یحییٰ خان، ضیاء الحق اور پرویز مشرف اس سلسلہ میں کامیاب رہے۔ لیکن لیاقت علی کے زمانے میں میجر جنرل اکبر خان اور اس کے ساتھیوں نے ایسی کوشش کی تو وہ ناکام رہے۔ یا ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں بریگیڈئر ایف بی علی اور اس کے ساتھیوں نے ایسی کوشش کی تو وہ بھی ناکام رہے۔ یا ضیاء الحق کے زمانے میں کچھ ''میجروں'' نے ایسی کوشش کی یا بے نظیر کے زمانے میں میجر جنرل ظہیر الاسلام عباسی اور بریگیڈئر مستنصر باللہ کی ایسی کوشش ناکام رہی۔ دراصل ضیاء الحق کے زمانے میں میجر جنرل تجمل حسین نے بھی کچھ ایسا ''خروج'' کرنے کی کوشش کی تو وہ بھی ناکام ہی رہا۔ البتہ ذوالفقار علی بھٹو کو طاقت میں لانے والے بھی کچھ فوجی یعنی ایک طرف جنرل گل حسن اور ائر مارشل رحیم وغیرہ تھے تو ایک اور بڑی وجہ یہ تھی کہ کئی افسر جن میں میجر جنرل شمیم اور بریگیڈئر اقبال مہدی شاہ وغیرہ شامل تھے۔ یحییٰ خان کو کھلم کھلا تنبیہہ کر رہے تھے کہ وہ مستعفی ہو جائے۔ دراصل یحییٰ خان کو چھ سو افسروں کے سامنے 14 ستمبر 1970ء کو اس عاجز نے بھی کہہ دیا تھا کہ آنے والے حالات کو وہ نہ سنبھال سکے گا۔ اسلئے بہتر ہے کہ وہ یہ کرسی کسی ایسے مخلص انسان کے حوالے کرے جو حالات کو سنبھال سکے۔ یحییٰ خان کے ''پروردوں'' میں کئی گروپ تھے اور ایک گروپ جنرل عبدالحمید جنرل خداداد، جنرل ابوبکر مٹھا، جنرل غلام عمر اور جنرل عنایت کیانی پر مشتمل تھا۔ دسمبر 1971ء میں سقوط ڈھاکہ کے بعد بھی یہ لوگ حکومت ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کرنے کو تیار نہ تھے اور جنرل عبدالحمید نے ایوب ہال میں مشورہ کیلئے راولپنڈی کے تمام افسروں کو بلا لیا۔ اور کچھ مگرمچھ والے آنسو بھی بہائے۔ لیکن جنرل گل حسن نے لوگوں کو تیار کیا ہوا تھا اور انہوں نے جنرل عبدالحمید کی وہ بے عزتی کی اور ایوب ہال میں وہ اودھم مچا کہ مجبوراً اس عاجز کو اٹھ کر یہ اعلان کرنا پڑا کہ خاموش رہیں۔ تم میں سے 70 فیصدی لوگ 14 ستمبر 1970ء کو اس ہال میں موجود تھے۔ جب اس عاجز نے اعلان کیا تھا کہ یہ المیہ ظہور پذیر ہونے والا ہے تم میں سے ایک آدمی نے میری ہم نوائی نہ کی۔ پھر جنرل حمید کو مخاطب کیا کہ جنرل صاحب کیا آپ لوگ اب بھی توبہ وندامت کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن افسوس آپ لوگ ایسا نہ کر سکیں گے۔ اس لئے مزید بے عزتی کیلئے تیار ہو جائیں۔ تمہارے عبرتناک انجام اور سزا کیلئے جس آدمی کو فطرت نے مقرر کیا ہے وہ پشاور پہنچنے والا ہے۔ ائر مارشل رحیم اس کو وہاں خوش آمدید کرے گا۔ جنرل گل حسن کمانڈو دستوں سے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لے چکا ہے۔ اور قارئین میرا مطلب ذوالفقار بھٹو سے تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو جانتا تھا، کہ فوج ہی ملک کا سب سے طاقتور ادارہ ہے۔ جس سلسلہ میں یہ عاجز اپنے پہلے مضامین میں میر علی احمد تالپور کی زبان سے فوج کو ملک کی سب سے ''بڑی سیاسی پارٹی'' ہونے کا ذکر کر چکا ہے۔ بھٹو نے جو نیوکلیئر طاقت بننے کی کوشش کی اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ پاکستان کے نیوکلیئر طاقت بننے کے بعد سائنسدانوں کی اہمیت زیادہ ہو جائے گی اور فوج ثانوی حیثیت اختیار کر لے گی۔ یہ اس کی غلط سوچ تھی نیوکلیئر ہتھیار بھی کسی فوجی تنظیم نے استعمال کرنے ہوں گے۔ اور ان ہتھیاروں نے فوج کی طاقت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ فوج اپنی تنظیم کی وجہ سے ''طاقت'' میں آ جاتی ہے۔ اور اصلی وجہ سیاسی ابتری اور افراتفری بھی ہے اور پھر اینگلو امریکن بلاک بھی دل سے یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کا حاکم کوئی آمر ہو کہ ایک آدمی کے ساتھ واسطہ ہوگا۔ علاوہ

ازیں ہمارے اکثر سیاسی رہنما، مفکر، دانشور، صحافی اور ادیبوں میں سے اکثریت نہ ہماری فوج کے تاریخی پس منظر سے آگاہ ہے نہ پوری طرح سے فوجی روایتوں اور کمانڈ کے طریقوں سے آگاہ ہے اور بے شک فوج میں ہر قسم کے لوگ ہیں، مذہبی، لبرل اور اب تو فوج بہت زیادہ ٹیکنیکل بھی ہوگئی ہے لیکن رواجی اور روایتی طور پر کمانڈ کا طریقہ اتنا سخت ہے کہ ساری فوج بری فوج کے سربراہ کی مٹھی میں ہوتی ہے اور اگر وہ بہت زیادہ نالائق نہ ہو تو جس وقت چاہے حکومت پر قبضہ کرسکتا ہے۔ اب ایوب خان کو کچھ عرصہ کے لئے محمد موسیٰ مل گیا۔ یا ذوالفقار علی کو کچھ عرصہ ٹکا خان مل گیا تو وہ اس غلط فہمی کا شکار ہوگئے کہ فوجی سربراہ کی زیادہ وقعت نہیں۔ لیکن جیسے ہی محمد موسیٰ کی جگہ یحییٰ خان آیا تو اس نے ایوب کو ایک طرح سے چلتا کیا اور جیسے ہی ٹکا خان کی جگہ ضیاء الحق نے لی، اس نے بھٹو کو چلتا کیا۔ اسلم بیگ یا جہانگیر کرامت کو ہمت نہ ہوسکی۔ وحید کاکڑ میں بھی ہمت تھوڑی تھی۔ جتنی تھی اس نے اس کو استعمال کر لیا کہ نواز شریف اور اسحاق خان دونوں کو چلتا کیا۔ آصف نواز کو موت نے کچھ نہ کرنے دیا۔ پرویز مشرف کچھ بھی کرنے کو تیار تھا تو سب کچھ حاصل کرلیا۔

قیام پاکستان کے بعد اونچی سطح کے لوگ کشمیر کی اہمیّت کو نہیں سمجھتے تھے

یہ عاجز دوسری جنگ عظیم سے پہلے سے فوج کے ساتھ وابستہ تھا اور سپاہی سے لے کر افسری میں اکثر بڑوں کو بہت نزدیک سے دیکھا۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے متحدہ ہندوستان کی ساری فوج کی تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار تھی جس میں تقریباً بیس ہزار گورے تھے۔ ہم مسلمان چالیس ہزار کے قریب تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں فوج کی تعداد 25 لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ جس کو جنگ کے بعد گھٹایا جا رہا تھا اور آزادی کے وقت یہ تعداد چار لاکھ کے قریب تھی، جس میں سے ڈیڑھ لاکھ نفری ہمیں ملی۔ افسران کی تعداد تقریباً اڑھائی ہزار تھی۔ جن میں تقریباً 35 کنگ کمیشنڈ افسران تھے جن کو 1920ء سے لے کر 1934ء تک کمیشن ملا ان میں سب سے سینئر جنرل اکبر خان رنگروٹ تھے اور سب سے جونیئر جنرل ایم اے لطیف اور جنرل شاہد حامد تھے۔ ایوب خان انہی میں شامل تھے جن کو 1928ء میں کمیشن ملا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر ''صاحب لوگ'' کی قسم کے آدمی تھے۔ مذہب سے بھی ان کا تعلّق برائے نام تھا۔ صرف بریگیڈئر فضل الرحمٰن اور جنرل بننے والے بریگیڈئر شیر خان کچھ عملی مسلمان نظر آتے تھے۔ ان میں جنرل نذیر احمد اور جنرل حیاء الدین قادیانی تھے اور جنرل شیر علی کبھی کبھی اسلام کا ''لبادہ'' اوڑھ لیتے تھے۔ عسکری پیشہ کے لحاظ سے بھی ان میں صرف جنرل نذیر احمد، جنرل حیاء الدین، جنرل اکبر خان طارق، جنرل ایم اے لطیف، جنرل شیر خان اور جنرل شیر علی، عملی طور پر پیشہ کے ساتھ وابستہ رہے۔ اور عسکریت کے مطالعہ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ورنہ ایوب خان از خود کو راقم کی آنکھوں کے سامنے 1944ء میں پلٹن کی کمانڈ سے ہٹا دیا گیا اور کرنل سے میجر بنا دیا گیا تھا۔ حادثہ میں ہلاک ہونے والے جنرل افتخار خان اور جنرل محمد یوسف بھی روایتی فوجی ٹھاٹھ باٹھ پر گزارہ کرتے تھے۔ جنرل اکبر خان رنگروٹ نے البتہ اپنے آپ کو پیشہ ور بنانے کی کوشش کی اور اسلام کو سمجھنے کی بھی کافی کوشش کی کہ اسلام پر کچھ کتابیں بھی لکھیں لیکن وہ میٹرک پاس بھی نہ تھے تو ان کی کم تعلیم اور لڑاکا فوج سے سروس کورس تبدیلی ان کے لئے بڑی رکاوٹ بن گئی۔

بیچ میں جنرل آغا رضا اور ناصر علی جیسے لوگ بھی تھے، جن کو سب لوگ ''بڑے بابو'' کہتے تھے۔ دو شیخ بھی تھے۔ ایک افضل شیخ اور دوسرا خالد مسعود شیخ' افضل صاحب تو نرے ہی ''شیخ'' رہے۔ بس عہدہ حاصل کر لیا اور تنخواہ لیتے رہے۔ لیکن خالد مسعود نے اپنی انگریزی سے فائدہ اٹھایا اور خود تو ایوب خان کے زمانے میں وزیر بھی رہے۔ لیکن فوجی نوکری کے دوران جونیئر اور سینئر عہدوں میں ''دوری'' کا بڑا خراب بیج بو گئے۔ ایک ''ہر دلعزیز'' جنرل اعظم خان بھی تھے جن کے کئی دفعہ نمبر کاٹے گئے لیکن پھر بھی وہ لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے تک پہنچ گئے اور ایوب خان کے وزیر بھی رہے اور مشرقی پاکستان کے بڑے کامیاب گورنر بھی رہے۔ محنتی اور مخلص آدمی تھے۔ لیکن بہت عامیانہ ذہن کے آدمی تھے۔ ایک جنرل آدم خان بھی تھے جن کا اس عہدہ تک پہنچ جانا ایک حیران کن ''حادثہ'' ہے کہ ظاہراً کوئی پہلو نظر نہیں آتا کہ ایسا آدمی کبھی کرنل بھی ہوتا۔ ایک جنرل جمالدار بھی تھے جو ضیاء الحق کے زمانے میں وزیر تھے۔ ایک بنگالی جنرل ایم آئی مجید بھی تھے لیکن ان کے سب عہدے بنگالی ہونے کی وجہ سے دے دیئے گئے تھے۔ ورنہ ان کو میجر کے عہدے سے اوپر نہ جانا چاہئے تھا۔ ان میں سے کچھ لوگ جیسے فیض احمد' گل شیر' ادریس' احمد جان' خالد جان' محمد علی نون اور عطا محمد وغیرہ بھی تھے۔ جو کرنل یا بریگیڈئر بھی اس وجہ سے بن گئے کہ پاکستان بن گیا۔ ورنہ ایسے لوگوں کے لئے میجری سے اوپر جانا ناممکن تھا۔ یہ تھے فوج کے وہ لوگ جو پاکستان کی فضاؤں پر چھائے رہے۔ ان سب میں سے صرف اکبر خان اور شیر خان نے جو کچھ کشمیر کے جہاد میں کیا وہ قابل تعریف ہے اور اس کا ذکر پچھلے مضامین میں ہو چکا ہے یا شیر علی اور حیاء الدین نے اپنے انگریز حاکموں کے جیسے احکام مانے وہ ذکر بھی ہو گیا ہے۔ کہ ہم نے کتنا نقصان اٹھایا۔ باقیوں میں سے صرف جنرل محمد یوسف' جنرل آدم خان اور جنرل مسعود شیخ بریگیڈئر کے طور پر چند دن اس جہاد سے وابستہ رہے۔ لیکن کوئی خاطر خواہ کام نہ کیا۔ اور جہاد کے آخری دنوں میں جنرل اکبر خان رنگروٹ کو جہاد سے وابستہ کرنے کا انگریزوں نے ''ڈرامہ'' کیا۔ یعنی ان سینئر افسران کی بڑی تعداد کو کشمیر کے جہاد کی بو بھی نہ آئی۔ تو ہم کشمیر کیسے حاصل کرتے کہ اس اوپر والی سطح والے لوگوں نے کشمیر کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جو ہمارے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔

اگر سویلین لوگ پاکستان بنانے کی اہمیت کو نہ سمجھ سکے اور سویلین بیوروکریٹس تو ویسے بھی کالے انگریز تھے' جن کی کارکردگی پر تبصرہ بعد میں آ رہا ہے تو ہمارے دانشوروں اور محققین کے لئے یہ عاجز اپنے فوجی صاحبان کے لئے مزید یہ عرض کرے گا کہ جب پاکستان بنا تو ان میں صرف چار صاحبان اکبر خان رنگروٹ' نذیر احمد' آغا رضا اور محمد منیر ٹوانہ بریگیڈئر تھے کہ محمد منیر کو تو یہ عہدہ خضر حیات ٹوانہ نے بلدیو سنگھ کو سفارش کر کے دلایا تو قائداعظم نے صرف باقی تین بریگیڈئروں کے ساتھ ملاقات کی صرف اکبر خان رنگروٹ سے کچھ متاثر ہوئے۔ اور اس کے لئے 14 اگست 1947ء سے میجر جنرل کے عہدہ پر تقرری کا فیصلہ بھی کیا اور اپنے نزدیک کراچی اور کوئٹہ کے ذمہ دار آٹھویں ڈویژن میں تعینات کر دیا۔ آغا رضا کا پہلے بریگیڈئر بننے کا نمبر کاٹ دیا گیا تھا۔ اور اس سے جونیئر نذیر پہلے بریگیڈئر بن چکے تھے۔ قائد کو بھی اس نے متاثر نہ کیا اور نذیر قادیانی سے بھی قائد متاثر نہ ہوئے کہ حد بندی کیلئے پنجاب میں فرقہ وارانہ فساد کی خبریں مل رہی تھیں اور قائداعظم کو کسی اچھے بریگیڈیئر کی ضرورت تھی تو باقی سینئر افسروں میں سے کرنل ایوب خان کو آگے لایا گیا جس کا بھی بریگیڈئر بننے کا نمبر کاٹ دیا گیا تھا تو

قائداعظم نے ایوب خان کو کچھ پسند کیا اور حد بندی والی فوج کیلئے اس کو 14 اگست 1947ء سے بریگیڈئر بنا کر پاکستان کا نمائندہ مقرر کیا۔ اب ایوب کی کچھ وقتی بدقسمتی تھی کہ اس فوج کا سربراہ میجر جنرل ریس تھا جس نے 1944ء میں ایوب خان کو کرنیلی سے توڑ کر میجر بنا دیا تھا۔ ایوب خان خود بھی کچھ ''عیاشانہ'' رویہ اختیار کر گیا اور بڑا بدنام ہوا کہ مسلمانوں کو قتل عام سے بچانے میں کوئی حصّہ نہ ادا کر سکا اور اس کو وہاں سے ہٹا کر نذیر احمد قادیانی کو اس ڈیوٹی پر لگایا جس نے زیادہ وقت قادیانیوں کی حفاظت میں گزارا۔ اور گورنر فرانس موڈی کے ساتھ مل کر سینکڑوں ٹرکوں کے ذریعہ سے قادیانوں کے قادیان سے ان کے سربراہ بشیر محمود سمیت سب لوگوں اور مرکزی ادارہ کو لاہور میں آ کر حفاظت سے براجمان کر دیا۔ جس کو بعد میں قائداعظم کی وفات کے دوسرے دن ربوہ میں کوڑیوں کے بھاؤ زمین عطا کر دی گئی۔

بہرحال ایوب خان کا میجر جنرل بننے کا نمبر کاٹ دیا گیا اور چند ماہ بعد آغا رضا اور نذیر احمد کو بھی میجر جنرل بنا دیا گیا۔ بلکہ ایوب خان سے ایک اور جونیئر افتخار خان جو نومبر 1947ء میں بریگیڈئر بنا تھا اس کو بھی فروری 1948ء میں میجر جنرل بنا دیا گیا۔ ایوب خان کا چھوٹا بھائی سردار بہادر جو فوج میں تو لانس نائیک کے عہدہ سے اوپر نہ جا سکا تھا وہ سول اور سیاست میں بڑا کامیاب رہا اور آئین ساز اسمبلی کا ممبر بن گیا تھا۔ اس کے ذریعہ سے ایوب خان نے قائداعظم کو جب انگریز جنرل ریس کی اس کے ساتھ پرانی دشمنی کی کہانی سنوائی تو قائداعظم کو ترس آ گیا۔ اور اس نے ایوب خان کو بھی میجر جنرل بنا کر ڈھاکہ میں فوج کو کچھ منظم کرنے کی ذمہ داری دی کہ مشرقی پاکستان میں اس سے پہلے نہ کوئی چھاؤنی تھی نہ فوج اور نہ بنگالیوں کی کوئی یونٹ تھی۔ ان کی فوج میں کل تعداد ایک سو سے بھی کم تھی۔

1949-50ء کے سالوں میں بری فوج کے سربراہ کے چناؤ والا معاملہ قوم کے لئے اوڑھنا بچھونا بنا رہا۔ کچھ چھوٹے یا مقامی اخباروں میں بھی ہر شخصیت کو اوپر لانے یا نکو بنانے پر بحث ہوتی رہی بلکہ کئی شوشے چھوڑے گئے کہ زیادہ امیدوار آغا رضا تھا۔ اس کے لئے 1949ء کے شروع میں ایک دن ''مشہور'' ہوگیا کہ وہ غدار ہے۔ آج دن کے بارہ بجے راولپنڈی پریڈ گراؤنڈ میں اس کو کھلم کھلا پھانسی چڑھایا جائے گا اور کافی لوگ اکٹھے ہوگئے کہ تماشا دیکھیں۔

1949ء کے آخر میں حیاء الدین اور شیر خان کے لئے اعلان ہوگیا کہ 1950ء کے شروع میں وہ میجر جنرل ہو جائیں گے اور اعظم خان کا نمبر کاٹ دیا گیا۔ لیکن دسمبر 1949ء میں ہوائی جہاز کے حادثہ میں افتخار خان اور شیر خان کے ہلاک ہو جانے کے بعد اس بحث نے ایک اور رنگ اختیار کر لیا۔

اس حادثہ سے دوسرے دن بری فوج کا سربراہ جنرل گریسی سیالکوٹ چھاؤنی میں تھا۔ اور ایک اجتماع میں حادثہ پر افسوس کرتے یہ بھی کہہ دیا کہ ہلاک ہونے والوں میں پاکستان کی بری فوج کے مستقبل کا ایک سربراہ بھی تھا۔ تیسرے دن جنرل گریسی نے واپس راولپنڈی آنا تھا اور راقم بھی اس کے ساتھ تھا۔ جب ہم وزیر آباد پہنچے تو وہاں انگریزی کا کوئی اخبار نہ مل سکا۔ صرف نوائے وقت ملا جس میں جنرل گریسی کے حوالے سے یہ خبر تھی کہ جنرل افتخار خان نے بری فوج کا سربراہ بننا تھا جب میں نے جنرل گریسی کو یہ خبر پڑھ کر اس کا انگریزی میں

ترجمہ بتایا تو وہ لال پیلا ہوگیا کہنے لگا سیالکوٹ کے اجتماع میں جو کچھ اس نے کہا اس کا مطلب شیر خان سے تھا کہ شاید وہ دوسرا سربراہ بنتا۔ ابھی تک اس نے اپنے جانشین کی حکومت کو سفارش نہیں بھیجی۔ پنڈی پہنچ کر تمام اخباروں کے ایسے تراشے اس کو بھیجے جائیں کہ وہ تردید کیلئے احکام دے گا۔ پنڈی ہم سیدھے اس گرجے میں پہنچے جہاں ہلاک ہونے والوں کیلئے ''سروس'' ہو رہی تھی تو اس عاجز نے کچھ چاپلوس لوگوں کو دیکھا کہ وہ جنرل گریسی کو کہہ رہے تھے کہ اب وہ جولائی 1950ء میں ریٹائر نہ ہوگا۔ اس کی نوکری بڑھ جائے گی۔

اگلے دن اس عاجز نے تمام ''تراشے'' ایک فائل میں لگا کر جنرل گریسی کو بھیجے تو اس نے اس پر کچھ لکھے بغیر مجھے بلایا اور فائل واپس کر دی اور زبانی کہا کہ مرے ہوئے کے لئے اچھے الفاظ کی تردید کرنا صحیح نہ ہوگا۔ اور جنرل گریسی کی نوکری میں چھ ماہ کا اضافہ ہوگیا۔ اور اس نے اعظم خان اور مسعود شیخ کو میجر جنرل بنا دیا۔ 1950ء کی آخری مہینوں میں اس نے تمام جنرلوں کو کوئٹہ سٹاف کالج میں کچھ پڑھائی اور کچھ امتحان کیلئے بریگیڈیر لاڈر کے پاس بھیج دیا۔ چیف انسٹرکٹر کرنل یحیٰی خان تھا۔ جنرل اکبر خان رنگروٹ نے اس کورس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ بریگیڈیر لاڈر اور کرنل یحیٰی خان نے کورس میں پہلا نمبر ایوب خان کو دیا اور جنرل گریسی نے اپنے جانشین کیلئے ایوب خان کی سفارش کی۔ راقم بہت چھوٹا آدمی ہے لیکن ان سب جنرلوں کو میں ان کے کپتانی کے زمانے سے جانتا تھا اور بعد میں سب کو نزدیک سے دیکھتا رہا۔ میرا خیال ہے کہ یہ فیصلہ صحیح تھا کہ ایوب خان کئی باتوں میں باقیوں سے بہت بہتر تھا کہ ہمارا یہی سٹینڈرڈ ہے کہ یہ خطہ قحط الرجال کی بیماری کا مریض ہے۔ میں جب قائداعظم کو دیکھتا تھا تو حیران ہو جاتا تھا کہ وہ باقیوں سے کتنا بلند تھا۔ مجھے پچھلے 59 سالوں میں کوئی ایک آدمی نہ نظر آیا جو اپنے حواریوں سے بلند ہو۔ اور یہ عاجز جو یحیٰی خان یا ذوالفقار علی بھٹو کو منہ پر کھری کھری سنا چکا ہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے وہ بڑے عامیانہ ذہن کے لوگ نظر آ رہے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ میں جو کچھ ان کو کلمہ حق سنا رہا ہوں، اس کا ان کے پاس جواب نہیں کہ وہ مومن کی فراست سے عاری تھے۔ تو قارئین مل کر رب کے دربار میں عاجزی کریں کہ وہ ہمیں مومن کی فراست عطا کرے۔ ہمارے آقا کا فرمان ہے کہ ڈر مومن کی فراست سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے سورہ المائدہ کی آیت مبارکہ 15 کے مطابق یہ نور ہمارے آقا ﷺ از خود ہیں۔ جو آدمی تمام معاملات کو حضور پاک ﷺ کی وساطت سے دیکھتا ہے۔ اس کو حالات اور معاملات خود بخود سمجھ آ جاتے ہیں۔

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

غلام اسحٰق خان نے صوبہ سرحد کا وزیر اعلیٰ بننے سے انکار کر دیا تھا

لیکن افسوس کہ ہمارے ملک میں ابھی تک ہر چیز اینگلو امریکن بلاک کی مرضی کے مطابق چلتی ہے کہ اس زمانے میں اصلی ''بادشاہ گر'' یہ سول بیوروکریٹس تھے جن کا سربراہ دفاع کا سیکرٹری سکندر مرزا تھا۔ اور اس کی مدد عزیز احمد اور اس کا بھائی جی احمد کرتے تھے۔ 1958ء میں سکندر مرزا کے چلے جانے کے بعد بھی عزیز احمد جو چھپا

ہوا لاہوری قادیانی تھا 1977ء تک ملک کا اہم آدمی رہا۔ ایوب خان کا معاون خصوصی بھی ایک لاہوری قادیانی تھا جس کا نام فاروقی تھا' وہ کام چلاتا تھا اور ایوب کے آخری سالوں میں غلام کذاب کا پوتا ایم ایم احمد نے آ کر سب کچھ سنبھال لیا کہ عزیز احمد کو باہر کسی جگہ سفارت پر بھیجتا تھا اور یحییٰ خان کے زمانے میں بڑا مشیر یہی ایم ایم احمد تھا کہ مارچ 1971ء میں ڈھاکہ میں جب یحییٰ خان مشرقی پاکستان کو ''آخری لات'' مار کر مغربی پاکستان واپس آ رہا تھا تو اس کا بڑا مشیر یہی ایم ایم احمد تھا۔ ذوالفقار بھٹو جب آیا تو اس نے اپنے پرانے ''دست راست'' عزیز احمد کو واپس بلا لیا جو اس کا خارجہ امور اور دفاع کا وزیر تھا۔ اور ضیاء الحق کو بھٹو کو پھانسی چڑھانے کے ''احکام'' ملے تھے۔ لیکن عزیز احمد کی طرف اس کو میلی آنکھ سے دیکھنے کی بھی ''اجازت'' نہ تھی کہ اس کا بڑا مشیر غلام اسحاق تھا۔ اس نے ضیاء الحق پر عزیز احمد کی ''وقعت'' افشا کر دی تھی کہ غلام اسحاق نے 1955ء میں صوبہ سرحد کا وزیر اعلیٰ بننے سے انکار کر دیا کہ اس نے ''پکی نوکری'' کو ترجیح دی۔ جس نے اس کو ملک کا صدر بنا دیا۔ اور انہی لوگوں کو اسٹیبلشمنٹ کہا جاتا ہے اور آج کل شاید طارق عزیز ان کا سربراہ ہے۔

ایوب خان ہی پاکستانی فوج کے پہلے سربراہ ہونگے

تو 1951ء میں سکندر مرزا اپنے ''آقاؤں'' کو تسلی دیتے' ایوب خان کے ساتھ چیف آف سٹاف کے طور پر اپنے ہم عقیدہ لیفٹیننٹ جنرل ناصر علی کو وابستہ کر دیا تھا۔ جو بغیر پلٹن، بریگیڈ اور ڈویژن کی کمانڈ کے اس اعلیٰ عہدہ پر پہنچ گیا۔ اور ہم پچھلے مضامین میں ذکر کر چکے ہیں کہ جب وہ ملٹری سیکرٹری تھا تو کرنل سلطان علی شاہ کو اپنے انگریز جنرلوں کے اشاروں کی وجہ سے سیالکوٹ تعینات کرنے کو تیار نہ تھا کہ وہ ان علاقوں سے بھارت کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے۔ بہرحال انگریز جاتے جاتے باقی کنگ کمیشنڈ افسروں یعنی آدم خان' شیر علی' اکبر خان طارق' ایم اے لطیف اور شاہد حامد وغیرہ سب کو میجر جنرل بنا گئے اور یہی لوگ ایوب خان کے پرنسل سٹاف افسر یا ڈویژن کمانڈر تھے اور ان سے خاص کر جنرل محمد یوسف اور کئی ایوب خان کی ''جانشینی'' کے امیدوار تھے۔ مجھ چھوٹے سے میجر کے بارے جو اس زمانے میں کیپٹن تھا ان میں سے اکثر کا خیال تھا کہ جو باتیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنے ''رقیبوں'' کے خلاف کرتے تھے وہ مجھے سمجھ نہ آ رہی ہوں گی کہ مجھے ان سب کو بہت نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو ان میں سے اکثر میجری کے عہدے سے اوپر نہ جا سکتے۔ کوئی ایک آدھ کرنل یا بریگیڈئر بن جاتا۔ پاکستان نے ان کو بڑی بلندیاں دیں۔ لیکن انہوں نے پاکستان یا پاکستان کی فوج کو ''کچھ'' بھی نہ دیا۔ صرف اکبر خان طارق غیرتمندی سے لڑنے اور مرنے مارنے کی اچھی مثالیں چھوڑ گیا۔ یا اکبر خان رنگروٹ جہاد اور اسلام کی بات تو کرتا تھا یا شیر علی فوجی فاؤنڈیشن کا ادارہ بنا گیا۔ جس سے ملک کی انڈسٹری نے بھی ترقی کی اور فوجیوں کیلئے یا کچھ کیلئے ملازمت کے فائدے ہوئے۔

تو فطرت نے بھی ان میں سے کسی کو دنیاوی ''بقا'' عطا نہ کی کہ کچھ حادثے کا شکار ہو گئے' کچھ راولپنڈی سازش میں ملوث ہو گئے۔ جنرل یوسف جو ایوب کی زیادہ جانشینی کا امیدوار تھا اس کو وقت سے پہلے ریٹائر کر دیا گیا اور باقی سب کا نمبر کاٹ کر 1935ء کو انڈین کمیشنڈ افسر محمد موسیٰ کو 1957ء میں ایوب کا چیف آف سٹاف بنایا گیا'

کہ وہ سکندر مرزا کا ہم عقیدہ تھا اور زیادہ نوکری برٹش خفیہ سروس میں کی تھی۔ اور اینگلو امریکن بلاک کا منظور شدہ تھا کہ ہم پچھلے مضامین میں گزارش کر آئے ہیں کہ سیالکوٹ میں فروری 1948ء میں مجاہدین پر جھاڑو پھیرنے کا کام انہی صاحب سے کرایا گیا۔ حیرانگی کی بات ہے کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کے ایک بڑے راز کے طور پر قائم ہے۔ حالانکہ ہمارے رہنماؤں میں جو غیروں کی ڈگڈگی پر ناچتے رہتے ہیں۔ کہ شاہ نعمت اللہ ولی فرما گئے اگر ''رہبرز مسلماناں در پردہ پاسبانان'' یعنی مسلمانوں کے رہنما در پردہ دشمنوں کے ساتھ ملے ہوئے ہوں گے۔ اسی وجہ سے اس عاجز نے ستمبر 65ء کی جنگ پر مضامین پہلے لکھ دیئے تھے کہ ایوب خان اور محمد موسیٰ کو فتوحات کے سہرے کیسے بندھ سکتے اور اب جب یہ عاجز سقوط ڈھاکہ۔ کے اصلی مضمون پر پہنچے گا تو قارئین کو اصلی حقائق سمجھ آ جائیں گے کہ حمود الرحمٰن کمیشن نے تو قوم اور ملک کا وقت بھی ضائع کیا اور مال بھی اور قوم کے سامنے حقیقت حال پیش کرنے میں بری طرح ناکام ہوئے۔

پاکستانی فوج کو حصہ کے طور پر جو انڈین کمیشنڈ آفیسر ملے ان کی تعداد سوا ایک سو بیس کے قریب ہوگی۔ سب سے سینئر محمد موسیٰ اور گلزار احمد وغیرہ نے 1935ء میں کمیشن حاصل کیا تھا۔ اور سب سے جونیئر اختر ملک وغیرہ نے 1940ء کے آخری دنوں میں یہ لوگ کنگ کمیشنڈ کمانڈروں کی طرح زیادہ ''صاحب لوگ'' تو نہ تھے۔ ایک دو ''کرنٹے'' یا کالے انگریز بننے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن ان لوگوں میں سے اکثر اپنے کام یا ذمہ داری کو سمجھنے کی بجائے نیچے والوں کے کام میں دخل انداز زیادہ ہوتے تھے۔ اور یہ اور کچھ اور ایسے بھی تھے لیکن پھر بھی کنگ کمیشنڈ صاحبان کی نسبت کئی پہلوؤں سے اس گروہ میں بہتر لوگ تھے۔۔ اول تو 48-1947ء کے کشمیر کے جہاد میں ان میں سے کرنل اور میجر کے طور پر میجر جنرل ملک شیر بہادر، بریگیڈیئر صدیق ستی، بریگیڈیئر نوشیرواں، بریگیڈیئر محمد اسلم کرنل حسن مرزا اور کرنل شیر محمد نے بڑے نمایاں کام کیئے۔ اور چند اور مثلاً بریگیڈیئر غلام محمد، کرنل کریم داد، بریگیڈیئر قربان علی، کرنل حفیف خان اور بریگیڈیئر نثار قریشی وغیرہ کئی صاحبان نے اچھا کام کیا۔ گو ان ہی میں سے میجر جنرل سرفراز نے بڑی کمزوریوں کا مظاہرہ کیا۔ اور بریگیڈیئر وحید حیدر کی کاروائیوں کو غداری بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کوتاہی تو ضرور ہے کہ کالی بھیڑیں ہر جگہ موجود ہوتی ہیں اور یہ عاجز جہاد کشمیر پر بہت کچھ لکھ چکا ہے۔

بہرحال ان صاحبان میں کافی افسران مذہب کی طرف بھی مائل تھے، جن میں جنرل حق نواز، جنرل ملک شیر بہادر، جنرل فضل مقیم، بریگیڈیئر گلزار احمد، بریگیڈیئر نثار قریشی، بریگیڈیئر نوشیرواں، کرنل سلطان علی شاہ اور کرنل شیر محمد وغیرہ کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ اور کئی اور بھی ہوں گے جنہوں نے اپنی یونٹوں یا ماتحتوں میں باقاعدہ درس قرآن کا بندوبست کیا یا اسلامی تعلیم حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ کچھ صاحبان اگر مذہب کی طرف زیادہ مائل نہ تھے تو ان کو بے دین بھی نہیں کہا جا سکتا کہ خاندانی طور پر ان کے گھروں میں جو اسلامی رکھ رکھاؤ یا مسلمانوں کی روایات تھیں، وہ ان کی پابندی کرتے تھے، جن میں جنرل حبیب اللہ، جنرل سید غواص، جنرل وصال محمد، جنرل بختیار رانا، جنرل ٹکا خان، بریگیڈیئر سانول خان، بریگیڈیئر محمد حیات، بریگیڈیئر رب نواز، بریگیڈیئر صدیق اللہ، بریگیڈیئر صاحب داد، بریگیڈیئر محمد مظفر، بریگیڈیئر سردار علی، بریگیڈیئر عباس بیگ، بریگیڈیئر سلطان محمد، بریگیڈیئر میر افضل، کرنل محمد ظریف اور بریگیڈیئر غلام محمد وغیرہ کو شامل کیا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں نے کمال ترکی کے طرز پر افواج کو بے دین نہ بننے دیا

ورنہ کنگ کمیشنڈ کی ''صاحب لوگی'' کی وجہ سے اور آگے جن لبرل افسروں کا ذکر آ رہا ہے' ان کے رویوں سے ہماری یہ فوج بھی ایک ''بے دین'' فوج بن جاتی۔

دراصل کشمیر کے جہاد کے جذبہ اور اس میں کچھ یونٹوں کی شمولیت کے بھی اچھے اثرات ہوئے۔ لیکن 1949ء کے ایک واقعہ نے یونٹوں کے مذہبی رہنے میں بڑا کام کیا کہ 1949ء میں لیاقت حکومت نے ہر کرنل کے عہدہ کے افسر تک زبانی طور پر اوپر والوں سے یہ پیغام پہنچایا کہ کمانڈنگ افسران اپنے جوانوں کو پاکستان میں شریعت کے نفاذ کی باتوں سے باز رکھیں گے۔ یہ حکم جب کوہاٹ میں کرنل سلطان علی شاہ کو اس کے سٹیشن کمانڈر نے زبانی دیا تو اس نے سمجھا کہ حکومت ایسا حکم نہیں دے سکتی۔ یہ ان کے ڈویژن کمانڈر جنرل نذیر احمد کی شرارت ہے جو قادیانی ہے تو انہوں نے لکھ کر پروٹیسٹ کیا اور چند دن بعد جب کرنل شیر محمد وہاں کوہاٹ میں ایک پلٹن کی کمانڈ کے لئے پہنچے تو کرنل سلطان علی شاہ نے ان کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا اور کرنل شیر محمد بھی زبانی پروٹیسٹ کرنے والوں میں شامل ہوگیا تو بات ساری فوج میں پھیل گئی اور جو کرنل پہلے کچھ خاموش تھے اُن میں سے بھی کچھ نے زبانی اور کچھ نے انٹیلی جنس رپورٹ میں ایسے ''احکام'' کو ناپسندیدہ قرار دیا۔ اور فوج میں خاص کر مذہبی لوگوں اور نچلے عہدے کے لوگوں کے بڑے سخت ردعمل ہوئے۔ لیپاپوتی کے طور پر لیاقت علی نے آئین ساز اسمبلی میں 1949ء کی قرارداد مقصد پیش کی کہ وہ اسلام کے نفاذ کے حق میں ہے۔ دراصل یہ ایک مہمل دستاویز ہے جس پر پورا تبصرہ کسی اور مضمون میں ہوگا لیکن یہ افسوسناک بات ہے کہ ملک کے علماء خاص کر شبیر احمد عثمانی نے اس قرارداد کی جو تعریف کی تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود اسلامی فلسفہ حیات کے علم میں ایک رواجی مولوی تھا' اور یہ عاجز اپنی تازہ کتاب ''پاکستان عطیہ رب ذوالجلال اور رسول باکمال ﷺ میں ثابت کر چکا ہے کہ انیسویں صدی سے اسلام کے چشمے خشک ہو چکے ہیں اور ہمارے خود ساختہ علما، اسلامی فلسفہ حیات اور اقدار سے بالکل نابلد ہیں۔ بہرحال اس قرارداد میں اتنی پرتضاد باتیں ہیں کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اور اس قرارداد میں عوام کی حاکمیت کو تسلیم کرکے ان کو اللہ تعالیٰ کا ''شریک'' بنا دیا گیا ہے۔ جسٹس افضل ظلہ کے زمانے میں جسٹس نسیم حسن کے ماتحت ایک کمیٹی بنائی گئی کہ ضیاء الحق جو اس قرارداد کو 1973ء کے آئین کا سرخیل بنا گئے ہیں۔ اس کے اثرات پر رپورٹ کی جائے تو کمیٹی نے دونوں چیزوں کو ایک دوسرے کے ''متضاد'' دستاویز قرار دیا کہ قرارداد مقاصد کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو اگر تسلیم کرلیا جائے تو 1973ء کا تمام آئین ختم ہو جاتا ہے۔ تو ظلہ صاحب نے فیصلہ دیا کہ معاملات کو اسی طرح رہنے دیا جائے۔ اور اس قرارداد کو آئین کیلئے ''تڑکہ'' یا ''دھونی'' کے طور پر ادھر رہنے دیا جائے۔ (فاعتبروا یا اولی الابصار)

دراصل ان انڈین کمیشنڈ افسران میں سے اکثر نے فوج میں چھوٹے رینکس میں نوکری کی تھی صرف چند یعنی جنرل نصیر' بریگیڈیر اسلم' کرنل ظریف' صاحبزادہ یعقوب اور ایر مارشل اصغر خان وغیرہ جن کو پہلے بری فوج میں کمیشن ملا تھا سیدھے طور پر رائل انڈین ملٹری کالج ڈیرہ ڈویژن سے فوج کی افسری کیلئے چن لئے گئے تھے۔ فوج میں اس زمانے میں سپاہی یا کیڈٹ کے طور پر بھی بھرتی ہونا مشکل تھا۔ جنرل اختر ملک کو چودھویں پنجاب سنٹر نے سپاہی بھرتی کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس کا والد فوجی نہ تھا۔ اور پڑھے لکھے آدمی کو فوج میں تب بھرتی کیا جاتا

تھا کہ اس کا والد فوجی ہو۔ یا پلٹن یا رسالے میں بھرتی نہ کرتے تھے۔ اور ایک صاحب جو گریجویٹ تھے' ان کو خچروں کی یونٹ میں بھرتی ہونا پڑا۔ جنرل محمد موسیٰ کو پائینیر کور میں بھرتی کیا گیا تھا۔ بڑی بے روزگاری اور بری حالت تھی۔ صرف لمبے تڑنگے جوانوں کو فوج میں لیا جاتا تھا۔ راقم کا قد چھ فٹ ہے۔ تقریباً ایک سو کی نفری میں میری کمپنی کے جوان جب سائز کے حساب سے کھڑے ہوتے تھے تو کم از کم دس پندرہ جوانوں کے بعد میرا نمبر آتا تھا۔ ویسے نوکری کے لئے انگریز مذہبی لوگوں' اصول والوں اور وعدہ کے پاس کرنے والوں کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس لئے انڈین کمیشنڈ افسران پر مذہبی رنگ بھی تھا۔ لیکن جلد دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ اور جب جنگ ختم ہوئی یا پاکستان وجود میں آیا تو ان لوگوں میں سے تیسرے حصہ کے برابر افسران لیفٹیننٹ کرنل بن چکے تھے اور اکثر میجر تھے اور صرف چند کیپٹن تھے۔ ان لوگوں کی شخصیت یا پیشہ وری پر اس ماحول کے گہرے اثرات تھے جس میں انہوں نے نوکری کی تھی مثلاً یحییٰ خان اور اس کے ساتھ عبدالحمید نے چند دن مصر کی لڑائی میں حصہ لیا۔

چنانچہ جب جنگ ختم ہوئی اور یہ لوگ برصغیر میں واپس آئے اور سٹاف کالج کوئٹہ میں تربیت حاصل کی تو جنگ کا تجربہ' محتاط شراب نوشی اور انگریزی زبان پر عبور ان کے بڑے کام آیا اور یہ عاجز گزارش کر چکا ہے کہ یحییٰ خان 1949ء میں سٹاف کالج کوئٹہ میں انسٹرکٹر تھا اور مشہور ہوگیا کہ یہ لوگ بڑی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ اور 52-1951ء میں صرف تیرہ سال کی نوکری کے بعد یحییٰ خان بریگیڈیئر بن کر راولپنڈی جی ایچ کیو کے ساتھ آ کر ایسا ''وابستہ'' ہوا کہ جنرل حق نواز کے ایک احتجاج کے بعد ایوب خان اور موسیٰ نے مجبور ہوکر 1963ء میں اس کو کچھ عرصہ کیلئے جی ایچ کیو سے باہر نکالا۔ اس دوران اس کا سایہ عبدالحمید بھی اکثر جی ایچ کیو میں آ کر تعینات ہوتا رہا۔ یہ عاجز اس زمانے میں محکمہ تعلقات سے وابستہ تھا اور راولپنڈی کلب بھی ساتھ ہی تھا وہاں بھی شام کو اکثر جانا پڑ جاتا تھا تو بریگیڈیئر کے طور پر یحییٰ خان اور عبدالحمید نے راولپنڈی کلب بار میں جو دھال چوکڑی جمائی ہوئی ہوتی تھی اور جس بے حیائی کا وہاں مظاہرہ ہو رہا ہوتا تھا' اس کو میری قلم لکھنے سے قاصر ہے۔ ایوب خان نے افسر میسوں اور کلبوں میں جو اس طرح کھلی شراب نوشی کی حوصلہ افزائی کی ہوئی تھی کہ بے پردہ عورتیں بھی بن ٹھن کر ان مجلسوں میں شریک ہوتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے نام پر بنائے ہوئے۔ ملک میں ایسی ''بے حیائیوں'' نے رنگ لانا تھا۔ اور ان شرابی افسروں کے ساتھ مجھے نفرت تھی۔ لیکن یحییٰ خان نے اپنی' ایک بہت بڑی ''لابی'' بنائی ہوئی تھی۔ اور شراب یا اس کے ذاتی کردار کو نظر انداز کرنے کی تبلیغ ہوتی تھی کہ یحییٰ خان دوستوں کا دوست تھا اور اپنے ساتھیوں اور دوستوں کی بڑی مدد کرتا تھا۔ جب سقوط مشرقی پاکستان کی کہانی بیان کریں گے تو قارئین حیران ہوں گے کہ اس نے کئی گروہوں کو اپنی لابی کا حصہ بنایا ہوا تھا ان میں اس کے پرائیویٹ سیکرٹری سمیت پانچ وقت کے نمازی لوگ بھی تھے۔

بہر حال یحییٰ خان نے جو کچھ ''حاصل'' کرنا تھا وہ 1952ء میں حاصل کر چکا تھا اور جس طرح لکیر کے فقیر کے طور پر پاکستان میں ہم ''ڈنگ ٹپاؤ'' گزارہ کر رہے ہیں کہ ہم نے پاکستان بنانے اور اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں کبھی کچھ نہ سوچا۔ تو یحییٰ خان اپنا پیشہ ورانہ کام اچھی طرح چلانے کے قابل تھا۔ اور باقی زندگی کو وہ ''فراڈ'' سمجھتا تھا کہ ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست''۔ وہ ایک شہزادہ کی طرح سب سیڑھیاں چڑھتا رہا اور

ستمبر 65ء کی جنگ کے مضامین میں یہ عاجز گزارش کر چکا ہے کہ بری فوج کی سربراہی کیلئے اس کا ''رقیب'' صرف جنرل سرفراز تھا۔ جس کو بدنام کرنے اور لاہور بھارت کے حوالے کرنے کے المیہ میں ذوالفقار علی بھٹو اور یحییٰ خان کے اقتدار ''مشترک'' تھے۔ یحییٰ کو بروقت مشکل سیالکوٹ محاذ سے بھی ہٹا لیا گیا تھا اور ''پانچوں سواروں'' میں شامل کرنے کیلئے چھمب جوڑیاں کی فتوحات میں بھی حصّہ دار بنا دیا گیا تھا۔ بہرحال جنرل سرفراز جن کو بھی یہ عاجز پسند نہ کرتا تھا۔ اس کیلئے فیصلہ ہو چکا تھا۔ لیکن فطرت نے ہمیں یحییٰ خان کی سربراہی میں ذلت سے دوچار کرنا تھا۔ تو شاہ ایران اور جنرل محمد موسیٰ وغیرہ نے کئی ''سازشوں'' کے ذریعہ سے اور ایوب خان کو کالا باغ' نور خان اور سرفراز کے اعوان ہونے کے پہلو سے ڈرا کر 1966 کے شروع میں یحییٰ خان کو ہماری فوج کا سربراہ بنوا ہی لیا۔ ہم اس وقت کوئٹہ میں تھے۔ دوپہر کے کھانے کے وقت ہماری افسر میس میں ہمارے کرنل کے ایم خان نے آ کر جب ہمیں یہ خبر سنائی تو میرے منہ سے نکل گیا ''پاکستان کی ذلت نظر آ رہی ہے''۔ ہمارے ایک افسر میجر گل محمد نے مجھے اشارہ کیا کہ کرنل کے ایم خان جنرل یحییٰ خان کا خاص آدمی ہے۔ تو میں نے سیدھے طور پر کہا کہ ''میجر گل مجھے سب کچھ معلوم ہے' کرنل صاحب مہربانی کریں اور یحییٰ خان کو مشورہ دیں کہ وہ اپنے حالات سنوارے'' کرنل کے ایم خان نے کہا ''کیا معلوم کہ وہ توبہ کر جائے''۔ اس عاجز نے گزارش کی کہ میں دعا کرتا ہوں لیکن ہماری دعائیں منظور نہ ہوئیں۔ 1967ء میں یہ عاجز پاکستان میں تیسری دفعہ اور ویسے پانچویں دفعہ آ کر محکمہ تعلقات عامہ کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ 1970ء کے شروع میں یحییٰ خان اور عبدالحمید سکاؤٹوں کے سالانہ جلسے میں میران شاہ گئے۔ جہاں پرانے انگریزوں کی رسم کے طور پر ڈین کے چاندی کے کپ کو شراب سے بھر دیا گیا۔ اور سب نے اس سے شراب کا گھونٹ لینا تھا۔ اور سب سے پہلے یہ کپ یحییٰ خان اور عبدالحمید کے سامنے رکھا گیا۔ انہوں نے اس کپ سے شراب کو اس طرح ''سُرکا'' کہ مجھے اپنے نانکوں کا گورا بیل یاد آ گیا کہ وہ تالاب سے پانی اسی ''ادا'' میں پیتا تھا۔ دونوں کی رہی سہی عزت بھی میرے دل سے مفقود ہو گئی۔ اور یہی وجہ تھی کہ 14 ستمبر 1970ء ان دونوں کو اور دسمبر 1971ء میں جنرل عبدالحمید کو اس عاجز نے جو کچھ کھری کھری باتیں سنائیں۔

ان انڈین کمیشنڈ افسروں میں جنرل سرفراز اور جنرل غلام جیلانی کی قسم کے لوگ بھی تھے' جن کی کارکردگی اور نالائقیوں یا کوتاہیوں کا ذکر جہاد کشمیر اور ستمبر 1965ء کے مضامین میں ہو چکا ہے۔ لیکن الطاف قادر اور عتیق الرحمٰن کی طرح کے کچھ کو ''کرنٹا'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ جو مغربی تہذیب کے دلدادہ تھے اور اسلام سے بہت دور تھے' بلکہ اردو بھی ''انگریزی'' میں بولتے تھے۔ عتیق الرحمٰن نے بڑی سچائی اور دیانتداری کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا اور عتیق الرحمٰن بڑی چھوٹی سطح پر جا کر سپاہیوں کو ٹوکتا تھا اور بھاگ دوڑ کی جسمانی سزا بھی دے دیتا تھا۔ چھاؤنی میں تماشا بنا ہوتا تھا کہ سپاہی ایک دوسرے کو ڈرانے کیلئے اچانک کہہ دیتے تھے کہ ''آ گیا عتیق الرحمٰن'' اور یہ سن کر سب لوگ بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ میں نے ایک دن ان کو جب وہ میجر جنرل تھا تو بتا دیا کہ وہ ایک ''ہوا'' بنا ہوا ہے اور اس کو کچھ سچ بھی سنایا اور واضح کیا کہ سچ سننا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس طرح وہ افسران اور جوانوں کے کردار میں بہتری نہ پیدا کر سکیں گے۔ سپاہی لوگ وہ کچھ کریں گے' جو کچھ وہ دیکھیں گے۔ ہم افسر لوگ آدھے انگریز ہیں اور آدھے دیسی۔ بلکہ بریگیڈئر آفندی جن کا ذکر ستمبر 65 کی جنگ میں سیالکوٹ محاذ پر ہو چکا ہے کہ

انہوں نے جنرل ابرار کو ٹامی انگریزی میں ''بھاگنے'' کا مشورہ دیا تھا فوج میں ایسے ''ٹامی بھی تھے۔ تو یہ عاجز عرض کرے گا ہماری فوجی تربیت کسی طرح اسلامی اقدار پر مبنی نہ تھی۔ اور سقوط ڈھاکہ یا نوے ہزار فوجیوں کے ہتھیار ڈالنے کے سلسلہ میں اس پہلو کو بھی ذہن میں رکھا جائے کہ فوج کا معاملہ آدھا تیتر اور آدھا بٹیر ہے۔

تو ستمبر 65 کی جنگ میں یہی انڈین کمیشنڈ افسر ڈویژن کمانڈر یا محمد موسیٰ کے پرنسپل سٹاف افسر تھے۔ کتنی افسوسناک بات ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی ایوب خان کو یا محمد موسیٰ کو مشورہ نہ دیا کہ اختر ملک جو کچھ کشمیر میں کر رہا ہے۔ بھارت خاموش نہ رہے گا۔ اور خاص کر یکم ستمبر 65ء کے چھمب جوڑیاں کے حملے کے بعد لاہور محاذ پر فوجوں کو اس طرح بروقت نہ بھیجنے میں بڑی کوتاہی تھی اور کسی نے یہ مشورہ نہ دیا کہ اس آنے والی جنگ کی تیاری کر لیں کہ جو پلٹنیں ستمبر اکتوبر 1965ء میں کھڑی کی تھیں وہ اگر جولائی اگست 65 میں کھڑی کر دیتے تو تاریخ کا دھارا تبدیل ہو جاتا۔ اور نہ جنگ کے بعد سوچا کہ سیاسی اور عسکری لحاظ سے ہم کتنے کمزور ہیں۔ بلکہ غلط طور سے ستمبر 65 کی جنگ کو ہماری فتح قرار دیا گیا۔ اگر یہ فتح ہوتی تو چھ سال بعد دسمبر 1971ء میں شکست فاش اور ذلت سے کیسے دوچار ہوتے۔ اس ''عاجز'' نے جنگ سے پہلے اور بعد میں جو شور کیا' خودنمائی کے ڈر سے میں تفصیل نہیں لکھ رہا اور اب بھی یہی شور کر رہا ہوں کہ ہم توبہ و ندامت کر کے مومن بنیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مومن کی فراست عطا کرے اور یہ آدھے تیتر آدھے بٹیر ہونے سے توبہ کریں حق و باطل میں فرق کریں اور حق کی پیروی کریں۔

پاکستان آرمی کے باقی سارے افسران جو ہمارے حصّے میں آئے وہ ایمرجنسی کمیشنڈ افسران تھے۔ جن کو 1941ء سے 1946ء تک کمیشن ملا۔ جن میں سینئر جنرل گل حسن' جنرل محمد شریف اور امیر عبداللہ نیازی تھے اور آخر والوں میں جنرل ضیاء الحق' جنرل سوار خان' جنرل محمد اقبال اور جنرل تجمل حسین وغیرہ آتے ہیں۔ جب پاکستان بنا تو ان میں کچھ میجر اور باقی کیپٹن تھے۔ ان میں سے کچھ نے کشمیر کے جہاد میں بھی حصّہ لیا۔ اور ستمبر 65ء کی جنگ میں زیادہ تر بریگیڈیئر اور کچھ کرنل انہی لوگوں میں سے تھے۔ چند ایک جنہوں نے بہادری دکھائی۔ یا جنہوں نے کوتاہیاں دکھائیں' یہ عاجز ان کا ذکر کر چکا ہے۔ اجتماعی صورت حال یہاں بھی انڈین کمیشنڈ افسران والی تھی کہ افراد نے جو کچھ کیا ذاتی کردار کی وجہ سے کیا اور پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے بچا لیا کہ میجر سے نیچے عہدہ والوں نے، جن کو پاکستان بننے کے بعد کمیشن ملا انہوں نے بڑی بہادری دکھائی کہ بنیادی طور پر اور قوم کے طور پر تو ہم اچھے لوگ ہیں لیکن اوپر جانے کیلئے یا تو کسی خاص کردار کی ضرورت پر زور نہیں دیا جاتا یا اوپر جا کر جیسا ابن الوقتی والا یا مطلب پرستی والا کردار اختیار کیا جائے' کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ ان سب باتوں کو سمجھنے کیلئے جہاد کشمیر کے سلسلہ میں فائر بندی کی سازش کے بعد کے واقعات پر اول ستمبر 1965ء کی جنگ کے حالات اور پھر دسمبر 71ء کی جنگ کی سازش کے حالات پر مختصر تبصرہ ضروری ہے کہ ہم سقوط ڈھاکہ کے المیہ اور ذلت و بے غیرتی کے عوامل کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

قائداعظم کشمیر کے معاملے کو بہت زیادہ اہمیّت دیتے تھے۔ جولائی 1948ء میں چودھری غلام عباس کی مہاراجہ کشمیر کی قید سے رہائی کے بعد قائد نے کشمیر کی آزادی کیلئے ان کی سربراہی میں ایک سپریم لبریشن کونسل تشکیل دی اور وزیراعظم لیاقت علی آزاد کشمیر کے صدر سردار ابراہیم' پنجاب اور سرحد دونوں کے وزیراعلیٰ' ریاستی سیکرٹری اور

متعدد اہم شخصیتوں کو اس کا ممبر بنایا۔ لیاقت کو یہ ثانوی پوزیشن دل سے پسند نہ تھی۔ قائداعظم کی وفات کے بعد اس کونسل کی کوئی میٹنگ بھی نہ ہوئی۔ اب لیاقت علی اس کی کاغذی حیثیت کو بھی طریقے سے ختم کرنا چاہتا تھا۔ تو راولپنڈی میں وزارت کشمیر کا دفتر بنایا گیا اور یہ وزارت ایک بہت پرانے گھاگ سیاستدان مشتاق احمد گورمانی کو سونپی گئی جس کا ذکر شروع کے مضامین میں ہو چکا ہے کہ 1954ء میں شاہ عراق کے پاکستان کے دورے کے وقت اخبار نویسوں نے اس کا نام ''نوری سعید آف پاکستان'' رکھا تھا۔ اس کو فوجی مشیر کے طور پر بریگیڈیر نوابزادہ شیر علی دیا گیا جس نے فائر بندی کی سازش کیلئے توپوں کے آتش بازی کے ڈرامے میں اہم کام کیا تھا اور یہ ذکر بھی ہو چکا ہے۔ گورمانی کو کام یہ دیا کہ لوگوں کو کشمیر کے سلسلہ میں خوب ''بے وقوف'' بنایا جائے کہ حکومت بڑا کام کر رہی ہے اور جس طرح بیرونی دنیا میں ظفر اللہ نے زبانی کلامی کشمیر کا مسئلہ ''زندہ'' رکھا ہوا ہے۔ اندرون ملک یہ کام گورمانی کرے اور چودھری غلام عباس ثانوی حیثیت میں چلا جائے۔ تو گورمانی نے چودھری غلام عباس اور سردار ابراہیم کے درمیان اختلاف پیدا کر دیئے اور چودھری غلام عباس کو لہو کے آنسو رلائے۔ ادھر آزاد کشمیر حکومت کو وزارت کشمیر کی ''لونڈی'' بنا دیا گیا۔ گورمانی 1951ء تک یعنی لیاقت کے قتل تک راولپنڈی سے دفتر چلاتا تھا۔ لیکن پھر وہ پاکستان کے ''بادشاہ گروں'' میں شامل ہو گیا اور 1957ء تک پاکستان کی سیاست پر چھایا رہا۔ کشمیر کے مسئلے کو سیاست کے طور پر زندہ رکھنے کیلئے 1948ء میں ہی راولپنڈی میں ایک بہت بڑا محکمہ تعلقات عامہ وجود میں لایا گیا۔ جس کے کرنل مجید ملک سربراہ تھے۔ گو قائداعظم کے یہ ناپسندیدہ آدمی تھے کہ فوج کے محکمہ تعلقات عامہ میں جانے سے پہلے ایک ہفتہ وار اخبار ''مسلم آؤٹ لک'' میں تحریک پاکستان کی مخالفت کرتے رہتے تھے۔ لیکن لیاقت کے یہ خاص الخاص آدمی تھے۔ تو ان کے ماتحت کشمیر کے ایک بہت بڑے تعلقات عامہ نے قوم کو کشمیر کی صحیح صورتحال سے باخبر نہ ہونے دیا کہ لیپا پوتی سے ''کشمیر آج ملا'' اور ''ابھی ملا'' کی ایسی ''لوری'' شروع کی، جو اب تک جاری ہے۔

جہاد کشمیر میں ہمارے انگریز جنرلوں نے بھارتیوں سے ہمیں مار دلوا کر خوب مرعوب کرنے کی کوشش کی کہ آزادی سے پہلے ہندو فوجی ہم مسلمانوں سے مرعوب تھے کہ کھیل کود، فوجی کاموں، یا حقیقی جنگ میں وہ ہم سے بہت نیچے ہوتے تھے۔ اب جہاد کو جمود دے کر انگریزوں کا اصلی مقصد یہ تھا کہ اس جہاد کے دوران ہمارے اندر جو اسلامی اقدار عود کر آئی ہیں ان کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ جنرل اکبر خان رنگروٹ اپنی ''یادوں'' میں تحریر کرتے ہیں کہ فروری 1949ء میں مجھے جنرل گریسی، جنرلوں کی کانفرنس کے بعد الگ طور پر کہنے لگا ''کہ تم نے یہ کیا ''جہاد، جہاد'' کی دقیانوسی طرز کو اپنا وطیرہ بنایا ہوا ہے'' جہاد والے عثمانیہ اور مملوک ہم مغربی طرز دفاع والوں کے ہاتھوں شکست کھا چکے ہیں۔ جہاد اور مغربی دفاع دونوں فلسفے اکٹھے کبھی نہیں چل سکتے۔ تم جہاد کو بھول جاؤ۔ یہاں پاکستان میں مکمل طور پر مغربی طرز دفاع اپنایا جائے گا۔'' اس کے بعد جنرل گریسی نے جی ایچ کیو کے ملٹری ٹریننگ کے ڈائریکٹر کے دستخطوں سے ایک پالیسی والا خط جاری کرایا۔ جس کا اختصار یہ ہے۔'' کشمیر کی جنگ کے دوران کچھ لوگوں نے کچھ تجربات حاصل کئے۔ لیکن یاد رہے یہ محدود اور وقتی قسم کی لڑائیاں یا جھڑپیں تھیں۔ جس میں پاکستانی افواج بھرپور طور پر شرکت نہ کر رہی تھیں۔ اس لئے ہماری فوجی تربیت کے دوران ان تجربات کا خواہ نظریاتی ہوں

یا عسکری ہرگز ذکر نہ کیا جائے گا۔ اور ہماری تربیت دوسری جنگ عظیم کے تجربات پر مبنی رہے گی۔ ’’یعنی جہاد کا نام بھی نہ لیا جائے گا۔‘‘

اس کے بعد جنرل گریسی نے اے جی برانچ کی پی ایس ڈائریکٹوریٹ سے ایک چٹھی جاری کرائی کہ کشمیر کی جنگ کے دوران کچھ یونٹوں نے اور اداروں نے اسلامی جنرلوں کے نام اپنا لئے تھے۔ جیسے خالد صلاح الدین اور غزنوی وغیرہ۔ کئی نام ایسے ہیں جو ایک سے زیادہ یونٹوں نے اپنا لئے ہیں۔ جو یونٹس کشمیر کی جنگ میں شریک نہیں ہوئیں۔ انہوں نے بھی اب ایسے نام اپنانے شروع کر دیئے ہیں اور اس طرح ناموں کے ’’چناؤ‘‘ یا ’’اپنانے‘‘ میں بڑی رقابت پیدا ہو رہی ہے۔ اس لئے آج سے ایسے تمام ناموں کا استعمال بند کیا جاتا ہے۔ اور یونٹوں کے سرکاری عددی ناموں کے علاوہ کوئی اور نام زبانی طور پر بھی نہ استعمال کیا جائے گا۔‘‘ پنجابی کی یہ مثال بغیر ترجمہ کے لکھی جاتی ہے۔‘‘

’’جتھو دی کھوتی اتھائیں ونج کھلوتی‘‘

یعنی اس بلیٹن اور رسالہ کو لمسڈن صاحب نے کھڑا کیا تھا۔ جنہوں نے 1857ء میں دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اور جو پٹہ لمسڈن صاحب گائیڈ رسالہ کو دے گئے۔ جہاز کے حادثہ کے وقت بھی ضیاء الحق پہنے ہوئے تھا۔ یا یہ پلٹن دو سو سال بہت پہلے ’’لانگ مور‘‘ صاحب نے کھڑی کی تھی۔ جس نے سرنگا پٹم میں شہید سلطان ٹیپو کی حکومت کو پاش پاش کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہر 23 مارچ کو جب بڑی پریڈ ہوتی ہے تو تمام میری پنجاب رجمنٹ والوں نے جو جھنڈے اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان پر ’’سرنگا پٹم‘‘ کے الفاظ سب سے اوپر کندہ ہوتے ہیں۔

چنانچہ اس روایت یا بھیڑ چال کو فوجی روایات میں بلند مقامات عطا کرنے کے لئے فرنٹیئر فورس کی دونوں رجمنٹوں نے 1949ء میں ’’پفرز کا سو سالہ‘‘ منانے کا اہتمام کیا کہ ان گروپوں کی اکثر یونٹیں 1849ء میں کھڑی ہوئی تھیں۔ دعوت نامہ تو سو سالہ فیلڈ مارشل برڈوڈ کے نام بھی جاری کیا' جو بڑھاپے کی وجہ سے سفر نہ کر سکا لیکن بھارتی فوج کے انگریز سربراہ جنرل راب لاکھارٹ کو خاص طور پر مدعو کیا گیا' جس کی تدبیرات کے تحت ہمیں کشمیر کے جہاد میں بھارتی سورماؤں سے مار دلا کر ’’مرعوب‘‘ کیا جاتا رہا۔ اخباروں میں خبروں اور سب رسم و رواج کو اتنا تقدس دیا گیا کہ شاید ’’پفرز‘‘ کوئی اسلام کے عظیم مجاہد تھے۔ جنرل آغا رضا فوج میں ایجوٹنٹ جنرل تھے۔ جو فوج کی رسم و رواج کے نگہبان ہوتے ہیں۔ وہ بھی ان رسموں میں شریک ہونے کے لئے ایبٹ آباد گئے ہوئے تھے لیکن ان کو آہستگی سے بتا دیا گیا کہ وہ ’’پفرز کے ڈنر‘‘ میں شرکت نہیں کر سکتے کہ وہ ’’پفر‘‘ نہیں اور اس بات کو خوب پھیلایا بھی گیا کہ ایک مقصد جنرل رضا کو نکو بنانا تھا کہ وہ پاکستانی فوج کا سربراہ بننے کا نہ صرف پکا امیدوار تھا بلکہ جلدی میں بھی تھا' دوسرا مقصد یہ تھا کہ پاکستانی فوج کی یونٹیں اپنی رجمنٹوں پر فخر کو اپنا وطیرہ بنائیں کہ ہم مکمل طور پر اپنے انگریز حکمرانوں کے ’’جانشین‘‘ نظر آئیں اور ایسے رسم و رواج آج کل بھی جاری ہیں۔ ایوب خان کی پلٹن پانچویں پنجاب ہر سال ’’دوشاخ‘‘ کا دن مناتی ہے کہ 1919ء میں انہوں نے اس مقام پر روسی ترکستان کے مسلمانوں کو تہ تیغ کیا تھا۔

1949ء میں انگریز عجیب تذبذب میں تھے کہ چین میں ماؤزے تنگ اور چو این لائی کامیاب ہو رہے

تھے۔ اینگلو امریکن بلاک کے "پروردہ" چنگ کائی شیک فارموسا پہنچ چکا تھا اور اس کے جو "حواری" بروقت اپنے علاقوں سے نہ بھاگ سکے، وہ پیدل چل کر سن کیانگ کے راستے یا دوسرے دروں سے گلگت اور سکردو کے علاقوں میں پہنچ گئے تھے اور اینگلو امریکن بلاک والے ان کی "چھانٹی" کرا کے ان کو اپنے یا اقوام متحدہ کے ذریعہ سے فارموسا وغیرہ بھیجنے کا بندوبست بھی کر رہے تھے اور ہمارے شمالی علاقوں کے کیمپوں میں ان کی دیکھ بھال بھی کر رہے تھے۔ جنرل گریسی کا ایک پرانا استاد لیفٹیننٹ جنرل مارٹن لندن ٹائمز کا فوجی نامہ نگار بنا ہوا تھا۔ اس کو جنرل گریسی نے ہوائی جہاز کے ذریعہ شمالی علاقوں میں بھجوایا۔ راقم بھی ساتھ تھا کہ جنرل مارٹن یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا یہ ماؤزے تنگ وغیرہ اتنے مضبوط اور منظم ہیں کہ وہ پکے طور پر چین کے حکمران بن جائیں گے اور جب اس کو ایسی تسلی ہوگئی تو انگریزوں نے بھارت اور پاکستان کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے کی تگ و دو شروع کر دی اور ہماری حکومت کو پہلے اس غلط فہمی میں ڈالا ہوا تھا کہ دریائے چناب کے مغرب تک کشمیر کے علاقے ہمیں مل جائیں گے، وہ پالیسی تبدیل کر کے انگریزوں نے موجودہ فائر بندی لائن اور اس میں کچھ تبدیلی کو بین الاقوامی سرحد پر دونوں ملکوں میں جو سمجھوتہ کرانے کا فیصلہ کیا اور اینگلو امریکن بلاک آج تک اسی پر قائم ہیں اور بعد میں بھارت اور چین کا جھگڑا بھی انہی اینگلو امریکن بلاک والوں نے کرایا اور اینگلو امریکن بلاک اور بھارت میں بڑا اختلاف روس کے بھارت کے ساتھ "یارانہ" پر ہے۔ جس دن بھارت نے روس کی وقعت کو تسلیم کرنا بند کر دیا یا روس کی "وقعت" ویسے ختم ہوگئی اس دن کے بعد موجودہ فائر بندی کی لائن کو بین الاقوامی حد بنا کر پاکستان کو بھارت کا چھوٹا بھائی بنا دیا جائے گا۔ یا دونوں ملکوں کی کنفیڈریشن ہو جائے گی کہ برصغیر ہندو پاکستان، جنوبی ایشیا میں اینگلو امریکن بلاک کا "سنتری" بن جائے گا۔ اس تجویز کے کچھ حصے 1949ء میں ہی سول ملٹری اخبار میں شائع ہو گئے تھے کہ لیاقت علی حکومت اندرونی طور پر اس سمجھوتے کے لئے راضی ہے تو ان دنوں اخبار بند کر دیا گیا تھا کہ اس "افشا" کا وقت نہ آیا تھا۔

چنانچہ 1949ء میں برٹش حکومت کے چیف آف دی امپیریل سٹاف فیلڈ مارشل سلم جو جنرل گریسی کا سینئر رہ چکا تھا، خاص طور پر بھارت اور پاکستان کے دورے پر آیا اور جنرل گل حسن اور مجھے تو خاص کر حکم ملا کہ ہم اس کے سٹاف پر رہے تھے اور گل حسن اس وقت میجر تھے کہ ہم فیلڈ مارشل سلم کو ملیں لیکن فیلڈ مارشل سلم نے ہماری فوج کے اکثر سینئر افسروں کے ساتھ کھل کر باتیں کیں کہ بھارت اور ہمارا متحدہ دفاع کا بندوبست ہونا چاہئے اور ہمیں بھارت کا چھوٹا بھائی بن کر رہنا ہوگا۔ انہی دنوں ایک برٹش میگزین میں جنرل ٹکر کا "جوائنٹ انڈو پاکستان ڈیفنس" پر مضمون شائع ہوا اور جنرل گریسی ہم پر زور دیتا تھا کہ ایسے خیالات کی ہم اپنے اخباروں میں پذیرائی کرائیں یا حکومت والوں کے منہ میں ایسے الفاظ ڈالیں لیکن اس وقت قوم میں کچھ "جان" باقی تھی تو ہمارے ڈائریکٹر کرنل شہباز نے ہمارے مشورے سے جنرل گریسی سے اس طرح جان چھڑالی کہ اس جنرل ٹکر کے مضمون کی کاپیاں بنا کر یونٹوں میں بھیج دیں گے کہ افسر لوگ اس "ضرورت" کو سمجھ سکیں۔ پاکستانی قوم ایسی بات سننے کو تیار نہیں ہے۔ قارئین یہ بڑی لمبی کہانیاں ہے آپ "حیلہ فرنگی" کی ان باتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ بھارت کسی ایسے دفاع میں شریک ہونے کو تیار نہ ہوا لیکن ہمیں "بغداد پیکٹ" یا بعد میں "سنٹو" یا "سیٹو" میں شمولیت کیلئے تیار کیا جا رہا تھا۔ بھارت والے جنہوں نے ہمیں کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا ان کو 1950ء میں ہماری ایک سگنل

کمیونیکیشن نشق کا بہانہ ملا تو انہوں نے اپنی افواج کو ہماری سرحد کی طرف تیزی سے حرکت دینا شروع کر دیا یہ مارچ 1950ء کی بات ہے۔ ایوب خان فوج میں ایجوٹنٹ جنرل تھے اور میں ان کے ساتھ جہلم جا رہا تھا۔ سواں کے پل کے پاس پہنچے تو آگے سے جنرل اعظم خان کار میں آتے دکھائی دیے جو نئے نئے جنرل بنے تھے اور لاہور ڈویژن کے کمانڈر بنے تھے۔ دونوں کاریں رک گئیں کہ اس زمانے میں کاروں اور ٹریفک کی یہ بھیڑ نہ ہوتی تھی اور جنرلوں کی تعداد سٹاف افسروں سمیت درجن سے بھی کم تھی ہر کار پر جھنڈے سے پہچانا جاتا تھا کہ ڈویژن کمانڈر ہے یا پرنسپل سٹاف افسر۔ اعظم خان کار سے اترتے ہی کہنے لگے ''میں ایک ڈویژن سے کس کس جگہ کا دفاع کروں گا'' ایوب خان نے کہا ''ہاں معاملات اچھے نہیں لیکن سیالکوٹ کا دفاع تمہیں نہ کرنا پڑے گا'' وہاں ساتواں ڈویژن جا رہا ہے اور بکتر بند بریگیڈ دونوں ڈویژنوں کا ریزرو ہو گا۔ تمہیں نئی بریفنگ جی ایچ کیو سے ملے گی۔ میں تو تم لوگوں کے لئے دعا کروں گا اور میری ذمہ داری فوج کے لئے نفری مہیا کرنا ہو گی وغیرہ یہ باتیں سن کر یہ عاجز کافی مایوس ہوا کہ انگریزوں نے ہمیں بھارت سے مرعوب کیا ہوا ہے اور ہمارے اوپر والے مرنے مارنے پر تیار نہیں اور شاید ہمیں ٹھیک طرح سے نہ لڑا سکیں۔ خیر یہ جھگڑا جلدی ختم ہو گیا کہ جنرل گریسی اپنے زمانے میں بھارت کے ساتھ سیدھی ٹکر سے بچنا چاہتا تھا۔ اس نے بھارتی فوج کے نئے سربراہ جنرل کری آپا سے بات کی تو اس نے کہا کہ پاکستان کی فوج کے جگہ جگہ سے ''پھیلاؤ'' کے سگنل مل رہے ہیں تو جنرل گریسی نے کہا فوج تو چھاؤنیوں میں بیٹھی ہے یہ تو سگنل کمیونیکیشن کو پرکھا جا رہا ہے تو فوجیں محاذ پر نہ گئیں۔

ایوب خان نے جہلم جا کر اپنے پرانے چودھویں سنٹر میں ایک مسجد کی بنیاد رکھنا تھی۔ چند ماہ پہلے یہ عاجز جنرل گریسی کے ساتھ جہلم گیا تھا تو ہمارے کمانڈر کرنل سٹک لینڈ نے مجھے بتایا تھا کہ لائنوں میں یہ جو ٹوٹی پھوٹی خراب جگہ ہے اس کو ہموار کر کے وہ یہاں ایک بہت بڑی مسجد بنانا چاہتا ہے۔ میں نے سمجھا کہ مجھے ''متاثر'' کر رہا ہے کہ میں دوسروں کے سامنے اس کے بارے میں اچھا تاثر دوں لیکن جہلم پہنچ کر میں حیران ہو گیا کہ مسجد کی بنیادیں کتنی وسعت میں تھیں اور بنیاد باقاعدہ فوجی سلامی سے بگل وغیرہ بجا کر رکھی گئی سب لوگ وردی میں بھی تھے اور وضو بھی کئے ہوئے تھے کہ ہم بھی جیسے گاڑی سے اترے تو ہمارے لئے وضو کرنے کا بندوبست بھی تھا۔ بنیاد رکھنے کے بعد اس عاجز نے سٹک لینڈ کو بڑی مبارکیں دیں تو سٹک لینڈ نے مجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے میرے لئے انکشاف کیا کہ یہی جنرل ایوب خان پاکستان کی فوج کے پہلے سربراہ ہوں گے۔ مجھے اس بات پر شک نہ پڑا کہ سٹک لینڈ جنرل گریسی کی گورکھا یونٹ کا تھا اور جنرل گریسی نے اس کو ولایت سے منگوایا تھا اس میں قارئین کے لئے بڑے اشارے ہیں کہ انگریز بڑے بہروپیا لوگ تھے اور ہرفن مولا تھے' وقت اور ضرورت کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ دوسرا اشارہ یہ ہے کہ ایوب خان کو اپنے رنگ میں رنگ کر انگریز بری فوج کی سربراہی کے لئے ''گروم'' کر رہے تھے۔

چنانچہ 1950ء کا سارا سال جنرل گریسی پاکستانی افسروں کو ''سانجھی دولت'' میں رہنے کیلئے گروم کرتا رہا لیکن کچھ افسر انگریزوں سے ''نالاں'' تھے ان کے ساتھ بھی جنرل گریسی کا رابطہ تھا کچھ کو شہ دی جا رہی تھی کہ حکومت کی ''مخالفت' کی جائے۔ کچھ کو ''ایجنٹ پروویکٹر'' بنایا ہوا تھا اور ایک ایسا مقصد سامنے تھا کہ انگریزوں سے

نالاں افسروں کی انگریزوں سے نالاں ہونے کا رویہ اپنی حکومت کے خلاف ہو جائے اور ان سے کچھ لوگ حکومت پر قبضہ کرنے کا کوئی پروگرام بنائیں اور جنرل گریسی جاتے جاتے ایک طرف لیاقت علی اور دوسری طرف ایوب خان کو ''آگاہ'' کر گیا کہ کچھ افسر حکومت پر قبضہ کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ آپ لوگ ان پر کڑی نگاہ رکھیں اور ان کی کسی ایسی کارروائی سے پہلے آپ لوگ ان پر ہاتھ ڈال کر ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کریں۔ راولپنڈی سازش کا مقدمہ اس سلسلہ میں قوم کو گہری تحقیق کی دعوت دیتا ہے کہ ہم لوگ انگریزوں یا اینگلو امریکن بلاک کے ہتھکنڈوں کو سمجھیں۔ افسوس کہ راقم کے علاوہ کسی صاحب نے اس سلسلہ میں تحقیق نہیں کی۔ سوائے ایک حسن ظہر کی کتاب کے لیکن کتاب میں تحقیق حوالوں سے نہیں کی گئی۔

پاکستان کی تاریخ کی اس پہلی سازش کا المیہ یہ ہے کہ اس کی سب کارروائی پر جو پردے ڈالے گئے یا حقیقت قوم پر واضح نہ ہو سکی تو باقی سازشوں کے سلسلہ میں وہی طریقے اختیار کئے گئے اور قوم حق و باطل میں آج تک فرق نہ کر سکی کہ باطل نے حق کا لبادہ اوڑھ لیا ہے اور باطل والے حق کو باطل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور جو آدمی جتنے زیادہ جھوٹ بول کر قوم کی غلط رہنمائی کرتا ہے' وہ قوم کا اتنا بڑا رہنما بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں سیاسی' مذہبی' فوجی' عدلیہ' دانشور ہر قسم کے لوگ شامل ہیں اور یہ عاجز ان میں سے کسی کا کچا چٹھا کھولتا ہے تو اخبار اس کو شائع کرنے سے ڈرتے ہیں کہ کہیں غلط الزام تراشی کے تحت وہ دھر نہ لئے جائیں۔ اب اس سازش کے مقدمہ کیلئے ججوں یا وکیلوں نے جو قسمیں اٹھائیں کہ وہ ساری کارروائیاں خفیہ رکھیں گے وہ معاملہ 55-1954ء میں خود بخود ختم ہو گیا تھا جب اس کے قانون کو غلط قانون قرار دے دیا گیا اور اس قانون کے تحت جو لوگ سزائیں کاٹ رہے تھے وہ سزائیں ختم ہو گئیں اور جن کو ''مجرم'' بنایا گیا تھا وہ بری ہو کر گھر آ گئے اس کے بعد ضروری ہو جاتا تھا کہ کارروائی کا لفظ لفظ قوم کے سامنے پیش کیا جاتا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس مقدمہ کے بڑے ''مجرم'' جنرل اکبر خان طارق از خود نے 1973ء میں شائع ہونے والی کتاب ''کشمیر کے حملہ آور'' میں چند فقرے لکھے ہیں کہ ان کا قصور یہ تھا کہ وہ کشمیر کو آزاد کرانا چاہتے تھے ایک اور ''مجرم'' کرنل حسن خان نے اپنی کتاب ''شمشیر سے زنجیر تک'' میں تمام مجرموں کے قلمی خاکے اور مقدمہ کی کچھ روداد لکھی ہیں۔ لیکن بیانات ادبیانہ ہیں اور ان میں افسانوی رنگ نظر آتا ہے۔ گو لفظ لفظ سچ ہے ایک اور ''مجرم'' بریگیڈیئر صدیق ستی نے ایک رسالہ میں ایک مضمون میں اپنا دفاع کیا ہے کہ انہیں ''حب الوطنی'' کی سزا ملی ہے۔ اس عاجز کی تحقیق کا اختصار یہ ہے کہ میں اپنے مضامین میں گزارش کر چکا ہوں کہ ہماری فوج میں کافی لوگوں کو کشمیر کے جہاد کے انگریز جنرلوں کے طریق کار کے ساتھ اختلاف تھا تو فائر بندی پر کچھ لوگوں نے مستعفی ہونے کی درخواستیں دیں کچھ نے پروٹیسٹ کیا' کچھ نے زبانی طور پر اختلاف کیا اور راقم بھی ان میں شامل تھا کہ مجھے ''ایڈورس رپورٹ'' پر رکھ کر میری تبدیلی ہمارے سنٹر میں کر دی گئی تو انگریز جنرل اس سے آگاہ تھے کہ پاکستان کی فوج میں کچھ غیرت مند لوگ بھی ہیں۔ تو انہوں نے اپنے جانے سے پہلے ایسے لوگوں کیلئے تجاویز بنائیں کہ ایسے لوگ پاکستانی فوج میں اوپر نہ آئیں بلکہ ان کے تیار کردہ ابن الوقت بے کردار اور مغرب زدہ لوگوں کی ''کھیپ'' پاکستان کی افواج پر مسلط رہے۔

ایسی تجاویز کے کئی پہلو تھے اور کئی ''میدانوں'' میں بڑی ریاکاری اور مکارانہ طریقے استعمال کرنے تھے

کہ انگریز اپنے پیچھے ہمارے اندر ان سازشی مکڑیوں سے کئی تنومند جال بچھوانے کے پروگرام بنا گئے ہیں۔ جن پر عمل اب بھی جاری ہے کہ ایسے لوگ "ڈبل گیم" بھی کھیلتے ہیں جیسے یہ عاجز ستمبر 65ء کی جنگ کے بارے میں ذوالفقار علی بھٹو اور اختر ملک کی سازش سے پردے اتار چکا ہے۔ کچھ لوگ اینگلو امریکن بلاک کی ڈگڈگی پر ہر وقت ناچنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی انگریز جرنلوں نے اپنے گماشتوں اور کارندوں کی مدد سے حکومت پاکستان کے خلاف ایک سازش کی بنیاد بھی "بندھوائی" اور جنرل گریسی نے اپنے جانے سے پہلے ایوب خان کو اس "سازش" کے بارے میں آگاہ کیا کہ وہ ایوب خان کی مدد کیلئے لیفٹیننٹ جنرل میک کے کو اس کے مشیر کے طور پر چھوڑ رہے ہیں اور اس "مشیر" نے لیاقت علی اور ایوب خان سے وہ کچھ کرا دیا جو انگریز چاہتے تھے اور بھولے پن سے ایوب خان اپنی کتاب "فرینڈز ناٹ ماسٹر" میں تسلیم کرتا ہے کہ جو لوگ بہت جونیئر ہوتے بڑی کمانڈوں پر بہادری سے کشمیر میں لڑے ان کو بعد میں ان کے قد کے مطابق "تراش" دیا گیا کہ انگریزوں نے جن قریبی لوگوں کی نشاندہی کی تھی جیسے بریگیڈیئر گلزار احمد، بریگیڈیئر نوشیرواں، کرنل سلطان علی شاہ، کرنل شیر محمد، میجر حفیظ آفریدی وغیرہ ان کو تو ترقی نہ کرنے دی لیکن دوسرے منہ پھٹ لوگوں کو سازش کے مقدمہ کے ذریعے سے فوج سے بھی فارغ کرا دیا۔

سازش کا سب سے بڑا مجرم جنرل اکبر خان طارق کو بنایا گیا جس کا کشمیر کے جہاد کے مضامین میں بھرپور ذکر ہے۔ دوسرا مجرم بریگیڈیئر صدیق ستی کو بنایا گیا جس کے بارے ذکر ہو چکا ہے کہ وہ پونچھ کو آزاد کرا چکا تھا لیکن وہاں حیاء الدین سے سازش کر کے جنرل گریسی نے پونچھ بھارت کے پاس رہنے دیا۔ تیسرا ملزم کرنل حسن مرزا کو بنایا گیا جس نے گلگت کو آزاد کرایا اور شمالی علاقہ جات میں بہادری کے مظاہرے کئے۔ چوتھا ملزم بریگیڈیئر ایم اے لطیف کشمیر کی جنگ میں تو شامل نہ تھا لیکن اکبر خان کے ساتھ ایک یونٹ میں نوکری کر چکا تھا اور اکبر خان کا ہم خیال تھا۔ علاوہ ازیں مختلف اوقات پر کرنل نیاز ارباب اور میجر محمد اسحاق نے اکبر خان کے بریگیڈ میجر کے طور پر کام کیا، کیپٹن خضر حیات جی تھری رہا تھا اور کیپٹن ظفر اللہ پوشنی سگنل افسر تھا تو ان کو اکبر خان کے ساتھ ان تعلقات کی وجہ سے دھر لیا گیا۔ ایک اور "ملزم" کرنل ضیاءالدین تھا جو کرنل نیاز ارباب کی یونٹ کا بھی تھا اور کشمیر سے تعلق کی وجہ سے کرنل حسن مرزا کے ساتھ بھی ان کا کچھ رابطہ تھا تو ان کو بھی سازش میں "ملوث" کر دیا گیا۔

میجر جنرل نذیر احمد کو البتہ مقدمہ میں بہت دیر بعد یعنی چھ ماہ یا سال بعد شامل کیا گیا۔ وہ وزیر خارجہ ظفر اللہ کا ہم زلف بھی تھا۔ جنرل گریسی اور بعد میں ایوب کے مشیر جنرل میک کے، ہرگز جنرل نذیر کو مقدمہ میں شامل نہ کرنا چاہتے تھے اور اس کو "بچانے" کے لئے ظفر اللہ اور انگریزوں نے بڑے جتن کئے لیکن آگے چل کر جب گواہیاں پیش ہوں گی تو قارئین پر خود بخود واضح ہو جائے گا کہ جس بڑی گواہی پر اس مقدمہ کی بنیاد باندھی گئی اس کے مطابق سب سے سینئر ہوتے ہوئے مقدمہ کا مجرم نمبرون جنرل نذیر بنتا تھا۔ جنرل نذیر کو "سلطانی گواہ" بھی نہیں بنایا جا سکتا تھا کہ اگر ساری سازش کی "تجاویز کا بانی جنرل اکبر خان کو بنا بھی لیا جاتا تو اس میں عملی پہلو کوئی نہ تھا اور مقدمہ میں جتنا کچھ "عملی پہلو" تھا اس کا بڑا مجرم جنرل نذیر احمد ہی تھا لیکن حیرانی کی بات ہے کہ جنرل نذیر کو صرف ایک دن کی سزا دی گئی کہ اس نے اس عملی کارروائی میں جو کیا یا حصہ لیا وہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے لیا اور

اوپر والوں کو کچھ حالات سے ''آگاہ'' بھی کر دیا تھا اور اوپر والوں کو واقعات اپنی زبان میں پیش کئے کہ فوج میں بے چینی ہے تو جنرل نذیر کے اس دفاع کو منظور یا تسلیم کر لینے کے بعد اکبر خان کو چھوڑ کر تمام ''مجرموں'' کو جنرل نذیر سے بھی کم سزا ملنا چاہیئے تھی کہ آگے ثابت ہو جاتا تھا کہ سلطانی گواہ کرنل صدیق راجہ تو ''ایجنٹ پرووکیٹر'' تھا یعنی حکومت یا کسی بڑے ادارے کی ضرورت کے تحت وہ اپنے رفقاء کو حکومت کے خلاف کسی کارروائی پر اکساتا رہتا تھا۔

یہ عاجز، کرنل صدیق راجہ نے جنرل ٹاتھم کے ''حکم'' پر اپنی پلٹن نویں ایف ایف کی دو کمپنیاں ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ محبوب نیازی کی کمانڈ میں جھنگڑ کی لڑائی میں ایک قصائی کی طرح جھونک دی تھیں اس کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے کہ مقصد پاکستانی فوج سے کچھ جوانوں کو بھارت کا قیدی بنانا تھا کہ اقوام متحدہ میں پاکستان والے ''معذرت خواہانہ'' رویہ استعمال کریں۔ اس آدمی کو یہ غلط فہمی تھی کہ اس طرح ڈبل گیم کھیل کر وہ سب اوپر والوں کو کسی نہ کسی طرح ''ٹھکانے'' لگا لے گا اور خود کمال ترکی بن کر پاکستان کی حکومت سنبھال لے گا کہ انگریز جنرلوں نے اس کو ایسی ''شہ'' دی ہوئی تھی کہ کمال اتاترک کو گیلی پولی کی لڑائی کے ''ڈرامے'' سے انگریز ہی اوپر لائے تھے۔ صدیق راجہ کی اس سلسلہ میں مدد ایک اور آدمی میجر یوسف سیٹھی کر رہا تھا کہ اس کو بھی سلطانی گواہ بنایا گیا کہ اکبر خان کے ''مہمانوں'' کی وہ دیکھ بھال کرتا تھا۔ ائیر کموڈور محمد خان جنجوعہ کو مقدمہ میں صرف اس لئے شامل کیا گیا کہ وہ فضائی فوج کیلئے انگریزوں کا دوسرے درجہ کا سامان خریدنے کو تیار نہ تھا۔ انگریز اس سے جونیئر لوگوں' رضا اور اصغر خان وغیرہ کو ''گروم'' کر رہے تھے کہ فضائی فوج کی سربراہی ان کو دیں اور محمد خان کو ''منظر'' سے ہٹا دیں۔ اکبر خان جب ولایت کورس کیلئے گیا ہوا تھا تو محمد خان اور اکبر خان کی کوئی ملاقات ہوئی یا ملاقات ''کرائی'' گئی۔ محمد خان کو سازش میں شامل کرنے کی ''جھوٹی'' گواہی پیش کی جا سکتی تھی۔ اکبر خان کی بیگم نسیم' واحد عورت تھی جس کو اس مقدمہ میں ''ملوث'' کیا گیا۔ وہ مشہور مسلم لیگی لیڈر بیگم شاہ نواز کی بیٹی تھیں۔ ان کی بہن ممتاز ترقی پسند خیالات کی تھیں اور سوشلسٹ یا کمیونسٹ خیالات کے لکھاڑیوں سے ملتی رہتی تھی۔ چونکہ اکبر خان کی ایک میٹنگ میں پاکستان ٹائمنر کے ایڈیٹر فیض احمد فیض' سجاد ظہیر اور محمد حسین عطا شامل تھے اور ان کو بھی اس مقدمہ میں ملوث کیا گیا تو کہا گیا کہ اکبر خان نے ان لوگوں کے ساتھ رابطہ کا کام اپنی بیگم نسیم کے ذریعہ سے کیا۔

جنرل موسیٰ نے جنرل ایوب خان کے ذریعے حبیب اللہ خان کو وقت سے پہلے ریٹائر کروا دیا

اکبر خان اپنی کتاب میں صدیق راجہ کے ساتھ مخبری کے کام کیلئے جنرل حبیب اللہ کا نام بھی لکھتے ہیں جو اس زمانے میں کرنل/ بریگیڈئر تھے لیکن حبیب اللہ نے مقدمہ میں کوئی گواہی نہ دی کہ اتنے زیادہ سلطانی گواہ بھی نہیں بنائے جا سکتے تھے اور حبیب اللہ جو گواہی دیتا تو وہ اس مقدمہ میں ''ملوث'' ہو جاتا کہ یہ کچھ ہم عام فوجیوں کو بھی معلوم تھا کہ 1949ء میں حبیب اللہ پشاور میں بریگیڈ کمانڈر تھے اور اکبر خان کوہاٹ کے بریگیڈ کمانڈر۔ تو دونوں اکثر کوہاٹ اور پشاور کے درمیان ایک دوسرے کو فون کر کے عالی چبوترہ کے مقام پر ملا کرتے تھے اور وہاں ''گپ'' لگاتے تھے یا کوئی صلاح مشورہ کرتے تھے۔ اس کی تفصیل نہ مقدمے میں آئی نہ ویسے باہر نکلی کہ اس صلاح مشورے کی باتوں کے باہر آ جانے سے دونوں اس مقدمہ میں بری طرح ''ملوث'' ہو جاتے کہ اب حسن

ظہیر نے اپنی کتاب میں اکبر خان کے حکومت پر قبضہ کرنے کے سلسلہ میں پہلے سے ایک طرف بھارت کے ساتھ بھی اور دوسری طرف روس کے ساتھ بھی بہتر تعلقات کیلئے کچھ گواہیاں پیش کی ہیں تو میرے لئے بھی یہ باتیں نئ ہیں۔ کیا معلوم یہ کچھ لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کرنے کا ایک بہانہ ہو اور اکبر خان کا اصلی مطلب حکومت حاصل کرنا ہو۔ حبیب اللہ نے پاکستان کے وجود میں آنے سے 1960ء تک پاکستانی فوج میں ایک بہت اہمیّت والے افسر کے طور پر اپنی شخصیت سے ہر خاص و عام کو متاثر رکھا۔ ویسے بھی جو جنرل یوسف وغیرہ ایوب خان کے جانشین نہ بن سکے۔ وہ سب الزامات' حبیب اللہ پر لگاتے تھے کہ وہ ایوب خان کا ''جانشین'' ہوگا اور اس میں کوئی شک نظر نہیں آتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اینگلو امریکن بلاک کیلئے حبیب اللہ پسندیدہ شخصیت نہ تھے۔ حالانکہ وہ ترقی کر کے لیفٹیننٹ جنرل کے عہدہ تک پہنچ گئے تھے اور جنرل محمد موسیٰ کے چیف آف سٹاف بھی بن گئے لیکن معلوم ہوتا ہے 1958ء میں جب ایوب خان کو صدر بنا دیا تو ساتھ محمد موسیٰ کے کمانڈر انچیف بن جانے کا اعلان کر دیا جو کڑوی گولی ایوب خان کو نگلنا پڑی اور حبیب اللہ تو ان دنوں ملک سے باہر تھا لیکن محمد موسیٰ کی مغربی لابی اتنی زیادہ امداد کر رہی تھی اور محمد موسیٰ نے ایوب خان کو اپنی وفاداری ایسی دکھائی کہ ایوب خان سے محمد موسیٰ نے حبیب اللہ کو بھی وقت سے پہلے فوج سے ریٹائر کرا دیا کہ پہلے محمد موسیٰ نے بریگیڈئر محمد حیات' بریگیڈئر محمد مظفر اور بریگیڈئر قاضی رحیم کو میجر جنرل نہ بننے دیا اور کرنل شیر محمد' کرنل محمد عنایت اور کرنل حفیظ آفریدی کو بریگیڈئر نہ بننے دیا کہ یہ سارے حبیب اللہ کے ''آدمی'' ہیں۔ لیکن اصلی بات مغربی لابی کی ہے کہ حبیب اللہ کے بھائی اسلم خٹک یوسف خٹک ولد علی قلی خان کی مسلم لیگ کے لئے خدمات اور ان کے دل میں جو اسلام کی محبت تھی۔ یہ چیز اہل مغرب کو پسند نہیں۔ یہ کچھ لکھنے میں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ جنرل حبیب اللہ کا بیٹا علی قلی خان بھی جو پاکستان کی بری فوج کا سربراہ نہ بن سکا۔ تو اس میں بھی مغربی لابی کا ہاتھ ہے۔ قارئین ذرا اندازہ لگائیں کہ اہل مغرب کس طرح ہمارے اندر ''گھسے'' ہوئے ہیں۔

1949ء کے شروع میں سیریا (شام) میں کرنل حسنی زیم نے حکومت کا تختہ الٹ کر حکومت سنبھال لی۔ تو ہمارے ہاں بھی شاید کچھ لوگوں کے دل میں یہی خیال عود کر آیا ہو کہ یہاں پاکستان کے حالات صحیح نہیں یہاں بھی کوئی فوجی حکومت سنبھال لے اور کئی فوجیوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کوئی بات چیت کی ہو لیکن جو لوگ ہمارے ملک میں کچھ احتجاج کرتے تھے ان کی کسی ایسی سازش کو اس مقدمہ میں نہ پیش کیا جا سکا کہ کوئی تنظیم بنائی ہو یا کسی فوجی یونٹ سے کوئی شب خون مارنے کا پروگرام بنایا گیا ہو۔ تمام تر مقدمہ ایسے احتجاجیوں کی 3 دسمبر 1949ء کی اٹک کے مقام پر ایک میٹنگ کی بات چیت پر بنایا گیا۔ اکبر خان طارق جو اس زمانے میں کوہاٹ بریگیڈ کے کمانڈر تھے۔ انہوں نے اس میٹنگ کا نجی طور پر بندوبست کیا۔ اس میں نویں ڈویژن کا کمانڈر میجر جنرل نذیر احمد' ان کا جی ون اور اکبر خان کا دوست کرنل (بعد میں بریگیڈئر) ایم اے لطیف راولپنڈی سے نویں ایف ایف کا کرنل صدیق راجہ (جو بعد میں سلطانی گواہ بنا) ساتویں ڈویژن کا جی ون کرنل (بعد میں بریگیڈئر) صدیق ستی شریک ہوئے۔ بریگیڈئر (بعد میں جنرل) حبیب اللہ صدیق ستی سے پہلے ساتویں ڈویژن کا جی ون تھا۔ اس نے بھی صدیق ستی کو پیغام بھیجا کہ وہ اس کانفرنس میں شریک ہوگا اور صدیق ستی ضرور اس کانفرنس یا میٹنگ میں شرکت کرے۔

راولپنڈی سے کرنل صدیق راجہ بڑی کوششوں سے کرنل صدیق ستی کو اٹک لے گیا لیکن بریگیڈیئر حبیب اللہ اس میٹنگ میں شریک نہ ہوئے۔ اس سلسلہ میں کئی مفروضے پیش کئے جاتے ہیں۔ کہ حبیب اللہ کو اکبر خان کے خیالات سے آگاہی تھی اور اس کو کام پڑ گیا اور بعد میں اس کو بتایا گیا کہ میٹنگ میں کیا باتیں ہوئیں۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ جان بوجھ کر حبیب اللہ بہانہ بنا گیا کہ وہ اکیلے تو انگریز جنرلوں کے رویہ سے نالاں ہونے کی بات کر لیتا تھا۔ لیکن اتنے اکٹھ میں وہ شامل نہ ہونا چاہتا تھا پھر انگریز جنرلوں کے ساتھ اس کے تعلقات اتنے خراب بھی نہ تھے بلکہ وہ اپنے پرانے ڈویژن کمانڈر جنرل ٹامپھم کا مداح تھا۔ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ حبیب اللہ نے محتاط رویہ اپنایا ہوا تھا اور وہ اس حد تک جانے کو تیار نہ تھا جو باتیں اکبر خان طارق کے ذہن میں تھیں۔

اس میٹنگ میں زیادہ بات چیت اکبر خان طارق ہی نے کی اور کہنے لگا کہ کشمیر کی جنگ میں جنرل گریسی اور انگریز افسروں نے ہر عمل کے سلسلہ میں تخریب کاری کی اور ہمارے ساتھ دھوکے کیے۔ کشمیر کے بغیر پاکستان نامکمل ہے اور پاکستان زیادہ دیر قائم نہ رہ سکے گا۔ خواہ مخواہ قوم کی دولت اور بے حساب نفری یا انسانی قوت اس جھگڑے میں اس طرح مفت میں ضائع ہو رہی ہے۔ کہ چند سال میں کنگال ہو جائیں گے اور مشرقی پاکستان بھی ہم سے الگ ہو جائے گا ہمارے لئے گندم اور ٹوٹا پھوٹا فوجی سامان انگریزوں سے بہت زیادہ قیمت پر خریدا جا رہا ہے۔ اس تجزیہ کے ساتھ سب میٹنگ میں شامل ہونے والوں نے اتفاق کیا۔ تو اکبر خان نے کافی وضاحت کے ساتھ ایک تجویز پیش کی کہ ہم فائر بندی لائن توڑ دیں اور کشمیر میں داخل ہو جائیں اور حکومت کو مجبور کریں کہ پارلیمنٹ سے ہماری اس کارروائی کو منظور کرائیں اگر منظوری نہ بھی ملی یا حکومت ہماری مخالفت کرے تو لوگ ہمارے ساتھ ہو جائیں گے اور ہم بھارت کے ساتھ جنگ لڑ کر بہت کچھ حاصل کر لیں گے۔

اس تجویز پر بہت بحث ہوئی۔ صدیق ستی نے شروع ہی سے اس تجویز کی مخالفت کی کہ ایک ہی وقت میں ہم پانچ آدمی ایک طرف بھارت کے ساتھ جنگ میں الجھے ہوئے ہوں گے اور اگر ہماری حکومت یا پارلیمنٹ ہماری اس کارروائی کو غلط قرار دیتی ہے تو پھر ہمیں حکومت پر قبضہ کرنا ہو گا تو یہ ایک فوجی حکومت ہو گی۔ بین الاقوامی طور پر غیر منظور شدہ حکومت ہو گی اور مشرقی پاکستان کا دفاع کون کرے گا؟ اکبر خان نے کہا کہ جنگ تمام معاملات کا حل ہوتا ہے اور اگر ہم بھرپور طرح سے بھارتیوں سے کچھ علاقے آزاد کرا لیں گے اور قوم کو لڑنے مرنے کی دعوت دیں گے تو کھرا کھوٹا بھی سامنے آ جائے گا اور حکومت ہماری مرضی کی ہو گی۔ بہت بحث ہوئی اپنی طرف سے کسی نے کوئی تجویز نہ دی۔ بحث اکبر خان کی تجویز پر ہوتی رہی اور اس کے اثرات پر سب سے زیادہ مرنے مارنے کی باتیں صدیق راجہ نے کیں جو بعد میں سلطانی گواہ تھا اور کہتا تھا کہ اگر مر جائیں گے تو بھی شہید ہوں گے کہ سب کچھ نیک نیتی سے کر رہے ہیں۔ جنرل نذیر احمد خاموشی سے سنتے رہے لیکن انہوں نے اپنی کوئی رائے نہ دی ان کو کہا بھی گیا کہ وہ بھی کچھ رائے تو دیں۔ تو اس نے کہا کہ وہ سب کچھ سننے کو بہت پسند کر رہے ہیں کہ ہم کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں لیکن میٹنگ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی اور مزید سوچنے اور پھر کبھی ملنے کے وعدے کے بعد میٹنگ ختم ہو گئی۔ کرنل حسن مرزا اپنی کتاب میں کہتے ہیں کہ جیل کے دوران جنرل نذیر نے ان کو بتایا تھا اور مقدمہ میں بھی یہ تاثر دیا کہ جنرل نذیر نے اس میٹنگ کے بعد لیاقت علی خان کے ساتھ ملاقات کی تھی اور اس کو

بتایا تھا کہ کافی افسر ہمارے انگریز افسروں کے رویوں اور کشمیر کی پالیسی سے نالاں ہیں اور شاید اٹک کی میٹنگ کی بات نہ کی ویسے اپنے تاثرات بتائے۔ یہ کچھ کہیں سے معلوم نہ ہو سکا کہ لیاقت علی کا ردعمل کیا تھا۔ لیکن راقم کو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ کئی لوگ لیاقت علی کے سامنے انگریز افسروں کی ایسی شکایات کرتے تھے تو لیاقت علی بات سن لیتا تھا شکایت کرنے والا چلا جاتا تھا تو لیاقت اپنے سٹاف کو کہہ دیتا تھا کہ پاکستانی فوج کا ہر افسر انگریزوں کو جلد نکلوا کر فوج کا کمانڈر انچیف بننا چاہتا ہے اور بات ختم ہو جاتی تھی۔ جنرل نذیر احمد متعصب ہرگز نہ تھا اور مشہور ادیب میجر ضمیر جعفری نے اپنے ایک مضمون میں ایک دفعہ لکھا کہ اس نے ایک دن کشمیر کی جنگ کے زمانے میں جنرل نذیر کو بڑا مغموم اور پریشان دیکھا تو اس کی پرسش پر کہنے لگا' ہمارے یہ انگریز ہمیں انگریزی طرح کی لڑائی لڑانا چاہتے ہیں' ہم اسلامی اور دیسی لڑائی لڑنا چاہیں گے' یعنی جنگ کے دوران بھی وہ انگریزوں کے طریقوں سے نالاں تھا اور اکثر لوگ بھانپ گئے تھے کہ انگریز مخلص نہیں۔

حسن ظہیر بھی اپنی کتاب میں ذکر کرتا ہے کہ 1949ء کے شروع میں کرنل ایم اے لطیف ملٹری اکیڈمی کاکول میں تھے تو ان کے گھر میں ایک پارٹی ہوئی جس میں ملٹری اکیڈمی کا کمانڈنٹ بریگیڈیئر اِنگل بھی شریک ہوا۔ اس پارٹی میں کرنل لطیف کے دوسرے مہمانوں نے بریگیڈیئر انگل کو انگریزوں کے پاکستان سے مخلص نہ ہونے کے سلسلہ میں ایسی کھری باتیں سنائیں کہ بریگیڈیئر انگل پارٹی کو چھوڑ کر چلا گیا اور کرنل لطیف کو بڑی معذرتیں کرنا پڑیں اور ساتھ ہی اس نے بریگیڈیئر انگل کو گزارش کی کہ اس کو اکیڈمی سے تبدیل کر دیا جائے کہ بریگیڈیئر انگل کو غلط فہمی نہ ہو جائے کہ یہ پارٹی کرنل لطیف نے انگریزوں کو کھری کھری سنانے کیلئے کرائی تھی۔ کرنل بعد میں بریگیڈیئر لطیف کا تعلق اسلامی گھرانے سے تھا اور وہ سچا آدمی تھا۔

لطیف کو افسوس ہوا کہ ہم لوگ اسلام سے اتنے دور ہیں۔ قید سے رہائی کے بعد لطیف نے بالکل گوشہ نشینی اختیار کر لی اور زیادہ وقت عبادت میں گزارا کرتا تھا اور روحانی طور پر کچھ حاصل بھی کر لیا لیکن اپنی ''ولایت'' پر پردہ رکھا ہوا تھا۔ ساتھیوں میں سے صرف صدیق سنی بھی آخری عمر اسلام کی طرف مائل ہو گیا تھا اور راقم کے ساتھ گہرے تعلقات اسی اسلام اور حب اللہ اور بغض اللہ کے اصول کی وجہ سے بنے۔

انگریز جنرلوں کے پاس ہر کارروائی کی پوری خبریں پہنچ جاتی تھیں اور وہ نہ چاہتے تھے کہ گریسی کی سربراہی کے زمانے میں فوج میں کسی ''بغاوت'' کے آثار ظاہر ہوں۔ وہ چاہتے تھے کہ دھواں دھکتا رہے لیکن آگ نہ بھڑکے۔ انہوں نے پوری صورت حال کو بھانپ لیا تھا۔ اکبر خان کو انہوں نے ولایت چار ماہ کے کورس پر بھیج دیا۔ وہ واپس آیا تو اس کو سیالکوٹ میں چودھویں پیرا بریگیڈ کی کمانڈ دی۔ جہاں دو پلٹنوں کے رجمنٹل سنٹر اور انجینئر سنٹر بھی تھے جن تینوں کے کرنل انگریز تھے اور انہوں نے اکبر خان پر نظر رکھنا تھی۔ جنرل گریسی نے جان بوجھ کر پشاور کے ایک دورہ کے دوران کرنل لطیف سے پوچھا ''آپ لوگوں کی سازش کیسے چل رہی ہے'' لطیف نے کہا ''سازش نہیں احتجاج ہے'' گریسی کے سامنے یہ مقصد بھی تھا کہ اس کی سربراہی میں کوئی عملی کارروائی نہ ہو کہ لوگ ڈرتے رہیں کہ انگریز باخبر نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایجنٹ پرووپیکٹر کرنل صدیق راجہ نے سب باتوں سے اپنے ڈویژن کمانڈر جنرل ٹاٹھم کو آگاہ کر دیا ہوگا جس نے 1950ء کے شروع میں ریٹائرڈ ہونا تھا۔ اس ڈویژن کا ہیڈ کوارٹر

راولپنڈی تھا اور یہاں کے لئے جنرل گریسی نے فیصلہ کیا ہوا تھا کہ انگریزوں کے وفادار بریگیڈئر حیاء الدین کو ترقی دے کر ڈویژن کمانڈر بنائیں گے کہ جنرل گریسی نے بھی 1951ء کے شروع میں ریٹائر ہو جانا تھا اور یہ عاجز بیان کر چکا ہے کہ اس سلسلہ میں جنرل ایوب خان کو فوج کی سربراہی کیلئے انگریز ''گروم'' کر رہے تھے اور 1950ء کی آخری سہ ماہی سے بھی تھوڑا پہلے ایوب خان کے بارے میں اعلان ہو گیا کہ وہ بری فوج کا سربراہ بنے گا۔

کرنل لطیف کے بریگیڈئر بننے کا نمبر آ گیا تھا۔ گریسی نے اس کی ترقی تو نہ روکی لیکن راولپنڈی یا کراچی یا پشاور کے نزدیک اس کو ترقی دے کر کسی بریگیڈ کی کمانڈ نہ دی بلکہ کوئٹہ بریگیڈ کی کمانڈ دی۔ صدیق ستی کا بھی بریگیڈئر بننے کا نمبر آ گیا تھا۔ اس کو بھی بریگیڈئر بنا کر دور دراز بنوں بھیج دیا گیا۔ اکبر خان کا بھی میجر جنرل بننے کا نمبر آ گیا تھا لیکن گریسی نے اس کو کسی ڈویژن کی کمانڈ دینے کی بجائے اس کو چیف آف دی جنرل سٹاف بنا دیا۔ یہ پوسٹ اہم ہوتی ہے اور عام طور پر سب سے سینئر ڈویژن کمانڈر کو ملنا چاہیئے تھی اور اکبر خان تو بہت جونیئر تھا لیکن اکبر خان کو جوانوں کی کمانڈ نہ دینا تھی کہ ایک ڈویژن کا کمانڈر کسی جگہ پر آسانی سے قبضہ کر سکتا ہے لیکن اکبر پر نظر رکھنے کیلئے حیاء الدین کو بٹھا دیا اور ایوب خان اور حیاء الدین کے درمیان پکا رابطہ بندھوا دیا اور اس کے بعد جنرل گریسی نے لیاقت علی، سکندر مرزا اور ایوب خان کو دسمبر 1949ء میں اٹک کی میٹنگ کی پوری کہانی سنائی کہ اس کو یہ کچھ معلوم ہے۔ بات اور گہری بھی ہو سکتی ہے تم لوگ اکبر خان سے کیسے ''چھٹکارا'' حاصل کر سکتے ہو یا حالت کو کیسے کنٹرول کرو گے وغیرہ

ایوب خان یہ سب کچھ سن کر سکندر مرزا کو لے کر پشاور پہنچا اور بنوں سے بریگیڈئر صدیق ستی کو بلا کر اس کو ''ٹٹولا'' کہ صدیق ستی موجودہ پانچویں پنجاب میں ایوب خان کے ساتھ نوکری کر چکا تھا۔ صدیق ستی کو زیادہ بھروسہ میں لینے کے لئے اور سکندر مرزا پر کچھ رعب بٹھانے کے لئے ایوب خان نے سکندر مرزا کے ساتھ اس کا ''تعارف'' اس طرح کرایا کہ صدیق ستی میرا اتنا وفادار دوست ہے کہ میں اس کو یہ کہوں کہ وہ تمہارا گلا ابھی کاٹ دے تو وہ مجھ سے کچھ بھی نہ پوچھے گا، صدیق ستی کو یہ بات پسند نہ آئی لیکن مصلحت میں وہ چپ کر گیا اور ایوب خان نے اٹک کی میٹنگ کی بات چھیڑ دی۔ ایوب خان، صدیق ستی کو اکبر خان کے خلاف گواہ بنانا چاہتا تھا یا اس کو اکبر خان پر نگاہ رکھنے کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا کہ صدیق ستی کو ایوب خان نے پہلے وعدہ دلایا کہ جو باتیں ان کے درمیان ہوں گی ان کو بعد میں کسی گواہی وغیرہ کے لئے نہ استعمال کیا جائے گا وغیرہ۔ صدیق ستی نے ایوب خان کو صاف صاف کہہ دیا کہ اٹک میں جو باتیں ہو گئی ہیں، وہ انگریزوں سے نالاں افسروں کے دل کی بھڑاس تھی اور ایوب خان خود ان کے ساتھ کئی دفعہ ایسی باتیں کر چکا ہے۔ وہاں کشمیر کو حاصل کرنے کے لئے کچھ تجاویز پر بات ہوئی لیکن بحث میں کسی نے کیا کچھ کہا نہ میں اس کی تفصیل میں جاؤں گا۔ نہ کسی طرح بعد میں کسی کے خلاف کوئی گواہی دوں گا کہ بھروسے والی ایسی میٹنگ میں کئی دفعہ انسان جوش میں آ کر غیر ذمہ دارانہ باتیں کر جاتا ہے۔ صدیق ستی نے کہا کہ اس کے بعد میری کسی سے ملاقات نہیں ہوئی سوائے کرنل نیاز ارباب کے جو اس میٹنگ میں تو نہ تھا لیکن اس نے مجھے اکبر خان کی طرف سے دعا سلام دیا، ایوب خان اور سکندر مرزا بڑے مایوس ہوئے۔

اکبر خان ہر قسم کے لوگوں سے مل کر کچھ باتیں کرتا رہتا تھا لیکن اس کے لئے ہر طرف سے ''مایوسی''

تھی۔ سیالکوٹ میں اس نے سب یونٹوں کے صوبیدار میجروں کو بلا بھیجا اور ان کے ساتھ لمبی چوڑی باتیں کیں کہ نچلے والے لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ وہاں اس کو بہت مایوسی ہوئی کہ ان لوگوں کا جواب ہر حکم کا ''بسرو چشم'' تھا۔ اکبر خان نے کئی دوسرے لوگوں کی مدد سے فوج کے مذہبی افسروں بریگیڈیئر گلزار احمد' کرنل شیر محمد اور کرنل سلطان علی شاہ وغیرہ کے ساتھ رابطہ باندھا تو انہوں نے شراب کی بندش' درس قرآن کو جاری کرنے اور نماز کو پریڈ کے طور پر ادا کرنے کی سفارشات کیں یعنی فوج والے پہلے مومن بنیں اور حکومت کو بھی سفارش کریں کہ وہ پوری قوم کو مومن بنائے اس کے بعد ہم پوری قوم جہاد میں حصہ لیں۔ یہ باتیں اکبر خان کو پسند نہ تھیں کہ وہ ''لبرل'' اور ''ماڈرن'' زندگی اپنا چکا تھا۔ جب اکبر خان چیف آف دی جنرل سٹاف بن گیا اور ایوب خان بھی آ کر کمانڈر انچیف کی کرسی پر بیٹھ گیا تو اکبر خان نے ایوب کو ٹٹولا کہ شاید وہ احتجاجیوں یا باغیوں کی سربراہی قبول کر لے لیکن ایوب خان کو معلوم تھا کہ اکبر خان کے ساتھ کچھ لوگ ہیں اور اس نے اپنا ایک گروپ تیار کر لیا ہے۔ ان کی سربراہی میں وہ ان کے ہاتھوں میں ''کٹھ پتلی'' ہوگا' پھر اس کو نئی نئی پکی نوکری ملی تھی۔ اس نے غلام اسحاق کی طرح سے پہلے پکی نوکری کے ساتھ وابستہ رہنے کو ترجیح دی اور ملک کی سربراہی اس وقت سنبھالی جب اس کو یقین ہو گیا کہ اس کے ایسا کرنے سے پتا بھی نہ ہلے گا۔ اکبر خان کو صدیق ستی یا دوسرے ہم خیال لوگوں سے یہ چیزیں ضرور مل گئیں کہ ایوب خان یا حکومت والے اس کے خلاف گواہ تلاش کر رہے ہیں۔ مقدمہ میں ملوث ہر صاحب نے اپنے دفاع میں یہ کہا کہ اس کو اکبر خان کے خلاف مبالغہ آمیز یا جھوٹی گواہی دینے کے لئے مجبور کیا گیا۔ اس نے انکار کیا تو اس وجہ سے اس کو دھر لیا گیا ہے۔

بہر حال اکبر خان نے بھی 23 فروری کو اپنا آخری کارڈ کھیل دیا۔ جن لوگوں کو وہ ملتا رہتا تھا۔ ان کی اس نے 23 فروری 1951ء کو ایک میٹنگ بلائی جس میں وہ تمام فوجی افسر جو بعد میں مقدمہ میں ملوث کئے گئے۔ وہ آئے جنرل نذیر ملک سے باہر تھا اور بلائے گئے لوگوں میں سے صدیق ستی اور میجر اسحاق نہ آئے۔ اکبر خان نے فیض احمد فیض پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر کو بھی بلا لیا اور اس کے ساتھ سجاد ظہیر کمیونسٹ بھی آیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو دعوت دی' کچھ کہتے ہیں کہ فیض احمد فیض اس کو اپنے ساتھ لے آیا۔ بہر حال مہمانوں کی دیکھ بھال یا میزبانی کرنل صدیق راجہ اور میجر یوسف سیٹھی نے کی جو بعد میں سلطانی گواہ بن گئے۔ اکبر خان نے اس میٹنگ میں اعلان کر دیا کشمیر ہمارا حق ہے۔ بھارت سے بزور شمشیر لینا کوئی مشکل نہیں اور پوری جنگ میں بھارت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اکبر خان نے پچھلے دو سال کئی طرح سے کوشش کی کہ کشمیر میں جنگ شروع ہو جائے۔ اس کے لئے اس نے خفیہ طور پر کئی لوگوں سے رابطے بھی باندھے اور خفیہ میٹنگز بھی کیں کہ ہمارے سربراہ انگریز تھے۔ میں نے جو کچھ آج تک اس سلسلہ میں کہا وہ سب کچھ ماننے کو تیار ہوں اور اس سلسلہ میں اگر میرا کورٹ مارشل ہوتا ہے تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ میری نیت پاکستان کے استحکام اور تکمیل کی ہے کہ کشمیر کے بغیر پاکستان نامکمل ہے۔ دسمبر 1949ء میں اٹک کے مقام پر اکبر خان نے جو باتیں کیں ان کو دہرا دیا اور مزید کہا کہ اب فوج کی سربراہی ایک پاکستانی کے پاس چلی گئی ہے۔ آج سے تمام خفیہ میٹنگز اور کارروائیاں بند ہیں۔ میں ایوب خان کو کشمیر کی پاکستان کیلئے اہمیت واضح کر چکا ہوں اور جب جہاں موقع ملے گا' اس ضرورت کو دہراتا رہوں گا۔ آپ

میں سے جو لوگ میرے ساتھ اس سلسلہ میں اتفاق کرتے ہیں اور ان میں ہمت ہے تو آپ بھی اوپر والوں سے سیدھی بات کریں۔ میں نے اس لئے پاکستان کے ایک اہم اخبار کے ایڈیٹر اور ملک کے دانشور کو بھی مدعو کیا ہوا ہے یعنی فیض احمد فیض آپ کے بیچ موجود ہے۔ وہ ملک کے دانشوروں کو ان حقائق سے آگاہ کریں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں ایوب خان یا حکومت کے پاس اسی دن پہنچ گئی ہوں گی۔ ایوب خان خود کشمیر کے لئے ایسی باتیں کرتا رہتا تھا کہ ایوب خان کی پلٹن والے اس زمانے کا کرنل سرفراز بعد میں جنرل اور کرنل محمد زمان بعد میں بریگیڈئر ہمیں کہتے رہتے تھے کہ جس دن ایوب خان نے کمانڈ سنبھالی اس دن پہلا کام وہ یہ کرے گا کہ کشمیر حاصل کرنے کی تجویز بنا کر اس پر جلد عمل کرے گا اور ایوب کے سربراہ بننے کے بعد اس عاجز نے تو کرنل محمد زمان کے ساتھ دوستی کی وجہ سے ان سے پوچھ لیا تھا کہ کیا ایوب خان وعدہ پورا کرے گا تو کرنل محمد زمان نے مجھے کہا کہ کمانڈر انچیف کی کرسی کیلئے ایوب خان کا اعلان ہونے کے بعد اس میں بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ کہ وہ 'محتاط' باتیں کرتا ہے اور یہ اوپر والی کرسیاں ایسی ہیں کہ وہاں جا کر انسان کو حالات بالکل مختلف طور پر نظر آتے ہیں؛ جیسے مثال ہے کہ کھجور پر چڑھنے سے ایک کی بجائے دو نظر آتے ہیں۔ قارئین! اس نکتہ پر دھیان دیں کہ سیاسی رہنما کیا کیا وعدے کرتے ہیں لیکن جب ان کو کرسی ملتی ہے تو ان کو سب کچھ بھول جاتا ہے تو یہی کچھ ایوب خان پر لاگو تھا اور ہے۔ بلکہ 1954ء میں کرنل شیر محمد راولاکوٹ سیکٹر کے کمانڈر تھے۔ ایوب خان آزاد کشمیر گیا تو کرنل شیر محمد نے گزارش کی کہ کشمیر کے مسئلہ کو کم از کم کسی گوریلا کارروائی سے زندہ تو رکھا جائے تو ایوب خان نے کہا کہ ہم بھارت کی ناراضگی مول نہیں لے سکتے۔ یہی ایوب خان 1965ء میں شیر محمد سے جونیئر اختر ملک جو اس زمانے میں جنرل بنا ہوا تھا اس کی کشمیر میں گوریلا بھیجنے کی تجویز کیوں مان گئے؟ قارئین اس عاجز کے ستمبر 65ء کی جنگ کے مضامین دوبارہ پڑھیں کہ یہ سب کچھ ایک سازش کی بنیاد بندھ رہی تھی کہ ایوب خان نے ایک طرف ہمارا لاہور محاذ خالی رکھا کہ شاستری کو دوسری طرف جنگ میں دھکیلا جا رہا تھا اور جن لوگوں نے یہ دھکا دیا یعنی اینگلو امریکن بلاک وہ ایوب خان کی پہلے ''برین واشنگ'' کر گئے ہوں گے کہ پاکستان نے کشمیر میں کوئی گوریلا کارروائی کی تو بھارت کسی ردعمل کے قابل نہیں اور تب ہی ایوب خان نے بغیر پوری تیاری کے قوم کو جنگ سے دو چار کر دیا ہمارے اوپر والے وہ کچھ کرتے ہیں جو اہل مغرب چاہتے ہیں۔

لیکن یہاں جو کچھ اکبر خان نے 23 فروری 1951ء کو اعلان کیا اس سے حکومت میں ''بھونچال'' آ گیا ہو گا کہ اس تلخ حقیقت کا لیاقت علی اور ایوب خان کے پاس کوئی دفاع نہ تھا لیکن انگریزوں نے ان کے پاس ''مشیر'' کے طور پر لیفٹیننٹ جنرل میک کے کو چھوڑا ہوا تھا جس کے پاس تجویز موجود تھی اور راولپنڈی کے سازش کے مقدمہ کا ڈرامہ کئی مرحلوں اور کئی طرز بیانات سے خوب رچایا گیا۔ 8، 9 مارچ کو یہ عاجز کوہاٹ سے جہلم جا رہا تھا اور وہ رات پنڈی ٹھہر گیا جس رات میجر جنرل حیاء الدین کی سربراہی میں اکبر خان اور اس کی بیگم نسیم کو فوج اور پولیس کے دستوں نے گرفتار کیا اور راولپنڈی کے سب افسروں کو اکٹھا کر کے بریف کیا گیا کہ آج رات راولپنڈی میں یہ کچھ ہوا اور اکبر خان کے دست راست بریگیڈئر ایم اے لطیف کو کوئٹہ میں گرفتار کر لیا گیا ہے اور فیض احمد کو لاہور سے۔ یہ گرفتار ہونے والوں کی پہلی ''کھیپ'' تھی۔ اکبر خان کو اقتدار کا بھوکا' شر پسند اور ملک کی جڑیں کھوکھلی

کرنے والے ایک باغی کے طور پر پیش کیا گیا۔ بیگم نسیم اکبر کو شیکسپیئر کے ڈراموں کی لیڈی میک بیتھ کے ساتھ تشبیہہ دی گئی۔ فیض کے واسطہ سے اکبر خان اور بین الاقوامی کمیونسٹ کے رابطہ کی سازش کو خوب اچھالا گیا۔ کمیونسٹ سجاد ظہیر کی گرفتاری کیلئے چھاپوں کی خبریں گھڑی گئیں۔ ایک اور کمیونسٹ محمد حسین عطا کو خود زیر زمین رکھا اور اس کی گرفتاری کی خبر ایک ماہ بعد میں دی۔ بریگیڈئر صدیق ستی اور میجر اسحاق کو دیر کے بعد گرفتار کیا اور پھر کرنل نیاز ارباب کو یعنی جو کوئی بھی اکبر خان کو ملا ان سب کے لئے ایک ایسی ڈرانے والی صورت حال پیدا کی جا رہی تھی کہ لوگ ڈر گئے اور ہر اس آدمی کو گرفتار کر لیا جو اکبر خان کے نزدیک رہا اور استغاثہ کی ضرورت کے مطابق اکبر خان کے خلاف جھوٹی گواہی دینے کو تیار نہ تھا۔ کرنل حسن مرزا اور کرنل ضیاء الدین نے جا کر کرنل صدیق راجہ سے ملاقات کی کہ ہم مل کر اوپر والوں کو اکبر خان کے 23 فروری 1951ء کے اعلان کے مطابق اس کے کورٹ مارشل کے لئے کہیں۔ یہ اتنے بڑے آدمی کو سول جیل میں رکھنا ٹھیک نہیں تو ان دونوں کو نہ صرف گرفتار کر لیا گیا بلکہ ان پر اضافی چارج لگایا گیا کہ آزاد کشمیر کی ایک پلٹن سے وہ لوگ راولپنڈی جیل میں حملہ کر کے اکبر خان کو رہا کرانا چاہتے تھے۔

یہ کچھ اس عاجز کی تحقیق اور مشاہدات کا اختصار ہے۔ حسن ظہیر کی لمبی چوڑی کتاب میں البتہ یہ تاثر ہے کہ اکبر خان کا اصل مقصد اقتدار تھا اور کشمیر کا نام لے کر وہ کچھ جذباتی لوگوں کو اپنے ساتھ ملاتا رہا ورنہ اکبر خان نے غفار خان کے ساتھ بھی رابطہ رکھا ہوا تھا اور برسر اقتدار آتے ہی وہ غفار خان کے ذریعے سے بھارت کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھا دیتا۔ کہ روس کے ساتھ کمیونسٹوں کے ذریعہ رابطہ تھا لیکن حسن ظہیر اس سلسلہ میں کوئی گواہی نہیں پیش کرتا اور اس تحقیق پر شک یہ ہے کہ اکبر خان نے جتنی تجاویز بنائیں ان میں پہلی کارروائی فائر بندی لائن توڑنے کی ہونا تھی یا بھارت کو چیلنج دینا تھا کہ کشمیر پر وہ غاصبانہ طور پر قابض ہے۔ تو پھر غفار خان سے بھارت کے ساتھ کیا بات کراتا۔ البتہ اس عاجز نے اپنی پہلی تحقیق میں یہ نتیجہ نکالا تھا کہ فیض احمد فیض کو شاید اکبر خان کسی غلطی کی وجہ سے بلا بیٹھا۔ اس کے کمیونسٹ بلاک کے ساتھ رابطے نہ تھے اور یہ کچھ ہماری حکومت اور استغاثہ والوں نے اچھالا لیکن اب مجھے ایک پرانا راجہ غضنفر علی کا تجزیہ یاد آ رہا ہے تو یقین آ جاتا ہے کہ ایسا رابطہ تھا۔ ہمارے ملک میں اب بھی اور اکثر یہ بحث چلتی رہتی ہے کہ 50-1949ء میں لیاقت علی کو روس جانے کی دعوت ملی تھی۔ ہماری حکومت نے اس کا فائدہ نہ اٹھایا اور ہمیں امریکہ کی جھولی میں ڈال دیا اور اب بھی اس سلسلہ میں اخباروں میں بحث ہوتی رہتی ہے کہ اس میں قصور کس کا ہے؟ اور ہم نے اس سلسلہ میں کیا کھویا کیا پایا؟

1961ء میں اس عاجز کی اپنے پرانے کرم فرما راجہ غضنفر علی سے ملاقات ہوئی تو میں نے یہ مسئلہ ان کے ساتھ چھیڑا کہ دعوت دلانے والے وہی راجہ صاحب ہی تھے۔ جب وہ ایران میں ہمارے سفیر تھے۔ کہنے لگے کہ انہوں نے روس کے ایران میں سفیر کو یہ باور کرا لیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی ملک کے طور پر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ تم روس والے صرف ان ملکوں کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہو جو سوشلسٹ یا کمیونسٹ ہوں تم ساری دنیا کو کمیونسٹ نہ بنا سکو گے۔ اہل مغرب، غیر جانبدار ممالک پر ڈورے ڈالتے رہتے ہیں اور ہم مسلمانوں کو بھی اپنے کیمپ میں لے جا رہے ہیں۔ آپ روس والے حقیقت پسند بنیں اور ہمیں ہمارے اسلامی تشخص پر قائم رہنے دیں

اور ہمارے وزیراعظم کو اپنے ملک میں بلائیں اور عزت دیں کہ دوستی کی کچھ بنیادیں بندھیں!! راجہ صاحب نے مزید کہا کہ روس کے سفیر نے جو لیاقت علی کو روس کے دورہ کی دعوت دی اس میں کوئی پرخلوص جذبہ تو نظر نہ آتا تھا کہ دعوت کی تاریخ 14 اگست مقرر کی کہ لیاقت علی نے اس دن اپنے ملک میں جن تقریبات میں شامل ہونا تھا ان سب اور ان کے نزدیک دنوں والی تقریبات ختم کرنا پڑتیں۔ اس لئے روس کو تاریخ تبدیل کرنے کی گزارش کی لیکن روس والوں کے رویوں میں لچک کا نام ونشان نہ ہوتا تھا ان کی حکومت دراصل دوسروں کو "طفیلی" ملک سمجھتی تھی کہ وہاں ان کے کارکن کھلے طور پر دندناتے پھریں۔ راجہ صاحب کا خیال تھا کہ اکبر خان طارق کے ان زمانوں میں فیض احمد فیض اور کمیونسٹ سجاد ظہیر وغیرہ ہم سفر لوگوں کے ساتھ رابطے روس کے لئے بڑے حوصلہ افزا تھے کہ جلد وہ لوگ پاکستان کو اپنا کٹھ پتلی ملک بنائیں گے۔ راجہ صاحب کا یہ تجزیہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ افغان حکمرانوں کی پاک دشمنی کی وجہ سے وہاں روسی ایجنٹ نور محمد ترکئی وغیرہ یا ببرک کارمل وغیرہ روس کے لئے کام کر رہے تھے اور ظاہر شاہ یا داؤد وغیرہ کے زمانوں میں ایسے غلط بیج بوئے گئے کہ افغانستان اب اس طرح تباہ ہو چکا کہ اس کی بحالی مشکل ہے۔ یہی چیز عراق اور عرب دنیا کو لاگو ہے۔ عرب ازم' یا بعث پارٹی نے عربوں کو اسلام سے دور کر دیا ہے۔ بنو امیہ کے زمانے میں عرب ازم نے "جنم" لیا تھا لیکن بنو عباس چونکہ عجمیوں کی مدد سے برسراقتدار آئے تھے تو وہ لوگ اول بھی مسلمان بن گئے اور آخر بھی مسلمان تو کئی صدیوں تک اسلام کا بول بالا ہوتا رہا اور 1258ء کے سقوط بغداد کی اور وجوہات تھیں۔ بیسویں صدی میں کمال ترکی نے ترک ازم کو اسلام پر ترجیح دے کر مسلمانوں میں ایک بہت بڑے تفرقہ کی بنیاد باندھ دی ہے۔ جمال عبدالناصر' یاسر عرفات' یا عراق وشام کی بعث پارٹیاں عرب ازم کی پیداوار ہیں۔ کاش! ہم سب مسلمان "رہبر و رہنما برحق مصطفیٰ ﷺ" کا نعرہ لگا کر اول اور آخر مسلمان رہیں۔

روس کے اس غیر حقیقت پسندانہ رویہ نے ایک بہت بڑی طاقت کو آج روسی خطہ تک محدود کر دیا ہے۔

1949ء میں اس عاجز کی خواب میں اس وقت کے روس کے سربراہ جوزف سٹالن سے ملاقات ہوئی اور میں نے اس سے گذارش کی تھی کہ وہ لوگ حقیقت پسند بنیں اور کون ہماری حکومت پر براجمان ہے اس پر زیادہ دھیان نہ دیں بلکہ ہمارے اسلامی تشخص کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ ہم مسلمان وعدہ کے پابند ہوتے ہیں اور اگر وہ ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں تو وہ ہمیں وفادار پائیں گے وغیرہ۔ اس عاجز نے 1952ء سے محسوس کر لیا تھا کہ چین والوں کو رب کی ذات پاک یہ شرف عطا فرما رہی ہے کہ وہ ہماری اہمیت کو ہمارے اسلامی تشخص کی وجہ سے سمجھ چکے ہیں۔ 64-1963ء میں ایوانِ صدر میں تعین ہونے کی وجہ سے چینی رہنما مسٹر چواین لائی کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بڑی فراست کا حامل اور حقیقت پسند تھا۔ ہماری 59 سالوں کی تاریخ میں اسلامی دنیا میں شاہ فیصل مرحوم اور فلسطین کے مفتی امین الحسینی مرحوم ومغفور اور باقی دنیا میں چواین لائی سے بڑھ کر ہمارا ہمدرد مجھے اور کوئی نظر نہ آیا اور چین کے ساتھ جو ہمارے اچھے تعلقات ہیں یہ چین والوں کی وجہ سے ہیں نہ کہ ہمارے کسی رہنما کی کوشش ہے۔ 67-1966ء میں کچھ چینی آرٹسٹ ہمارے ساتھ کام کرتے رہے۔ ان کی وجہ سے میرا چینی سفارت خانہ سے بھی تعلق رہا اور بہت کچھ معلوم ہوا۔ چنانچہ جب میں فوج سے ریٹائر ہوا تو اپنے نام اور پاکستانی شہری کے طور پر میں نے روسی سفارت خانے کو کئی خطوط لکھے اور اس زمانے کے حالات کے تناظر میں ان کو لکھتا تھا

کہ وہ لوگ بھی چین کی طرح حقیقت پسند بنیں۔

یہ عاجز ان خطوط کی کاپی وزارت خارجہ کو بھی بھیج دیتا تھا کہ یہ کچھ میں ایک فرد کے طور پر کر رہا ہوں اور اپنی ذمہ داری پر کچھ عرصہ بعد (ISI) والے میرے پاس آ دھمکے اور پوچھنے لگے کہ روسی سفارت خانہ کے ساتھ میرے کیا تعلقات ہیں؟ میں مسکرا دیا کہ شاید وہ میرے خطوط روسی سفارت والوں تک پہنچنے نہیں دے رہے یا ان کی کاپی بنا لیتے ہیں۔ ذرا سوچ لیتے کہ ان خطوط میں کیا کبھی کوئی ایسی بات لکھی ہوئی تھی جو پاکستان کے مفاد میں نہ ہو اور میں کون ہوں؟ کہ تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور ستمبر 65ء میں میرے شور کی وجہ سے فوج نے لاہور کو بچایا اور میرے ماتحتوں کو عظیم قربانی بھی دینا پڑی وغیرہ میری باقی سروس کو دھیان میں رکھتے ہوئے جا کر وزارت خارجہ میں ان خطوط کی کاپیاں دیکھ لو روس والوں کی طرف خط میں تو یہ عاجز یہ نہ لکھ سکتا تھا کہ خط کی کاپی وزارت خارجہ کو دے رہا ہوں جو ISI والے میرے پاس آئے وہ تو کچھ ''شرمندہ'' ہو گئے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ مجھ پر نظر رکھی جاتی ہے اور میرے دوست سائنسدان سلطان بشیر محمود کو جن دنوں حراست میں لیا گیا تو میرے بارے میں کئی شکوک کئے گئے اور چپ تب ہوئے جب معلوم ہوا کہ میں نے تو بشیر صاحب کو منع کیا تھا کہ افغانستان کے حالات غیر معمولی ہیں۔ وہ وہاں نہ جائیں۔

اگلے دن اس عاجز نے صدر جنرل مشرف اور قوم کو ایک کھلا خط لکھا تھا جو شائع نہ ہو سکا کہ مجھے نظر آتا ہے کہ موجودہ روسی سربراہ پیوٹن کچھ حقیقت پسند نظر آتا ہے اور پہلے جنرل محمود احمد کا روس کا دورہ اور اب مشرف کی اس کے ساتھ لمبی ملاقات۔ بات کو آگے بڑھایا جائے کہ روس نے غلطیاں کیں اور وہ حقیقت پسند بنے اور چین والی پالیسی اپنائے۔ وہی جو میں آج سے بیس سال پہلے ان کو لکھتا رہا لیکن روس کیلئے بڑا مسئلہ بھارت کی دوستی ہے وہ بھارت کو ناراض نہیں کر سکتا یا نہیں کرنا چاہتا۔ بھارت بھی جاہلوں کی دنیا میں آباد ہے اور اس کو حقیقت پسند بن کر ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہیئے کہ اس کے اندر چودہ کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ وہ بھلا پاکستان اور مسلمانوں کو کیسے ختم کر سکتا ہے۔ وہ ہمارے ذریعہ سے اسلامی دنیا کے ساتھ دوستی گانٹھے نہ کہ ہماری دشمنی مول لے کر یہ کچھ ہم بھارت کو تب سمجھا سکتے ہیں یا باور کرا سکتے ہیں کہ ہم خود اول و آخر مسلمان بنیں۔ ہم خود غیروں کے باطل فلسفوں کی پیروی کر کے ایک فضول انتشار کا شکار ہیں۔ کہ کبھی جغرافیائی طور پر قومیتوں میں بٹ جاتے ہیں اور کبھی مذہبی طور پر فرقوں میں اور یہ عملی مضامین لکھنے میں مقصد یہ ہے کہ ہم توبہ و ندامت کر کے حزب اللہ بن جائیں اور پوری امت محمدیہ ایک قوم بن جائے۔ مسلمان ملکوں کا اتحاد تب ہو سکتا ہے کہ سب اول مسلمان بنیں۔

تو راولپنڈی سازش کے مقدمہ کی کہانی کو اب اختتام تک پہنچاتے ہیں کہ قوم نے نہ اس کی تحقیق کی نہ کوئی سبق سیکھا۔ ملک کے مایہ ناز فرزند جو کشمیر میں بہادری سے لڑے ان میں سے کچھ جذبات میں آ کر یہ کچھ کر رہے تھے یا کچھ کے ''مقاصد'' تھے یہ معمولی باتیں ہیں۔ قوم کا اس مقدمے نے بڑا نقصان کیا اور قوم انتشار کا شکار ہوئی۔ استغاثہ آج تک صحیح کہانی سامنے نہیں لایا اور حسن ظہیر کی کتاب بھی اٹک کی میٹنگ کے بغیر کسی اور بڑی گواہی کا ذکر نہیں کرتی۔ کرنل حسن مرزا اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ اکثر جھوٹے گواہ پیش کئے۔ جن کے بیان سن کر کئی دفعہ جج بھی شرمندہ ہو جاتے تھے اور صفائی کے وکیلوں کی جرح ان جھوٹے گواہوں کی ایسی تیسی کر دیتی۔ اس

لئے سب صفائی کے وکیلوں نے ملزموں کو مشورہ دیا کہ وہ صرف یہ کہہ دیں کہ وہ ''قصور وار'' نہیں' کوئی بیان نہ دیں کہ ان کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوا۔ لیکن اکبر خان نے یہ مشورہ نہ مانا۔ اس نے جو کچھ کیا یعنی دسمبر 1949ء میں جو کچھ اٹک میں ہوا یا جو کچھ 23 فروری 1951ء میں راولپنڈی میں ہوا۔ ان سب باتوں کو تسلیم کیا کہ اس پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے یا اس کا کھلا کورٹ مارشل کیا جائے۔ عدالت نے اکبر خان کے بیان پر اس کو اور اس کے چند ساتھیوں کو قصور وار ٹھہرایا اور کچھ سزا تجویز کی۔ لیکن ایئر کموڈور محمد خان جنجوعہ۔ بریگیڈیئر صدیق ستی اور میجر اسحٰق کو بری کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن احکام تھے کہ عدالت فیصلہ نہیں سنا سکتی۔ حکومت سے مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ سنائے۔ تو حکومت نے کہا کہ صرف بیگم نسیم اکبر کو رہا کیا جا سکتا ہے اور جنرل نذیر کو ایک دن کی یا معمولی سزا دی جائے۔ باقی سب ملزمان کو ضرور کچھ سزا دی جائے کہ انہوں نے اکبر خان کے بارے حکومت کو آگاہ کیوں نہیں کیا۔ تو مقدمہ کو پھر شروع کر کے اس چارج کے تحت ایئر کموڈور محمد خان' بریگیڈیئر صدیق ستی اور میجر اسحٰق کو بھی کئی سال قید کی سزا دی۔ دو اڑھائی سال مقدمہ چلتا رہا اور سب نے تقریباً ایک سال جیل کاٹی کہ جسٹس منیر نے جب آئین ساز اسمبلی کے وجود میں آنے کو غلط قرار دے دیا۔ تو اس کے بنائے گئے سارے قانون ختم ہو گئے۔ تو سب ''ملزم'' رہا ہو گئے۔ دراصل قانونی طور پر تو پاکستان کا وجود میں آنا ختم ہو گیا۔ لیکن رومن قانون کو جیسے چاہو ''ڈھال'' دو۔ پاکستان قائم رہا کہ یہ ایک ''حقیقت'' بن چکا ہے اور رومن قانون ''حقائق'' کو تسلیم کرنے کی اجازت دیتا ہے اور اصلی بات یہ ہے کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا راز ہے تو قائم ہے۔ فطرت بھی کھیل تماشہ سے محظوظ ہو رہی ہے۔

روس نے ہمارے لئے بانہیں نہ پھیلائیں تو امریکہ ہمیں گود میں لینے کو تیار تھا۔ لیاقت علی 1950ء ہی میں امریکہ کا چکر لگا آیا تھا۔ اس کی وہاں خوب پذیرائی ہوئی۔ لیکن جواہر لعل نہرو اس سے پہلے امریکہ ہو آیا تھا اور ایک خفیہ معاہدہ بھی کر آیا تھا جس کے بارے میں ہمیں 1962ء میں ''خبر'' ہوئی۔ اسلامی دنیا میں بھی بھارت ہماری دال نہ گلنے دے رہا تھا۔ حسین احمد مدنی کی کوشش سے نہرو سعودی عرب کا چکر بھی لگا آیا تھا۔ جہاں اس کو مقامی دیوبندیوں نے ''امن کے ''پیامبر'' کے طور پر پیش کیا اور پاکستان کو کشمیر میں ''غاصب'' کے طور کہ پاکستان والے برصغیر ہندو پاکستان میں امن نہیں ہونے دے رہے اور سعودی حکمران ہمیں منہ لگانے کو بھی تیار نہ تھے۔ خدا بھلا کرے اسٹرو جرمن نو مسلم اسد کا کہ اس نے سعودی عرب کی حکومت کو پاکستان کی اہمیت اور خلوص سے کچھ آگاہ کیا۔ اینگلو امریکن بلاک کو زیادہ دلچسپی بغداد پیکٹ کے ساتھ تھی کہ ان کا خاص الخاص آدمی نوری' السعید' عراق میں ''بادشاہ گر'' کے طور پر موجود تھا۔ اس میں وہ لادین ترکی اور شہنشاہ رضا پہلوی کے ایران کو شامل کرانا چاہتے تھے اور 1950ء میں رضا شاہ سے پاکستان کا دورہ کرایا۔ شاہ ایران کو جو پذیرائی پاکستان میں ملی' اس نے جہاں دنیا کو حیران کر دیا اور رضا شاہ پر بھی بڑے اثرات ہوئے اور ایک دفعہ وہ پاکستان کا بڑا ہمدرد بن گیا۔ لیکن اس میں بعد میں تبدیلی لائی گئی یا آ گئی یا سکندر مرزا کے ساتھ مل کر ایران پاکستان کنفڈریشن کا جو سلسلہ چل نکلا۔ یہ کچے دھاگے کا ''اتحاد'' بھی اینگلو امریکن بلاک کو پسند نہ تھا۔ تو بغداد پیکٹ کے وجود میں آنے کو کافی دیر لگ گئی کہ معلوم ہوتا ہے کہ لیاقت علی سے جو کچھ اینگلو امریکن بلاک یا انگریز کرانا چاہتے تھے' وہ کرا چکے تھے۔ وہ بہت کم گو اور گہرا آدمی تھا

اور سیاستدان تھا اس نے کامن ویلتھ کانفرنس میں جانے سے انکار کر دیا تھا کہ پاکستان کی تجویز کے مطابق ایجنڈا میں کشمیر کا مسئلہ شامل نہ تھا۔ یہ تھی تو صرف سیاسی ''لیپا پوتی'' کہ اس کے بیٹے اکبر اور اشرف پہلے لندن پہنچے ہوئے تھے اور انہوں نے ''ڈیڈی اور ممی'' کی لندن میں پہنچنے کی جو تاریخ بتائی تھی لیاقت اور بیگم لیاقت اس روز لندن پہنچ گئے۔ لیکن کامن ویلتھ کے ملکوں میں کچھ دن سیاسی ہل چل مچی رہی اور فیصلہ ہوا کہ ایجنڈا تو اب بن گیا ہے۔ اس سے باہر کینیڈا اور آسٹریلیا کے وزیر اعظم لیاقت اور جواہر لعل نہرو کی ملاقات کرا کے کشمیر کے سلسلہ میں کوئی ''مفاہمت'' کرا رہے تھے۔ اس سلسلہ میں کچھ راہ نکالیں گے۔

قارئین! یہ سیاسی ''لیپا پوتیاں'' ہیں اور کچھ ''نورا کشتیاں'' بھی کی جاتی ہیں اس لئے ایوب خان اور لیاقت علی ابھی راولپنڈی سازش کے مقدمہ کے اثرات سے پورے طرح باہر نہ نکلے تھے کہ جولائی 1951ء میں بغیر کسی وجہ کے بھارت نے اپنی فوجیں پاکستان کی سرحدوں پر اکٹھا کرنا شروع کر دیں۔ جیسا اب 2002ء میں کیا۔ بریگیڈیئر گلزار احمد ہمارے ڈائریکٹر ملٹری آپریشن تھے۔ اس نے ایوب خان اور اس کے سٹاف افسروں پر حالات کی سنگینی واضح کرتے، اس تیزی سے اپنی فوج کو اپنی ذمہ داری والی جگہ پہنچا دیا کہ بھارتی فوجی کمانڈ والے حیران ہو گئے کہ نیشنل گارڈ کو جگہ جگہ دوسری دفاعی لائن کے طور پر یا فوج کی مدد کیلئے ذمہ داریاں دے دیں اور پوری قوم لڑنے مرنے پر تیار ہو گئی۔ سیاست دان کے طور پر لیاقت علی نے اس قومی یکجہتی کا فائدہ اٹھایا اور ''مکا'' اٹھایا کہ یہ ہمارا قومی نشان ہے ہم بھارت کا منہ توڑ دیں گے۔ اینگلو امریکن بلاک اور بھارت کے سامنے مقصد کشمیر کے معاملہ کو ''التوا'' میں ڈالنا تھا اور کشمیر کے معاملہ کو بیچ لائے بغیر ہمارے ان ''آقاؤں'' نے ''لیاقت نہرو'' سمجھوتہ کے تحت ساری صورت حال تبدیل کر دی کہ دونوں ملک مل کر اپنے باقی معاملات پہلے طے کریں گے۔ تو پھر اقوام متحدہ کی قراردادوں کے اعمال کو پیش رفت دی جائے گی۔ لیکن اب فوج میں بھی کوئی ''احتجاج'' نہ ہوا۔ ہمارے پاس جو فوجی سامان تھا' وہ پرانا ہو چکا تھا۔ ملک کے پاس ذرائع نہ تھے کہ فوجی سامان خریدیں۔ تو ہم لوگ چپ چاپ سرحدوں سے چھاؤنیوں سے واپس آ گئے کہ فوجی سامان کو کم سے کم استعمال کریں۔

اکتوبر 1951ء میں راولپنڈی میں لیاقت علی کو قتل کر دیا گیا۔ لیاقت علی اگر بہت گہرا آدمی تھا تو اس کو قتل کرنے والے اور زیادہ گہرے ہوں گے کہ آج تک کوئی کھوج نہ مل سکی۔ اس عاجز نے البتہ بامقصد تحقیق کی ہے۔ کہ میرے پاس جواب موجود ہے کہ لیاقت علی کو قتل ''بادشاہ گروں'' نے کرایا نہ کہ اس کے فوری جانشین نے، کہ عام طور قتل کا الزام ''جانشینوں'' پر لگایا جاتا ہے۔ اس لئے قتل کرانے والوں میں غلام محمد ضرور شامل تھا اور مشتاق گورمانی یا سکندر مرزا' عزیز احمد اور خاص کر اس کا بھائی جی احمد جو ہوم منسٹری کا سیکرٹری کافی عرصہ رہا۔ ان سب کا اس قتل میں ''ہاتھ'' تھا۔ یہ قتل اینگلو امریکن بلاک کی بھی ''ضرورت'' تھی کہ ان کو اب ''بسر و چشم'' والے آدمیوں کی ضرورت تھی۔ لیاقت علی جلدی جلدی ہاں نہ کرتا تھا۔ لیاقت علی پر فائر سید اکبر نے کیا۔ یا لیاقت علی اور سید اکبر دونوں کو گولی کسی پولیس افسر یا پولیس کے ایجنٹ نے ماری، سید اکبر کو قربانی کا بکرا بنانا تھا اور کب سے کوئی اس کی ذہنی برین واش کر رہا تھا کہ وہ لیاقت علی کو کافر یا منافق ''گردانتا'' تھا۔ وہ افغانستان سے سیاسی دیس نکالے کے طور حکومت پاکستان میں وظیفہ پر گزارا کرتا تھا اور اس کو ایبٹ آباد سے اس ''ڈرامے'' یا کارروائی کیلئے راولپنڈی

لایا گیا۔ اس کی گولی سے لیاقت علی کی موت واقع ہوئی یا کسی اور گولی سے سید اکبر کو قتل کرنا زیادہ ضروری تھا کہ کوئی گواہی نہ مل سکے اور اس کے جیب میں کاغذات یا اس کی ڈائری سے ساری گواہیاں پیش کرائی تھیں کہ وہ جنونی قسم کا جذباتی آدمی تھا۔ اس نے خواب میں اپنے آپ کو لٹی کے کنارے ''شہید'' کے طور پر دیکھا اور جسٹس منیر نے نجی محفلوں میں تسلیم کیا کہ اس نے زیادہ انکوائری نہ کی کہ ایک کی بجائے دو ''شہید'' بن جائیں گے۔ یہ عاجز جہاں تصور میں تحریک پاکستان سے پہلے غازی علم الدین اور غازی مرید حسین وغیرہ درجنوں شہداء کو دیکھتا ہے کہ ناموس رسول ﷺ یا اسلام کی سربلندی کیلئے اللہ تعالیٰ کے نام پر قربان ہوگئے۔ وہاں ان کی معیت میں مجھے سید اکبر بھی نظر آتا ہے کہ لیاقت علی کے جنازے کا منظر میرے ایک صاحب نظر کرم فرما نے خواب میں دیکھا تھا۔ تو اس کو بتایا گیا کہ تمہارے کافرانہ نظام کا جنازہ ہے کہ کافرانہ نظام میں ہر حاکم کا عبرتناک حشر ہوگا۔ ممکن ہے سید اکبر بھی ''شہید'' ہو جیسے اُس نے اپنے آپ کو خواب میں شہید دیکھا۔

لیاقت علی نے اس قوم کو کیا دیا، یا کیسی مثالیں چھوڑیں۔ اس سلسلہ میں ہماری تحقیقات بڑی ادھوری ہیں اور بڑی غلط باتیں پھیلائی گئیں کہ لیاقت علی اپنے بینک میں کوئی پیسہ نہ چھوڑ گیا اس کو کیسے صحیح مانا جائے کہ نوائے وقت 22 اپریل 1991ء کے مطابق لیاقت کی وفات کے چند سال بعد اس کے بیٹے اکبر نے اس زمانے کے لاکھوں اور آج کل کے کروڑوں روپے کے تحفے دے کر گوا کی ایک حسینہ سے شادی کی تھی۔ جو سب تحفے لے کر اکبر کو چھوڑ گئی۔ یعنی ''چوروں کو مور پڑ گئے'' یعنی اگر لیاقت علی کوئی دولت نہ چھوڑ گیا ہوتا تو اکبر لیاقت علی نے یہ دولت کہاں سے لی تھی۔ لیاقت کے زمانے میں لیاقت کی پہلی بیوی سے بڑا بیٹا ولایت علی لاہور آیا ہوا تھا اور مہاجرین کی چھوڑی ہوئی دولت اکٹھی کرتا رہا اور اُس کے خاندان والے پنجاب میں بڑی جائیدادوں کے مالک ہیں۔ لیاقت علی نے اپنے ایک معمولی کاردار کو راولپنڈی میں آباد کرایا۔ جس کے بیٹے امیر اعظم کو ''سردار امیر اعظم'' بنا کر آئین ساز اسمبلی کا ممبر بنا دیا اور وہ وزارتوں پر بھی فائز رہا۔ خان آف ممدوٹ کے ساتھ لیاقت علی کا بڑا جھگڑا لیاقت علی کے ہم زلف ایشورداس کی وجہ سے ہوا۔ بیگم رعنا لیاقت علی جو کہتی تھی کہ وہ مسلمان ہوگئی ہے وہ ایک ہندو پنڈت کی بیٹی تھی اور اس کی دوسری بہن اس ایشورداس کی بیوی تھی۔ مردان شوگر مل اور دریاؤں سے لکڑی کے سارے کاروبار پاکستان بن جانے کے بعد بھی اور آبادی کے تبادلہ کے بعد بھی ایشورداس بھارت میں بیٹھ کر کرتا تھا اور سب دولت بھارت چلی جاتی تھی۔ نواب ممدوٹ نے اس میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو خان آف ممدوٹ کو دشمن بنا لیا اور ممتاز دولتانہ کو اس کی مخالفت میں کھڑا کر دیا۔ لیاقت علی نے چار سال سے زیادہ عرصہ پاکستان پر حکمرانی کی۔ نہ آئین بننے دیا نہ اس سلسلہ میں کچھ کام کیا۔ سوائے 1949ء کی قرارداد مقاصد کے جس سے قوم کو بے وقوف بنانے کی کہانی پہلے لکھی جا چکی ہے۔

یہ عاجز باقی بھی بہت کچھ لکھ چکا ہے کہ خورشید انور بھی لیاقت علی کا ''خاص الخاص'' آدمی تھا جس نے سری نگر کی طرف پیش قدمی کا ''ڈرامہ'' کیا اور بھارت یا جواہر لعل نہرو کی ''ضرورت'' پوری کی کہ سردیوں سے پہلے بھارتی فوج مہاراجہ کی ''امداد'' کیلئے پہنچ گئی۔ جموں کی طرف سے لیاقت علی نے کوئی کارروائی نہ کرنے دی اور دریائے چناب کے مشرق میں بھی کوئی کارروائی نہ کرنے دی۔ ایڈمرل احسن اور جنرل اکبر خان کی کتابوں کے

حوالوں سے یہ عاجز ثابت کر چکا ہے کہ قائداعظم تو جموں کے علاقے میں پکی فوج کو استعمال کرنے پر بھی تیار تھے لیکن انگریزوں کی مدد سے لیاقت نے اس علاقے میں رضا کاروں کو استعمال کرنے سے روک دیا تو قائداعظم اور لیاقت علی کے اختلافات کھل کر سامنے آجاتے ہیں بلکہ آزادی سے پہلے متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں لیاقت علی نے کانگریس کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی سے جو سمجھوتہ کر لیا تھا' قائداعظم نے اس کو ناپسند کیا تھا۔ لیکن ہم قحط الرجال کے شکار ہیں۔ باقیوں کا ذکر بھی آتا ہے۔ قائداعظم نے ''کھوٹے سکوں'' کے ساتھ بھی گزارا کیا اور لیاقت علی کے ساتھ آخری ملاقات کے بعد مس فاطمہ جناح نے جو قائداعظم کی آنکھوں میں آنسو دیکھے یا آخری ایام میں جب قائداعظم کراچی پہنچا تو ان کو خوش آمدید کہنے والا کوئی نہیں تھا یا لیاقت علی کی کشمیر کے جہاد کی ''ڈھیلی'' پالیسی یا جہاد کو پہلے ٹھنڈا کرنا یا پونچھ کے سلسلہ میں نہرو کی باتوں میں آجانا یا مکمل طور پر فائر بندی کے ڈرامے سے جہاد کو جمود دے جانا، لیاقت علی ہی نے ممتاز دولتانہ اور زاہد حسین سے پنجاب کے مشرقی دریاؤں کے پانی کا حق بھارت کو دینے پر دستخط کروائے اور قائداعظم کی وفات کے بعد مخلص لوگوں نے لیاقت علی کو سمجھایا کہ ہم آغا خان کو پاکستان کا گورنر جنرل بنائیں۔ بے شک وہ مغربی لابی کا آدمی ضرور تھا لیکن اس کے اینگلو امریکن بلاک کی حکومتوں پر اثرات بھی تھے۔ اگر اس وقت آغا خان پاکستان کا گورنر جنرل بن جاتا تو کشمیر کے معاملات کو وہ سلجھا لیتے اور کشمیر ہمیں مل گیا ہوتا۔ لیکن لیاقت علی نے ایک کمزور آدمی کو گورنر جنرل بنایا کہ حکومت کی باگ ڈور مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں رہے۔

لیاقت علی کی پالیسی کو ہمارے ملک میں دو آدمی ضرور سمجھ گئے' ایک غلام محمد اور دوسرا ذوالفقار بھٹو۔ غلام محمد نے سوچا کہ اگر لیاقت علی جیسا عام یا اوسط ذہنیت والا آدمی سیاسی ''شطرنجوں'' سے ایسے اعلیٰ عہدہ پر پہنچ سکتا ہے وہ تو لاہوری داؤ بھی کر سکتا ہے کیوں نہ وہ خود حکومت پر براجمان ہو جائے۔ تو اس نے ناظم الدین کو ایک ''مہرہ'' کے طور پر استعمال کیا کہ ساری طاقت وزیراعظم کی کرسی کے پاس ہے تو ناظم الدین وزیراعظم بن جائے تو بنگالی سپاہیوں نے اسی زمانے میں کہا تھا کہ وہ بڑی غلطی کر بیٹھا ہے صوبیداری سے حوالدار میجر بن گیا۔ ساری طاقت کرسی کی نہیں ہوتی ''شخصیت'' بھی بڑا کام کرتی ہے ناظم الدین کا تعلق نواب فیملی سے تھا۔ فضل حق کی قائداعظم سے بغاوت کی وجہ سے ناظم الدین متحدہ بنگال کا وزیراعلیٰ بن گیا۔ لیکن انتظامی لحاظ سے بڑا ناکام تھا تو مسلم لیگ کی قیادت حسین شہید سہروردی کے پاس چلی گئی تھی اور 1946ء کے انتخابات کے بعد وہ بنگال کا وزیراعلیٰ تھا۔ لیکن بنگال کی تقسیم کے بعد قیادت پھر ناظم الدین کے پاس چلی گئی کہ دارالحکومت ڈھاکہ میں بن رہا تھا اور ناظم الدین کا تعلق ڈھاکہ سے تھا۔ سہروردی کا تعلق بردوان (مغربی بنگال) کے ساتھ تھا' جو علاقے بھارت کا حصہ بن رہے تھے۔ ناظم الدین کو پاکستان کے ''بادشاہ گروں'' نے جن کا سربراہ غلام محمد تھا خوب استعمال کیا۔ ذوالفقار بھٹو نے بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ لیاقت علی کس طرح اپنے مغربی آقاؤں کا کھیل بھی کھیلتا رہا اور قوم کو بھی بے وقوف بناتا رہا۔ تو اس نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ لیکن اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کے ''آقا'' ان کو ''شہادت'' سے بھی دو چار کریں گے کہ ان کی موت یا ''شہادت'' کے بعد کوئی ان کی کوتاہیوں کا ''کھوج'' نہ لگائے۔ کہ اس ''کھوج'' لگانے سے ان کے ''آقاؤں'' یعنی ''مغربی لابی'' والوں کی سازشوں کے طریق کار کھل کر سامنے آجائیں گے۔ ضیاء الحق کو اس عاجز نے کئی خطوط لکھے کہ بھٹو نے جو افواج کو ستمبر 65 میں لاہور محاذ پر جانے سے روکا ہوا تھا اس

سلسلہ میں بھٹو پر مقدمہ چلایا جائے لیکن شاید ضیاء الحق کو ایسا کرنے کی ''اجازت نہ تھی'' اور اب لیاقت علی بھی ''شہید'' ہے اور بھٹو بھی ''شہید'' ہے۔ 1980ء میں موجودہ حکومت کے ''قانونی مشیر'' اور اس وقت ضیاء الحق کی حکومت کے وزیر شریف الدین پیرزادہ نے لیاقت علی کے ان گروپوں اور قائداعظم کے ساتھ ''بے وفائی'' کے سلسلہ میں اخباروں میں ایک بیان دے دیا۔ بیگم رعنا لیاقت زندہ تھی۔ اس نے پیرزادہ کے خلاف ہتک کے مقدمہ کی ''دھمکی'' دے دی۔ پیرزادہ نے میرے ساتھ رابطہ کیا۔ میں نے کہا کہ میرا نام استعمال کریں کہ آپ کو سب کچھ میں نے بتایا اور مزید بیان دو کہ میجر امیر افضل کو خوشی ہوگی کہ ایسا مقدمہ چلے کہ وہ عدالت میں رہی سہی کسر بھی پوری کر دے گا کہ قوم کو سچ اور حق بھی معلوم ہو جائے گا۔ بیگم لیاقت کو سانپ سونگھ گیا کہ پیرزادہ نے ایسا بیان دے دیا۔

ناظم الدین کا وزیراعظم بننا بھی غیر جمہوری عمل تھا۔ لیکن ''بادشاہ گر'' تو اس کو ''تگڑم'' ناچ نچانا چاہتے تھے کہ 1952ء میں مشرقی پاکستان میں زبان کا جھگڑا شروع کرا دیا گیا کہ ناظم الدین کی وقعت اس کے اپنے علاقے میں کم ہو، کہ اس کے بجائے وہ ''بادشاہ گر'' کسی ایسے آدمی کو آگے لانا چاہتے تھے جو مکمل طور پر ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو اور اینگلو امریکن بلاک کی بھی یہ ''ضرورت'' تھی۔ یہ عاجز جولائی 1951ء سے مشرقی پاکستان پہنچ چکا تھا۔ حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ 1944ء سے 1946ء میں اس عاجز نے دیکھا تھا کہ ہندوؤں کے پسے ہوئے مسلمان، ہم پنجابی اور پٹھانوں کو اپنے درمیان دیکھ کر ہمیں اپنے نجات دہندہ اور بڑے بھائی سمجھتے تھے۔ اب وہ مسلمان کی بجائے ''بنگالی'' بن چکے تھے اور اب جو ''نفرت'' ان کے پاس تھی وہ ہماری طرف تبدیل ہوگئی کہ بنگال کے علاقوں کا یہ وطیرہ بن چکا ہے کہ وہ کسی کے ساتھ نفرت کریں اور براہو ان کا فرانہ نظاموں کا جن میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف دو گروہوں کا ہونا ضروری ہے یا ''مخالفت'' ضروری ہے۔ جس کو بنگالیوں نے نفرت بنا دیا اور برا ہو مادیت اور لبھاؤ اور برابر مواقع کی بجائے ''برابری'' کو اپنا وطیرہ بنانے کا، کہ ہر بنگالی اب بڑا افسر یا ایسی پوزیشن میں جانا چاہتا تھا جس میں ہم مغربی پاکستان کے افسران تھے۔ بنگالی افسروں کو نیشنل گارڈ کی یونٹوں کی کمانڈ کی تربیت ہماری پلٹن کے میجر محمد شریف دے رہے تھے اور انہوں نے ذرا ان سے سخت جانی مشقت لی۔ تو افسروں نے ''بغاوت'' کر دی کہ ہمیں صرف کمانڈ کرنے کی تربیت دی جائے اور میجر شریف کے ماتحت کام کرنے سے انکار کر دیا تو راقم کو وہاں بھیجا گیا۔ راقم نے بڑی مشکل سے صورتحال کو سنبھالا دیا۔ کہا کہ جب تک وہ لوگ نیچے والے کے کام کو عملی طور پر نہیں سیکھیں گے وہ کمانڈ نہیں کر سکیں گے۔ ہاں بدنی کام کے پیریڈ اتنے کر دیتے ہیں جتنے وہ مقرر کریں اور زیادہ وقت فن سپہ گری کے لیکچروں پر دیں گے اور اس دوران جہاں عملی کام کا ذکر آئے گا تو میں خود تمہارے سامنے وہ عملی کام کروں گا اور تم میری نقل کرنا۔ اب میں خود ''رنگروٹ'' بن گیا تو مجبوراً ان لوگوں کو رنگروٹ بننا پڑا کہ ہر آدمی بغیر کام کے بڑا افسر بننا چاہتا تھا۔

یعنی ہم مغربی پاکستانیوں اور بہاریوں وغیرہ سب غیر بنگالیوں کے خلاف ان کافرانہ نظاموں کی وجہ سے لاوا ابلنے لگا تھا۔ پس شر پسند رہنماؤں کے آگے آنے کی دیر تھی کہ پاکستان کے بنتے ہی زبان کا جھگڑا ہندو بنگالیوں نے شروع کرا دیا تھا اور قائداعظم کو مشرقی پاکستان جانا پڑا تھا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اس ملک کی زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہے اور مسلمانوں کی زبان اردو ہے کہ اسی زبان میں ہم اپنے عقائد کی پیروی سیکھتے ہیں۔ اس لئے

کوئی پسند کرے یا نہ کرے پاکستان کی زبان اردو ہوگی۔ اس وقت تو خاموشی ہوگئی۔ لیکن یہ بڑا مشکل مسئلہ تھا اور پاکستان میں کئی مسائل نے سر اٹھالیا۔ 1950ء میں آغا خان مرحوم پاکستان آیا۔ تو کئی دانشوروں نے کئی ملکی مسائل ان کے سامنے پیش کئے اور زبان کا مسئلہ پر بھی بات کی۔ کہ یہ مسائل کیسے حل ہوں۔ آغا خان کا اس زمانے میں لمبا چوڑا انٹرویو ''ڈان'' اخبار میں شائع ہوا تھا کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنایا گیا ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ اتنے دور دو خطوں کا اتحاد ہے اور وہ اتحاد عملی طور پر اسلام کو اپنانے اور اس کے نفاذ سے قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن پہلی صدی کا اسلام جب نہ کوئی فرقہ واری تھی اور نہ فقہی گروہ بندی تھی۔ آغا خان چونکہ شیعہ تھا تو ایک صحافی نے ذرا ''شرارت'' سے سوال پوچھا کہ ان سو سالوں میں بنوامیہ کا زمانہ بھی شامل ہے۔ آغا خان نے کہا ''ہاں! بین الاقوامی دنیا میں امیہ کا زمانہ بھی اسلام کی شان و شوکت کا زمانہ تھا'' کہ وہ لوگ خلفاء راشدین کی امت کی وحدت اور خلوص اور اسلامی فلسفہ حیات پر عمل کے ثمرات حاصل کرتے رہے۔ ان کے اپنے ظلم، عرب ازم اور مادیت کی چاہت کے نتائج بعد والوں نے بھگتے۔ آغا خان نے کہا کہ پاکستان والوں کو مزید وحدت کیلئے اپنی ایک زبان کرنی ہوگی۔ وہ انگریزی کو اپنالیں یا عربی کو۔ اردو نے اسلام کی بڑی خدمت کی لیکن دو خطوں کو متحد نہیں رکھ سکتی۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کو نفاذ اسلام کے ذریعے متحد رکھا جا سکتا ہے

قارئین! یہ افسوس کا مقام ہے کہ قوم نے ان قیمتی مشوروں پر مزید بحث تک نہ کی۔ لیکن راقم کیلئے ان میں نشان راہ تھا۔ 6 ستمبر 1965ء کو جب میں نے بی آر بی سے آگے عورتوں اور بچوں کو بھاگتے دیکھا تو یہ عاجز پکار اٹھا۔ ''کہ اے حجاج بن یوسف تو میرا ہیرو ہے۔ بنوامیہ کے زمانوں میں اسلامی غیرت تو تھی۔'' آغا خان کی دوسری نصیحت پر عمل نہ کرنے کے نتائج بھی ہم نے جلد دیکھ لئے۔ تو مارچ 1952ء میں ناظم الدین اور نورالامین کو ''بے جان'' کرنے کیلئے شیخ مجیب الرحمٰن اور پروفیسر غلام اعظم جیسے نوجوان رہنماؤں نے بنگالی زبان کی حق میں جو تحریک شروع کی تو سارے مشرقی پاکستان سے لوگ ڈھاکہ کی طرف ''الٹ'' پڑے۔ بہاری پولیس اور ایسٹ پاکستان رائفلز نے گولی چلا دی۔ چھ سات آدمی ہلاک ہوگئے تو حالات اور زیادہ خراب ہوگئے۔ ڈھاکہ میں کوئی پکی پلٹن نہ تھی۔ نیشنل گارڈ، بنگال سنٹر اور ادھر اُدھر سے مانگ کر کوئی سات کمپنیاں بنا کر سگنل رجمنٹ کے کرنل سردار محمد افضل کو ڈھاکہ شہر کا عارضی طور پر ملٹری کمانڈر بنایا گیا۔ لیکن حالات کنٹرول نہ ہو رہے تھے۔ تو کومیلہ سے ہماری پلٹن کی تین کمپنیوں کو حکم ملا کہ جا کر ڈھاکہ کا کنٹرول سنبھالیں۔ ہمارے کرنل نے بڑی دانشمندی کی کہ ہم سب کو ڈھاکہ شہر میں نہ ''جھونک'' دیا۔ ایک کمپنی کو ریزرو رکھا اور ایک کو ڈھاکہ چھاؤنی یا دفتروں کی حفاظت پر مامور کیا اور سارے ڈھاکہ شہر کی ذمہ داری میری اکیلی کمپنی کو دی۔ کہ وہاں متعین سات کمپنیوں سے میں نے چارج سنبھالنا تھا۔ جو لوگ جھولا، پٹھو اور لوہے کی ٹوپیاں پہنے ''فائیٹنگ آرڈر'' میں جگہ جگہ متعین تھے۔ میں نے کرنل سردار افضل کو گزارش کی کہ دو گھنٹے کے اندر شہر خالی کر دیں اور میں کسی اکیلے اکیلے سے چارج نہ لوں گا۔ میں نے اپنے جوانوں کو ''فائیٹنگ آرڈر'' وردی کے بجائے ''سیریمونیل'' وردی پہنائی۔ اور پانچ پانچ راؤنڈ دیئے کہ وہ حفاظت کیلئے جیب میں رکھنا اور کسی ایک جگہ رہنے کی بجائے میں نے انہیں ٹکڑیوں میں بانٹ دیا کہ گاڑیوں میں ''گشت'' کریں اور کہیں کہیں گاڑیوں سے اتر کر سپاہیانہ چال سے چلیں۔ جہاں کچھ لوگ نظر آئیں تو مجھے وائرلیس

پر بلالیں۔ ایک دو جگہوں پر لوگ اکٹھے ہوئے تو میں وہاں پہنچ گیا اور اعلان کیا ''کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں میں آپ کو قتل کرنے کیلئے نہیں آیا۔ میرا کام تو سرحدوں کی حفاظت ہے۔ لیکن یہاں بدامنی کی وجہ سے مجھے یہاں آنا پڑا۔ مجھے بتاؤ کہ اگر بھارت اب حملہ کر دے تو سرحدوں کی حفاظت کون کرے گا؟'' وغیرہ پھر میں نے جو آزادی سے پہلے ان لوگوں کے رہنماؤں سے دوستی بنائی تھی' ایک ایک کا نام لیا کہ ''اے لوگو۔ ان کو بلاؤ کہ اب آ کر میرے ساتھ بات کریں کہ کیا ہم نے پاکستان اس لئے بنایا تھا کہ ایک دوسرے کو قتل کریں اور یہ بدامنیاں ہوں'' وغیرہ۔ میں نے کہا ''کہ ذرا اخبار نویسوں کو بھی بلائیں کہ وہ آ کر مجھے ملیں۔ کہ ہم سوچیں کہ کیا ہو رہا ہے۔'' میں نے کچھ اخبار نویسوں کے نام لئے جن کو میں تحریک پاکستان کے وقت سے جانتا تھا۔ چند گھنٹوں کے بعد لوگوں نے تتر بتر ہونا شروع کر دیا اور مشہور ہو گیا کہ چھ فٹ قد والے چوڑی چھاتی والے پنجابی سپاہی آ گئے ہیں جو اُن پر گولی نہیں چلاتے اخبار نویس اور کئی سول رہنما بھی میرے پاس پہنچ گئے اور لوگ ''پاکستان زندہ باد'' اور ''اسلام زندہ باد'' کے نعرے لگاتے تتر بتر ہو رہے تھے۔ میرے ڈویژن کمانڈر اس زمانے میں جنرل محمد موسیٰ تھے۔ حالات کی اس تبدیلی کی باتیں سن کر وہ حیران ہوئے اور بریگیڈیئر (بعد میں جنرل) عبدالحمید اور ایک سٹاف افسر میجر اسلم کو میرے پاس بھیجا۔ وہ سب باتیں سن کر حیران ہوئے اور جنرل محمد موسیٰ صاحب بھی دوسرے دن آئے لیکن یہ ''وقتی'' نتیجہ تھا۔ اس عاجز نے بعد میں لکھ کر رپورٹ بھیجی کہ ''بنگلہ دیش'' بنانے کی بنیاد باندھی جا رہی تھی۔ وقتی طور پر معاملات رک گئے ہیں۔ اسلام اور صحیح قسم کا اسلام ہی دو خطوں کو متحد رکھ سکتا ہے اور یہی کچھ موجود مغربی پاکستان پر لاگو ہے کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ''مواقع تقدیر'' فراہم کر رہا ہے اور لمبی رسی ملی ہوئی ہے کہ ''عشق بلاخیز کا قافلہ سخت جان'' بن کر ہم اسلام نافذ کر دیں۔

قادیانیوں کے خلاف تحریک

اگست 1952ء میں اس عاجز کی تبدیلی ایک آزاد کشمیر بٹالین میں ہوگئی۔ جہاں 48-1947ء کے مجاہدوں اور چھاپہ ماروں کو ہماری طرح ''ٹامی'' سپاہی بنایا جا رہا تھا۔ اتفاقاً نائیک شاہ ولی بھی اسی پلٹن میں موجود تھا۔ پہلے مضامین میں ذکر ہو چکا ہے کہ اسی شاہ ولی نے مجاہد کے طور پر راجوری محاذ پر پانچ آدمیوں کی مدد سے 1948ء میں ایک بریگیڈیر کی پیش قدمی، تین دن روکے رکھی، اب اس کو انگریزی طرز کی لڑائی لڑنے کی تربیت دی جا رہی تھی۔ جہاں دشمن کی ایک سیکشن کو برباد کرنے کیلئے ایک پلٹون کی ضرورت ہے۔ کچھ مجاہدین کو فائر بندی لائن پر مورچوں میں پڑے رہنے والی بات پسند نہ تھی، ایک مجاہد ''غائب'' ہو گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد ''واپس'' آیا۔ بھارتی فوج کی دو رائفلیں بھی اٹھائے ہوئے تھا۔ حالانکہ وہ اپنی رائفل اپنے مورچے میں چھوڑ گیا تھا۔ 1954ء تک یہ جذبہ کرنل شیر محمد کو بھی نظر آتا تھا۔ جنہوں نے ایوب خان کو جو گزارش کی تھی' کہ بھارت کے خلاف گوریلہ کارروائی کریں۔ لیکن جب ایسے جذبے ''سرد'' پڑ گئے اور یہ لوگ بھی ہماری طرح ''ٹامی'' سپاہی بن گئے تو 1965ء میں ایک ''سازش'' کے تحت ان میں کچھ کو اختر ملک نے مقبوضہ کشمیر میں ''جھونک'' دیا۔ قارئین! اس عاجز کو کہیں سے کوئی ایسا عمل نظر نہ آیا کہ ہم پاکستان بنانے کے مقاصد حاصل کرنے کیلئے کچھ کر رہے ہوں۔ مشرقی پاکستان سے آزاد کشمیر جاتے محکمہ تعلقات عامہ والوں نے مجھے ''دیکھ لیا'' تو پاکستان میں دوسری دفعہ اور ویسے چوتھی دفعہ اس

''سپاہی'' کو پھر دانشوروں کی ''رفاقت'' میسر آگئی کہ میری تبدیلی ISPR میں ہو گئی۔ مشرقی پاکستان میں ناظم الدین کو بدنام کرانے کا کام پورا ہو چکا تھا۔ اب مغربی پاکستان میں بھی ناظم الدین کیلئے مشکلات پیدا کرنے کی سازش کو بروئے کار لانا تھا۔ تو 1953ء میں پنجاب میں قادیانیوں کے خلاف تحریک شروع ہو گئی۔

لیکن قادیانیوں کے خلاف یہ تحریک اس کے شروع کرنے کے عوامل، تحریک از خود، واقعات، ممتاز دولتانہ کو بے عزتی سے نکالنا، منیر کی انکوائری، مارشل لاء کا لگ جانا' مودودی کو پھانسی کی سزا دلانے کا ''ڈرامہ'' کرانا اور پھر منیر کی انکوائری کے ذریعے مودودی کو ایک ''مفکرِ اسلام'' ثابت کرنا' بے گناہ لوگوں کا بے حساب قتل۔ اول تو قوم کافی باتوں کے بارے بے خبر ہے کہ ایسے نتائج حاصل کر لئے گئے کہ بیس سال تک کوئی آدمی قادیانیوں کے خلاف چوں بھی نہ کر سکا اور 1973ء کی تحریک بھی حادثاً شروع ہوئی۔ افسوس کہ اس سلسلہ میں ہمارے دانشوروں نے ذرا بھر تحقیق نہ کی۔ اول ہمارے اندر غیروں نے جو قادیانیوں کا پودا لگایا تو انہوں نے ہماری زمین خاص کر مشرقی پنجاب کو بڑا ''زرخیز'' پایا کہ یہ خبیثہ پودا وہاں لگ سکتا ہے اور یہ عاجز اس سلسلہ میں بہت تحقیق کر چکا ہے اور شرعی عدالت اور سپریم کورٹ دونوں مقامات پر اس شرپسندی والی سازش کے سلسلہ میں قوم کیلئے بڑے نکتے واضح کئے اور تمام سازش کے پس مناظر اور نتائج اور نتائج کے اثرات بھی واضح کئے، لیکن افسوس ان معاملات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی اور ''ختم نبوت کی حفاظت'' کرنے والے از خود معاملات کی گہرائیوں تک غوطہ زن نہیں ہو سکے۔

عرب سے مغربی علاقوں نے حضرت عمرؓ کی عربی زبان کو اپنانے کی تجویز کو بسر و چشم تسلیم کیا اور مصر، تیونس، مراکش حتیٰ کہ سپین تک میں عربی زبان اپنانے کی وجہ سے وہاں بے شمار علماء پیدا ہوئے اور علمی ادارے وجود میں آگئے یا آتے رہے۔ مشرق میں عراق اور شام کی تو زبان عربی تھی اور وہاں سے آذربائیجان اور خراسان کے راستے سنٹرل یا روسی ترکستان کے علاقے اسلامی علوم کے گہوارے بن گئے۔ لیکن مرکزی ایران اور فارس کے علاقے میں عربی زبان کیلئے رکاوٹ پیدا ہو گئی کہ فارسی بڑی ''ترقی یافتہ'' اور شہنشاہوں کی زبان ہونے کی وجہ سے عربی کیلئے ''رقابت'' پیدا کر رہی تھی۔ پھر گیارھویں صدی عیسوی میں فردوسی یا عمر خیام کے ''شاہناموں'' یا ''رباعیوں'' نے فارسی زبان کو ایسی زندگی عطا کر دی کہ تیرھویں صدی کے عربی کے بڑے مداح شیخ سعدی کو بھی اپنا کلام فارسی میں پیش کرنا پڑ گیا۔ برصغیر ہندو پاکستان میں اسلام جب سندھ کے راستے داخل ہوا تو ان مسلمانوں کا تعلق زیادہ تر بصرہ یا فارس کے علاقوں سے تھا اور محمود غزنوی یا باقی افغان بادشاہ بھی عربی کی بجائے فارسی اور ترکی پر زیادہ عبور رکھتے تھے تو یہ کہنا بالکل بجا ہو گا کہ برصغیر ہندو پاکستان میں اسلام عربی کی بجائے فارسی اور ترکی ''لبادہ'' میں داخل ہوا اور یہاں اسلام فقراء اور خانقاہی نظام والوں نے فارسی یا علاقائی زبانوں کی مدد سے پھیلایا۔ کہ ان خطوں میں اٹھارھویں صدی تک ازہر یونیورسٹی یا درس نظامیہ کے طرز پر بنا ہوا کوئی ادارہ نظر نہیں آتا اور اٹھارھویں صدی کے شاہ ولی اللہ سے پہلے کسی بڑے عالم کا نام بھی سننے میں نہیں آتا اور دیوبندوں کی طرح کے اسلامی ادارے بھی انیسویں صدی کی آخری سالوں میں وجود میں آئے۔ اس لئے انگریزوں نے غلام کذاب سے قادیانزم خبیثہ پودا جب یہاں بویا تو غلام کذاب کو پوری طرح ''تیار'' کیا۔ پہلے پہل وہ ایک ریفارمر کے طور سامنے آیا کہ اسلام کو زمانے کے تناظر میں بیان کرتا تھا۔ پھر ''مجدد'' بنا اور نبوت کا دعویٰ تو بہت دیر کے بعد کیا۔

بلکہ اس کے کچھ پیروکار یعنی لاہوری گروپ تو آج بھی کہتا ہے کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہی نہیں۔ بہر حال اصلی مقصد اسلام میں شکوک پیدا کرنے اور مسلمانوں کو انتشار کا شکار کرنا ہوتا ہے اور قادیانی اب بھی کسی عقیدے پر قائم نہیں رہتے۔ یہ ایک ٹریڈ یونین بھی ہے کہ اپنے فرقے کیلئے مراعات حاصل کی جائیں۔ ایک دوسرے کی دیکھ بھال کی جائے اور اختر ملک یا عبدالعلی کے باپ غلام نبی کی کہانی یہ عاجز بیان کر چکا ہے کہ قادیانیوں کے اوپر والے گروہ میں اکثر دہریئے ہیں اور سرسید کی طرح ''نیچریئے'' بھی کافی ہیں۔

چنانچہ غلام کذاب نے شروع شروع میں مسلمان مولویوں کی کم علمیوں کو خوب اچھالا اور ان کو اکثر بحث و مباحثہ کی دعوت دے دیتا تھا اور کچھ عالم اس کے ساتھ بحث کو وقت کا ضیاع سمجھتے تھے اور مشرقی پنجاب کے اضلاع کے مسلمانوں کی حالت زار کی کرنل سلطان علی شاہ اپنی کتاب میں بھیانک تصویر کھینچتا ہے۔ ان علاقوں کے مولوی یا مسلمان تو قادیانیوں کے ''مقابلہ'' سے بھی گھبراتے تھے کہ غلام کذاب کو یہ ہمت پڑ گئی کہ اس نے ایک بحث مباحثہ کی دعوت گولڑہ شریف کے پیر مہر علی شاہ کو بھی دے دی۔ پیر صاحب کا فقر میں بھی بہت اونچا مقام تھا اور آپ اسلامی علوم کے سمندر تھے کہ افراد میں تو کئی اور لوگ اسلامی علوم پر عبور رکھتے تھے۔ تو پیر مہر علی شاہ نے نہ صرف یہ دعوت قبول کر لی بلکہ اسلامی علوم کے حامل کئی افراد پیر صاحب کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ غلام کذاب نے نہ صرف بحث سے ''فرار'' اختیار کیا۔ بلکہ پیر صاحب نے غلام کذاب کی موت کے بارے میں بھی پیش گوئی کر دی کہ اس کی موت پیٹ میں مروڑ پڑنے سے ٹٹی خانے میں واقع ہو گی اور مرزا قادیان کی پیر مہر علی شاہؒ کی موت کی پیش گوئی غلط ثابت ہوئی کہ مرزا کے مرنے کے بعد وہ تیس سال زندہ رہے۔ تو قادیانی سازش کچھ رک گئی اور اس کے بعد کوئی ابن الوقت یا پیٹ کے لالچ سے قادیانی ہوا ہو گا ورنہ جب تک پیر صاحب مہر علی شاہؒ زندہ رہے' ان کا نام سن کر قادیانیوں پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ پیر صاحب کی وفات کے جلدی بعد دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی یا تحریک پاکستان شروع ہو گئی۔ کافی قادیانی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور قادیانی مسئلہ ثانوی حیثیت اختیار کر گیا کہ ظاہری طور پر تو ظفر اللہ پاکستان کا وکیل تھا اور پاکستان کا وزیر خارجہ بھی بن گیا تھا اور لیاقت علی کے زمانے میں ممتاز دولتانہ کی مدد سے ربوہ کے وجود میں آنے کا ہم پچھلے مضامین میں ذکر کر چکے ہیں کہ قادیانیوں نے خوب لوٹ مچائی ہوئی تھی۔ سول افسروں میں بھی کافی قادیانی تھے اور قادیانیوں کو خوب فائدے دیئے جا رہے تھے اور فوج میں ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر وحید حیدر تھا جس کی کشمیر کی جنگ میں کوتاہیوں کا ذکر ہو چکا ہے جن کو غداری بھی کہا جا سکتا ہے اور قادیانی افسر اپنی مرضی کی اور اچھی جگہوں پر اپنے آپ کو پوسٹ کرا لیتے تھے اور ظفر اللہ کے قائداعظم کا جنازہ نہ پڑھنے سے قادیانیوں کے خلاف لوگوں کے جذبات کافی عرصے سے ابھر رہے تھے اس لئے قادیانیوں کے خلاف اگر کوئی تحریک چلتی یا چلائی جائے تو لوگ دھڑا دھڑ اس میں شامل ہونے کو تیار ہو جاتے۔

تحریک ختم نبوت کے ذریعے ممتاز دولتانہ اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے

اب یہ تحریک کس طرح چلی، یا ظاہراً جو باتیں سامنے آئیں۔ ہم اپنی کہانی کی بنیاد تو انہی حقائق کے گرد یا اوپر باندھیں گے۔ لیکن ساتھ چھپے ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے جائیں گے کہ یہ کن کن کی ''ضرورت'' تھی اور

کس نے اس سے کیا فائدہ اٹھایا اور کس نے کیا کیا نقصان کرایا۔ یہ تحریک ممتاز دولتانہ نے شروع کرائی اور اسی زمانے میں یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ اس کے "گماشتے" یا اس کے ماتحت سرکاری اداروں کے کئی کارکن اس تحریک میں کام کر رہے تھے۔ ممتاز دولتانہ یہ کچھ مرکزی حکومت کے "بادشاہ گروں" کی شہ پر کر رہا تھا کہ ناظم الدین کیلئے جگہ جگہ مسائل پیدا کئے جائیں اور دولتانہ کو یہاں تک شہ دی گئی کہ لیاقت علی کا جانشین اس کو ہونا چاہیئے تھا کہ مسلم لیگ میں وہ لیاقت کے بعد دوسرے نمبر کا آدمی تھا۔ صوبہ سرحد سے یوسف خٹک اور ارباب خاندان کے کچھ لوگ اس کے ساتھ تھے۔ سندھ سے اس کو محمد ایوب کھوڑو کی مدد تھی اور کراچی سے اسماعیل چندریگر اور کچھ مہاجر اس کے ساتھ تھے مشرقی پاکستان سے ناظم الدین کے مخالف گروہ چودھری حمید الحق اور یوسف علی چودھری (موہن میاں) کئی فصلی بٹیرے سیاستدان اس کے ساتھ تھے اور وہ لاہور آ کر ممتاز دولتانہ کے ہاں قیام کرتے تھے تو ان میں سے کوئی ایک دفعہ دوسرے درجہ کے شور مچانے والے اپنے ساتھی شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی ساتھ لے آیا۔ تو ممتاز دولتانہ نے رہائش کی کمی اور مجیب کے مطابق اس کو اپنے نوکروں والے کوارٹر میں جگہ دی اور مجیب نے بعد میں اس کا ذکر کئی دفعہ کیا کہ یہ برتاؤ اس کے مغربی پاکستان والوں کے خلاف نفرت کا باعث بنا۔ لیکن تحریک چلانے کیلئے قادیانیوں کی سازش اور عقائد وغیرہ کے سلسلہ میں جو "قرطاس" یا کاغذات تیار کئے یہ کام مودودی نے کیا۔ اس کے ساتھ ممتاز دولتانہ یا دوسروں نے کیسے رابطہ باندھا یا اسے کس نے "استعمال" کیا، دراصل یہ مودودی کی اپنی "ضرورت" بھی تھی اور باقی "رابطوں" کا یہ عاجز کوئی کھوج نہ نکال سکا۔

مودودی اور جسٹس منیر میں کوئی قدر مشترک ہے

مودودی کو معلوم ہوگیا تھا کہ ملک میں اسلام پر عبور ہونے کا نہ کوئی ادارہ ہے اور نہ کوئی پیر مہر علی شاہؒ جیسا فرد سامنے آیا۔ تو انہوں نے اپنا اسلام چلانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس کا بڑا ثبوت موجود ہے کہ مودودی کے عقائد کے سلسلہ میں تو کئی لوگوں نے اس پر صحیح طور سے تنقید کی لیکن اس کی "علمیت" کو کسی نے چیلنج نہ کیا کہ اس کی کتاب "خلافت اور ملوکیت" کے طرز بیانات نے امت کو نہ صرف انتشار سے دوچار کر دیا بلکہ صحابہ کرامؓ کی شان کے سلسلہ میں شکوک پیدا کر دیے۔ ان کی کتاب "جہاد فی الاسلام" اسلام کے ساتھ بہت بڑا مذاق ہے کہ اس نے دفاع کے لئے "مصلحانہ" اور "مدافعانہ" تلمیحات استعمال کر کے جگ ہنسائی کرائی کہ دفاع میں مصلحت کوئی نہیں ہوتی ہے' یہ ضرورت ہوتی ہے۔ اور دفاع کو صرف مدافعانہ بنانے کا مطلب ہے کہ "آ بیل مجھے مار" دفاع کو ہمیشہ "جارحانہ" ہونا چاہیئے۔ اور مودودی کی اس ساری کتاب میں جہاد کے نظریاتی پہلو۔ یا تقاضوں پر ایک لفظ بھی نہیں جو اس فلسفہ کی بنیادی ضرورتیں ہیں کہ مودودی نے تو تلوار سے نفرت پیدا کی حالانکہ جہاد طرز زندگی ہے کہ بچے بچے کے ہاتھ میں تلوار ہو۔ اور پھر جہاد کشمیر کے سلسلہ میں فتوٰی کہ ہمیں تین گروہوں میں بانٹ دیا اور ہم پاکستانیوں کے لئے جہاد کشمیر میں شمولیت کو ناجائز قرار دیا۔ قبائلیوں کو مشروط اجازت دی اور کشمیریوں کو وطن کی حفاظت کیلئے جہاد کی اجازت دی۔ توبہ میرے اللہ مودودی نے سورہ الانعام کی آیت مبارکہ 159 اور سورۃ النساء کی آیت مبارکہ 75 کی خلاف ورزی کی اور دیوبندی حسین احمد کی طرح وطنیت کو "قوم" کی بنیاد بنا دیا اور مودودی کی

تفہیم تو تفہیم برائے تفہیم ہے۔ وہ اسلامی فلسفہ حیات سے نابلد معلوم ہوتا ہے کہ اس کا استاد نیاز فتح پوری سرسید کی طرح ''نیچریہ'' تو ضرور تھا۔ کچھ لوگوں کے حساب سے ''دہریہ'' تھا۔ مودودی جنگ بدر جیسی جنگ کو ''بھڑوں کے چھتے میں پتھر مارنا'' قرار دیتا ہے اور قرآن پاک سورہ آل عمران کی آیت مبارکہ 127 میں دشمن کی ذلالت اور نامرادی کو رد کر کے جنگ احد کو مسلمانوں کی شکست قرار دیتا ہے۔ (توبہ میرے اللہ) مجھے اس کے ان خرافات کو رد کرنے کے لئے ایک کتاب لکھنا پڑ گئی اور اب پوری تفسیر بھی لکھ دی۔ مودودی کے حواریوں میں کبھی کوئی سکالر نظر نہ آیا بلکہ یہ ناکام مذہبی لوگوں کے لئے ''پناہ گاہ'' تھی جیسے ملک غلام علی اور رحمت الٰہی بھی ہمارے ساتھ فوج میں تھے۔ ان کو افسری نہ ملی اور نائکی/ حوالداری تک پہنچ سکے۔ تو بعد میں جماعت اسلامی میں ''پناہ'' لے لی اور یہ عاجز مودودی کے ہر ''حواری'' کو جانتا ہے تو مودودی نے قادیانیوں کے خلاف یہ مسودہ شہرت حاصل کرنے کے لئے تیار کیا کہ جماعت اسلامی نے تنظیم کے طور پر تحریک میں بھرپور شرکت نہ کی۔ بلکہ تحفظ ختم نبوت اور دیوبند مکتب فکر سے بھی تنظیم کے طور پر بہت کم اداروں نے شرکت کی۔ جن عام لوگوں نے زیادہ شرکت کی ان میں زیادہ بریلوی مکتب فکر کے لوگ تھے اور عبدالستار نیازی نے ان کی قیادت کی۔ عبدالستار نیازی کا اسلام کا علم تو واجب سا سکول ٹیچر کی سطح کا تھا۔ عبدالستار اپنی سیاست کی ''یتیمی'' کو ختم کرنے کے لئے کر رہا تھا یا عقیدتاً وہ اس تحریک میں تن من سے شریک تھا۔ حتمی رائے نہیں دی جاسکتی۔ دونوں باتیں ہوسکتی ہیں۔ لیکن نیازی نے مقابلہ مردانہ وار کیا اور مرنے کے لئے تیار تھا۔

تحریک خوب زور شور سے چلی اور لاہور انتظامیہ کو ایک دفعہ تو ہلا کر رکھ دیا کہ فوج کی مدد مانگنا پڑی۔ اور جہاں ذرا شک پڑا گولی چلانے کی اجازت تھی۔ تو غلام کذاب کے پوتے کرنل داؤد نے فرقان پلٹن کے قادیانی تیار رکھے ہوئے تھے جن کے پاس فوجی وردی بھی تھی اور اس پلٹن کے کشمیر کے جہاد میں ''ڈرامائی'' طور پر شرکت کی کہانی بیان ہو چکی ہے۔ اس طرح ہزاروں لوگ شہید ہو گئے کہ یہ تو کافی بعد معلوم ہوا کہ کرنل داؤد سرکاری جیپوں پر ایسے لوگوں کو بٹھا کر وہاں بھیج دیتے جہاں احتجاجی اکٹھے ہو رہے ہوتے۔ اور ان کو گولیوں سے بھون دیتے۔ لوگ سمجھتے کہ فوج یا پولیس نے ایسا کیا ہے۔ بہرحال پولیس نے بھی خوب گولیاں چلائیں۔ اور جگہ جگہ قادیانی افسروں نے اور ان کے پروردوں نے وہ تباہی مچائی کہ لوگوں کے سر سے قادیانی مخالفت کا کیڑا نکال دیا جائے۔ اس سلسلہ میں 1986 میں رائے محمد کمال کی کتاب ''قادیانی امت'' شائع ہوئی جس میں معتبر ذرائع سے دس ہزار نہتوں کے شہید ہونے کے ثبوت ہیں۔ لیکن کوئی ثبوت نہ تھا کہ کس نے کس وقت کیا کچھ کیا۔ اور کافی باتیں مارشل لا لگنے کے بعد پتہ چلیں کہ دو بریگیڈوں کے کمانڈر جنرل حق نواز اور جنرل فضل مقیم تھے جو اس وقت بریگیڈیئر تھے اور اسلامی ذہن رکھتے تھے لیکن وہ بھی سازش کے پہلو کو نہ سمجھ سکے۔ البتہ راقم کو کچھ ''مہک'' لگی تو میں نے کرنل خوشی محمد کو جا کر آگاہ کیا تو اس نے جنرل حیاء الدین قادیانی کے مسجد میں اکٹھے لوگوں پر فائر کرنے کے حکم کو ماننے سے انکار کر دیا تو ظاہر ہے کہ قادیانی یا ان کی لیڈر شپ ''آگاہ'' تھی اور ''تیار'' تھی کہ اس کے بعد لوگوں نے بیس سال تک قادیانیوں کے خلاف مُنہ سے لفظ نہ نکالا اور ظفراللہ بھی وزارت خارجہ کی گدی پر برقرار رہا تو اینٹی قادیانی تحریک سے قادیانیوں نے بھی فائدہ اٹھالیا۔

تحریک کے نتائج، غریب مسلمانوں کے خلاف تھے کہ بے گناہ مارے گئے۔ یا دولتانہ کو نہ صرف وزارت اعلیٰ سے ہاتھ دھونا پڑا بلکہ سیاست کا یہ فصلی بٹیرہ سیاسی یتیم بن گیا۔ اس کے بعد صرف چند ماہ کے لئے مرکزی وزیر بن سکا۔ باقی عرصہ ''سیاست بازی'' نے اسے کچھ نہ دیا اور آخر ذوالفقار بھٹو کو ''درخواست'' دے کر چند دن لندن میں سفارت کا کام کیا اور اللہ تعالیٰ کے نام پر بنائے ہوئے ملک میں کافرانہ سیاست کا ہر کھلاڑی، عبرتناک انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے ایک تلمیح گھڑ لی ہے کہ سیاست میں کوئی آخری لفظ نہیں ہوتا۔ یعنی بے اصولی، بددیانتی اور بے وفائی کی اجازت ہوتی ہے۔ اور وعدہ بھی توڑا جا سکتا ہے۔ اسلام چونکہ ایسی اجازت نہیں دیتا تو یہ کافرانہ سیاست بھی اس ملک میں کبھی نہیں چل سکی اور آج کل جو تماشے ہو رہے ہیں۔ وہ قوم کے سامنے ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور میں مارشل لا بھی لگ گیا اور فوج نے مارشل لا لگانے یا حکومت کرنے کی ''تربیت'' حاصل کر لی تو بقول میر علی احمد تالپور جس کے بیانات سے ان مضامین کی بسم اللہ کی تھی۔ اس نے نومبر 1954 سے فوج کو ملک کی ایک بڑی سیاسی پارٹی کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور ''سلطانی پارٹی'' کی تلمیح کا بانی تھا جس کو آج کل ''کنگز پارٹی'' کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مارشل لاء نے مودودی اور عبدالستار نیازی کو پھانسی کی سزا سنائی۔ جس پر ذرا بھر بھی عمل نہ ہوا کہ سزا کو ''عمر قید'' یا تھوڑی سزا میں تبدیل کر دیا گیا تو جنہوں نے ان کو ''مہرے'' کے طور پر استعمال کیا تھا۔ انہوں نے ''سفارش'' کر کے ان کی خلاصی بھی کرا لی لیکن نظریاتی طور پر بڑا المیہ منیر انکوائری'' ہے۔ جسٹس منیر کئی کتابوں کا مضمون ہے۔ وہ چھپا ہوا قادیانی تھا یا صرف بے دین اور اس کے باوجود وہ حد بندی میں بھی ہمارا ''نمائندہ'' تھا اور پاکستان کے عدلیہ پر وہ نہ صرف کئی سال چھایا رہا بلکہ ہمارا چیف جسٹس بھی رہا قانون ساز اسمبلی کو ختم کرنے کے عمل کے صحیح ہونے پر اسی نے ''مہر'' لگائی تھی۔ تو اس انکوائری میں جو اس نے اسلام کا مذاق اڑوایا۔ جاہل لوگوں سے پھبتیاں کسوائیں اور اسلام پسندوں کی جو ایسی تیسی کرائی تو لوگ اسلام کے نفاذ کی بات کو ہی کئی بالکل بھول ہی گئے۔ اس نے صرف مودودی کو اسلام کا عالم تسلیم کیا' جس سے اور بے دلی پھیلی کہ لوگ اس زمانے میں مودودی کی ''کم علمیوں'' سے تو آگاہ نہ تھے' جن کا اس عاجز نے ذکر کیا لیکن عقیدہ کے بارے کافی لوگ باخبر تھے۔ تو لوگ اسلام کیلئے مودودی اور اس کی جماعت کو ''وارث'' بنانے کو تیار نہ تھے۔ اور نہ ان کی معتزلہ والے عقلی اسلام کے نفاذ کے حق میں تھے۔ بہرحال یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ مودودی اور جسٹس منیر میں کوئی ''قدر مشترک'' ہے۔

صدام بُش لڑائی محض نُورا کُشتی ہے

اور قارئین اصلی بات اینگلو امریکن بلاک کے ''چھپے ہاتھ'' ہیں کہ ان کی مرضی کے بغیر ہمارے ملک میں بھی ''پتا'' نہیں ہلتا۔ صدام بھی ان کا 'آدمی' تھا اور پھر ایسے ہی ہوا کہ صدام اور اس کے ساتھی حفاظت کے تحت ''غائب'' ہو گئے اور یہ چھپے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ بہرحال ہمارے ہاں جو کچھ 1953 میں ہوا یہ اینگلو امریکن بلاک کی بھی ''ضرورت'' تھی۔ اور جو نتائج نکلے ان کے حق میں گئے۔ پنجاب کی مسلم لیگ مرکزی حکومت کے ''بادشاہ گروں'' کی ''لونڈی'' بن گئی۔ دولتانہ کے حق میں ایک ہاتھ بھی نہ اٹھا۔ مرکز کا ''چنیدہ'' فیروز خان نون آ کر پنجاب کا وزیر اعلیٰ بن گیا اور پاکستان اور مسلمانوں کے بہت زیادہ نقصان کرنے والے خضر حیات کا ''دست راست'' مظفر علی قزلباش آ کر فیروز خان کا بھی ''مشیر خاص'' بن گیا۔ یہ پنجاب کی بڑی پرانی روایات ہیں۔ ٹوانے،

سکھوں کے بھی ''دست راست'' ہوتے تھے۔ جب انگریز آئے تو ان کے ''مشیر خاص'' بن گئے اور فتح خان ٹوانہ سکھ دربار کا نوکر تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس کے کرنل لارنس اور لیفٹیننٹ ایڈورڈ سے بھی رابطے تھے کہ اکتوبر 1846 میں انگریزوں کے خط لے کر وہ' سری نگر بھی پہنچ گیا اور مسلمان گورنر کو گلاب سنگھ کے حق میں دستبردار کرانے میں کامیاب رہا۔ لیکن ایسی دوغلی پالیسیوں کی وجہ سے وہ بنوں کے نزدیک کیسے ہلاک ہوا۔ سب عبرتناک کہانیاں ہیں۔ بہرحال ان لمبے چھپے ہاتھوں نے کافی بندوبست کر رکھے تھے۔ ایک غیر معروف بنگالی محمد علی بوگرہ کو پہلے برما میں سفیر بنا کر ''سفارتی آداب'' کی تربیت دی اور پھر اس کو امریکہ میں سفیر بنا دیا گیا تھا۔ ہمارے بادشاہ گر غلام محمد سکندر مرزا، مشتاق گورمانی، عزیز برادران، اب چودھری محمد علی کو بھی اپنی ٹیم کا حصّہ بنا چکے تھے تو امریکی ''تربیت یافتہ'' محمد علی بوگرہ، ان کے لئے ناظم الدین سے بہتر ''مددگار'' یا مشیر ہو سکتا تھا کہ مکمل طور پر امریکہ کی جھولی میں گرنے کا وقت آ گیا تھا۔ بادشاہ گروں کو معلوم ہو گیا تھا کہ جس طرح ممتاز دولتانہ کو ہٹانے سے مسلم لیگیوں یا سیاست دانوں میں سے کسی ایک نے بھی آواز نہیں اٹھائی تو ناظم الدین کو دھکا دیا جا سکتا ہے اور ایسے ہی ہو گیا۔ محمد علی بوگرہ ہمارا وزیراعظم بن گیا۔

لیاقت علی قائداعظم کے سیاسی رفقاء راجہ غضنفر علی اور اسماعیل ابراہیم چندریگر وغیرہ کو سفارتی عہدوں پر بھیج کر سیاست کو اپنی ''لونڈی'' بنانے میں مشغول رہا۔ خلیق الزمان کو ''فرار ملت'' کا نام دلوایا اور حسین شہید سہروردی کو ''کتا'' کہنے سے گریز نہ کیا۔ اب ناظم الدین اور ممتاز دولتانہ سے جو کچھ کیا گیا تو باقی صرف ایک سیاست دان خان عبدالقیوم رہ گیا تھا۔ اس کو زبردستی مرکز میں وزیر بنا کر صوبہ سرحد میں اس کا استقبال کالی جھنڈیوں سے کرایا گیا جو ذکر ہو چکا ہے۔ سردار عبدالرب نشتر اور خان آف ممدوٹ جیسے شریف سیاستدانوں کی وقعت ویسے ختم کر دی تو پیچھے صرف فصلی بٹیرے رہ گئے' جن کی مثال موم کی طرح تھی جن کو کسی سانچے میں ڈھال کر ان سے کچھ بھی کرایا جا سکتا تھا۔ ملکی حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ غیر مسلم جو زرخیز زمینیں چھوڑ گئے۔ وہ ایسے لوگوں کو دے دی گئیں جو خود زمیندارہ نہ کر سکتے تھے یا ان کو زمینداری کی سوجھ بوجھ نہ تھی۔ بیل کا زمانہ ختم ہو رہا تھا اور میکانائزڈ فارمنگ کا زمانہ آ رہا تھا لیکن ٹریکٹر امپورٹ کرنے کے لئے زرمبادلہ کہاں سے لیں۔ تو یہ علاقے جو بھارت کے کئی علاقوں کو بھی گندم مہیا کرتے تھے۔ اب یہ پیداوار اپنے علاقے کی ضرورت پوری نہ کرتی تھی۔ نہ کوئی کارخانہ تھا نہ کوئی انڈسٹری۔ لوہا بھی ملک میں موجود نہ تھا۔ اور اس کا کارخانہ بہت دیر کے بعد بنایا گیا تو مشینری کون بناتا۔ فوجی سامان کی تو بری حالت تھی۔ 1961 تک رائفل کو صاف کرنے والی چندی بھارت سے آتی تھی۔ واہ میں جو ہتھیاروں کے بنانے کا کارخانہ شروع کیا وہ ''سفید ہاتھی'' ثابت ہو رہا تھا کہ برطانیہ سے پرانی مشینیں لا کر نصب کر دیں۔ کہیں سے کوئی بہتری نظر نہ آ رہی تھی۔ سنا کہ ترکوں نے جو امریکہ کی مدد کے لئے کوریا میں ایک بریگیڈ بھیجا تھا تو امریکہ نے ان کو ہتھیار دے دیئے۔ ہمیں بھی اب جھولی پھیلانی ہو گی۔ خواہ ''آئزن ھاور ڈاکٹرائن'' ہو یا ''جان فاسٹر ڈلس'' کی کمیونسٹ کے پھیلاؤ کے آگے بند باندھنے کی تجویز ہم بسر و چشم امریکہ کی گود میں جانے کو تیار تھے۔

عراق کا شاہ فیصل دوم، اس کا ماموں شہزادہ عبدالہ نے فروری 1954 میں پاکستان کا دورہ کیا لیکن اصلی آدمی اہل مغرب کا خاص الخاص اور عراق کا ''بادشاہ گر'' نوری سعید، ایوب خان کو ''پرکھنے'' آیا تھا اور ہمارے ''بادشاہ گروں'' میں سے ایک مشتاق گورمانی ساتھ تھا جس کو اخبار نویس ''نوری آف پاکستان'' کا نام دیئے ہوئے تھے۔ ایوب خان بے چارہ تو نوری سعید کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ ایوب خان کو فوج کے سربراہ کے طور پر ''پرکھا'' جا رہا تھا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ عزیز برادران کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ سب بادشاہ گروں کو چلتا کیا جا رہا تھا۔ اور 1958 سے ایوب خان اکیلے نے پاکستان میں اہل مغرب کا ''نمائندہ'' ہونا تھا۔ شاہ عراق کے جلدی بعد ترکی کے صدر جلال بایار نے بھی پاکستان کا دورہ کیا اور برطانیہ کے ساتھ، ترکی، عراق، ایران اور پاکستان کو بغداد پیکٹ میں ''باندھ'' دیا گیا جس کے اصلی کرتا دھرتا امریکہ نے مبصر کا ''لبادہ'' اوڑھا ہوا تھا۔ اور پاکستان کو مشرق بعید میں نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور فلپائن کے ساتھ امریکہ کی سربراہی میں SEATO (سیٹو) معاہدہ میں بھی شامل کر لیا گیا کہ پاکستان کی کچھ فوجی سامان سے مدد ہو گی۔ ایوب خان کو برطانیہ کے دورہ کی بھی دعوت ملی کہ ان کی جنگی مشقوں میں شرکت کرے اور ترکی کے فوجی افسروں سے انقرہ میں ملاقات کی دعوت ملی ہوئی تھی لیکن حیران کن دعوت سر آغا خان کی طرف سے تھی؛ جو جنیوا میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ایوب خان کو کہا گیا کہ پروگرام ایسا بنانا کہ برطانیہ سے ترکی جاتے ایک دو روز ''میرے پاس'' قیام کرنا ایوب کے ان دوروں اور آغا خان سے ملاقات کے بارے میں ہمارے اخباروں میں کبھی کچھ زیادہ شائع نہ ہوا۔ لیکن ایوب خان اپنے ''نزدیکی'' افسروں کے ساتھ آغا خان سے ملاقات کی باتیں اکثر زیر بحث لاتا رہتا تھا۔

آغا خان کے ساتھ ملاقات، ایوب خان کی بہت بڑی عزت افزائی تھی کہ آغا خان ہمارے ملک کے کسی سربراہ کو بھی دعوت دیتا تو وہ اس کو اپنی عزت سمجھتا۔ آغا خان نے یہ کچھ اپنی طرف سے کیا یا اہل مغرب کے اشارے پر یا دونوں باتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ یا آغا خان کو کوئی غلط فہمی تھی کہ ہر مسلمان جنرل، خالدؓ بن ولید یا ابو عبیدہؓ بن جراح بن سکتا ہے۔ کیا باتیں ہوئیں ہم ان کے ایوب خان پر اثرات کی مدد سے ہی کچھ کھوج نکال سکتے ہیں۔ آغا خان بڑی لچکدار شخصیت کے مالک تھے۔ دل سے وہ اوّل بھی مسلمان اور آخر بھی مسلمان تھے اور پاکستان کے بڑے ہمدرد تھے۔ گو وہ کئی ملکوں کے ''شہری'' تھے۔ ساتھ ہی اہل تشیع کے ایک چھوٹے سے گروہ شش امامیہ کے روحانی سربراہ تھے جو ان کو ''حاضر امام'' تسلیم کرتے تھے۔ کہ وہ اثنا عشریہ اہل تشیع کی طرح ''امام غائب'' کے نظریہ میں یقین نہ رکھتے تھے۔ اور امام جعفر صادقؓ کے بعد امامت کے سلسلہ کو ان کے بیٹے اسمٰعیل کی طرف تبدیل کر دیتے ہیں لیکن آغا خان کسی گروہی تعصب سے بالا تھے۔ وہ کافی پڑھے لکھے تاریخ عالم اور تاریخ اسلام کے طالب علم تھے۔ اور اپنے زمانے کے عظیم مدبر مانے جاتے تھے۔ ان سے ملاقات کے بعد ایوب خان اپنی شخصیت کو بڑا اہم سمجھنے لگے تھے اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ انہوں نے اور پاکستانی فوج نے ملک کے معاملات میں اہم کردار ادا کرنا ہے۔ لیکن زیادہ حیران کن بات جو 1954 سے پہلے ان کی زبان سے کبھی نہ سنی گئی تھی۔ وہ یہ تھی کہ انہوں نے ترکی والوں کو کہا کہ وہ گیلی پولی کی گھٹن سے نکل کر اپنی سوچوں کو وسیع کریں۔ لیکن ایوب خان کا اس سلسلہ میں علم بڑا واجبی تھا کہ بحث کے دوران وہ کچھ آگے نہ بڑھ سکتے تھے۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی سنی سنائی

بات کو وہ اتنی اہمیت دے رہے ہیں کہ ایک دن ان کے منہ سے نکل گیا کہ آغا خان نے بھی مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں ترکی والوں کو کہوں کہ وہ گیلی پولی کو بھول جائیں اور عثمانیہ کی ماضی کی شاندار تاریخ کے پس منظر کو سمجھتے ہوئے اپنی پوزیشن کو موجودہ زمانے کے تناظر میں بہتر کریں۔

قارئین۔ یہ ایک بہت اہم معاملہ ہے اور آغا خان کی سوچ شاید اس عاجز کی تحقیق سے بھی زیادہ بلند ہو اور وہ اس سلسلہ کے ''چھپے ہاتھوں'' کی کارگرویوں یا اس میں سازش کے پہلو کے بارے اور زیادہ آگاہ ہوں کہ وہ عمر میں اور علم میں اور بیسویں صدی کی ایک عظیم شخصیت تھے۔ ہمیں ان کی اس سوچ کے ساتھ مکمل اتفاق ہے کہ گیلی پولی کی معمولی لڑائی کو ڈرامائی انداز میں اتنی بلندیاں کیوں دی جاتی ہیں اور کیا ترکوں اور عالم اسلام کو اس جنگ سے کوئی فائدہ ہوا یا نقصان کہ ہر جنگ کو اس کے نتائج اور نتائج کے اثرات کے تحت پرکھا جانا چاہیئے۔ یہ عاجز فلسفہ جنگ کا طالب علم ہے۔ کلاسوٹز کی فلسفہ جنگ کی آٹھ کتابوں کو اپنے تبصروں کے ساتھ شائع کر چکا ہوں۔ حضور پاک ﷺ اور خلفاء راشدینؓ کی عسکری حکمت عملی پر چار کتابیں بھی لکھ چکا ہوں۔ اور اسلام کی پوری عسکری تاریخ نوٹ فارمز میں تیار ہوگئی تھی لیکن میرے رفیق اور کرم فرما جنرل احسان الحق کو وقت سے پہلے ضیاء الحق کی پالیسی کے تحت فوج سے ریٹائرڈ کر دیا گیا تو یہ کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچا۔ دنیا کی ہر مشہور جنگ کا اس عاجز نے گہرا مطالعہ کیا کہ جنگیں صرف فتوحات حاصل کرنے کے لئے نہیں لڑی جاتیں۔ ڈرامے بھی ہوتے ہیں اور ''نورا کشتیاں'' بھی۔ موجودہ عراق کی جنگ کی طرف دھیان دیں۔ ہمارے فوجی مبصرین نے کیا کیا تبصرے کئے۔ کہ یہ تو ''نورا کشتی'' معلوم ہوتی ہے۔ صدام کی فوجی کمانڈ اچانک غائب ہوگئی۔ ہماری اپنی کشمیر 48-1947 اور ستمبر 65 کی جنگ کو یہ عاجز باقی لوگوں ن سوچوں سے ہٹ کر کچھ نرالے اور انوکھے اندازوں میں پیش کر چکا ہے کہ کس طرح اختر ملک اور بھٹو نے کشمیر میں گوریلا جنگ کا ڈرامہ کیا اور لاہور بھارت کے حوالے کرنا تھا اور شاستری کو کس طرح جنگ میں دھکا دیا اور کشمیر کی جنگ کو بھی یہ عاجز انگریزوں کی سازش کے طور پر پیش کر چکا ہے کہ انہوں نے خود اونچا کنٹرول بن کر متحارب گروہوں کو اس طرح لڑایا' جیسے جنگی مشقوں میں دو گروہوں کو لڑایا جاتا ہے۔ ویسے ہمارے آقا ﷺ کا بھی فرمان ہے کہ ''جنگ دھوکہ ہوتی'' ہے یا جنگ میں دھوکہ بازی کی جاتی ہے۔ تو 1971ء میں ہماری ذلت آمیز شکست کو پوری طرح سمجھنے کے لئے قارئین کے لئے یہ عملی تجزیے پیش کر رہا ہے کہ آؤ گیلی پولی کی جنگ کو بھی نتائج اور نتائج کے اثرات کے پہلوؤں کے تحت پرکھیں۔ تو جس بھنور میں عالم اسلام گھرا ہوا ہے' اس کی کافی ''گرہیں'' کھل جائیں گی۔

گیلی پولی کی معمولی لڑائی کے بعد میجر جنرل مصطفیٰ کمال سے ''شکست'' کھا جانے کی بات کو خود انگریزوں اور اتحادیوں نے وہ اوج دیا کہ وہ ایک ہیرو بن گیا اور بعد میں سمرنا میں چند یونانی دستوں کو اتار کر انہیں جو مصطفیٰ کمال کے سامنے ''فرار'' اختیار کرایا گیا تو یورپ کے ''مرد بیمار'' ترکوں کی حکومتوں کو بچانے کا سہرا بھی اس کے سر بندھ گیا۔ اور وہ ترکوں کا نہ صرف حکمران بن گیا بلکہ ''اتا ترک'' یعنی ترکوں باپ بھی بن گیا۔ اور ماڈرن ترکی کا بانی یا کیا کچھ بن گیا کہ ایک طرح سے اس کی ''پوجا'' ہو رہی ہے۔ ادھر بوسنیا کا موجودہ رہنما عالی جاہ عزت بیگ نے چند سال پہلے ایک کتاب میں یہ تاثر دیا کہ مصطفیٰ کمال نے نہ صرف اسلام کو ترکی سے ''دیس نکالا''

دیا بلکہ ترکوں کو آدھا تیتر اور آدھا بٹیر بنا کر ان کی یہ حالت کر دی ہے کہ وہ سو سال پیچھے چلے گئے ہیں اور وہ لوگ جو کبھی دنیا کی عظیم طاقت اور مانی ہوئی قوت تھے اب اوروں کے پیچھے پیچھے ہی چلیں گے اور ان کو پرانا مقام کوئی معجزہ ہی دے سکتا ہے۔ ادھر راقم کے لئے ترک اور ان کی تاریخ میری گھٹی پینے کے وقت سے آج تک میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ والد صاحب مغفور مرحوم پہلی جنگ عظیم سے پہلے موجودہ ساتویں پنجاب میں سردار تھے، جن کو ان زمانوں میں انڈین آفیسر کہا جاتا تھا۔ جنگ شروع ہوتے ہی ان کی یونٹ نے جنرل ٹاؤنشیڈ کے ماتحت بصرہ سے بغداد کی طرف ترکوں کے خلاف تیزی سے پیش قدمی شروع کر دی۔ سلمان پاک کے مقام پر جناب سلمان فارسیؓ کی قبر کی زیارت کے وقت والد صاحب کو کسی غیبی آواز نے ندامت سے دوچار کر دیا کہ ان کی جگہ تو ترک فوج میں ہونا چاہیئے تھی۔ نہ کہ انگریز کی فوج میں۔ کچھ جنگیں ہوئیں۔ لیکن اکثر مسلمان فوجی ندامت سے دوچار تھے کہ ترک جنرل خلیل پاشا نے انگریزی فوج کو گھیرے میں لے لیا اور تین ماہ کے محاصرے کے بعد انگریزی فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ ترک سب قیدیوں کے ساتھ بہت عزت سے پیش آئے اور انڈین افسروں کو بذریعہ ریل بروسہ جانا تھا کہ موصل کے مقام پر والد صاحب اور باقی مسلمان سرداروں کو غازی انور پاشا ترکی کے وزیر جنگ کی زیارت نصیب ہوئی تو رہی سہی کسر نکل گئی کہ والد صاحب نے باقی ساری زندگی ندامت میں گزاری اور صرف پین اسلام ازم (Pan-Islamism) کی بات کرتے تھے۔

غازی انور پاشا، بہت بڑے عاشق رسول ﷺ تھے۔ جنگ عظیم اول میں انور پاشا، جمیل پاشا اور رؤف بیگ خلیفہ کے بڑے وزیر تھے اور حکومت یہی لوگ چلاتے تھے۔ رؤف بیگ جلاوطنی کی حالت میں اپنی یادوں میں لکھتے ہیں کہ شریف حسین مکہ کے انگریزوں کے ساتھ سازباز سے وہ آگاہ ہو گئے تھے۔ لیکن شریف حسین نے روضہ رسول ﷺ پر جا کر اپنی وفاداری کی قسم اٹھالی تو انور پاشا نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی "کہ حضور پاک ﷺ کے اسم مبارک پر سے لاکھوں عثمانی سلطنتیں قربان کی جا سکتی ہیں۔" شریف حسین سے زیادہ غدار ہمارے اندر موجود ہیں لیکن جب تک ان کی غداری کا کوئی واضح ثبوت نہ ملے تو ہم تو ان کے خلاف بھی کارروائی کرنے کو تیار نہیں۔ رؤف بیگ مزید لکھتا ہے کہ ان کے غداروں سے انور پاشا کا مطلب مصطفیٰ کمال اور اس کا گروہ ہے جو اب ترکی کے حکمران بن بیٹھے ہیں۔ بہرحال والد صاحب نے ترکی میں برائے نام جنگی قیدی کے طور پر دو تین سال گزارے۔ سلطنت عثمانیہ زوال پذیر تھی۔ لیکن پرانی شان و شوکت اور اسلام کے ساتھ محبت کی نشانیاں کہیں کہیں نظر آ جاتی تھیں۔ والد صاحب کے رفیق خاص اور ہمارے نزدیک انگہ گاؤں کے حافظ محمد قاسم قرآن پاک کی قراۃ ایسی پیاری آواز میں کرتے تھے کہ ان کی ہمراہی میں والد صاحب کو کئی مقامات اور کئی مسجدوں میں جانے کے مواقع میسر ہوئے کہ ترک ایک غیر عرب کی زبان سے اس خوش الحانی سے قراۃ سن کر جھوم جھوم جاتے اور خلیفۃ المسلمین کی طرف سے حافظ صاحب کو تلوار اور دونوں صاحبان کو خوبصورت غلافوں میں قرآن پاک پیش کئے جن میں سے ایک حمائل شریف اسی غلاف میں میرے پاس آج بھی بہت اچھی حالت میں موجود ہے۔ قید سے رہائی کے بعد انگریزوں کو ان کے یہ "تعلقات" پسند نہ آئے اور دونوں صاحبان نے برصغیر واپس آتے ہی ریٹائر ہونے کی درخواست دے دی اور باقی زندگی توبہ و ندامت میں گزارنے کا عہد کیا کہ والد صاحب صرف

پونے دو سال زندہ رہے۔ اور میری عمر ایک ماہ تھی کہ راہِ عدم ہو گئے۔ حافظ محمد قاسم صاحب ان کی وفات کی خبر سن کر ان کی قبر پر پہنچے تو ندامت کے دو چار آنسو بہائے اور پکارا ''فتوحی خان! آپ کی ندامت جلدی سن لی گئی۔ ہمارے آقا ﷺ کے فرمان کے مطابق اس دنیا کی قید سے نجات مل گئی۔ میرے لئے بھی دعا کریں'' ایک سال بعد ان کو بھی اس قید سے نجات مل گئی اور اولاد کو منع کر گئے کہ خبردار انگریز کی نوکری نہ کرنا اور انہوں نے حکم مانا۔ البتہ پاکستان بننے کے بعد ان کے پوتے فوج میں شامل ہوئے اور کرنل کے عہدوں سے ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ ہمارے والد بزرگوار اگر زندہ رہتے تو ہمیں انگریز کی بندوق اٹھانے کی ہرگز اجازت نہ دیتے۔ لیکن اور بھی کوئی کام نظر نہ آیا اور یہ عاجز ''کرایہ کا سپاہی'' رہا۔ جس سلسلہ میں اب بھی ندامت کی وجہ سے توبہ و ندامت میری زندگی کا حصہ بن گئی ہے۔

تو میری پرورش والد بزرگوار کے ان رویہ کی یادوں میں ہوئی اور میری والدہ اور میری بڑی بہن نے پنگوڑے میں مجھے حضور پاک ﷺ کی غلامی اور اسلام کی لوری دی۔ والد صاحب کے رفقاء سے ترکوں کی کہانیاں سننے میں مجھے بڑا سکون آتا تھا اور جب خود کچھ پڑھنے کے قابل ہوا تو سلطنت عثمانیہ کی تاریخ کو پڑھنے کی وجہ سے یہ عاجز تاریخ عالم یا تاریخ اسلام یا عسکری تاریخ کا طالب علم بن گیا۔ لیکن والد صاحب کے رفقاء نے نہ کبھی مصطفیٰ کمال کا ذکر کیا نہ گیلی پولی کی جنگ کا لیکن ہمارے بچپن میں اور پاکستان بننے تک ہمیں ترکی کے حالات کی واقفیت نہ ہو سکی اور ''کمال ترکی'' کو ہم ''غازی مصطفیٰ کمال پاشا'' کے طور پر جانتے تھے کہ وہ غازی انور پاشا کا صحیح جانشین بنا اور بعد میں عصمت انونو ان کا جانشین ہے اور ایک دفعہ یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ غازی انور پاشا زندہ ہے اور فقیر اے پی کا نام اپنا کر انگریزوں کے خلاف برسرپیکار ہے۔ یہ 1952 کی بات ہے کہ گولڑہ شریف کے سجادہ نشین بابو صاحب محی الدین اپنے چند رفقا اور قوالوں کے ساتھ ترکی گئے اور ہمیں معلوم ہوا کہ ترکی میں جو جلال بیار اور عدنان مندریس کی حکومت آئی ہے انہوں نے کمال ترکی کی لگائی ہوئی پابندیاں کچھ ختم کر دی ہیں اور قونیہ میں مولانا روم کے مزار کو کھول دیا ہے اور بابو صاحب کو اجازت مل گئی ہے کہ وہ اس مزار کی زیارت بھی کریں گے اور وہاں قوالی بھی کرائیں گے اور بابو صاحب جب واپس آئے تو ان کے رفقاء سے جو ہم نے کہانیاں سنیں کہ پہلے کس طرح ترکی سے اسلام کو دیس نکالا دے دیا گیا تھا تو ہمیں اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ بابو صاحب خود تو بڑے محتاط تھے۔ ہمیں بتایا کہ وہاں کی حکومت اسلامی اقدار پر کافی پابندی لگائے ہوئے تھی اب حالات کچھ بہتر ہو رہے ہیں۔

ایوب خان جب 1954 میں انقرہ گیا تو وہاں صرف فوجی افسروں کے ساتھ اس نے کچھ باتیں کیں۔ اور صدر جلال بیادر اور وزیراعظم عدنان مندریس کے پاس رسمی سلام کے لئے حاضر ہوا۔ فوج میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی کہ ایوب خان نے اس سلسلہ میں ہمیں کچھ نہ بتایا۔ البتہ ایک فوٹو ہمیں دیا کہ ہم فوجی اخبار ہلال میں شائع کریں۔ جہاں ایوب خان ترکی کے فوجی سربراہ کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا اور ترجمانی کا کام نوجوان کیپٹن علی انور کر رہا تھا جو غازی انور پاشا کا بیٹا تھا۔ اس عاجز نے اس فوٹو کی بے شمار کاپیاں بنا کر غازی انور پاشا کے پورے تعارف سے یہ فوٹو ملک کی ساری اخباروں کو جاری کر دیا اور اکثر اخباروں اور رسالوں نے اس فوٹو کو بڑی پذیرائی دی اور ساتھ عدنان مندریس کے برسراقتدار آنے اور ترکی میں اسلام کے واپس آنے کا ذکر کیا کہ انور پاشا

کے خاندان کے لوگ ملک سے جلا وطن تھے۔ لیکن اب واپس آ گئے ہیں۔ چند ماہ بعد نومبر 1954 میں پاکستان میں ایک بہت بڑی جنگی مشق ہو رہی تھی جس میں ترکی کے ایک وفد نے آنا تھا۔ جس میں ہم نے کیپٹن علی انور کا نام پڑھا تو بہت خوش ہوئے کہ ان کے ساتھ ملاقات ہو گی کہ وفد نے پاکستان کی چھاؤنیوں اور ضلع جہلم اور ضلع اٹک کے علاقوں میں کئی دن جنگی مشق دیکھنا تھی۔

یہ عاجز اور میجر ابن الحسن ان وفدوں کی آمد کو پبلسٹی دینے کے لئے کراچی پہنچ گئے لیکن وہاں دیکھا کہ کیپٹن علی انور کی بجائے ایک چالیس سالہ کیپٹن ازگنش مترجم کے طور پر آیا تو اس عاجز نے بڑی معذرانہ اور مصالحانہ رویہ اختیار کر کے ان سے اس تبدیلی کی وجہ پوچھی تو وہ مدبر قسم کا کیپٹن مسکرا دیا اور کہنے لگا معلوم ہوتا ہے کہ آپ غازی انور پاشا کے مداحوں میں سے ہیں۔ اسی ڈر کی وجہ سے ہماری فوجی قیادت نے ان کو آخری وقت روک لیا کہ پاکستانی لوگ اس وفد کے سربراہ جنرل نورالدین کی بجائے کیپٹن علی انور کو زیادہ اہمیّت دیں گے اس کے بعد کیپٹن ازگنش اور اس راقم کے درمیان جو محبت اور رشتہ عود کر آیا' میری قلم اس کو بیان نہیں کر سکتی اور ہم ہر وقت ''تنہائی'' کی تلاش میں ہوتے تھے کہ باتیں کریں۔ آخر کلر کہار کے فوجی کیمپ نے مشقوں کے دوران یہ مواقع فراہم کر دیا کہ رات کے ڈنر کے خاتمے کے بعد اور عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد ہم دونوں اکٹھے بیٹھ جاتے تھے اور جو باتیں ہمارے درمیان ہوئیں' وہ ایک کتاب کا مضمون ہیں۔ چند خاص باتوں کا اختصار آگے آ رہا ہے لیکن اب تو ترکی کے اخباروں میں کمال ترکی کے بارے میں پچھلے تیس سالوں میں بہت کچھ شائع ہو رہا ہے کہ اس کا تعلّق یہودیوں کے باطنی سازشی فرقہ کی شبیطائی شاخ سے ہے اور وہ بھی اس یہودی کی اولاد ہے جس نے 1666 میں پہلے مسیحا بننے کا دعویٰ کیا اور بعد میں مسلمان کا لبادہ اوڑھ لیا اور عزیز محمد آفندی کہلاتا تھا۔ ان یہودیوں کا تعلّق سالونیکا کے علاقے کے ساتھ تھا اور فری میسن تحریک بھی وہاں سے شروع ہوئی۔ وزیراعظم عدنان مندریس کو پھانسی کی سزا دلوانے والا رحمد امنی پلمان یعقوبی بھی دراصل شبیطائی یہودی تھا۔ اور موجودہ حکومت سے پہلے وزیراعظم بلند اجویت کی بیوی اور اس کا وزیر خارجہ دونوں کا تعلّق اس شبیطائی یہودی گروہ سے تھا۔

1954 میں البتہ کیپٹن ازگنش نے بھی مجھے بہت کچھ بتایا کہ ان کے والد غازی انور پاشا اور رؤف بیگ کے خاص رفقاء اور عملی مسلمان تھے تو انور پاشا اور رؤف بیگ کے خاندان کے ساتھ ان کے خاندان کو بھی ''دیس نکالا'' ملا تھا اور وہ فرانس چلے گئے تھے اور ان کو عربی، فرانسیسی، انگریزی کئی زبانوں پر عبور تھا۔ ترکی زبان کے سکالر بھی تھے۔ ان کے والد 1930 کے قریب وفات پا گئے تھے اور ان کو بہت کچھ بتا گئے تھے کہ انور پاشا کو مصطفیٰ کمال پر شک تھا تو اس کو جنگ کے دوران کسی محاذ پر بھیجنے کے بجائے پچھلے علاقوں کے حِفظ ماتقدم کے طور پر دفاع کے لئے چھوڑا تھا کہ انگریزوں نے سمندر کے راستے مصطفیٰ کمال کی ذمہ داری یہ کچھ کے علاقے گیلی پولی میں ایک حملہ کر کے جلدی فرار اختیار کر لیا۔ جو ''ڈرامہ'' معلوم ہوتا تھا۔ یہ کچھ سن کر راقم کو یاد آیا کہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے انگریز جو ہمیں عسکری تاریخ پڑھاتے تھے' اس میں کہتے تھے کہ مورچوں کو ایک نالی سے ملا کر فرار کے وقت ان میں پانی چھوڑ دیا تھا اور ہر مورچے پر رائفل کی بیرل میں ایک روانڈ ڈالا ہوا تھا کہ ٹریگر کے ساتھ

دودھ کا خالی ڈبا باندھا گیا تھا اور جب یہ ڈبہ پانی سے بھر جاتا تھا تو اس کے وزن سے ٹریگر خود بخود دب جاتا تھا اور گولی چل پڑتی تھی تاکہ ترکوں کو معلوم ہو کہ فوج وہاں موجود ہے لیکن وہاں کامیابی ممکن نہ تھی تو فوج پسپا ہو چکی تھی۔ پانی کیسے ہر مورچے میں پہنچ گیا اور اس کی رفتار کتنی تھی اور پانی کے بہاؤ سے کئی جگہیں اونچی نیچی کیوں نہ ہو گئیں۔ اور رائفلیں لڑھک کیوں نہ گئیں، یہ سب زبانی لیپا پوتی اور ڈرامے تھے کہ کیپٹن ازگنش نے مزید بتایا کہ مصطفیٰ کمال اس کے بعد سمرنا کے علاقے میں آ گیا اور وہاں سے جمیل پاشا کو جو کمک جانا تھی' اس کو روک لیا کہ وہاں یونانی حملہ کر رہے ہیں تو جمیل پاشا شام و فلسطین میں انگریز جنرل البنھی کی پیش قدمی کو نہ روک سکا۔ شام پر اتحادیوں کے قبضہ سے عراق میں جنرل خلیل پاشا کی فتوحات رائیگاں گئیں کہ اس کے عقب میں دشمن پہنچ رہا تھا تو اس کو بھی اناطولیہ میں پسپا ہونا پڑا تو ترکوں کی شکست کا ذمہ دار یہی مصطفیٰ کمال تھا لیکن سمرنا کے مقام پر یونانیوں کے حملے کے ڈرامہ اور پھر فرار کے بعد مصطفیٰ کمال ترکوں کا ہیرو بن گیا۔ اور آہستہ آہستہ حکومت پر براجمان ہو گیا لیکن زیادہ اہم باتیں وہ ہیں کہ اس نے نہ صرف خلافت کو ختم کیا۔ جس طرح اس نے پوری قوم کو بے دین بنا دیا کیپٹن ازگنش اپنی بے بسی پر لہو کے آنسو بہاتا تھا اور فوج پر ایسا کنٹرول کر گیا جو نہ صرف اس وقت بلکہ اب تک جاری ہے اور کیپٹن ازگنش نے مجھے بتایا کہ ان کو عدنان مندریس اسی وجہ سے ترکی میں واپس لایا اور اس عمر میں کمیشن دیا۔ یا علی انور کو فوج میں کمیشن دلایا کہ عدنان مندریس چاہتا ہے کہ اسلامی خیال کے لوگ فوج پر کچھ اثرات کریں۔ لیکن فوج بہت زیادہ بے دین ہے۔ وہ عدنان مندریس کو زیادہ دیر نہ چلنے دیں گے اور اس کے فوج والے مجھے اور کیپٹن علی انور جیسے لوگوں کو بھی فوج سے نکال دیں گے۔

قارئین! یہ بہت وسیع مضامین ہیں اور کیپٹن ازگنش نے مجھے کہا تھا کہ میں یہ باتیں تو لوگوں کو بتا سکتا ہوں اور شائع بھی کر سکتا ہوں لیکن میں ان کے نام کا حوالہ آئندہ دس' پندرہ سال تک نہ دوں۔ بعد میں ان کا حوالہ دے سکتا ہوں اور یہ عاجز اس سلسلہ میں یا یہودیوں کی سازشوں کے تانے بانے ملا کر بہت کچھ لکھنا چاہتا ہے لیکن افسوس ہماری قوم پر کہ جنرل مشرف سمیت کئی لوگ کمال ترکی سے اب بھی بہت متاثر ہیں۔ یہ عاجز بار بار مومن کی فراست کے حامل ہونے کی ضرورت پر زور دے رہا ہے کہ ہم اپنے اندر سے ان لوگوں کو پہچانیں جو اول اور آخر مسلمان نہیں یا بینظیر کی طرح کھلم کھلا نہ صرف اسلامی اقدار بلکہ اسلامی قوانین اور حدود کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کے نام پر بنائے ہوئے ملک میں ایک پارٹی کے سربراہ ہیں۔ کمال ترکی کی پیروی کرنے والوں میں سے بلند ایجوت کی پاکستان کی بجائے بھارت کے ساتھ دوستی کی بات اب سمجھ آ سکتی ہے کہ وہ برائے نام مسلمان تھا۔ عراق کے صدر صدام یا اس سے پہلے جمال عبدالناصر جو بھارت کو پاکستان پر ترجیح دیتے تھے وہ مسلمان کم اور عرب زیادہ تھے۔ بلکہ جمال عبدالناصر تو اپنے آپ کو فرعون کی قوم سے ہونے پر فخر کرتا تھا۔ یاسر عرفات بھی بھارت کا یار ہے کہ وہ بھی پہلے عرب ہے اور بعد میں کچھ اور ہے۔ اب جو لوگ مسلمان ملکوں کے متحدہ دفاع کی بات کرتے ہیں۔ اب جن ملکوں کے سربراہ ایسے ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے کہ اول مسلمان نہیں۔ علامہ اقبال میں مومن کی فراست تھی تو ہمیں بتا گیا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ امیدیں وابستہ نہ کرو۔

''نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روح، شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی''

نومبر 1954ء میں جس جنگی مشق کا ذکر کیا ہے کہ اس میں ترکی کا وفد آیا تھا۔ اس مشق میں انگریزوں کا فیلڈ مارشل لارڈ ہارڈنگ' امریکی جنرل کے ماتحت ایک بہت بڑا وفد۔ آسٹریلیا سے ایک میجر جنرل' عراق سے ایک فوجی وفد اور سیلون کا فوجی وفد بھی شریک ہوئے تھے کہ امریکہ کے فوجی وفد نے امریکہ والوں کو صحیح رپورٹ دی کہ سپہ گری کے لحاظ سے پاکستانی فوجی اچھے اور ماڈرن ہتھیاروں کے استعمال کرنے کے قابل ہیں تو تب امریکہ نے ہمیں فوجی امداد دینا شروع کی۔ یہ جنگی مشق ایک اچھی کوشش تھی کہ ایوب خان نے بھی کچھ فن سپہ گری کو سیکھا اور اس کے ماتحت جنرلوں' بریگیڈئروں پر بھی اونچی سطح کے کچھ جنگی تقاضے عملی طور پر واضح ہو گئے۔ لیکن ایک دو غلط اسباق نکالے گئے کہ بے شک ٹینک اور بکتر بند دستے جنگ کے فیصلہ کن ہتھیار ہیں اور حرکت کے ساتھ جتنی زیادہ تباہی مچائی جا سکے اسی سے فتوحات حاصل ہوتی ہیں لیکن ہمیں زیادہ بھروسہ ان ذرائع پر کرنے کی ضرورت تھی جو ہمارے پاس میسر تھے یعنی نفری اور ان میں مومن والا جذبہ۔ بھاری ہتھیاروں کو انعام خداوندی سمجھ کر بہت کفایت شعاری سے ضرور استعمال کرتے کہ ملک میں کوئی انڈسٹری نہ تھی اور صرف دو فوجی ورکشاپیں تھیں۔ جو ان بھاری ہتھیاروں کو کچھ مرمت کر سکتی تھیں بلکہ پوری طرح ان کو ''اوورہال'' بھی نہ کر سکتی تھیں۔ دوسرا غلط سبق یہ نکالا کہ خشک علاقوں میں ٹینکوں کی حرکت کے سلسلہ میں یہ نہ سوچا کہ ہماری سرحدوں کی نہری زمین اور کھالے یا نہروں کا پانی بھی ہے۔ جس طرح ٹینکوں نے چکوال اور تلہ گنگ کے علاقوں میں حرکت کی ہے پنجاب میں ایسی حرکت نہ ہو سکے گی اور بعد میں صاحبزادہ یعقوب خان کے پہلے بکتر بند دستے کی 62-1961ء میں ایسی مشق پنجاب میں کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ پنجاب کی زمین میں حرکت محدود ہو جاتی ہے لیکن افسوس کوئی سبق نہ سیکھا اور یہ عاجز ستمبر 65ء کی جنگ میں اپنی ناکامیوں میں کم نفری اور بکتر بند دستوں کے کھیم کرن سے آگے رک جانے کے پہلوؤں کی خوب طور سے وضاحت کر چکا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ بعض دفعہ زبانی تسلیم تو کر لیا جاتا ہے کہ ہاں یہ غلطی تھی لیکن عملی طور پر اس کو درست کرنے میں سستی کر لی جاتی ہے۔

اختر ملک اور بھٹو نے کشمیر میں گوریلا جنگ کا ڈرامہ کیا

جہاں تک مومن کے جذبہ اور اسلامی طرز جنگ کا تعلق ہے اس سلسلہ میں بھی فوج میں آوازیں اٹھتی رہیں اور ایک دفعہ ایوب خان نے کرنل کے اوپر عہدہ والوں کو کہا بھی سہی کہ وہ سفارشات کریں۔ بریگیڈئر گلزار احمد اور کرنل شیر محمد وغیرہ نے اس سلسلہ میں بڑی اچھی سفارشات بھیجیں لیکن جس ادارہ نے ان کاغذات کی چھان بین کرنا تھی اس کا سربراہ ایک قادیانی کرنل صفدر بیگ تھا اور قادیانی جہاد کا نام نہیں سننا چاہتے یا جہاد کے ساتھ فراڈ کرتے ہیں کہ یہ نظریہ بدنام ہو۔ اس لئے یہ کاغذات ردی کی ٹوکری میں چلے گئے دراصل المیہ یہ ہے کہ جہاد کے نظریہ اور تقاضوں پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ مسلمان عملی جہاد میں تو مصروف رہے لیکن لکھنے والے یا علماء عملی طور پر فن سپہ گری سے دور رہے اور پھر اس خطہ میں تو انگریزوں نے سرسید اور غلام کذاب دونوں سے جہاد کی

مخالفت کرائی۔ سیالکوٹ کے ایک مولوی چراغ علی سے جہاد کو جدوجہد کا نام دِلا کر جنگ کو اس سے خارج کرا دیا اور اس کو نظام حیدر آباد سے ''بہادر یار جنگ'' کا خطاب دلوایا۔ جس کے لئے بہتر خطاب ''فرار جنگ'' تھا۔ (غلطی سے اس کو مسلم لیگ کے عظیم رہنما بہادر جنگ نہ سمجھ لینا) علاوہ ازیں مودودی کی کتاب ''جہاد فی الاسلام'' پر پہلے تبصرہ ہو چکا ہے کہ اسلام کے ساتھ بہت بڑا ''مذاق'' ہے۔ مولانا شبلی بھی اپنی سیرت کی کتاب میں جہاد کو ''بظاہر ایک ظالمانہ عمل لکھ گئے'' اور اس یا انگریزوں کے ساتھ وفاداری کی وجہ سے ان پر کفر کے فتوے بھی لگ گئے تھے۔ سید سلیمان ندوی اپنی سات سیرت کی کتابوں میں نظریہ جہاد کو کل ''چار صفحے'' دیتے ہیں اور ستمبر 65ء تک یہ عاجز جہاد کو صرف ایک جذبہ کے طور پر سمجھتا تھا کہ کسی بھی طریقہ جنگ میں جذبہ ایمانی پیدا کر دیا جائے تو مقصد حل ہو جائے گا اور اپنے ماتحتوں میں اس جذبہ کو اجاگر رکھا کہ انہوں نے عظیم قربانی دے کر لاہور کو بچا لیا لیکن یہ بات بھی عام نہ تھی اس ہی جنگ کے بعد البتہ بریگیڈئر گلزار احمد اور کرنل شیر محمد وغیرہ نے جہاد کے تقاضوں، قرآن پاک کے میدان جنگ کے اصولوں، جہاد کی تنظیم اور پوری قوم کے حزب اللہ ہونے پر ایک کتاب اور کئی مضامین لکھے اور اس عاجز نے اب تو اس سلسلہ میں درجن بھر کتابیں لکھ دی ہیں کہ جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنانا پڑتا ہے لیکن قوم نے یا ہماری فوج نے اس سلسلہ میں کوئی عملی کارروائی نہیں کی۔

نومبر 1954ء کی اس جنگی مشق، جس کا نام ''ہنڈی کیپ'' تھا کے لئے میجر ابن الحسن اور راقم نے بہت کوشش کی کہ اخبار نویسوں کو بھی یہ مشقیں دکھائی جائیں اور وہ جنگ کے معاملات کو سمجھیں اور اس جنگ کی دوطرفہ مصنوعی لڑائی اور متحارب گروہوں کی کارروائیوں کو اپنے اخباروں میں جنگی مبصر کے طور پر خبریں دیں اور شائع کریں۔ جنرل ایوب خان اور جنرل حیاء الدین اس پر راضی ہو گئے لیکن جنرل ناصر علی نے ہمارے ڈائریکٹر مقبول حسین کی مدد سے ہماری سوچوں پر ''پانی پھیر'' دیا کہ وہ نہ چاہتا تھا کہ اس سے جونیئر جنرل جو ان مشقوں کے کرتا دھرتا تھے ان کا نام ہو۔ اس مشق میں تقریباً تین پیدل ڈویژن اور ایک بکتر بند بریگیڈ شریک ہوئے تھے اور دو ڈویژن کے افسروں نے ریفری اور امپائروں کا کام کیا تھا۔ کچھ رضا کار دستے بھی شریک ہوئے تھے اور اس زمانے میں اپنی فوج اتنی ہی تھی۔ تینوں ڈویژنوں کے کمانڈر بریگیڈئر تھے۔ یعنی حبیب اللہ، حاجی افتخار احمد اور وصال محمد۔ بریگیڈئر حبیب اللہ کی کارکردگی بہترین رہی تھی لیکن ایک دوسرے کے ساتھ کچھ حسد بھی سامنے آیا کہ جنرل محمد یوسف کہتے تھے کہ ''حبیب اللہ کو ماتحت بڑے اچھے ملے ہیں جن میں بریگیڈئر سرفراز، بریگیڈئر محمد مظفر اور کرنل افتخار جنجوعہ کے نام لئے جاتے تھے ورنہ حبیب اللہ خود تو ڈپلومیسی اور ایوب خان کے ساتھ رشتہ کی وجہ سے گزارا کر رہے ہیں'' اوپر والوں کے ایک دوسرے کی طرف ایسے رویوں نے بھی ہمیں مسلم اخوۃ کی طرف پیش رفت نہ کرنے دی اور ہم حزب اللہ نہ بن سکے۔ راولپنڈی سازش کے مقدمہ کی وجہ سے فوج پر تو 1951ء سے ''مارشل لاء'' لگا ہوا تھا کہ کسی کو سچ اور حق بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ایسی فوجوں کا وہی حشر ہوتا ہے جس سے ہم 1971ء میں دو چار ہوئے۔ لیکن 1954ء میں کشمیر کی جنگ کے بہادری کے تمغوں کے اعلان نے رہی سہی کسر نکال دی تھی۔ پہلا ہلال جرأت ایوب خان کو ملا جس نے کشمیر کی جنگ کی کسی تجویز بنانے کی کانفرنس میں بھی شرکت نہ کی تھی۔ دوسرا حیاء الدین کو جس کے بارے پونچھ کی لڑائی کا ذکر ہو چکا ہے کہ فائر بندی کرا کے جنرل گریسی نے حیاء الدین کی

مدد سے پونچھ بھارت کے پاس رہنے دیا۔ تیسرا ہلال جرأت شیر علی کو جس نے 1948ء کی فائر بندی اور آتش بازی کے ڈرامے میں انگریز جنرلوں کی کھیل کھیلی۔ چوتھا بریگیڈئر محمد اسلم کو جس نے اوڑی کے محاذ پر کچھ اچھا کام تو کیا تھا لیکن گلگت محاذ پر کافی سستی دکھائی۔ حسن خان کے ساتھ رقابت کی اور خود تجارت میں ''مشغول'' ہو گیا تھا لیکن کشمیر کی جنگ کے لئے ایوب خان' حیاء الدین اور شیر علی کیلئے کچھ ''سفارشات'' تیار کرنا تھیں کہ ان کو کشمیر کی جنگ کا ''ہیرو'' ثابت کیا جائے۔ یہ ''بناوٹی'' بہادری کی کہانیاں بریگیڈئر اسلم نے تیار کی تھیں تو اس کو بھی ہلال جرأت مل گیا بہر حال ''لیپاپوتی'' کے لئے کیپٹن سرور' ظفر اقبال' کرنل شیر محمد' اکابر حسین' محبوب نیازی اور خورشید ربانی وغیرہ کچھ لوگوں کو صحیح طور پر بھی بہادری کے تمغے ملے لیکن کشمیر کی جنگ کے جو تین بڑے ہیرو تھے یعنی جنرل اکبر خان طارق' بریگیڈئر صدیق ستی اور کرنل حسن مرزا ان کے بارے تو یہ عاجز پوری کہانی لکھ چکا ہے کہ ان کو ''کال کوٹھڑی'' میں ڈال دیا گیا۔ جرم اور قصور الگ چیز ہے اگر وہ واقعی قصور وار تھے تو اس قصور کی سزا ملتی لیکن انہوں نے جو بہادریاں کی تھیں وہ اعزاز تو ان کا حق تھا لیکن یہاں تو یہ ظلم ہوا کہ ان کی بہادری کے کارناموں کو تاریخ کا حصّہ نہ بنانے کی پوری سازش کی لیکن حق چھپ نہیں سکتا اب اس عاجز نے کافی حق باتوں کو اجاگر کر دیا ہے ایک اور تماشا یہ بنا کہ حسد کی وجہ سے پانڈو کی لڑائی نے کمانڈر ملک شیر بہادر (بعد میں جنرل) اور خلیج کی عظیم فتح کے کمانڈر کمانڈر کرنل نوشیروان کو بھی حسد کی وجہ سے کوئی تمغہ نہ دیا لیکن بہت زیادہ زیادتی میجر حفیظ آفریدی کے ساتھ ہوئی جو پانڈو کی جنگ کا بڑا ''ہیرو'' تھا۔ جن کے بہادری کے کاغذات کسی نے گم کر دیئے لیکن پانڈو کا ایک روحانی ہیرو بلوچ پلٹن کا صوبیدار کالے خان شہید اب بھی ''زندہ'' ہے اور جہاد میں ''مصروف'' ہے کہ شہیدوں کے زندہ ہونے کو سچ ثابت کرنے کے لئے ان کی روح سینکڑوں لوگوں کے سامنے اپنی زندگی کا ''اظہار'' کر چکی ہے کہ کئی لوگوں کو خواب میں بھی ملتا ہے کہ جہاد جاری رکھو۔ نوائے وقت کا ایک کالم نویس مسٹر ضیغم کہتا ہے کہ میں نے پانڈو کی لڑائی میں میجر الحق جو بریگیڈئر اکبر کا برگیڈ میجر تھا اُس کو یہ اہمیت نہیں دی اب پانڈو کی لڑائی کے سینکڑہ سے زیادہ ''ہیرو'' ہیں اور میجر الحق کسی گنتی میں نہیں آتا۔ افسوس نوائے وقت نے میرا جواب نہ شائع کیا کہ میں نے مسٹر ضیغم کی طبیعت صاف کی تھی۔ ایوب خان کو معلوم ہو گیا تھا کہ ستمبر 65ء کی جنگ میں بہت جھوٹ بولے گئے اور جھوٹے بیانات پر لوگوں کو تمغے دیے گئے لیکن بیچارے ایوب خان کو یاد نہ آیا کہ اس ''روایت'' کی بنیاد خود ایوب خان نے باندھی تھی اسلام کا عظیم فرزند جنرل تجمل حسین اپنی کتاب میں ستمبر کی جنگ میں جھوٹے بیانات پر تمغے حاصل کرنے کا سلسلہ میں لکھتا ہے کہ جس طرح ترکی کی فوج میں بہادری کے تمغے نہیں دیئے جاتے' ہم بھی یہ سلسلہ بند کریں کہ لوگ جھوٹ نہ بولیں۔ یہ عاجز اپنے مضامین میں ایسے جھوٹے تمغوں کے سلسلہ میں جنرل سرفراز اور بریگیڈئر قیوم شبیر کا ذکر کر چکا ہے تو 1971ء کا سقوط ہونا تھا کہ حق و سچ ایک دن ظاہر ہو جاتا ہے۔

1954ء کا میرے لئے سب سے اہم واقعہ مشرقی پاکستان میں شریف نور الامین اور مسلم لیگ کی متحدہ محاذ کے ہاتھوں انتخابات میں شکست ہے اور میں اس کو ایک المیہ گردانتا ہوں کہ اس عاجز نے 1952ء میں جو پیش بینی کی تھی کہ ''بنگلہ دیش'' کی بنیاد بندھنے والی ہے وہ پوری ہو گئی اور بنگلہ دیش کی بنیاد بندھ گئی اور اب اس المیہ کو پوری طرح سمجھنے کے بعد اسلامی تاریخ کے بہت بڑے 1971ء کے سقوط ڈھاکہ کے المیہ اور نوے ہزار فوجیوں

کے ہتھیار ڈالنے کی ذلت کو ہم آسانی سے سمجھ لیں گے۔ 1954ء کے المیہ کی بہت زیادہ ذمہ داری لیاقت علی پر آتی ہے جس نے مسلم لیگ کو اپنی لونڈی بنا دیا تو وہ ہر کسی کی لونڈی بن گئی اور پاکستان کی خالق جماعت جس کو پاکستان بننے کے بعد حزب اللہ بن کر پوری قوم کو حزب اللہ بنانا چاہیئے تھا وہ 1954ء میں ایک طرح سے مٹ گئی۔ لیاقت علی نے پنجاب میں ممدوٹ اور دولتانہ میں لڑائی کرا کے پنجاب مسلم لیگ کو اپنی لونڈی بنانے کے لئے ''دولتانہ لیگ'' بنا دیا تھا جس کی وقعت ختم ہو چکی تھی کہ دولتانہ کو جب برخاست کیا تو اس کے حق میں ایک آواز نہ اٹھی۔ سندھ میں مسلم لیگ بے حساب چھوٹے چھوٹے کھوڑو گروپ' الٰہی بخش گروپ' غلام علی گروپ اور عبدالستار گروپ وغیرہ میں بٹ چکی تھی اور کراچی میں مہاجرین کی مسلم لیگ الگ ڈفلی بجا رہی تھی۔ سرحد کے شریف مسلم لیگی سردار عبدالرب نشتر تقریباً گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ لیاقت علی نے خان قیوم کے خلاف پہلے پیر صاحب مانکی شریف اور بعد میں یوسف خٹک اور ابراہیم جھگڑا کو کھڑا کر کے وہاں بھی مسلم لیگ کو اپنی لونڈی بنانا چاہا لیکن اس کو کامیابی نہ ہوئی۔

لیکن لیاقت علی کے جانشین اور ''بادشاہ گر'' خان قیوم کو مرکز میں لے آئے اور پھر سرحد میں اس کا کالی جھنڈیوں سے ''استقبال'' کرا کے سرحد کی مسلم لیگ کو اپنی ''لونڈی'' بنا چکے تھے۔ تو یہ عاجز اپنے پہلے مضامین میں گزارش کر چکا ہے کہ پشاور میں ہمیں فیلڈ مارشل آرکنلیک نے بتایا کہ مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا ہمارے ''بادشاہ گر'' بڑے خوش ہیں تو ہمیں بھی بات سمجھ آ سکتی ہے کہ وہ لوگ لیاقت علی کے اعمال کے ''ثمرات'' حاصل کر رہے ہیں۔ لیاقت علی نے قائداعظم کے باغی فضل الحق کو گلے لگا لیا اور عظیم مسلم لیگی لیڈر سہروردی کو مسلم لیگ میں آنے سے ''دھتکار'' دیا۔ سیاستدان کو سہارا چاہیئے اور سہروردی نے مجیب الرحمٰن جیسے ''شرپسندوں'' یا عطاء الرحمٰن جیسے ''باغیوں'' کے سہارے سے اپنے آپ کو ''زندہ'' کیا اور ابوحسین سرکار' حمید الحق چودھری اور مولوی فرید احمد جیسے تمام فصلی بٹیرے قسم کے سیاستدانوں نے متحدہ محاذ بنا لیا تھا' جو ایک طرف بھان متی کا کنبہ تھے تو منفی بنیادوں کا اتحاد بھی ''وقتی'' ہوتا ہے۔ انہوں نے مسلم لیگ کو تو ختم کر دیا لیکن یہ لوگ کوئی تعمیری کام کرنے کے قابل نہ تھے۔

مشرقی پاکستان میں متحدہ محاذ کی کامیابی کو جمہوریت کی فتح قرار دیا گیا۔ جیسے 1970ء میں یحیٰی خان کی ''عظمت'' کے گن گائے گئے۔ یہی بڑا المیہ ہے۔ اسلام کسی مادر پدر آزاد جمہوریت کی اجازت نہیں دیتا۔ تو اول ایوب خان نے جمہوریت کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ اپنے پرخچے اڑا بیٹھا۔ پرویز مشرف نے جمہوریت کی جڑیں نچلی سطحوں پر گاڑنے کی کوشش کی ہے اور اس پر وہ جمہوریت کا محل تعمیر کرنا چاہتا ہے لیکن وہ بھی ناکام ہوگا۔ اصلی بات یہ ہے کہ اسلام اللہ تعالٰی کی آمریت ہے۔ پہلے اس کو جاری و ساری کرنا پڑتا ہے اور سورہ آل عمران اور سورہ الشوریٰ کے مطابق مشورہ اس امر کو جاری کرنے کے طریقوں پر ہوتا ہے کہ اس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نفاذ کس طرح ہو۔ اس میں اول ترجیح اللہ تعالٰی کے حقوق کو ہوتی ہے کہ سورۃ النساء کے مطابق سب سے پہلے ''اطیعو اللہ واطیعو الرسول'' ہوں کہ اسلام اطاعت امیر اور تنظیم یا جماعت بندی کی سخت پابندی کے احکام دیتا ہے اور ایسے لوگ قوم کے رہنما نہیں بن سکتے جو قوم کو گمراہ کریں یا بے وقوف بنائیں۔ اس لئے اللہ تعالٰی کے نام پر بنائے گئے ملک میں یہ کافرانہ نظام جن میں سیاسی گروہ بندی کی بھی اجازت ہو نہ چلے ہیں اور نہ چلیں

گے۔ لیکن ہم اپنی پوری سفارشیں پوری کہانی بیان کرنے کے بعد دیں گے کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے۔ فی الحال حق اور باطل دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ حق ایک دن پورے طور پر غالب آ جائے گا۔

مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی شکست کے بعد ہمارے کٹھ پتلی وزیراعظم محمد علی بوگرہ کی وقعت بھی ختم ہوگئی تھی لیکن آئین ساز اسمبلی میں ابھی کچھ مسلم لیگی موجود تھے' جن کی مدد سے محمد علی نے اپنے ''محسن'' غلام محمد پر ایک وار کیا کہ ایسا قانون پاس کرالیا کہ آئندہ گورنر جنرل وزیراعظم کو برخاست نہ کر سکے گا اور یہ کچھ کر کے امریکہ چلا گیا۔ غلام محمد اس وقت کراچی میں نہ تھا۔ واپس آ کر اس نے باقی ''بادشاہ گروں'' وغیرہ کے لئے ہر قسم کی ''گندی'' زبان استعمال کی اور محمد علی کا ''انتظار'' کرنے لگا لیکن جس دن وہ کراچی پہنچا تو غلام محمد نے محمد علی بوگرہ اور آئین ساز اسمبلی دونوں کو برخاست کر دیا۔ بڑی منتوں سے محمد علی کو برائے نام وزیراعظم رکھا لیکن ساتھ چودھری محمد علی کے علاوہ سکندر مرزا اور ایوب خان کو بھی وزیر بنا دیا اور حکومت بیوروکریٹس کے ہاتھوں میں مکمل طور پر آ گئی اور فوج بھی عملی طور پر ملک کی ایک سیاسی پارٹی بن گئی۔ ایوب خان اپنا بری فوج کا عہدہ برقرار رکھتے ہوئے جب وزیر دفاع بن گئے اور واپس راولپنڈی پہنچے تو ان کو مبارکباد دینے کے لئے جی ایچ کیو کے بڑے افسر ہوائی اڈہ پر موجود تھے۔ دوسرے دن ایوب خان نے ہمیں خطاب کیا' جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ پاکستان کے اصلی حکمران سکندر مرزا اور ایوب خان ہیں اور عوام کی بجائے طاقت کا سرچشمہ ہم فوجی ہیں۔ اب جمہوریت کے ساتھ صرف ''فراڈ'' کیا جائے گا لیکن دو تلواریں میان میں نہیں رہ سکتیں اور بیمار غلام محمد بھی ابھی موجود تھا اور پاکستان اللہ تعالیٰ کا راز ہونے کی وجہ سے اس کی قدرت سے چل رہا تھا۔

ایوب خان کو ایوب کھوڑو کے دفتر کے باہر ایک گھنٹہ تک بیٹھنا پڑا

جسٹس منیر نے تمیز الدین کا مقدمہ خارج کر دیا کہ غلام محمد نے صحیح طور پر اسمبلی برخاست کی ہے لیکن نئی اسمبلی کے چناؤ کا مشورہ دیا جو کام 1955ء میں ہو سکا۔ نئی اسمبلی مشرقی پاکستان سے تو بالکل مختلف لوگوں کی تھی اور مغربی پاکستان میں بھی صوبے ختم کر کے ''ون یونٹ'' بنا دی گئی تھی کہ صوبائی تعصب ختم ہو اور دونوں خطوں میں ''برابری'' ہو۔ غلام محمد' سکندر مرزا' ایوب خان' چودھری محمد علی' ایوب کھوڑو' ممتاز دولتانہ' سہروردی' سب اس کے حق میں تھے اور اس کام کے لئے مشتاق گورمانی کو مغربی پاکستان کا گورنر بنانا تھا اور ڈاکٹر خان صاحب کو وزیراعلیٰ۔ جو ذکر ہم کر چکے ہیں لیکن نئی اسمبلی میں محمد علی بوگرہ کا کوئی آدمی نہ تھا تو بیوروکریٹ چودھری محمد علی وزیراعظم بن گیا اور کچھ دن بعد بوڑھے غلام محمد کو بھی گورنر جنرل ہاؤس سے ''گھسیٹ'' کر باہر نکال کر اس کو اس کی بیٹی کے گھر چھوڑ آئے اور سکندر مرزا گورنر جنرل بن گیا۔ چودھری محمد علی نے قائداعظم کے باغی فضل الحق کی مدد سے ایک آئین بنایا جس کو 1956ء میں نافذ کیا اور یہ 1956ء کا آئین کہلایا اور میر جعفر کا پوتا سکندر مرزا 26 مارچ 1956ء کو اللہ تعالیٰ کے نام پر بنائے گئے ملک کا پہلا صدر بن گیا اور اگلے دو سال اس کا طوطی بولتا رہا۔ ایوب خان ایک دفعہ تو بہت ثانوی حیثیت میں چلا گیا تھا کہ ایک آنے والی سیاسی حکومت میں محمد ایوب کھوڑو' وزیر دفاع بن گیا تھا اور ایوب خان نوکری میں اضافہ کرانا چاہتا تھا۔ ایوب کھوڑو نے کہا کہ لاہور آ کر ملنا ایوب کھوڑو جہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں

ایک گھنٹہ باہر برآمدے میں بیٹھا رہا کہ کھوڑو کے پاس اور مہمان آ گئے تھے یا یہ جان بوجھ کر ''ڈرامہ'' کیا کہ مشہور ہو گیا تھا کہ ایوب خان باہر بنچ پر بیٹھا رہا اور 1958ء کے شروع میں ایک افواہ بھی اڑائی گئی کہ ایوب خان کے بھارت کے ساتھ رابطے ہیں اور اس کو گرفتار کر لیا گیا ہے لیکن اینگلو امریکن بلاک نے ایوب خان کے حق میں فیصلہ کر لیا تھا اور ان دو سالوں میں سکندر مرزا کے ہاتھ سے رہے سہے پاکستانی سیاستدانوں کو ''تگڑم'' ناچ نچایا گیا اور آخر سکندر مرزا کا ''پتا'' بھی کٹوا دیا گیا اور ایوب خان اس ملک کا ''بے تاج'' بادشاہ بن گیا بلکہ علی محمد راشدی تو پاکستان کی بادشاہی پر ایوب خان کو خاندانی قبضہ کرنے کی تجویز پیش کرتا رہا۔

سکندر مرزا کے مارشل لاء لگانے کی ایک بڑی وجہ جہلم سے گجرات تک عبدالقیوم خان کا جلوس تھا

چودھری محمد علی 1956ء میں اپنا آئین نافذ کرنے کے بعد خود اس کا پہلا ''ہدف' بن گیا تھا۔ یہ فطرت کی ضرورت تھی کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر بنائے ہوئے ملک میں پہلا کافرانہ آئین بنانے والے اس آئین کا ایسا ''ہدف'' بنے جیسے خدائی دعویٰ کرنے والا فرعون اپنے پرورش کئے ہوئے بچے حضرت موسیٰ کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا اور 1956ء میں ہی سہروردی نے وزیراعظم کی گدی سنبھال لی۔ اگر سہروردی کو کام کرنے دیا جاتا' تو پہلی دفعہ وزیراعظم کی کرسی پر پاکستان میں ایک وزیراعظم آ کر بیٹھا تھا جو بڑا کایاں سیاستدان اور مدبر سٹیٹسمین تھا جو بھارت کے جواہر لعل نہرو کو بین الاقوامی دنیا میں چاروں شانے گرا دیتا اور ملک کو بڑا استحکام دیتا وہ نہ صرف اعلیٰ پایہ کا وکیل تھا' بلکہ تاریخ عالم کا طالب علم تھا اور بین الاقوامی امور کو خوب سمجھتا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اب ہم امریکہ کی جھولی میں گر چکے ہیں تو ان کے ساتھ فی الحال گزارا کرنا ہو گا اور ایسا اس نے کھلم کھلا ''تاثر'' دیا لیکن ہمارا اصلی دوست چین ہے اس لئے وہ جلدی جلدی چین کا چکر بھی لگا آیا۔ پنجاب اور پنجاب کے سیاستدانوں کی اہمیت کو وہ سمجھتا تھا اس لئے اپنے دوست آفتاب کی فیملی کی مدد سے ایک ریٹائرڈ پولیس افسر رمضان شاہ کو اپنا پولیٹیکل سیکرٹری بنایا کہ اس کی باتوں کا جواب دے سکے کہ کون' کون ہے۔ ''بادشاہ گروں'' میں وہ سکندر مرزا کے بارے میں جانتا تھا کہ بے اعتبار اور بے وفا آدمی ہے ''وقت'' اور ''حالات'' نے اس کو یہ مقام دے دیا ہے۔ اس کے ساتھ ''گزارا'' کرنا ہو گا۔ ایوب خان کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ اوسط درجہ کی ذہنیت کا وہ حامل ہے لیکن فوج کی سربراہی نے اس کو یہ ''بلندیاں'' عطا کر دی ہیں اور وہ سکندر مرزا کی نسبت بہتر آدمی ہے اور امریکہ والے بھی ایوب کو سکندر مرزا پر ترجیح دیں گے۔ مغربی پاکستان کو ''ون یونٹ'' بنوانے میں زیادہ ہاتھ ایوب خان کا تھا۔ اس لئے سہروردی بھی نہ صرف ''ون یونٹ'' کے حق میں تھا بلکہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں ''برابری'' کے اصول کا پیروکار تھا ورنہ آبادی کے لحاظ سے تو مشرقی پاکستان کو برتری حاصل تھی اور سہروردی نے اس برتری کو اپنے حق میں نہ استعمال کیا۔

انہی دنوں کے اندر اندر ایوب خان اور سکندر مرزا میں فضائی فوج کی سربراہی کے امیدواروں کے سلسلہ میں اختلاف چل رہا تھا۔ سکندر مرزا اپنے ہم عقیدہ ائر کموڈور رضا کے سر پر تاج رکھنا چاہتا تھا۔ امریکہ والے اس چیز کو پسند نہ کرتے تھے کہ سکندر مرزا اتنا طاقتور ہو جائے کہ ایران اور پاکستان کے درمیان کوئی کنفیڈریشن ہو جائے کہ وہ لوگ دو اسلامی طاقتوں کے درمیان کچے دھاگے والا اتحاد بھی پسند نہیں کرتے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے ایوب خان اور سہروردی کو الگ الگ ''اشارہ'' کر دیا تھا کہ فضائی فوج کی سربراہی ائر کموڈور اصغر خان کو ملنا چاہیئے۔

ایوب خان نے نومبر 1956ء میں خانکی ہیڈ ورکس کے گردونواح میں جنگی مشق کر کے اپنے ''آقاؤں'' امریکنوں کے لئے ثابت کرنا تھا کہ جو فوجی سامان وہ ہمیں دے رہے ہیں' وہ اور اس سے بہتر سامان بھی ہماری فوج استعمال کرنے کے قابل ہے تو ساتھ فضائی فوج کا ایک گروپ اصغر خان کی کمانڈ میں بری فوج کی ''سپورٹ'' میں تھا۔ خانکی کے مقام پر مہمانوں کے لئے بڑے بڑے خیمے لگا کر ''میزبانی'' کا بڑا اعلیٰ بندوبست تھا۔ امریکہ کے جنرل جارج ڈیکر کے ماتحت امریکہ کے اعلیٰ فوجی وفد کے علاوہ ترکی' برطانیہ' ایران اور انڈونیشیا کے بھی فوجی وفود کو دعوت دی گئی تھی اور صدر سکندر مرزا اور وزیراعظم سہروردی نے جنگی مشقیں دیکھیں اور امریکی جنرل جارج ڈیکر نے اصغر خان کے ہر کام کی بہت تعریف کی اور میرے سامنے ایوب خان نے اصغر خان کو فضائی فوج کا سربراہ بننے کی مبارکباد دی۔ ہر مہمان اور ''بڑے آدمیوں'' کے درمیان یہ عاجز پھرتا رہتا تھا اور یہ لوگ میری موجودگی کو اہمیت نہ دیتے تھے کہ یہ چھوٹا سا افسر ان کی باتیں نہ سمجھتا ہوگا تو یہ عاجز اتنا کچھ قوم کے سامنے پیش کر کے قوم کو باور کرانا چاہتا ہے کہ دیکھ لیں امریکہ والے ہمارے معاملہ میں کتنی گہری شمولیت حاصل کئے ہوئے ہیں۔ آگے چل کر واضح کیا جائے گا کہ یہی پس منظر تھا کہ اصغر خان نے 1958ء میں ایوب خان کو برخاست کرانے میں سکندر مرزا کی مدد نہ کی لیکن 1968ء میں جب ذوالفقار بھٹو نے ایوب خان کے خلاف تحریک شروع کی تو اصغر خان بھی ''میدان'' میں آ گیا کہ یہ امریکہ والوں کی خواہش یا ضرورت تھی۔

1956-57ء میں وزیراعظم سہروردی خاصا مستحکم ہو رہا تھا اور مکمل طور پر سکندر مرزا کی ڈگڈگی پر نہ ناچ رہا تھا کہ اصغر خان کے سلسلہ میں اس نے ایوب خان کا ساتھ دیا تھا لیکن جمہوری طور پر سہروردی کی پوزیشن بہت کمزور تھی۔ مشرقی پاکستان سے آدھے سے بھی زیادہ ممبر اس کے خلاف تھے اور وہ فضل الحق یا اور چھوٹی پارٹیوں کے وفادار تھے۔ اس کی پارٹی کے ممبر جو وفاق میں وزیر بنے تھے۔ ان کو اپنی ''بھوک'' مٹانے کا نادر موقع ہاتھ آیا تھا۔ انہوں نے ''خوب کمائی'' شروع کی ہوئی تھی۔ مغربی پاکستان میں کچھ مسلم لیگی اسماعیل ابراہیم چندریگر اور ممتاز دولتانہ کے ساتھ تھے۔ زیادہ تر ''ری پبلکن'' تھے جو سکندر مرزا کی ''جیب'' میں تھے یعنی ہر سلطانی پارٹی میں جانے کو تیار تھے۔ یہ اس سیاسی گروہ بندی اور سیاسی بددیانتی کا نتیجہ تھا' جس کی طرح لیاقت علی ڈال گیا تھا اگر ہم ''حزب اللہ'' والی سیاست کو اپناتے تو سہروردی ایک بہترین رہبر اور وزیراعظم ثابت ہوتا اور وہ بین الاقوامی طور پر پاکستان کے وقار کو بہت بلند کر دیتا لیکن سکندر مرزا نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے بغیر ملک میں کوئی اور رہنما اہمیت حاصل کر جائے اور شاید ہمارے ''آقاؤں'' اینگلو امریکن بلاک کی بھی ضرورت تھی کہ پاکستان کے سب سیاسی رہنماؤں کو تگڑم ناچ نچا کر ''ٹشو پیپر'' بنا کر پھینک دیا جائے کہ اوپر سے کوئی ایسا اشارہ ملتا ہے کہ ہمارے رہنما اچانک پالیسی تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ عاجز 1957ء میں کراچی جا رہا تھا۔ سہروردی کے پولیٹیکل سیکرٹری رمضان شاہ میرے ہم سفر تھے اور بڑے پر امید تھے کہ سہروردی اب کافی عرصہ پاکستان والوں کی صحیح رہنمائی کرے گا لیکن قوم جانتی ہے کہ سکندر مرزا نے ذرا سا اشارہ کیا اور سب لوگ سہروردی کا ساتھ چھوڑ گئے تو چند دنوں کے لئے سکندر مرزا نے وزیراعظم اسماعیل ابراہیم چندریگر کو بنا دیا۔

لیکن اب ایک ایسے وزیراعظم کی ضرورت تھی جس کو برخاست کر کے سکندر مرزا مارشل لاء لگائے اور

ملک میں کوئی چوں نہ کرے تو 1958ء میں چند ماہ حکومت کرنے کے بعد کافی لوگ چندریگر کا ساتھ بھی چھوڑ گئے اور ملک فیروز خان نون کے سر پر وزارت عظمیٰ کا تاج رکھا گیا۔ یہ صاحب کسی زمانے میں پنجاب کے وزیراعلیٰ بننے کے بڑے امیدوار رہے۔ خاص کر 46-1945ء کے انتخابات کے بعد لیکن ناکام رہے لیکن 1953ء میں ممتاز دولتانہ کو برخاست کرنے کی وجہ سے ''ضرورت'' پڑ گئی کہ ان کو پنجاب کا چند دنوں کے لئے وزیراعلیٰ بنانا پڑ گیا۔ اور اب ایک اور ''ضرورت'' نے ان کو وزیراعظم بنا دیا۔ آپ جب ولایت سے وکالت کر کے ملک میں واپس آئے تھے تو علامہ اقبال زندہ تھے۔ ان کے والد ان کو لے کر علامہ اقبال کے پاس گئے کہ جناب بڑی دولت خرچ کر کے وکالت کرائی ہے۔ وکالت بالکل نہیں چلتی اور کوئی اچھی سرکاری نوکری بھی نہیں ملتی۔ دعا بھی کریں اور کوئی سفارش بھی کریں۔ علامہ نے کہا فکر نہ کریں بہت جلدی ''وزیر'' بن جائیں گے اور چند دنوں بعد وہ پنجاب کے وزیر تعلیم بن گئے۔ لوگ علامہ اقبال کے پاس گئے کہ آپ یا تو فقیر ہیں یا ساری آپ کی سفارش چلتی ہے۔ جو کچھ فیروز خان نون کے بارے کہا وہی کچھ ہوا۔ تو علامہ اقبال ہنس پڑے کہنے لگے۔ اس میں فقیری کی کوئی بات نہیں میں نے دیکھ لیا تھا کہ بڑے آدمی کا لڑکا ہے۔ آتا جاتا کچھ نہیں تو وزیر بننا ضروری تھا اور یہ صاحب ہمارے وزیراعظم بھی بن گئے کہ اصلی بات یہ تھی کہ ایوب خان کو میدان میں لانا تھا تو میدان میں ''بونے'' لوگ چھوڑے ہوئے تھے۔ سب کام سکندر مرزا سے کرایا جا رہا تھا لیکن مارشل لا لگانے کے بعد سکندر مرزا کو خیال آیا کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھا تھا۔

تو سکندر مرزا نے بھی آخری چال کے طور پر داؤ کھیلا کہ ایوب خان کو وزیراعظم بنا دیا لیکن اس میں بڑی چال تھی کہ دراصل ایوب خان کی جگہ سکندر مرزا نے جنرل محمد موسیٰ کو بری فوج کا سربراہ بنا دیا۔ اب اعلان ہو گیا ایوب خان خاموش تھا۔ احکام تبدیل بھی نہیں کرا سکتا تھا اور سکندر مرزا بھی جلدی میں تھا۔ ایوب خان مشرقی پاکستان گیا ہوا تھا۔ سکندر مرزا نے جنرل محمد موسیٰ کو یحییٰ خان' عبدالحمید اور اپنے دوست جنرلوں کو اکٹھا کر کے کہا ایوب خان کے خلاف میری مدد کرو' میں اس کو ہٹانا چاہتا ہوں۔ محمد موسیٰ کو ایسی ہمت کیسے ہوتی کہ جنرل اعظم خان اور جنرل مسعود شیخ' ایوب خان کے وزیر بن کر اس کی ''پاکٹ'' میں جا چکے تھے اور ایوب خان کو زیادہ بھروسہ تین اعوان جنرلوں ملک حق نواز' ملک شیر بہادر اور سرفراز پر تھا اور جنرل بختیار رانا وغیرہ بلکہ جلد جنرل بننے والے بریگیڈئر فضل مقیم وغیرہ سب کے سامنے محمد موسیٰ کی ایوب خان کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ اس لئے محمد موسیٰ نے سکندر مرزا کو سوال کر دیا کہ کیا اس کے حواس تو درست ہیں نہ؟ اور ایوب خان کے ساتھ مشرقی پاکستان میں بات کی کہ وہ جلدی مغربی پاکستان واپس آئے لیکن سکندر مرزا نے فضائی فوج کے سربراہ اصغر خان اور بحری فوج کے سربراہ ایڈمرل چودھری سے مدد مانگ لی تو اصغر خان نے بھی محمد موسیٰ والا جواب دیا اور ایوب خان کو اطلاع دے دی۔ ایڈمرل چودھری کچھ مدد کا وعدہ کر بیٹھا یا ایوب خان کو اطلاع نہ دی کہ اس کو جلد اس کی کرسی سے ہٹانا پڑا اور ایوب خان واپس کراچی پہنچ گیا جہاں سب نے مل کر سکندر مرزا کا پتا کاٹ دیا۔ قارئین آپ کو یہاں ایک خاص سوچ کی دعوت دی جاتی ہے کہ ڈرگ روڈ ہوائی اڈہ پر جب سکندر مرزا کو قید کر کے کوئٹہ لے جا رہے تھے تو ہم اکثر مضامین میں لکھ چکے ہیں کہ وہاں برٹش خفیہ سروس کے پاکستان کے علاقہ میں آخری سربراہ اس وقت امریکہ کی

سفارش اور ان کی ضرورت کے تحت آسٹریلیا کا ہائی کمشنر جنرل کاتھورن جب خاص اجازت سے سکندر مرزا کو ملنے آیا تو سکندر مرزا نے اپنے پرانے دوست کو ایک بڑی گالی نکال کر پوچھا تھا کہ کب سے اس کو نمبرون پوزیشن سے ہٹایا گیا تھا؟ اب قارئین پورے حالات پر نظر دوڑائیں کہ سکندر مرزا کے مارشل لا لگانے کی ایک بڑی وجہ جہلم سے گجرات تک خان عبدالقیوم کے تحت مسلم لیگ کا جلوس تھا کہ سکندر مرزا کی سیاسی وقعت دھیلے کے برابر بھی نہیں تھی اور فوج یا جنرلوں میں اس کی پوزیشن واضح کر دی گئی ہے کہ کسی ایک کو اس کا ساتھ دینے کی ہمت نہیں تھی اس کے باوجود وہ کرسی کے ساتھ چمٹا رہنا چاہتا تھا لیکن اس کو اصلی حقیقت معلوم ہوگئی کہ اینگلو امریکن بلاک والوں کے لئے وہ نمبرون نہیں رہا اور اس کی وقعت ایک "ٹشو پیپر" کے برابر ہے تو تب اس کو نکالا گیا ورنہ اگر وہ لوگ اس کو رکھنا چاہتے تو یہ مخالفت والے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتے۔ اس لئے قارئین میرے مضامین کے ان جائزوں کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ ہمارے ملک میں وہ سب کچھ ایسے ہوتا ہے جیسے یہ ہمارے آقا چاہیں۔ ہاں البتہ بعض تجاویز پوری نہیں ہوتیں جیسے ستمبر 65ء کی جنگ کے وقت ہم حکم عدولی کر کے محاذ پر 5 ستمبر کو چلے گئے تو امریکن ہمارے ساتھ جو کرنا چاہتے تھے نہ کر سکے تو وہ کچھ دسمبر 1971ء میں کیا۔ اس عاجز نے ستمبر 65ء کے بعد قوم کو بہت سمجھایا لیکن میری بات نہ سنی گئی۔

تو ہمارے ان بامقصد مضامین میں ہم تواتر قائم رکھنے کے لئے واقعات کا کچھ ذکر کرتے ہیں۔ لیکن ان مضامین کو پاکستان کی تاریخ نہ سمجھ لینا بلکہ یہ تاریخی واقعات کے بامقصد جائزے ہیں کہ ہم اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں سے اسباق سیکھیں۔ ایوب خان 1951ء سے لے کر 1958ء تک لگاتار سات سال پاکستان کی بری فوج کا سربراہ رہا تو اس نے فوج کو کچھ بھی نہ دیا بلکہ فوج کے رکھ رکھاؤ نے اس کو ایسی شخصیت بنا دیا کہ وہ ملک کی حکومت پر براجمان ہوگیا اور اگلے گیارہ سال یعنی 1969ء تک وہ اس ملک کے سیاہ وسفید کا مالک تھا۔ لیکن اس نے ملک اور قوم کو بھی کچھ نہ دیا۔ 1954ء میں جو سر آغا خان نے ایوب خان کو "مہمان" بنا کر اس سے کوئی امید وابستہ کی تھی تو وہ بھی غلط امیدیں تھیں۔ اٹھارہ سال رب کی ذات پاک نے ایوب خان کو کیا سنہری مواقع عطا فرمائے کہ وہ اس ملک کی اور ہماری قسمت تبدیل کر دیتا۔ لیکن افسوس فوج میں اس نے یحییٰ خان جیسے لوگوں کی پرورش کی اور سیاست میں ذوالفقار بھٹو جیسے لوگوں کی پرورش کی۔ جنہوں نے قوم کو سقوط ڈھاکہ جیسے سیاسی اور عسکری حادثات سے دوچار کر دیا۔ اور قارئین میرے سامنے اسلامی تاریخ کا یہ عظیم المیہ ہی مجھے بار بار قلم اٹھانے پر مجبور کر رہا ہے کہ حمود الرحمٰن کمیشن نے اپنا بھی وقت ضائع کیا اور قوم کا وقت اور پیسہ بھی ضائع کیا تو یہ عاجز قوم کو اس المیہ کی وجوہات تقاضوں اور اسباب سے باخبر کرنا چاہتا ہے کہ یہ ہیں "تاشقند کے اصلی راز" کہ بھٹو نے تو قوم کو اس نعرہ سے بے وقوف بنایا تھا۔

تو گزارش کی تھی کہ ایوب خان نے سات سال بری فوج کی سربراہی کے عرصہ میں اپنی فوج میں کوئی بہتری نہ پیدا کی۔ یہ آوازیں اٹھتی رہیں کہ ہم اپنی فوج کو اپنے علاقائی مزاج اور ضرورتوں کے مطابق منظم کریں تو ہماری فوج میں (اکیڈمی) سے سونے کا تمغہ حاصل کرنے والا جنرل عبدالحمید جس کو آج کل "یحییٰ کا سایہ" کے طور پر جانتے ہیں' اس کے ماتحت ایک بہت بڑا کمیشن تشکیل کیا گیا کہ وہ لمبی "سفارشات" پیش کریں گے۔ قارئین

ان لوگوں نے جس طرح فوج کا وقت ضائع کیا پوری فوج کو بیوقوف بنایا اور لڑائی لڑنے کا ایک ''بوگس'' طریقہ بھی فوج پر ''مڑھ'' دیا جو ستمبر 65ء کی جنگ میں ایک دن کے لئے نہ چلا۔ یہ کہانی بیان کرنا اس لئے ضروری ہے کہ ان کی اس غلط کارروائی کے سلسلہ میں پروٹیسٹ کرنے والوں میں کرنل قیوم یا راقم جیسے کل کوئی درجن بھر افسران ہوں گے۔ ورنہ ساری فوج نے اس ''بوگس'' طریقے کو خوشی سے اپنا لیا بلکہ ایوب خان تو پھولا نہ سماتا تھا کہ انہوں نے لڑائی لڑنے کا ایک نیا طریقہ اپنا لیا ہے اور 64-1963ء میں شاہ ایران پاکستان آیا تو اس کو خاص طور پر اس طریقہ کا ڈیمانسٹریشن دکھایا گیا۔ دراصل اس سارے کام میں جنرل عبدالحمید نے صرف اپنی شخصیت بنانے پر زور لگا دیا کہ وہ اپنی ٹیم کو ہر چھاؤنی میں لے جاتا تھا۔ وہاں اس سلسلے میں خوب بحث ہوتی تھی اور جنرل حمید بڑا ''لبرل'' ہو کر ہر آدمی کے سوالات کی تعریف کر چھوڑتا تھا، ورشام کو کلبوں یا میسوں میں خوب شراب لنڈھاتے تھے کہ ایک غیر معروف جرمن لکھاڑی کی کتاب سے چند ''تلمیحات'' نقل کر کے اس ''نئے طریقہ'' کو جنرل حمید کی ''سوچ'' بنا دی تھی اور بڑا اصول یہ بنایا گیا کہ زیادہ علاقے ''فائر'' سے cover کئے جائیں اور نفری کا کم سے کم استعمال کیا جائے کہ بچت ہو گی اور لمبے فاصلے ناپ کر کافی علاقے خالی چھوڑ دیئے جاتے تھے۔

ہماری سطحوں پر کچھ لوگوں نے بہت شور مچایا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ کام آپ لوگ ہم ''میجروں'' پر چھوڑیں کہ ہتھیار فائر سے کتنا علاقہ Cover کر سکتا ہے لیکن یہ بھی یاد رکھیں کہ ہمارے پاس ''فائر'' یعنی ہتھیار اور بارود کم ہیں، نفری بہت موجود ہے اس لئے نفری کا فائدہ اٹھائیں لیکن ہماری بات نہ مانی گئی۔ پلٹنوں کی نفری کم کر دی۔ بریگیڈ میں تین پلٹنوں کی بجائے دو پلٹنیں رہنے دیں۔ ڈویژن میں بھی بریگیڈوں کی تعداد کم کر دی۔ سپاہیوں نے ان کے نام ''ٹیڈی بریگیڈ'' رکھ دیئے۔ کم نفری اور پیدل فوج کی کمی نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا ورنہ جنرل چودھری نے بھارتی فوج کی پسپائی کے احکام دے دیئے تھے اور جنرل حمید کے پیدل ڈویژن نے ویسے بھی ہمارے بکتر بند دستوں کی مدد نہ کی اور جنگ کے دوران ایوب خان ناراض بھی ہوا کہ ایک دفعہ جنرل عبدالحمید کو کمانڈ سے ہٹانے کا بھی فیصلہ کیا تھا لیکن یحییٰ خان اور عبدالحمید کی لابی بڑی مضبوط تھی اور ستمبر 65ء میں اینگلو امریکن بلاک کی سکیم ''الفا'' کامیاب نہ ہو سکی تو سکیم ''بریوو'' تیار تھی جس میں یحییٰ خان اور عبدالحمید نے بڑے ایکٹر کے طور پر کام کرنا تھا۔ سقوط مشرقی پاکستان جیسے المیہ کے لئے 1948ء سے تیاری شروع تھی لیکن 1965ء کے بعد سٹیج تیار تھی بجائے اس کے کہ جنرل عبدالحمید نے جو لڑنے کا ایک ''بوگس'' طریقہ تیار کیا تھا جو 1965ء میں ایک دن نہ چلا تو لڑائی کے بعد اس کو بے عزتی کے ساتھ گھر بھیج دینا چاہیئے تھا لیکن کیا ہوا؟ اس میں ایوب خان اور محمد موسیٰ خود بھی قصور وار تھے کہ وہ اندھے ہو گئے تھے کہ ایک معمولی بات کو نہ سمجھ سکے۔

پاکستان کے ساتھ جو کچھ کوئی جتنا کرتا ہے تو اس حساب سے اس کا عبرتناک انجام ہوتا ہے۔ باقی سیاستدانوں کو تو صرف برخاست کیا گیا۔ سکندر مرزا کو قید کر کے پہلے کوئٹہ لے گئے اور پھر ولایت میں دیس نکالا دیا گیا جہاں وہ ایک ہوٹل چلاتا تھا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ اس کی وفات ایران میں ہو لیکن اس کا پرانا دوست رضا شاہ پہلوی بھی زندہ سکندر مرزا کو اپنے ملک میں رہنے کی اجازت نہ دے سکا۔ مرنے کے بعد اس کو ایران میں دفن ہونے کی اجازت دی اور ولایت سے اس کی لاش ایران پہنچی تو شاہ ایران کے خلاف بھی تحریک شروع ہو چکی تھی

اور تھوڑے عرصہ بعد شاہ ایران کو بھی اپنا ملک چھوڑنا پڑ گیا۔ ایران میں اس زمانے میں بہت افراتفری تھی۔

سکندر مرزا کے بعد ایوب خان نے صدارتی طرز حکومت کو اپنا لیا اور ہمارے ملک میں بہت بحث چلتی ہے کہ صدارتی نظام ہو یا پارلیمانی نظام ۔ اور کون سا نظام اسلام کے نزدیک ہے تو کہا جاتا ہے کہ صدارتی نظام اسلامی نظام کے زیادہ نزدیک ہے لیکن ہمارا وفاقی نظام ہے۔ جس میں صوبائی خودمختاری کے مدنظر ہمیں پارلیمانی نظام اپنانا چاہیئے ۔ اب ہمارے ملک میں سیاسی افراتفریوں کی بڑی وجہ یہی پارلیمانی نظام ہے۔ جس میں صدر اور وزیراعظم میں رسہ کشی نہ کبھی ختم ہوئی ہے نہ ہوسکتی ہے اور آنے والے مضامین میں ان سب پہلوؤں پر خوب بحث ہوگی کہ میرے نزدیک دونوں صدارتی اور پارلیمانی نظام کافرانہ نظام ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ملک میں یہ کافرانہ نظام نہ کبھی چلے ہیں نہ چلیں گے۔ یہ بات ہی غلط ہے کہ کون سا نظام اسلام کے نزدیک ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت مبارکہ 208 میں حکم ہے کہ ''اسلام میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ۔'' یہ آدھا تیتر اور آدھا بٹیر والا طریقہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ سورۃ الکافرون اور متعدد سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ اور لوگوں کو بتا دو کہ ان کا دین ان کے لئے ۔ ہے اور ہمارا دین ہمارے لئے ہے۔ ''میں تیری نظر میں کافر تو میری نظر میں کافر، تیرا دین نفس شاری میرا دین نفس گزاری'' اس میں کوئی اگر مگر نہیں ہے۔ یہاں ''اولی الامر'' کی حکومت ہوتی ہے جو اطیعو اللہ اور اطیعو الرسول ہو کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو جاری و ساری کیا جائے اور سورہ آل عمران اور سورہ شوریٰ کے مطابق مشورہ اس امر کو جاری کرنے اور اعمال کے طریق کار کے سلسلہ میں ہوسکتا ہے۔ یہ ''اولی الامر'' کہاں سے آئے؟ زیادہ ضرورت اس پہلو کی ہے ہم یہ تلاش کریں کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں اور مومن کے مقاصد زندگی کیا ہیں؟ ہمارے ہاں یہ پہلو نظروں سے اوجھل ہے اور قوم بری طرح بددیانتی کی شکار ہے۔ ایوب خان یہی مقاصد لے کر آیا تھا کہ ملک میں سخت سیاسی بددیانتی ہے وہ اس سیاسی بددیانتی کو ختم کرے گا۔ وہ اس سلسلہ میں کتنا کامیاب رہا۔ دراصل فوج میں کچھ رکھ رکھاؤ کی وجہ سے ظاہراً بددیانتی کم نظر آتی ہے اور ایوب کو خیال تھا کہ سول اور سیاست میں بھی اس بددیانتی کو ختم کیا جاسکتا ہے۔

ایوب خان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ ٹریکٹر خرید سکے

ایوب خان نے بری فوج کی سربراہی سنبھالی تو اس کے سال دو سال بعد اس کا چھوٹا بھائی میجر سلطان برج کھیلتے بیس ہزار روپے کی بازی ہار گیا جو آج کے بیس لاکھ کے برابر ہیں۔ یہ پیسے میجر سلطان نے سرکاری فنڈ سے نکالے تھے۔ فوج میں اس زمانے میں رکھ رکھاؤ تھا۔ ایوب خان کے پاس تو بیس ہزار نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے دوست بریگیڈئر محمد زمان سے پیسے ادھار لے کر سرکاری فنڈ میں پیسے پورے کر دیئے اور بھائی کو فوج سے نکال دیا۔ ایوب خان کی مالی حالت بالکل ''گزارا'' تھی کہ ہلال جرأت جیسے بھی ملا اس سلسلہ میں ایوب خان کو جو زمین ملی تو ایوب خان کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ ٹریکٹر خرید کر اس زمین کو آباد کرتا۔ 57-1956ء میں جہلم میں ہمارا چودھواں سنٹر ختم ہو گیا اور مردان میں پنجاب سنٹر کا حصہ بن گیا تو رجمنٹل فنڈ سے ہم نے جو ٹریکٹر خریدا ہوا تھا وہ آدھی قیمت پر ایوب خان کو دے دیا اور کچھ افسر ناراض تھے کہ ایوب خان سے قیمت بہت کم لی ہے۔ 58-1957ء میں ہم تھل میں تھے اور ایوب خان کا بیٹا اختر ایوب ہماری پلٹن میں تھا اور کوئٹہ کورس پر جا رہا تھا اور

جب بھی والدہ صاحبہ سے بات کرتا تھا تو گزارش کرتا تھا کہ کوئٹہ میں سائیکل سے گزارا مشکل ہے۔ ان کو خان جی (ایوب خان) ایک موٹر سائیکل خرید دیں تو اس کو بتایا گیا کہ گوہر ایوب بھی اس کورس پر جا رہا ہے۔ جس کو کراچی سے ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل خرید کر دیا جا رہا ہے دونوں بھائی اس پر گزارہ کرنا۔

1958ء میں مارشل لا نگ جانے کے بعد اختر ایوب' اپنے والد کا اے ڈی سی بن کر راولپنڈی آ گیا اور 1962ء میں جب یہ عاجز ایک دوسری پلٹن کے ساتھ آ کر راولپنڈی میں متعین ہوا کہ ایوانِ صدر کی ڈیوٹی ہوتی تھی تو دیکھا کہ اختر ایوب فوج کو چھوڑ چکا ہے۔ صوبائی آسمبلی کا ممبر ہے اور ظاہر ہے اس کے پاس کاروں کی کیا کمی ہونا تھی۔ اس کو میں نے ایک ہوشیار سا سپاہی مرزا خان اردلی کے طور پر دیا تھا تو وہ بھی فوج کو چھوڑ چکا تھا اور کئی مربع زمین کا مالک تھا اور ایوانِ صدر میں کاردار تھا اور مجھے ملنے آتا تھا تو اپنی کار چلا کر خود آتا تھا۔ میرا تو اس زمانے میں بھی سائیکل پر گزارا تھا۔ 1965ء میں جب ہماری پلٹن پنڈی سے لاہور جانے لگی تو اختر ایوب نے کہا کہ اگر میں پسند کروں تو مجھے ادھر ہی ایوانِ صدر میں سویلین نوکری مل سکتی ہے۔ یہ عاجز ایوانِ صدر والوں کو نزدیک سے دیکھتا رہتا تھا۔ میں نے اختر ایوب کو کہا کہ ''کھاتا وہ نہیں جس کو ملتا نہیں۔'' میں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی تھی کہ اے میرے رب مجھے موقع ہی نہ دینا کہ میں کچھ خورد برد کر سکوں۔ میں فوجی ہی میں اچھا ہوں''۔

ایوانِ صدر کے کام کو اس عاجز نے بہت نزدیک سے دیکھا۔ 1964ء میں جب مس فاطمہ جناح ایوب خان کے مقابلہ میں آ گئی تو ایک دفعہ تو ایوانِ صدر اور ایوب خان کے لئے بھونچال آ گیا۔ پھر کسی نے سمجھایا کہ پاکستان کی مخالفت کرنے والی غفار خان کی جماعت اور مودودی کی جماعت اسلامی اور مجیب الرحمٰن جیسے علیحدگی پسندوں کا مسلم لیگ کونسل کے ساتھ منفی طرز اور ضرورت کا اتحاد ہے اور تم کہہ دو کہ پاکستان کی دشمن جماعتیں وقت کا فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ تو ایوب خان کو کچھ حوصلہ آیا۔ ہماری پلٹن کے افسروں میں سے ایوب خان صرف مجھے اچھی طرح جانتا تھا اور اگر کوئی اور وہاں ڈیوٹی پر جاتا تو ایوب خاں میرے بارے میں پوچھتا۔ اس لئے ان انتخابات کے دن کا سارا ''ڈرامہ'' اس عاجز نے بہت قریب سے دیکھا۔ جس سے کچھ پردے آنے والے مضامین میں اتاروں گا کہ اصل میں ہم سب جانے یا بن جانے اہل مغرب یا امریکہ کی ڈگڈگی پر ناچ رہے تھے اور ڈنکن سنڈے نے 1962ء میں جو ایوب خان کو بھارت کا ''چھوٹا بھائی'' بننے کا مشورہ دیا تھا۔ اس وقت سے آج تک اہل مغرب کے سامنے بڑا مقصد یہی ہے کہ ہم جانے یا بن جانے ان کی سازش کے لئے مہرے رہیں۔

ایوب خان نے کہا کہ زمین کے اچھے خطے سیاستدانوں کے لئے رکھو

اول یہاں قحط الرجال ہے۔ پھر کردار کی کمی ہے اور ہم مومن کی فراست سے بھی عاری ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی فراڈ کرتے ہیں۔ جب ایوب خان نے ایوانِ صدر میں چیف الیکشن کمشنر کو بلا کر اس سے ایوب خان کے کامیاب ہونے کا رسمی اعلان کرا دیا تو ایوب خان نے اعلان کر دیا کہ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے بچا لیا کہ پاکستان دشمن طاقتیں برسر اقتدار نہ آ سکیں کل پوری قوم عصر کی نماز کے وقت شکرانہ کی نماز ادا کرے لیکن دوسرے دن ایوب خان از خود نے عصر کی نماز بھی نہ پڑھی اور گالف کھیلتا رہا اور سورج غروب ہونے کے بہت بعد اندھیرا

ہونے پر گھر آیا۔ یہ کچھ اس عاجز نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میں نے خود یہ عصر کی نماز گالف کورس کی ایک جگہ پڑھی تھی۔ علاوہ ازیں میرے پلٹن وال جنرل بی ایم مصطفیٰ نے جو اس وقت بریگیڈئر تھے انہوں نے 1970ء میں لاہور میں مجھے ایک فائل دکھائی اور اس وقت کے مغربی پاکستان کے گورنر جنرل عتیق الرحمٰن کے دفتر میں تھی۔ اس میں جنرل محمد موسیٰ نے گورنر بننے کے بعد زمین کے کچھ اچھے ''قطعے'' ستمبر 65ء کی جنگ میں بہادری والے اعزاز حاصل کرنے والوں کے لئے ریزرو کئے تھے۔ ایوب خان نے اوپر لکھا کہ بہادری والوں کو اور عام سی زمین دے دی جائے۔ یہ اچھے زمین کے ''قطعے'' اپنے پاس ریزرو رکھو کہ سیاستدانوں کو قابو میں رکھنے اور ان کو ساتھ ملانے کے لئے ایسی زمین کے قطعے کام آئیں گے۔

قارئین یہ ان صاحب کے ریمارکس ہیں جو ملک میں سیاسی بدنیتی اور بدعنوانی ختم کرنے کو آئے تھے اور یہ ہے فوج اور فوج کے ''بہادروں'' کے لئے ان کی ''محبت'' اور ''رویہ'' کہ فوج نے ان کو کہاں پہنچایا لیکن انہوں نے فوج سے اپنے بیٹوں کو باہر نکال کر فوج کو بھی ''لات'' مار دی کہ سیاست سونے کی کانیں ہیں' فوج میں کیا پڑا ہے۔ یہ ہیں مغربی کافرانہ سیاست کے اثرات

''ہوائیں ان کی فضائیں ان کی سمندر ان کے جہاز ان کے گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر؟ بھنور ہے تقدیر کا بہانہ''

اب ہم اسلامی تاریخ کے عظیم المیہ سقوط مشرقی پاکستان کے نزدیک پہنچ گئے ہیں۔ چلو بنگالی ہم سے الگ ہو جاتے لیکن اتنے ہتھیار بند دستے' ہتھیار ڈالنے پر کیوں تیار ہو گئے؟ اور ان کو ایک سازش کے ذریعہ سے ''ڈیل ہوسٹیج'' بنایا گیا۔ اس کے لئے میرے لحاظ سے 1948ء سے تیاری شروع تھی اور جنرل تجمل حسین اور چند نے مشرقی پاکستان میں سلطان ٹیپو بننے کی ضرور کوشش کی۔ لیکن جب نیازی دل چھوڑ بیٹھا تو وہی ہونا تھا جو ہوا۔



پانچواں سلسلہ

اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں سقوطِ ڈھاکہ
سے بڑا المیہ کوئی نہیں

اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں سقوطِ ڈھاکہ سے بڑا المیہ کوئی نہیں

مضامین کا یہ پانچواں سلسلہ بہت اہم ہے کہ اس میں آگے جا کر ہم واقعاتی طور پر سقوط ڈھاکہ یا سقوط مشرقی پاکستان کو بیان کریں گے۔ اسلام کی چودہ سو سالوں کی تاریخ میں اس واقعہ سے بڑھ کر کوئی اور ذلت آمیز واقعہ موجود نہیں۔ بے شک کربلا کا واقعہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ کہ ابھی کئی صحابہ کرامؓ حیات تھے جب یہ واقعہ پیش آیا اور ظالموں یا اہم کرداروں میں صحابہ کرامؓ کے بیٹے موجود تھے۔ لیکن امام حسینؓ کی عظیم قربانی۔ بھیڑ بکریوں والی قربانی نہ تھی۔ کربلا کے شرکاء میں ایک ایک صاحب نے لڑنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے پاس حق کیلئے اپنی جان قربان کردی۔

1258ء کے سقوط بغداد کے وقت بھی لاکھوں افراد کو بھیڑ بکریوں کی طرح قربان کیا گیا۔ جنگوں میں شکستیں ہوئیں۔ ملک یا علاقے دشمن کے حوالے کرنے پڑے۔ لیکن کبھی نوے ہزار کو چھوڑ کر ایک ہزار ہتھیار بند دستوں نے اجتماعی طور پر اس طرح ہتھیار نہ ڈالے جس ذلت سے ہم دوچار ہوئے۔ ہمارے ہاں اکثر کہا جاتا ہے کہ نوے ہزار نہیں، صرف ساٹھ ہزار ہتھیار بند دستے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ ایک ہزار یا ایک سو کو بھی اس طرح ہتھیار نہ ڈالنے چاہئیں اور ستمبر 65ء کی جنگ میں 21/22 ستمبر کو یہ عاجز دشمن کے گھیرے یا محاصرہ میں آچکا تھا اور 22 ستمبر تقریباً دس بجے دشمن کے ٹینکوں نے میری پوزیشن کو روند ڈالا۔ اور اب سفید رومال کے ہلائے بغیر صرف موت ہی دوسرا راستہ باقی رہ گیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی کہ ہم نے موت کیلئے "لبیک کی" اور دشمن کا گھیرا توڑنے کی کوشش میں متعدد ساتھیوں نے شہادت کی سعادت حاصل کرلی اور کچھ بری طرح زخمی حالت میں دشمن کے قیدی بھی بنے۔ لیکن بڑھاپے کے باوجود رب کی ذات پاک نے اس عاجز کی عزت رکھ لی۔ اور گھیرا توڑ کر یہ عاجز دوسری دفاعی لائن بنا سکا۔

جو کچھ ہمارے ساتھ دسمبر 1971ء میں ہوا اس عاجز کو تو یہ المیہ 52-1951 میں تصور میں نظر آ گیا تھا اور 1954 میں رہا سہا شک بھی نکل گیا تھا اور یہ عاجز اپنے مضامین میں ایسے تصورات دے چکا ہے کہ ستمبر 1970 میں ایوب ہال میں ایسا اعلان کردیا کہ یہ کچھ ہونے والا ہے۔ اور پھر جون و جولائی 1971ء میں مشرقی پاکستان میں جا کر آنکھوں سے دیکھا کہ اب عزت بچانے کیلئے کچھ کیا جائے اور انہی تاثرات کو یہ عاجز قوم کے سامنے واقعاتی طور پر پیش کرنا چاہتا ہے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

پرانے زمانوں میں جب کسی جگہ کوئی المیہ واقع ہوتا تھا تو اچانک کوئی نالائق حکمران کسی ملک کا والی بن جاتا تھا' اور اس المیہ کی ساری ذمہ داری اس نالائق حکمران پر ڈالی جاتی تھی' لیکن ہمارے اس المیہ کے چار بڑے ایکٹر یحیٰی خان' ذوالفقار بھٹو' مجیب الرحمٰن اور امیر عبداللہ خان نیازی جب پاکستان بنا تو بالکل معمولی اور غیر معروف آدمی تھے۔ انکو 24 سال لگے جو وہ ایسے مقامات تک پہنچ گئے کہ قوم کو ایک بے مثال ذلت سے دوچار کیا تو ان 24 سالوں میں پاکستانی قوم کے ہر فرد اور جو لوگ کسی طرح ہمارے سربراہ رہے یا جو لوگ ان چاروں کو اوپر لانے اور ترقی دلانے کے ذمہ دار ہیں۔ یا جو لوگ ان کے ''پچھ لگ'' تھے' وہ سب اس ذلت اور المیہ کے ذمہ دار ہیں۔ اور یہ عاجز یہ شور مچاتا رہا بلکہ ان ''چاروں'' میں سے تین کو ان کے منہ پر کئی دفعہ کہا یا ان کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا کہ ان کو باور کرایا جائے کہ ان کی ''غلط کاریاں'' رنگ لائیں گی۔ صرف مجیب الرحمٰن کے ساتھ میرا کوئی رابطہ نہ تھا۔ علاوہ ازیں میرے مضامین میں کھل کر واضح ہو چکا ہے کہ اس سلسلہ میں بنیادی وجہ ہمارے یہ کافرانہ سیاسی' فوجی یا دیگر نظامات ہیں' جس سلسلہ میں تنبیہہ بھی ملتی رہی کہ ملک کا ہر سربراہ یا بڑا آدمی عبرتناک انجام سے دوچار بھی ہوا۔ لیکن قوم نے اپنا قبلہ درست نہ کیا۔

یحیٰی خان کے بارے میں اس عاجز نے سب کچھ غائبانہ طور پر تو 1949ء میں سن لیا تھا۔ کہ 1950 میں اس کو کرنل کے طور پر دیکھا۔ جب شاہ رضا پہلوی کو جو گارڈ دی گئی' اس کا وہ کمانڈر تھا۔ میرے دل میں ان دنوں سے اس کیلئے جو نفرت پیدا ہوئی کہ مجھے جس ''صورت'' میں وہ نظر آیا۔ اس نے اسی کردار کا مظاہرہ کر کے اس ملک کو دولخت کرایا۔ لیکن میں ان لوگوں کے رویہ سے حیران ہوتا تھا۔ جو ایسے آدمیوں کے ''پرستار'' یا ''پروردہ'' بنے ہوئے تھے۔ یحیٰی خان اور اس کا سایہ حمید جس ''زندگی'' کا 1952 کے بعد راولپنڈی کلب میں پرزور مظاہرہ کرتے رہے۔ وہ ''جھلکی'' میں اپنے پہلے مضامین میں دے چکا ہوں کہ ساتھ والے جونیئر افسروں کو چھوٹا بھائی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس ''دھمال چوکڑی'' میں ان کی بیویوں کے ساتھ جس بے حیائی کا مظاہرہ ہوتا تھا یا ایسے افسر اپنی بیویوں کو ''بنا ٹھنا'' کر لا کر خود اس بے حیائی میں شریک ہوتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ اور رسول پاک ﷺ کے نام پر بنے ملک میں ہم کسی اور بدتر قہر سے بھی دوچار ہو سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ''سقوط'' کرا کے ہمیں کتنا سستا چھوڑ دیا تھا۔

ایوب خان بھی شراب تو پیتا تھا' لیکن کھلم کھلا وہ اس طرح بے حیائیوں والا رویہ نہ اختیار کرتا تھا۔ لیکن اپنے ماتحتوں کو ایسے رویہ سے کیوں نہ روکا؟ اس کی جھلکی مجھے اپریل 1965ء میں اختر ایوب کے ذریعہ سے ملی کہ ایوب خان سوچتا تھا کہ اس کے جو ماتحت کھلم کھلا شراب اور بے حیائیوں کے عملوں کو اپنائیں گے ان کی ملک میں اور خاص کر مذہبی لوگوں میں زیادہ ''وقعت'' نہ ہوگی اور ایوب کی حکومت کو ان سے کوئی ''خطرہ'' نہ ہوگا۔ یہ ساری تفصیل میں زمان کے حساب سے بعد کے مضامین میں لکھوں گا۔ کہ میں نے اس زمانے میں ہی اختر ایوب کو بتا دیا تھا کہ یہ سوچ بڑی غلط ہے۔ پاکستان میں ''کرسی'' کی بڑی طاقت ہے۔ اور حالات کسی بھی آدمی کی شخصیت کو اوج دے دیتے ہیں۔ بہر حال قارئین دو اسباق نوٹ کر لیں کہ ہمارا ہر اوپر والا یا حکمران زیادہ تر اپنی کرسی کی حفاظت کے بارے سوچتا رہتا ہے اور فطرت ''مواقع تقدیر'' مہیا کر کے ہر ایک کو مواقع عطا فرما رہی ہے۔ لیکن یحیٰی خان وغیرہ 1952ء میں ہی اس نتیجہ پر پہنچ گئے تھے کہ زندگی فراڈ ہے۔

بابر به عیش کوش
عالم دوباره نیست

دوسرے بڑے ایکٹر کو اس عاجز نے اکتوبر 1949ء میں کوہاٹ میں دیکھا کہ ذوالفقار علی بھٹو ایک طالب علم اور بھارتی شہری کے طور پر اپنے بہنوئی کرنل صاحبزادہ مصطفےٰ اور اپنی بہن کو ملنے آیا ہوا تھا اور اس عاجز نے پہلی دفعہ کوئی آدمی ''ٹیڈی لباس'' میں ملبوس اس طرح لمبے بالوں کے ساتھ دیکھا۔ کرنل مصطفےٰ کا تعلق فوج کے ان لبرل افسروں کے گروہ کے ساتھ تھا جو زندگی کو فراڈ سمجھتے تھے۔ لیکن فوجی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے وہ اپنے اس رویہ کو ظاہر نہ کرتا تھا۔ کہ لوگوں کو اس زمانے میں معلوم ہوا کہ وہ شاہ نواز بھٹو کا داماد ہے۔ اور شاہ نواز نے جونا گڑھ میں جو ڈبل گیم کھیلی تھی اس سازش کو اس زمانے میں لوگ پوری طرح تو نہ ''بھانپ'' سکے تھے کہ یہ بہت بڑی سازش تھی جس کا ذکر یہ عاجز اب اپنے مضامین میں کر چکا ہے۔ لیکن شاہ نواز کے اس عمل کو سخت ناپسند کیا جاتا تھا کہ وہ جونا گڑھ کا نظام بھارت کے سپرد کر گیا تھا تو ذوالفقار کو بھی لوگوں نے پاکستان میں اس پس منظر اور لباس کی وجہ سے ناپسند کیا تھا۔ ذوالفقار پاکستان پکے طور کب آیا؟ 1958ء کے مارشل لاء میں وہ وفاقی وزیر بن گیا اور ایسا محمد ایوب کھوڑو کے ''سندھ کارڈ'' کو نقصان پہنچانے کیلئے کیا گیا تھا۔ یہ ''کارڈ'' پہلے جی ایم سید نے قائداعظم کے ساتھ بغاوت کر کے ''سندھی قومیت'' کو اپنا کر استعمال کرنا شروع کیا۔ اور یہ بھول گیا کہ اس کے آباؤ اجداد عراق سے سندھ میں آئے تھے اور عراق سے پہلے مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ میں عرب قومیت سے دستبردار ہو کر مسلم قومیت کے ہراول میں تھے۔ بہرحال یہ سندھی قومیت یا اب مہاجر قومیت کے ''کارڈوں'' کا سلسلہ اب بھی جاری ہے اور مسلم قومیت یا پاکستان کے اسلام کا قلعہ ہونے کے نظریہ کے بڑے دشمن یہی لوگ ہیں کہ ان کی نقل میں مجیب الرحمٰن نے بنگالی قومیت کی طرح ڈالی۔

ذوالفقار بھٹو کے عروج و زوال کی کہانیاں یا اس کے ساتھ وابستہ پاکستان کی تاریخ یا زندگی کا ہر پہلو ہماری 59 سالوں کی تاریخ کے سیاہ ترین ابواب ہیں۔ بھٹو کی زندگی کی ہر کارروائی پاکستان کی بنیاد مسلم قومیت کی نفی ہے۔ وہ حکومت کا حصہ ہوتے ہوئے یا ہمارے سیاہ وسفید کا مالک حکمران رہتے' جو اسلام اور مسلم قومیت کو ایسی تیسی کرتا رہا اور اس کے باوجود پاکستان قائم ہے تو اسی ایک چیز سے ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے اور اب تک قائم ہے۔ حیرانگی کی بات یہ ہے کہ بھٹو کے پھانسی لگنے کے عبرتناک انجام کے باوجود بعد میں لوگوں نے بے نظیر کو پاکستان کی ''تقدیر'' کا خطاب دے دیا۔ تو اس عاجز کو خیال ہوا کہ اگر بے نظیر کبھی پاکستان کی حکومت پر براجمان ہوگئی تو پاکستان کی تقدیر اپنا ''واٹرلو'' دیکھ لے گی۔ لیکن فطرت کھڑی مسکرا رہی ہے کہ دو دفعہ ایسا ہونے کے باوجود پاکستان اللہ تعالیٰ کے راز کے طور پر قائم ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اس خطہ میں کوئی اہم واقعات رونما کرنے ہیں۔ اس لئے سقوط ڈھاکہ میں تو ذوالفقار نے اہم کردار ادا کرنا تھا اور اس کے باوجود پاکستان نے قائم رہنا تھا۔ سبق صرف ایک ہی ہے کہ ایک غیر معروف بھارتی شہری سب اسلامی اقدار کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہوئے آ کر 1958 میں یہاں وزارت سنبھال لیتا ہے اور اپنے ''پرستاروں'' اور ''پروردوں'' کا ایک انبوہ پیدا کر لیتا ہے۔ تو سقوط ڈھاکہ تو بہت معمولی المیہ ہے ہم کسی بہت بڑے قہر سے بھی دوچار ہو سکتے تھے۔

امیر عبداللہ نیازی کو بھی یہ عاجز دوسری جنگ عظیم سے پہلے سے جانتا ہے جب وہ فوج میں لانس نائک تھا اور اس کو امن اور جنگ دونوں زمانوں میں بہت نزدیک سے دیکھا اور وہ میرا فوجی سپہ گری کے فن کا استاد بھی ہے اور کرنل کے عہدے یعنی پلٹن کی کمانڈ فوجی سپہ گری میں وہ علمی اور عملی لحاظ سے بہت اونچا مقام رکھتا تھا اور وہ کم دل بھی نہیں تھا۔ لیکن عزت نفس کے بارے میں اس کے رویہ سے میں کچھ حیران ہو جاتا تھا کہ بعض دفعہ وہ اپنے سے اوپر والوں کی طرف سے سخت سے سخت بے عزتی کو بھی برداشت کر جاتا تھا۔ اور اوپر والوں کے غلط رویہ کے آگے بھی سر تسلیم خم کر جاتا تھا۔ میں نے اس کی زندگی کے سب واقعات کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کی سب کارکردگی کی بہت تحقیق کی ہے کہ وہ فن سپہ گری کے ''کھیل'' کا بڑا اچھا طالب علم تھا اور کرنے کی حد تک وہ اس کا ماہر تھا۔ لیکن مشرقی پاکستان کی پوری کمانڈ اور اس کے قومی تقاضے یا جگہ جگہ کے سازشوں کے اثرات۔ امیر عبداللہ کو جب اس عاجز نے اگست 1971 میں سیدھے الفاظ میں سب کچھ بتایا کہ معاملات جو صورتحال اختیار کر رہے ہیں وہ اس کے بس سے بالکل باہر ہیں کہ وہ وقت اور حالات سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ تو اس کو میری بات سمجھ نہ آ رہی تھی کہ اس وقت صرف عزت بچانے کے بارے میں کسی تجویز کی ضرورت تھی۔ لڑائی یا جنگ لڑنے کا وقت گزر چکا تھا کہ ہم نے اپنے آپ کو ایسی صورتحال سے دوچار کر دیا تھا کہ اس کا کوئی اور حل نظر نہیں آتا تھا۔ تو یہ عاجز قوم کو یہ واضح کرے گا کہ یہ صورتحال کیا تھی اور کس طرح 48-1947 سے ہم آہستہ آہستہ اس گھمبیر صورتحال کی طرف بڑھتے رہے اور کسی مرحلہ پر اس صورتحال کو حل کرنے کی کوشش نہ کی۔

اب جون۔ جولائی 1971ء میں یہ عاجز مشرقی پاکستان میں گیا ہی صرف اس لئے تھا کہ حالات کو آنکھوں سے دیکھوں کہ واقعی صورتحال ایسی گھمبیر ہو چکی ہے جو صورت یہ عاجز 52-1951 میں بھانپ گیا تھا کہ ایسے ہوگا۔ نیازی کی بجائے کوئی کمانڈر بھی ہمیں شکست سے نہ بچا سکتا تھا۔ بات سیدھی تھی کہ اوپر والوں کو صاف پتہ تھا کہ ہم حالات کو کنٹرول نہیں کر سکتے۔ اور اقوام متحدہ کو گزارش کرتے کہ وہ آ کر حالات سنبھال لے ہم جا رہے ہیں۔ اگر بنگالیوں کو ہماری ضرورت ہوئی تو جیسا وہ چاہیں گے ہم ان کے ساتھ تعلقات قائم کریں گے۔ یا مجیب الرحمٰن کو رہا کر کے حکومت اس کے سپرد کرتے اور عزت سے مغربی پاکستان واپس آ جاتے۔ لیکن یہ جو ذلت سے نوے ہزار فوجیوں سے ہتھیار ڈلوائے یا ''ڈبل ہونسٹیج'' بنے۔ یہ ذلت ہمیں فطرت کی طرف سے بھی سزا تھی اور سب جنرلوں میں یہ ''ذلت'' امیر عبداللہ نیازی کے نام کیوں آئی؟ کہ باقی جنرل اس سے بہتر تو نہ تھے۔ اس عاجز کو ستمبر 65 کے میدان جنگ میں اشارہ ہوگیا تھا کہ ''اے سپاہی! تمہاری فوج اسلامی فوج نہیں ہے۔ یہ مغربی کافرانہ دفاعی نظام کی طرز ہے۔ تمہارے بیچ کچھ اچھے لوگوں کی وجہ سے اس دفعہ تم ذلت سے بچ گئے ہو۔ اپنے حالات ٹھیک کرو۔ ورنہ اگلی جنگ میں ذلت سے نہ بچ سکو گے'' اور یہ عاجز قوم کو اب سب کچھ بتانا چاہتا ہے کہ اس عاجز نے فوج میں اس ''پیغام'' کو کس طرح عام کیا۔ کہ آخر 1969ء میں جنرل گل حسن کو یہ ضرورت لکھ کر بھی پیش کی' جس کی کاپی میرے پاس اب بھی موجود ہے۔ اور 14 ستمبر 1970 کو جنرل یحییٰ خان اور اس کے حواریوں کو یہ سب کچھ زبانی بھی بتایا اور 5 اکتوبر 1970 کو لکھ کر بھی دیا جس کی کاپی بھی میرے پاس موجود ہے اور جنرل نیازی اور جنرل رحیم کو جو' جولائی۔ اگست 1971 میں زبانی تنبیہ کی۔ وہ الگ کہانی ہے۔

تیسرے کردار مجیب الرحمٰن کا ذکر چوتھے نمبر پر کر رہا ہوں لیکن سقوط ڈھاکہ کا بڑا کردار وہ آدمی ہے۔ جس نے وقتی طور پر اپنے مقاصد بھی حاصل کر لئے اور ''بنگلہ بندھو'' بن کر بنگلہ دیش کا بانی بھی بن گیا اور اسلام کی تاریخ میں کھلے طور پر مسلم قومیت کا باغی بھی بن گیا۔ اس عاجز نے اُس کا نام مارچ 1952 میں مشرقی پاکستان میں زبان کے جھگڑے کے وقت سنا تھا۔ لیکن مجھے رب کی ذات پاک نے اس کے چہرے یا شکل سے ہمیشہ دور رکھا۔ کہ میرے ڈھاکہ شہر کی کمانڈ سنبھالنے سے پہلے اس کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ بہرحال وہ ایک ''سیاسی غنڈا'' تھا۔ اور اُس کی تعلیم کے بارے بھی کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کتنا پڑھا ہوا تھا۔ وہ سیاسی ''ضرورت'' کی پیداوار تھا۔ کہ کافرانہ نظام اور کافرانہ سیاست اپنا کر جب لیاقت علی نے سہروردی کو ''کتا'' کہنے سے بھی گریز نہ کیا تو سہروردی کی یہ سیاسی ضرورت تھی کہ اپنی سیاسی زندگی کو قائم رکھنے کیلئے وہ چوروں، ڈاکوؤں اور رہزنوں یا غنڈوں کی مدد سے بھی وہ ''طاقت'' حاصل کرے۔ تو مجیب الرحمٰن کو سہروردی یا فضل حق اور سیاستدانوں کا ''روحانی فرزند'' کا نام دیں یا کافرانہ سیاست کے غیر فطری بچے کا نام دیں کہ ایسے غنڈے کو اتنی پذیرائی ملی کہ 1964 میں مس فاطمہ جناح کی COP کا بھی وہ ایک اہم ستون بن گیا تھا۔ اس کی ساری سیاست نفرت پر مبنی تھی اور ہماری کوتاہیوں کا اس نے خوب فائدہ اٹھایا۔ جو بے شمار ہیں۔

دراصل ہم نے جو قوم کے طور پر یہ سوچنے کی کوشش نہ کی کہ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اور تخلیق کائنات کے مقاصد کیا تھے۔ کہ اس میں انسان کی تخلیق کے مقاصد کو تلاش کر کے ہم اپنے لئے نشان راہ تلاش کریں کہ فرد کے طور پر یا اجتماعی طور پر ہم انسان کے فرائض کو تلاش کر کے اپنے لئے ''حقوق اللہ'' تلاش کریں۔ کہ جب ہر انسان اللہ تعالیٰ کے حقوق پورے کرے گا تو معاشرہ میں حقوق العباد خود بخود پورے ہونا شروع ہو جائیں گے تو اسلامی معاشرہ ظہور پذیر ہو جائے گا۔ اور ہم ''حزب اللہ'' بن کر دنیاوی زندگی میں ربط و ضبط انصاف اور امن کا ایسا مظاہرہ پیش کریں گے کہ ہمارے اعمال کو دیکھ کر دنیا کے وہ لوگ جو تذبذب کا شکار ہیں وہ ہماری طرف کھچے چلے آئیں گے اور اس طرح الگ الگ انتظامی وحدت ہوتے اسلامی ممالک کیلئے ہم ایسا نمونہ پیش کریں گے کہ ہماری نقل میں وہ بھی ترک یا ایرانی یا عرب یا افغان وغیرہ ہونے کی بجائے اول بھی مسلمان ہو جائیں گے اور آخر بھی مسلمان۔ پھر تمام امت میں ایک مرکز سے مزید وحدت پیدا کی جائے گی۔ افسوس! اس سلسلہ میں نہ ہمارے رہنماؤں، نہ حکومت، نہ دانشوروں اور نہ علماء یا مولویوں نے کچھ سوچا۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ عاجز اپنے پہلے مضامین میں بیان کر چکا ہے۔ کہ ہم سب کا اسلام اندھے کے ہاتھی والا تھا کہ جو کچھ اپنے ہاتھوں سے ''ٹٹولا'' اسی کو اسلام سمجھا اور مولویوں نے 21 نکات کا اعلان کر کے اپنی طرف سے سب کچھ حاصل کر لیا۔ اور یہ نہ بتایا کہ ان 21 نکات کو عمل میں کیسے اور کس طرح لایا جائے۔

یعنی ان کافرانہ نظاموں کی مادر پدر آزادی اور آزاد جمہوریت اور ان اسلامی اقدار کو ایک دوسرے کے بیچ گڈمڈ کر کے سب معاملات کو آدھا تیتر اور آدھا بٹیر بنا دیا کہ 1949ء کی مہمل قرارداد مقاصد جہاں لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا ''شریک'' بنا دیا تھا اس کے ذریعہ سے یا 1956 کے کافرانہ رومن آئین کو اپنا کر پاکستان کو فلاحی ملک یا جنت ارضی بنانے کے دعویدار بن گئے۔ اور اس زمین یا ارض کو ''شاد باد'' کر کے اپنے وطن کو بھی اللہ تعالیٰ کا شریک

بنانا شروع کردیا کہ ایک طرح سے یہ الفاظ ہندوؤں کے مادر وطن کی پوجا کے الفاظ ''بندے ماترم'' کا فارسی ترجمہ بھی ہیں۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اس صورتحال کے مدنظر مجیب الرحمٰن کو بنگال سرزمین شاد باد کرنے سے کون روک سکتا تھا' اور بنگلہ بھاشا کو اردو کے مقابلہ میں لانا ہر بنگالی کے ایمان کا حصہ بن گیا تھا۔ تو فطرت ہم سے بڑی غلطیاں بھی کرا رہی تھی کہ آزادی کے وقت بنگالیوں کی ساری فوج میں تعداد ایک سو سے بھی کم ہوگی اور بنگالی افسروں کی تعداد بھی آٹھ۔ دس سے کم تھی۔ اب بنگالی بدنی طور پر اتنے کمزور تھے کہ توپ کا گولہ تک نہ اٹھا سکتے تھے تو توپخانہ یا رسالہ میں یا انجینئرز میں ان کو بھرتی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کچھ بنگالی پلٹن کھڑا کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن پلٹن کی مارٹر پلٹون کیلئے کوئی بنگالی موزوں نہ ہوتا تھا کہ مارٹر کی بیرل یا ترائی پارٹ کو اٹھا سکے۔ لیکن مجبوری کے تحت بنگال رجمنٹ کا سنٹر اور ایک پلٹن کھڑی کی گئی۔ جن میں کچھ پنجابی اور پٹھان عہدیدار بھی رکھے اور آہستہ آہستہ بنگالی پلٹنیں کھڑی کی تھیں۔ کہ پنجاب رجمنٹس' فرنٹیئر فورس رجمنٹس اور بلوچ رجمنٹس تھیں۔

دراصل پاکستان بننے کے بعد یہ نام بھی ختم کر دینے چاہیئے تھے کہ ویسے تو پنجاب رجمنٹوں میں پٹھان بھی تھے اور فرنٹیئر فورس میں پنجابی بھی تھے اور ان کی الگ الگ کمپنیاں ہوتی تھیں۔ تو کھیلوں کے مقابلوں وغیرہ اور ویسے بھی کچھ صوبائی تعصب عود کرتا رہتا تھا۔ 56-1955 میں ون یونٹ کے بننے کے بعد ایک اچھا کام یہ ہوا کہ پلٹنوں نے الگ الگ پٹھانوں کی کمپنی اور پنجابیوں کی کمپنی والا سسٹم ختم کردیا' ویسے ہر قبیلہ کی اوسط نفری اور پرموشن پرانے طریقے پر بحال رکھا۔

اب بنگالیوں کے ساتھ بھی اگر یہ طریقہ کرتے تو بنگال یونٹس کبھی اس طرح بغاوت نہ کرتیں جیسے 1971 میں کی۔ کہ جس یونٹ میں آدھی بنگالی نفری تھی وہاں کسی ایک بنگالی نے بغاوت نہ کی۔ یہی بدقسمتی ایسٹ پاکستان رائفلز کے سلسلہ میں ہوئی۔ کہ سرحدوں کے یہ دستے سارے کے سارے بنگالی تھے اور یہ سارے دستے اور بنگالی یونٹس کب سے بنگلہ دیش تحریک کے ''سیکٹر'' بنے ہوئے تھے۔ تو دسمبر 1971 کا سقوط کوئی حادثہ نہ تھا کہ اس کی ذمہ داری کسی ایک یا چند متعلقہ آدمیوں پر ڈالی جائے۔ ہم ساری قوم قصوروار ہیں ہاں متعلقہ لوگ یعنی یحییٰ' بھٹو' مجیب یا نیازی وغیرہ کو رب کی ذات پاک نے عبرت کے ''نشانات'' بنا دیا کہ ان کا ظاہری کردار بھی سیاہ تھا۔

جہاں سویلین سیاستدان ناکام ہو گئے وہاں ایوب خان بھلا کیسے کامیاب ہوسکتا تھا

اب 1958ء کے مارشل لا لگنے تک کی کہانی ہم بیان کر چکے ہیں لیکن ذرا سوچا جائے کہ ایک سول بیوروکریٹ یا سرکاری نوکر' غدار میر جعفر کا پوتا سکندر مرزا اتنا طاقتور کیسے بن گیا کہ قائداعظم کے تین رفقاء سہروردی' چندریگر اور فیروز خان جنھوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا تھا' ان کو ڈیڑھ سال کے عرصہ میں وزیراعظم کے عہدوں پر لاکر ایک ''ٹشو پیپر'' کی طرح پھینک دیا اور تحریک پاکستان کے یہ کارکن ایسے بے وقعت کیوں ہو گئے؟ تو سامنے یہ نتیجہ آتا ہے کہ پاکستان کے بن جانے کے بعد ''عزت نفس'' نہ قوم کے طور پر ہم حاصل کر سکے نہ

افراد کی کوئی ''عزت نفس'' تھی کہ فرداً یہ بے عزتیاں برداشت کر کے چپ ہو گئے یا گوشہ نشین۔ ہم آزادی اور جمہوریت کے حق میں بڑا شور مچاتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اس کافرانہ نظام میں ''عزت نفس'' جیسی کوئی چیز ہمیں میسر نہیں ہوئی۔ لیاقت علیؒ انگریز جنرلوں کی مدد سے حکومت چلاتا رہا اور غلام محمد و سکندر مرزا' ایوب خان کی مدد سے اور یہ ''ڈنگ ٹپاؤ'' معاملہ ہے اور اب ایوب خان اور فوج والے ''میدان'' میں آ گئے کہ وہ حکومت چلائیں۔ کس فلسفہ پر؟ بات پھر بھی ادھر ہی رہی۔ حکومت سول بیوروکریٹس چلا رہے تھے اور اب بھی وہی حکومت چلا رہے ہیں۔ فوج کا صرف ''نام'' استعمال ہوتا ہے اور نہ کوئی فلسفہ ہے' نہ کوئی سسٹم ہے نہ کوئی آئین ہے نہ قانون کہ ہمیں معلوم نہیں کہ انسان کیا ہے؟ اور بات پھر ہمارے پہلے مضامین کی طرف پھر جاتی ہے کہ جس نے پہچانا اپنے نفس کو اس نے پہچانا خدا کو۔ آیئے حضور پاک ﷺ کے اس فرمان پر عمل کر کے مومن بن جائیں تو ہمیں مومن کی فراست بھی حاصل ہو جائے گی اور ''عزت نفس'' بھی مل جائے گی اور فراڈ قسم کے رہنماؤں سے یا بے کردار لوگوں سے بھی چھٹکارا حاصل ہو جائے گا لیکن افسوس ہمارے دانشور یا صحافی بھی قوم کی اس صراط مستقیم کی طرف رہنمائی نہ کر سکے۔ جہاں سویلین سیاستدان بری طرح ناکام رہے۔ فوج اور ایوب خان کیسے کامیاب ہو سکتے تھے۔

اس لئے 1958ء سے 1962ء تک ایوب حکومت کے حالات پر تبصرہ کرنا اپنا سر پیٹنا ہے۔ ہم نے اپنے مضامین میں فوج کا مکمل تعارف لکھ دیا ہے کہ یہ ایک نوآبادیاتی اور انگریزی طرح کی فوج ہے۔ انگریز افسروں کی جگہ دیسی افسر آ گئے ہیں جن کو مختلف اقسام میں بھی بانٹ دیا گیا ہے اور ماحول یا صورتحال کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ ایوب خان اور کچھ مخلص لوگوں کو شکایت تھی کہ سیاستدان بہت بددیانت ہیں۔ وہ لوگ سیاسی بددیانتی ختم کریں گے اور نتیجہ اس عاجز نے پہلے مضامین میں بیان کر دیا ہے کہ ایوب خان نے اپنے بیٹوں کو فوج سے چھٹی کرا کے سیاست میں ڈال دیا کہ سیاست سونے کی کانیں ہیں اور 1966ء میں جنرل محمد موسیٰ کو کہا' اچھی زمین فوج والوں کو نہ دے بلکہ یہ ''قطعات'' سیاستدانوں کو اپنے ساتھ شامل کرنے کے لئے ریزرو رکھے جائیں۔ بات ہی ختم ہو گئی۔ ''جتھوں دی کھوتی اُتھے ونج کھلوتی'' یعنی گدھی اپنے تھان پر پہنچ گئی تو بعد میں بھٹو نے اگر روٹی کپڑے اور مکان کا نعرہ لگایا اور دانشور اور شاعر اپنی شاعری اور ادب کی تان وہاں جا کر توڑتے ہیں۔ ''پیٹ نہ پیاں روٹیاں سبھے گلاں کھوٹیاں'' تو پھر پاکستان بنانے کا کیا مطلب تھا؟ ''روٹی تو کسی طرح کی کھائے مچھندر'' بے شک ہمارے آقا ﷺ کا فرمان ہے کہ عنقریب ہے کہ محتاجی کفر بن جائے۔ اسلام محتاجی دینا کسی کو پسند نہ کرے گا اور خلیفہ وقت ایک آدمی کے بھوک سے مرنے کی اپنی ذمہ واری کا فکر مند ہوتا تھا لیکن یہ ضرورتیں ہیں۔ اصول نہیں۔ اسلام کے لحاظ سے انسانیت کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ اس کو دوزخ کی آگ سے بچایا جائے کہ روز قیامت ہم رب کی ذات پاک کو کیا جواب دیں گے۔ حضور پاک ﷺ کے زمانے میں بھی کافر کہتے تھے کہ ہمارا ملک بھی ملک شام یا ملک عراق کی طرح زرخیز ہو جائے یہاں نہریں ہوں چشمے ہوں۔ کھیتی باڑی ہو تو رب کی ذات پاک نے چھوٹی سی سورۃ القریش نازل فرمائی ''کہ وہ تو جنگل میں بھی روزی مہیا کرتا ہے'' اور حضرت ابراہیمؑ کی سورۃ ابراہیمؑ کی دعا ہمیں یاد کرائی کہ وہ اللہ پر توکل کر کے اپنی بیوی جناب ہاجرہؓ اور چند ماہ کے بچے حضرت اسماعیلؑ کو اس بیابان میں چھوڑ گئے تھے تو یہ توکل کیا رنگ لایا۔ سبحان اللہ' تو قارئین' بات ترجیحات کی کریں' کہ ہماری اول ضرورت یہ ہے کہ

ہم مومن کے مقاصد زندگی تلاش کر کے ترجیحی طور پر مومن بنیں۔

ایوب خان نے جو حکومت بنائی اس میں تین جنرل بھی تھے۔ ایوب کھوڑو کا سندھ کارڈ ختم کرنے کے لئے ایک نوجوان سیاستدان، ذوالفقار بھٹو، ایک قانون دان منظور قادر جو سر عبدالقادر کا بیٹا تھا۔ ایک سی ایس پی افسر جو ریلوے میں چلا گیا تھا اور فتح محمد سے ایف ایم بن گیا تھا۔ مشرقی پاکستان سے نیم سیاستدان اور نیم سرکاری نوکر اور پوری قوم ایوب خان کے گن گا رہی تھی کہ شکر ہے ایک ایسی عظیم ہستی ایوب ہمارے ملک کا سربراہ بن گیا ہے۔ چند ماہ بعد ایوب خان نے اپنے اقتصادی مشیروں سے مشورہ کر کے ملک کے مالی حالات پر چند دانشوروں خاص کر اخبار کے ایڈیٹروں کے ساتھ زبانی بات چیت کی تو ملک کے سب سے بڑے انگریزی اخبار ڈان کا ایڈیٹر جو میرا آزادی سے پہلے کا دوست تھا وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا آپ فوجیوں نے اتنا ''عظیم آدمی'' کہاں چھپا کر رکھا ہوا تھا، کہ ملک کے مالی معاملات کو اس طرح سمجھتا ہے میں اب کیا کہتا کہ کل تم لوگ اسی کو گالیاں نکالو گے۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

یعنی ہمارے ہاں قحط الرجال ہے اور مردم شناسی کا پہلو بھی صحیح نہیں کہ معمولی بات سے ہم اثرات لے لیتے ہیں۔ ایوب خان کے سلسلہ میں میرے پاس کئی آدمی آئے اور کہنے لگے ان کا روحانی دنیا میں بہت اونچا مقام ہے اور پہلے بزرگ پیش گوئیاں کر گئے ہیں کہ دریائے سندھ کے نزدیک چھوٹی پہاڑیوں سے ایک باشندہ اٹھ کر اس برصغیر کو کفر سے پاک کر دے گا اور اسلام اس کے زمانے میں یہاں بلندیاں اختیار کرے گا کہ انہی علاقوں میں ایک بڑا شہر بھی آباد ہو گا جو اسلام کا مرکز بنے گا۔ یہ دوسری پیش گوئی تو کچھ صحیح ثابت ہوئی اور ایوب خان نے جو دارالخلافہ تبدیل کیا یا کمیشن مقرر کئے کہ وہ یہ فیصلہ کریں گے۔ یہ صرف لیپا پوتی تھی اور صرف ''ضروری'' مشق تھی۔ بہرحال ایوب خان خود بھی کچھ ایسی غلط فہمیوں کا شکار ہو گیا تھا لیکن اپنے نفس کو پہچاننے کی کوشش نہ کی اور نہ اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی بلکہ حکومت کے آخری ایام میں تو ماڈرن اسلام کے چکر میں پڑ چکا تھا اور الطاف گوہر کے ساتھ مل کر ''غلام پرویز کے اسلام'' کا پہلے فوج میں تعلیم و تدریس کا پروگرام بنایا جو کام ہم نے نہ چلنے دیا۔ یہ لمبی کہانی ہے اور پھر ایوب کے خلاف تحریک شروع ہو گئی اور ایوب سب کچھ بھول گیا کہ ایوب دل کا مضبوط آدمی نہ تھا اور جلدی دل چھوڑ جاتا تھا لیکن شروع زمانے میں ان کو فوج سے ایک بریگیڈئر فضل الرحمن مل گئے جو ''علم الکلام'' یعنی بات چیت کے طریقے کو عملی طور پر اپنانے کی وجہ سے فوج میں ساری ترقیاں حاصل کرتے رہے۔ ورنہ فن سپہ گری میں ان کو کوئی مقام حاصل نہ تھا اور یہ صاحب انفارمیشن سیکرٹری کے عہدے تک پہنچ گئے تھے اور ایوب خان کو یہ صاحب ایشیا کا ''ڈیگال'' بنانے پر لگے ہوئے تھے لیکن ان کی خود کی نظر ''وزارت'' پر تھی جو جلدی ظاہر ہو گئی تو ایوب خان نے ان کو ''ڈاکٹر گوبلز'' والے عہدے سے ہٹا دیا۔ ایوب خان کے گرد ہر قسم کے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے اور وہ ہر ایک کی بات سن لیتے تھے۔ اس لئے ایوب خان نے کئی ریفارمز کیں۔ کئی کمیشن بنائے لیکن اکثر تجاویز اور سفارشات عملی نہ ہوتی تھیں تو قوم کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔

ایوب خان صرف ایک مقصد میں کامیاب ہوا کہ وہ اپنی حکومت کے عرصہ کو زیادہ سے زیادہ طول دے

اور اس نے زیادہ وقت آئین کے بنانے اور سیاست کی بحالی کی سوچوں پر لگایا اور پہلے ''ایبڈو'' کے ذریعہ سے اکثر سیاستدانوں کو سیاسی میدانوں سے دیس نکالا دلا دیا۔ پرانے سیاستدانوں میں سے مغربی پاکستان میں تو صرف راجہ غضنفر علی اور ایوب خان کا بھائی سردار بہادر خان بچ سکے اور مشرقی پاکستان سے تمیز الدین اور محمد علی بوگرہ' البتہ مشرقی پاکستان سے دوسرے درجہ کے کئی سیاستدان اب بڑے سیاستدان بن کر افق پر آ گئے اور ایوب خان نے صدارتی نظام کے تحت ایک ایسا آئین بنایا جس نے اس کو تین سال کے لئے ملک کا صدر بنا دیا اور مصر سے بنیادی جمہوریتوں کے فلسفہ کی نقل کر کے ایسے فلسفہ والا ملک بنا کر ایوب خان نے جمہوریت کو کنٹرول کرنے کی تجویز اور پروگرام بنایا اور 1962ء میں تو وہ اس سلسلہ میں کچھ کامیاب بھی ہو گیا کہ پہلے چار سال ایوب خان نے اس ملک پر ایسے حکومت کی کہ اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون تھا اور ایوب کو کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ اینگلو امریکن بلاک کو پاکستان کے لئے ایک ایسے ہی حکمران کی ضرورت تھی اور ایوب خان نے ان کا ہر حکم اس طرح مانا جس طرح انگریزوں کا ''وائسرائے'' مانتا تھا لیکن پاکستان کو اینگلو امریکن بلاک والے اس لئے ''وجود'' میں لائے تھے کہ پاکستان کے ذریعہ سے وہ لوگ جواہر لعل نہرو یا بھارت کے حکمرانوں پر بھی نظر رکھیں۔ کہ بے شک جواہر لعل نہرو 1949ء سے امریکہ کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ کر آیا تھا کہ وہ کمیونسٹ بلاک کے مزید پھیلاؤ کو اینگلو امریکن بلاک کی مدد سے روکے گا لیکن 1949ء سے اہل مغرب کی کوشش تھی کہ بھارت اور پاکستان ان کی سپروائزری میں کسی ''متحدہ دفاع'' میں بندھ جائیں جنرل گریسی اس سلسلہ میں فوجی محکمہ تعلقات عامہ کو استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن ہمارے مشورہ سے ہمارا ڈائریکٹر کرنل شہباز اس 'بھنور' میں نہ پھنسا۔ اب اہل مغرب 1961ء میں بھارت اور چین میں ''ٹکراؤ'' کرانے والے تھے اور تیاری مکمل تھی لیکن اس سے پہلے وہ ایوب خان کو بھی شہ دے رہے تھے وہ جا کر بھارت کا ''چھوٹا بھائی'' بن جائے اور مغربی ذرائع ابلاغ سرخیوں پر سرخیاں دے رہے تھے کہ جواہر لعل نہرو کے لئے بڑا اچھا موقع ہے کہ ایوب خان' پاکستان کا ایک پراثر اور مضبوط رہنما ہے اور اس کے ساتھ نہرو جو کچھ طے کرے گا دونوں ملکوں کے کشمیر سمیت سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔

اصل میں بھارت کا نظریہ تھا کہ پاکستان وجود میں ہی کیوں آیا

ایوب خان جس کو 1954ء تک بین الاقوامی معاملات کی کوئی زیادہ شدبد نہ تھی کہ پہلی زندگی میں اس کا علم اور مطالعہ محدود تھا لیکن اب جس ماحول میں وہ کام کر رہا تھا تو اس کو بین الاقوامی معاملات کی کچھ سمجھ لگنا شروع ہو گئی تھی اور اپنے بارے بھی اس کو کچھ خیال ہو گیا تھا کہ وہ بڑا ''اہم آدمی'' ہے اور ہمارے قحط الرجال کی صورت حال میں اندھوں میں ''کانا'' راجہ ضرور تھا۔ تو اس نے ایک دفعہ مشرقی پاکستان جانے کا ایسا پروگرام بنایا کہ دہلی میں تھوڑا سا رک جائے اور جواہر لعل نہرو کو 'ہیلو ہیلو' کرتے اس کے ساتھ کچھ بنیادی باتیں کرے کہ ہمیں اپنے بنیادی جھگڑے طے کرنا چاہئیں۔ اب اصلی بات یہ ہے کہ بھارت کے حساب سے بنیادی جھگڑا یہ ہے کہ پاکستان وجود میں کیوں آ گیا ہے۔ یہ جلد ختم ہو کر بھارت کے ساتھ مل جائے کہ وہ مہا بھارت بن جائیں لیکن بین الاقوامی آداب کی وجہ سے وہ اس کا کھل کر اعلان نہیں کرتے۔ البتہ یہ ان کی ہر تجویز میں ہوتا ہے کہ پاکستان کو اتنا نقصان

پہنچائیں کہ وہ قائم نہ رہ سکے اور کشمیر پر قبضہ رکھنے کیلئے جو وہ لوگ بے بہا خرچ کر رہے ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔ کشمیر کے دریاؤں کا رخ تبدیل کر کے وہ پاکستان کو بنجر اور ریگستان میں تبدیل کرنا چاہیں گے کہ یہ ملک اپنی موت آپ مر جائے۔ اینگلو امریکن بلاک اور بھارت کی ''مشترکہ اقدار'' یہ ہے کہ پاکستان کمزور ملک رہے لیکن اہل مغرب کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ پاکستان اتنا کمزور ہو کہ ان کے پروردہ ہو کر بھارت کا ''چھوٹا بھائی'' بنا رہے تاکہ دونوں ملک مل کر ایشیا میں ان کے ''سنتری'' کا کام کریں لیکن بھارت چاہتا ہے کہ پاکستان اتنا کمزور ہو کہ بالکل ختم ہو جائے۔

اہل مغرب یا اینگلو امریکن بلاک والے ہندو کی ذہنیت کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ جس طرح ہم سمجھتے ہیں۔ بھارت طاقتور کے سامنے ہاتھ جوڑنے کیلئے تیار رہتا ہے لیکن کمزور پر اس طرح سوار ہوگا اور اس کے ساتھ ایسا ذلت آمیز سلوک کرے گا کہ اس کو انسان بھی نہ سمجھے گا۔ اہل مغرب چونکہ طاقتور ہیں ان کو یہ تجربہ نہیں کہ ہندو ذہنیت کمزور کے ساتھ کیا برتاؤ کرے گی اور ساری دنیا تبدیل ہو جائے ہندو ذہنیت کبھی تبدیل نہ ہوگی اور ان کا سب سے بڑا دشمن پاکستان اور مسلمان ہیں۔ یہ عاجز اور مرحوم مغفور پروفیسر منور مرزا ہندو ذہنیت پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور کچھ تو سردار پٹیل یا جنونی ہندو پارٹیاں سیدھے طور پر مسلمانوں کے خلاف باتیں کرتے ہیں جیسے اگلے دن ایک پارٹی نے اعلان کیا کہ وہ خوش تب ہوتے ہیں کہ بھارتی ٹینک لاہور کی سڑکوں پر دندناتے پھریں اور راولپنڈی پر میزائل گرتے رہیں لیکن جواہر لعل نہرو جیسے لبرل لبادہ اوڑھنے والے بہت منافقت کرتے تھے۔ ان کا باطن چانکیہ سے بھی زیادہ سیاہ ہے اور اگر وہ کوشش کریں بھی تو پھر بھی ان کا باطن عام آدمی کے سامنے بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایوب خان نے بڑی حیرانگی سے ہمیں نجی طور پر کئی دفعہ بتایا کہ وہ بڑے خلوص کے ساتھ جواہر لعل نہرو کو بتا رہے تھے کہ ہم اپنے جھگڑے ختم کریں اور امن پسندی کے ساتھ ہمسایوں کی طرح رہیں اور میں نے کہہ دیا کہ ہم تو آپ لوگوں کے ساتھ متحدہ دفاع کرنے کو بھی تیار ہیں تو اچانک نہرو کے منہ سے یہ الفاظ نکل پڑے ''کس کے خلاف؟'' قارئین! یہ ایوب خان کے لئے ایک بم...... شیل تھا کہ نہرو کہہ گیا تھا کہ اے پاکستان والو ہمارے بڑے دشمن تو تم ہو۔ ہم تمہارے ساتھ مل کر کونسا اور کیسا دفاع کریں؟ اور نہرو خود کو بھی ''محسوس'' ہوا کہ بلی تھیلے سے باہر آ سکتی ہے۔ وہ اپنا چانکیہ والا باطن ایوب کے سامنے ظاہر کر چکا تھا۔

قارئین! اب ایوب خان اور نہرو کے درمیان آگے بات چیت کیسے چل سکتی۔ دریاؤں کے پانی کا سمجھوتہ ایک مجبوری تھی کہ 1948ء میں لیاقت علی کے زمانے میں زاہد حسین اور ممتاز دولتانہ دریائے راوی، ستلج اور بیاس پر بھارت کا حق تسلیم کر آئے تھے۔ انگریز بے ایمانی سے گورداسپور کا ضلع بھارت کو دے کر دریائے راوی پر مادھو پور ہیڈ ورکس بھارت کو دے گئے تھے اور ماؤنٹ بیٹن آخری وقت بے ایمانی کر کے دریائے بیاس اور ستلج پر فیروز پور ہیڈ ورکس اور فیروز پور کے مسلم اکثریت والے علاقے بھارت کو دے گئے۔ اب اگر ہمیں مسلم اکثریت والے کشمیر کے علاقے مل بھی جائیں تو یہ تین دریا تو زیادہ بھارتی اور کشمیر کے ایسے علاقوں سے شروع ہوتے ہیں جہاں ہندو اکثریت میں ہیں بلکہ دریائے چناب کے اوپر والے حصے بھی کشمیر کے ایسے علاقوں میں ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ بہرحال صرف کشمیر حاصل کر لینے سے ہمارے مسائل حل نہیں ہوتے۔ بات ہی کچھ اور

ہے یہ حق و باطل کی جنگ ہے۔ جس دن پاکستان میں حق اور اسلام نافذ ہو گیا تو یہ حق خود بخود بھارت کے کفر کو اپنی لپیٹ میں لے کر تہہ و بالا کر دے گا تو اول ہندوانہ اور بھارتی ذہنیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ضیا الحق کے زمانے میں بھی ہمارے بھارت کے ساتھ تعلقات اسی طرح خراب تھے اور اس زمانے میں آغا شاہی وزیر خارجہ تھا اور صاحبزادہ یعقوب باہر ملکوں میں سفیر کا کام کرتا تھا اور وزارت خارجہ کو کوئی مشورہ دینے آیا ہوا تھا کہ ضیاء الحق نے آغا شاہی اور صاحبزادہ یعقوب دونوں کو بھارت بھیج دیا کہ وہاں بات کر کے حالات کو کچھ ٹھیک کریں۔ بھارت سے واپسی پر آغا شاہی بڑا خوش نظر آتا تھا کہ بھارت والوں نے پاکستان کے کچھ ''معذرت نامے'' قبول کر لئے ہیں جو حسب معمول ''ظاہری منافقت'' تھی لیکن آغا شاہی نے ایک بیان ''داغ'' دیا کہ وہ بھارت کی کافی ''غلط فہمیاں'' دور کر آئے ہیں۔

یہ بیان پڑھ کر مجھے آگ لگ گئی تو میں نے اسی دن آغا شاہی کو خط لکھا جس کی کاپی میرے پاس آج بھی موجود ہے کہ یہ تو مجھے عرصہ سے معلوم تھا کہ ہماری وزارت خارجہ میں کوئی کام کا آدمی موجود نہیں لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ آپ جیسے لوگ مومن کی فراست سے اتنے عاری ہیں کہ ایسے بیان دیتے ہو کہ بھارت کی کافی ''غلط فہمیاں'' دور کر آئے ہو۔ خدارا! یہ پہلو اچھی طرح سمجھ لو کہ بھارت والوں کو یا ہندوؤں کو صرف ''ایک'' غلط فہمی ہے کہ پاکستان وجود میں کیوں آ گیا ہے۔ اور جنرل ضیاء الحق کو اس خط کی کاپی دی اور ساتھ لکھا کہ آپ کے وزیر خارجہ کا صرف ''انگریزی'' پر گزارا ہے۔ ورنہ فہم و فراست میں بالکل زیرو ہیں۔ ضیا الحق کو پہلے بھی کچھ معلوم ہو گیا تھا کہ وزارت خارجہ ''بناوٹی'' لوگوں سے بھرا پڑا ہے اور وہ اپنے پرانے ڈویژن کمانڈر صاحبزادہ یعقوب خان کو ویسے بھی ''نوازنا'' چاہتے تھے تو انہوں نے آغا شاہی کو ''رخصت'' دے کر یعقوب صاحب کو وزیر خارجہ بنا دیا ویسے تو صاحبزادہ یعقوب صاحب بھی ''آغا شاہی سے بدتر'' کیٹگری میں آتے ہیں لیکن زبان کے 'محتاط'' ہیں اور ضیاء الحق سورہ آل عمران کی آیت مبارکہ 54 '' مکروا ومکراللہ'' کے اصول کو ضرور سمجھتا تھا۔ وہ مکاروں کے مکر کو ان کو واپس لوٹا دیتا تھا۔ اس وقت پاکستان نیوکلیئر طاقت نہ بنا تھا۔ روس نے تو مرار جی ڈیسائی کو پاکستان پر حملہ کرنے کی بھی ''شہ'' دی تھی لیکن پاکستان اللہ تعالیٰ کا بڑا راز ہونے کی وجہ سے بچا ہوا ہے۔ 1984ء میں پاکستان' ضیاء الحق کے زمانے میں نیوکلیئر بن گیا تھا اور ضیاء الحق نے کچھ ''کرکٹ ڈپلومیسی'' بھی اپنائی پس فطرت معاملات کو چلا رہی ہے اور فطرت اس عشق بلاخیز کے قافلہ سخت جان کو بھی جلد ظاہر کر دے گی جنہوں نے اس برصغیر کو کفر سے پاک کرنا ہے۔ ایک صاحبِ نظر کہہ رہے تھے کہ اس قافلے کے کچھ فرد کی طرف اہل قبور بھی اپنی ''اجداث'' سے غور سے دیکھتے نظر آتے ہیں کہ اس جہاں دنیا میں ان کی آمد کا ظہور شروع ہو گیا ہے (واللہ اعلم) کہ کسی غیبی طاقت نے مجھ سے یہ کچھ لکھوا دیا۔

ایوب خان کے زمانے کی طرف واپس مڑتے ہیں' ایوب خان کو نزدیک سے دیکھتے بالکل ظاہر ہو گیا تھا کہ بھارت کے ساتھ کسی باعزت دوستی کی اس کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا تھا بلکہ دل سے وہ اس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ ''بھارت کا جو یار ہے وہ غدار ہے''۔

اہل مغرب بھارتیوں سے بہت امیدیں وابستہ کیئے ہوئے تھے 62-1961ء میں بھارت کو ایسی ہزیمت

ہوئی کہ پاکستان کے لئے ایک سنہری موقع تھا کہ وہ کشمیر کو بھارت کے غاصبانہ قبضے سے چھڑا سکتا تھا اور بھارت ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا لیکن اپنے ہاں وہ سعادت مند لیڈر شپ موجود نہ تھی کہ ان کو برصغیر ہندو پاکستان کو کفر سے پاک کرنے کے سہرے بندھتے۔ یہ عاجز اس سلسلہ میں اپنے پہلے مضامین میں بھی اشارے کر چکا ہے کہ اینگلو امریکن بلاک سے برطانیہ کا چالاک وزیر دفاع ڈنکن سنڈے دوڑتا ہوا برصغیر میں پہنچا۔ ایوب خان کی خوب ''برین واشنگ'' کی اور پاکستان نے اس سنہری موقعہ سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا تو ڈنکن سنڈے نے ہماری کمزوری اور ناسمجھی سے مزید فائدہ اٹھانے کے لئے اور پکے طور پر مغرب کے پروردہ کے طور بھارت کا چھوٹا بھائی بنانے کیلئے ایوب خان کو یہ مشورہ دینے سے بھی ''گریز'' نہ کیا کہ ہم مشرقی پاکستان کی سرزمین بھارت کو بہتر ذرائع آمدورفت کیلئے استعمال کرنے کی اجازت دیں لیکن یہ سن کر زمین ایوب خان کے پاؤں تلے سے نکل گئی کہ ایوب خان کو بھارت کی بھی پوری سمجھ آ چکی تھی کہ بھارت کا بڑا دشمن چین نہیں بلکہ پاکستان ہے اور ایوب خان نے ڈنکن سنڈے کے سامنے جس رویے کا اظہار کیا ایوب خان نے کئی دفعہ ہمیں اس صورتحال سے آگاہ کیا لیکن جو چیز ایوب خان کو اس زمانے میں سمجھ نہ آئی وہ حیلہ فرنگی تھا کہ ڈنکن سنڈے اور اس کی قوم جو ایوب خان کو اپنا ایک 'وائسرائے'' سمجھتے تھے۔ وہ حیران ہو گئے کہ ایوب خان میں مسلمان کے طور پر ابھی تھوڑی سی ''جان'' موجود ہے۔

ایوب خان کو اینگلو امریکن بلاک دنیاوی طور پر بہت مضبوط بنا چکے تھے۔ ایوب خان اپنا تشکیل کیا ہوا صدارتی نظام اور 1962ء کا آئین نافذ کر چکا تھا جس کے منتخب نمائندوں نے حسب معمول پہلے ہی دن ایوب کو ایک سیاسی شکست سے ''دوچار'' کر دیا کہ اس کے نمائندہ حبیب الرحمن کی بجائے مخالف گروہ کا شریف نمائندہ مولوی تمیز الدین سپیکر بن گیا۔ 1962ء کے قانون میں ایک اچھی بات تھی کہ اسمبلی کا جو ممبر وزیر بنے گا اس کو ممبری سے مستعفی ہونا پڑے گا لیکن سیاستدانوں نے اس ''شق'' کو ماننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ وزیر بھی بنیں گے اور ممبر بھی رہیں گے۔ ایوب کو مشورہ دیا گیا کہ اس کو سیاستدانوں کی یہ بات ماننا پڑے گی۔ سیاست میں کوئی حرف آخر نہیں ہوتا۔ یعنی کوئی ''اصول'' نہیں ہوتا بلکہ ایوب خان کو سیاسی پارٹیاں بھی بحال کرنا ہوں گی۔ اور بہتر ہے کہ خود مسلم لیگ کو بحال کر دے اور جو لوگ اس کے ساتھ تعاون کریں ان کی ایک مسلم لیگ بنا لے۔ پہلے چودھری خلیق الزمان کے تحت حکومت کے ''چمچوں'' نے کونشن مسلم لیگ بنائی۔ جس کی ''گدی'' کچھ عرصے کے بعد ایوب خان خود کو سنبھالنا پڑی اور اس کے مخالف لوگوں نے کونسل مسلم لیگ بنا ڈالی اور پھر بھان متی کے کنبہ کی طرح سب سیاسی پارٹیوں نے سورۃ النمل کی آیت مبارکہ 82 کے الفاظ ''دابۃ من الارض'' کی پیروی کرتے زمین سے سر باہر نکال دیا۔ ہمارے مفسرین نے جو اس کو جانور قرار دیا یہ دراصل ڈارون کا ''بوزنہ'' ہے اور انسان جو مرکز کائنات تھا وہ سورۃ الاعراف کی آیت مبارکہ 176 کے مطابق زمین یا مادیت میں گھس گیا اور رب کی ذات نے وضاحت کی کہ اس کی مثال ''کتے کی'' طرح ہے۔ بوجھ رکھیں تو بھی ہانپے۔ بوجھ نہ رکھیں تو بھی ہانپے' تو قوم ایسی مادیت اور سیاست کی طرف واپس آ گئی جس کو ختم کرنے کا یا صحیح کرنے کا ایوب خان نے اعلان کیا تھا۔

ہمارا مولوی یا ہمارے علماء یا ہمارے دانشور آزادی کے وقت ہماری صحیح رہنمائی نہ کر سکے۔ صرف قائد اعظم کے اس اعلان کہ میں اول بھی مسلمان ہوں اور آخر بھی مسلمان اور اگر مسلم ہے تو مسلم لیگ میں اور اس

کافرانہ نظام میں ایک دیانتدار وکیل کے طور پر انہوں نے ہمارا مقدمہ لڑا اور ہم نے یہ ملک حاصل کر لیا لیکن یہ عاجز اپنے مضامین میں یہ تاثر بار بار دے رہا ہے کہ ملک حاصل کر کے ہم نے اس ملک میں مومن بن کر یا ''حزب اللہ'' کے طور پر رہنا تھا۔ افسوس ہم اللہ تعالیٰ کی فوج نہ بن سکے۔ پاکستان کی دنیاوی فوج والوں کو تو یہ بات جلدی سمجھ لینا چاہیئے تھی کہ ایک دنیاوی فوج کے ربط و ضبط کی وجہ سے کتنے فائدے ہیں۔ ہم اگر اللہ تعالیٰ کی فوج بن جائیں تو

''ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان''

ایوب خان نے جو اینگلو امریکن بلاک کو مایوس کیا تو نہ ایوب خان نہ ہم قوم یا فرد کے طور پر یہ اندازہ لگا سکے کہ اہل مغرب ہر میدان خواہ سیاست تھی یا معیشت یا عسکریت پاکستان میں سازشوں کے وسیع جال پھیلا رہے تھے۔ اگر ایوب خان اسلام کے نفاذ کے سلسلہ میں کچھ سوچ کر اسلام نافذ کر دیتے یا جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنا کر وہ کچھ کرتے جو اختر ملک اور بھٹو نے کشمیر میں کرایا تو اول بھارت کو ہم پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی لیکن اگر بھارت والے کسی بیوقوفی کی وجہ سے ایسا کر بیٹھتے یا ان کو جنگ میں ''چھپے ہاتھ'' اس طرح دھکا دیتے جس طرح انہوں نے 1965ء میں دیا تو دہلی تک ہمیں کوئی نہ روک سکتا تھا اور کشمیر کی بھارتی غاصب فوج ہماری قید میں ہوتی لیکن افسوس ہم لوگوں نے یہ سنہری موقع گنوا دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر ہم صحیح تیاری کرتے تو یہ ''چھپے ہاتھ'' بھارت کو اس طرح جنگ میں دھکا نہ دیتے کہ یہ ''دھکا'' تو بھارت کو ہم پر برتری دلانے کی امید میں دیا گیا لیکن بات مومن بننے کی ہے اور مومن کی فراست حاصل کر کے ایسی تجاویز بنائیں کہ باطل، حق کے سامنے پاش پاش ہو جائے۔ بہر حال مصلحت کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ دشمن کے ''فکر'' کو سمجھ سکیں کہ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ نے علمی اور عملی طور پر ہماری توجہ دو ضروری پہلوؤں کی طرف دلائی۔ قائداعظم کا فرمان تھا کہ ''اپنے دشمن کو پہچانو'' اور قائد اعظم اپنے بیرونی اور اندرونی دشمنوں کو خوب پہچانتے تھے اور جو لوگ ہندوؤں کے ''پچھ لگ'' بنے ہوئے تھے خواہ مولوی آزاد تھا، خواہ غفار خان، یا حسین مدنی، قائداعظم نے ان کو کبھی منہ نہ لگایا اور جو انگریزوں کے ''پروردے'' تھے۔ جیسے خضر حیات ٹوانہ وغیرہ تو ان کو بھی اپنے سے دور رکھا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے الفاظ میں اپنے آپ کو پہچاننے کے اصول کا ذکر کر کے اصل میں حضور پاک ﷺ کے اس فرمان کی ہمیں یاد دہانی کرائی کہ ''جس نے پہچانا اپنے نفس کو اس نے پہچانا رب کی ذات پاک کو'' تو اس عاجز کے یہ مضامین لکھنے میں بڑا مقصد قوم کو یہی یاد دہانی کرانا ہے کہ میں تاریخ برائے تاریخ لکھنے کو ایک لاحاصل مشق کہتا ہوں کہ ہمیں بامقصد تاریخ لکھنا چاہیئے اور سوچیں کہ ہم ایوب خان کے دور تک پہنچ گئے ہیں لیکن کہیں سے کوئی روشنی نظر نہ آئی کہ کوئی ایک مثال بھی ہمارے سامنے نہیں کہ کوئی ایسا عمل کیا ہو جس سے فرد یا قومی مفاد کی اصلی ضرورت پوری ہوتی ہو۔

ایوب خان صرف یہ سوچتا تھا کہ وہ اپنی کرسی کس طرح برقرار رکھ سکے۔ اور صدارت کی پہلی ٹرم ختم کرنے کے بعد 1964ء میں وہ دوسری دفعہ صدر بننے کی مشق کیلئے تیاری کے ساتھ میدان میں ''کود'' پڑا۔ مس فاطمہ جناح کس طرح ایوب خان کے مقابلہ کیلئے تیار ہو گئی۔ کون مخلص لوگ سمجھتے تھے کہ ایوب کی آمریت ختم

کر کے قوم کیلئے کسی دیانتدارانہ سیاسی سسٹم کی راہ نکالی جائے یا کون سیاسی اور فصلی بٹیرے تھے جو ہر "کیمپ" میں موجود تھے یعنی ایوب خان کے ساتھ بھی تھے اور مس فاطمہ جناح کے ساتھ بھی اور اس سارے عمل سے انہوں نے دنیاوی فائدے اٹھائے۔ اس سلسلہ میں اخباروں میں بہت کچھ ہے۔ لیکن اس عاجز کیلئے سبق یہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہہ تھی کہ ایک دفعہ اس نے ایوب خان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور میرے سامنے تو اس نے کئی دفعہ کہا کہ طاقت میں آنے کے بعد وہ ضرور اسلام کا نفاذ کرے گا۔ اور اپنی جعلی فتح کے بعد اس نے قوم کو دوسرے دن شکرانے کی نماز پڑھنے کی گزارش بھی کی کہ اس کی "فتح" سے ملک بچ گیا ہے لیکن افسوس!

کہ وہ اتنا خودغرض ثابت ہوا کہ مقررہ وقت پر اس کا اپنا سر بھی شکرانہ کے سجدے کیلئے نہ جھکا۔ اور یہ ہے قول اور فعل کی منافقت جس سے ہمارے سارے رہنما بلکہ پوری قوم دوچار ہے۔ ایوب خان اس غلط فہمی کا شکار ہوگیا، کہ وہ قسمت کا دھنی ہے، اور جب تک چاہے وہ برسر اقتدار رہ سکتا ہے۔ اور جب وہ جانے لگے گا تو جس کے سر پر وہ "تاج" رکھنا چاہے گا وہی پاکستان کا حکمران بن جائے گا۔ اور اس سلسلہ میں "جوتشیوں" اور ابن الوقت لوگوں نے مشہور کر دیا کہ ایوب کا بیٹا گوہر ایوب اس کا جانشین ہوگا اور اس کو لوگوں نے "پرنس آف ویلز" کہنا شروع کر دیا۔ میرا تعلق البتہ اختر ایوب کے ساتھ تھا۔ اور وہ مجھے بہتر انسان نظر آتا تھا۔ اور عمر میں اپنے سے چھوٹے گوہر ایوب کیلئے نہ اس کے دل میں کوئی حسد تھا اور نہ رشک۔ ہم نے کئی دفعہ مخول یا مذاق بھی کیا کہ "جانشینی" بڑے کا حق ہوتا ہے تو وہ کہتا تھا۔ قسمت کی بات ہے اگر میرے چھوٹے بھائی کے مقامات بلند ہوں گے تو اس کیلئے یہ خوشی کا باعث ہوگا۔ بہرحال جب تک ہم ایوانِ صدر رہے۔ وہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ آ کر مجھے ملتا تھا۔ اور بڑی نیک نیتی سے میرے ساتھ کئی معاملات کے سلسلہ میں مشورہ بھی کرتا تھا کہ میرے خلوص سے وہ متاثر تھا۔ اپریل 1965ء میں راقم نے اپنی پلٹن کی ایڈوانس پارٹی لے کر لاہور چلے جانا تھا کہ ہماری تبدیلی لاہور ہوگئی تھی تو اختر ایوب مجھے ملنے آیا۔ اور کہنے لگا کہ جنرل محمد موسیٰ خان جی (ایوب خان) کا بڑا وفادار رہا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خان جی کا سب جنرلوں اور فوج پر بہت بڑا اثر تھا۔ پھر محمد موسیٰ کی زیادہ وقعت نہ تھی کہ وہ شیعہ تھا اور اس کا تعلق بلوچستان کے ہزارہ قبیلہ سے تھا جن کا سول یا فوج میں کوئی اثر نہیں تھا لیکن اس کی اضافی مدت بھی اب ختم ہونے والی ہے تو سربراہی کیلئے میں تمام نیچے والے جنرلوں کا خاکہ اس کو گوش گزار کروں کہ کون بہتر آدمی ہے کہ خان جی کی کچھ اپنی "پسندیدگیاں" بھی ہیں۔

اختر ایوب نے کہا خان جی کو یحییٰ خان سے کوئی خطرہ نہیں

میں نے اختر کے ساتھ لمبی چوڑی بات کی جس کا اختصار یہ ہے کہ تمہارے خان جی کے لئے بہتر آدمی جنرل سرفراز ہے، گو میں اس کو ذاتی طور پر پسند نہیں کرتا کہ اس میں بڑی انسانی خامیاں ہیں لیکن ایوب خان کے ساتھ وہ بے وفائی نہ کرے گا۔ ویسے بہترین آدمی جنرل ملک شیر بہادر ہے جو ہر لحاظ سے ملک اور قوم اور تمہارے خان جی کیلئے موزوں ہوگا لیکن میں اس سلسلہ میں زیادہ سفارش نہ کروں گا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میرے جنرل شیر بہادر کے ساتھ ذاتی اور خاندانی تعلقات ہیں۔ ویسے سب سے سینئر جنرل بختیار رانا ہے۔ وہ بھی آپ کے باپ کے ساتھ بے وفائی نہ کرے گا۔ البتہ سپہ گری کے پیشہ میں وہ بھی محمد موسیٰ کی طرح گزارا ہے۔ اور یہی چیز

جنرل سید غواص اور جنرل وصال محمد پر لاگو ہے کہ پیشہ ورانہ لحاظ سے وہ لوگ بھی گزارے ہیں لیکن امید ہے وہ بھی بے وفا نہ ہوں گے۔ البتہ آپ کے خان جی کی نظر ضرور بہ ضرور یحییٰ خان پر ہوگی کہ پیشہ ورانہ لحاظ سے اس نے اپنی شخصیت کے گرد بڑے قلعے تعمیر کئے ہوئے ہیں۔ اور ظاہر طور پر آپ کے خان جی کی وفاداری کے گن گاتا رہتا ہے۔ تو اختر کہنے لگا کہ ٹھیک ہے خان جی اس سے کافی متاثر ہیں لیکن محمد موسیٰ کی طرح اس کے خاندان کے لوگ بھی فوج میں نہیں ہیں اور وہ شیعہ بھی ہے تو فوج میں اس کا ہولڈ بھی کم ہوگا اور وقعت بھی۔ تو خان جی کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے کہا کہ یہاں بات محمد موسیٰ سے بالکل الگ ہے۔ میجری کرنیلی سے یحییٰ خان نے اپنی ایک ''لابی'' تشکیل کی ہوئی ہے۔ وہ لوگوں کے بڑے فائدے بھی کرتا ہے۔ اور اس کی لابی میں ایک طرف اگر شرابی کبابی ہیں تو دوسری طرف کئی پانچ وقت کے نمازی بھی اس سے متاثر ہیں۔ وہ مردم شناس بھی ہے اور ہر آدمی کو استعمال کرنے کو اس کا ہنر آتا ہے۔ اور اندرونی طور پر یحییٰ خان کے ذوالفقار بھٹو کے ساتھ بڑے گہرے رابطے ہیں اور اس عمر میں بھٹو سے بڑھ کر ملک میں مجھے کوئی بہروپیا آدمی نظر نہ آیا (ضیاء الحق کے ساتھ گو میرے رابطے 1952ء سے تھے لیکن اس زمانے میں وہ لیفٹیننٹ کرنل تھا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھٹو سے بڑھ کر ''بہروپیا'' ہے) پھر جنرل حمید گو یحییٰ کے کورس کا ہے اور اس سے ایک نمبر سینئر ہے لیکن وہ یحییٰ خان کی ''جیب'' میں ہے اور لوگ اس کو یحییٰ خان کا ''سایہ'' کہتے ہیں۔ اس لئے آپ کے خان جی کو اگر کوئی خطرہ ہے تو ایسے لوگوں کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ جن پر وہ ''بھروسہ'' کرتا ہے۔ اور قارئین! اندازہ لگائیں کہ بڑے سے بڑے آدمی کو اپنی کرسی کی کتنی فکر ہوتی ہے۔ مزے میں ہم رہے جو زیادہ اوپر جا ہی نہ سکے کہ میرے ساتھ 1941ء سے جو کمیشن حاصل کرنے آئے تھے وہ بریگیڈئر تھے یا کرنل تھے اور 1971ء میں جنرل تھے۔ لیکن میرے ساتھ تو ''تماشے'' بنتے رہے۔ کہ رب سبحانہ نے کچھ اور سوچا ہوا تھا۔

اگر یہ عاجز طریقے کے ساتھ اپنا ''تعارف'' ان مضامین کے ذریعہ سے نہ کراتا تو یہ عاجز قومی معاملات پر اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کو کون شائع کرتا۔ یا پڑھتا کہ یہ آدمی جو ساری نوکری میں میجر کے عہدے سے اوپر نہ جا سکا کون ہوتا ہے کہ قومی اور بین الاقوامی معاملات پر اس طرح نڈر ہو کر تبصرے کرے گا اور لوگوں نے اپنی شخصیت کے گرد جو قلعے تعمیر کئے ہوئے اُن کو مسمار کر کے اس لئے مضامین کا سلسلہ ستمبر 65 کی جنگ سے شروع کیا۔ لیکن ستمبر 65ء کی جنگ کا پوسٹ مارٹم ساتھ نہ لکھا کہ ''سیز فائر'' کے بعد پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ اور ''جھوٹے'' لوگ میرے سامنے فرار ہو رہے تھے۔ میں بھی جنرل اکبر خان طارق کی طرح اپنی ''کشتیاں'' جلا چکا تھا کہ اپنا کورٹ مارشل کرانے پر تیار تھا کہ صرف سچ بولوں گا اور سچ لکھوں گا۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے اپنے آپ کو سچ سننے کیلئے تیار کیا جاتا ہے اور اہل بنایا جاتا ہے کہ افسوس آج تک پوری قوم نے ستمبر 65ء کی جنگ کے فوری یا دور رس نتائج کا تو جائزہ بھی نہیں لیا کہ ان نتائج کے اثرات اب تک جاری ہیں اور یہی بڑا المیہ ہے کہ ہر واقعہ کے نتائج کے اثرات ایک جاری عمل ہے۔ اول یہ معلوم کیا جائے کہ اینگلو امریکن بلاک جنہوں نے ہمیں اس جنگ میں ''جھونکا'' ان کے مقاصد کتنے پورے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ان کا فوری مقصد تو پورا نہ ہوا کہ بھارتی جنرل چودھری لاہور پہنچ کر کلب میں ''چھوٹا پیگ'' نہ پی سکا اور ایوب خان کی ''کرسی'' بھی بچ گئی اور ہم ذلت

آمیز شکست سے بھی بچ گئے۔ لیکن یہ فوری نتائج تھے۔ ویسے ہم بہت نقصانات کرا بیٹھے۔ ہر بھارتی لیڈر اور سورما ڈرتا تھا کہ مسلمانوں سے لڑائی یا جھگڑا مول نہ لو کہ 1948ء میں کشمیر میں پاکستانی فوج کو ''باندھ کر'' اور کنٹرول کر کے لڑایا گیا تھا۔ اب کھلی جنگ میں مسلمان اگر ''بپھر'' گیا تو دہلی سے پرے نہ رکے گا خواہ ان کو ڈنڈوں نیزوں یا کلہاڑیوں کے استعمال سے ایسی پیش قدمی کرنا پڑے۔ اب بھارتی لاہور اور سیالکوٹ آ کر ہماری دہلیز پر بیٹھ گئے۔ اور ان کے دل سے ہماری برتری کا ڈر ختم ہو گیا۔ یعنی اینگلو امریکن بلاک جو کچھ ہمارے ساتھ کرانا چاہتے تھے اس کی بنیاد بندھ گئی پھر انہوں نے سیاسی طور پر مہم چلوا کر 1969ء میں ایوب کا پتا بھی کٹوا دیا۔ اور 1971ء میں ہمیں ذلت آمیز شکست دلا کر اپنا مقصد پورا کر لیا۔

قارئین! اس جنگ سے ہم نے کچھ بھی نہ حاصل کیا تھا۔ یہ جو آج تک اخباروں میں مضمون آ رہے ہیں کہ 1965ء میں قوم متحد تھی تو بھارت ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ قوم کیسے متحد تھی؟ اور قومی طور پر ہم نے کس یکجہتی کا مظاہرہ کیا؟ جس کا کوئی نتیجہ نکلا اور وہ نتیجہ کیا تھا؟ یہ زبانی کلامی متحد ہونے کے اثرات بھی کئی سالوں کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اگر واقعی ہم متحد تھے تو دشمن ہمیں چھ سال کے اندر اس طرح دولخت نہ کر دیتا جس طرح اس نے کیا۔ میرے لحاظ سے اس جنگ نے ہمارے اس انتشار کو دگنا چوگنا کر دیا' جس سے کافرانہ سیاسی اور عسکری نظاموں کی پیروی کی وجہ سے ہم دوچار تھے۔ اور فوجی لحاظ سے جنگ کے آخری دنوں میں سیالکوٹ محاذ پر بکتر بند دستوں میں ہمیں برتری حاصل ہو گئی تھی اور ہم بھارتی بکتر بند کے بڑے حصے کو تباہ کر کے بھارتی فوجی مشینری کو بری طرح نقصان پہنچا کر جموں' کٹھوعہ روڈ کا رابطہ کاٹ سکتے تھے۔ لیکن افسوس کہ صاحبزادہ یعقوب محتاط رویہ کی وجہ سے بریگیڈیئر عبدالعلی قادیانی کے بزدلانہ مشورے اور ایوب خان کے دل کو چھوڑنے کی کی وجہ سے ہم یہ انعامات بھی حاصل نہ کر سکے۔ ریگستانی اور بیابان راجپوتانہ کے بھارتی علاقوں کے چند قلعوں پر قبضہ کر کے ہم بھی اپنی ''فتح مندی'' کے جھوٹے قلعے تعمیر کر رہے تھے کہ سوائے کھیم کرن کے بھارت کا کوئی اور علاقہ ہمارے قبضہ میں نہ تھا۔ ساری جنگ میں میرے ماتحت بڑی بہادری سے لڑے اور انہوں نے لاہور کو بچایا۔ لیکن یہ عاجز ندامت سے اور دوچار رہا کہ دہلی نہیں ہم تو امرتسر تک بھی نہ پہنچے اور دشمن ہماری دہلیز پر بیٹھا ہے اور میری سوچ بالکل تبدیل ہو چکی تھی لیکن میری حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی جب سیز فائر کے بعد میں نے دیکھا کہ ہمارے ''بڑوں'' کو ذرا بھر بھی احساس زیاں نہیں۔ اور وہ لوگ پہلے سے بھی زیادہ جھوٹوں اور ریت کی بنیادوں پر اپنی شخصیتوں کے ساتھ اکڑتے پھرتے ہیں جس کا ایک مشاہدہ پیش کرتا ہوں۔

ہم لوگ شہدا کو دفن کرنے سے فارغ ہوئے تو مجھے پیغام ملا کہ میرے بریگیڈ کمانڈر قیوم شیر نے مجھے بلا بھیجا ہے۔

جب میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ ''ڈرامے'' کر رہا ہے اور فرعون کی طرح تکبر کے ساتھ مجھے کہنے لگا کہ میں جنگ کے اپنے واقعات کا کسی کے سامنے ذکر نہیں کروں گا کہ تمام واقعات کی بریگیڈ والے چھان بین کریں گے تو پھر اوپر والوں کو ساری صورتحال بتائی جائے گی۔ میں نے کہا کہ بریگیڈئر صاحب! میں نے سمجھا تم نے اپنی ندامت کا اظہار کرنے کیلئے مجھے بلا بھیجا ہے کہ تم بروقت ہماری مدد نہ کر سکے۔ تمہیں اللہ

تعالٰی نے توفیق نہ دی کہ ایک دن ہمارے پوزیشن کو جا کر دیکھ لیتے حالانکہ فوجی قانون اور تربیت کی مطابق ہر دوسرے دن تمہیں ہمارے دفاعی پوزیشن میں آنا تھا۔ جنگ سے پہلے تم لوگ یہ نہ سوچ سکے کہ جنگ آ رہی ہے اور میری باتوں کو پاگل کی باتیں قرار دیتے رہے۔ جنگ کے دوران تم لوگ ہمیں پسپا کرا کر پیچھے بھگا لے آئے اور تم تو 11\12 ستمبر رات کو پل کو اڑانے والے تھے۔ میں نے تمہیں روکا اور دوسرے دن تمہاری غلطی سے چھوڑی ہوئے پوزیشن کو بھاری قربانی دے کر دوبارہ حاصل کیا۔ فوجی قانون کے لحاظ سے ہر دوسرے دن تم نے آ کر میری پوزیشن کو دیکھنا تھا' تمہیں ایک دن بھی توفیق نہ ہوئی کہ آ کر مجھے ''ہیلو ہیلو'' بھی کر جاتے۔ پھر 21 ستمبر شام کو ہم نے لیفٹیننٹ افتخار کو تمہارے پاس بھیجا کہ ہماری مدد کرو کہ دشمن ہمارے پوزیشنوں کو روندنے والا ہے۔ تم نے کوئی مدد نہ کی اور ہمیں گھیرا پڑ گیا۔ افتخار نے جا کر تمہیں پھر اطلاع دی کہ پلٹن کو دو کمپنیوں کو گھیرا پڑ چکا ہے تم نے نہ اُس وقت مدد کی۔ نہ دوسرے دن تم نے ہماری مدد کی اور اس عاجز نے دشمن کا گھیرا توڑ کر بی آر بی پر چند آدمیوں کی مدد سے دوسری دفاعی لائن بنائی جو تیسری بلوچ کے حوالے کر دی ہے۔ تم کون ہوتے ہو میری کارروائی کی چھان بین کرنے والے؟ میں تمہیں اپنا کمانڈر اب تسلیم نہیں کرتا کہ جنگ ختم ہو گئی ہے اور تین سو نفری میں سے میرے پاس تقریباً چالیس پچاس زندہ جوان موجود ہیں۔ میں اب ڈویژن والوں سے احکام لوں گا اور میں واپس اپنے ہیڈکوارٹر میں آ گیا جہاں ڈویژن ہیڈکوارٹر کو حالات سے آگاہ کیا جس کو میرا پرانا کمانڈر کرنل بعد میں میجر بی ایم مصطفٰی پہلے ہی کھری کھری سنا گیا تھا کہ لڑنے والوں کی پرسان حالی تو دور کی بات ہے کسی نے ان کو شہداء کی تدفین کیلئے بھی کوئی مدد نہ پہنچائی۔

معلوم ہوتا تھا کہ میرے اس رویہ کی ڈویژن والوں کو پہلے ہی خبر مل چکی تھی کہ مجھ سے سینئر میجر (بعد میں جنرل) غلام حسن کو انہوں نے ہیلی کاپٹر سے منگوا کر چند گھنٹوں کے بعد میرے پاس بھیج دیا کہ اُس کو بہادری کے تمغہ سے ''نوازا'' جا رہا ہے۔ اور وہ جا کر میجر امیر افضل کو کنٹرول کرے جو ''باغی'' ہو رہا ہے۔ کہ کیا دیکھتا ہوں کہ آنسو بہاتا میجر حسن آ کر میرے گلے لگ گیا اور کہنے لگا کہ تم اور پلٹن کی دو کمپنیوں نے جس بہادری سے دشمن کو تہس نہس کیا ہے پاکستان کی تاریخ کا یہ ایک سنہری باب ہے۔ مجھے اب پلٹن کی کمانڈ مل گئی ہے۔ لیکن پلٹن کے روحانی کمانڈنگ افسر ہمیشہ آپ ہی رہیں گے۔ آپ مہربانی کر کے میری مدد کریں۔ جنرل سرفراز آپ اور باقی مجاہدوں کو ملنے آ رہا ہے اور آپ سے معذرت بھی کرے گا۔ میں نے میجر حسن کو کہا کہ ''میں تو جنرل سرفراز کو اس حالت میں نہ مل سکوں گا کہ میرے ذہنی حالات ایسے ہیں کہ۔ مجھے خود معلوم نہیں کہ میرے منہ سے کیا الفاظ نکل جائیں۔ جنرل سرفراز باقی مجاہدین سے ملیں اور ایک انکوائری ہو جائے کہ بریگیڈ ہیڈکوارٹر والوں نے ہمارے ساتھ ایسا رویہ کیوں اختیار کیا۔ یا کوئی سازش تھی کہ بھارتی ہماری پوزیشنوں کو روندتے شالا مار باغ تک پہنچ جائیں۔ بہر حال جنرل سرفراز آیا۔ اور لیفٹیننٹ افتخار نے قیوم شیر کے سامنے جنرل سرفراز اور سب لوگوں کو پوری کہانی سنائی۔ اور سب مجاہدوں نے ایک آواز سے کہا کہ وہ اس بریگیڈ کے ماتحت نوکری نہ کریں گے۔ لیکن سرفراز خود کو کچھ معلوم نہ تھا کہ اُس کے محاذ پر کیا ہو رہا ہے۔ وہ بریگیڈیئر قیوم شیر کیلئے بہادری کے تمغے کی سفارش کر چکا تھا۔ اس کو روکنے کی کوشش کی۔ لیکن بہادری کے تمغوں کا فیصلہ ہو چکا تھا اور کاغذات پریس میں پہنچ چکے تھے۔ صرف قیوم شیر کا

آئندہ پروموشن کیلئے نمبر کاٹ دیا۔ اور ہمیں چند دنوں کے بعد اُس کے بریگیڈ سے تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن قارئین ستمبر 65 کی جنگ کا بڑا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ غیروں کی سازش نے ہمیں جنگ میں ''جھونک'' دیا۔ جس کے لئے تیاری ناممکن تھی۔ اکثر کمانڈر اس سے بے خبر رہے کہ اُس کے ماتحت کیسے لڑائی لڑتے رہے۔ اور یہ عاجز اپنے مضامین میں ثابت کر چکا ہے کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے۔ جگہ جگہ اُس ذات پاک نے کچھ اپنے نیک بندوں کو چن لیا۔ اور انہوں نے'' مواقع تقدیر'' کا صحیح استعمال کیا۔ کچھ نے عظیم قربانی دی۔ اور پاکستان وقتی طور پر ذلت سے بچ گیا۔ لیکن قوم کو بے وقوف بنانے کا سلسلہ جاری رہا کہ قوم کے سامنے ساری کاروائی کو ہماری عظیم فتح کے طور پر پیش کیا۔ اور ہماری کم علم قوم نے اس ''غلط انعام'' کو صحیح تسلیم کیا۔ اور آج تک ستمبر 65 کی جنگ کو ہماری فتح سمجھا جاتا ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ اگر وہ ہماری فتح تھی تو چھ سال بعد ہم عظیم ذلت سے کیوں دوچار ہوئے۔ اور یہ عاجز یہ نکتہ قوم کو ''برہانیت'' کی مدد سے سمجھائے گا لیکن قوم کی ناسمجھی کے کچھ مناظر پیش کرنے بھی ضروری ہیں۔

فوجی خوش دلی سے گلے میں ہار ڈال رہے تھے' جیسے وہ واقعی میں فاتح ہوں

پلٹن کی آدھے سے زیادہ نفری شہید یا زخمی ہو چکی تھی۔ کمک مردان سے منگوا کر پلٹن کو نئے سرے سے منظم کرنا تھا۔ کیپٹن اور بعد میں جنرل اور پنجاب کے سابق گورنر محمد صفدر کو میجر حسن نے میری رفاقت اور مدد کیلئے بلا لیا' کہ ہم بڑ ڈوڈ بیرک میں واپس جائیں اور پلٹن کو منظم کر کے لڑائی کے لئے تیار کریں۔ اور محاذ سے ہم جب لاہور شہر اور شالامار باغ سے کچھ فاصلے پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں لاہور کے شہریوں نے ایک اجتماع کیا ہوا ہے۔ محاذ سے شہر کی طرف واپس جاتے فوجی کو روک کر اُس کے گلے میں ہار ڈالا جاتا تھا۔ پانی کی بوتلیں پلائی جاتی تھیں۔ اور ایسی آؤ بھگت ہو رہی تھی جیسے ہم نے دہلی فتح کر لی ہے اور وہاں سے واپس آ رہے ہیں کہ فوجی بھی گردن جھکا کر جس خوش دلی سے ہار پہن رہے تھے تو گویا وہ خود کو کوئی بڑا ''فاتح'' سمجھتے تھے۔ یہ عاجز جو میدان جنگ کے وقت سے ندامت سے دوچار تھا اب ان مناظر کو دیکھ کر میرے جو آنسو جاری ہوئے ہیں۔ وہ آج تک نہیں رُکے۔ اور یہ چند الفاظ میں بڑی مشکل سے لکھ رہا ہوں کہ ہماری ناداں اور کم علم قوم جنگ کے تقاضوں سے بالکل ناآشنا ہے۔ بلکہ خود فوج کا بڑا حصہ ''ناآشنا'' ہے اور یہی رونا یہ عاجز اپنے مضامین میں 6 ستمبر کے بارے میں پیش کر چکا ہے۔ کہ بی آر بی سے عورتیں اور بچے جو بھاگ کر آئے تھے تو اگر اسلام میں خودکشی کی اجازت ہوتی تو وہ بہترین موقع تھا۔ اور میں پکار اُٹھا تھا'' کہ اے حجاج بن یوسف! تو میرا ہیرو ہے کہ دو مسلمان عورتوں کی عزت کے لیے اُس نے اُس خطہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ لیکن ہم سرحد کے علاقوں میں اپنی عورتوں اور بچوں کی حفاظت نہ کر سکے۔ اور کیا ہم ہار پہننے کے حق دار تھے' کہ دشمن لاہور کی دہلیز کے سامنے بیٹھا تھا؟ داد دینا پڑتی ہے اس قوم کے جذبے کو کہ کاش ہمارے رہنما قوم کی صحیح رہنمائی کر کے اس جذبے کا صحیح استعمال کریں۔ کہ 6 ستمبر 1965ء کو بھی لاہور سے ایک لاکھ کا اجتماع شالامار باغ سے محاذ کی طرف چل پڑا۔ لیکن بے چارے توپوں کے گولوں کا کیسے مقابلہ کرتے۔ کاش ہم پوری قوم کو حزب اللہ بنا کر اس جذبے کو صحیح استعمال کرتے۔ کہ چند دن بعد کھیم کرن محاذ سے ایک ڈرائیور اور ایک دفتر اردلی ایک سرکاری گاڑی میں کوئی چیز خریدنے انارکلی بازار آئے۔ کسی نے پوچھ لیا کہ

کس محاذ سے آئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا۔ ''کھیم کرن سے'' پس لوگ اکٹھے ہو گئے۔ سپاہیوں کو ہاروں سے لاد دیا گیا۔ اور تقریریں شروع ہو گئیں۔ کہ ان جوانوں کی یونٹ والے ان کو تلاش کرنے کے لیے پہنچ گئے۔ اور یہ تماشا دیکھ کر ایک طرف ہنسی نہ روک سکتے تھے تو دوسری طرف قوم کی ''نادانی'' بھی اُن کے سامنے تھی۔ لیکن ایک ''جذبہ'' تھا۔ اُس کو بھی داد دینا ضروری ہے۔

قارئین! میرے لئے میری زندگی کے باقی ایام جنگ سے زیادہ مشکل تھے کہ دوسرے دن جنرل محمد موسیٰ لاہور پہنچ گئے۔ اور جن لوگوں نے اپنی بہادری کی جھوٹی کہانیاں جلد ''گھڑ'' لی تھیں۔ جنرل موسیٰ خود ایک ایسا تمغہ اپنی چھاتی پر سجا کر لاہور اور سیالکوٹ محاذ کے کچھ ''بہادروں'' کو بہادری کے تمغے دینے کے لیے پہنچ گیا۔ اور ان تمغہ لینے والوں میں بریگیڈیر قیوم شیر بھی تھا۔ جس نے جب تمغہ لینے کے لیے اپنی چھاتی آگے کی تو یہ عاجز اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ پھر ندامت کے ساتھ میرا سر جھک گیا۔ کہ ان تمغہ لینے والوں میں اگر ایک آدمی بھی لڑائی بہادری سے لڑا ہوتا تو وہ کہتا ''جہنم میں جائیں یہ تمغے۔ دشمن ہماری دہلیز پر بیٹھا ہے'' کونسے تمغے؟ اور کونسی بہادری؟ ''قارئین! یہی بڑا المیہ ہے کہ ہم نے اپنی فوج کو اسلامی غیرت کی تربیت نہ دی۔ کلبوں میں بے حیائی کی زندگی کا مظاہرہ کیا۔ تو آج جھوٹی کہانیوں پر تمغے لینے کو کیسے عار سمجھا جاتا کہ سقوط ڈھاکہ کے سبب پیدا ہو رہے تھے۔ ''کہ شرم تم کو مگر نہیں آتی'' کی تلمیح کو اپنی روزمرہ زندگی سے ہم دیس نکالا دے رہے تھے۔ یہ عاجز ان حالات کو کیسے برداشت کرتا رہا۔ کیپٹن صفدر کی مہربانی کہ وہ مجھے حالات کے ساتھ ''گزارا'' کرنے کا مشورہ دیتا رہا تھا اور ساتھ سچائی کو قائم رکھنے پر کاربند رہنے کی صلاح بھی دیتا تھا۔ اور کہنے لگا یونٹ کے اتنے جوانوں نے جو بہادری دکھائی ہے۔ اُن کی سفارشات تم نہ لکھو گے تو اور کون یہ کام کر سکتا ہے کہ کچھ صحیح لوگوں کو بھی کچھ بہادری کے تمغے ملیں۔ اب میرے لیے یہ کام بڑا مشکل تھا کہ عام طور پر اپنے ماتحتوں اور جونیئر کی سفارشات لکھی جاتی ہیں۔ لیکن میں نے اپنے سے سینئر اپنے کمانڈر افسر گول والا کی سفارش بھی لکھنا تھی۔ جو پارسی تھا۔ اور غیر مسلم ہوتے اس طرح دشمن کے خلاف ڈٹ گیا۔ تو جونیئر کیلئے میں نے زیادہ تر شہداء کی سفارشات لکھیں اور اپنی کمپنی کے علاوہ صوبیدار رستم خان کے ساتھ مشورہ کر کے کیپٹن صغیر کی کمپنی اور بٹالین ہیڈ کوارٹر والوں کی سفارشات بھی لکھیں۔ بلکہ میں تو امدادی یونٹ والے بکتر بند دستوں کے میجر سرور شہید اور افتخار جعفر شہید اور توپخانہ کے میجر اوپل شہید کی سفارشات بھی لکھنے کو تیار تھا۔ لیکن اُن کے یونٹ والوں نے کئی اوروں کو ''دعویدار'' بنایا ہوا تھا۔ اور خاص کر میجر نذر حسین نے بکتر بند دستوں کے شہداء افسروں کی کامیابیاں بھی اپنے کھاتے میں ڈال کر اپنے لئے اعزاز حاصل کر لیا اور یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

بے شک میرے سخت رویہ اور پستول اٹھانے کی وجہ سے ہمارے کرنل گول والا اور ہماری پلٹن کے شہداء افسران کو بہادریوں کے تمغے مل گئے۔ لیکن اوپر والے نہ سچی کہانی کو اخباروں میں جانے دیتے تھے اور نہ ان اتنے زیادہ شہداء کے نام پر کسی سڑک کو موسوم ہونے دے رہے تھے کہ قوم کو معلوم نہ ہو جائے کہ اس عظیم قربانی میں اوپر والوں کی کچھ نالائقی اور کوتاہی بھی سامنے آ جاتی تھی اور یہ سب شہداء لاہور کے فوجی قبرستان کے ایک شہید گنج میں مدفون ہیں، جو ہر وقت خوشبو سے مہکتا رہتا ہے۔

فائر بندی کی جو صورتحال تھی۔ اس میں کسی ملک کو یعنی بھارت یا ہمیں ایک دوسرے پر برتری نہ تھی۔
ذوالفقار بھٹو نے جنگ کے بعد پینترا تبدیل کیا کہ وزارت خارجہ نے یہ تو نہ کہا کہ اپنے ذمہ داری کے علاقوں میں فوج چوکنی نہ رہے۔ انہوں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ سرحدوں پر اور خاص کر واہگہ روڈ پر فوجوں کا ایسا اجتماع نہ ہو کہ آتے جاتے لوگ یہ کہہ سکیں کہ پاکستان والے بھارت کے ساتھ جنگ کی تیاری کر رہے تھے۔ لیکن یہ قوم کو بے وقوف بنانے والی باتیں ہیں۔ کیا ایوب خان اور محمد موسیٰ کو معلوم نہ ہو گیا ہو گا۔ کہ ہمارے امریکی مہمانوں نے بھارتیوں کو محاذ دکھا دیا کہ لال بہادر شاستری کو جنگ میں ''دھکا'' دینا تھا۔ کیا ایوب اور موسیٰ کو اس پارٹی کا پتہ نہ چل گیا ہو گا کہ لاہور کے بڑے کمانڈروں جنرل سرفراز اور بریگیڈئر قیوم شیر وغیرہ کو 5/6 ستمبر رات کو نشے میں دھت کیا گیا تھا لیکن اوپر والے قوم کو سچی باتیں نہیں بتاتے۔ اس لئے ایوب خان ذوالفقار بھٹو کے ساتھ ''گزارا'' کر رہا تھا کہ کچھ سمجھوتہ ہو جائے تو پھر وہ بھٹو کو ''فارغ'' کر دے گا یا اس سے جان خلاصی کرے گا اور بھٹو کو بھی معلوم تھا کہ ایوب خان کی حکومت میں اس کیلئے کوئی ''جگہ'' نہیں ہے اور جلد اس کو نکال دیا جائے گا۔ اس لئے اس نے کب سے پینترا تبدیل کیا ہوا تھا۔ اقوام متحدہ میں اس نے رونے کا ڈرامہ رچایا اور بھارت کے ساتھ ہزار سال جنگ کا جھوٹا نعرہ لگایا اور پھر ''مجبوری'' کے ساتھ اقوام متحدہ کے تحت فائر بندی قبول کی۔ اور اپنی لابی سے یہ تاثر دیا کہ وہ تو جنگ کے جاری رکھنے کے حق میں تھا۔ ایوب خان دل چھوڑ گیا ہے اور ایوب خان کے پاس کوئی جواب نہ تھا کہ وہ واقعی دل چھوڑ چکا تھا کہ اس کو کئی لحاظ سے اور کئی ''میدانوں'' میں مایوسی ہوئی۔ بھٹو اور اختر ملک نے ایوب خان کے ساتھ دھوکہ کیا۔ اس کو جنگ میں دھکا دینے کا ڈرامہ بھی رچایا اور لاہور بھارت کے حوالے کر کے ایوب خان اور فوجی کمانڈ کو بدنام کرنا بھی ان کا مقصود تھا۔ جس میں وہ کامیاب نہ ہوئے۔ لیکن فوج میں بھی کچھ لوگوں نے نااہلیت کا مظاہرہ کیا اور جون 1994ء کے نوائے وقت میں الطاف گوہر کہتا ہے کہ ایوب خان کو معلوم ہو گیا تھا کہ جنگ کے دوران اور اپنی کارروائیوں کے سلسلہ میں کافی لوگوں نے جھوٹ بولے ہیں اور ایوب کا اپنے ماتحتوں پر سے اعتبار اتر گیا تھا۔

قارئین اصلی بات یہ ہے کہ ایوب خان دل کا بھی چھوٹا آدمی تھا اور اس جنگ نے اس کو ''ادھ موا'' کر دیا تھا۔ لیکن جو چیز اس کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جب اوپر والے جھوٹ پر گزارا کریں گے اور ایوب خان خود بغیر کشمیر میں داخل ہونے کے کشمیر کی جنگ میں بہادری کا تمغہ ہلال جرأت حاصل کر چکے تھے تو نیچے والے ضرور جھوٹ بولیں گے اور یہ ایک قومی المیہ ہے اور اس کے متعلقہ دوسرا المیہ یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنی غلطیاں تسلیم کر کے توبہ و ندامت کو تیار نہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو یہ رویہ بہت پسند ہے تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی کہ یہ ملک اس کی رحمت کی وجہ سے چل رہا ہے۔

تو تاشقند کا سمجھوتہ اقوام متحدہ کی بھی ''ضرورت'' تھی اور بڑی طاقتوں کی بھی کہ وقتی طور پر امن ہو جائے اور بھارت اور پاکستان دونوں کی ''ضرورت'' تھی کہ یا جنگ کریں یا پہلے کی طرح پھر خاموش بیٹھ جائیں کہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ باطل اور حق کی اس جنگ کے آخری فیصلہ کا وقت نہ آیا تھا کہ ہم نے پورے طرح حق والے بننے کی کوئی کوشش نہ کی اور اس جنگ سے کچھ حاصل نہ کیا اور نہ امن کے سمجھوتہ سے کچھ حاصل کر سکتے تھے۔

بھارت بھی ہمیں شکست تو نہ دے سکا اور کچھ حاصل نہ کیا لیکن اس نے کھویا بھی کچھ نہیں تھا۔ کشمیر پر غاصب کے طور وہ اپنا قبضہ برقرار رکھ سکتا تھا اس لئے تاشقند کا ''اکٹھ'' یا ''اجتماع'' بھارت اور پاکستان کیلئے ایک بہانہ (Face Saving) کا موقع پیدا کیا جا رہا تھا۔ یا صلح کا ''بہانہ'' بنایا جا رہا تھا۔ البتہ لال بہادر شاستری جنگ کے نام سے کانپ اٹھتا تھا اور جنگ کے زمانے میں رات کو ایوانِ صدر میں جا کر پناہ لیتا تھا۔ جب فائر بندی ہوئی تو اس کی جان میں جان آئی۔ وہ پاکستان کو کچھ دیئے بغیر صلح کا اتنا خواہشمند تھا کہ جب تاشقند کا معاہدہ ہو گیا تو وہ یہ خوشی نہ برداشت کر سکا اور زندگی کی ''بازی'' ہار گیا کہ تاشقند ہی میں وہ مر گیا۔ معاہدہ کا ڈرافٹ پاکستان کی طرف سے ذوالفقار بھٹو نے ہی تیار کیا تھا لیکن اس کو معلوم تھا کہ اس کے بعد اس کی چھٹی ہو جائے گی۔ اس لئے پاکستان واپس پہنچ کر اس نے حسب معمول ''ڈرامے'' شروع کر دیئے کہ اسلام آباد ہوائی اڈے پر منہ بنا کر وہ ایک طرف ہو گیا کہ اخبار نویسوں کو یہ تاثر دے کہ یہ معاہدہ ایوب خان نے کیا تھا۔ وہ بھارت سے بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا اور ہم نے ستمبر 65ء کی جنگ میں جو ''فتوحات'' حاصل کی تھیں۔ ان کا کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور جیتی ہوئی بازی' امن کی میز پر ہار گئے۔ اب ایوب خان اور محمد موسیٰ جو ستمبر 65ء کی جنگ کو ''فتح'' قرار دے چکے تھے وہ لاجواب تھے کہ کس منہ سے کہتے کہ یہ ہماری فتح نہیں۔ قارئین یہ ہوتے ہیں جھوٹ کے نتائج اور جو جتنا بڑا جھوٹا ہو وہ قوم کو زیادہ بے وقوف بناتا ہے۔ بھٹو نے ''تاشقند کے راز'' کے نعرہ سے جس طرح ہماری قوم کو بے قوف بنایا اور آج تک کچھ لوگ بھٹو کو ایک ''ہیرو'' سمجھتے ہیں اور بہت بڑا سیاستدان تو سیدھی بات یہ ہے کہ جو بہت زیادہ جھوٹا ہو وہ بہت بڑا سیاستدان ہوتا ہے۔

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

بھٹو نے کئی دفعہ اعلان کیا کہ وہ تاشقند کے راز ظاہر کر دے گا اور کئی ڈرامے کئے کہ حکومت اس کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے رہی۔ لیکن جب وہ خود حاکم بنا تو کہنے لگا کہ مصلحت اجازت نہیں دیتی کہ بات کا اظہار کیا جائے اور اب وہ طاقت یا حکومت پر براجمان ہو گیا ہے۔ اس لئے تاشقند کا معاہدہ بے وقعت ہو گیا ہے۔ یعنی راز یہ تھا کہ اس وقت بھٹو طاقت میں نہ آ سکا۔ یہ راز رہ گیا تو اس عاجز نے 1985ء میں اس عنوان سے دو کتابیں لکھیں جن میں ایک کا نام ''تاشقند کے اصلی راز'' رکھا کہ اے قوم تمہارے ساتھ کیسے فراڈ کیا جاتا ہے اور بعد میں ایک اور کتاب لکھی کہ تاشقند کے رازوں کا مصنف ''پنڈورا باکس'' کھولتا ہے اور یہ مضامین اسی سلسلہ کی کڑی ہیں کہ اے قوم مومن بنو۔ مومن کی فراست کے حامل بنو کہ جھوٹے رہنما 59 سالوں سے تمہارے ساتھ فراڈ کر رہے ہیں۔

اس عاجز نے فائر بندی کے بعد اپنی تبلیغ کا یہ سلسلہ جاری رکھا کہ ہم اپنے دشمنوں کے ارادوں کو سمجھیں اور ہمیں پہچان ہونا چاہیئے کہ اینگلو امریکن بلاک والے ہمارے اصلی دشمن ہیں اور بھارت اور ان دونوں کی کئی قدریں ''مشترک'' ہیں کہ مسلمان کو مسلمان نہ چھوڑو اور ہماری ضرورت یہ ہے کہ ہم مومن بنیں۔ میرے ماتحتوں نے جو عظیم قربانی دی اور آخری جوان اور آخری گولی تک لڑے۔ اس کا کچھ نتیجہ تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا

کہ فائر بندی والے دن جب ہم نے بڑی محبت کے ساتھ اپنے ستر شہداء کو میدان جنگ سے اٹھا کر عزت کے ساتھ ایک شہید گنج میں دفن کیا۔ جب یہ مناظر مجھے یاد آ جاتے ہیں تو میرے اردگرد خوشبو کی مہک پھیل جاتی ہے۔ بھارتی اپنی لاشوں کی ٹانگوں کے ساتھ رسی باندھ کر جن لاشوں کو ہمارے سامنے سے کھینچ کر لے گئے ان کی تعداد چار پانچ سو ضرور ہو گی اور 22 ستمبر کو صبح سویرے ہماری پوزیشن کو روندنے سے پہلے ہم نے پہلے پوزیشن پر ان کی سینکڑوں لاشیں دیکھی تھیں۔ جن کا تعلق ان کی ڈوگرہ اور پنجاب پلٹن سے تھا جو 21/22 ستمبر ساری رات ہمارے ساتھ برسر پیکار رہے تھے۔ جاٹ پلٹن کا نقصان بھی اتنا ہو گا اور کچھ بھارتی لاشیں اُن کے مقبوضہ علاقوں میں ہوں گی۔ لیکن ہمارے سینئر افسروں کو خطرہ یہ کھائے جا رہا تھا کہ تاشقند کے سمجھوتے کے بعد جو فوجی چھاؤنیوں میں واپس جائیں گے تو میں اخبار نویسوں کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے یا محکمہ تعلقات عامہ میں نوکری کی وجہ سے یا ایوانِ صدر میں رہنے کی وجہ سے' جو کافی لوگوں کو جانتا ہوں تو میں اوپر والوں کی کوتاہیوں سے قوم کو آگاہ کر دوں گا کہ میرے ساتھ جنرل سرفراز نے جس انکوائری کا وعدہ کیا تھا اور کہتے تھے کہ امن بحال ہونے کے بعد پوری انکوائری کریں گے۔ ان کا کسی انکوائری کا ارادہ نہ تھا بلکہ اوپر جی ایچ کیو تک ایسی غلطیاں ہوئی تھیں۔ اگر پوری چھان بین کی جاتی اور کوتاہ بینوں کو اگر محمد غوری کی طرح ''تو برے'' چڑھانے کی سزا نہ دی جا سکتی تو کچھ سزا ضروری تھی اور کچھ وعدوں کی ضرورت تھی کہ آیئے ہم آئندہ سچ بولیں۔ تو تب بھی ہم سقوط مشرقی پاکستان سے بچ جاتے۔

لیکن طریقہ یہ اختیار کیا کہ گو جی ایچ کیو نے خبر بھیج دی تھی کہ میں اب مردان نہ جاؤں گا اور سولہ پنجاب کے ساتھ رہوں گا۔ لیکن دوبارہ جی ایچ کیو کے ساتھ ''ملاپ'' کر کے میرے لئے' جنوری 1966ء میں یہ احکام آئے کہ میں جلدی مردان پہنچوں اور ایک نئی پلٹن کھڑی کروں کہ گو سنیارٹی سے میرے کرنل بننے کا کوئی موقع نہ تھا لیکن میری نوکری' پہلے تجربے اور جنگ کی کارروائی کے مدنظر مجھے سپیشل طور پر کرنل بنا دیا جائے گا۔ مجھے معلوم تھا کہ مقصد مجھے لاہور سے ہٹانا ہے۔ لیکن میں نے یہ حکم بسروچشم مان لیا کہ ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' تو فروری کے دوسرے ہفتے ایک نئی پلٹن 35 پنجاب کھڑی کی اور حکم ملا کہ اس پلٹن کو کوئٹہ لے جائیں کہ وہاں انہی نئی یونٹوں سے ایک نیا ڈویژن کھڑا کیا جا رہا تھا۔ خیر مجھے کرنل کس نے بنانا تھا۔ نہ ساری زندگی میں نے کسی عہدہ کی خواہش رکھی لیکن دو تین ماہ جو میں نے اس پلٹن کی کمانڈ کی اور میرے کرنل کے آ جانے کے بعد بھی 1966ء میں ڈویژن کی ہر کانفرنس اور ہر مطالعہ اور جنگی مشق کے دوران' اپنی فوج کو اسلامی بنانے کے بارے اس عاجز نے جو کچھ زبانی کہا یا عملی طور پر کیا۔ وہ کئی کتابوں کا مضمون ہے اور کئی افسروں بلکہ مجھ سے سینئر کمانڈروں نے بھی میری ''تبلیغ'' سے اتفاق کیا۔ لیکن وہاں کوئٹہ ہی میں سنا کہ بری فوج کی سربراہی یحییٰ خان کو مل رہی ہے اب لڑاکا فوج کے ساتھ مزید وابستہ رہنے سے یہ عاجز کچھ زیادہ حاصل نہ کر سکتا تھا۔ اسی دوران ISPR والے چاہتے تھے کہ میں پھر ان کے ہاں آ کر جنگ کے تجربات کے سلسلہ میں کچھ بنیادی کام کروں۔ تو ملٹری سیکرٹری کوئٹہ آیا تو انہوں نے مجھے بلا کر بتلایا کہ میری درخواست پر کوئی انکوائری نہیں ہو رہی کہ ایسی انکوائری کرنا ''پنڈورا باکس'' کھولنا ہے اور وہ مجھے محکمہ تعلقات عامہ میں تبدیل کر رہے ہیں کہ میں وہاں کچھ لکھنے کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ تو اس طرح

دسمبر 1966ء میں یہ عاجز پاکستان بننے کے بعد تیسری دفعہ اور ویسے پانچویں دفعہ محکمہ تعلقات عامہ سے آ کر وابستہ ہو گیا اور پھر 1971ء کے "ڈرامہ" اور المیہ کو بہت نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا کہ ہم نے اپنی ماضی کی غلطیوں کا کوئی نوٹس نہ لیا تھا تو یہ المیہ تو ہونا تھا۔

"فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف"

نواب آف کالا باغ نے بھٹو کو گرفتار کرنے کی بجائے گورنر ہاؤس میں سرکاری مہمان بنا لیا

ذوالفقار بھٹو نے ایوب خان کو کئی مسائل سے دو چار کر دیا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں بھٹو خوش تھا کہ ایوب خان، بھٹو کے "اندرون خانہ" دوست یحییٰ خان کو بری فوج کی سربراہی سونپ چکا تھا۔ بھٹو کا اک اور ہم پیالہ اور دوست بریگیڈیئر گل حسن بھی میجر جنرل بن گیا تھا اور بریگیڈیئر پیرزادہ کو خاص طور پر میجر جنرل بنا دیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ "لو کیٹیگری" تھا اور اس طرح جو آدمی میڈیکل طور پر فٹ نہ ہوتا تھا اس کو پروموشن نہیں دیا جاتا تھا۔ نواب کالا باغ نے ایوب خان کو سمجھایا تھا کہ یحییٰ خان کو بری فوج کی سربراہی دے کر وہ بڑی غلطی کر رہا تھا۔ اور ایک دفعہ ایوب خان نے جنرل سرفراز کے حق میں فیصلہ کر دیا تھا۔ لیکن یحییٰ خان کی "لابی" اور کئی "چھپے ہاتھوں" نے ایوب خان کو باور کرایا کہ نور خان جو فضائی فوج کا سربراہ ہے وہ نواب کالا باغ کا رشتہ دار ہے۔ سرفراز کو بری فوج کا سربراہ بنا کر تم "اعوانوں" کے ہاتھوں میں "کٹھ پتلی" بن جاؤ گے اور جب وہ چاہیں گے، تمہیں کرسی سے اتار دیں گے۔ تو ایوب خان نے فیصلہ تبدیل کر دیا تو نواب کالا باغ نے ایوب خان کو مزید سمجھایا کہ اب ایوب خان، بھٹو کو وزارت سے نکالنے کی غلطی نہ کرے بلکہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہے۔ ورنہ وہ بہت بڑا لیڈر بن جائے گا۔ ایوب خان کو بات سمجھ نہ آئی اور چھپے ہاتھوں نے ایوب کو باور کرایا کہ نواب کالا باغ بھٹو کے ساتھ ملا ہوا ہے اس لئے چاہتا ہے کہ بھٹو وزارت پر قائم رہے تو ایوب خان نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اور بھٹو کو وزارت سے نکال دیا۔

بھٹو اپنے اس "جھٹکے" کا سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ تو وزارت چھوڑنے کے بعد اس نے ملک کی سب سے زیادہ "سیاسی زرخیز زمین" لاہور کو استعمال کرنے کے لئے وزارت چھوڑنے کے بعد لاہور کا راستہ لیا کہ سارا لاہور شہر اور نزدیک سے بپھرے ہوئے کم علم اور نادان لوگ امڈ کر لاکھوں کی تعداد میں لاہور ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ اب نواب کالا باغ بجائے اس کے کہ بھٹو کو گرفتار کر کے منظر سے ہٹاتا۔ اس نے اپنے ملٹری سیکرٹری کو بھیج کر بھٹو کو ریلوے سٹیشن پر "خوش آمدید" کہا اور گورنر کالا باغ کی طرف سے دعوت دی کہ وہ دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھائے اور بھٹو سرکاری کار میں گورنر ہاؤس پہنچ گیا اور لوگ دیکھتے رہ گئے کہ بھٹو کہاں گیا ہے؟ کسی نے بھٹو کی گرفتاری کی خبر افواہ کے طور پر پھیلائی تو کالا باغ نے ایک بجے کی خبروں میں اعلان کرا دیا کہ بھٹو گورنر کے مہمان کے طور پر ان کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں تو تمام اجتماع "ٹھنڈے" پڑ گئے۔ اور لوگوں کو کچھ سمجھ نہ آیا۔ وہ اپنے گھروں کو واپس چلے گئے لیکن ایوب خان، نواب کالا باغ کے ساتھ بہت ناراض ہوا کہ اس نے میرے دشمن کو ایسے پذیرائی کیوں دی تو نواب کالا باغ نے کہا کہ "ایوب خان! میں نے دہکتی آگ پر بروقت پانی ڈال کر اس

آگ کے پھیلاوے سے لاہور کو بچا لیا ہے اور پوری بات آپ کو اگلی ملاقات میں سمجھاؤں گا۔ نواب کالا باغ نے ایوب خان کو بہت سمجھایا کہ ذوالفقار علی بھٹو ایک ہوشیار کوے کی طرح بہت چالاک بہروپیا اور مداری قسم کا آدمی ہے۔ بھٹو کا مذہب کوئی نہیں وہ خود اہل سنت بنا ہوا ہے۔ لیکن اس کی بیوی شیعہ ہے اور ایرانی نسل ہے۔ اس لئے بھٹو کے ہر شیعہ کے ساتھ تعلقات ہیں خواہ وہ فوج کے جنرل محمد موسیٰ ہوں یا یحییٰ خان اور یہ تعلقات ایران کے رضا شاہ پہلوی تک بھی ہیں۔ اس کے تعلقات جنرل اختر ملک اور غلام کذاب کے پوتے ایم ایم احمد کے ذریعہ سے قادیانیوں کے ساتھ بھی ہیں اور قادیانی ایک ایسے بے دین آدمی کو پاکستان کا سربراہ دیکھنا چاہیں گے۔ اخباری دنیا میں کافی لوگ ''بے دین'' ہیں۔ ان میں سے کچھ تو اپنے آپ کو کھلے طور پر سوشلسٹ کہتے ہیں، گو اندر سے یہ لوگ ابن الوقت اور سب کچھ اپنے مطلب کے لئے کرتے ہیں۔ ذوالفقار بھٹو کے اس لئے انفارمیشن میڈیا کے ساتھ اتنے گہرے تعلقات ہیں کہ ان میں سے اکثر بھٹو کا ساتھ دیں گے اور اس نے جو عوام کا نمائندہ بننے کا ''لبادہ'' اوڑھا ہوا ہے یا آزادی کے جھوٹے نعرے لگاتا ہے تو ملک کا سنجیدہ طبقہ اور سنجیدہ اخبار نویس بھی اس کی مخالفت نہ کریں گے۔ اور اینگلو امریکن بلاک کا بھی یہ ضرور ''پسندیدہ'' آدمی ہوگا کہ ان کو بھی ایک ایسے بے دین آدمی کی ضرورت ہے۔

نواب صاحب نے ایوب خاں سے کہا میں تو جا رہا ہوں میرے بعد آپ بھی چلے جائینگے

قارئین! میں نے جو کچھ اوپر لکھا ہے میں اس سلسلہ میں اور بھی بہت معلومات رکھتا ہوں کہ گورنر ہاؤس میں میرے چند رشتہ دار نوکری کرتے تھے اور نواب صاحب ان مخلص آدمیوں کے ساتھ مشورہ بھی کر لیتے تھے اور ان کو بہت کچھ بتا بھی دیتے تھے حالانکہ یہ کوئی بڑے افسر نہ تھے اور نواب کالاباغ کی ایوب خان کے ساتھ جو آخری بات ہوئی تو وہ اس نے ان مخلص لوگوں کو اپنے استعفیٰ دینے کے بعد صاف بتا دی کہ وہ جا رہا تھا کہ اس نے ایوب خان کو صاف کہا کہ یحییٰ خان کی ''لابی'' اور خفیہ سروس کے کچھ بے کردار لوگ جن میں اس نے اے بی اعوان کا نام بھی لیا کہ اعوان نہیں ہے اس نے اعوان ہونے کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔ ایوب خان کو غلط خبریں دے رہے ہیں کہ میں اس کی جگہ لینا چاہتا ہوں۔ ہم اعوان وفادار اور لج پال لوگ ہوتے ہیں اور کسی پر چھپ کر وار نہیں کرتے۔ میں نے جہاں پہنچنا تھا وہاں ''پہنچ'' چکا ہوں کہ میں یتیم رہ گیا تھا۔ دشمن بہت زیادہ تھے۔ میری ماں کو ڈر رہتا تھا کہ کوئی مجھے کسی طرح قتل یا ختم کر کے ہماری جائیداد کا وارث بننے کی کوشش کرے گا تو میری ماں اپنے دل کو طاقت دینے کے لئے کہ میں بچ جاؤں گا اور بڑا آدمی بن جاؤں گا پنگوڑے میں مجھے یہ لوری دیتی تھی ''پتر بنے لاٹ پنجاب دا'' یعنی میرا بیٹا پنجاب کا گورنر بن جائے۔ جس عہدہ پر اس زمانے میں صرف انگریز ہوتے تھے اور کسی دیسی کا وہاں پہنچنا مشکل تھا لیکن رب کے رنگ کہ حالات ایسے تبدیل ہو گئے کہ میں پورے مغربی پاکستان کا گورنر بن گیا اور اتنے سال سے اس عہدہ پر ہوں۔ اب میں عزت کے ساتھ اس عہدہ سے ریٹائر ہونا چاہتا ہوں کہ تمہارے اور میرے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ دور نہیں ہو سکتیں لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ میرے جانے کے بعد آپ بھی اس عہدہ پر زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔ یہ بات میں اس لئے نہیں کہہ رہا کہ تم مجھے گورنر

رکھو۔ میرا فیصلہ اٹل ہے اور یہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔ میں یہ عہدہ کل چھوڑنے کے لئے تیار ہوں لیکن تمہیں ایک ماہ کی مہلت دیتا ہوں کہ میرا جانشین تلاش کر لو۔ ایوب خان کو غلط مشورہ دینے والے پہلے سے تیار تھے کہ جنرل محمد موسیٰ جو ریٹائر ہو کر ایران میں سفیر کے طور پر جانے والا تھا اور کرنل طارق میر کو وہاں اپنی ''ایڈوانس پارٹی'' کے طور پر ملٹری اتاشی بھی بھیج چکا تھا ایسا ''بے وقعت'' آدمی نواب کالاباغ کا ''جانشین'' بنے کہ وہ لوگ سیاست کے کھیل کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں گے۔

یہاں یہ گزارش ضروری ہے کہ نواب کالاباغ ایک کتاب کا مضمون ہے۔ اس کی دیانتداری اور اصول پکے تھے کہ غیر عورت کی طرف وہ نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ 61-1960ء میں ملکہ الزبتھ پاکستان آئی تو اس نے انگریزوں کو پہلے ہی بتا دیا کہ وہ ملکہ کو خوش آمدید ضرور کہے گا لیکن ملکہ ہاتھ آگے نہ بڑھائے کہ وہ غیر محرم عورت سے ہاتھ نہ ملائے گا۔ لیکن وہ سخت کینہ پرور بھی تھا اور ذاتی دشمنی میں کئی حدیں ''پھلانگ'' جاتا تھا اور اس سلسلہ میں کچھ ظالمانہ کارروائیاں بھی کیں۔ علاوہ ازیں حکومت کے مخالفین کو سختی سے کچل دیتا تھا اور اس سلسلہ میں بھی کچھ ظالمانہ کارروائیوں کی باتیں عام ہیں کہ خاص کر مسلمان طلباء پر بھی کئی دفعہ ظلم کئے تو وہ بھی ''عبرتناک انجام'' سے نہ بچ سکا اور اپنوں کے ہاتھوں یا ''ضرورت'' کے تحت قتل ہوا اور اس کا بڑا بیٹا کئی بددیانتیوں کی وجہ سے مقدموں میں ملوث رہا تھا اور اس کی دونوں پوتیاں سمیرا ملک اور عائلہ ملک اب اسمبلی کی ممبر ضرور ہیں لیکن جس طرح بے پردگی کے ساتھ وہ پھر رہی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کسی خاندانی رکھ رکھاؤ کا خیال نہیں اور نواب کالاباغ کے ظلموں کی وجہ سے اس کی غیر محرم عورت سے دور رہنے والی اچھائی کی روایت بھی آگے نہ چل سکی۔
(فاعتبروا یا اولی الابصار)

نواب کالاباغ کی ایوب خان کے بارے پیش گوئی بھی صحیح ثابت ہوئی کہ وہ اس کے بعد تقریباً دو سال کرسی پر رہ سکا لیکن اگر نواب کالاباغ کو نہ ہٹاتا تو بھی نواب کالاباغ اور ایوب خان نے اس حشر سے دوچار ہونا تھا جس سے ہوئے۔ چند ماہ یا ایک آدھ اور سال نکال جاتے کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے۔ یہاں جو کچھ کرے گا اس جہان میں بھی عبرتناک انجام سے دوچار ہوگا اور آخرت کی سزا الگ ہے۔ ستمبر 1965ء کی جنگ کے دوران مجھے اشارہ ہوا کہ تمہارے ننھیال' جناب سلطان باہوؒ صاحب کے معتقد تھے۔ ''اے سپاہی اس جنگ کے بعد وہاں حاضری ضرور دینا''۔ مجھے یہ موقع 1967ء کے اگست کے مہینہ میں مل سکا اور اپنے اور بھائی کے بچوں کے ساتھ وہاں حاضری دی۔ اول اشارہ یہ ہوا کہ اپنے سلطان' سلطان مہدیؒ کو نہ بھولنا۔ وہاں حاضر ہوتے رہنا اور دوم دربار سے باہر نکلے تو ایک اجنبی آدمی نے پشتو لہجہ میں آ کر سلام دیا اور کہنے لگا ''پنڈی سے آئے ہو پنڈی سے؟'' عرض کی کہ ''جی ہاں'' کہنے لگا ''اکبر بادشاہ کا کیا حال تھا؟'' مجھ ایسے لگا کہ یہ اشارہ ایوب خان کی طرف ہے لیکن میرے منہ سے نکل گیا ''کونسا اکبر بادشاہ؟'' تو اس مجذوب قسم کے نوجوان پٹھان نے مجھ پر ایسی سخت نگاہ ڈالی جو میرے لئے برداشت کرنا مشکل تھی کہ جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ جب بات سمجھ گئے ہو تو پھر سوال کیوں کیا ہے؟ تو میں نے معذرت کی اور کہا کہ آپ نے میرے تجسس کو پسند نہیں کیا تو یہ جواب دے دیتا ہوں کہ وہ ٹھیک ٹھاک ہے تو وہ مجذوب مسکرا دیا اور کہنے لگا ''چلا جائے گا' چلا جائے گا''۔

پاکستان بنا کر رب کی ذات پاک ہم سب کو بڑے امتحانوں میں ڈال رہی ہے۔ ویسے سب نے ''چلے'' جانا ہے لیکن کس کو اس دنیا میں بھی ''بقائے دوام'' ملتا ہے اور کسی کے چہرے سورۃ آل عمران اور سورۃ القیامت کے بیانات کے مطابق آخرت میں روشن اور ''ناضرہ'' ہونگے اور کن بدقسمتوں کے چہرے سیاہ اور ''باسرہ'' ہونگے۔ یہ دنیا ایک گلوبل ولیج یعنی ایک شہر یا گاؤں بننے کے نزدیک پہنچ گئی ہے۔ کیا کافر لوگ یا غیر مسلم اس دنیا کے حکمران ہونگے؟ تو جنگ و جدل کا یہی حال رہے گا۔ ہمارا ایمان ہے کہ قیامت سے پہلے دینِ اسلام کے پیروکار ہی اس دنیا کے حکمران ہونگے۔ آج ہم مسلمان ایک مغلوب قوم ہیں۔ اس سائنس اور ٹیکنالوجی کے زمانے میں کفار سے مقابلہ کر کے ہمارا وہی حال ہوگا جو افغانستان اور عراق کا ہوا ہے۔ تو آیئے ہم سورۃ الحجرات میں جو مسلمان اور مومن کا فرق بیان کیا گیا ہے کہ ایمان ایک باطنی عمل بھی ہے اس کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ رب کی ذات پاک سورۃ النساء میں وعدہ کرتے ہیں کہ کافر کبھی مومنین پر غلبہ حاصل نہ کریں گے اور سورۃ الروم میں زیادہ واضح فرمایا کہ رب کی ذات مومنین کی مدد کرتی ہے۔ کسی جگہ یہ نہ فرمایا کہ مسلمانوں کی مدد ہوگی اور یہ عاجز عملی طور پر مثالیں پیش کرتا آ رہا ہے کہ چونکہ پاکستان میں ہم نے اجتماعی طور پر ''کل مومن اخوۃ'' بننے کی کوشش نہیں کی تو ہم ان عبرتناک انجاموں سے دوچار ہو رہے ہیں لیکن بچے ہوئے اس لئے ہیں کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے اور کوئی نہ کوئی مومن ہمارے بیچ موجود ہوتا ہے۔

بعض لوگ ایوب خان کو اکبر بادشاہ بنانے پر تلے ہوئے تھے

بہر حال یہ عاجز مضمون کی طرف واپس آتا ہے، سلطان باہو صاحبؒ کے مزار پر حاضری کے بعد راولپنڈی واپس آیا تو ایوب خان کے خلاف تحریک جنم لیتی ہوئی نظر آ رہی تھی لیکن ایوب خان اس سے ''بے خبر'' تھا اور اپنی حکومت کے آخری ایام میں اس نے اکبر بادشاہ بننے کی کوشش بھی کی اور جی ایچ کیو کے سنجیدہ فوجی افسران نے کھلم کھلا یہ کہنا شروع کر دیا کہ اسلام کے بارے میں اپنی کم علمی کی وجہ سے لوگ اس کو ''اکبر بادشاہ'' بنانے پر تلے ہوئے ہیں اور الطاف گوہر، فیضی اور ابوالفضل برادران والا کردار ادا کر رہا تھا اور قوم کو معلوم ہے کہ ایوب خان نے 1968ء کا سال ایوب خان کی حکومت کے سنہری نتائج کے دس سال منانے کا اعلان کر دیا اور ایوب خان سے کچھ حالات معلوم کر کے الطاف گوہر نے ایوب خان کی طرف سے ایک کتاب "Friends not Masters" بھی لکھ ڈالی اور سرکاری خرچ پر اس کتاب کی ہزاروں (ممکن ہے لاکھوں) کاپیاں طبع کرائیں اور ایوب خان اپنی ''کم علمی'' کی وجہ سے اس کتاب کو ایک مقدس کتاب یا صحیفہ سمجھتا تھا اور اس خیال کا حامی ہو گیا تھا کہ پاکستان میں اس کی سمجھ کا کوئی آدمی پیدا ہی نہیں ہوا اور ہر آمر کی طرح بے چارہ ''حجاب اکبر'' کا شکار ہو گیا جیسے بیس پچیس سال پہلے ایران کے رضا شاہ پہلوی نے ایران کی اڑھائی ہزار سالہ بادشاہت کا جشن منایا تو کئی سنجیدہ آدمیوں نے کہہ دیا تھا کہ بیسویں صدی میں اس ''جشن'' کا منانا بہت بڑا مذاق ہے کہ پھر شاہ ایران کے جانے میں دیر نہ لگی۔ قارئین! ان مضامین کے شروع میں گزارش کی تھی کہ ہمارے آقا ﷺ نے فرمایا ''جس نے پہچانا اپنے نفس کو اس نے پہچانا خدا کو۔'' یہ جن لوگوں کو ''بڑائیاں'' مل جاتی ہیں وہ بڑی غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آؤ ہم ان کی

غلطیوں سے اسباق سیکھیں۔

بہرحال ایوب خان کی ان آخری سالوں کی غلط فہمیوں اور کارروائیوں کو لوگ بھول گئے ہیں کہ الطاف گوہر اس کو کیا کچھ نہ بتا رہا تھا۔ یحییٰ خان یہ تماشے دیکھ کر مسکراتا تھا کہ ایوب کو "دھکا" دیکر گرانا اب بڑا آسان ہو گا۔ صرف اس کو ڈر یہ تھا کہ ایوب خان پھر کہیں جا کر نواب کالاباغ کے ساتھ مشورہ نہ کر لے۔

اس لئے کالاباغ کی' اس موت کے اسباب میں یحییٰ خان اور اس کے بھائی محمد علی جو جنرل محمد موسیٰ کا مشیر خاص تھا' کا کچھ نہ کچھ ہاتھ ضرور تھا کہ نواب کالاباغ کے جس بیٹے نے باپ کو قتل کرنے کی بات تسلیم کی اس کی بیوی ریاست ھنزہ کی تھی اور خاندانی جھگڑوں میں اس عورت نے باہر کی کسی شہ سے بڑا بھرپور حصہ لیا تھا لیکن اصلی بات یہ تھی کہ یحییٰ خان' فضائی فوج کے سربراہ نور خان پر پٹو ڈال کر اس کو "بے وقوف" بنا کر اپنے ساتھ ملانا چاہتا تھا۔ اگر کالاباغ زندہ رہتا تو وہ نور خان کو کبھی اجازت نہ دیتا کہ وہ یحییٰ خان سے ایسی دوستی گانٹھے کہ یحییٰ خان نے وقتی طور پر نور خان کو ساتھ ملا کر اس کا فائدہ اٹھایا اور پھر "ٹشو پیپر" کی طرح نور خان کو پھینک دیا کہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کیا گندی کھیلیں کھیلی جاتی ہیں (توبہ میرے اللہ) ہماری قوم اسلامی فلسفہ حیات کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ ہر وقت انسان یہ سوچے کہ روز قیامت میں اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا۔

تو نواب کالاباغ کی وفات کے بعد یحییٰ خان ایک "رنگ ماسٹر" کی طرح بیٹھا تماشے کر رہا تھا۔ کبھی کسی ایکٹر کو آگے کرتا تھا کبھی دوسرے کو اور جنرل محمد موسیٰ کے ساتھ بڑا مشیر یحییٰ خان کا بھائی آغا محمد علی تھا۔ وہ محمد موسیٰ سے ایسے غلط کام کرا رہا تھا کہ اعوان قوم کا کوئی آدمی کسی اچھے عہدہ پر ہوتا تھا اس کو وہاں سے ہٹوا دیتا تھا حالانکہ گورنر مودی کے زمانے کے بھرتی کئے ہوئے گورنر ہاؤس کے معمولی یا چھوٹے نوکروں کو بھی جو اعوان تھے ان کو بھی وہاں سے نکالا جا رہا تھا کہ جنرل موسیٰ کے اردلی نائب صوبیدار نور محمد نے جنرل محمد موسیٰ کو سمجھایا کہ وہ ایسے ظلم سے باز آئے۔ جنرل محمد موسیٰ نے کیا گورنری کرنا تھی۔ اکثر اخباروں میں ایوب خان کی طرف سے یہ بات منسوب کی گئی کہ "پہلا یعنی کالاباغ کوئی بات مانتا نہ تھا اور یہ یعنی محمد موسیٰ کوئی بات سمجھتا نہ تھا"۔

تو جو لوگ ایوب کو ہٹانا چاہتے تھے وہ ہر میدان میں اپنا کام شروع کئے ہوئے تھے۔ بھٹو کچھ دب گیا تھا۔ سندھ میں ایک جگہ اس نے ایوب خان کے خلاف خوب زہر اگلا لیکن کسی بڑے اخبار نے ڈر کی وجہ سے اس سلسلہ میں کچھ شائع نہ کیا۔ یحییٰ خان کے بھائی محمد علی نے جنرل محمد موسیٰ کو شہ دی کہ وہ ایوب کا دفاع کرے تو جنرل محمد موسیٰ نے بھٹو کی باتوں کو غلط قرار دیتے جو بیان دیا وہ جب بڑے اخباروں میں شائع ہو گیا تو سب لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بھٹو نے ایوب پر کیا الزام لگائے تھے اور اس طرح بھٹو کو "اہمیت" مل گئی اور مغربی پاکستان میں وہ ایک لیڈر کے طور پر ابھرنے لگ پڑا۔

لیکن "رنگ ماسٹر" کے طور پر یحییٰ خان اور اس کا بھائی محمد علی اب مشرقی پاکستان کو الگ کرنے کی خفیہ کھیل جاری کئے ہوئے تھے۔ اس چیز کی کھوج تو بہت بعد میں نکلی کہ بنگلہ دیش کے جھنڈے اور اشتہار بھی لاہور میں آغا محمد علی بنا کر مشرقی پاکستان بھیجتا تھا۔ اصل میں ستمبر 65ء کی جنگ کے برے نتائج اور ان کے اثرات پر آج تک قوم نے غور نہیں کیا۔ ستمبر 65ء سے پہلے بنگالی فوجی مغربی پاکستان کے پٹھان اور پنجابی فوجیوں سے

بڑے ''مرعوب'' رہتے تھے اور وہ فوج میں برابری اور بڑے عہدے تو مانگتے تھے لیکن بھارتیوں سے بھی ڈرتے تھے کہ وہ کسی ''بنگلہ دیش'' جیسے ملک کا اکیلے دفاع نہ کر سکیں گے اور ان کو امید تھی کہ جب بھی کوئی جنگ ہوگی مغربی پاکستان سے فوجیں دہلی کو فتح کر لیں گی اور اسی میں مشرقی پاکستان کا خود بخود دفاع ہو جائے گا۔ ستمبر 65ء کی جنگ میں ہم امرتسر' جالندھر تک بھی نہ پہنچ سکے تو مغربی پاکستان کی فوج کا یہ ''بھرم'' بھی بنگالیوں کی نظر میں ختم ہو گیا اور ایک بنگالی پلٹن ایک غیر اہم اور غیر معروف جگہ پر لاہور اور قصور کے درمیان بی آر بی کا دفاع کر رہی تھی۔ جہاں کوئی خاص لڑائی نہ ہوئی تھی لیکن خواہ مخواہ بنگالیوں کو بھی ''پانچوں سواروں'' میں شامل کرنے کے وہ جھوٹے قصے گھڑے گئے اور کچھ کو بہادری کے تمغوں سے بھی نواز دیا گیا اور اخباروں میں خوب پذیرائی ہوئی کہ بنگالی سپاہی کی پٹھان اور پنجابی سپاہی سے ''مرعوبیت'' ختم ہو گئی اور مجیب الرحمٰن کو لیڈر بنانے والے دراصل اور سرکاری نوکروں کے علاوہ یہ بنگالی فوجی بھی تھے کہ ان کے بل بوتے پر مجیب الرحمٰن نے کھلم کھلا اگرتلہ کے علاقوں میں بھارت کے ساتھ بھی رابطے باندھنے شروع کر دیئے اور مغربی پاکستان میں دراصل یحییٰ خان کی لابی' سب قادیانی' سرکاری بیوروکریٹس میں الطاف گوہر کی قسم کے لوگ اور بھٹو کی لابی خفیہ طور پر بنگالیوں کو الگ ہونے کی شہ دے رہے تھے۔

لیکن اب اتنے مضامین کے جائزوں سے یہ ثابت کرنا بھی بہت ضروری ہے کہ 1962ء سے 1965ء تک کسی وقت بھی پاک و بھارت جنگ میں دہلی تک پہنچ جانا ہمارے لئے بہت آسان تھا کہ ہم واقعاتی طور پر ثابت کریں گے کہ بکتر بند اور توپخانہ میں ہمارے ہتھیار بھارتیوں سے کارکردگی میں اتنے بہتر تھے کہ جنگ کی دو اہم ''ضرورتوں'' میں ہمیں بھارت پر برتری حاصل تھی۔ اوّل ضرورت دشمن کی سخت سے سخت جارحانہ کارروائی کو روکنا ہوتا ہے اور یہ کچھ ہم نے سیالکوٹ محاذ پر عملی طور پر جنگ کے شروع ہوتے ہی ثابت کر دیا تھا اور ستمبر 65ء کی جنگ پر پہلے ہی بھرپور مضامین میں یہ کچھ بیان ہو چکا ہے۔ دوسری ضرورت یہ ہوتی ہے کہ دشمن کے دفاع میں ''بنیادی شگاف'' ڈال دینا اور یہ کچھ ہم نے قصور' کھیم کرن کے محاذ پر حاصل کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں ہم بھارت کی نسبت مقابلتاً بہتر طور پر Interior Lines پر لڑ رہے تھے اور کسی ایک محاذ سے فوج دوسرے محاذ پر جلدی لے جا سکتے تھے کہ قصور محاذ سے جا کر سیالکوٹ محاذ پر بکتر بند دستوں کی برتری بھی حاصل کر لی تھی اور جنگ کے آخری دنوں میں بھارتی بکتر بند طاقت کو تباہ کرنے کے قابل ہو گئے تھے لیکن افسوس ہم نے اپنی نااہلیوں' کوتاہیوں اور کم دلیوں کی وجہ سے اپنی کسی برتری کا فائدہ نہ اٹھایا اور اس سلسلہ میں اپنی بہت بڑی غلطی کی بھی یہ عاجز نشاندہی کر چکا ہے کہ ہمارے پاس پیدل فوج کی کمی تھی اور جو پلٹنیں ہم نے ستمبر' اکتوبر 65ء میں کھڑی کیں اگر ان کو جولائی' اگست 65ء ہی میں کھڑا کر دیتے تو دہلی تک پہنچنا بہت آسان تھا اور بھارت کی ساری فوج جو کشمیر میں تھی وہ یا تتر بتر ہو کر پہاڑی راستے ہماچل کے علاقوں کو استعمال کر کے بھارت بھاگ جاتے یا ہماری قید میں ہوتے۔

اب میرے ان بیانات' جائزوں اور سوچوں کو آج تک کسی نے غلط نہیں قرار دیا یا مخالفت میں کچھ نہیں لکھا تو اب میں (چھوٹا منہ اور بڑی بات) پورا تجزیہ پیش کرتا ہوں کہ ہماری فوجی قیادت نے اگر کشمیر میں گوریلے یا کمانڈو بھیجتے وقت یہ نہ سوچا تھا کہ بھارت جوابی طور پر ہم پر حملہ بھی کر سکتا ہے اور دونوں ملکوں میں جنگ بھی ہو سکتی

ہے اور جنگ کی صورت میں ہمارے لئے دہلی تک کے علاقے فتح کرنے ضروری ہیں۔ تو ان کی نااہلی یا کوتاہی پر مزید بحث کرنا فضول ہے اور یہ کچھ قوم کے سامنے ہے کہ ہماری عسکری قیادت نے کچھ بھی نہ سوچا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے ہمیں بچالیا کہ پاکستان اس کی ذات پاک کا ایک بہت بڑا راز ہے۔ اس عاجز نے ایوب خان کو کیپٹن دیکھا اور پاکستان کے ہر بڑے افسر کو سلسلہ وار ترقی کرتے دیکھا لیکن میرے مشاہدوں نے مجھ پر بڑے راز عیاں کئے جن کا میں کبھی کبھی اظہار بھی کرتا رہتا تھا۔ جیسے نومبر 1947ء میں بریگیڈیئر افتخار خان کو کہا کہ ہم لڑائی نہیں لڑ سکتے تو فوج کو توڑ دیں یا ستمبر 65ء لاہور کے بڑوں خاص کر بریگیڈیئر قیوم شیر کو کھری کھری باتیں سنائیں۔ سوائے جنرل اکبر خان طارق بریگیڈ صدیق سنی' بریگیڈیئر نوشیروان' کرنل شیر محمد' کرنل حفیظ آفریدی اور کرنل محمد عنایت کے مجھے پاکستان میں ایک آدمی بھی ایسا نظر نہ آیا جو پلٹن کی لڑائی سے اوپر لڑائی کی صحیح سوجھ بوجھ رکھتا ہو اور ملکوں کی لڑائی تو ان ''جرنلوں'' کے سروں سے ادھر ادھر گزر جاتی تھی اور جب اس عاجز نے عملی طور پر اور مثالوں سے اپنے عظیم رفیق میجر جنرل احسان الحق ڈار مرحوم کو جو اس وقت میجر تھے' پورا تجزیہ بتایا کہ ہمارے جنرل جنگ سے کتنے ''نابلد'' ہیں تو اگلے چند سالوں کے لئے ہم دونوں لازوال دوستی میں بندھ گئے تھے اور اپنی وفات سے پہلے میری کتاب ''حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال'' کے پیش لفظ میں انہوں نے نہ صرف اپنی موت کی پیش گوئی کی ہے بلکہ قوم کو میری تحریروں کی طرف بھی متوجہ کر گئے کہ وہ ان میں اپنے لئے نشان راہ تلاش کریں۔

معلوم نہیں آج کل کیا حالات ہیں؟ 1979ء تک میرے فوج کو چھوڑنے کے وقت تک اکثر جنرل اور سینئر افسران اپنے سے نیچے والوں کے کام میں ''مخل'' ہو کر اپنا بھی وقت ضائع کرتے رہتے تھے اور اپنے ماتحتوں میں بھی بداعتمادی پیدا کرتے تھے اور اپنے کام کے بارے نہ سوچتے تھے کہ اونچی سطح پر کچھ سوچیں۔ اس عاجز نے کئی دفعہ طریقے کے ساتھ اپنے بالا افسروں کو سمجھایا کہ وہ اپنے جونیئر لوگوں سے بھی کچھ سیکھیں۔ میں جب پلٹن سے باہر نوکری کر کے پلٹن میں واپس آتا رہتا تھا تو نائکوں اور حوالداروں سے بھی کئی نئی باتیں اور طریقے سمجھا کرتا تھا لیکن اصل بات کردار کی کمی ہے۔ ایوب خان اور محمد موسیٰ کو کسی نیچے والے ایک بریگیڈیئر یا جنرل نے یہ نہ بتایا کہ وہ کیا غلط طریقے اپنا رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کسی کرنل کی سطح والے افسر نے مخالفت کی۔ مثلاً 62-1961ء میں لاہور میں اس وقت کے بریگیڈیئر اختر ملک کا ''تجرباتی'' بریگیڈ جنگی مشق Mile Stone میں اس چیز کو باور کرا رہا تھا کہ پیدل فوج کو کم سے کم کر دیا جائے۔ فوج کے ستر فیصد افسران وہاں موجود تھے۔ جہاں بتایا گیا کہ اب لڑائی بکتر بند دستے اور توپخانہ ہی لڑے گا۔ کرنل شیر محمد جن کا ذکر کشمیر کی جنگ میں کرنل خالد کے طور پر ایک ''طلسماتی شخصیت'' کے طور پر ہو چکا ہے وہ اختر ملک سے سینئر تھے لیکن وہ چونکہ سچی بات کرتے تھے اور اسلام کی طرف مائل تھے تو ان کو بریگیڈیئر نہ بنایا گیا تھا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ پیدل فوج کی اہمیت کسی زمانے میں ختم نہ ہو گی اور پاکستان کے پاس تو چند مانگی تانگی بکتر بند گاڑیاں اور توپیں ہیں۔ اس کو انعام خداوندی سمجھیں اور پیدل فوج کی ایسی تیسی نہ کریں۔ بریگیڈیئر بعد میں جنرل محمد شریف کی سفارش پر کرنل شیر محمد کے پروٹیسٹ کو ''ریکارڈ'' میں شامل کر کے دو سال بعد ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا کہ ستمبر 65ء میں ہم پیدل فوجوں کی کمی کی وجہ سے مطلوبہ یا ضروری نتائج نہ حاصل کر سکے۔ اوپر والے سچ اس لئے نہیں بولتے کہ سچ بولنے والا اوپر جا نہیں سکتا اور اوپر جا کر

سچ بولنے والے کو اہم مقام سے ہٹا لیا جاتا ہے کہ اوپر والوں کے لئے زندگی فراڈ ہے۔ قوم نے آج تک فلسفہ حیات کی ضرورتوں کے سلسلہ میں کچھ بھی نہیں سوچا۔

ایوب خان کے خلاف تحریک کیسے چلی۔ اس نے کیا رنگ اختیار کیا اس کا اختصار بھی کئی مضمونوں میں ختم نہیں ہوتا۔ پس یہ سمجھ لیں کہ بڑا ''رنگ ماسٹر'' یحییٰ خان تھا۔ مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمٰن ایک طرف اور صرف داڑھی رکھ لینے سے ''مولانا'' بن جانے کی وجہ سے بھاشانی بنگالیوں کے ذہن پر چھا چکے تھے۔ مغربی پاکستان میں اندر ہی اندر بھٹو کی لابی زور پکڑ چکی تھی۔ حالانکہ بے شمار لیڈر خان عبدالقیوم' ممتاز دولتانہ' سردار شوکت' نصراللہ چودھری محمد علی وغیرہ میدان میں تھے اور مودودی نے جماعت اسلامی کو بھی سیاست میں کافی عرصہ سے ''دھکا'' دیا ہوا تھا۔ میرے رفقاء میں سے ایوب خان کا سب سے بڑا مخالف کرنل شیر محمد تھا لیکن یہ حالات دیکھ کر وہ سہم گئے کہ اس کا ''ہم جماعت'' اصغر خان اور قادیانی جنرل غلام جیلانی وغیرہ سیاست میں کود چکے تھے۔ وہ کہنے لگے کہ ایوب خان کو نکال کر تاج کس کے سر پر رکھو گے؟ یحییٰ خان یا بھٹو یا اصغر خان یا مجیب الرحمٰن کے سر۔ یہ چاروں ایوب سے بدتر ہیں۔ میرے اخبار نویس رفقاء میں سے سید شبیر حسین کہنے لگے' اگلے دن ایک عرب سفارتی نمائندہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ کہنے لگا: ایوب کو نکال کر کیا کرو گے؟

عرب علاقوں میں جو اپنے آپ کو ''سوشلسٹ'' کہتا ہے وہ امریکہ کا ''ایجنٹ'' ہوتا ہے۔ کیا تمہارا بھٹو بھی ''بہروپیا'' نہیں ہو سکتا؟ قارئین 1968-69ء کی افراتفری کو اس عاجز نے بہت قریب سے دیکھا۔ ہر کوئی ''بپھرا'' ہوا نظر آتا تھا۔ ایسا انتشار اور افراتفری تھی۔ کہ مجیب الرحمٰن کے خلاف واضح ثبوت تھے کہ وہ اگرتلہ جا کر بھارت کے ساتھ منصوبے بنا رہا ہے کہ مشرقی پاکستان کو پاکستان سے الگ کیا جائے تو ایوب خان کو سیاستدانوں نے مجبور کر دیا کہ وہ مجیب الرحمٰن کو رہا کر کے اپنے سامنے گول میز پر بٹھائے اور ممتاز دولتانہ جس نے کسی زمانے میں مجیب الرحمٰن کو ''مہمان'' کے طور پر اپنے نوکروں کے کوارٹر میں رکھا تھا۔ اب مجیب کے سامنے اور پاؤں کے نیچے غالیچے بچھا رہا تھا تو مشرقی پاکستان نے الگ تو ہونا تھا۔

جب حالات بہت خراب ہو گئے تو اختر ایوب میرے پاس آیا اور ساتھ ہی میں گزارش بھی کرتا آ رہا ہوں کہ میں نے اس کو مشورہ دیا کہ ان کے ''خان جی'' اسلام نافذ کر کے اپنے دونوں جہاں سنوار لیں۔ لیکن اختر کوئی دنیاوی حل معلوم کرنا چاہتا تھا اور حالات کے گہرے مطالعوں اور جائزوں میں دلچسپی رکھتا تھا کہ افواج میں سے کون کون لوگ ان کے والد کی وفاداری کریں گے اور کون کون یحییٰ خان کے پکے ''پروردے'' ہیں وغیرہ۔ میں نے اختر ایوب کو بڑی تفصیل سے ایک ایک آدمی کے بارے ''بریف'' کیا۔ جس کا اختصار یہ ہے کہ افواج پاکستان کی اہم شخصیت صرف ایئر مارشل نور خان ہے اور یحییٰ خان نے اس پر ''پٹو'' ڈال لیا ہے کہ اس کو استعمال کر کے ''ٹشو پیپر'' کی طرح پھینک دے گا۔ بحری فوج کی اتنی ''اہمیت'' نہیں اور ایڈمرل احسن کی اتنی ''وقعت'' بھی نہیں۔ وہ سمجھدار آدمی ہے وہ ''حاکم'' کا کہا مانے گا۔ بری فوج میں جنرل عبدالحمید کو لوگ یحییٰ خان کا ''سایہ'' کہتے ہیں۔ وہ یحییٰ خان سے ایک نمبر سینئر تھا لیکن یحییٰ خان کے ماتحت نوکری پر تیار ہو گیا اور وہ یحییٰ کا ''وفادار'' ہے۔ اب فوج میں جنرل حق نواز یا جنرل بختیار رانا یا جنرل وصال محمد یا جنرل ملک شیر بہادر جیسے لوگ موجود نہیں کہ آپ کے

''خان جی'' ان پر بھروسہ کریں۔ یحییٰ خان کی لابی مضبوط ہے۔ وہ مذہبی لوگوں کا بھی ''گاڈ فادر'' بنا ہوا ہے۔ ان کی بڑی عزت کرتا ہے اور وہ مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتا۔

اس کے برعکس آپ کے ''خان جی'' نے الطاف گوہر کے فیضی اور ابو الفضل جیسے مشوروں سے غلام احمد پرویز کو فوج کو ماڈرن اسلام پر لگانے کے لئے فوج میں لیکچر دینے کی یحییٰ خان کو چٹھی لکھی تو یحییٰ خان نے انٹیلی جینس والوں اور ہم تعلقات عامہ والوں سے مشورہ کیا۔ راقم نے اس سب ''عمل'' کی سخت مخالفت کی کہ اس طرح فوج میں انتشار پیدا ہوگا اور دوسرے مکتبہ فکر کے علماء کو بھی دعوت دینا ہوگی تو یحییٰ خان نے یہ سارا کام مجھے سونپ دیا کہ پرویز کی تحریروں سے اس کی عقائد یا غلط بیانیوں کی ''سمری'' بنا کر میں ہی یحییٰ خان کی طرف سے ایوب خان کے خط کے جواب کا ڈرافٹ لیٹر تیار کروں اور یحییٰ خان نے یہ سارا جواب اپنے پرنسپل سٹاف افسروں میں سرکولیٹ کیا کہ ہم فوجی بنیاد پرست مسلمان ہی بہتر ہیں۔ ہم کسی ''جدت'' میں نہیں پڑتے تو ساری فوج نے یحییٰ خان کے اس عمل کو سراہا اور ظاہر ہے کہ فوج کے اندر مذہبی لوگوں کو یہ بات پسند نہیں کہ ان کو کوئی ماڈرن اسلام کی ''تبلیغ'' کرے تو ایسی باتوں کی وجہ سے دن بدن آپ کے ''خان جی'' کے فوج پر اثرات کا ''گراف'' نیچے جا رہا ہے۔ اختر کہنے لگا کہ جنرل عبدالحمید کو کچھ ''ٹٹولا'' جائے کہ اس کی وفاداریاں کہاں ہیں؟ تو میں نے کہا کہ یہ کام آپ کے ''خان جی'' ہی کر سکتے ہیں کہ یحییٰ خان ملک سے باہر ہو اور اس کی غیر موجودگی میں ایوب خان یحییٰ کی جگہ عارضی سربراہ سے حالات کے مطالعہ کے بہانے کچھ مشورہ کرے۔

تو ایوب خان نے ایک ضروری پروگرام کے تحت یحییٰ خان کے چین کے دورے کا منصوبہ بنایا اور یحییٰ خان ہفتہ دس دن کے دورے پر چین چلا گیا تو ایوب خان نے حالات کی خرابی کا بہانہ بنا کر جنرل عبدالحمید کو بلا بھیجا کہ وہ ان کو ملک میں امن کے بارے صحیح صورت حال سے آگاہ کریں۔ اب جنرل عبدالحمید اپنے ساتھ چیف آف دی جنرل سٹاف صاحبزادہ یعقوب خان، ملٹری انٹیلی جینس کے بریگیڈیئر عظمت بخش (بعد میں جنرل) اور ان کے سٹاف افسر کرنل غلام حسن (بعد میں جنرل) کو لے گیا۔ خود بہت کم باتیں کیں اور صورت حال پر زیادہ بریفنگ کرنل غلام حسن سے کرائی گئی کہ امن و امان کی صورت حال بہت خراب ہے۔ حالات مارشل لاء لگانے سے ہی ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ ایوب خان کچھ ہنس پڑا ''کہ مارشل لا کون لگائے؟'' تو آگے سے سب چپ کر گئے تو ایوب خان نے کہا کہ اچھا اس کا جواب میں علیحدگی میں جنرل عبدالحمید سے پوچھوں گا۔ چائے کے بعد جب باقی سب چلے گئے اور صرف جنرل عبدالحمید اکیلا رہ گیا تو ایوب خان نے اس کو ''ٹٹولا'' کہ حالات اتنے خراب ہیں تو کیا تم فوراً مارشل لاء لگا سکتے ہو؟ تو جنرل عبدالحمید نے کہا کہ بہتر ہے کہ یحییٰ خان کو چین سے واپس بلا لیا جائے کہ ہم سب مل کر اور باقاعدہ سوچ سمجھ کر اور تجویز بنا کر مارشل لاء لگائیں تو یحییٰ خان کو چین کا دورہ مختصر کرنا پڑا۔ یعنی جنرل عبدالحمید، یحییٰ خان کا ''آدمی'' نکلا۔

ایوب خان سخت تذبذب میں تھا۔ آئین کے لحاظ سے جب وہ دستبردار ہوتا، تو اس کو حکومت قومی اسمبلی کے سپیکر کو دینا چاہئے تھی۔ جو مشرقی پاکستان کا فضل قادر چودھری تھا اور وہ محبِ وطن پاکستانی تھا لیکن ایوب خان کو ڈر تھا کہ حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ فضل قادر چودھری حالات کو کنٹرول نہ کر سکے گا اور افراتفری میں ایوب

خان کے بیٹوں خاص کر گوہر ایوب یا داماد نجیب اللہ وغیرہ کے بارے جو جائیدادیں بنانے کے ''الزامات'' ہیں۔ لوگ ان پر پل پڑیں گے۔ ایک مشورہ یہ تھا کہ حکومت اصغر خان کے حوالے کر دی جائے لیکن یحیٰی خان اور بھٹو اس کی سخت مخالفت کر رہے تھے۔ یہ بھی سوچا گیا کہ حکومت شریف نورالامین کے حوالے کر دی جائے لیکن کوئی تجویز نہ چل رہی تھی۔ بھٹو کسی سیاستدان کو حکومت دینے کے حق میں نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ حکومت فوج اور یحیٰی خان کو دی جائے کہ وہ اس کو ''بے وقوف'' بنا لے گا۔ مجیب الرحمٰن بھی کسی سیاستدان کو حکومت پر براجمان کرانے کو تیار نہ تھا کہ اس خود کی شخصیت ''ثانوی'' صورت حال میں چلی جائے گی۔ ہمارے جاننے والوں میں سے پاکستان ٹائمز کے مایہ ناز صحافی سید شبیر حسین (اب مرحوم و مغفور) کے ایوب خان کے ساتھ بھی گہرے تعلقات تھے اور وہ حالات سے زیادہ باخبر تھا۔ ان کو نورالامین نے بتایا کہ اصلی تجویز ملک کو دولخت کرنے کی ہے اور وہ وقت قریب آ گیا ہے لیکن اس کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس ذلت آمیز کارروائی کا سارا ''الزام'' فوج کے سر ڈالا جائے گا اور اس ذلت آمیز کام میں فوج کو بدنام کرنا ضروری ہے۔ یہ چیز تو ہمیں بہت بعد میں سمجھ آئی کہ ستمبر 1965ء میں اگر فوج ذلت سے بچ گئی اور بھارتی لاہور کو پلیٹ ''میں'' حاصل نہ کر سکے جس کی تفصیل یہ عاجز اپنے مضامین میں بیان کر چکا ہے تو سقوط ڈھاکہ نے 1971ء کے ذریعہ سے فوج کو ذلت سے دوچار کر دیا جس کو عملی طور پر سمجھنے کے لئے یہ عاجز جون، جولائی 1971ء میں مشرقی پاکستان گیا اور جنرل نیازی یا جنرل رحیم کو گزارش کی کہ عزت بچائیں اور اپنے مضامین انہی عنوان سے شروع کئے کہ سازشیں بہت گہری ہیں اور ہم سب کچھ جانتے ہوئے اور کچھ بن جانے ان سازشیوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔

سید شبیر حسین سازشوں کو کچھ سمجھ گیا اور اس نے اسی زمانے میں ایک کتاب **Lengthening shadow** لکھ دی کہ ''سائے لمبے'' ہو رہے ہیں۔ اور اس نے ثابت کیا کہ ذوالفقار بھٹو اور کچھ صحافی ایسے بھیانک کردار میں مشغول ہیں کہ ملک کی جڑیں کھوکھلی کی جائیں اور اس کتاب میں جو اشارے کئے گئے وہی کچھ بعد میں ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ بھٹو جب حکمران بن گیا تو اس نے سید شبیر حسین کو کوئٹہ میں تبدیل کر دیا اور بعد میں اتنا تنگ کیا کہ آخر شبیر حسین کو نوکری چھوڑنا پڑ گئی۔ میرے لئے البتہ شبیر حسین کی ایسی تحریریں یا ان کی رفاقت یا ان کی کھری سوچ میں بڑا ہی نشان راہ تھا اور میری تحقیقات پر برادرم کرنل شیر محمد اور سید شبیر حسین کی سوچوں کے بہت اثرات ہیں۔ افسوس! قوم نے اسلام کے ایسے مایہ ناز فرزندوں کی سوچوں سے فائدہ نہ اٹھایا۔ ہماری قوم کے سامنے ہر واقعہ کو ایک ''حادثہ'' کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور نہ قوم خود سوچتی ہے نہ رہنما ان کی رہنمائی کرتے ہیں کہ یہ ''کچھ'' کیوں ہوا؟ اور سقوط ڈھاکہ جیسے المیہ کیلئے حمود الرحمٰن قسم کے بے مقصد اور ادھورے ''ٹاسک'' والے کمیشن بنا کر قوم، کا وقت اور قوم کی دولت ضائع کی جاتی ہے۔ اس لئے یہ عاجز پچھلے 59 سالوں کے واقعات میں سازشوں والے پہلوؤں کے تانے بانے ملا کر قوم کو باور کرا رہا ہے کہ آؤ اپنے نفس کو بھی پہچانیں اور اپنے اندر کے اور باہر کے دشمنوں کوتاہ بینوں اور بے کردار لوگوں کو پہچانیں اور مومن کی فراست حاصل کر کے ''مواقع تقدیر'' کا فائدہ اٹھائیں۔

پاکستان اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا راز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بچا رکھا ہے۔ ایوب خان، ہرگز یحیٰی خان کو حکومت نہ دینا چاہتا تھا لیکن اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ اگر کسی سویلین کو حکومت دے دی تو یحیٰی خان افراتفری

کرا کے اس سویلین سے حکومت لے لیو لے گا اور پھر ایوب خان کی مزید بے عزتی کرائے گا اور گو ایوب خان اور یحیٰی خان کا ایک دوسرے کے ساتھ باہمی اعتماد پاش پاش ہو چکا تھا کہ جنرل عبدالحمید نے ضرور بر ضرور یحیٰی خان کو بتا دیا ہو گا کہ ایوب خان نے اس کو "ٹٹول" کر ایک طرح سے اس کو حکومت پر "براجمان" کرنے کی شہ دی تھی اور یہی افسوسناک پہلو ہے کہ ایوب خان کسی پالیسی یا چالاکی سے چند اور سال نکال جاتا تو کیا فائدہ ہوتا۔ جتنی زیادہ دیر ٹھہرتا اتنی زیادہ بے عزتی سے کرسی چھوڑنا پڑتی۔ اللہ تعالیٰ پاکستان میں بار بار کئی لوگوں کو مواقع فراہم کر رہا ہے کہ خود بھی ٹھیک ہو جاؤ اور پاکستان کیلئے حکومت کا صحیح طریقہ نکالو۔ عزت کے ساتھ کرسی پر آؤ اور عزت سے کرسی خالی کرو۔ لیکن یہاں بدقسمتی سے ہر آدمی کسی "سازش" سے یہ کرسی حاصل کرتا ہے اور پھر عبرتناک انجام سے دوچار ہو کر یہ کرسی خالی کرتا ہے۔

لیکن اس دنیاوی کرسی میں بھی عجیب کشش ہے۔ ایوب خان کی خواہش تھی کہ یحیٰی خان اس کو برائے نام صدر رکھے۔ اسلئے ایوب خان جو حکومت سے "دستبرداری" کا اعلان کر رہا تھا۔ وہ صدر کے عہدہ سے مستعفی ہونے کا اعلان نہ کر رہا تھا اور نہ ہی 1962ء کے آئین کا خاتمہ کر رہا تھا بلکہ اسی آئین کے تحت جنرل یحیٰی خان کو ملک کا اقتدار سنبھالنے کیلئے اس کو اس کی ایک "آئینی ذمہ داری" دے رہا تھا کہ ملک کا امن اور حالات خراب ہو گئے ہیں اور یحیٰی خان ان حالات کو ٹھیک کرے۔ اسلئے ایوب خان نے اپنی تقریر کا مسودہ الطاف گوہر کے ہاتھ یحیٰی خان کے پاس بھیجا کہ یحیٰی خان بھی اپنی تقریر کا ڈرافٹ ایوب خان کو دکھائے۔ لیکن یہ چیز ہمیں کچھ دن بعد میں معلوم ہوئی کہ یحیٰی خان کا اس سلسلہ میں "مشیر خاص" جنرل پیرزادہ تھا۔ جو اس وقت ایجوٹنٹ جنرل تھا۔ کیونکہ حالات کا زیادہ جائزہ جی ایس برانچ تیار کر رہی تھی اور وہاں صاحبزادہ یعقوب خان کی جگہ میجر جنرل گل حسن آ گئے تھے۔ تو ہمیں خیال تھا کہ یحیٰی خان کے مارشل لاء کو جی ایس برانچ اور میجر جنرل گل حسن چلائیں گے۔ لیکن جب مارشل لاء لگ گیا تو جنرل پیرزادہ یحیٰی خان کے پرنسپل سٹاف افسر کے طور پر سامنے آئے۔ وہی یحیٰی خان کی تقریر تیار کر رہا تھا اور ایوب خان کو اندھیرے میں رکھا جا رہا تھا کہ جنرل پیرزادہ جب بریگیڈئر تھے اور 1962ء میں ایوب خان کے ملٹری سیکرٹری بنے تو ان کے "آمرانہ" اور "سازشانہ" رویے کو ایوب خان کی "خاندانی کچن کابینہ" بھانپ گئی تھی اور انہوں نے ڈاکٹروں سے مل کر پیرزادہ کو "ایوانوں" سے الگ کر دیا۔ پیرزادہ اب یحیٰی خان کی "بیساکھی" کی مدد سے پھر "ایوانوں" کا کرتا دھرتا بن رہا تھا اور قارئین نوٹ کریں کہ یحیٰی خان کی "لابی" کے دو بڑے "ستون" یہی گل حسن اور پیرزادہ تھے۔ جن کے بھٹو کے ساتھ بھی "گہرے" رابطے تھے۔ جنرل عبدالحمید تو صرف یحیٰی خان کا "سایہ" تھا۔ اس کے نام کو استعمال کیا گیا اور ائر مارشل نور خان کو "فصلی بٹیرے" کے طور پر "وقتی" طور پر استعمال کر کے پھر "ٹشو پیپر" کی طرح پھینک دیا گیا۔ قارئین! ہم سقوط ڈھاکہ کے المیہ کے کافی "نزدیک" پہنچنے والے ہیں اور بڑے بڑے ایکسٹراب ظاہر ہونے لگے ہیں تو نیازی اکیلا اس ذلت کا ذمہ دار نہیں۔ اس کا قصور یہ ہے کہ اس نے اس ذلت کا "طوق" اپنے گلے میں کیوں ڈالا؟ اور پوری قوم کو اس ذلت سے دوچار کرنے کے عملی پہلو کا ذمہ دار کیوں بنا؟ کیا وہ "سلطان ٹیپو" نہیں بن سکتا تھا؟ وہ بہت کچھ کر سکتا تھا۔ یہ سب پہلو بعد میں قوم کے سامنے آئیں گے۔

تو الطاف گوہر کو یحییٰ خان اور فوج والوں نے گھاس نہ ڈالی کہ وہ سب الطاف گوہر سے نفرت کرتے تھے۔ انہوں نے الطاف گوہر کو کہا کہ ایوب خان اپنی تقریر ریکارڈ کرائے۔ یحییٰ خان کی تقریر کا ڈرافٹ جلدی صدر ہاؤس بھیج دیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہ کیا گیا اور ایوب خان' یحییٰ خان اور اس کے حواریوں کے ارادوں اور تجاویز سے ''بے خبر'' ہی رہا کہ شام کو اس کی تقریر نشر ہو جانے کے بہت بعد' یحییٰ خان نے تقریر کی۔ جب ایوب خان دل چھوڑ کر اپنے ہاتھ کاٹ چکا تھا لیکن یحییٰ خان نے پھر بھی چالاکی کی۔ اس نے نہ ایوب خان کو صدر کے طور پر معطل کیا نہ خود صدر بن کر صدر کے عہدے کی قسم اٹھائی بلکہ 1962ء کے آئین کو ختم کرنے کے اعلان سے ہی سب کچھ حاصل کر لیا کہ خود چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گیا اور پہلا کام یہ کیا کہ ایوانِ صدر میں جو پنجاب رجمنٹ کی پلٹن تھی۔ اس کی جگہ فوراً اپنی بلوچ پلٹن کو لے آیا جس میں تین دن لگ گئے اور جب یحییٰ خان نے ملک پر پورا ''کنٹرول'' حاصل کر لیا۔ تو پھر ایوب خان کو کہا کہ وہ صدر ہاؤس خالی کر دے اور یحییٰ خان نے صدر بننے کی قسم اس کے بعد اٹھائی۔

یحییٰ خان کا حکومت پر براجمان ہونا میرے لئے ایک بہت بڑا المیہ تھا۔ بیس سالوں سے یہ عاجز یحییٰ خان کو بہت نزدیک سے دیکھ رہا تھا۔ اگر ساری اندرونی بے حیائی اور بے غیرتی کی باتیں نہ بھی لکھی جائیں تو عام اور کھلے طور پر جس بے حیائی کا مظاہرہ یحییٰ خان کر رہا ہوتا تھا یا کس طرح وہ بہروپیا ہو کر گرگٹ کی طرح رنگ تبدیل کر کے مذہبی لوگوں کا بھی ''گاڈ فادر'' بن جاتا تھا۔ محرم میں ماتمی مجالس میں بھی بڑے ادب کے ساتھ جا کر بیٹھتا تھا اور شراب نوشی کھلے طور پر بے کردار عورتوں کی ''رفاقت'' میں کرتا تھا۔ یزید بھی شراب تو پیتا تھا لیکن ایسی بے حیائی کا مظاہرہ نہ کرتا تھا۔ یحییٰ خان ایک بڑا ماہر فوجی پیشہ ور بنا ہوا تھا لیکن کرنل کی سطح سے اوپر پیشہ وری کا نہ اسے تجربہ تھا نہ اس سلسلہ میں اس نے کبھی مطالعہ کیا تھا۔ ملک کیا چیز ہے اور قومیں کیسے بنتی ہیں۔ ان رواجی معاشرتی علوم سے وہ بالکل نابلد تھا اور اسلام کے بارے اس کا مطالعہ نہ ہونے کے برابر تھا کہ سوائے اس کے کہ وہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوا تھا اور اس کے بزرگوں کا اسلام کے لحاظ سے جو رکھ رکھاؤ تھا۔ اس سے وہ آگاہ تھا۔ اس خود نے عملی طور پر اسلام نہ طالب علمی کے زمانے میں اپنایا۔ نہ فوجی نوکری کے دوران۔ میں بڑی مایوسی کی حالت میں گھر بیٹھا تھا۔ ایوب کی تقریر کے بعد لوگ خوشیاں منا رہے تھے اور ناچ رہے تھے کہ اس سے ''خلاصی'' ہوئی ہے۔ صرف میری والدہ بزرگوار نے ایوب کیلئے کچھ اچھے الفاظ استعمال کئے کہ بیچارہ اتنا خراب آدمی تو نہ تھا۔ غلط قسم کے لوگوں کے جال میں پھنس گیا تھا۔

لیکن ہمارے ہاں ایک ایسی ''لابی'' بھی تھی کہ جن میں کچھ عورتوں کیلئے یحییٰ خان ''راجہ اندر'' کی طرح تھا۔ لیکن ایک ہندو راجہ سے تمثیلی موازنہ کی بجائے یہ عاجز اپنے پچھلے مضامین میں ایک صاحبہ کے صدارتی تعارفی کتاب پر ''تاثرات'' لکھ چکا ہے کہ وہ یحییٰ خان کو ایک ''گدی نشین پیر'' قرار دیتی تھیں۔

''کہ چارے چوکاں تیرے ڈیوا بلدا' پنجواں میں بالن آئی آں'' کہ اے یحییٰ خان تیرے ارد گرد روشنی ہی روشنی ہے۔ میں اس میں اور ''اضافہ'' کرنے آئی ہوں۔ لیکن یہ عاجز اصلی صورت حال پر بھی تبصرہ کر چکا ہے کہ صورتحال اس سے بالکل مختلف تھی۔

''چارے چوکاں تیریاں چکڑ ڈبیاں' کتھری نوں مل مل دھوویئے'' کہ اے یحییٰ خان تیرے ارد گرد گند ہی گند ہے تو خود اس گند میں اس طرح ڈوبا ہوا ہے کہ سمجھ نہیں آتا کہ کس حصے سے صفائی کا عمل شروع کیا جائے۔

یہ صورتحال تھی اور مجھے سمجھ نہ آتی تھی کہ محکمہ تعلقات عامہ میں رہ کر میرا قلم یحییٰ خان کی شخصیت کو کیسے ''Project'' کر سکے گا۔ حکومت حاصل کرنے سے پہلے اس کے بارے میں مجھے خواب آیا کہ یحییٰ خان نے حکومت پر قبضہ کر لیا ہے اور میں چند ساتھیوں کے ساتھ یحییٰ خان کو ملنے گیا کہ اس سے معلوم کریں کہ اس کی پالیسی کیا ہے؟ اور ہم دوسرے لوگوں کو کیا کچھ بتائیں؟ جب میں خواب میں صدر ہاؤس پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ یحییٰ خان ایک بہت بڑے خوشنما پلنگ پر ''دراز'' ہے اور ہر قسم کے لوگ مرد اور عورتیں۔ اس کو ''مٹھی چاپی'' کر رہے ہیں اور وہ نشے میں ہے اور جب آنکھ کھولتا ہے تو کہتا ہے ''ہاں! ہاں! کام چلاؤ'' اور کبھی غصے میں آ کر کہتا ہے ''خبردار غلطی نہ کرنا۔ ورنہ میں بھی بڑا برا آدمی ہوں'' قارئین! جس کو ہم آج کل ''روڈ میپ'' کہتے ہیں۔ چھپے ہاتھوں نے اس ''روڈ میپ'' کی تجویز بنائی ہوئی تھی کہ پاکستان کو دولخت بھی کرنا ہے اور پاکستانی فوج کو ذلت سے بھی دوچار کرنا ہے اور یہ عاجز آج ایسا نہیں کہہ رہا بلکہ اس عاجز نے 14 ستمبر 1970ء کو ایوب ہال میں یحییٰ خان اور اس کے حواریوں کے سامنے اعلان کر دیا تھا کہ یہ کچھ ہونے والا ہے اور 5 اکتوبر 1970ء کو یہ کچھ لکھ کر یحییٰ خان کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈئر محمد اسحٰق کے ہاتھ میں ''تھما'' آیا کہ ساتھ تجویز بھی دی کہ اس ذلت سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ اس کی کاپی آج بھی میرے پاس موجود ہے اور اس زمانے اس عاجز نے اس مسودے کی سینکڑوں کاپیاں بنوا کر ذمہ دار لوگوں تک پہنچائیں کہ 14 ستمبر 1970ء کو ایوب ہال میں فیصلہ ہوا تھا کہ میں اپنی سوچ اور تجاویز لکھ کر یحییٰ خان کو دوں گا اور ایوب ہال میں افواج پاکستان کے تقریباً چھ سو افسران موجود تھے لیکن قارئین! نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ یہ عاجز قوم کو اب گزارش کرے گا کہ ہماری اب بھی یہی حالت ہے۔ اکثر لوگ ''مکھی پر مکھی'' مار کر وقت گزارتے ہیں اور مارچ 2003ء کے مضامین میں گزارش کر چکا ہوں کہ آؤ پاکستان جو اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے۔ اس کے وجود میں آنے کے مقاصد اور مومن کی زندگی کے مقاصد کو سمجھ کر ان کے تانے بانے ملا کر اپنے لئے مواقع تقدیر کا صحیح استعمال کر کے نشان راہ تلاش کریں۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے قتل کا حکم صادر فرمایا ہے کہ ہم ساری قوم زیادہ وقت خرافاتی بحث میں ضائع کرتے ہیں۔ زباں اور قلم دونوں سے۔ اور یہ عاجز یحییٰ خان کی حکومت کے واقعات قوم کے سامنے بڑے اختصار سے پیش کرے گا کہ دراصل کوئی حکومت نہ تھی جو جہاں بیٹھا ہوتا تھا' اگر اس میں کچھ ہمت اور ہوشیاری ہوتی تھی وہ اپنی مرضی چلاتا تھا۔ میں یہاں پر اپنی مثال دیتا ہوں کہ میں اپنی مرضی چلاتا تھا اور خودنمائی کے ڈر سے تفصیل نہیں لکھ رہا۔ جو کمزور آدمی ہوتے تھے وہ اپنے بڑوں کے احکام ''بسر و چشم'' مان لیتے تھے۔ میرا ''باس'' عبدالرحمٰن صدیقی تھا۔ جس کو پوری قوم جانتی ہے اور خاص کر اخبار نویسوں کو معلوم ہے کہ وہ کتنے ''پانی'' میں تھے کہ دسمبر 1971ء کی جنگ میں جو بریفنگ وہ کیا کرتے تھے تو آگے سے کیا تاثرات ہوتے تھے۔ بہرحال وہ ہمارے لئے یحییٰ خان کے معاون خصوصی جنرل پیرزادہ کا حکم لے آئے کہ ان کے ''ڈنڈے'' کو ہماری قلم کی مدد کی ضرورت ہے اور ہم اس کام کو عملی طور پر نبھائیں۔ میں نے کرنل صدیقی کو کہا کہ یہ حکم اسی طرح ہے' جس طرح

آپ نے ایوب کے خلاف تحریک کے وقت مجھے کہا تھا کہ بڑے صاحب نے کہا ہے کہ فوج غیر جانبدار ہے اور میں نے اس اصول کو غلط قرار دیا تھا۔ کہاں گئی فوج کی غیر جانبداری؟ معاملے کو سیاسی طور پر کیوں نہ حل ہونے دیا۔ فوج خود ایک سیاسی پارٹی کیوں بن گئی ہے؟ اور حکومت سنبھال لی ہے۔ اس کارروائی کو میری قلم کبھی صحیح نہ قرار دے گی اور میں ملک کے اخباروں یا اخبار نویسوں کو غلط رہنمائی کبھی نہیں دے سکتا۔ ہاں خاموش رہ سکتا ہوں اور دفتر کے انتظامی کاموں یا الھلال اخبار کا کام جاری رکھوں گا۔

لیکن ایک بڑی ضرورت غیر ملکی اخباری نمائندے تھے' جو سینکڑوں کی تعداد میں' راولپنڈی' اسلام آباد میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور الطاف گوہر کی ''شہ'' پر وہ لوگ ہمیں یعنی ISPR والوں کو بہت تنگ کر رہے تھے۔ ان میں سے ہر نتھو خیرا' یحییٰ خان کے ساتھ ملاقات کرنا اپنا ''حق'' سمجھتا تھا اور ''دھونس'' دیتے تھے کہ ان کی یہ خواہش ہم پوری کریں۔ یہ عاجز ان لوگوں کو 1944ء سے جانتا تھا اور ان زمانوں میں ان میں کچھ اچھے لوگ تھے۔ اب ''لچر'' قسم کے لوگ آ رہے تھے اور ہمارے ملک میں سرکاری طور پر بھی ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی کہ ہمارے بارے میں وہ اچھی باتیں لکھیں لیکن یہ لوگ اپنی مرضی کے مطابق لکھتے ہیں کہ ان کے ''مقاصد'' کچھ اور ہوتے ہیں اور عام غیر سرکاری لوگ بھی ان لوگوں کو بہت زیادہ ناجائز ''لفٹ'' دیتے ہیں کہ ان کی کوئی خبر باہر کے ملکوں میں چھپ جائے۔ ان غیر ملکی اخباروں کے بارے میں قوم کو صورتحال سمجھانے کے لئے ایک کتاب' یا کئی مضامین لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس عاجز نے جنرل یحییٰ خان سمیت اپنی فوج کے کئی سینئر افسران کو کچھ عرصہ پہلے ''بریف'' کیا تھا کہ ان لوگوں کو کم از کم ''منہ'' لگایا جائے اور ان لوگوں کو اپنے ''مقام'' پر رکھا جائے۔ اس لئے فوج یا محکمہ تعلقات عامہ کی طرف سے اکثر یہ ذمہ داری مجھے ہی دی جاتی تھی کہ یہ لوگ میری "Baby" ہیں اور یحییٰ خان کی مرضی سے چند ماہ کے لئے میں نے ان لوگوں کو ''سنبھالنے'' کی ذمہ داری اٹھالی کہ دو ماہ کے اندر یہ لوگ ''مایوس'' ہو کر ہمارے ملک سے چلے گئے اور الطاف گوہر کی پرزور سفارشوں کے باوجود یحییٰ خان کی پہلی پریس کانفرنس میں بھی اس عاجز نے ان لوگوں کو ''مدعو'' نہ ہونے دیا۔ یہ لوگ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اور اختصار کی وجہ سے وہ تفصیل نہیں لکھ رہا کہ میں ہر ایک کو اس کے ''مقام'' پر کیسے رکھتا تھا۔ البتہ انہیں دنوں میں حاجی محمد شفیع صاحب نے میرے ان لوگوں کے ساتھ ''برتاؤ'' ''رویئے'' اور ''طریق کار'' پر ایک مضمون لکھ دیا کہ ان میں سے ایک امریکن دو گھنٹے کی بحث کے بعد محکمہ تعلقات عامہ کے گیٹ سے واپس مڑا کہ ''اس کا پہلا سوال کیا تھا اور میرا جواب کیا تھا کہ وہ سب کچھ بھول گیا ہے''۔ بحرحال ایسا کچھ یہ عاجز چند ماہ کر سکتا تھا کہ ہم پالیسی بنا رہے ہیں۔ جب کوئی پالیسی بن جاتی ہے تو پھر اس پالیسی کو صحیح ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اور یحییٰ خان کی حکومت چلانے کی کوئی پالیسی نہ تھی' ''ڈنگ ٹپاؤ'' گزارہ ہو رہا تھا۔ اور چھپے ہاتھ اپنے کام میں مصروف تھے کہ ہمیں ''سقوط ڈھاکہ'' کی طرف دھکیلا جا رہا تھا۔

یحییٰ خان کی میرے خواب کے مطابق ''مٹھی چاپی'' ہو رہی تھی اور اپنے ہر ماتحت کو وہ کہتا تھا کہ ٹھیک طرح سے کام کرو ورنہ گردن دبا دوں گا۔ وہ کسی کاغذ کو جو اس کے سامنے رکھا جاتا تھا' پوری طرح سے پڑھتا بھی نہ تھا۔ بلکہ اس افسر کو کہتا تھا کہ مجھے موٹی موٹی باتیں ''زبانی'' بتاؤ۔ اس کاغذ میں کیا لکھا ہے اور پھر کہتا تھا تم نے

پوری بات نہیں بتائی میں اس کاغذ کو پڑھوں گا۔ لیکن وہ پڑھتا نہیں تھا اور بغیر پڑھے اپنے دستخط یا ہاں یا نہ کا فیصلہ پہلی زبانی بریفنگ کی مدد سے کر دیتا تھا۔ اس سلسلہ میں میجر حسن جو مارشل لاء ریگولیشن یحییٰ خان کے دستخطوں سے میرے پاس جاری کرنے کے لئے لے آتا تھا۔ اس میں گرامر اور ہجوں کی غلطیاں ہوتی تھیں۔ اور میں ان کو ایسے سب مسودے واپس کر دیتا تھا۔ تو میجر حسن ادھر ہی دستخط شدہ کاغذوں کے الفاظ ربڑ سے مٹا کر وہاں صحیح الفاظ ٹائپ کر دیتا تھا یا قلم سے غلطی صحیح کر دیتا تھا۔ تو یہ عاجز تو ایسے ریگولیشن جاری کرنے سے انکار کر دیتا تھا تو میجر حسن کرنل صدیقی یا کرنل قاسم کے پاس جا کر ان سے OK کرا کے ہمارے دفتر سے پریس ریلیز جاری کرا لیتا تھا۔

حکومت چلانے کے لئے یحییٰ خان نے جنرل عبدالحمید' ائیر مارشل نور خان اور ایڈمرل احسن کو مختلف وزارتیں بانٹ دی تھیں اور وہ اپنے دفتروں میں بیٹھ کر یا کسی متعلقہ وزارت میں بیٹھ کر سیکرٹریوں کی سفارشوں کی مدد سے ڈنگ ٹپاؤ کام چلاتے تھے۔ نور خان نے کچھ زیادہ دلچسپی لی اور تعلیم کے محکمہ میں اپنی سوچ کے مطابق کچھ ریفارمز کرنا چاہیں لیکن بری طرح ناکام ہوا۔ اور مکھی پر مکھی ماری جاتی رہی کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا راز ہے' قدرت اس کا کام چلا رہی ہے۔ البتہ ایوانِ صدر یا مارشل لاء ہیڈ کوارٹر میں جنرل پیرزادہ نے کچھ تنظیم بنا لی کہ ''جی ہاں'' کرنے والے بریگیڈئر رحیم اور کریم یا ایسی ہی قسم کے کرنل عارف قسم کے ''کرنل'' اکھٹے کر لئے۔ جہاں یحییٰ خان کی پالیسی کہ وہ ''انتظامی بددیانتی'' صحیح کرے گا کے سلسلہ میں کچھ سویلین بیوروکریٹس کو ان ''بددیانتیوں'' کی وجہ سے گھر بھیجنے کا کام ہوتا رہا کہ ایسے 303 راشی افسروں کو سروس سے نکال دیا۔ لیکن اس سلسلہ میں نہ اصول ایک جیسے تھے نہ طریق کار میں یک رنگی تھی۔ یحییٰ خان اور اس کے ''حواریوں'' خاص کر جنرل پیرزادہ کا خیال تھا کہ ان سویلین بیوروکریٹس نے ایوب خان کے زمانے میں خوب دولت کمائی ہے اور ان میں سے کافی لوگ صحیح طور پر پکڑے گئے کہ پاکستان' اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا راز ہے۔ اس میں جس کسی نے پاکستان کا جتنا نقصان کیا وہ خود یا اس کی اولاد کو اس دنیا میں کچھ عبرتناک صورتحال سے دو چار ضرور ہونا پڑا۔ لیکن یہ معاملات کا حل نہیں ہے۔ بددیانتی والا معاملہ اسی طرح چل رہا ہے۔ اور کچھ لوگوں کو پچھلے دنوں مشرف حکومت نے پکڑا اور ان سے ''وصولیاں'' کیں۔ سیاسی بددیانتی' یا انتظامی بددیانتی کسی فلسفہ سے ختم کی جا سکتی ہے اور وہ فلسفہ اسلامی نظریات پر سختی سے عمل کرنا ہے۔ کاش! قوم کو یہ چھوٹی ساری بات سمجھ آ جائے۔

یحییٰ خان کے زمانے میں حکومت کی نہ کوئی پالیسی تھی نہ طریق کار کہ یحییٰ خان کوئی حکم تو دے دیتا تھا لیکن تفصیلی ہدایات دینا یا ڈائرکٹ کرنا یا کوئی پالیسی بنانا' یحییٰ خان کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے پاس' ایسی ضرورتوں کے لئے ''وقت'' نہیں ہوتا تھا۔ وہ زیادہ وقت کسی کے ساتھ گپ شپ یا کسی میٹنگ کی صدارت وغیرہ کرتا تھا۔ اور وہاں معاملات بہت ''مختصر'' ہوتے تھے کہ یحییٰ خان تفصیل میں نہ جانا چاہتا تھا۔ اور نہ اس کو زیادہ دلچسپی ہوتی تھی کہ کون کیا کر رہا ہے یا کام کیسے چل رہا ہے۔ پس پیرزادہ ہی دوسرے الفاظ میں حکومت چلا رہا تھا۔ تو اس نے سوچا' کہ کچھ وزیر بنا لئے جائیں۔ اور یحییٰ خان پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ نور خان کو کسی طرح فضائی فوج کی سربراہی سے ہٹائے۔ تو اس نے بڑی چالاکی سے اور زبانی کلامی بڑے انصاف اور ''فیاضی'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے فضائی اور بحری فوج والوں کو باور کرایا کہ صوبوں کی گورنری ہمیشہ بری فوج سنبھالتی ہے۔ اس دفعہ

مغربی پاکستان کی گورنری' فضائیہ والے سنبھالیں اور ائر مارشل نور خان اپنے ماموں نواب کالا باغ کی طرح مغربی پاکستان کو کنٹرول کریں۔ نور خان باتوں میں آ گیا لیکن مقصد اس کو فضائیہ کی سربراہی سے ہٹانا تھا۔ جب اس کی جگہ ایک چھپا قادیانی اور بسر و چشم کرنے والا ائر مارشل رحیم' فضائیہ پر اچھی طرح براجمان ہو گیا تو نور خان کو بھی مغربی پاکستان کی گورنری سے ہٹا کر ''ٹشو پیپر'' کی طرح پھینک دیا۔ اور اس کی جگہ ایک ''بسر و چشم'' کرنے والے لیفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمان کو لگا دیا۔ اور پھر مغربی پاکستان کے چار صوبے بنا کر ہر صوبے کا گورنر کسی لیفٹیننٹ جنرل کو ہی بنایا۔ مشرقی پاکستان کی گورنری ایک ''کمزور انسان'' بحری فوج کے ایڈمرل احسن کو دی گئی۔ جو نہ صرف مجیب الرحمن کی خوشامد کرتا تھا بلکہ زبان کے جھگڑے میں مارے جانے والے بنگالیوں کو ''شہید'' قرار دے کر ان کے نشانوں پر پھول چڑھاتا تھا۔ یعنی بنگالی نیشنلزم کی خوب پذیرائی ہو رہی تھی کہ ملک پاکستان کو دولخت کیا جائے (توبہ میرے اللہ)

تو یحییٰ خان نے مرکز میں بھی ایک بھان متی کے کنبہ والی کابینہ تشکیل دے دی کہ خوب افراتفری ہو اور مکمل مادر پدر آزادی ہو۔ کہ ذوالفقار علی بھٹو خوب مداری کے تماشے کر کے مغربی پاکستان والوں کی رہنمائی سنبھال لے۔ یحییٰ خان کی دلچسپیاں اور تھیں کہ اس کے پاس حکومت چلانے کے ''جھمیلوں'' میں الجھنے کا وقت نہ تھا۔ نہ کوئی وزیراعظم تھا نہ سینئر وزیر کہ حکومت کسی ملی جلی پالیسی کے تحت چلتی۔ ہر وزیر اپنی الگ الگ ''ڈفلی'' بجاتا تھا۔ جنرل نوابزادہ شیر علی کی اس حکومت میں شرکت ''حب علیؓ'' کی وجہ سے نہ تھی۔ بلکہ ''بغض معاویہ'' کا اظہار تھا۔ کہ وہ ایوب خان کو ناپسند کرتے تھے کہ اس نے انہیں بری فوج کی سربراہی نہ دی۔ اب یحییٰ خان نے ایوب کو چلتا کیا تو وہ اپنا ''ساڑ پھانکنے'' کے لئے یحییٰ کے وزیر بن بیٹھے۔ جو ان سے بہت جونیئر تھا اور ان کے ماتحت کام کر چکا تھا۔ وہ یحییٰ خان کے کردار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے لیکن وہ اس بے کردار آدمی کی حکومت میں وزیر مذہبی امور اور وزیر اطلاعات بن بیٹھے۔ اور دسمبر 1970ء میں اسلامی خیال والوں کی بری طرح شکست کی وجہ سے وزارت سے ان کو مستعفی ہونا پڑا۔ کہ لادین طاقتیں ان کے پیچھے پڑ گئیں۔ پنجاب سے یحییٰ خان نے اپنے ہم عقیدہ مظفر علی قزلباش کو وزیر بنایا۔ جو پنجابیوں کے حقوق کی دیکھ بھال کی بجائے زیادہ وقت اہل تشیع کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ یا اپنے ان غدار ساتھیوں کی جن لوگوں نے خضر حیات سے مل کر اسلام اور پاکستان کو نقصان پہنچایا تھا۔ سرحد سے وزارت' خان قیوم سے بے وفائی کرنے والے عبدالرشید کو دی جو پختونوں کا نمائندہ ہونے کی بجائے' زیادہ احکام جنرل پیرزادہ سے لیتے تھے۔ مشرقی پاکستان سے ایک غیر جانبدار ڈاکٹر اے ایم مالک کو وزیر بنایا۔ جس کو بعد میں گورنر لگانا پڑا۔ یعنی یہ ایک ''ڈنگ ٹپاؤ'' حکومت تھی۔ جن میں نوابزادہ شیر علی اور ایک آدھ وزیر اپنی مرضی کرتے تھے۔ ورنہ باقی وزیر جنرل پیرزادہ سے ہدایات لیتے تھے۔ جس کے ذوالفقار علی بھٹو کیساتھ گہرے اندرونی رابطے تھے کہ بھٹو نے اس کے ساتھ وعدہ کیا ہوا تھا کہ جب اس کو حکومت ملی تو وہ اس کو بری فوج کا سربراہ بنائے گا۔

ایسا ہی وعدہ بھٹو نے میجر جنرل گل حسن سے کیا ہوا تھا۔ اور اس کے ذریعہ سے بعد میں یہ رابطہ ائر مارشل رحیم قادیانی سے بھی کر لیا تھا لیکن حکمرانوں میں ایک تیسرا ''مضبوط'' گروہ جنرل یحییٰ خان کے ''سایہ'' جنرل عبدالحمید کا تھا جس کے ساتھ میجر جنرل ابوبکر مٹھا' میجر جنرل خداداد' میجر جنرل عنایت کیانی اور میجر جنرل

غلام عمر شامل تھے۔ اور میجر جنرل عمر تو ''کسنجر'' آف پاکستان بنا ہوا تھا۔ اور یہ لوگ یحییٰ کی ''وفاداری'' کا دم بھی بھرتے تھے۔ اور یحییٰ خان کی اصلی طاقت یہی لوگ تھے۔ البتہ یحییٰ خان نے بری فوج کی سربراہی نہ چھوڑی تھی۔ فوج میں اس کا پرائیویٹ سیکرٹری بریگیڈئر امیر گلستان جنجوعہ تھا۔ جس کو بعد میں ضیاء الحق نے صوبہ سرحد گورنر بنا دیا تھا کہ وہ جنرل فضل حق کو ''کنٹرول'' کرتا رہے۔ یہ اس زمانے میں یحییٰ کے ''سایہ'' عبدالحمید کا بھی سیکرٹری تھا کہ یحییٰ کی طرف سے جنرل حمید پر بھی ''نظر'' رکھتا تھا۔ البتہ یحییٰ خان نے سیدھے طور پر اپنے ایوانِ صدر کے سیکرٹری بریگیڈئر بعد میں میجر جنرل محمد اسحاق کے ذریعہ سے جنرل گل حسن کے ساتھ بھی رابطہ رکھا ہوا تھا۔ اور حیرانگی کی بات ہے کہ میجر جنرل اسحاق پانچ وقت کا نمازی اور تہجد گزار تھا۔ اس نے یحییٰ کے ساتھ کیسے گزارا کیا بلکہ بعد میں ذوالفقار علی بھٹو کا بھی کافی عرصہ ملٹری سیکرٹری رہا اور نوابزادہ شیر علی کا بھی بڑا ''خاص الخاص'' آدمی تھا۔ یہ آدمی میری پلٹن کا تھا۔ اوپر والوں کو سلام کرنے کا ماہر تھا۔ اور نیچے والوں کے ساتھ سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا سوائے اپنے تعلق والوں کے۔ جنرل گل حسن یحییٰ کے ''سایہ'' جنرل عبدالحمید کو ''خاطر'' میں نہ لاتا تھا۔ راقم ایک ''بن دیکھا مبصر'' تھا۔ سب کے ساتھ کام پڑتا تھا۔ اور یہ لوگ مجھے ایک ''معمولی میجر'' سمجھتے میری موجودگی میں اپنی ''کمزوریوں'' کا اظہار کر بیٹھتے تھے۔ میں جہاں جاتا تھا وہاں کا ''ماحول'' بول اٹھتا تھا کہ کتنی افراتفری ہے۔ ایک دوسرے کا اعتبار نہیں اور کوئی یہ نہیں سوچتا تھا کہ ملک کس تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ کہ جنرل گل حسن نے ہم پر پوری طرح ''براجمان'' ہونے کے لئے ہم جی ایس برانچ کے افسروں سے خطاب کیا کہ ہم پیشہ وارانہ لحاظ سے اپنے آپ کو آنے والے حالات کیلئے تیار کریں۔ ستمبر 65ء کی جنگ فیصلہ کن نہ تھی۔ بھارت اور ہم دوبارہ جنگ کی طرف پیش رفت کر رہے ہیں اور ہمیں سچے اور بہادر لوگوں کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں آپ حالات کو بہتر کرنے کی کوئی تجویز دیں گے تو میں اس کا شکر گزار ہوں گا وغیرہ۔

راقم کی جنرل گل حسن کے ساتھ دوسری جنگ عظیم کے وقت سے شناسائی تھی۔ کہ وہ مشہور انگریز جنرل بعد میں فیلڈ مارشل سلم کے اے ڈی سی تھے۔ اور راقم بھی اس ہیڈ کوارٹر میں آتا جاتا رہتا تھا۔ جنرل گل حسن رائل انڈین ملٹری کالج ڈیرہ دوں کا تعلیم یافتہ اور فوج میں سچے اور بااصول لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ سچ سن بھی لیتا تھا اور اوپر والوں کو بھی کبھی کبھی سچ سنا دیتا تھا۔ پیشہ وارانہ لحاظ سے بھی وہ اکثر دوسروں سے بہتر تھا۔ اور دوستوں کا دوست بھی تھا۔ اور عہدوں میں فرق ہو جانے کے باوجود مجھے وہ ایک دوست کی طرح ملتا تھا لیکن کنوارا رہنے کی وجہ سے اور شراب کا رسیا ہو جانے سے' گل حسن میں کچھ خود پسندی اور تکبر کے پہلو گھر کر گئے تھے۔ اسلئے گل حسن بھی وہ ''شخصیت'' نہ تھا' جس کی اس عاجز کو تلاش رہی تھی' اور اب تک ہے۔

پاکستان کو دولخت ،کس نے کیا

پاکستان کو دولخت کرانے والے ایکٹروں میں جنرل گل حسن اور جنرل عبدالحمید اور اس کے حواریوں نے اہم ''رول'' ادا کیا۔ خاص کر 1971ء کی فوجی شکست کی ذمہ داری ان لوگوں پر بھی اتنی زیادہ ہے' جتنی امیر عبداللہ نیازی پر۔ نیازی نے عملی طور پر کوتاہی کی اور ان لوگوں کی ایک دوسرے کے ساتھ ''چپقلش'' کی وجہ سے ان کی تجاویز اور تیاری بھی بالکل غلط تھی۔ اور مغربی پاکستان میں عملی کارروائی بھی بد سے بدتر تھی جو تفصیل آگے آ رہی ہے۔

(چھوٹا منہ اور بڑی بات) قارئین! یہ عاجز جو آج اس قسم کے مضامین لکھ رہا ہے تو یہ کوئی بعد کی سوچ نہیں۔ اس کا پس منظر ہے کہ جو کچھ اس عاجز نے 1948ء میں اور 1965ء میں سوچا۔ وہ صحیح ثابت ہوا۔ تو اس طرح اس عاجز نے 1969ء کے پہلے چھ ماہ میں ایک مسودہ لکھ کر جنرل گل حسن کو پیش کیا۔ جس کی کاپی اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ اور یہ مسودہ فروری 1972ء میں ذوالفقار علی بھٹو اور جنرلوں کی میٹنگ میں زیر بحث بھی آیا کہ اس عاجز نے دو سال پہلے لکھ کر دے دیا تھا کہ آنے والی جنگ کے نتائج ستمبر 65ء کے نتائج سے بھی بدترین ہوں گے۔ دراصل میں سیدھے طور پر یہ لکھ کر نہ دینا چاہتا تھا کہ اس کافرانہ مغربی دفاعی نظام کی بجائے ہم فطری جہاد کی حکمت عملی کے تحت تدبیرات بنا کر اپنے آپ کو جہاد کے تقاضوں کے تحت منظم کریں۔ کہ اگر یہ الفاظ لکھتا تو مجھے بھی ایک ''مولوی'' قرار دے دیا جاتا۔ اس لئے میں نے یہ مسودہ ایسے الفاظ اور زبان سے تیار کیا جو فوج کے ''روزمرہ'' میں اور ''تحریروں'' میں استعمال ہوتی تھی۔ مختصراً عرض کی کہ ہماری موجودہ فوجی تدبیرات اور فوجی تنظیم کسی ایسی فوجی یا عسکری تعزیرات کے تابع نہیں ہیں۔ جو تدبیرات کسی قومی حکمت عملی کے تحت تیار کی ہوں، اور ایسی فوجی حکمت عملی، قومی مقاصد سامنے کر کے تیار کی ہو۔ بلکہ صورتحال یہ ہے کہ باہر سے جو ہتھیار مل سکتے ہیں ان کی مدد سے انگریزوں کی نوآبادیاتی تنظیم کی نقل میں ایک فوجی ڈھانچہ کھڑا کیا ہوا ہے۔ جس کو ایک متحارب گروہ کے طور پر جنگ میں ''جھونک'' دیا جاتا ہے۔ بھارت کو چونکہ متحارب گروہ کے طور پر ہمارے اوپر عددی برتری بھی ہے اور ہتھیار بھی اس کے پاس زیادہ ہیں تو ہم چند دن کی لڑائی یا جنگ لڑ سکتے ہیں۔ جیسے ستمبر 65ء میں صرف سترہ دن جنگ لڑ سکے۔ اب اگر بہت زیادہ تیاری کر لیں اور جذبہ کو بڑھا بھی لیں تو زیادہ سے زیادہ ستائیس دن لڑائی لڑ سکیں گے۔ بلکہ مجھے تو خیال ہوتا ہے کہ صرف سات دن لڑ سکیں گے۔ یہ بھیانک صورتحال اس عاجز کو نظر آ رہی ہے۔ فوج والے میرے ساتھ مل کر آنے والی جنگ کے مناظر کا اگر سچے دل سے تصور باندھ سکتے ہیں تو ان کو یہ سب صحیح طور پر نظر آ جائے گا۔ کہ میں ثابت کروں گا کہ یہ عاجز صحیح ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اسلامی فلسفہ کو اپناتے ہوئے پہلے ہم فوج والے حزب اللہ بنیں

آؤ پوری فوج والے توبہ و ندامت کریں۔ اپنے نفس کو بھی پہچانیں اور قوم کے طور پر اپنی ذمہ داریوں کو بھی پہچانیں۔ اور اسلامی فلسفہ حیات کو اپناتے ہوئے پہلے ہم فوج والے ''حزب اللہ'' بنیں اور پھر پوری قوم کو ''حزب اللہ'' بنائیں۔ جو بھاری ہتھیار ہمارے پاس ہیں ان کو انعام خداوندی سمجھ کر بہت کفایت شعاری سے اور خاص مقامات اور خاص اوقات پر استعمال کریں۔ پاکستان کی پیدل فوج کو ''شبخونی'' کفن پوش مجاہدین بننا ہوگا۔ جنہیں ہر جگہ آخری جوان اور آخری گولی تک لڑنا ہوگا اور پوری قوم کے نوجوانوں کو ایک ایک بندوق سے لیس کرنا ہوگا۔ اور ملک میں چار پانچ کروڑ مجاہدین کو ایک ''سیلاب'' کی شکل اختیار کرنا ہوگی وغیرہ وغیرہ اور اس عاجز نے پوری تنظیم بنانے کے طریق کار اور خاکہ بھی دیا کہ ہم فوجی سر جوڑ کر اس خاکہ میں رنگ بھر کر پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنا دیں۔ وغیرہ وغیرہ

قارئین! جنرل گل حسن اور اس کے سٹاف نے یہ سفارشات پڑھیں یا نہ پڑھیں۔ بات سیدھی ہے کہ اس

پر کوئی کارروائی نہ ہوئی اور ہم 1971 میں ذلت سے دوچار ہوئے اور صورتحال آج بھی یہی ہے کہ مکھی پر مکھی ماری جا رہی ہے اور اس زمانے میں بھی مکھی پر مکھی ماری گئی اور سقوط ڈھاکہ ہو گیا۔ لیکن یہ اکیلے فوج کی ذمہ داری نہیں، یہ معاملہ قومی ہے اور اس عاجز نے کوشش شروع کر دی کہ یحییٰ خان اور حکومت تک یہ سب کچھ پہنچاؤں۔ ساتھ ہی ''ہلال'' کے سیرت نمبر کا اجراء شروع کر دیا اور ہلال میں ایسے مضامین شروع کر دیئے کہ ہم جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنائیں اور حضور پاک ﷺ یا قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی جنگوں کے اسباق پر توجہ دے کر اپنی فوجی حکمت عملیوں یا تدبیرات کو اسلامی رنگ دیں۔ تو سقوط ڈھاکہ کوئی ایک آدھ دن یا کسی ایک وقت کا حادثہ ہرگز نہیں ہم نے قوم کے طور پر کبھی سوچا نہیں کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا راز ہے۔ یہاں اگر مسلم قومیت کا فلسفہ اجاگر ہو گیا تو ہم نے سورۃ المائدہ اور سورۃ المجادلہ کے الفاظ کے مطابق ''حزب اللہ'' بننا ہے۔ غیر اس چیز کو سمجھتے ہیں۔ اسرائیل والے عربوں کی بجائے پاکستان کو اپنا بڑا دشمن سمجھتے ہیں وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ پاکستان والے ان کو ''تسلیم'' کر لیں۔ چین والے بھی ہماری ''وقعت'' سے آگاہ ہیں۔ اس لئے یہ سب کچھ ایک دن ہونا ہے کہ باطل قوتیں حزب اللہ کے سامنے سرنگوں ہوں گی۔ لیکن ایسا ایوب خان اور یحییٰ خان کے تحت تو نہ ہو سکتا تھا۔ یحییٰ خان اپنی مداری والی ''ڈفلی'' بجا کر ایک ''رنگ ماسٹر'' بنا بیٹھا تھا کہ سیاستدانوں کو ''تگڑم'' ناچ نچا رہا تھا۔ کہ وہ ایوب والی غلطی نہ کرے گا کہ خود سیاست میں شامل ہو جائے بلکہ سیاستدانوں کو لڑا کر ''بندر بانٹ'' بھی کروں گا اور صدارت پر بھی ''براجمان'' رہوں گا۔

تو یحییٰ خان کی پالیسی یہ تھی کہ مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمان کو خوب اکثریت ملے۔ کہ جن لوگوں نے حساب لگایا کہ مجیب الرحمٰن کو مشرقی پاکستان میں پچاس فیصد ووٹ ملیں گے تو یحییٰ خان نے مجیب الرحمٰن کو اکثریت دلانے کے لئے دونوں خطوں میں برابری کے اصول کو ختم کر دیا جو دونوں خطوں کو متوازن رکھنے کے لئے سیاستدانوں نے محنت کر کے بنایا تھا۔ اور یحییٰ خان نے قومی اسمبلی کی سیٹوں کو آبادی کے حساب سے کر دیا تو مشرقی پاکستان کی سیٹوں کی تعداد بڑھ گئی۔ ادھر مغربی پاکستان میں ون یونٹ ختم کر کے یحییٰ خان نے چار صوبے بھی بحال کر دیئے۔ کہ یہاں مغربی پاکستان میں کوئی متحدہ محاذ' مجیب کے مقابلے میں نہ آئے اور ایڈمرل احسن کے ذریعہ سے مجیب الرحمٰن سے یقین دہانی ہو سکتی تھی کہ وہ وزیراعظم ہو گا اور یحییٰ خان صدر ہو گا۔ مغربی پاکستان میں ''اسلام پسندوں'' کو یحییٰ خان خوب نکو بنا رہا تھا' کہتا تھا' پاکستان نظریہ اسلام کی پیداوار ہے اور وہ اس نظریہ کی حفاظت کرے گا اور ایسی باتوں سے متاثر ہو کر جماعت اسلامی کے محمد طفیل نے اپنی ''سادگی'' کی وجہ سے یہ اعلان بھی کر دیا کہ یحییٰ خان ملک کو اسلامی آئین دے گا (توبہ میرے اللہ)۔ یہ سب لیپا پوتی تھی۔ یحییٰ خان نے ایک ''لیگل آرڈر'' جاری کیا کہ سیاستدان فلاں فلاں حدیں نہ پھلانگیں گے اور اس میں نظریہ اسلام کا ذکر ضرور کیا کہ کوئی اس کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔ لیکن ان احکام پر سختی سے عمل نہ کرایا گیا۔ مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو لادین سیاست میں سوشلزم کا پرچار کر کے لوگوں کو روٹی' کپڑا' مکان کے مادی چکر میں پھنسا چکا تھا۔ جو سراسر غیر اسلامی کارروائی تھی اور مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمان' مغربی پاکستان خاص کر ''پنجابیوں'' کے خلاف ایسی نفرت پھیلا رہا تھا کہ وہاں کوئی ہوا کا سخت جھونکا بھی آ جاتا تو بنگالی پکار اٹھتے ''سالا پنجابی! یہ کچھ لایا ہے یا اس کو نہیں روکتا''۔

اب اس مادر پدر آزاد جمہوری نظام میں سیاستدان' بھانت بھانت کی جو بولیاں بول رہے تھے اور ''برابری'' کو جو غلط طور پر ''پروجیکٹ'' کیا جا رہا تھا ملک کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے ہرگز نہ بچایا جا سکتا تھا۔ ملک کو دولخت کر کے تو رب کی ذات پاک نے تھوڑی سزا اور تنبیہہ پر اکتفا کیا۔ ورنہ حالات ایسے نظر آ رہے تھے کہ ملک کئی مزید ٹکڑوں میں بٹ جائے گا لیکن پاکستان اللہ تعالیٰ کا راز ہے اور اللہ تعالیٰ نے زیادہ ٹکڑے ہونے سے ہمیں کیسے بچایا۔ یہ سب جائزے اور حقائق آگے آ رہے ہیں (لیکن افسوس ہم نے کوئی سبق نہ سیکھا۔ آج مشرف کے زمانے میں مجھے حالات ہو بہو ویسے ہی نظر آ رہے ہیں کہ ہماری قوم ایک بہت بڑے انتشار سے دوچار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی مہربانی کر کے کسی معجزہ سے ہمیں بچائے)۔

تو یہ تھے 1970ء کے وسط کے حالات لیکن افسوس کہ جیسی ناسمجھی اس زمانے میں تھی۔ آج بھی یہی حالت ہے۔ یحییٰ خان بڑا خوش تھا کہ اس نے سیاستدانوں کو لڑا دیا ہے کہ سب اس کے ''محتاج'' بنے ہوئے ہیں۔ تو 14 ستمبر 1970ء کو نہایت ''Relax'' حالت میں یحییٰ خان نے افواج پاکستان کے تقریباً چھ سو افسروں سے آ کر اس طرح ''خطاب'' کیا۔ کہ اس نے ''میدان'' مار لیا ہے۔ وہ آزادانہ انتخابات کرائے گا وغیرہ۔ یحییٰ خان نے اپنی تقریر بڑی غیر رواجی طور پر شروع کی۔ کہ وہ کہنے لگا کہ پچھلے ڈیڑھ سال سے وہ ''غیر لڑاکا'' قسم کا فوجی بن کر رہ گیا ہے۔ اور تم لوگ مجھے لانگری' بہشتیوں کے زمرے میں ڈال سکتے ہو کہ میں فن سپہ گری کے پیشہ سے ''لاتعلق'' تھا۔ اس طرز میں یحییٰ خان لڑاکا فوجیوں کو بھی تکبر دلا کر بے وقوف بنا رہا تھا کہ وہ ان سے اعتماد کا ووٹ لینا چاہتا تھا۔ کہ یہ ایک قسم کی ''چاپلوسی'' بھی تھی کہ لڑاکا فوجی ہی سپریم ہیں۔ ورنہ ملک کا صدر بھی لانگریوں' بہشتیوں کے زمرہ میں آتا ہے۔ اس کے بعد یحییٰ خان نے ملک کے سیاستدانوں کے بارے میں بڑے تفصیلی باتیں کیں کہ ان میں اکثریت ''کم فہموں'' کی ہے اور مجھے تحصیلدار یا تھانیدار سمجھتے ہیں۔ کہ میں ان کے ایسے کام کرا دوں۔ بین الاقوامی معاملات کی ان کو ذرا بھر شدبد نہیں۔ اور میں حیران ہوں کہ یہ لوگ حکومت کیسے چلائیں گے۔ تو ہم فوجیوں کو اس ملک کو کافی عرصہ ''چھاتہ'' مہیا کرنا ہوگا۔ وغیرہ یحییٰ خان نے بالکل Informal طریقے سے ہمارے ساتھ بہت باتیں کیں' جیسے کوئی حکمران ''خاندانی کچن کابینہ'' کے ساتھ کرتا ہے۔

جب یحییٰ خان نے کھلے دل سے سوالات کی دعوت دی تو میں نے ارادہ کیا کہ یحییٰ خان سے پوچھوں کہ کل ایوب خان نے تم سے یہی ''چھاتہ'' مانگا تو تم نے کہا فوج ''غیر جانبدار'' ہے۔ لیکن وقت آیا تو یہ غیر جانبداری ختم کر کے آپ نے حکومت سنبھال لی۔ اب کتنا عرصہ مزید ہمارے کندھے پر بندوق رکھ کر آپ اور آپ کے حواری حکومت کے مزے اڑانا چاہتے ہو۔ آخر اس ملک کو چلانے کیلئے کوئی سسٹم یا طریقہ تو بنایا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ لیکن میں نے سوچا کہ چلو دوسرے لوگوں کے سوالات سن لوں۔ اور پھر ماحول کے مطابق سوال کروں گا۔ اب جو سوالات کا سلسلہ شروع ہوا تو کسی ایک آدمی نے سنجیدہ بات نہ کی۔ نہ ملک میں افراتفری کی صورت حال پر تبصرہ کیا۔ بلکہ ہر سوال کسی خوشامد کے مدنظر ہوتا تھا۔ کہ ''چارے چوکاں تیرے ڈیوا بلدا اے۔ اے یحییٰ خان تو بڑا عظیم رہنما ہے۔ شکر ہے تو نے آ کر ملک کو سنبھالا دیا ہے اور تو ملک کے معاملات کو خوب سمجھتا ہے۔'' اب خوشامد والی کوئی بات باقی نہ رہ گئی تو ایک صاحب نے ایک بے معنی سا سوال کر دیا کہ یہ ''چھاتہ'' کھلا ہوگا

پابند۔ تو یحییٰ خان اور اس کے حواری خوب کھلکھلا کر ہنسے اور بڑے بھروسہ کے ساتھ یحییٰ خان کہنے لگا کہ ''میاں۔ چھاتہ۔ چھاتہ ہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے۔ تو کھول دیا جاتا ہے۔ ورنہ وہ بند صورت میں پاس ہوتا ہے یا میسر ہوتا ہے۔''

اب کسی غیبی طاقت نے مجھے کھڑا کر دیا اور میرے منہ سے یہ الفاظ نکال دیئے۔ ''جناب صدر صاحب! مجھے وہ وقت نظر آ رہا ہے کہ یہ ''چھاتہ'' پاش پاش ہو جائے گا۔ اور آپ ملک کے ٹکڑے ہونے پر صدارت کریں گے۔'' سب ہال پر سناٹا چھا گیا۔ مجھے خود بھی معلوم نہ تھا کہ میں نے وہ الفاظ کیوں کہہ دیئے۔ یحییٰ خان نے کہا ''تم کیا سوال کرتے ہو۔ میں نے چھاتہ کے سوال کا جواب دے دیا ہے۔'' اس عاجز نے رب ذات پاک سے عرض کی کہ میری رہنمائی فرما۔ تو میں نے جواب دیا۔ ''جناب صدر صاحب! میں نے تو کوئی سوال نہیں کیا۔ بلکہ ایک حقیقت بیان کی ہے کہ فضا میں یہ ریکارڈ ہو جائے کہ چھ سو افسران میں سے ایک نے کلمہ حق کہہ ڈالا۔'' یحییٰ خان نے کہا ''تم آگے آؤ'' جس میں مقصد مجھے ڈرانا تھا۔ تو میں نے اس کی طرف بڑھتے عرض کی کہ جناب میں آگے آنے سے نہیں ڈرتا۔ اور اپنا بیان دہرا دیا کہ یہ حقیقت ہے جس سے آپ لوگوں کو آگاہ کرتا ہوں۔'' یحییٰ خان نے کہا ''ایسا کیوں ہوگا؟'' عرض کی ''اس لئے کہ آپ نے جو صورتحال بیان کی ہے وہ کچھ تو تانگے کا کوچوان بھی جانتا ہے۔ آپ ملک کے رہنما ہیں۔ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے اور ہمیں بتایئے کہ آپ ردعمل کیا ہوں گے اور آپ حالات کو کیسے کنٹرول کریں گے۔'' یحییٰ خان نے کہا ''کہ میں کوئی فقیر ہوں کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ کیا ہونے والا ہے۔'' میں نے عرض کی ''کہ جناب لیڈر شپ کے اسباق میں پڑھایا جاتا ہے کہ لیڈر قوم کے ساتھ ساتھ بھی چلتا ہے اور آگے آگے بھی چلتا ہے کہ وہ دیکھ سکے کہ کیا ہونے والا ہے۔ اور خود ایسا نظر نہ آئے تو ایسے مشیر مقرر کرتا ہے۔ جو اس کو صحیح صورت حالت سے آگاہ کریں۔'' یحییٰ خان نے کہا ''کہ میں کس کو مشیر مقرر کروں؟ میں نے کہا'' مجھ جیسے لوگوں کو اور نہ ان سرخ فیتوں والوں کو جو اپنی کرسیوں پر خوش ہیں اور آپ کو کبھی سچ نہ بتلائیں گے۔ مجھ سے تھوڑا سا سچ سن لیں باقی میں لکھ کر دوں گا۔ اور وہ سچ یہ ہے کہ ان شراب کی بوتلوں کو ظہیر الدین بابر کی طرح توڑ دو۔ اور خود بھی توبہ و ندامت کرو اور قوم سے بھی توبہ و ندامت کراؤ۔ ہم کتنی بدقسمت قوم ہیں کہ زمین کی پوجا ''پاک سرزمین شاد باد'' کا ترانہ بجتا ہے تو ہم خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں اور مسجد سے اللہ تعالیٰ کے بلاوے کی اذان ہوتی ہے تو ہم کلبوں میں ناچ کر رہے ہوتے ہیں اس قوم کو اسلام کے راستے پر لگا دو۔ ورنہ عبرتناک انجام کیلئے تیار ہو جاؤ۔'' اور بھی چھوٹی موٹی باتیں ہوئیں لیکن قارئین! عجیب صورت حال تھی۔

یحییٰ خان کچھ تھر تھرا رہا تھا اور اس کے اکثر حواریوں کے چہرے ''باسرہ'' ہو چکے تھے۔ یحییٰ خان کی تقریر پر پانی پھر چکا تھا۔ اور جو محل اس نے اپنی کارکردگی کے گرد تعمیر کیا تھا۔ وہ دھڑام سے گر چکا تھا۔ اس نے ''بے دلی'' سے کہا کہ اچھا میں تمہارے لکھے ہوئے ''مسودے'' کا انتظار کروں گا'' اور اس کو اس ''ناکام اجتماع'' کو ختم کرنے کا بہانہ مل گیا۔ اب قارئین ذرا اندازہ لگائیں کہ جس قوم کے سربراہوں کو ایک چھوٹا سا میجر یہ سچ سناتا ہے اور یہ کچھ سن کر وقتی چہرے لٹکانے کے علاوہ کوئی ایک سینئر کوئی ردعمل نہیں دکھاتا۔ صرف تین افسران بریگیڈیئر غضنفر، کرنل محبوب الٰہی اور میجر عجائب حسین میرے نزدیک باری باری آئے اور کہا۔ ''مرحبا۔ لالہ! اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی جزا

دے" باقی سینکڑوں جاننے والوں نے میرے ساتھ آنکھ ملانے سے گریز کیا۔ یہ عاجز پورا مسودہ لکھ کر 5 اکتوبر 1970ء کو صدر ہاؤس میں صدر کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈئر محمد اسحاق کو دے آیا۔ اس کی کاپی آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ اور ہر بات آج بھی بڑی تروتازہ ہے۔ میں نے اس کی ہزاروں کاپیاں بنوائیں۔ لیکن لوگ وہ مسودہ لینے سے ڈرتے یا گھبراتے تھے۔ میں نے اس کی کاپیاں کچھ دوسری چھاؤنیوں میں بھی "رفقاء" کو بھیجیں اور ساری فوج جانتی تھی کہ ایک ایسا مسودہ یحیٰی خان کو دیا گیا تھا۔ کہ 1977ء میں مارشل لاء لگانے کے بعد جنرل ضیاء الحق نے میرے پرانے عزیز اور پلٹن وال لیفٹیننٹ جنرل غلام حسن کو میرے پاس بھیجا جو یہ مسودہ مجھ سے لے گیا اور ضیاء الحق نے جلد مجھے ملاقات کیلئے بلانے کا وعدہ کیا۔ لیکن کیسی ملاقات؟ یہ کہانیاں اپنے وقت پر بیان ہوں گی۔ ضیاء الحق مجھے "لالہ" یا بڑا بھائی کہتا تھا۔ جہاں میں کھڑا ہوتا تھا چل کر میرے پاس آتا تھا۔ لیکن حکومت سنبھالنے کے بعد جہاں ایک "دوافطاریوں" میں اکٹھے ہوگئے۔ تو ضیاء الحق اس صف میں نماز بھی نہ پڑھتا تھا۔ جس میں یہ عاجز کھڑا ہو جاتا۔ کیا وہ مجھ سے ڈرتا تھا؟ نہیں! وہ مجھے ملیامیٹ کر سکتا تھا۔ میں اس کے مقابلہ میں ایک چھوٹا آدمی تھا۔ کچھ رکھ رکھاؤ ہوتا ہے کہ کچھ وجوہات کہ "بڑوں" کیلئے "چھوٹوں" کا سامنا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ وضاحتیں آنے والے واقعات میں قارئین کو عملی طور پر باور کرائی جائیں گی۔

"بڑوں" کی بہت قسمیں ہوتی ہیں۔ میرا ایسا ہی ایک رفیق اور میرے قبیلہ کا آدمی سگنل کے محکمہ سے پہلا میجر جنرل بن گیا تھا۔ کہ یحیٰی خان نے ترقیاں عام کر دی تھیں۔ ان صاحب نے اگلی جی ایس کانفرنس میں سفارش کی کہ میجر امیر افضل صدر مملکت کے ساتھ بڑی گستاخی سے پیش آیا۔ اور اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ میجر جنرل عابد زاہد نائب چیف کے طور پر صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے بعد میں میرے دوست بریگیڈئر اختر علی کو پوری کہانی بتائی کہ اس نے جواب دیا کہ اس سلسلہ میں **JAG Branch** سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ بعد میں جنرل گل حسن کے سامنے معاملہ پیش کریں گے کہ وہ (یعنی عابد زاہد) اس اجتماع میں موجود نہ تھے۔ **JAG** والوں نے مہمل قسم کا جواب دیا۔ اور جب گل حسن سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ فوج کو میجر امیر افضل جیسے سچے آدمیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق یہ **Discipline** (ضبط) کا معاملہ نہیں ہے۔ ہاں صدر ہاؤس سے کوئی حکم آئے تو پھر کارروائی ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ چند دن بعد میں کار میں جا رہا تھا کہ **JAG** کے میجر جنرل عبدالعزیز قاضی مجھے سڑک پہ چلتے نظر آئے۔ میں نے کار روک لی کہ ان کو دفتر چھوڑ آتا ہوں کہ وہ میرے پرانے رفیق تھے۔ انہوں نے "نہ" کردی کہ وہ جان بوجھ کر پیدل چل رہے ہیں۔ لیکن میں تھوڑا آگے گیا تھا کہ انہوں نے مجھے آواز دی کہ "رک جاؤ" اور پھر میری کار میں سوار ہو گئے۔ کہنے لگے کہ "آج کل لوگ تمہارے ساتھ بات کرتے ڈرتے ہیں۔ کہ اوپر والے ناراض ہو جائیں گے۔ تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اسی "ڈر" کی وجہ سے میں تمہاری کار میں سوار نہ ہوا۔ اب تم میرے دفتر چلو گے اور میرے ساتھ چائے بھی پینا۔ کہ کچھ لوگ تمہارے خلاف قانونی کارروائی چاہتے تھے اور ہم سے مشورہ لیا گیا تو ہم نے کہا کہ یہ مہمل قسم کا "حادثہ" تھا جس کو جیسا مرضی ہوا ایسا معاملہ بنایا جا سکتا ہے لیکن جنرل گل حسن نے معاملہ کو ختم کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود اکتوبر ہیں میری فوج سے ریٹائرمنٹ کے احکام جاری ہو گئے کہ میں 16 مارچ 1971ء کو فوج سے ریٹائر ہو جاؤں گا۔

کچھ لوگوں نے ہمدردی کی مجھے نہ کوئی زمین نہ کوئی پلاٹ وغیرہ ملا تھا۔ اور اب تو کوئی چیز نہ ملے گی اور آج تک تم نے سر چھپانے کی جگہ بھی نہ بنوائی۔ اور اب تو فوجی فاؤنڈیشن میں کوئی نوکری بھی نہ ملے گی۔ یہ عاجز 33 سال نوکری کر چکا تھا۔ مجھے ذرا بھی افسوس نہ ہوا۔ اور اگلے چند ماہ اور زور شور سے نوکری کی۔ کہ 1970ء کے انتخابات کو بہت نزدیک سے دیکھا کہ نوکری نہ ہمارے مزاج سے مطابقت رکھتی ہے اور نہ یہ ہمارے قومی معاملات کا حل ہے اور یہی کچھ اس عاجز نے اپنے ''مسودہ'' میں تحریر کیا تھا۔ اور یہ کافرانہ نظام نہ آج تک ملک میں چلا ہے۔ نہ آگے چلے گا۔ آج کل جنرل مشرف کی جمہوریت کے نتائج اور نتائج کے اثرات پر نگاہ ڈالیں۔ کہ وہ بھی ایوب خان کی طرح اس جمہوریت کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ کب تلک؟ ہمارے ملک میں جو آدمی جتنے زیادہ جھوٹ بولے اور جتنا زیادہ قوم کو گمراہ کرے وہی اتنا بڑا لیڈر بن جاتا ہے۔ اور جب وہ ''بلندی'' پر پہنچ جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اور رسول پاک ﷺ کے نام پر بنائے گئے ملک میں اس ''ناپاک بلندی'' میں کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ تو فطرت اس شخص کے نیچے سے ''پھٹا'' کھینچ لیتی ہے۔ تو وہ بھٹو کی طرح پھانسی یا مجیب کی طرح گولی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یا ضیاء الحق کی طرح ان کے ''پرخچے'' اڑ جاتے ہیں۔ تو اب فطرت نے ایک نرالی صورت تیار کی ہے کہ نواز شریف یا بے نظیر کی طرح ملک سے باہر پھینک دیئے جاتے ہیں۔ آئندہ کیا ہوتا ہے؟ پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے۔ کوئی اور عجیب و غریب صورت پیدا ہوگی۔

تو حالات کو تواتر دینے کیلئے ہم 1970ء میں واپس جاتے ہیں کہ میرا بڑا لڑکا ڈاکٹر خالد ریاض ان دنوں میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے آخری سال کے طالب علم تھا۔ لاہور میں میرے پرانے ہم مکتب ملک غلام علی سے ملاقات ہوگئی۔ جو مودودی کے معاون خصوصی تھے۔ مودودی صاحب شوکت اسلام کا دن منا کر بڑے خوش تھے۔ اور ایک شاہسوار کے طور پر اس کافرانہ سیاست میں کود چکے تھے۔ تو میرا لڑکا کچھ چھٹیاں لے کر راولپنڈی میں آ کر جماعت اسلامی کا کارکن اور ایک رہنما بن گیا۔ میں نے منع نہ کیا۔ صرف بتا دیا کہ جماعت اسلامی سمیت تمام مذہبی جماعتیں نہ رسول عربی ﷺ کے اسلام کو خود سمجھتی ہیں نہ اس پر عمل پیرا ہیں۔ تو وہ قوم کی خاک رہنمائی کریں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ان کو قوم کی رہنمائی کا ہرگز موقع نہ دے گا۔ اور قارئین! یہ عاجز پہلے مضامین میں جھلکی دے چکا ہے کہ اسلام کیا ہے۔ اور ہمارے علماء فرقہ واریت اور فقہی گروہ بندی کا شکار ہونے کی وجہ سے اسلام سے کوسوں دور ہیں۔ جس دن اسلام کو سمجھنے والا قافلہ سخت جان سامنے آیا۔ وہ اس خطہ کو حضور پاک ﷺ کے جمال سے معطر، مطہر اور منور کر دے گا۔ اور حضور پاک ﷺ کے جلال سے عبرت حاصل کر کے جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنا کر پوری قوم کو ''حزب اللہ'' بنا دیں گے۔ مودودی کی ''کم علمی'' کا اشارہ پہلے مضامین میں کر چکا ہوں۔ اور اس سلسلہ میں ایک کتاب بھی لکھ چکا ہے۔ جماعت اسلامی کے رہنماؤں کو کھلے خطوط لکھ چکا ہوں۔ کہ اُس قوم کو مودودی سے نجات دلائیں کہ وہ تفرقہ بازی کو پھیلاؤ دے گیا ہے۔ جمعیت العلماء اسلام کا مفتی محمود اعلان کر گیا تھا کہ وہ پاکستان کے بنانے کے ''گناہ'' میں شریک نہ تھا۔ جمعیت العلماء پاکستان والے جہاد کی بجائے زیادہ زور ''عرسوں'' پر دیتے ہیں اور تبلیغی جماعت والوں نے اپنی ''گشت'' یا Picnic کو ''چلہ'' کا نام دے دیا ہے۔ کہ وہ اجتماعی جہاد یا مدنی زندگی کی بجائے مکی زندگی اور جہاد بالنفس تک پہنچ پائے ہیں۔ ان سب جماعتوں کو میں

سینکڑوں خطوط لکھ چکا ہوں کہ وہ تفرقہ بازی ختم کر کے اوّل اور آخر مومن اور مسلمان بن جائیں۔ اس لئے فی الحال ہم بھی علامہ اقبال کی طرح اس قافلہ کا ''انتظار'' ہی کر رہے ہیں کہ ''کونسی وادی میں یا منزل میں ہے۔''

قارئین! ہم دسمبر 1970ء کے انتخابات کے نتائج سے تو آگاہ ہیں لیکن ہم جو ان کو ''صاف شفاف'' انتخابات کہتے ہیں۔ اور اس زمانے میں یحییٰ خان کو خراج تحسین پیش کیا گیا کہ تاریخ میں اس نے اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ یہ سب جہالتیں اور کم علمیاں ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ایسٹ پاکستان رائفلز والے یا دیگر سرکاری نمائندے مجیب الرحمٰن کے ساتھ تھے۔ اگر کوئی آدمی مجیب کی عوامی لیگ کے نمائندے کے خلاف ووٹ دیتا تو مجیب کے ''غنڈے'' اس کا تیا پانچہ کر دیتے۔ مشرقی پاکستان میں انتخابات نہ تھے بلکہ سرکاری لوگوں اور عوامی لیگ کی غنڈہ گردی تھی۔ لیکن انتخابات کے جو نتائج دکھائے گئے۔ ان کے بعد مجیب الرحمٰن مشرقی پاکستان کا بے تاج بادشاہ بن گیا تھا۔

پاکستان کے ساتھ محبت کرنے والے بنگالی جن کو مجیب الرحمٰن کے ساتھ نفرت تھی۔ وہ اس قدر سہم گئے کہ انہوں نے بھی پاکستان کا نام لینا چھوڑ دیا۔ یحییٰ خان نے تو ون یونٹ کے چار ٹکڑے اس لئے کئے تھے۔ کہ یہاں بھی بھان متی کا کنبہ ہو۔ اور یحییٰ خان کسی کنبہ کو مجیب الرحمٰن کے ساتھ شامل کر کے مجیب الرحمٰن کو وزیراعظم بنا دے گا۔ اور خود صدر یا مجیب الرحمٰن اگر الگ ہونا چاہتا ہے تو ہو جائے۔

یحییٰ خان کے علاوہ کئی لوگ مشرقی پاکستان کو ''لات'' مارنے کو تیار تھے۔ اور یحییٰ خان صرف مغربی پاکستان کی صدارت پر ''اکتفا'' کے لئے تیار تھا کہ ایران کے ساتھ ''کنفڈریشن'' آسانی سے ہو جائے گی۔ اور جو کام سکندر مرزا سے نہ ہو سکا۔ وہ یحییٰ خان کر دکھائے گا۔ لیکن فطرت نے صوبہ پنجاب والوں سے بھٹو کو ووٹ دلا کر مغربی پاکستان کی وحدت کو بچا لیا۔ اور بھٹو نے ہم ''ادھر'' اور تم ''ادھر'' کا نعرہ بھی لگا دیا۔ اور مشرقی پاکستان جا کر اسمبلی کے اجلاس میں بھی نہ شریک ہونا چاہتا تھا کہ وہ ''ڈبل ہوسٹیج'' نہیں بننا چاہتا تھا کہ جو کچھ ہماری فوج کے ساتھ دسمبر 1971ء میں ہوا کہ وہ ''ڈبل ہوسٹیج'' بن گئے۔ بھٹو کو یہ کچھ دسمبر 1970ء میں ''معلوم'' تھا۔ اب مجیب الرحمٰن کو مغربی پاکستان یا پورے پاکستان کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی کہ سوائے صوبہ سرحد اور بلوچستان کے چند ممبروں کے اس کو مغربی پاکستان سے کسی ''تعاون'' کی امید نہ تھی۔ لیکن وہ کھلے طور پر صرف بنگلہ دیش کے سربراہ بننے کا اعلان بھی نہ کرتا تھا۔ کہ وہ پورے پاکستان پر براجمان ہو کر مغربی پاکستان کو پاش پاش کر کے بھارت کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ یحییٰ خان کو برائے نام صدر بنانے کو بھی تیار نہ تھا کہ وہ آزادی سے کھلے ہاتھ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا جو کچھ اس کو بھارت والے کہتے۔

ہمارے ملک میں بڑی بحث چلتی ہے کہ یحییٰ خان نے حکومت مجیب الرحمٰن کے حوالے کیوں نہ کی؟ اگر میں تمام حوالوں سے تمام واقعات کے تانے بانے ملا کر سب کچھ لکھوں تو یہ مضامین ایک کتاب میں بھی اختتام پذیر نہیں ہوتے۔ یہاں یحییٰ خان کے الگ مقاصد تھے۔ مجیب الرحمٰن کے اور مقاصد اور بھٹو کے بالکل الگ مقاصد۔ اب بات بڑی سیدھی تھی کہ دونوں خطوں کو اکٹھا تو رکھا ہی نہ جا سکتا تھا۔ اور اگر میری بات مان کر توبہ و ندامت کر لی جاتی۔ اور ہم لوگ مغربی پاکستان میں اسلام کا نفاذ کر دیتے اور کسی عزت کے ساتھ اور طریقے کے ساتھ علیحدگی

اختیار کی جاتی۔ تو نوے ہزار فوجیوں کو ہتھیار ڈلوا کر اس عمل کو قبول کرنے کی ''ذلت'' سے بچا جا سکتا تھا۔ لیکن انتخابات کرا کے یحییٰ خان مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان دونوں خطوں میں لادین قیادت کو اوپر لا چکے تھے۔ مجیب مشرقی پاکستان کا ''بے تاج'' بادشاہ تھا اور بھٹو مغربی پاکستان کا ''بے تاج'' بادشاہ اور ایک سال بعد یہ کچھ عملی طور پر ہو گیا۔ اس لئے ایک نتیجہ تو کھل کر سامنے آ گیا کہ 1971ء میں جو کچھ کیا۔ وہ قربانیاں رائیگاں گئیں بنگالیوں کو قتل کرنے کی بدنامی خواہ مخواہ سر لی۔ حالانکہ بنگالیوں نے جہاں ان سے بن پڑا بہاریوں اور مغربی پاکستانیوں کو جس بے دردی سے قتل کیا۔ وہ رونگٹے کھڑے کرنے والی داستانیں ہیں۔ اور معافی صرف ''ہم'' مانگ رہے ہیں کہ ہم نے بنگالیوں کے ساتھ ''ظلم'' کیا۔ (توبہ میرے اللہ)

جو کچھ 1971ء میں ہوا۔ وہ سب غلط عمل تو نہ تھے، البتہ سب کچھ بڑے غلط طریقے سے کیا گیا۔ ابھی میں نوکری میں تھا کہ فروری 1971ء میں کرنل صدیقی' جنرل گل حسن کا پیغام لے آیا کہ مجیب ہماری کوئی بات نہیں مانتا۔ اب ہمیں بھٹو کو ساتھ ملا کر اس کی مدد کرنا پڑے گی۔ اس عاجز نے جنرل گل حسن کو باور کرایا کہ یہ غلط بات ہو گی۔ ہمیں دونوں کو ''برابری'' دینا ہو گی لیکن اگر مجیب' ہماری کوئی نہیں مانتا۔ تو بھی ہمیں بھٹو کو اس پر ترجیح نہ دینا چاہیئے۔ بہرحال ہم ''سازشوں'' کا کھلونا بنے ہوئے تھے کہ باہر کے کچھ ''ڈرامے'' تو سمجھے جا سکتے ہیں کہ بھارت نے جہاز کے ''ہائی جیک'' کا ڈرامہ کرا کے ہم سے اپنا ایک جہاز برباد کرایا۔ کہ دونوں خطوں کا بھارت کے اوپر سے ہوائی جہازوں کے جانے کا راستہ بھارت نے بند کر دیا اور اب سیلون والوں کی مہربانی سے سمندر والے راستے اڑ کر سیلون میں کچھ رک کر مشکل سے ڈھاکہ پہنچتے تھے۔ لیکن ہمارے باقی اعمال میں ہم جو اندھوں کی طرح کارروائی کر رہے تھے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے اندر بے شمار ''سازشی'' آدمی موجود تھے جو ہم سے ایسا کچھ کرا رہے تھے۔

پورے مشرقی پاکستان کے دفاع اور اندرونی سیکورٹی کیلئے صرف ایک لنگڑے لولے ڈویژن کے برابر فوج تھی جس میں دو یا تین بنگال پلٹنیں یا بنگال سنٹر' مرکزی حکومت کی بجائے زیادہ وفادار مجیب الرحمٰن اور عوامی لیگ کے تھے۔ اس سلسلہ میں بہت زیادہ قصور وار مشرقی پاکستان کے گورنر ایڈمرل احسن اور فوج کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب خان ہیں۔ انہوں نے جو فروری مارچ 1971ء میں ہاتھ کھڑے کر دیئے کہ وہ حالات کو کنٹرول نہیں کر سکتے۔ کیا ان کو یہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ہو گا کہ یہ عاجز راولپنڈی بیٹھے ہوئے اخباریں پڑھ کر اندازہ لگا چکا تھا کہ ''پشتو کی کہاوت'' پوری ہو رہی ہے۔ ''کہ راتلوئے واقعاتو داسورے مخ کے رازے'' کہ آنے والے واقعات کا سایہ پہلے سے نظر آ جاتا ہے ''اصل میں فوج کی اس کمزوری کے اثرات نے مجیب الرحمٰن اور عوامی لیگ والوں کو شہ دی کہ وہ دھونس' دھاندلی سے اتنے انتخابات جیت گئے۔ جو دو ڈویژن فوج مارچ 1971ء اور اپریل 1971ء میں مشرقی پاکستان میں بھیجی وہ فوج اگر وہاں اکتوبر' نومبر 1970ء میں بھیج دیتے اور بنگال یونٹوں میں آدھی نفری' دوسری پلٹنوں سے بھیج دیتے اور ان آدھے بنگالیوں کو پنجاب' بلوچ اور فرنٹیئر فورس میں بھیج دیتے تو نہ یہ یونٹیں سازش کا گڑھ بنتیں اور نہ بغاوت کرتیں۔ اور نہ مجیب کو انتخابات میں اتنی کامیابی ہوتی کہ پنجابی اور پٹھان سپاہی کا بڑا رعب تھا کہ اتنی کم نفری کے ساتھ وہ لوگ جہاں تھے وہاں کسی بنگالی کو کچھ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اگر گورنر احسن اور صاحبزادہ یعقوب کی سفارش نہ مانی جاتی تو انہیں نومبر' اکتوبر 1970ء میں مستعفی

ہو جانا چاہیئے تھے۔ جس کے اثرات اچھے ہوتے۔ کہ ہماری کچھ آنکھیں کھل جاتیں۔ ISI پر بھی الزام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے سربراہ جنرل محمد اکبر راقم کا ذاتی دوست تھا۔ وہ میرا ہم خیال تھا اور اس نے ہر طریقے سے حکومت کو سمجھایا کہ حالات کو کیسے سنبھالا دیا جا سکتا ہے۔ میرے خلاف بھی جو سخت کارروائی نہ ہوتی تو جنرل اکبر نے میرے بارے میں بڑی اچھی رپورٹ دی اور مجھے جو جلدی فوج والوں نے واپس بلا لیا تھا یہ بھی جنرل محمد اکبر نے فوج والوں کو سمجھایا تھا۔ کہ ان کو میری ''ضرورت'' ہے۔

اب انتخابات کے جو نتائج نکلے۔ اس کے بارے میں کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ یحیٰی خان' خود مجیب الرحمٰن کی جیت چاہتا تھا۔ اور یحیٰی خان جو مشرقی پاکستان جا کر عوامی لیگ والوں سے سمجھوتہ کرنے کا ''ڈرامہ'' کر رہا تھا۔ یا بھٹو نے کہا کہ مغربی پاکستان سے جو ڈھاکہ کے اجلاس میں جائے گا۔ اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ یہ عاجز ان مشہور واقعات پر کوئی تبصرہ نہ کرے گا۔ صرف یہ گزارش کروں گا کہ جب جنرل ٹکا خان ڈھاکہ پہنچا تو کسی بنگالی جج کو ہمت نہ ہو رہی تھی کہ ٹکا خان کو قسم دلاتا۔ فوج چھاؤنیوں میں بندھ کر رہ گئی تھی۔ ان کو خوراک بھی مشکل سے مہیا ہو رہی تھی۔ مشرقی پاکستان میں وہ کچھ ہوتا تھا جس کا مجیب الرحمٰن حکم دیتا اور فوج نے جو 25 مارچ کو علاقے پر کنٹرول حاصل کرنے کی کارروائی کی وہ ''مجبوری'' ضرور تھی لیکن وقت کا تعین اور طریقہ غلط تھا۔ پہلے زیادہ فوج منگواتے اور پھر کارروائی طریقے سے کرتے۔ یہ معجزہ تھا کہ ہم اس وقت بچ گئے۔ ورنہ سب فوجیوں کے عوامی لیگ کی قید میں چلے جانے میں تھوڑا سا فرق رہ گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ضرورت یہ تھی کہ پہلے مزید فوج وہاں پہنچائی جاتی۔ پھر مجیب الرحمٰن اور اس کے سب حواریوں کو طریقے کے ساتھ Protective Custody میں لیا جاتا۔ یہ غلط طریقہ تھا کہ اکیلے مجیب الرحمٰن کو گھر سے قید کیا اور باقیوں کو ''فرار'' ہونے دیا۔ اور چٹاگانگ بنگال سنٹر یا دو بنگال پلٹنوں سے طریقے کے ساتھ پہلے ہتھیار لے لئے جاتے تو بعد میں آہستہ آہستہ کارروائی کر کے پورے خطے پر کنٹرول حاصل کیا جاتا۔ اور تمام Border (سرحد) کو مغربی پاکستان سے سکاؤٹس اور رینجر کے ساتھ Seal (بند) کیا جاتا جیسے بعد میں کرنا پڑا۔ لیکن ہم نے جو کچھ کیا تو وقت ایسا آیا کہ ساری بنگال پلٹنوں نے بغاوت کر دی۔ اپنے مغربی پاکستان کے افسروں کو شہید کر دیا۔ صرف ایک پلٹن نے اپنے کرنل ملک خضر حیات سمیت تین افسروں کو قید کر کے بھارت کے حوالے کر دیا۔ ایک وقت چٹاگانگ کا کچھ حصہ' جیسور پور شہر' ضلع کشتیہ اور ضلع پبنہ باغیوں کے کنٹرول میں آ گئے تھے۔ راجشاہی کو باغیوں نے گھیر لیا تھا۔ ٹھاکر گاؤں دیناج پور' برہمن باڑیہ کئی مقامات پر باغیوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اور بہاریوں یا مغربی پاکستان والوں کا جو قتل عام ہوا' کہ بعد میں بنگلہ دیش کے صدر اور اس وقت کے میجر ضیاء الرحمٰن نے اپنے ساتھی نوجوان مغربی پاکستان کے افسروں کو بریک فاسٹ کرتے ٹیبل پر شہید کیا۔ (توبہ میرے اللہ) اور ہم کو کہا جاتا ہے کہ ہم معافی مانگیں۔ بہر حال اوپر والوں کے غلط طریقوں سے جو اس بغاوت کے ''مواقع'' فراہم کئے گئے' یہی سب سے بڑا المیہ ہے۔ افسوس قوم کو باخبر نہیں کیا گیا۔ اور ہماری عظیم قربانیوں پر آج تک پردہ ڈالا ہوا ہے۔ لیکن اس عاجز نے دبی زبان میں ہلال میں اس سلسلہ میں بہت کچھ بعد میں لکھ ڈالا تھا۔ اور میں اپنے ان مجاہدین اور شہداء کو سلام کرتا ہوں کہ کم تعداد کے باوجود انہوں نے ایک دفعہ پورے مشرقی پاکستان پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ اس کے بعد حکومت کی ذمہ داری تھی کہ حالات کا

جائزہ لے کر صلح وصفائی سے بنگالیوں کو الگ ہونے کی اجازت دے دیتے۔ یا توبہ وندامت کرتے۔ لیکن یہ جو ہمیں ذلت آمیز شکست دلائی گئی یہ بھی سازش کی ایک ''کڑی'' تھی۔ اور ہم اندھوں کی طرح سازشیوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔

مشرقی پاکستان سے غیر ملکی صحافیوں کو نکال دیا گیا تھا۔ یہ تو بڑی اچھی کارروائی تھی۔ اور کراچی میں بیٹھ کر اس عاجز نے سختی کے ساتھ غیر ملکی اخبار نویسوں کو مشرقی پاکستان سے آنے جانے والوں کو ''سونگھنے'' سے روکا ہوا تھا۔ اور ہم کہتے تھے کہ مشرقی پاکستان میں حالات کنٹرول میں ہیں اور جنرل ٹکا خان کا بڑا مشیر میجر جنرل راؤ فرمان علی جب ڈھاکہ سے اسلام آباد جا رہا تھا تو کراچی ٹھہر گیا۔ اور ہمیں بڑی تسلیاں دیں کہ حالات کافی حد تک کنٹرول ہو گئے ہیں۔ اور جلدی مکمل کنٹرول ہو جائیں گے۔ مجھے صحیح صورت حال کی خبر تھی۔ اور میں نے ان کو کھری کھری سنائیں۔ کہ ہم کس کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ وہ یحیٰی خان کو صحیح صورت حال سے آگاہ کریں کہ اب مشرقی پاکستان ہماری ''ایک کالونی'' تھی۔ پولیس کے دستے بھی مغربی پاکستان سے گئے ہوئے تھے۔ اور ہم حکمران کے طور پر وہاں بندوق کے ذریعہ سے حکومت کر رہے تھے۔ میجر جنرل راؤ فرمان نے کہا کہ یہ تمہاری غلطی ہے۔ تم مشرقی پاکستان جا کر خود حالات دیکھو تو تب تمہیں سمجھ آئے گی۔ کراچی میں یہ عاجز اخباروں کو اپنے ساتھ ملا چکا تھا۔ کہ میں نے مخلص اخبار نویسوں سے کسی بات کا پردہ نہ رکھا ہوا تھا۔ اور ان کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا کہ کیا کچھ شائع کیا جائے۔ اور کیا کچھ شائع نہ کریں۔ اور غیر ملکی صحافیوں کیلئے تو میرا ''نام'' ہی کافی تھا۔ وہ لکھتے وہ کچھ تھے جو ان کی ''مرضی'' یا ''ضرورت'' ہو۔ لیکن میں نے ان کو سر پر نہ چڑھنے دیا۔ اس لئے میں راولپنڈی واپس آ گیا اور کرنل صدیقی کو صاف بتایا کہ یہ وقت کی ضرورت ہے۔ کہ میں مشرقی پاکستان جاؤں۔ حالات کا مطالعہ کروں۔ جو کچھ شائع کیا جا سکتا ہے۔ وہ شائع کریں۔ اور واپسی پر ہم بھی فوج والوں کو اپنی طرف سے رپورٹ دیں کہ اونٹ کس کروٹ جا رہا ہے۔ وہ یہ سن کر خوش ہو گیا۔ کہ میجر صدیق سالک تو جنرل امیر عبداللہ نیازی کے ساتھ ''نتھی'' ہو گیا تھا۔ محکمہ تعلقات عامہ سے ''فیلڈ'' کی رپورٹنگ نہ ہو رہی تھی۔ اس بڑھاپے میں یہ عاجز اگر ایسا کچھ کر لے تو محکمہ تعلقات عامہ کا فرض پورا ہو گا۔ اور بڑا نام بھی ہو گا۔ اور یہ عاجز جون، جولائی 1971ء میں بیس سالوں کے وقفہ کے بعد مشرقی پاکستان پہنچ گیا کہ قارئین کو یاد ہو گا کہ 1952ء کے شروع میں یہ عاجز ڈھاکہ شہر کا فوجی کمانڈر تھا۔ اور ایک کمپنی سے حالات ایسے ٹھیک کئے کہ فوج کے چلے جانے کے بعد بھی بنگالی جب کسی فوجی کو شہر میں دیکھتے تھے تو پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ڈھاکہ شہر کو کنٹرول کرنے کیلئے ایک بریگیڈ کی نفری 24 گھنٹے ڈیوٹی پر تعین تھی۔

جنرل ٹکا خان اب صرف گورنر تھے۔ فوجی کنٹرول میرے پرانے رفیق اور استاد لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ نیازی سنبھال چکے تھے۔ میں ڈھاکہ پہنچنے کے دوسرے دن بعد ان کو ملنے چلا گیا۔ وہ اس وقت تیار ہو کر بلونیا، (چٹاگانگ اور فینی کے نزدیک) جا رہے تھے۔ بلونیا کے علاقے کو ''صاف'' کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ چلوں اور کارروائی دیکھوں اور آئندہ بھی ان کے ساتھ جایا کروں اور تمام کارروائیوں کی ایسی رپورٹیں لکھا کروں۔ جیسے دوسری جنگ عظیم میں تم لکھا کرتے تھے۔ عرض کی ''جناب! اس کام کے لئے آپ کو صدیق سالک

صاحب دیئے ہوئے ہیں۔ میں تو اپنا ''مطالعہ'' کرنے آیا ہوں کہ ہم شرپسندوں کو مشرقی پاکستان سے نکال بھی سکتے ہیں یا خود ''بنگلہ دیش'' کے سیلاب میں بہہ جائیں گے۔ کوشش کر کے علاقہ کے چپہ چپہ کو دیکھوں گا۔ اور ہر مشہور بارڈر آؤٹ پوسٹ پر بھی جاؤں گا۔ اور مغربی پاکستان واپس جانے سے پہلے آپ کو بھی صورت حال سے آگاہ کر جاؤں گا۔ تو جنرل نیازی کہنے لگا۔ ''اچھا مہمانیاں کھانے آئے ہو'' تو عرض کی ''کہ یہ سوچ بھی ٹھیک ہے۔''

پہلے گزارش ہو چکی ہے کہ اگر ایڈمرل احسن اور صاحبزادہ یعقوب کی غلط سوچوں، غلط طریقوں اور بروقت حالات کو سنبھالا نہ دینے کی وجہ سے حالات اتنے خراب ہو چکے تھے تو جنرل ٹکا خان پر بھی سخت الزام عائد ہوتا ہے کہ اس نے 25 مارچ کو کارروائی جلد بازی میں کی اور بنگالیوں کو باغی ہونے میں ''آسانی'' ہوئی۔ بغاوت کو روکنے کے لئے ضروری اقدامات نہ کئے گئے۔ اب تقریباً دس، بیس ہزار بنگالی فوجی یا رائفلز والے، بھارت جا چکے تھے اور ہزاروں مکتی باہنی والے بھی بھارت پہنچ چکے تھے جو جس وقت چاہتے مشرقی پاکستان میں داخل ہو سکتے تھے۔ اور کچھ بھی کر سکتے تھے لیکن میری حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی۔ کچھ بنگالی وفاداری کے ساتھ اول مسلمان تھے اور پھر بنگالی اور وہ پاکستانی فوج میں بھی وفاداری سے کام کر رہے تھے اور کچھ فوج کے باہر ہوتے، فوج کی مدد کر رہے تھے۔ یعنی یہ افسوسناک پہلو ہے کہ ہم نے مسلم قومیت اور اسلام کی طاقت کو نہ سمجھا اور نہ اس پر عمل کیا کہ قرآن پاک کی سورۃ الانفال میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ یہ ''الفت رب کی ذات پاک کی ایک ایسی عطا ہے جو انمول ہے'' یعنی اس کی قیمت کو دنیاوی زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل ''بغاوت'' ہر بنگالی کے ذہن میں کچھ نہ کچھ ہوتی ہے۔ اگر اس ''بغاوت کو کفر اور طاغوت سے بغاوت کی طرف موڑ دیا جائے تو بنگالی ایک مثالی مسلمان اور مومن بن جاتا ہے لیکن ایک کرنل عثمانی جس کا تعلق سلہٹ سے تھا اس نے بڑی بے وفائی کی۔ وہ دل کا بہت کمزور تھا، انگریزوں نے اس کو اس لئے پلٹن سے تبدیل کر کے سروس کور میں بھیج دیا تھا۔ مہربانی کر کے پاکستان میں اس کو پلٹن میں دوبارہ بھیجا تو اس نے 1950 میں کشمیر کے علاقے میں بڑی کم دلی کا مظاہرہ کیا تو اس کی ترقی بند کر دی گئی لیکن ایوب خان نے خاص مہربانی کر کے اس کو کرنل بنا کر پہلی بنگال پلٹن کی کمانڈ دے دی کہ بنگالیوں کی حوصلہ افزائی کر کے ان کو بہتر سپاہی بنا دے۔ اس نے طریقہ یہ نکالا کہ ہم بنگالی، مغربی پاکستان والوں سے بہتر سپاہی ہیں۔ یہ انگریزوں کی بنگال آرمی تھی، جس نے وسط انیسویں صدی میں سکھوں کی پنجابی آرمی کو شکست دی تھی اور بنگالیوں کے احساس کمتری کو حسد اور نفرت کا ''لیپا'' دے کر ان میں بغاوت کا مادہ پیدا کیا اور 1967 میں فوج سے سبکدوش ہونے کے بعد مجیب الرحمٰن کے ساتھ مل کر بھارت کے ساتھ ''رابطہ'' باندھا اور 25 مارچ 1971 کو یہ آدمی آسام پہنچ گیا اور ہر باغی بنگالی کے لئے ہدایات تھیں کہ بغاوت کے بعد وہ بھارت میں کہاں پہنچیں تو سب باغی بنگالی، اسی کرنل عثمانی، میجر ضیاالرحمٰن اور میجر صفی اللہ اور میجر خالد وغیرہ کی نگرانی میں بھارت پہنچ کر منظم ہوتے رہے جنہوں نے جون/ جولائی 1971 سے، مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر حملے شروع کر دیے کہ مجیب الرحمٰن کے ایک حواری نذرالاسلام کے تحت بنگلہ دیش کی حکومت کشتیہ کے نزدیک چوہاڈنگہ کے مقام پر ''وجود'' میں آ کر اب مغربی بنگال میں باقاعدہ ''کام'' کر رہی تھی۔

یہ وہی محل تھا جس میں آزادی سے پہلے کوئی مسلمان جوتے پہن کے نہ جا سکتا تھا

سب سے پہلے راقم نے راج شاہی ڈویژن سے دورہ کو شروع کیا اور نٹور کے نزدیک ایک چھوٹے سے ہوائی اڈہ پر اتر کر نٹور کے ایک پرانے ہندو راجہ کے محل میں پہنچا جہاں میرے پرانے مہربان میجر جنرل نذر حسین شاہ کے سولہویں ڈویژن کا مرکز تھا۔ یہ وہی محل تھا جہاں آزادی سے پہلے کوئی مسلمان جوتے پہن کر اس کے اندر نہ جا سکتا تھا۔ مشرقی پاکستان کے سابق گورنر عبدالمنعم خان بتایا کرتے تھے کہ وہ وکالت کرتے تھے اور ان کو اس محل میں کسی کام سے جانا پڑا تو پاؤں سے جوتے اتار کر اندر داخل ہو سکا۔ یہاں اس عاجز نے جنرل صاحب ان کے سٹاف کرنل محمد اکبر اور متعدد سٹاف آفیسروں کے ساتھ لمبی ملاقاتیں کیں اور سب حالات زیر بحث آئے۔ ان علاقوں میں حالات اتنے خراب نہ تھے۔ عوامی لیگ والوں اور شرپسندوں کی تعداد مقابلتاً کم تھی کہ لوگ پاکستان کے زمانے کو سنہری زمانہ کہتے تھے کہ پہلے ہندو جاگیرداروں کی غلامی کرتے رہے تھے۔ فوج کو البتہ بہت پھیلنا پڑا کہ شرپسند جگہ جگہ شرارتیں کرتے تھے۔ اس لئے ایک بریگیڈ، اسی جگہ کے نزدیک بریگیڈیئر اسلم نیازی کی کمانڈ میں تعین تھا۔ دوسرا بریگیڈ شمال میں ضلع بوگرا میں اور تیسرا بریگیڈ مزید شمال میں رنگ پور، میر پور کے علاقوں میں ٹھاکر گاؤں اور دیناج پور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس عاجز نے صورت حال کا ضمنی مطالعہ اپنے عزیز رفیق بریگیڈیئر اسلم نیازی کے بریگیڈ کے علاقوں سے شروع کیا جس کی ایک پلٹن راجشاہی میں تھی۔ دوسری پبنہ میں اور تیسری راجشاہی اور جیسور ڈویژنوں کے درمیان بھارت کے ساتھ ملتی سرحد اور اندرونی علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔

بریگیڈیئر اسلم نیازی نے میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا اور سب سے پہلے ہم راجشاہی گئے جہاں عزیزم کرنل رضوی کی پنجاب پلٹن حالات کو کنٹرول کر رہی تھی۔ تعلیمی ادارے، اس وقت تک بند تھے۔ بریگیڈیئر اسلم نے علاقے کے شرفاء اور دانشوروں کو بلایا ہوا تھا اور تعلیمی اداروں کو کھولنے کا فیصلہ کرنا تھا لیکن ہم سیدھے یہاں کے مشہور صوفی مخدوم صاحب کے مزار پر حاضر ہوئے جہاں یہ عاجز ''کشف القبور'' کی کئی ایسی وارداتوں سے دوچار ہوا جن کا پہلے بہت کم تجربہ تھا اور حج اس وقت کیا ہوا نہ تھا اور مدینہ منورہ کے ایسے جمال بعد میں وارد ہوئے۔ بہرحال جب مزار پر پہنچے تو بڑی ''خوش آمدید'' ہوئی اور ماحول خوشبو سے معطر ہو گیا لیکن پھر مایوسی کے اثرات شروع ہو گئے کہ مزار پر سورہ الرعد کی جن آیات پر نظر پڑی۔ وہ کسی آنے والی ''ذلت'' کا اشارہ کر رہی تھی کہ اتنے میں ایک صاحب میرے ساتھ لپٹ گئے اور زار و زار رونے لگے۔ میں ان صاحب کو نہیں جانتا تھا کہ وہ راجشاہی کے ریڈیو کے سٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ لیکن وہ صاحب مجھے ''حضور پاک ﷺ کے سپاہی'' کے طور میری تحریروں کی وجہ سے غائبانہ طور پر جانتے تھے۔ بڑے مخلص انسان تھے۔ راجشاہی، مارچ، اپریل 1971 باغیوں کے محاصرہ میں رہا تھا اور انہوں نے ریڈیو سٹیشن پر بھی قبضہ کر لیا تھا لیکن یہ صاحب چند اہم پرزے مشینوں سے نکال کر فوج کے اس ''حصار'' میں پناہ گزین ہو گئے تھے اُس پلٹن کا کرنل شفقت بلوچ وغیرہ تو مغربی پاکستان چلے گئے تھے۔ کرنل محمد حسین ملک نے اُس پلٹن کو دوبارہ منظم کیا اور ان کا ذکر آگے آ رہا ہے کہ بعد میں اُس پلٹن کے ساتھ وہ لال منیر ہٹ پہنچ گئے۔ راج شاہی کا نظام اور کنٹرول اب کرنل فہیم رضوی کی پنجاب پلٹن نے سنبھال لیا تھا لیکن اس حصار میں محاصرہ کے اندر رہنے والوں میں سے انٹیلی جنس کا کرنل عبداللہ، ابھی راجشاہی میں موجود تھا اور اس عاجز

نے کرنل عبداللہ، ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر اور متعدد ''محاصرین'' سے باغیوں کے ظلموں اور شرپسندوں کی تمام کہانیاں بھی سنیں۔ اور میں پاکستان کی ان فوجی یونٹوں کو بھی سلام کرتا ہوں جنہوں نے دن رات ایک کر کے حالات پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ راجشاہی میں کافی اچھے لوگ بھی تھے۔ سب کا تاثر یہ تھا کہ اسلام کا نفاذ ہی دونوں خطوں کو متحد رکھ سکتا ہے۔ ہم مانیں یا مانیں، فوج، ایک حکمران طاقت کی طرف سے مشرقی پاکستان کو ایک نوآبادی کی طرح کنٹرول کر رہی تھی۔ وہ بیرونی دشمن یا باغی بنگالیوں کا مقابلہ کیسے کرتی جو بے حساب مقامات سے مشرقی پاکستان میں داخل ہو رہے تھے۔ راجشاہی کا دفاع تو کچھ آسان تھا کہ دریا، دونوں ممالک میں حد کے طور پر حائل تھا۔ ایک روز وہاں قیام کر کے ہم راجشاہی اور جیسور کے درمیان وسیع علاقوں میں پھیلی بریگیڈ کی دوسری پلٹن کے حالات دیکھنے چلے گئے۔ یہ فرنٹیئر فورس کی ایک پلٹن تھی اور جس طرح چوکنے ہو کر یہ لوگ پوری سرحد پر پھیل کر ملک کی سرحدوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ ان کی جانفشانی دیکھ کر میرے آنسو آ گئے کہ مغربی پاکستان سے رینجر، سکاؤٹس اور پولیس والے بھی آہستہ آہستہ ان کی مدد کے لئے یہاں بھی اور باقی جگہوں پر بھی پہنچ رہے تھے۔ اور قوم کو ''اندھیرے'' میں رکھا ہوا تھا کہ مشرقی پاکستان میں حالات نے ''نارمل'' صورت اختیار کر لی ہے۔

بریگیڈئر اسلم نیازی کے ساتھ ایک اور رات نٹور گزار کر میں نے فیصلہ کیا کہ پنبہ میں بریگیڈئر کی تیسری پلٹن کو دیکھ کر میں سیدھا بوگرا رنگ پور کی طرف چلا جاؤں گا اور بریگیڈئر صاحب اور ان کے افسران سے عارضی الوداع کیا اور لمبے سفر پر روانہ ہو کر پنبہ میں کرنل سلیم ملک کی بارھویں پنجاب پلٹن میں جا کر پہلا پڑاؤ کیا۔ اس پلٹن کے ساتھ میرے خاندانی تعلقات اور کئی دفعہ اکٹھا نوکری کرنے کی وجہ سے سب افسران اور جوان مجھے جانتے تھے اور وہ مجھے دیکھ کر مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مجھے اندرونی حالات اس سچائی سے سنائے جاتے تھے کہ مجھ پر رقت طاری ہو جاتی تھی کہ یہ پلٹن مارچ کے آخری ہفتہ میں مشرقی پاکستان پہنچی اور پہلے جا کر جیسور کو باغیوں سے پاک کیا کہ جیسور چھاؤنی پر تو فوج کا قبضہ برقرار رہا لیکن باغیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ شہر ان کے قبضے میں چلا گیا تھا اور انہوں نے وہاں بڑے ظلم ڈھائے۔ راجشاہی والی پنجاب پلٹن کی ایک رائفلز کمپنی پنبہ میں متعین تھے۔ ایسٹ پاکستان رائفلز والے کچھ بنگالی یونٹوں کے بھگوڑے کچھ پولیس والے، پنبہ پہنچ گئے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ کمپنی کمانڈر میجر اسلم نے صحیح اندازہ لگایا کہ شہر کے اندر رہ کر لڑائی لڑنا مشکل ہے۔ اس نے شہر سے نکل کر باہر ایک کھلی جگہ پر پوزیشن لے لی۔ باغیوں نے شہر میں بہاریوں اور جن لوگوں نے فوج سے ہمدردی کی تھی ان میں سے سینکڑوں کو شہید کیا اور میجر اسلم کی کمپنی پر حملے شروع کر دیے۔ جتنے آدمیوں کو پاس ''موجودہ'' ٹرانسپورٹ میں سوار کیا جا سکتا تھا اور خاص کر کمزور لوگوں کو گاڑیوں میں سوار کرنے کا حکم دیا کہ وہ راجشاہی پہنچیں جو لڑتے بھڑتے راجشاہی پہنچ گئے کہ میجر اسلم خود تقریباً پچاس مضبوط جوانوں کے ساتھ باغیوں کو الجھائے ہوئے اور روکے ہوئے تھا۔ دو دن باغیوں کو روکنے کے بعد میجر اسلم نے اپنے جوانوں کو تین گروہوں میں بانٹ دیا کہ وہ بھی لڑ بھڑ کر پیدل نکلنے کی کوشش کریں۔ یہ کوشش البتہ کامیاب نہ ہو سکی۔ میجر اسلم اور متعدد مجاہدین شہید ہو گئے۔ دس پندرہ کے قریب زخمیوں کو باغیوں نے گرفتار کر کے بھارت بھیج دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہم نے بنگالیوں پر ظلم کیا۔ یہ کوئی نہیں بتاتا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا کچھ کیا۔ کرنل سلیم ملک اور پلٹن کے سب افسروں سے دل کی باتیں ہوئیں وہ بڑے

سخت حالات میں ڈیوٹی دے رہے تھے۔ بھارت سے باغی آ کر کئی طرح سے شر پسندی کی راہ نکال جاتے تھے اور سب کا خیال تھا کہ حالات کو مکمل کنٹرول کرنا مشکل ہے۔ معاملات کو سیاسی طور پر حل کیا جائے کہ بنگالی اپنے علاقے میں خود حکومت کریں۔

اس کے بعد یہ عاجز وسطی بنگال سے ایک لمبا سفر کر کے بوگرہ پہنچا۔ کئی میلوں میں کوئی فوجی نظر نہ آیا۔ کچھ پنجاب سے آئی ہوئی پولیس اور وفادار بہاریوں کے پولیس والوں کے کچھ آؤٹ پوسٹ تھے لیکن باغی لوگ ان علاقوں میں آ کر بہت کچھ کر سکتے تھے کہ اندرونی علاقے کی حفاظت کے لئے مزید ایک ڈویژن فوج کی ضرورت تھی۔ بہرحال بوگرہ ایک مشہور شہر ہے جو غیاث الدین بلبن کے بیٹے بغرا خان نے آباد کیا اور نام بنگالی لہجہ میں بگڑتے بگڑتے ''بوگرہ'' بن گیا۔ پاکستان کے تیسرے وزیر اعظم محمد علی کا تعلق اس شہر سے تھا' جس کے بارے میں پہلے مضامین میں گزارش کی جا چکی ہے۔

بوگرہ میں میرا پرانا رفیق بریگیڈیئر حسن بڑی بے صبری سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے ملتے ہی کہنے لگا۔ امیر افضل! شکر ہے تم آئے ہو کہ میں دل کی بھڑاس نکال لوں گا اور پھوٹ پڑا کہ باقی حالات تم بہتر جانتے ہو گے اور ان پر بعد میں تفصیلی بحث کریں گے' پہلے میں اپنی بات کروں گا کہ میرے پاس تین پلٹنیں ہیں۔ ایک بلوچ پلٹن یہاں سے بیس میل دور ''گائے بندھا'' کے مقام پر ہے لیکن کئی دفعہ ندی نالوں میں طغیانی آ جائے تو وہاں پہنچنے تک دو دن لگ جاتے ہیں کہ وہ لوگ سرحد کے ساتھ بری طرح ''لٹکے'' ہوئے ہیں یا ان کو سرحد کے ساتھ ''چمٹا'' رہنا پڑتا ہے کہ باغی کئی راستوں سے داخل ہو کر سارے مشرقی پاکستان میں کسی جگہ جا کر شر پسندی کی واردات کر سکتے ہیں۔ پھر وہاں تک سفر کیلئے راستے پر ساتھ حفاظتی دستے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم وہاں نہ جانا۔ حالات مجھ سے پوچھ لو اور ان کی ''وار ڈائری'' میں منگوا رکھوں گا' تم نٹور واپس جاتے یہاں سے لے لینا۔ دوسری پلٹن فرنٹیئر فورس کی ہے۔ تم جب رنگپور جاؤ گے تو میں رہنما ساتھ بھیجوں گا۔ بڑی سڑک سے ہٹ کر ''ھلی'' ریلوے سٹیشن کے علاقے میں یہ لوگ تعینات ہیں۔ ریلوے کی پٹڑی سے سو گز دور بھارت کی سرحد ہے۔ یہ لوگ سخت ''کھچاؤ'' کی حالت میں کام کر رہے ہیں۔ تم حالات خود اپنی آنکھ سے دیکھ لینا۔ تیسری بھی ایک اور بلوچ پلٹن ہے۔ یہی لوگ میرے ریزرو بھی ہیں اور بوگرہ کے شہر اور ارد گرد کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ ان سے خود مل کر حالات سے آگاہی حاصل کر لینا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر بھارت حملہ کر دے تو میں کیا کروں گا۔ جو جہاں ہے وہ وہاں ''بندھ'' جائے گا اور دشمن ہمارے اندر یا بیچ سے نکل کر ڈھاکہ یا جہاں بھی چاہے گا پہنچ جائے گا۔ پہلے میں چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں میں تھا۔ وہاں باغیوں نے بڑے ظلم ڈھائے اور پاکستان کے وفادار لوگوں کو شہید کیا۔ بڑی مشکل سے حالات کو وہاں کنٹرول کیا اور اب یہاں سخت ''تناؤ'' میں کام کر رہا ہوں۔ میں نے اوپر لکھ دیا ہے کہ اس حالت میں صورتحال نہیں سنور سکتی۔ معاملات کو سیاسی طور پر حل کریں۔ ورنہ میری جگہ کسی اور صاحب کو بھیجیں۔ آج رات آپ میرے ہی پاس گزاریں۔ باتیں کر کے میں اپنا کچھ بوجھ ہلکا کر لوں گا۔ خیر میرا پروگرام بہت Tight تھا۔ میں نے شام کی چائے کا اور کھانا کھانے کا پروگرام بلوچ پلٹن کے ساتھ بنایا اور دو ماہ بعد بریگیڈیئر حسن کی جگہ رضا کارانہ طور پر اس محاذ پر بریگیڈیئر تجمل حسین ملک پہنچ گیا۔ جس نے دسمبر 71ء کی جنگ میں

بھارت کا سخت مقابلہ کیا اور وہ ''سلطان ٹیپو'' بننے پر بھی تیار تھا۔ لیکن کیا ہماری اعلیٰ قیادت ان لوگوں کے ''سلطان ٹیپو'' بننے کا کوئی فائدہ اٹھا سکتی تھی؟ افسوس! بات ہی کچھ اور تھی۔ ڈرامہ تھا۔ مشرقی پاکستان کو لات ماری جا رہی تھی۔ فوج کو قربانی کا بکرا بھی بنانا تھا اور ہمیں ذلت سے دوچار کرنا تھا۔ قارئین! آپ میرے ساتھ ساتھ رہیں۔ میں سب باتیں ثبوتوں کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرتا رہوں گا۔ بریگیڈئر حسن بھی مغربی پاکستان نہ پہنچ سکا۔ اکتوبر 71ء میں جب وہ ڈھاکہ پہنچا تو جنرل نیازی نے اس کو کہا کہ ''اس مشکل وقت میں ہمیں چھوڑ رہے ہو؟'' بریگیڈئر حسن کی غیرت عود کر آئی اور اس نے بھی ''ڈوبتی کشتی'' کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

میں نے بلوچ پلٹن کے ساتھ چار پانچ گھنٹے گزارے۔ انہوں نے بتایا کہ بوگرہ میں کوئی فوجی نہ تھا اور یہاں دو تین ہفتے باغیوں کی حکومت رہی۔ پاکستان کے ہمدرد لوگوں اور خاص کر بہاریوں کو انہوں نے خوب تہ تیغ کیا۔ چند فوجی افسروں نے ان بہاری خاندانوں کے بچے ہوئے لڑکوں کو اپنے بیٹے بنا کر اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا اور ان کی اپنے بچوں کی طرح پرورش کر رہے تھے۔ ایسے تین چار بہاری بچوں کو میرے ساتھ بھی ملایا گیا اور پلٹن والوں نے مجھے بتایا کہ باقی دو پلٹنوں کو رسد بھیجنے کیلئے وہ لوگ حفاظتی دستے بھی مہیا کرتے ہیں اور سارے ضلع میں امن بحال کرنے کیلئے وہ پولیس والوں کی مدد بھی کر رہے ہیں۔ دوسرے دن، بلوچ پلٹن سے حفاظتی دستہ لے کر میں رنگپور جاتے ''ھلی'' کی طرف مڑ گیا۔ جہاں فرنٹیئر فورس کی ایک مشہور پلٹن تعینات تھی جن کے ساتھ میری دوستی دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں 1941ء میں ملایا سے شروع ہوئی تھی۔ یہاں پر دسمبر 1971ء میں بھارت کے ساتھ گھمسان کی جنگ لڑی گئی تھی اور یہاں ہی میجر اکرم شہید کو نشان حیدر سے نوازا گیا۔ پلٹن کی کمانڈ کرنل عباسی کر رہے تھے اور ساتھ توپخانہ کی بیٹری بھی تھی۔ یہاں عجیب صورتحال تھی۔ ریلوے لائن سے صرف سو گز کے فاصلہ پر مغربی بنگال اور بھارت کا علاقہ ہے۔ بنگالی باغی، وہاں کئی دفعہ سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے تھے، اور بنگلہ دیش زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ لیکن ہمارے مجاہدین جواب نہ دیتے تھے، اور نہ ہی سامنے ہوتے تھے بلکہ اپنی اپنی پوزیشنوں میں رہتے تھے۔ سخت چوکنا ہونے کی ضرورت تھی اور بھارتیوں کی مدد سے کئی دفعہ یہ باغی فائر بھی کھول دیتے تھے اور موقع ملتا تو کسی جگہ سے ہمارے علاقوں کے اندر بھی گھس آتے تھے۔ میں نے سب حالات پلٹن والوں سے پوچھے اور دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھایا کہ شام سورج غروب ہونے سے پہلے میں رنگپور پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہاں بریگیڈئر میجر عزیزم عبدالحق مرزا میرے لئے بیٹوں اور چھوٹے بھائیوں کی طرح تھے کہ جب راقم نے 35 پنجاب پلٹن کھڑی کی تھی تو عبدالحق میرا دایاں بازو تھے۔ وہ اپنی رہائش اور دفتر سے باہر گھنٹہ بھر سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے رات تو انہی کے ہاں قیام کرنا تھا۔ لیکن ادھر ان کے بریگیڈ کمانڈر، بریگیڈئر عبداللہ ملک اور بکتر بند یونٹ کے کرنل کے میجر عبدالحق کو پیغام پر پیغام مل رہے تھے کہ وہ میرے انتظار میں ہیں تو یہ عاجز مغرب کی نماز ادا کرنے کے فوراً بعد ان کے پاس پہنچا کہ دونوں پرانے رفیق تھے۔ بریگیڈئر عبداللہ ملک نے بتایا کہ انہیں رنگ پور اور میر پور میں تو کوئی تکالیف نہ ہوئی کہ لوگ بھی اچھے ہیں اور فوج کا سارے علاقے پر کنٹرول تھا۔ البتہ ''ٹھاکر گاؤں'' میں ایسٹ پاکستان رائفلز نے بغاوت کر کے میجر محمد حسین ملک کو شہید کر دیا اور تم پوری کہانی ''ٹھاکر گاؤں'' جا کر سن لینا کہ ٹھاکر گاؤں اور دیناج پور پر کچھ دن باغیوں کا قبضہ رہا اور مشرق میں لال منیر ہٹ پر بھی۔

لیکن اب فوج نے تمام مقامات کا کنٹرول سنبھال لیا ہے اور ان کی تبدیلی مغربی پاکستان میں ہو گئی ہے۔ نیا بریگیڈئر اختر انصاری آنے والا ہے فی الحال یہاں زیادہ گڑبڑ نہیں۔ لیکن ہمارا پھیلاؤ اتنا زیادہ ہے کہ اگر بھارت حملہ کر دے تو بریگیڈ کے طور پر دشمن کے ساتھ کوئی متحدہ لڑائی نہیں لڑی جا سکتی۔ ہم نے اوپر والوں کو اس صورتحال سے آگاہ کر دیا ہے کہ سویلین معاملات کو سیاسی طور پر حل کیا جائے۔ آخر فوج کتنا اور کیسا کنٹرول کرے گی۔ بکتر بند دستوں کے کرنل نے کہا کہ اس کی یونٹ کی آدھی نفری بنگالی ہے۔ کوئی ایک آدمی بھی باغی نہیں ہوا۔ وہ ہمارے اور خاص کر پنجابی اور پٹھان اپنے ساتھیوں کے رویوں سے بہت متاثر ہیں اور ہم نے الگ سو فیصدی بنگالی یونٹیں بنا کر بڑی غلطی کی۔ بنگالیوں نے بغاوت کی نہیں۔ ان سے بغاوت ان لوگوں نے کرائی جو جلدی کرنل، بریگیڈئر یا جنرل بننا چاہتے تھے۔

رات میں نے عزیزم میجر عبدالحق کے پاس گزاری، جس نے اپنی چارپائی کو میری چارپائی کے ساتھ جوڑ دیا کہ رات کو کبھی آنکھ کھلے گی تو وہ میری سانسوں کی آواز سن کر بھی محظوظ ہوں گے اور بڑی محبت کا اظہار کیا۔ بار بار میرے ساتھ لپٹ جاتا تھا۔ میں نے اپنی جیپ ان کے ہاں چھوڑی کہ اس کو واپسی سفر کیلئے تیار کریں اور ایک بنگالی مسلمان قسم کے ڈرائیور کے ساتھ ان کے بریگیڈ کی جیپ میں صبح سویرے میرپور چھاؤنی کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں ہر طرح کا امن تھا اور حالات نارمل تھے۔ تربیت کا کام جاری تھا اور یہ پہلا مقام دیکھا۔ جہاں ماحول میں امن نظر آ رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے اور ظہر کی نماز کے بعد ٹھاکر گاؤں کی طرف روانہ ہوئے تو آگے ایک مزار آیا، جس کو "پگلا پیر" کہتے ہیں۔ ڈرائیور نے کہا یہاں اگر رک کر قبر پر حاضری نہ دی جائے تو آدمی کسی نقصان سے دوچار ہو جاتا ہے۔ میں وضو میں نہ تھا اور کہا کہ وضو میں دیر لگ جائے گی۔ واپسی پر قبر پر حاضری دیں گے۔ تھوڑا ہی آگے نکلے تو جیپ پھسل گئی اور ایک درخت کے ساتھ معمولی ٹکر سے ریڈیٹر سے پانی نکلنا شروع ہو گیا۔ اب ہم لمبے سفر کے قابل نہ تھے۔ واپس مڑے، وضو کر کے "پگلا پیر" پہ حاضری دی اور جگہ جگہ گاڑی میں پانی ڈال کر واپس رنگپور آ گئے کہ عزیزم میجر عبدالحق کے ساتھ ایک اور دن گزارنے کا موقع مل گیا۔ یہ "پگلا پیر" کی کرامت کا "اظہار" تھا یا میجر عبدالحق کی محبت کا کھچاؤ یا دونوں باتیں ہو سکتی تھیں۔ میں آج تک فیصلہ نہیں کر سکا۔ دوسرے دن بہت سویرے ایک اور جیپ میں اس تیزی سے ٹھاکر گاؤں کی طرف روانہ ہوئے کہ نو بجے سے پہلے ٹھاکر گاؤں پہنچ گئے۔ جہاں کرنل ملک محمد امیر اور پنجاب رجمنٹ والے کل سے ہمارے منتظر تھے۔ چائے کے بعد مجھے وہ اس مکان میں لے گئے جہاں ایسٹ پاکستان رائفلز کے عزیزم میجر محمد حسین ملک ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ حالات کو بھانپ چکے تھے۔ اپنی دو بیٹیاں چوری چھپے ایک معتبر مسلمان شہری کے حوالے کر دیں کہ وہ ان کی حفاظت کرے۔ خود، بیوی اور ایک لڑکے کے ساتھ مکان کی چھت پر اپنے دفاع کا پروگرام بنایا۔ اس کی یونٹ سے ایک بنگالی کیپٹن نے اپنے کمانڈر کے دفاع کی قسم اٹھائی کہ وہ اتنے دور سے آ کر ان کی تربیت کرتا رہا ہے اور وہ ان کی باپ کی طرح ہے۔ وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا اور مکان کے اوپر سے باغی بنگالیوں کو بہت سمجھایا۔ لیکن باغی نہ مانے اور لڑائی میں میجر محمد حسین، اس کی بیوی، لڑکا اور وہ بنگالی کیپٹن شہید ہو گئے۔ افسوس اسلام کے اس عظیم فرزند بنگالی کیپٹن کا نام مجھے بھول گیا ہے۔

کرنل محمد امیر نے ایک صوبائی اسمبلی کے ممبر کو بھی بلایا ہوا تھا۔ جو اول بھی مسلمان تھا اور اس نے عوامی لیگ کے نمائندہ کو شکست دی تھی۔ یہاں کی آبادی اسلامی خیال کی تھی اور کافی بہاری بھی آباد تھے۔ شرپسندی صرف ایسٹ پاکستان رائفلز نے کی کہ تیسرے دن رنگ پور اور میر پور سے فوجی دستے پہنچ گئے تھے اور اب حالات کنٹرول میں تھے اور اسمبلی کا ممبر بار بار زور دیتا رہا کہ صرف اسلام کے نفاذ سے دونوں خطوں کو متحد رکھا جا سکتا ہے۔ کرنل ملک امیر اور اس کے افسران نے ایک اور عجیب و غریب بات بتائی کہ چند دن پہلے روس کے کونسلر نے علاقے کا دورہ کیا اور باتوں باتوں میں کہہ گیا کہ ''ہم لوگ خواہ مخواہ ایک ''لاحاصل مشق'' سے حالات کنٹرول کر رہے ہیں۔ بین الاقوامی دنیا خاص کر روس اور امریکہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ بنگلہ دیش ایک الگ اور آزاد ملک ہونا ضروری ہے اور پاکستان کی اعلیٰ قیادت کو یہ سب کچھ معلوم ہے۔ صرف وقت کے ''تعین'' کیلئے یہ ''مناظر'' عمل میں لائے جا رہے ہیں'' اور انہوں نے اوپر والوں کو یہ رپورٹ بھیجی ہے۔ میں بھی یہ بات اوپر پہنچاؤں۔ غیر ملکی اخبار نویسوں سے تو یہ عاجز مارچ اپریل 1971ء سے کراچی میں ایسا سن چکا تھا۔ ایک سفارتی نمائندہ کی ایسی بات سفارتی آداب کے خلاف تھی لیکن ہمارے اوپر والے چونکہ ''مخلص'' نہ تھے۔ یعنی پنجابی کی کہاوت کے مطابق ''کانے'' تھے اسلئے انہوں نے اس رپورٹ پر کوئی ردعمل نہ دکھایا۔ یہ عاجز دوپہر کے کھانے اور ظہر کی نماز کے بعد ''دنیاج پور'' روانہ ہو گیا۔ جہاں سورج غروب ہونے سے تھوڑا پہلے پہنچا۔ وہاں بلوچ پلٹن کے کرنل عبدالحکیم اور اس کے افسروں کے ساتھ ملاقات بڑی مختصر رہی کہ کافی سویلین مہمان آئے ہوئے تھے اور پلٹن کے میس میں ایک بہت بڑا ڈنر تھا۔ جہاں سویلین شرفاء سویلین نوکروں خاص کر پولیس والوں اور کئی لوگوں سے بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ اکثر کا خیال تھا کہ یہ حالات زیادہ دیر نہ چل سکیں گے۔ حکومت کو معاملات کا کوئی قومی یا سیاسی حل ڈھونڈنا ہوگا۔ دنیاج پور پر بھی چند دن باغی قابض رہے تھے لیکن فوج کے آنے کے بعد وہ بھاگ کر بھارت چلے گئے تو سرحدوں کے حالات کشیدہ تھے۔

دوسرے دن صبح سویرے رنگ پور کو واپس جاتے۔ سب سے پہلے اس عاجز نے ''چھل غزہ'' کے مقام پر حاضری دی جس کو چالیس غازیوں کا ''مقام'' یا ''مزار'' مانا جاتا ہے۔ اور ہمارے ہاں بھی کئی جگہ جو ''نوگزی'' قبریں ہیں دراصل یہ بھی ''نوغزہ'' کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ کیا وہاں نو یا چالیس غازی دفن ہیں؟

عقل یہ بات تسلیم نہیں کرتی کہ گن کر غازی باری باری دفن ہوتے رہے۔ یا ایک دن اتنے غازی وفات پا گئے۔ میرے خیال میں نو یا چالیس غازیوں کی کوئی ''بیٹھک'' یا ''مقام'' ہے۔ جہاں انہوں نے رہائش اختیار کی ہوئی تھی۔ بہرحال یہ مقام بڑا صاف ستھرا تھا اور اس عاجز نے حسب عقیدہ کل مومن مسلمانوں کی بخشش کیلئے فاتحہ تو ضرور پڑھی لیکن ارواح کا تعلق جو ''اجساد'' سے ہوتا ہے۔ ایسا کوئی ''کشف قبور'' کا مرحلہ نہ آیا جس سے یہ عاجز جب کسی مزار پر قبر پر حاضر ہوتا ہے تو دوچار ہوتا ہے۔ میجر عبدالحق کی محبت جاری تھی کہ واپس جا کر ان کے پاس رنگ پور میں تیسری دفعہ قیام کیا کہ اس کے دوسرے دن میں لال منیر ہٹ ضرور جانا چاہتا تھا کہ اس کے نچلے اور جنوبی علاقہ ''گائے بندھا'' بھی نہ جا سکا تھا۔ لال منیر ہٹ تک صرف بذریعہ ٹرین جا سکتے تھے جو فوج کی نگرانی میں صبح وہاں جاتی تھی اور شام کو واپس آ جاتی تھی کہ عام طور پر ریلوے کا سسٹم اکثر جگہوں پر بند تھا۔ میں

لال منیر یٹ پہنچا تو عزیزم کرنل محمد حسین ملک میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہاں کچھ چائے پی کر پلٹن کی کمپنیاں جہاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اگر وہاں تک پیدل جاتے تو سارا دن لگ جاتا اور صرف ایک کمپنی کو دیکھ سکتے یہاں ریل کی پٹڑی پر ''ٹھیلوں'' کے ساتھ انجن لگے ہوئے تھے اور اس علاقہ کو ریل کے ان ''ٹھیلوں'' پر سوار ہو کر دیکھا کہ پلٹن کتنی پھیلی ہوئی تھی کہ آسام کے علاقوں سے باغی آ کر اندر گھس جاتے تھے یہ وہ پلٹن تھی جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ راجشاہی میں محاصرہ کے اندر تھی اور ایک کمپنی کے پیدل نوجوان میجر اسلم سمیت باغیوں نے پنبہ کے پاس شہید کر دیے تھے' اور اس پلٹن کے مورال پر بہت اثر ہوا تھا اور ان میں بنگالیوں سے بدلہ لینے کی خواہش عود کر رہی تھے۔ لیکن کرنل ملک محمد حسین نے پلٹن کو نماز کی باقاعدگی پر سختی سے لگا کر ان کی ذہنی اور قلبی کیفیت کو مسلمان مجاہدین والی کیفیت میں تبدیل کر دیا تھا شام کو یہ عاجز واپس رنگ پور پہنچ گیا اور دوسرے دن کسی جگہ بغیر ٹھہرے بہت لمبا سفر کر کے نٹور بریگیڈئر اسلم نیازی کے پاس پہنچ گیا۔ جولائی کا وسط ہو گا اس دن پہلی دفعہ راجشاہی کے علاقہ پر باغیوں نے بھارت سے آ کر ایک بڑا حملہ کیا جو پسپا تو ہو گیا لیکن باغیوں کے حملوں میں تیزی آ رہی تھی بریگیڈئر اسلم تبدیل ہو کر ''فینی'' (کومیلہ کے نزدیک) جا رہا تھا' جہاں میں نے ابھی جانا تھا اور ان کو عارضی الوداع کر کے میں دوسرے دن ڈھاکہ پہنچ گیا اور وہاں پہنچ کر میں نے بہت کچھ لکھا لیکن میں یہ تو نہ لکھ سکتا تھا کہ ہم بھارت کے ساتھ لڑائی لڑنے کے قابل نہیں کہ اس طرح بے دلی پھیلتی نہ یہ لکھ سکتا تھا کہ صورت حال ''بھیانک'' ہے کہ حکومت قوم کو بے وقوف بنا رہی تھی کہ حالات نارمل ہیں میں اس کی سیدھی تردید کیسے کرتا' طریقے کے ساتھ بہت کچھ لکھا کہ حالات کیا تھے اور مجاہدین کی بڑی دلجوئی کی کہ مشکل حالات میں وہ قوم کے اعتماد پر پورے اترے کہ ادھر قوم جنرل یحییٰ خان کو خراج تحسین پیش کر رہی تھی کہ اس نے فوجی کارروائی کر کے ملک کو شرپسندوں سے بچا لیا ہے' اس لئے میں صرف یہ اظہار کر دیتا تھا کہ حالات کتنے مشکل ہیں۔ یہ صورت حال ایک ڈویژن کے بارے میں تھی جو مقابلتاً باقی ڈویژنوں سے بہتر حالات میں تھا تو اس کے بعد یہ عاجز ڈھاکہ سے جیسور پہنچ گیا کہ اتفاقاً میجر جنرل شوکت رضا سمیت آٹھویں ڈویژن ہیڈ کوارٹر کے سب افسران ہوائی اڈے پر موجود تھے کہ ان کا کرنل نعیم بریگیڈئر بن کر بریگیڈئر اسلم نیازی کی جگہ نٹور جا رہا تھا۔ جس کی ''فینی'' میں تبدیلی کا ذکر ہو چکا ہے۔ سب افسران کے ساتھ ہوائی اڈہ پر ہی علیک سلیک ہو گئی اور ان کے ساتھ ہی میں ڈویژن ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔ جہاں ابھی صبح کی ''بریفنگ'' ہونا باقی تھی اور کرنل اسلم بیگ جی ون نے میرے سامنے نقشے پر بریفنگ کی جو حالات سن کر میں حیران ہو گیا کہ صورت حال بالکل دوسری جنگ عظیم کی طرح تھی۔

میں ستمبر 65ء کی جنگ کی مثال نہیں دے رہا کہ اس زمانے میں بریفنگ کا کسی کو وقت ہی نہ تھا۔ پس بغیر تجاویز کے ہمیں لڑایا جا رہا تھا کہ ''چڑھ جا بچہ سولی رام بھلی کرے گا'' بہر حال کرنل اسلم بیگ نے جو صورت حال پیش کی کہ جیسور ڈویژن کی ساری سرحد Activate ہو چکی تھی۔ باغی جگہ جگہ سے اندر گھسنے کی کوششیں کر رہے تھے اور کچھ اندر داخل ہو کر کئی مقامات پر Sabotage کی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ اسی علاقہ کے ایک مقام چوہا ڈنگہ پر بنگلہ دیش کی عارضی حکومت وجود میں آئی تھی۔ یہی مجیب الرحمان کا آبائی علاقہ ہے اور یہاں پر مقام کشتیہ' جیسور' کھلنا' بنیاپول پر باغی بغاوت کر کے قتل عام میں مصروف رہے تھے۔ جنرل شوکت رضا کے ساتھ میری رسمی

ملاقات ضرور ہوئی لیکن فوجی وردی کے علاوہ شوکت رضا اور مجھ میں کوئی ''قدر مشترک'' نہ تھی۔ شوکت رضا دیہات کے پڑھے ہوئے ہر افسر کو اپنے انگریزی لہجہ کی وجہ سے ان پڑھ سمجھتا تھا اس میں حد سے زیادہ تکبر تھا شادی اس نے کی نہ تھی اس لئے انسانی اقدار کا بھی اس کا اپنا الگ ''معیار'' تھا اور میری اسلام کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے مجھے وہ ''کٹھ ملا'' گردانتا تھا اس کے اوروں کے اعمال پر اکثر اعتراضات ہوتے تھے کہ دوسروں کی آنکھوں میں تنکا ڈھونڈتا رہتا تھا لیکن اپنی آنکھ میں پڑا شہتیر نظر نہ آتا تھا۔ یعنی اپنے گریبان میں وہ منہ ڈالنے کو تیار نہ ہوتا تھا اور مغربی اقدار کا دلدادہ تھا۔ اس نے ساری ترقیاں انگریزوں کی طرح لہجہ کی انگریزی ''بولی'' اور اوپر والوں سے گپ شپ کی وجہ سے حاصل کی تھیں اور یحییٰ خان کا وہ بڑا مداح تھا تو اب پہلی دفعہ اس کو زندگی میں عملی کمانڈر کے طور پر کام کرنا پڑا تو وہ جنرل نیازی کے ہر حکم پر اعتراض کر چھوڑتا تھا کہ اس کی عادت بن گئی تھی اور خود کوئی متبادل بہتر تجویز بھی نہ دیتا تھا اس لئے جیسور ڈویژن کی اس خراب صورت حال میں شوکت رضا کی غلط کمانڈ کے اثرات بھی تھے۔ جنرل نیازی نے اس کو سمجھایا کہ یہ قومی ضرورت ہے کہ ہم حکم مانیں یا مستعفی ہو جائیں لیکن شوکت رضا' جنرل نیازی کو بھی ان پڑھوں کی نفری میں شمار کرتا تھا تو جنرل نیازی نے اس کی جگہ میجر جنرل محمد حسین انصاری کو کمانڈ دینے کی سفارش کی جنہوں نے چٹاگانگ میں بڑا اچھا کام کیا تھا اور ان کی نئی نئی اس عہدہ پر ترقی ہوئی تھی۔ تو وہ شوکت رضا سے ہفتہ کے اندر اندر کمانڈ لینے والے تھے۔ اس لئے میں نے بھی شوکت رضا کے ساتھ ملاقات کی خواہش نہ ظاہر کی اور نہ شوکت رضا نے مجھے کوئی ''وقعت'' دی جو مجھے اور لوگ دے رہے تھے۔

چنانچہ دوپہر کے کھانے کے بعد میں سیدھا جیسور کے علاقے کے بریگیڈ کمانڈر اور پرانے دوست بریگیڈئر محمد حیات کے پاس چلا گیا جس نے مجھے بتلایا کہ میں بھیانک صورت حال اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں کہ وہ بالکل حالت جنگ میں ملک کے چپہ چپہ کا دفاع کر رہے ہیں اور وہ مجاہدین کو داد دیتے ہیں کہ وہ ان حالات میں احکام پورے کر رہے ہیں جیسور شہر پر باغیوں کا قبضہ کئی ہفتے رہا ساتھ مغربی بنگال کی حد ملتی ہے کلکتہ بھی نزدیک ہے مکتی بھانی اور باغیوں کا سب سے بڑا گڑھ ہمارے آوٹ پوسٹ بنیاپول سے چند میل دور بھارت میں ہے اور کافی باتیں ہوئیں اور ابھی کچھ باقی تھیں کہ میجر جنرل شوکت رضا کا بریگیڈئر محمد حیات کو فون آ گیا کہ وہ اکیلا ہے اور بریگیڈئر حیات آ کر اس کو کمپنی دے۔ بریگیڈئر محمد حیات نے معذرت کی کہ میجر امیر افضل آیا ہوا ہے اور وہ مجھے ''بریف'' کر رہا ہے لیکن شوکت رضا نے کہا ''یہ کام تمہارا بریگیڈئر میجر کر سکتا ہے'' مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ بہرحال میں نے دوسرے دن صبح سویرے بنیاپول کے پیچھے فرنٹیئر فورس پلٹن میں جانے کا پروگرام بنایا تو میری جیپ کے علاوہ ساتھ ایک اور جیپ میں حفاظتی دستہ بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا کہ اکیلی گاڑی' آدھ میل بھی اکیلی نہ چل سکتی تھی۔ میں جب پلٹن میں کرنل اخوندزادہ کے پاس پہنچا تو بھی اردگرد سے فائر کی آوازیں آ رہی تھیں اور میں بنیاپول کے بارڈر آوٹ پوسٹ پر پہنچا تو ہم پر بھی مارٹر کے گولے گرے میں نے دوپہر کا کھانا اسی پلٹن کے ساتھ کھایا اور میں سب پلٹن والوں کو سلام کرتا ہوں کہ وہ ان حالات میں گزارہ کر رہے تھے۔ پولیس بھی یہاں پنجاب سے پہنچی ہوئی تھی اور رینجر یا سکاؤٹس والے بھی مغربی پاکستان سے آئے تھے۔ دوپہر کے بعد اس عاجز نے کھلنا میں بلوچ پلٹن کا دورہ کیا جو اس سے بھی بدتر صورت حال سے دوچار تھے کہ کھلنا ایک قسم کی بندرگاہ بھی ہے

اور وہاں باغی ہر راستہ استعمال کر کے کبھی بندرگاہ کو نقصان پہنچا دیتے تھے کبھی کشتیوں یا چھوٹے شہروں پر حملہ آور ہو جاتے۔ میرے سامنے صرف ایک سوال تھا کہ دوسری جنگ عظیم میں بھی کچھ دن یونٹیں آرام میں ہوتی تھیں اور کچھ دن محاذ پر یہاں ہماری یونٹیں لگاتار طور پر محاذ پر موجود تھیں۔ میں اور کیا دیکھتا اور افسران سے کیا معاملات زیر بحث لاتا کہ جنگ شروع تھی واپس آ کر رات میں نے جیسور میں گزاری اور دوسرے دن کشتیہ چلا گیا جہاں بریگیڈئر منظور میرے پرانے دوست بریگیڈ کمانڈر تھے اور اس کے سارے سٹاف افسران میجر جعفر اور میجر خان زمان وغیرہ میرے عزیزان میں سے تھے اور کچھ کیپٹن میرے بیٹوں کی طرح تھے کہ ان کے والد بزرگوار میرے ساتھ نوکری کر چکے تھے اس لئے وہاں معاملات کھل کر زیر بحث آئے کہ فوج ان حالات میں کتنے اور عرصہ کے لئے گزارا کرے گی۔ سب کا خیال تھا کہ دباؤ اتنا زیادہ ہے کہ تین چار ماہ بعد لوگ ذہنی مریض ہو جائیں گے کہ کارروائی کا کوئی نتیجہ سامنے نہ آ رہا تھا نہ فتح نہ شکست۔ اب مجھ پر واضح ہو گیا تھا کہ حالات کے مزید مطالعہ کی ضرورت نہیں کہ اتفاقاً میرے ایک پرانے رفیق کرنل ملک محمد اسلم جو ایسٹ پاکستان رائفلز کے جیسور کے کمانڈر تھے وہاں ان کے ساتھ بھی ملاقات ہو گئی جنہوں نے سب حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور اب بھی دیکھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں اور ڈھاکہ واپس جانے سے پہلے اس عاجز نے ایک دن ان کے مکان پر جیسور میں ان کے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا۔

کشتیہ میں مارچ 1971ء ایک بلوچ پلٹن کی ایک کمپنی تھی جو شہر میں ڈیوٹی پر تھی اور باغیوں نے ایسٹ پاکستان رائفلز سے بغاوت کر کے کچھ عوامی لیگ کے غنڈوں کو ساتھ ملا کر اس کمپنی کا محاصرہ کر لیا۔ کئی دن لڑائی ہوتی رہی لیکن باغیوں کی تعداد ہزاروں میں تھی کمپنی کمانڈر سمیت کئی مجاہدین شہید ہوئے اور کئی زخمی جن کو قید کر کے بھارت بھیج دیا گیا تھا۔ کوئی دس پندرہ آدمی زندہ بچ کر جیسور پہنچ سکے اور دو تین ہفتے بعد جب مغربی پاکستان سے کمک پہنچ گئی تو تب کشتیہ کو باغیوں سے پاک کیا گیا۔ کشتیہ اور گرد و نواح اب بھی شر پسندوں کے گڑھ تھے۔ راقم نے چوہا ڈنگہ جا کر پنجاب پلٹن کے کرنل مطلوب اور میری پرانی پلٹن سولہ پنجاب کے میجر رانا جو اس نئی پلٹن میں آ گئے تھے سے طویل ملاقات کی۔ حالات اسی طرح خراب تھے جس طرح جیسور اور بیناپول کے علاقوں میں تھے۔ ہم جس جگہ پر بھی گئے بھارتی توپچی اور مارٹر والے بھی فائر کر دیتے تھے اور بہانہ یہ بنایا جاتا تھا کہ پاکستانی دستے ان کی سرحد میں گھس آئے تھے اور ان بھاگتے دستوں پر فائر کیا گیا تھا اور کچھ گولے پاکستان کی سرحد کے اندر گر گئے تھے۔ بھارت اور پاکستان کی سرحد بالکل بند تھی۔ امن کے زمانے میں جو رینجر والے یا پولیس والے ایک دوسرے سے ملاپ کر کے غلط کارروائیاں روکتے رہتے تھے۔ وہ کام ''ٹھپ'' ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھارت اور پاکستان حالتِ جنگ میں ہیں۔ یہ عاجز پنجاب رجمنٹ کے مجاہدین کو سلام کرتا ہے کہ بڑے تناؤ اور کھچاؤ میں وہ لوگ چوکنے تھے اور دن رات سرحدوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ میں جہاں بھی جاتا تھا۔ میرے ساتھ ایک جیپ میں حفاظتی دستہ ہوتا تھا۔ ساتھ ہی ایک بلوچ پلٹن کی کچھ چوکیوں کو دیکھا کہ وہ لوگ اوپر کی طرف راجشاہی ڈویژن کے علاقے میں فرنٹیئر فورس پلٹن سے رابطہ باندھے ہوئے تھے۔ جن کے دورہ کا ذکر یہ عاجز، نٹور کی طرف سفر کے وقت کر چکا ہے۔ یہ لوگ بھی ایسے ہی تناؤ میں کام کر رہے تھے۔

اب صرف میرے گروپ کی پلٹن چھٹی پنجاب باقی رہ گئی تھی۔ جو جنوب میں بارسیال کے علاقہ میں سمندر تک پھیلی ہوئی تھی۔ جن کو ''ہیلو ہیلو'' کرنا بھی ضروری تھا۔ لیکن سفر اتنا لمبا تھا کہ ایک دن میں کام نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے اگلے سارے دن سفر کر کے کچھ وقت بارسیال پہنچ کر کرنل محمد شریف کی معیت میں سمندر کے علاقوں تک حالات کا مطالعہ کیا اور کرنل شریف سے بریفنگ لی کہ اکا دکا شر پسند' کسی نہ کسی راستے سے آ کر پولیس سٹیشنوں پر حملے کرتے رہتے ہیں اور ہر تھانہ کو دفاعی چوکی میں تبدیل کر دیا گیا ہے کہ پولیس والے بھی مغربی پاکستان سے منگوائے گئے ہیں اور فوج والے ان پولیس چوکیوں کے درمیان دن رات گشت کرتے ہیں۔ میجر نادر پرویز اور ایک دوسرے کمپنی کمانڈر کو میں نہ مل سکا تھا۔ ان کے لئے بندوبست کیا کہ میری واپسی پر سڑک کے ''مقررہ'' مقامات پر مجھے آ ملیں اور سب سے حالات معلوم کر کے یہ عاجز دوسرے دن سورج غروب ہونے کے وقت کشتیہ پہنچا اور صبح سویرے جیسور روانہ ہو گیا کہ اس سے اگلے دن میں نے ڈھاکہ واپس جانے کیلئے اپنی سیٹ کا سارا بندوبست کرنا تھا اور آدھا دن اور رات کا کافی حصہ حسب وعدہ ایسٹ پاکستان رائفلز کے کرنل محمد اسلم سے بات چیت میں گزارا۔ جن کی بصارت اور بصیرت دونوں ہی مثالی تھیں۔ انہوں نے سب کچھ ہوتا' اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور ان کے جائزوں نے میری سوچوں کو تقویت دی کہ ہم مشرقی پاکستان میں اب کوئی لڑائی لڑنے کے قابل نہیں ہیں۔ خواہ موجودہ فوج سے دگنی فوج وہاں اکٹھی کر لیں۔ بات عزت بچانے کی تھی کہ کسی ذلت آمیز شکست سے بچنا ضروری تھا۔ اب میں نے ہر جگہ یہ باتیں سیدھی طور پر کہنا شروع کر دیں۔ لیکن ڈھاکہ واپس جا کر 'ہلال' کے لئے جو تین' چالیس صفحات تیار کئے ان میں سیدھے طور پر تو یہ باتیں نہ لکھیں۔ لیکن ایسے اشارے ضرور کئے کہ وقت ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ فوج والے تھک جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کرے معاملات کا کوئی سیاسی حل نکل آئے۔ البتہ مجاہدین کو حسب معمول خراج تحسین پیش کیا کہ اپنے گھروں سے دور وہ سخت جانفشانی سے قوم کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں۔ میں اب حالات سے مایوس ہو چکا تھا اور مغربی پاکستان میں بیٹھ کر میں اندازہ بھی نہ لگا سکتا تھا کہ حالات اتنی بھیانک صورت حال اختیار کر گئے ہیں۔ مشرقی پاکستان کا دفاع ہم ایک لنگڑے لولے ڈویژن سے کرتے رہے تھے۔ میں اس خوشی سے مغربی پاکستان سے نکلا تھا کہ اب دو مزید ڈویژن بھیج کر کے ہم نے تزویراتی طور پر مشرقی پاکستان میں برتری حاصل کر لی ہو گی۔ اور بے شک اگر بنگالی بغاوت نہ کرتے اور ہمارے ساتھ ہوتے تو بھارت دس ڈویژنوں سے ہم پر حملہ کر کے بھی ہمارا بال بیکا نہ کر سکتا تھا لیکن جب لوگ آپ کے ساتھ نہ ہوں' تو باہر سے آ کر دشمن ''ہو'' کی آواز سے ہمیں شکست دے سکتا ہے۔ یہ بھارتی فوج نے 1971ء میں ہمیں شکست دے کر کوئی بہادری نہیں کی۔ میری سوچ کے مطابق تو وہ یہ سب کام تین دن میں کر سکتے تھے۔ اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ جلد مغربی پاکستان جاؤں اور وہاں ''پاگلوں'' کی طرح جی ایچ کیو میں شور کرنا شروع کر دوں کہ خدارا مشرقی پاکستان میں فوج کی عزت کو بچانے کے لئے کوئی تجویز بناؤ۔ لیکن میں نے سوچا کہ فوج والے مجھے ڈاکٹروں کے حوالے کر دیں گے۔ اور چلو سرسری طور پر مشرقی سرحد پر بھی ایک نظر ڈال لوں۔ ان علاقوں کو کنٹرول کرنے والا ڈویژن ڈھاکہ ہی میں تھا اور ان کے میجر جنرل رحیم جو میرے پرانے مہربان اور رفیق ہیں ان سے ملاقات ہو چکی تھی۔ کرنل سٹاف سعد اللہ جو میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح تھے وہ بریگیڈیئر بن کر

میمن سنگھ جا رہے تھے۔ بہرحال، ان کی جگہ آنے والے کرنل مظہر یاسین اور سٹاف کے ساتھ ایسا پروگرام بنایا کہ میں سلہٹ سے لے کر چٹاگانگ تک مشرقی سرحد کا بذریعہ سڑک سفر کر کے راستے میں سب بریگیڈوں اور یونٹوں کو ملتا رہوں۔ جہاں رات پڑ جائے، رات وہاں ہی گزار دوں اور چٹاگانگ سے ہوائی جہاز سے ڈھاکہ پہنچوں۔

سلہٹ سے پنجاب رجمنٹ کے عزیزم کرنل ملک سرفراز ڈھاکہ آئے ہوئے تھے۔ اگلے دن ان کی معیت میں یہ عاجز بذریعہ ہوائی جہاز سلہٹ پہنچ گیا اور میں وضو میں تھا، ان کو لے کر سب سے پہلے شاہ جلال سہروردیؒ کے مزار پر حاضری دی۔ سبحان اللہ! جلال تو صرف نام میں تھا۔ وہاں تو جمال کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اچھل پڑا، ایسا سکون طاری ہوا کہ یہ عاجز ستمبر 65ء کی جنگ میں سورہ آل عمران اور سورہ الانفال کے حوالے سے جس سکون کو قرآن پاک کے الفاظ کے تحت بیان کر چکا ہے، وہ کیفیت طاری ہوگئی۔ ساتھ ہی رقت بھی طاری ہوگئی اور آنسو بھی جاری ہو گئے۔ یہ عاجز ایک دو مقامات پر ایسی کیفیت کے تجربہ سے گزر چکا تھا۔ لیکن یہاں صاحب مزار نے تصور میں بازو پھیلا کر جس طرح مجھے ''خوش آمدید'' فرمایا یا جن بوسوں اور محبت یا الفتوں کو مجھ پر وارد کیا ان کیفیات کو میں کبھی نہیں بھولا اور ایک دفعہ خیال ہوا کہ مشرقی پاکستان والے ہم سے الگ یا جدا نہ ہوں گے تو ساتھ ہی واردات ہوگئی۔ ''کہ جدائی تو محبت کی شرط قدیم ہے'' کیا معلوم کہ صاحب مزار کو بھی ''جدائی'' نظر آ رہی ہے۔ ایک خیال آتا تھا اور ایک خیال جاتا تھا۔ حسب عقیدہ فاتحہ بھی ضرور پڑھا۔ دعائیں بھی مانگیں اور نوافل بھی ادا کئے اور تقریباً ایک گھنٹہ مزار پر گزارا۔ شکر ہے عزیزم کرنل سرفراز ساتھ تھا۔ کئی دفعہ قدم لڑکھڑائے کئی دفعہ صرف ''ڈگمگائے''۔ مزار سے الگ ہونے کو دل نہ کرتا تھا کہ ایسے معلوم ہوا۔ غیب سے آواز آئی۔ اے حضور پاک ﷺ کے سپاہی! تمہاری یہاں حاضری کی تمہیں رب کی ذات پاک جزا دے۔ فقراء، مشیت کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کرتے تو الوداعی سلام کر کے اس کام کے لئے روانہ ہو جا، جس کے لئے آیا تھا''۔ اور پھر ہلکی ہلکی اور بھینی بھینی خوشبو نے میرے اردگرد کے ماحول کو معطر کر دیا، سارا دن ایسی خوشبو ساتھ رہی بلکہ دوسرے روز جب سلہٹ کو ''الوداع'' کہا اور آپ کے لئے فاتحہ پڑھی تو پھر بھی کچھ دیر کیلئے اسی قسم کی خوشبو کو محسوس کیا۔

بہرحال مزار سے سیدھا بریگیڈ ہیڈ کوارٹر گیا۔ جہاں بریگیڈئر رانا اور ان کے سٹاف کو سلام عرض کیا اور گزارش کی کہ یہ عاجز سلہٹ صرف ایک دن قیام کرے گا۔ کل سے برہما باڑیہ کی طرف سفر شروع کر دوں گا۔ کرنل ملک سرفراز نے مجھے کافی معاملات کے سلسلہ میں بریف کر دیا ہے اور اگر ان کی اجازت ہو تو آج بھی میں انہی کی رہنمائی اور میزبانی میں گزاروں اور اگر انہوں نے کوئی خاص بات بتائی ہو تو بتا دیں۔ بریگیڈئر رانا کو یہ تجویز پسند آئی اور کہنے لگے کہ سلہٹ کے حالات تو بالکل ٹھیک ہیں۔ لیکن جب تم بریگیڈ کی ذمہ داری کے باقی علاقوں کو دیکھو گے تو حیران ہو جاؤ گے کہ جیسے جیسے جنوب کو جاتے رہو گے حالات خراب سے خراب تر نظر آئیں گے۔ خدا کرے حکومت جلد کسی سیاسی تصفیہ پر پہنچ جائے۔ موجودہ طریقہ اس صورتِ حال کا حل نہیں۔ سلہٹ کے سارے علاقے میں امن ہی امن تھا اور کرنل سرفراز نے بتایا کہ مارچ میں فوجی کارروائی کے وقت بھی یہاں کوئی بغاوت نہ ہوئی۔ باہر سے آ کر کچھ شرپسندوں نے کچھ لوگوں کو بہکانے کی کوشش کی لیکن یہاں لوگ اول بھی مسلمان اور آخر بھی مسلمان ہیں اور متحدہ پاکستان کے خاص حامی ہیں۔ وہ سارا دن ہم نے سلہٹ کے شمالی محاذ کے علاقے دیکھے

جہاں صوبہ آسام کے ساتھ حد ملتی ہے۔ بڑا ہی خوشنما اور پرنور ماحول تھا۔ البتہ سرحد کا پھیلاؤ بہت زیادہ تھا اور دوسرے علاقوں سے کچھ مکتی بھانی والے ان کے علاقوں سے مشرقی پاکستان کے علاقوں میں داخل ہونے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اس لئے کرنل سرفراز کی یونٹ کو بہت چوکنا رہنا پڑتا۔

ہم نے ساری دیکھ بھال کسی حفاظتی دستے کے بغیر کی اور دوسرے دن میں اپنے سفر پر رواں دواں ہو گیا کہ سلہٹ کے چائے کے باغوں کے علاقوں کے اندر سے سڑک گزرتی ہے اور دوپہر تک بڑے ہی خوشنما سفر کے بعد ایک سرکاری سیرگاہ اور ریسٹ کیمپ پہنچا۔ جہاں فرنٹیئر فورس پلٹن کا کرنل اور ان کے سیکنڈ ان کمانڈ میرے جاننے والے تھے اور ان کے ہاں رات بھی گزارنا تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اب برہما باڑیہ تک مجھے حفاظتی دستہ کے ساتھ سفر کرنا ہوگا کہ سڑک جو جنوب کو جا رہی ہے بھارتی ریاست تریپورہ کی سرحد وہاں سے بہت نزدیک ہے۔ بعض جگہوں پر کل فاصلہ ایک یا دو میل دور ہے۔ اگرتلہ اسی ریاست کا مرکزی شہر ہے۔ جہاں جا کر مجیب الرحمٰن نے 1967ء میں بھارتیوں سے رابطہ باندھا تھا اور مشہور اگرتلہ مقدمہ میں ایوب خان کے زمانے میں مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا گیا تھا کہ سیاستدانوں کی سفارش پر 69-1968ء میں ایوب خان کو مجیب الرحمٰن کو رہا کرنا پڑا تھا۔ اب یہی اگرتلہ بنگالی باغیوں کا ایک گڑھ ہے۔ بنگالی باغی ریاست تریپورہ سے نکل کر ان علاقوں میں کسی گھات میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور اگر پاکستانی فوج کا کوئی جوان یا پولیس یا رینجر کا جوان نظر آئے اس کو شہید کر دیتے ہیں۔ یا ایسے چھوٹے دستوں کو پکڑنے کی بھی کوشش کرتے ہیں یا کسی کو شہید کر کے ندی نالے میں ڈبو دیتے ہیں کہ وہ دریا میں بہہ جائے اور پلٹن کے کچھ جوانوں کا نقصان ہوا۔ تو اب پلٹن بڑی چوکنی ہے لیکن افسوس کہ مغربی پاکستان آ جانے کے بعد مجھے خبر ملی کہ مجھے بریف کرنے والا اس پلٹن کا سیکنڈ ان کمانڈ تین جوانوں سمیت ستمبر 1971ء میں ایک ایسی ہی گھات کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے لاپتہ ہو گیا تھا۔ کہ بنگالی باغی آدمیوں کو شہید کر کے ندی نالوں میں ڈال دیتے تھے کہ لاشیں آگے بہہ جاتی تھیں۔

رات اس پلٹن میں قیام کے بعد راقم صبح سویرے حفاظتی دستوں کی معیت میں وہاں سے چل نکلا۔ جہاں کوئی موڑ آ جاتا تو ہم اور چوکنے ہو کر ایک دوسرے کو فوجی الفاظ کے مطابق "Cover" کرتے کہ میری جیپ میں بھی دو ہتھیار بند نوجوان تھے۔ ہمارا اگلا پڑاؤ برہما باڑیہ تھا جس کے نزدیک بھارتی فوجیوں کو وہاں سے 59-1958 میں خارج کرنے والے میجر محمد طفیل شہید کو نشان حیدر سے نوازا گیا تھا۔ اب ہمارے بنگالی فوجی انہی بھارتیوں کی مدد سے ہمارے ساتھ لڑائی کر رہے تھے کہ 25 مارچ 1971ء کو یہاں پر مقیم بنگالی پلٹن نے بغاوت کر دی اور اپنے کرنل ملک خضر حیات اور دو اور مغربی پاکستان کے افسروں کو شہید کرنے پر تلے ہوئے تھے لیکن پلٹن کا صوبیدار میجر اور کچھ نچلے عہدے والے ڈٹ گئے کہ کرنل ملک خضر پچھلے بیس سالوں سے ایک والد کی طرح ان کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ تو ان تینوں افسروں کو قید کر کے بھارت والوں کے حوالے کر دیا۔ جن کی رہائی 1971ء کے باقی جنگی قیدیوں کے ساتھ 74-1973ء میں ہوئی۔ اس بنگالی پلٹن نے وسیع علاقوں پر اپنی حکومت ایک ماہ تک جاری رکھی اور ساتھ کومیلہ چھاؤنی پر حملہ آور بھی ہوئی۔ برہما باڑیہ میں بھی ایک فرنٹیئر فورس پلٹن تھی جب میں وہاں دن کے گیارہ بجے پہنچا تو ایک اور بری خبر سنی کہ ان کے ساتھ جنوب میں آگے جو بلوچ پلٹن تعینات تھی میرے

پہنچنے سے ایک گھنٹہ پہلے باغیوں نے ایک گھات لگا کر ان کے کرنل مظہر قیوم کو شہید کر دیا تھا۔ اس پلٹن کا پھیلاؤ ایسا تھا کہ ندی نالوں میں سے کشتیوں پر سوار ہو کر پلٹن والے آگے والی کمپنیوں کے ساتھ رابطہ بھی رکھتے تھے اور ان کو رسد و رسانی بھی پہنچاتے تھے کہ آدھی سے زیادہ زمین زیرآب تھی۔ کرنل قیوم ایک چوکی کا ملاحظہ کر کے واپس آ رہے تھے۔ اپنے بٹالین ہیڈکوارٹر کے نزدیک پہنچے تو دوسری کشتی پر سوار حفاظتی دستے کو چوکی کی طرف واپس کر دیا۔ یہاں ہی بنگالی باغیوں نے جو زمین کے چپہ چپہ سے واقف تھے۔ گھات لگائی ہوئی تھی اور کرنل قیوم پر فائر کر کے ان کو شہید کیا اور پھر ساتھ والے جنگل میں غائب ہو گئے۔ یہ تھے حالات کہ یہ فرنٹیئر فورس پلٹن اور ساتھ بلوچ پلٹن۔ ایک ایسے علاقے کا دفاع کر رہے تھے' جو آدھا پانی تھا اور آدھی خشک زمین۔ جس میں جنگلات بھی تھے۔ میں نے فرنٹیر فورس پلٹن کے ساتھ بہت تھوڑا وقت گزارا۔ دوپہر کے کھانے کی رسم پوری کی کوئی چیز گلے کے نیچے نہ جاتی تھی اور فیصلہ کیا کہ میں وہ دن اور رات بلوچ پلٹن کے ساتھ گزاروں گا اور ان کی دلجوئی کروں گا۔ پلٹن کا سیکنڈ ان کمانڈ میجر اصغر میرا پرانا رفیق تھا۔ وہ کومیلہ ہسپتال میں بیمار تھا اور داخل تھا۔ لیکن یہ دردناک خبر سن کر مجھ سے کوئی پانچ منٹ پہلے وہ بھی پلٹن میں پہنچ گیا کہ ان کا بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیر منظور عاطف ڈھاکہ کسی کانفرنس کے لئے گیا ہوا تھا تو اور ساتھی چند یونٹوں کے افسران بھی ان کی دلجوئی کے لئے پہنچ گئے اور مجھے اور لوگوں سے ملنے کا بھی موقع مل گیا۔ جہاں صورت حال اور معاملات کو حل کرنے کے سلسلہ میں بہت باتیں ہوئیں حالات سدھرتے نظر نہیں آتے۔ اب قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ دو پلٹنیں کتنے تناؤ میں آدھی خشکی اور آدھی ندی نالوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔

صبح سویرے ہی یہ عاجز کومیلہ چھاؤنی کی طرف ایک اور حفاظتی گاڑی کے ساتھ روانہ ہو گیا اور پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ وہاں کا بریگیڈ کمانڈر منظور عاطف جو ہاکی کا مشہور کھلاڑی ہے وہ ڈھاکہ گیا ہوا تھا۔ بریگیڈ میجر خالد لطیف مغل نے مجھے خوش آمدید کہا۔ جس کے ساتھ یہ چند گھنٹوں کی رفاقت ایک لازوال دوستی کی بنیاد بنی کہ وہ بعد میں فوج سے لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ وہ بھی اسلامی فلسفہ حیات اور اسلام کی عسکری تاریخ کے طالب علم تھے اور غائبانہ طور پر میری ''تحریروں'' کی وجہ سے مجھے جانتے تھے۔ ان کے ساتھ بھی بہت باتیں ہوئیں اور کومیلہ میں مجھے میرے ایک اور رفیق کرنل محمد اکرم کی تلاش تھی جو فرنٹیئر کور کی ایک یونٹ لے کر وہاں پہنچے ہوئے تھے اور اس علاقے میں فوج کو مدد کر رہے تھے۔ ان کو میں نے اپنے کومیلہ پہنچنے کا وقت اور مختصر قیام کی خبر بھیجی ہوئی تھی۔ تو وہ میری تلاش میں تھے اور ان کی تلاش میں مجھے ساری کومیلہ چھاؤنی کا چکر لگانا پڑ گیا اور آخر ملاقات ہو گئی اور ساری کومیلہ چھاؤنی کو دیکھنے میں میرے لئے بہت تحقیق تھی کہ میری اس چھاؤنی اور علاقے کے ساتھ بڑی یادیں وابستہ تھیں۔ 1944ء سے 1946ء تک اس چھاؤنی میں یہ عاجز اکثر قیام کرتا رہا جب یہ جگہ چودھویں انڈین آرمی کے جنرل (بعد میں فیلڈ مارشل) سر ولیم سلیم کا مرکز تھی۔ ان زمانوں میں کومیلہ چھاؤنی میں بجلی نہ تھی اور دو مسلمان لڑکے ہاتھوں سے ایک رسی کھینچ کر دفتروں کو ''جھولا'' دیتے تھے۔ اگست 1944ء میں جب میں پہلی دفعہ وہاں گیا تو ماہ رمضان تھا اور میں روزہ سے تھا۔ ایک بچہ کے ہاتھ مجھے دفتر والوں نے چائے بھیجی جو میں نے واپس کر دی تو ان بنگالی مسلمان لڑکوں کے دل میں میرے لئے وہ محبت عود کر آئی کہ میں ان کے لئے

''پیر و مرشد'' بن گیا اور جب میں وہاں سے گزرتا تھا تو یہ لڑکے مجھے بڑی ہی محبت و پیار سے ملتے تھے۔ لیکن اب ماحول تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ ''محبتیں'' اب ''دوری'' میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد 52-1951ء میں اس چھاؤنی کو بنتے یا اس کی بسم اللہ ہوتی میں نے دیکھی' جب میں اپنی پلٹن 7 پنجاب کے ساتھ وہاں تعینات تھا۔ میں تبدیلی دیکھ کر حیران ہو گیا کہ جھونپڑیوں' شیڈوں کی جگہ اب خوشنما عمارتیں اور خوبصورت سڑکیں تھیں۔ پاکستان کے 24 سالوں کے اس علاقے کے زمانے کے لئے بعد کے مورخین سنہری زمانہ گردانیں گے۔ آزادی سے پہلے اور 1951ء تک اکثر لوگوں کے پاؤں میں جوتا نہ ہوتا تھا۔ ایک دھوتی پر گزارا ہوتا تھا۔ گلے میں ایک بنیان ہوتی تھی یا گرمیوں میں کچھ لوگوں کے گلے میں کچھ نہ ہوتا تھا۔ صرف ہندو آبادی کے گلے میں سفید قمیض نظر آتی تھی اور باقی اکثر آبادی جھونپڑیوں میں ہوتی تھی۔ سڑکیں برائے نام یا بہت چھوٹی ہوتی تھیں۔ بجلی صرف چند شہروں میں ہوتی تھی۔ کومیلہ چھاؤنی میں کوئی بجلی نہ ہوتی تھی۔ 1952ء سے کچھ جنریٹر چلتے تھے کہ پہلی رات یا سحری کے وقت کچھ بجلی ہوتی تھی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں کوئی ڈیویلپمنٹ نہیں ہوئی تھی یہ سراسر جھوٹ ہے۔ مقابلتاً مشرقی پاکستان میں ڈیویلپمنٹ مغربی پاکستان سے اوسطاً دگنی ہوئی ہوگی۔

بہر حال کومیلہ میں کرنل محمد اکرم اور میجر خالد لطیف نے میرے کہنے پر دوپہر کے کھانے کا ذرا جلدی بندوبست کر لیا کہ میں اس دن شام تک ''فینی'' پہنچنا چاہتا تھا۔ جہاں میرے عظیم رفیق بریگیڈ محمد اسلم نیازی' نٹور سے آ کر میرا انتظار کر رہے تھے کہ وہ راجشاہی کی طرح یہاں بھی لوگوں کا اجتماع کر رہے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ میں اس میں شریک ہو کر حالات کا بہتر مطالعہ کروں۔ ایک حفاظتی دستے کے علاوہ میرا ہم سفر کمانڈو یونٹ کا میجر بلال تھا۔ اسی صاحب نے 25 مارچ 1971ء کو مجیب الرحمٰن کو گرفتار کیا تھا اور کہتا تھا کہ مجھے تو سب ''ڈرامے'' نظر آتے ہیں۔ قوم کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ بنگالیوں اور ہمارے درمیان فاصلے بڑھانے کے لئے یہ جنگ اور لڑائی جاری ہے۔ مجیب الرحمٰن کی گرفتاری کے لئے میجر بلال نے تمام ضروری حفاظتی اقدام اپنائے لیکن وہ کہتا تھا کہ مجیب الرحمٰن یا خاندان کے کسی آدمی نے زبانی یا عملی ''مزاحمت'' نہ کی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب اس گرفتاری سے ''آگاہ'' تھے یا اس کے لئے تیار تھے اور باقیوں کو کیوں نہ گرفتار کیا کہ ان کو ''فرار'' ہونے کا موقع فراہم کیا اور اکیلے مجیب الرحمٰن کو گرفتار کرانے کے ''عمل'' کا مجھ سے ''ڈرامہ'' کیوں کرایا گیا؟ اس گرفتاری سے چند گھنٹے پہلے مجیب الرحمٰن سمیت سب رہنما ایک کانفرنس میں ''مدعو'' تھے' وہاں ہی سب کو گرفتار کر لیا جاتا۔ میجر بلال نے مزید کہا کہ بنگالی یونٹوں کو بغاوت کرنے کا موقع کیوں فراہم کیا گیا اور اتنی کم نفری سے یہ فوجی کارروائی کیوں کی؟ اور جو دو ڈویژن فوج بعد میں لائی گئی اس کو پہلے کیوں نہ منگوایا گیا۔ اگر یہ سب فوجی موجود ہوتے تو بنگالی کبھی بغاوت نہ کرتے۔ بنگالیوں نے ہماری کم نفری دیکھ کر بغاوت کی۔ ہمارے پاس نفری زیادہ ہوتی تو زیادہ اہم تھا کہ پہلے یہ کارروائی کرتے کہ جس بنگالی پلٹن کی بغاوت کا ڈر تھا ان سے ہتھیار لے لئے جاتے تو ہرگز یہ ''تماشہ'' یا ''ڈرامہ'' نہ بنتا۔ جو کچھ مجھے میجر بلال نے بتایا ایسی اکا دکا باتیں یہ عاجز کئی اور لوگوں سے بھی سن چکا تھا۔ یہ حقائق ہیں ان کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ حمود الرحمٰن کمیشن نے دھیلے کا کام نہیں کیا۔ اور یہ عاجز جو کچھ یا جو حقائق اب قوم کے سامنے پیش کر چکا ہے آج تک یہ باتیں قوم کو کسی نے نہیں بتائیں۔ اس لئے قارئین میرے ان مضامین کے سلسلہ

میں میرے اس بیان کو دوبارہ یاد کریں کہ میں نے جنرل نیازی اور جنرل رحیم کو کیا بتایا تھا۔ جن سے ان مضامین کی بسم اللہ کی گئی کہ "سازش جاری ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگ جانتے ہوئے اور کچھ بن جانے سازشیوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں"۔ اب اتنا کچھ بتانے کے بعد مزید اضافہ کروں گا کہ سازش کے "علم" رکھنے والوں میں بھی کئی اقسام کے لوگ تھے۔ جن میں سے کچھ سازش کی "کڑیاں" تھے' کچھ کو بے وقوف بنایا گیا کہ مشرقی پاکستان کو "لات مارنا" ضروری ہے۔ ہم اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ کچھ بے وقعت لوگ ہوتے ہیں اور حاکم کا ہر حکم ماننے کو تیار ہوتے ہیں اور ہر چڑھتے سورج کی پرستش کرتے ہیں۔ اس لئے یہ عاجز ابھی سے صاف طور پر جنرل یحییٰ خان ذوالفقار بھٹو' مجیب الرحمٰن اور جنرل پیرزادہ کو تو سازش کی "کڑیاں" قرار دے گا لیکن جنرل عبدالحمید اس کے حواری اور جنرل گل حسن بھی مشرقی پاکستان کو "لات مارنے" والوں میں ضرور شامل ہیں۔ امیر عبداللہ نیازی کو شاید "بے وقوف" بنایا گیا۔ کاش! حمود الرحمٰن کمیشن والے میری درخواست مان کر میرے بیانات اور سوچ کے مطابق اگر انکوائری کرتے تو سچ تلاش کیا جا سکتا تھا اور اب بھی وقت ہے کہ سچ تلاش کریں تو سچ بولنے والے کم لوگ ہی زندہ ہوں گے کہ میجر بلال نومبر 71ء میں شہید ہو گئے تھے۔

سورج غروب ہونے سے تھوڑا پہلے ہم فینی پہنچ گئے۔ جہاں سے بھارتی سرحد بہت نزدیک ہے اور بھارت والوں کی توپوں کے گولوں کے پھٹنے کی آواز آ رہی تھی کہ وہ ہماری شاہراہ یا سڑک پر اکا دکا فائر جاری رکھتے ہیں۔ یہاں حالات جیسور اور کشتیہ کے مقابلہ میں ایک لحاظ سے زیادہ خراب تھے کہ وہاں سڑکیں سرحد پر عموداً طور پر ملتی تھیں۔ لیکن یہاں سڑک سرحد کی لائن کی متوازی تھی اور بھارتی گاڑیوں کو دیکھ کر فائر گرانے کی کوشش کرتے تھے۔ جس سے کئی دفعہ نقصان بھی ہو جاتا تھا۔ یا اپنے "کاؤنٹر" فائر سے بھارتیوں کو "خاموش" کرنا پڑتا تھا۔ مجھے بریگیڈیئر محمد اسلم کے پاس دو تین دن ٹھہرنا پڑ گیا۔ کہ میرے پہنچنے کے بعد بریگیڈیئر صاحب نے لوگوں کو اکٹھا کرنے کی تاریخ دی۔ لوگ تو جوق در جوق اکٹھے ہو گئے اور نعرہ تکبیر اور پاکستان زندہ باد کی صدائیں بھی سنیں لیکن لوگ ہمارے ساتھ نہ تھے۔ مخلص لوگوں کی تعداد کم تھی۔ زیادہ تر "وقتی" لوگ اس اجتماع میں شریک ہوئے۔ ایک ڈیڑھ ماہ پہلے جو کچھ راجشاہی میں اس عاجز نے اچھے تصورات لئے تھے' وہ بھی معدوم ہونے لگے تھے کہ مجیب اگرتلہ سازش کے سلسلہ میں مغربی پاکستان ہی میں قید تھا۔ اب کہا جاتا تھا کہ "پنجابی" ان کے لیڈر کو قید کر کے مغربی پاکستان کیوں لے گئے ہیں؟ اور مجیب الرحمٰن پر کیا مقدمہ چلایا جائے گا؟ اس نے کیا قصور کیا ہے؟ اب میرے لئے آخری مقام چٹا گانگ باقی رہ گیا تھا۔ جس جگہ کے واقعات کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا۔ چٹا گانگ کے لوگ مقابلتاً اچھے لوگ تھے کہ بندرگاہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ اسلام کی بین الاقوامی وسعت کو سمجھتے تھے اور تنگ نظر یا تنگ دل نہ تھے۔ اتفاقاً چٹا گانگ میں میری ملاقات ایک بہت بڑے محب پاکستان لیڈر چودھری فضل القادر سے ہو گئی جو اسمبلی کے سپیکر تھے اور ایوب خان نے مستعفی ہوتے ہوئے حکومت ان کے حوالے کرنا تھی۔ لیکن ایسے نہ کیا اور یحییٰ خان کو حکومت دے دی۔ یہ صاحب میرے جاننے والے تھے۔ ان کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں۔ وہ کہنے لگے کہ وہ "بے بس" ہو چکے ہیں۔ مجیب الرحمٰن جو ایک غنڈہ تھا۔ وہ بنگلہ "بندھو" بن چکا ہے۔ کوئی "چھپے ہاتھ" ہمیں آپس میں لڑا رہے ہیں اور ایسی خونریزی ہو چکی ہے کہ حالات ٹھیک ہوتے نظر نہیں آتے۔ لیکن وہ خود اول

بھی مسلمان ہے اور آخر بھی مسلمان ہے اور اس کے بعد پاکستانی ہے۔ اور بنگالی اس حد تک ہے کہ وہ مشرقی بنگال
کا باشندہ ہے۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد فضل القادر چودھری اور مولوی فرید احمد جیسے پاکستان کے وفاداروں
شہید کر دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔

چٹا گانگ کے حالات پر اب تفصیلی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ یہاں اچھے لوگوں کے ہوتے ہوئے غنڈ
کی نفری بھی کافی تھی۔ یہاں ہی میجر ضیاء الرحمن نے اپنے افسروں کو شہید کر کے چٹا گانگ ریڈیو پر بھی ایک دف
قبضہ کر لیا تھا اور بغاوت فرو کرنے کیلئے کومیلہ چھاؤنی سے بریگیڈیئر اقبال شفیع اور کرنل شاہ پور کی یونٹ آئی جن
راستے میں رکاوٹیں کھڑا کر دی گئی تھیں اور میجر جنرل محمد حسین انصاری کے اتفاقاً وہاں ہونے سے حالات پر کچھ قا
پایا گیا لیکن چٹا گانگ سے باغیوں کو پوری طرح صاف کرنے میں دیر لگ گئی۔ حیدر آباد دکن کے مہاجر بریگیڈ
منور علی بیگ نے چٹا گانگ کو گھر بنایا ہوا تھا اور بنگالیوں کے ''باپ'' بنے ہوئے تھے۔ ان کے گھر کا بھی محاصرہ
لیا گیا تھا اور وہ کئی دن باغیوں کا مقابلہ کرتے رہے اور بچ گئے تو وہ مشرقی پاکستان کو الوداعی سلام کر کے جا
کراچی میں رہائش پذیر ہوئے۔ بمبئی کے مہاجر کرنل عبداللہ شیخ کو ''پاپا ٹائیگر'' (بنگالیوں کا باوا) کہا جاتا تھا۔ ا
بھی باغیوں نے معاف نہ کیا اور ان کے گھر کا بھی محاصرہ کر لیا اور کافی سامان کو نقصان پہنچایا۔ مشکل سے ان
جان بچی کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والا ایک فوجی دستہ وہاں بروقت پہنچ گیا۔ کرنل شیخ بھی سب کچھ چ
چھاڑ کر کراچی آ گئے تھے۔ راقم اب مزید کیا دیکھتا صرف جناب بایزید بسطامیؒ کی ''بیٹھک'' پر حاضری باقی تھی
ہوائی اڈہ پر جاتے وقت بریگیڈیئر محمد اسلم نیازی کی معیت میں وہاں حاضری دی اور حسب عقیدہ فاتحہ ضرور پڑ
لیکن یہاں بھی حالات دیناج پور کے ''چہل غزہ'' والے تھے۔ تاریخ میں جناب بایزید بسطامیؒ کے اس علاقے
سفر یا آمد کا کوئی ذکر نہیں۔ اس بیٹھک کی وجہ تسمیہ سمجھ نہ آ سکی۔ کیا کوئی روحانی تعلق تھا؟ یہاں کے حالات ''چ
غزہ'' سے بھی مختلف تھے کہ وہاں ''کشف'' کی واردات نہ ہوئی لیکن روحانی تعلقات کے ''اثرات'' تو تھے۔ یہ
کوشش کے باوجود کوئی روحانی رابطہ بھی نہ بندھ سکا۔ اور اُن لوگوں کی بات صحیح نظر آتی کہ یہ کوئی معمولی قسم کا
اور بایزید نامی آدمی تھا۔ کہ وہاں رہائش رکھتا تھا۔ اور لوگوں نے ساتھ لفظ ''بسطامی'' کا اضافہ کر کے اُس جگ
''مقدس'' بنا دیا۔ البتہ مایوسی ضرور چھا گئی کہ شاید پیغام تھا کہ دونوں خطوں کے دنیاوی تعلقات ختم ہیں۔ روحا
ایک مشکل مسئلہ ہے۔ یہ عاجز ''باطن'' کے کسی پہلو پر تب یقین کرتا ہے کہ اس ''باطن'' کے ''ظاہر'' پر بھی عا
اثرات ہوں اور وہ قرآن پاک اور سنت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں۔ اس لئے یہ عاجز ''روحانیت'' کو
''علم'' یا ''سائنس'' کا نام بھی دیتا ہے کہ یہ کچھ عیسائیوں، ہندوؤں، بدھوں اور کئی دوسرے لوگوں کے پاس بھی
ہے لیکن میں جناب جنید بغدادیؒ کے اس قول کا پیروکار ہوں کہ اگر تمہیں کوئی آدمی دیوار پر سوار ہو کر دیوار کو
نظر آئے اور سنت نبویؐ کا تارک ہو تو اس کی جوتیوں سے مرمت کریں کہ وہ شعبدہ باز بھی ہو سکتا تھا۔ موسم
خراب تھا۔ جہاز آنے میں دیر تھی اور برادرم محترم بریگیڈیئر اسلم نیازی مجھے الوداع کر کے اپنے کام پر چلے
تھے۔ جہاز دوپہر کے بعد آیا اور یہ عاجز ایک بہت مشکل سفر کے بعد شام چار پانچ بجے ڈھاکہ پہنچا۔ فضا میں
سا جہاز کئی دفعہ الٹتے الٹتے مشکل سے سیدھا ہوتا تھا۔ شاید اشارہ تھا کہ اب مسلمانوں کیلئے مشرقی پاکستان میں ہچکو

ہی ہچکولے ہیں۔

اب صرف میمن منگہ کا علاقہ رہ گیا تھا جس کا بریگیڈ کمانڈر سعد اللہ مجھے حالات سے آگاہ کر چکا تھا کہ یونٹیں بے حساب پھیلاؤ میں ہیں۔ سب کو دیکھنے کیلئے ہفتہ سے زیادہ عرصہ لگ سکتا ہے۔ البتہ حالات اتنے خراب نہیں۔ یہ پرانے مسلم لیگی لیڈر نورالامین کا علاقہ ہے جو قومی اسمبلی کا ممبر بھی منتخب ہو گیا تھا۔ اس علاقہ میں صرف جادیو کے مقام پر ایک بنگالی پلٹن نے بغاوت کی تھی۔ مغربی پاکستان کے افسروں کو بال بچوں سمیت شہید کیا تھا اور بہاریوں کا قتل عام کیا تھا۔ میں نے ڈھاکہ میں اپنے رفقاء کو ابھی ملنا تھا کہ میرے پاس میمن منگہ جانے کیلئے کوئی وقت باقی نہ رہ گیا تھا۔ ڈھاکہ میں جنرل راؤ فرمان علی سے رابطہ باندھنے کی کوشش کی کہ اس کو بتاؤں کہ کونسے حالات ''نارمل'' ہیں؟ لیکن وہ ''طرح'' دے جاتا تھا۔ البتہ اکتوبر 1971ء میں راولپنڈی میں وہ مجھے میرے کرم فرما میجر جنرل بی ایم مصطفیٰ کے ساتھ مل گیا۔ جہاں وہ کسی کانفرنس کیلئے آیا ہوا تھا تو میں نے اس کو کہہ دیا کہ ''جنرل صاحب! آپ کس کو بیوقوف بنا رہے ہیں؟'' یہ صاحب اگر سازش کی کڑی نہ تھا تو ''لات مارنے'' والوں میں ضرور شامل تھا۔ راقم ڈھاکہ میں اپنے رفقاء بریگیڈیر کے ایم خالد' کرنل محمد اقبال' کرنل قاضی عبدالرشید' کرنل ممتاز ملک اور ایسے بے حساب دوستوں سے ملا لیکن ان دنوں پاکستان کے راستے حکومت پاکستان نے امریکہ اور چین کا رابطہ بندھوا دیا تھا تو اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ پاکستان بین الاقوامی طور پر بہت اونچا چلا گیا تھا۔ اب امریکہ اور چین' پاکستان کو دولخت نہ ہونے دیں گے۔

مجھے امریکہ پر تو کوئی بھروسہ نہ تھا لیکن چین کے بارے میں بھی میرا خیال تھا کہ کسی کو محکوم رکھنے کیلئے چین ہماری مدد نہ کر سکے گا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ خان اور اس کے ٹولہ نے امیر عبداللہ نیازی کو کچھ ایسی تسلی ضرور دی کہ اس نے اپنے ''خاص الخاص'' دوستوں کو ''تسلی'' دی ہوئی تھی۔ میمن منگہ کے علاقے میں بعد میں بریگیڈیر عبدالقادر نیازی آ گیا تھا اور دسمبر 1971ء میں جب بھارتیوں نے میمن منگہ کے علاقے میں بذریعہ پیراشوٹ فوج اتاری تو بریگیڈیر عبدالقادر نے سمجھا کہ چینی ہماری مدد کو پہنچ گئے ہیں اور وہ اکیلا ان کو ''خوش آمدید'' کہنے چلا گیا کہ بھارتی فوجیوں نے اس کو قید کر لیا۔

قارئین! یہ عاجز قوم کو بھول بھلیوں میں نہیں ڈالنا چاہتا ہے لیکن کون کیا ہے؟ اور کیا کچھ ہوا؟ یہ حقائق چھان بین کر کے قوم کے سامنے پیش ہو رہے ہیں اور ''بڑوں'' کی مہربانی کہ مجھ ''چھوٹے سے میجر'' کو اتنی وقعت دیتے تھے لیکن یہ عاجز بھی ایسے ''بڑوں'' کو ملتا تھا جہاں کوئی میری عزت کرتا تھا یا مجھے کوئی ''وقعت'' دیتا تھا۔ شوکت رضا جیسے لوگوں کو میں دور سے سلام کرتا تھا اور ستمبر 65ء کی جنگ میں اپنے دونوں بریگیڈیروں آفتاب احمد اور قیوم شیر کو کھری کھری تو سنا دیں لیکن میں ان کے ''نزدیک'' نہ جاتا تھا۔ یہاں جنرل امیر عبداللہ نیازی کے ہیڈ کوارٹر میں کرنیلوں اور میجروں کے ساتھ تو میں نے بہت باتیں کیں لیکن ان کے بریگیڈیر سٹاف غلام جیلانی کو بھی میں دور سے ''سلام'' کرتا تھا کہ وہ ایک ''وقتی'' آدمی تھا اور ہر چڑھتے سورج کی پرستش کرتا تھا۔ اس سے پہلے بریگیڈیر العدروس اس کام پر تھا جس کے باپ جنرل عدروس نے ستمبر 1948ء میں حیدر آباد دکن میں بھارتیوں کے آگے ہتھیار ڈالے تھے۔ یہ آدمی صاحبزادہ یعقوب اور ایڈمرل احسن کے برابر ذمہ دار تھا کہ اس نے مجیب

الرحمٰن اور شرپسندوں کو کھلی چھٹی دی ہوئی تھی۔ اب جنرل ٹکا خان اور بریگیڈیئر غلام جیلانی آ گئے۔ جنہوں نے یحییٰ خان کے ہر حکم کو بسروچشم تسلیم کیا اور اکیلے مجیب کو گرفتار کرنے اور باقیوں کو فرار ہونے کی غلطی میں یہ دونوں برابر کے شریک ہیں کہ نامکمل تیاری کے ساتھ فوجی کارروائی شروع کی اور بنگالی یونٹوں کو "باغی" ہونے دیا تو جنرل ٹکا خان اور بریگیڈیئر غلام جیلانی اگر سازش کی کڑی نہیں ہیں تو یا ان کو "لات مارنے" والوں میں شمار کرنا ہوگا یا کہ غلط کام میں "حصہ دار" بنے۔ یہی بریگیڈیئر غلام جیلانی دو ماہ کے بعد میجر جنرل بن کر ISI کا سربراہ بن گیا۔ اس کو غلام اسحٰق ثانی بھی کہہ سکتے ہیں کہ یحییٰ خان کا بھی منظور نظر تھا اور بھٹو کے سارے زمانے میں اس کا منظور نظر رہا اور ضیاء الحق کے ساتھ بھی ملا ہوا تھا کہ ضیاء الحق نے اس کو ترقی دیکر دفاعی سیکرٹری بنایا پھر پنجاب کا گورنر۔ نواز شریف اسی کا "چنیدہ" تھا اور پنجاب میں ضیاء الحق کی "باقیات" کا چناؤ بھی اسی ایک آدمی نے کیا اور ایسے ہی لوگ قوم کو غلط راستوں پر لگا کر قوم کا بیڑہ غرق کرتے ہیں، جن کا کوئی اصول نہیں ہوتا۔ 1974ء میں ISI کے کچھ افسران نے قومی ضرورت کے تحت میری کچھ سچی باتوں اور حقائق سے فائدہ اٹھانا چاہا اور یہ حقائق جب اس تک پہنچے تو وہ حیران ہو گیا اور ماتحتوں کے ذریعہ یا "SOURCE" معلوم کیا تو انہوں نے میرا نام لیا جو اس کیلئے RED RAG تھا۔ اس نے ان کو تنبیہ کر دی کہ خبردار اس آدمی کے نزدیک جانا بند کر دو۔ قارئین یہ ہے ہمارا قومی کردار کہ ہم "حقائق" پر پردے ڈال کر زندگی کو فراڈ بنانے پر تلے ہوئے ہیں اور "حق و سچ" والوں سے دور رہتے ہیں۔

جنرل نیازی کو قربانی کا بکرا بنایا گیا

جنرل نیازی کے ساتھ میں اپنی ملاقات کا ذکر اپنے پہلے مضمون میں ایک "ابتدائیہ" کے طور پر کر چکا ہوں۔ اس کے "خلوص" پر مجھے کبھی شک نہ گذرا لیکن اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ ایسے ذلیل اور بے عزتی والے حشر سے دوچار ہوگا۔ اس میں کسی حد تک "سادگی" بھی تھی اور اوپر والوں کے سامنے وہ بھیگی بلی بن جاتا تھا۔ اس کی بہادری میں بھی کوئی شک نہ تھا۔ اپنی تجویز کے تحت وہ بڑی بہادری سے لڑا اور ہمارے مجاہدین نے بڑی بہادری دکھائی لیکن نیازی کو "بیوقوف" بھی بنایا گیا اور قربانی کا بکرا بھی۔ اس کو "سلطان ٹیپو" بننے والی بات میں بھی کوئی فائدہ نظر نہ آیا کہ وہ اپنی بنیادی اور خاندانی اقدار کو "مادیت" میں ڈبو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ امتحان میں نہ ڈالے یہ عاجز "میجر کا میجر" ہی رہا تو سچ بھی بولتا رہا اور جان بھی قربان کرنے کو تیار رہا لیکن اگر میں بھی اپنے باقی ساتھیوں اور ہم عصروں کی طرح جنرل بن جاتا یا ستمبر 65ء کی جنگ میں مجھے بھی بہادری کے کسی تمغہ سے نواز دیا جاتا اور اتنی زیادہ نوکری کی وجہ سے مجھے بھی کچھ زمین بھی مل جاتی اور پلاٹ بھی تو میں بھی مادیت میں گھس کر نمک کی کان میں نمک بن جاتا۔ بقول میرے ایک عزیز اور کرم فرما کموڈور طارق مجید کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سب "آلودگیوں" سے بچایا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو "حجت" بنانا چاہتا تھا کہ قوم کے سامنے سچ پیش کرے اور یہ سچ اور حقائق شائع ہو رہے ہیں کہ وہ ان غداریوں اور کوتاہیوں سے اسباق سیکھ کر قوم کیلئے نشان راہ کے بارے خود بھی سوچیں اور یہ عاجز تمام واقعات کے جائزے پیش کرنے کے بعد۔ اس ضرورت کا "خاکہ" بھی پیش کرے گا کہ ہمارے لئے نشان راہ کیا ہے اور بہت کچھ کتابوں میں لکھ چکا ہوں۔

اب راولپنڈی جانے سے پہلے حسب وعدہ اس عاجز نے جنرل نیازی کو اپنی رپورٹ پیش کرنے کا وعدہ کیا تھا میں اس کو یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی ساری تجاویز غلط ہیں کہ وہ کہتا تمہیں یہ کیسے معلوم ہوئیں کہ بڑی تجاویز ہم جیسے ''چھوٹے لوگوں'' کو نہیں بتائی جاسکتیں۔ نہ میں اس سے پوچھ سکتا تھا کہ اس کی جنگ کرنے کی تجویز کیا ہیں؟ لیکن میں نے معلوم کر لیا تھا کہ جنرل نیازی برما میں جاپانیوں کے حملوں کو روکنے والے طریقے STRONG POINTS مضبوط چھوٹے چھوٹے دفاعی پوزیشنوں میں لڑنے کے طریقہ کو اپنائے ہوئے تھا لیکن اس نے یہ نہ سوچا کہ دشمن بنگالی باغیوں کی مدد سے ان پوزیشنوں کے درمیان سے نکل کر ڈھاکہ پہنچ جائے گا اور وہ کسی علاقے کی اہم زمین کا متحدہ دفاع کر کے دشمن کو نقصان نہ پہنچا سکے گا لیکن چونکہ بھارت نے زیادہ فوج مشرقی پاکستان کے گرد ڈال دی تھی تو مغربی پاکستان سے ہم بھارت کیخلاف بہت کچھ کر سکتے تھے اور دہلی وگرد و نواح کو بچانے کیلئے بھارت کو اپنی مشرقی پاکستان کے گرد والی فوجیں ادھر لے جانا پڑیں گی اور وہ مشرقی پاکستان میں کوئی خاص فتوحات حاصل نہ کر سکے گا لیکن نیازی نے اس طرف تو دھیان ہی نہ دیا کہ اگر اس کی فوجیں مشرقی پاکستان میں کسی شکست سے دوچار ہوں تو ان کو کسی کھلے علاقے میں ''فورٹریس'' یعنی حصار بنا کر کئی مہینے جنگ جاری رکھنے کی تجویز بنانا چاہئیں اور ایسا ایک ''فورٹریس'' دفاعی حصار راجشاہی میں بن سکتا تھا جس کے بارے جنرل نذر حسین شاہ نے سوچا ہوا تھا اور میرے ساتھ بات بھی کی تھی لیکن بہترین ''فورٹریس'' دفاعی حصار چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے میں بن سکتا تھا جہاں کئی مہینے لڑنے کے بعد برما میں ''بچاؤ'' کیلئے بھی جا سکتے تھے اور مرنے لڑنے والے کبھی نہیں مرتے۔ بھارت والے لمبی لڑائی لڑنے کی ہمت اور طاقت نہ رکھتے تھے اور ہم ''سلطان ٹیپو'' بن کر عزت بھی بچا سکتے تھے کہ مشرقی پاکستان والوں کی قربانی سے اثرات لے کر مغربی پاکستان والے بھی لڑنے مارنے کو تیار ہو جاتے تو ہم دہلی کے گردونواح میں بھی پہنچ جاتے اور کشمیر کا رابطہ بھی بھارت کے ساتھ کاٹ سکتے تھے لیکن یہ عاجز گذارش کر چکا ہے کہ اس عاجز نے پچاس سالوں میں پاکستان کی فوج میں چار پانچ صاحبان دیکھے جو کرنل سے اوپر سطح کی لڑائی یا قومی جنگ کو کچھ سمجھتے تھے۔ جن میں جنرل اکبر طارق، جنرل فضل مقیم، بریگیڈئر نوشیروان، بریگیڈئر صدیق ستی اور کرنل شیر محمد کو شامل کیا جا سکتا تھا۔ باقی سب صرف مکھی پر مکھی مارنے والے تھے اور اس چھوٹے سے میجر کی باتیں ان کے سروں کے اوپر سے گذر جاتی تھیں یا مجھے پاگل کہا جاتا تھا۔ جنگی مشقوں کی ''پوسٹ مارٹموں'' سے مجھے دور رکھا جاتا کہ میں کھری کھری سناتا۔ اپنے سمیت سب کا ''کچا چٹھا'' کھول کر رکھ دیتا تھا۔ تو میں نے 'محتاط' انداز اپنا کر باتیں کرنا شروع کیا ہوا تھا۔ چنانچہ جنرل نیازی کے پاس جا کر کسی بحث میں پڑنے کی بجائے میں نے ان کو سیدھے طور پر بتا دیا کہ حالات بہت خراب ہیں۔ وہ لوگ حالات کو صحیح طرح جانچ نہیں رہے، یعنی Comprehend نہیں کر رہے۔ وہ کچھ سوچیں اور اس طرح میں چاہتا تھا کہ جنرل نیازی کو کہوں کہ وہ عزت بچانے والے پہلو کو بھی سوچیں اور میں اس کو تفصیل لکھ کر دینے کو تیار تھا۔

لیکن جیسے پہلے گذارش ہو چکی ہے میجر جنرل رحیم نے غلط وقت اندر آ کر رنگ میں بھنگ ڈال دی کہ مجھے لہجہ تبدیل کرنا پڑا اور الفاظ کو تبدیل کیا۔ جنرل رحیم بات کو کچھ سمجھ تو گیا اور اس کو میں نے اشارہ بھی کیا اور جنرل رحیم کچھ دیر جانے کو تیار ہو گیا لیکن جنرل نیازی مجھے اپنا شاگرد سمجھتے تھے مجھے کچھ ''وقعت'' دینے کو تیار نہ تھا۔

علاوہ ازیں اس کو مغرب میں ہماری کامیابی کا یقین دلایا گیا تھا اور اس کو امریکہ اور چین کی امداد کا یقین بھی دلایا گیا تھا۔ وہ بڑے ''بھروسے'' میں تھا تو اس عاجز نے گذارش کی کہ جنرل رحیم نے کوئی ضروری بات کرنا ہوگی اس لئے میں جاتا ہوں۔ میں دو دن اور یہاں ہوں اگر آپ کے پاس وقت ہو تو مجھے بلا لینا۔ میں علیحدگی میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ فوج کو قربانی کا بکرا بنایا جا رہا ہے اور یہ کچھ نورالامین نے ہمیں 1969 میں بتا دیا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ اگر میری باتیں سن لیں تو بہتر ہوگا کہ یہ عاجز صرف یہ گذارش کرے گا کہ عزت کیسے بچائی جائے؟ لیکن جنرل نیازی نے کچھ جواب نہ دیا۔ دوسرے دن میں جنرل رحیم کو ملا اور اس کو بھی یہی گذارش کی کہ میں ان کی موجودگی میں جنرل نیازی کو کھری کھری نہ سنا سکتا تھا۔ اس لئے علیحدگی میں باتیں کرنے کی گذارش کی تھی اور اب آپ کو صاف بتاتا ہوں کہ آپ لوگوں نے آنیوالے المیہ کے بارے کچھ بھی نہیں سوچا۔ آپ لوگ ایک ''لاحاصل مشق'' میں مصروف ہیں اور مزید ایک بریگیڈ مل جائے تو وہ مشرقی پاکستان کا دفاع کر لیں گے اور نومبر 1971ء میں دو مزید پلٹنوں کو بھی ''ڈوبتی کشتی'' میں ڈال دیا گیا۔ تیسری پلٹن اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر جنگ شروع ہو جانے کی وجہ سے رک گئے۔ کتنی کم علمی اور نا اہلی تھی کہ حالات کو نہ بھانپا جا سکا۔ دو مزید ڈویژن بھی کچھ نہ کر سکتے۔ بنگالی ہمارے ساتھ نہ تھے۔

راولپنڈی پہنچ کر میں نے کرنل شیر محمد (کشمیر کی جنگ کا کرنل خالد) کے ساتھ کئی گھنٹوں کی لمبی ملاقاتیں کیں اور ان کو حالات سے آگاہ کیا۔ ان کا لڑکا میجر خالد بھی مشرقی پاکستان میں تھا۔ اس سے بھی دو دفعہ ملاقات کی تھی اور کرنل صاحب کیلئے واقعات اور اپنا تجزیہ پیش کیا۔ انہوں نے سو فیصد میری سوچ کے ساتھ اتفاق کیا لیکن لمبی چوڑی رپورٹ لکھنے کی بجائے میں نے جنرل گل حسن سے ملاقات کا فیصلہ کیا اور ان کو بتایا کہ مشرقی پاکستان میں ہم دس دن سے زیادہ عرصہ لڑائی نہیں لڑ سکتے اور میں نے جو اپنے مسودہ میں جو پہلے جنرل صاحب کو دے چکا تھا صرف سات دن کی لڑائی کی بات کی تھی۔ یہ کچھ اب عملی طور پر میرے سامنے آ گیا ہے۔ مشرقی پاکستان کے مجاہدین صرف ''سلطان ٹیپو'' بن کر قوم کی عزت بچا سکتے ہیں۔ کیا آپ لوگ مغرب میں ان کی اس ''قربانی'' کا فائدہ اٹھانے کی تجویز بنا چکے ہیں؟ تو جنرل گل حسن نے کہا کہ ان کے سلطان ٹیپو بننے تک نوبت نہ پہنچے گی۔ ہم مغرب میں وہ کچھ کریں گے کہ بھارت والوں کو دہلی کو بچانے کیلئے اپنی فوجیں مشرقی پاکستان کے گردونواح سے واپس بلا کر دہلی کے بچاؤ کیلئے لانا پڑیں گی۔

یحیٰی خان اور ذوالفقار علی بھٹو کی ''مشترکہ قدر'' مشرقی پاکستان میں فوج کی شکست یا ساری فوج کو شکست دلانا تھا تو تب ہی مشرقی پاکستان سے ''چھٹکارا'' حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اگر ویسے یحیٰی خان مشرقی پاکستان مجیب الرحمٰن کے حوالے کر دیتا یا اس کو کنٹرول نہ کرنے کے قابل ہونے کا اعلان کر دیتا تو مغربی پاکستان کے لوگ بگڑ جاتے یا کہتے کہ پورا ملک مجیب الرحمٰن کے حوالے کرو کہ وہ اکثریت کا رہنما ہے۔ چنانچہ جنرل گل حسن نے مجھے جس مغربی پاکستان سے بھرپور کارروائی کی ''خوشخبری'' سنائی تھی وہ کامیاب ہو سکتی تھی لیکن یحیٰی خان زمان و مکان کو غلط استعمال کر کے مغربی پاکستان سے کارروائی کو لاحاصل مشق بنا دینا چاہتا تھا اور جنگیں زمان و مکان کے صحیح استعمال سے لڑی جاتی ہیں کہ بغیر وقت کی اچھی تدبیراتی اور تکنیکی تجویز بھی مقاصد حاصل نہیں کر سکتی۔ جنرل گل

حسن اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ مغربی پاکستان سے بھرپور کارروائی جنرل ٹکا خان کی کور نے کرنا تھی۔ جس کے ماتحت پہلا بکتر بند اور دو پیدل ڈویژن فوج تھی۔ جنہوں نے بھٹنڈہ والے راستے دہلی کے گردونواح میں پہنچ جانا تھا اور یہ صحیح تجویز تھی۔ جنرل گل حسن کہتا ہے کہ ہم نے تجویز بنائی تھی کہ لڑائی کے شروع ہوتے ہی یہ کارروائی عمل پذیر ہو جائے لیکن یحییٰ خان نے کہا کہ نہیں باقی مقامات پر سے جو جارحانہ کارروائیاں کریں گے ان کی کامیابی کے بعد یحییٰ خان اس بھرپور کارروائی کے وقت کا فیصلہ دیں گے۔ اب ہم آگے واضح کریں گے کہ باقی مقامات سے جارحانہ کارروائیاں اتنی محدود سطح پر کی جا رہی تھیں کہ انہوں نے خاک کامیاب ہونا تھا۔ اتنے میں مشرقی پاکستان میں تو ہم شکست سے دوچار ہو گئے اور یہ بھرپور کارروائی ہم نے کی ہی نہ اور میں آگے سب جارحانہ حملوں کو شیرو شکر کروں گا۔ کہ یحییٰ خان کی یہ سوچ بالکل غلط تھی بہرحال جنرل گل حسن کے بھٹو کے ساتھ ''تعلقات'' تھے اور یحییٰ خان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ائر مارشل رحیم اصغر خان کا ''آدمی'' ہے اور ان ہی چھپے ہاتھوں کی ''پیداوار'' ہے جن کا اصغر خان ہے۔ تو یحییٰ خان نے ذوالفقار بھٹو' ائر مارشل رحیم اور جنرل گل حسن کو اکٹھا چین بھیج دیا کہ معلوم کریں کہ ہم جس صورت حال سے دوچار ہیں اور بھارت' ہمارے باغیوں کو مدد پہنچا رہا ہے۔ چین اس سلسلہ میں ہماری کیا مدد کر سکتا ہے۔ چین والوں نے ایک طرح سے ہر مدد کرنے کی ''معذرت'' کر دی کہ ہم اپنے سیاسی معاملات کو بات چیت سے حل کریں اور بھارت کو دخل اندازی کا موقع نہ دیں اور واپسی پر بھٹو نے کہہ دیا کہ ہم کسی مدد کی امید نہ کریں تو کچھ اخباری نمائندوں نے سوال کیا کہ پھر ہم کیا کریں گے؟ تو بھٹو نے جواب دیا ''دما دم مست قلندر'' اس کی بلا سے مشرقی پاکستان جاتا ہے تو جائے وہ تو فوج کو بھی ذلیل کرانا چاہتا تھا اور خود مشرقی پاکستان جا کر ''ڈبل ہوسٹیج'' نہیں بننا چاہتا تھا۔ وہ تو اس سازش کا سرغنہ تھا' جن کے سامنے مقصد ہماری فوج کو ''ڈبل ہوسٹیج'' بنانا تھا اور ان کیلئے بھارت میں قیدی کیمپ تیار ہو چکے تھے۔ تاریں اور باڑھیں لگائی جا رہی تھیں۔ یحییٰ خان کے سامنے مقصد یہ تھا کہ ذوالفقار بھٹو' ائر مارشل رحیم اور جنرل گل حسن کو ''رام'' کر لے کہ مشرقی پاکستان کو ''لات'' مارنا ضروری ہے اور ایسا فوجی شکست سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس ''جنگ'' میں سب ''ننگے'' ہیں گو بھٹو' ائر مارشل رحیم' جنرل گل حسن اپنی خود غرضیوں کیلئے یحییٰ خان کی کھیل کھیلتے رہے اور سب نے مل کر قوم کو ذلت سے دوچار کیا۔

یحییٰ خان اس سے پہلے اپنے سایہ ''جنرل عبدالحمید اور اس کے گروہ جنرل غلام عمر اور جنرل خداداد' جنرل ابوبکر مٹھا وغیرہ کو یہی کچھ ''باور'' کرا چکا تھا کہ دونوں خطے اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ مشرقی پاکستان کو ''لات'' مارنا ہو گی اور ایسا مشرقی پاکستان میں فوجی شکست سے ہو سکتا ہے اور ہم مغربی محاذ سے جارحانہ کارروائیاں کر کے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اب یحییٰ خان نے ان کو یہ تو نہ بتانا تھا کہ مغربی محاذ سے بھی جارحانہ کارروائی کو وہ ''لاحاصل مشق'' بنا دیگا اور اس گروہ کو یحییٰ خان نے باور کرایا ہوا تھا ''کہ میرے 'جانشین' تم لوگ ہی ہو'' اور بھٹو کے ساتھ وعدہ کیا ہوا تھا کہ وہ اس کو وزیر اعظم بنائے گا اور بھٹو نے ایک طرف جنرل گل حسن کے ساتھ وعدہ کیا ہوا تھا کہ اس کو بری فوج کا سربراہ بنائے گا اور دوسری طرف جنرل پیرزادہ کے ساتھ بھی ایسا وعدہ کیا ہوا تھا۔ جب خواہشات اور خود غرضی کی یہ حالت ہو تو سقوط مشرقی پاکستان نے ہونا تھا بلکہ اس کی راہ نکالی گئی۔ اب جنگ کن

تجاویز کے ساتھ لڑی جائے گی ہمیں کون بتاتا کہ ملٹری آپریشن ڈائریکٹریٹ میں بھی صرف چند افسران ایسی باتوں سے آگاہ ہوتے ہیں یا کارروائی کرنے والے ڈویژن کمانڈر یا بریگیڈ کمانڈر ان ''اعمال'' یا ''تجاویز'' سے آگاہ ہوتے ہیں جو انہوں نے بجا لانے ہوتے ہیں لیکن میری عمر اور زیادہ نوکری کی وجہ سے کچھ رفیق ایسی باتیں میرے ساتھ مشورہ کیلئے مجھے تجاویز سے آگاہ کر دیتے تھے۔ مثلاً میرے رفیق میجر جنرل بی ایم مصطفیٰ مرحوم نے جب مجھے آگاہ کیا کہ وہ سندھ کا دفاع صرف ایک بریگیڈ سے کریں گے باقی دو بریگیڈوں سے رحیم یار خان آ کر جیسلمیر کی طرف جارحانہ کارروائی کریں گے کہ یہ جارحانہ کارروائی ایک قسم کا صوبہ سندھ کا بالواسطہ دفاع بھی ہوگا۔ تو اس عاجز نے گذارش کی کہ یہ ''لال بجھکڑ'' والی تجویز ہے۔ اگر یہ جارحانہ عمل ریگستان میں رک گیا تو یہ دونوں بریگیڈ نہ ادھر کے رہیں گے نہ ادھر کے اور پھر اس کارروائی کیلئے فضائی برتری کی لگاتار ضرورت ہوگی جو ہمارے پاس موجود نہیں۔ جنرل بی ایم مصطفیٰ نے میری باتیں غور سے سنیں اور اوپر والوں کو سمجھایا کہ اس تجویز میں بڑے خطرے ہیں اور آخر جیسلمیر کو فتح کر کے ہم کیا حاصل کریں گے اور تزویراتی طور پر کیا حاصل کریں گے لیکن اوپر والی قیادت کہتی تھی کہ یہ ہمارے بڑے حملے کی ''مدد'' کیلئے ایک ''انحرافی'' کارروائی بھی ہوگی کہ دشمن کو دھوکے میں بھی رکھیں گے کہ اس پر ہمارے مقاصد واضح نہ ہوں گے کہ ہم کس رخ پر کامیابیاں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے اوپر والوں کی یہ سوچ بھی بڑی ''بوگس'' تھی کہ دشمن بری افواج کو تو زیادہ تر مشرقی پنجاب میں ہی رکھے گا اور فضائی برتری کی وجہ سے وہ فضائی فوج کا رخ کسی بھی خطرے کی طرف چند لمحوں میں موڑ سکتا تھا۔

دوسری جاہلانہ تجویز کی خبر میرے بہت پیارے اور عزیز دوست بریگیڈئر شیر علی باز مرحوم کے ذریعہ سے معلوم ہوئی کہ سیالکوٹ میں اس کے بریگیڈ کو اپنے علاقے میں کچھ پیچھے ''پسپا'' کیا جائے گا کہ دشمن ان کا ''پیچھا'' کر کے ہمارے علاقے میں آئے تو ہم دشمن کو وہاں تہس نہس کر دیں گے اور کیا حاصل کریں گے اس کا عزیزم شیر علی باز کو اوپر والوں نے کوئی فائدہ بھی نہ بتایا سوائے دشمن کے جانی نقصان کے اور دشمن اپنی مضبوط پوزیشنوں کو بھلا چھوڑ کر، چھاتی نکال کر ہمارے سامنے کیسے آئے گا کہ ''آ بیل مجھے مار۔'' اس جاہلانہ سوچ پر اپنا سر پیٹا کہ یہ عاجز سیالکوٹ کے اردگرد کی زمین کا بہت مطالعہ کر چکا تھا اور اب جو بھرپور مضامین لکھ چکا ہوں کہ اکبر خان طارق کہا کرتے تھے کہ سیالکوٹ سے جموں کی طرف کوئی کارروائی کر کے ''جموں کو ہم نے چھوڑ دیا جموں نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔''

ستمبر 65ء کی جنگ کے سلسلہ میں یہ عاجز گذارش کر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس معجزہ سے سیالکوٹ کو بچایا۔ ورنہ ہم نے سیالکوٹ کا بڑا کمزور دفاع کیا ہوا تھا اور جارحانہ کارروائی کی ضرورت سیالکوٹ محاذ پر ہے کہ پٹھانکوٹ سے جموں تک کسی بھی کمزور مقام یا دفاع کو بھرپور کارروائی سے ''چیرا پھاڑا'' جا سکتا ہے اور کشمیر میں بھارت کی فوجوں کی مین سپلائی کو اپنے اندر ''کھینچ'' کر تہس نہس کرنے کی بجائے دشمن کو اس کے اپنے علاقے میں جتنا جا کر برباد کیا جائے تو دو فائدے تھے دشمن بھی برباد ہوگا اور زمین بھی ''حاصل'' ہوگی۔

لیکن عزیزم شیر علی باز اپنے اوپر والے قادیانی میجر جنرل عبدالعلی ملک کے ساتھ ایسی بحث کرنے کے قابل نہ تھے اور نہ میں نے ان کو ایسا مشورہ دیا کہ یہ عاجز عبدالعلی کے میجر کے طور پر 1948ء میں کشمیر کے جہاد

کے وقت ''ریچھ'' اور ''فیڈک'' پہاڑیوں سے ''فرار'' ہونے کی غداری قوم کے سامنے پیش کر چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ بھی ایک ''غداری'' تھی۔ تجویز عبدالعلی کی ہوگی اور یحییٰ خان کے مقاصد کے مطابق یہ ''مطابقت'' والا عمل تھا۔ اور عبدالعلی نے ستمبر 65 میں بھی غلط مشورے دیئے جن کا ذکر یہ عاجز کر چکا ہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ سیالکوٹ کی طرف سے نہ 1948ء نہ 1965ء میں کوئی پیش قدمی کی گئی کہ ضلع گورداسپور کی تحصیل بٹالہ میں قادیانی غلام کذاب کی قبر کے علاقے کو بچایا جاتا ہے کہ وہاں پہنچ کر کوئی منچلا مسلمان مرزا غلام کذاب کی قبر کو کھود کر اس جگہ کو بارود سے اڑا نہ دے۔ اس لئے 1971ء میں بھی سیالکوٹ کی طرف سے پیش قدمی کی کوئی تجویز نہ بنائی گئی اور میں آگے چل کر واضح کروں گا کہ لاہور' سیالکوٹ کے علاقوں میں ہماری پیدل فوج کے چار ڈویژن اور ایک بکتر بند ڈویژن امرتسر اور گورداسپور کے علاقوں کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتے تھے۔ البتہ قارئین یہ ضرور نوٹ کریں کہ گورداسپور کا ضلع جو پاکستان کو نہ دیا اس میں قادیان کی ''حفاظت'' کو بھی مدنظر رکھا گیا تھا۔ ڈائریکٹر ملٹری آپریشنز بریگیڈیئر ریاض مرحوم تھے جو بعد میں میجر جنرل کے عہدے پر ہوتے 1979ء میں وفات پا گئے۔ بہت سادہ اور شریف النفس انسان تھے اور میرے دوست تھے اور مجھے ''لالہ'' کہتے تھے۔ میرے ساتھ ملاقات میں اس عاجز نے ان کو بڑے حوصلے میں پایا اور جو کچھ مجھے جنرل گل حسن نے بتایا تھا اس کی انہوں نے بڑی سادگی سے وضاحت کی کہ ہم جگہ جگہ سے جارحیت والی کاروائیاں کریں گے اور جہاں زیادہ کامیابی ہوئی اس کو زیادہ پیش رفت بھی دیں گے اور اس کے بعد اپنی بھرپور کارروائی سے بھارت کو سبق سکھلا دیں گے۔ اس عاجز نے ان کو گذارش کی کہ یہ سوچ صحیح نہیں جگہ جگہ جارحیت کیلئے اپنی طاقت کو منتشر مت کرو اور بھرپور کارروائی کو باقی معمولی جارحیت کی کارروائیوں کے تابع نہ کریں۔ اسرائیلیوں کی طرح پہلے بھرپور کارروائی کریں اور باقی جارحیت کی کاروائیاں خاص کر سیالکوٹ محاذ یا لاہور محاذ سے تھوڑا بعد میں کریں' جو اس بھرپور کاروائی کی ''مدد'' میں ہوں گی۔ دور دراز کی جارحانہ کاروائیاں بڑی ''مقامی'' اور وقتی ہوتی ہیں لیکن قارئین سازش گہری تھی۔ جب جنگ شروع ہوئی تو ہمیں کچھ اور تجاویز اور عمل معلوم ہوئے تو میں نے سر پیٹ لیا کہ سب کچھ غلط طریقے سے ہو رہا ہے۔ میں تو بیان کر چکا ہوں کہ یحییٰ خان' مغربی پاکستان سے جارحانہ کارروائی کے ''ڈرامے'' کر رہا تھا وہ مغرب میں کچھ بھی حاصل نہ کرنا چاہتا تھا۔

اب کون اور لوگ سازش کی ''کڑیاں'' تھے یا مشرقی پاکستان کو ''لات'' مارنے کو ایک قومی ضرورت سمجھتے تھے ان میں جنرل عبدالحمید ان کے حواریوں' جنرل گل حسن اور ائر مارشل رحیم وغیرہ سب کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

بہتر حکمت عملی اختیار کی جاتی تو 71 کی جنگ بھی کامیابی سے لڑی جا سکتی تھی

البتہ جنرل بی ایم مصطفیٰ یا جنرل ٹکا خان یا باقی فیلڈ کمانڈر یا چھوٹی سطح پر بریگیڈیئر شیر علی باز وغیرہ کے بارے یہ عاجز جانتا ہے کہ یہ مخلص لوگ تھے اور اوپر والوں کے احکام مان رہے تھے۔ فوج میں ہر آدمی اپنی مرضی نہیں کر سکتا۔ مرکز کا حکم ماننا پڑتا ہے اور اختلاف کی صورت میں آدمی مستعفی ہو سکتا ہے۔ لیکن عمل کے احکام ملنے سے پہلے۔ اگر حمود الرحمٰن کمیشن میری گزارشات کو تسلیم کر لیتا اور ان گزارشات کی مدد سے متعلقہ ''ایکٹروں'' سے مجھے سوالات پوچھنے کی بھی اجازت ہوتی تو یہ عاجز سب اوپر والی لیڈرشپ کے علاوہ نیچے والوں میں سے بھی میجر

جنرل راؤ فرمان، میجر جنرل شوکت رضا یا لیفٹیننٹ جنرل ارشاد کافی لوگوں کا کچا چٹھا کھلوا دیتا، لیکن بدقسمتی سے کمیشن کے لئے "مشاورت" کا کام ایک "کاغذی" جنرل الطاف قادر کر رہا تھا۔ نہ وہ کسی "ایکٹر" سے کوئی کام کا سوال پوچھ سکا۔ نہ ججوں کو کوئی صحیح مشورہ دے سکا، تو اس لئے قوم کو دسمبر 1971ء کی جنگ کی ساری صورتحال معلوم نہ ہو سکی اور قوم جنرل نیازی کی کمزوری یا نااہلی یا "غداری" یا جو کچھ کہیں اس سے تو آگاہ ہے۔ لیکن باقیوں کے بارے آگاہ نہیں، اس لئے میں نے باقیوں کی ذمہ داری اور کارکردگی سے کچھ پردے اتار دیئے ہیں۔ اب جنگ کے واقعات کو اختصار سے بیان کروں گا کہ قوم پر مزید حقیقت واضح ہو جائے اور پھر اپنی تجویز دوں گا، کہ یہ جنگ بھی کامیابی کے ساتھ لڑی جا سکتی تھی۔

ستمبر 65 کی جنگ کو اس عاجز نے میدان جنگ میں دیکھا یا خود لڑائی کی اور دسمبر 71 کی جنگ کے دوران اپنے "بڑوں" اور جنگ لڑانے والوں کو دیکھا اور سب کچھ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ جہاں "غداریوں" اور کوتاہیوں کا کوئی حساب نہیں۔ ہم قوم کے طور پر بے حد نااہل، غیر ذمہ دار اور بڑے "وقتی" لوگ ہیں۔ مجھے بالکل حالات سمجھ نہ آ رہے تھے کہ ہم میں سے اکثریت نے یہ عجیب وغریب رویئے کیوں اپنائے ہوئے تھے اور بڑی تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ کچھ "ڈرامے" تھے۔ کچھ خود غرضیاں تھیں اور کچھ "گزارا" کر رہے تھے۔ کہ ہماری جنگ لڑنے کی تجاویز پر بڑے "بوگس" طریقوں سے عمل کرایا جا رہا تھا اور بے مقصد تجاویز پر عمل ہو رہا تھا۔ بھارتیوں نے 22 نومبر 71ء سے مشرقی پاکستان پر بھرپور زمینی حملے شروع کئے ہوئے تھے۔ صرف فضائیہ، جنگ میں شامل نہ تھی اور یہ خبریں ہم خود بھی دے رہے تھے اور لوگ کہتے تھے ہم بھی جوابی کارروائی کریں تو ہماری نااہل قیادت نے بھی جوابی کارروائی کا "ڈرامہ" کر دیا، کہ اچانک 3 دسمبر شام کو ہماری حکومت نے اعلان کر دیا کہ بھارتیوں نے مغربی محاذ پر بھی حملہ کر دیا ہے اور ہم حالت جنگ میں ہیں اور جوابی کارروائی کر رہے ہیں راقم کو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ یہ خبر غلط تھی۔ بھارت والوں نے مغربی محاذ پر 3 دسمبر تک کوئی جارحانہ اقدام نہ کیا تھا۔ بلکہ ہماری فضائی اور بری فوج نے مغربی پاکستان میں "جارحانہ عمل" کا صرف ڈرامہ کیا اور کوئی بھرپور کارروائی نہ کی اور ہم نے جوٹکا خان کی کور سے بھرپور کارروائی کرانا تھی۔ ان دستوں نے آگے والی "جم گاہوں" کی طرف اُس دن سورج غروب ہونے کے بعد پشاور اور ملتان سے کوچ شروع کیا۔ اگر حیران کن کارروائی جارحانہ طور پر کرنا تھی تو ان دستوں کو 3 دسمبر سے پہلے بہاولنگر پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ اور رات ہی رات بھارتی علاقہ بھٹنڈہ سے آگے نکل جانا چاہیئے تھا۔ محکمہ تعلقات عامہ کا دفتر دن رات کھلا رہتا تھا اور میں دفتر ہی میں تھا کہ ملکی اور غیر ملکی اخبار نویس ہمارے پاس پہنچنا شروع ہو گئے اور کرنل صدیقی ایوانِ صدر چلا گیا کہ وہاں سے "بریفنگ" لے گا۔ ہم تو دفتر میں تھے۔ رات کے دس بجے بھارت سے خبر آئی کہ بھارت کی وزیراعظم اندرا گاندھی کہتی ہے کہ پاکستان والوں نے ہم پر حملہ کر دیا ہے اور وہ دونوں محاذوں پر جوابی کارروائی کر رہے ہیں۔ رات کے گیارہ بجے کرنل صدیقی واپس آیا، اور ہمیں الگ طور پر بتایا کہ بڑے صاحب (یعنی یحیٰی خان) نشے میں دھت ہیں اور کل کسی وقت قوم کو خطاب کریں گے۔ ہم اخبار والوں کو ٹال دیں چونکہ بھارت نے "اچانک" حملہ کر دیا ہے، تو جوابی طور پر ہم بھی اپنی سرحدوں کی حفاظت کر رہے ہیں اور صدر صاحب کل قوم سے خطاب کریں گے۔ یحیٰی خان نے یہ خطاب اتنی "مخلصانہ زبان"

میں کیا کہ کئی لوگ رو پڑے۔ لیکن میرے لئے یہ ایک ''ڈرامہ'' تھا۔ کہ مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کہ قوم کو بے وقوف بنایا جا رہا تھا۔

قارئین! میں نے سچّی بات اس لئے لکھ دی ہے کہ بھرپور جنگ کے لئے ''پہل'' ہم نے کی اور بے مقصد اور لاحاصل کہ اصلی اور بھرپور کارروائی جو کرنا تھی اس کے لئے تو صرف فوجوں نے اگلی ''جم گاہوں'' کی طرف حرکت کی۔ ایک ایک عمل پر تبصرہ کئی مضامین میں ختم نہیں ہو سکتا۔ دوسرے دن دوپہر کو مجھے ڈھاکہ سے جنرل نیازی کے چیف آف سٹاف بریگیڈیئر باقر صدیقی کا فون آیا، کہ وہ جنگ کی صورت حال کی خبریں ہمیں بھیجتے تھے۔ کیا اب بھی یہ ''حدود'' قائم ہیں؟ میں نے کہا کہ میرا فیصلہ ہے اور میں اس پر قائم رہوں گا۔ کہ آپ لوگ ''آزاد'' ہیں۔ سوچ سمجھ کر میجر صدیق سالک خبریں دیتا رہے۔ ہم آپ پر کنٹرول نہیں کر سکتے۔ البتہ لڑائی آپ ڈائریکٹر ملٹری آپریشن کے ماتحت لڑ رہے ہیں۔ اگر وہ کوئی حدود لگائیں تو اس پر عمل کریں۔ اس کے بعد کراچی سے تفضّل صدیقی کا فون آیا کہ بحریہ کے سلسلہ میں وہ کیا کریں۔ تو اس کو بھی میں نے وہی جواب دیا۔ یعنی جنگ سے پہلے خبریں دینے کے طریق کار کی بھی کوئی تجویز نہ بنائی اور میں نے مناسب فیصلہ کر دیا کہ ہم مغربی محاذ کے لئے ملٹری آپریشن والوں سے خبریں حاصل کرتے تھے۔ دوپہر کے قریب، جنرل یحییٰ خان نے قوم کے ساتھ سیدھا خطاب کی بجائے اپنی ریکارڈ شدہ تقریر سنوا دی۔ کہ ڈرامے ہو رہے تھے۔ ورنہ اگر بھارت نے ہم پر حملہ میں پہل کی ہوتی تو اصول تھا کہ ملک کا صدر فوراً سامنے آ کر قوم کو سیدھا خطاب کرتا۔ اب جس طرح سے ہم خبریں حاصل کر کے ہر روز شام کو اخبار نویسوں کو ''بریف'' کرتے تھے تو جگ ہنسائی ہوتی تھی۔ بری فوج کے لئے ''بریفنگ'' کرنل صدیقی کرتے تھے۔ وہ ''سویلین وردی پوش'' تھے۔ پیشہ ورانہ باتیں، ان خود کو سمجھ نہ آتی تھیں اور وہ ''آئیں بائیں شائیں'' مارتے رہتے تھے۔ تو ایم آئی سے ایک کرنل کو ان کی مدد کے لئے ساتھ رکھنے کا فیصلہ ہوا۔ فضائی فوج سے البتہ ان کا اپنا ایک کموڈور آتا تھا۔ لیکن اپنی خبریں وہ لوگ بھی ''ڈرامائی'' انداز میں بیان کرتے تھے جن میں سچ تھوڑا ہوتا تھا۔ یحییٰ خان بھی ایک دفعہ جی ایچ کیو میں ایم آئی کی بریفنگ سننے آیا تھا۔ لیکن یہ ڈرامہ تھا کہ وہ بھی ''پانچوں سواروں'' میں شامل ہو رہا تھا۔ چھمب کو ہم نے آزاد کرا لیا تھا۔ یہ عاجز غیر ملکی اخبار نویسوں کے ایک ''بے ربط انبوہ'' کو وہ جگہ دکھانے کے لئے لے گیا تھا اور وہاں مجھے دو دن قیام کرنا پڑا۔ واپس پہنچا تو معلوم ہوا مشرقی پاکستان کا معاملہ ختم ہے اور مغربی پاکستان میں ہم کچھ بھی نہیں کر سکے۔ لیکن اب کچھ کریں گے تو اس عاجز نے ''فیلڈ رپورٹنگ'' کے لئے لاہور محاذ پر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ بھارتی فضائی فوج دندناتی پھرتی ہے اور حالات ستمبر 65 کی جنگ سے بالکل مختلف ہیں۔ اس زمانے میں ہماری فضائی فوج کو دیکھ کر بھارتی جہاز بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ تو اس عاجز کو معلوم ہوا کہ ایئر مارشل رحیم کا نمائندہ ''کموڈور'' راولپنڈی میں بڑی مبالغہ آمیز قسم کی بریفنگ کرتا تھا۔ داتا دربار حاضری دی اور مایوسی کی حالت میں دو نوافل ادا کئے کہ آگے محاذ پر چلا گیا۔ اپنی پرانی پلٹن جن کو اس عاجز نے ستمبر 65 میں کمانڈ کیا۔ ان کے ہیڈکوارٹر میں پہنچ گئے کہ اگلے محاذ پر جوانوں کو دیکھوں کہ وہ کس حالت میں لڑ رہے ہیں اور شاید کوئی دشمن کی گولی مجھے ٹھنڈا کر دے کہ اس مایوسی اور ذلت والی زندگی اور قید خانہ سے چھٹکارا ہو۔

قارئین! میری مایوسیوں کی کوئی انتہا نہیں۔ جنگ شروع ہوئی تو پہلے ایک دو دن ڈائریکٹر ملٹری آپریشنز بریگیڈیئر ریاض کو ملا۔ تو وہ بڑا ہشاش بشاش ہوتا تھا کہ ”ہماری باری“ آنے والی ہے ہم بھارت کی ایسی تیسی کر دیں گے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بے چارے کو کہا گیا تھا کہ ٹکا خان کی کور کو بھرپور تیاری کے احکام دے دو اور وہ لوگ ”پر تولے“ بہاولنگر کے نزدیک سے بھارت میں داخل ہونے والے تھے چند دن بعد میں ملٹری آپریشنز ڈائریکٹریٹ گیا تو دیکھا کہ وہ بڑی مایوسی کی حالت میں بیٹھا ہوا تھا اور پوچھنے لگا۔ ”امیر افضل فائر بندی کی کوئی خبر“ تو مجھ پر بھی اور مایوسی طاری ہوگئی۔ یحییٰ خان ایک اور ڈرامہ کر چکا تھا۔ نورالامین کو وزیراعظم اس لئے نامزد کیا کہ ذوالفقار بھٹو کو نائب وزیراعظم اور وزیر خارجہ بنا کر اقوام متحدہ بھیجنا تھا۔ کہ ایسی کوئی باعزت قرار داد وہاں منظور نہ ہونے دینا کہ مشرقی پاکستان سے کسی عزت کے طریقے سے فوج کو نکال لیا جائے۔ پہلے گزارش کر چکا ہوں کہ یحییٰ خان اور بھٹو کی ”مشترکہ قدر“ فوج کو ذلت آمیز شکست دلانا تھا۔ لیکن یہاں بریگیڈئر ریاض کو اس دن حکم ملا تھا کہ مغربی پاکستان سے ہم بھرپور کارروائی کر کے کچھ زیادہ حاصل نہ کر سکیں گے۔ ذوالفقار بھٹو کو اقوام متحدہ بھیجا گیا ہے کہ وہاں فوج کے مشرقی پاکستان سے انخلاء کا کوئی باعزت بندوبست کیا جائے۔ قارئین کون کس کو بے وقوف بنا رہا تھا؟ اور کون سازش کی کڑی تھے؟ اور کون سازشیوں کے کھیل خوشی سے کھیل رہے تھے؟ اور کون میری طرح بے بس تھے؟ یہ تفصیلی بحث بھی چھٹے سلسلہ میں ہوگی۔ اقوام متحدہ میں کچھ بھی نہ ہوا۔ نیازی کے ہتھیار ڈالنے کے بعد یحییٰ خان نے اندرا گاندھی کی مغرب میں فائر بندی کی شرط بھی ”تسلیم“ کر لی اور یہ کچھ اس عاجز نے اگلے مورچوں میں سنا۔ ابھی وہ گولی تیار نہ ہوئی تھی جو مجھے ٹھنڈا کر دیتی۔ مایوسی کی حالت میں یہ عاجز واپس مڑا۔ داتا صاحب کے دربار پر حاضری دی۔ نوافل ادا کیے اور عرض کی ”رب ڈاہڈے دی مرضی“

مغربی پاکستان سے جارحانہ کارروائیوں کے ”ڈراموں“ کے واقعات کا اختصار اس طرح ہے کہ بارہویں ڈویژن کے کمانڈر جنرل محمد اکبر کو کہا گیا کہ وہ حملہ کر کے پونچھ شہر کو آزاد کرائیں۔ جنرل اکبر ایک مخلص اور سنجیدہ صاحب تھے اور راقم کے مہربان رفیق تھے۔ جب ستمبر 1970 میں اس عاجز نے یحییٰ خان اور اس کے حواریوں کو کھری کھری سنائیں تو جنرل اکبر نے رپورٹ دی تھی کہ میجر امیر افضل ایک حق پرست، مخلص محبّ وطن پاکستانی ہے۔ مذہب کے ساتھ زیادہ لگاؤ اور جذبہ کے تحت وہ اعلان حق کرنے سے گریز نہیں کرتا اور سیاستدانوں یا مذہبی رہنماؤں کو ان کے منہ پر بری طرح لتاڑتا ہے اور انہیں ذاتی طور پر معلوم ہے کہ میجر امیر افضل انگریز حکمرانوں کو بھی ان کے منہ پر کھری کھری سناتا تھا۔

جس زمانے میں یہ عاجز مشرقی پاکستان کا دورہ کر رہا تھا جنرل اکبر بھی وہاں گیا ہوا تھا اور میرے ساتھ انہوں نے بھی سرسری طور پر تبادلہ خیالات کیا تھا اور بعد میں مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے لکھ کر رپورٹ دی تھی کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کیلئے ان کے قابل قبول کوئی سیاسی تصفیہ کیا جائے اور اپنی فوج کے وہاں سے عزت کے ساتھ انخلا کی بھی تجویز بنائی جائے۔ ستمبر 1971ء میں ان کی جگہ غلام جیلانی کو ISI کا سربراہ بنا دیا گیا جو ہر حکم ”بسروچشم“ مانتے تھے اور یہ کہانی پہلے بیان ہو چکی ہے۔ جنرل اکبر نے 48-1947 کے کشمیر کے جہاد میں بھرپور حصہ لیا تھا کہ آپ کا تعلق ضلع بھمبھر سے تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ پونچھ دریا اور زمین کی اٹھان کی وجہ سے پونچھ

ایک قدرتی حصار ہے۔ اکبر خان نے اوپر والوں کو سمجھایا کہ پونچھ پر سیدھا حملہ کر کے سر پھوڑنا ہوگا۔ بہتر ہے کہ جھنگڑ' راجوری اور پونچھ کا رابطہ کاٹنے کیلئے کسی کھلے علاقہ پر حملہ کر کے بہت کچھ حاصل کر لیں لیکن ان کی بات نہ مانی گئی کہ پونچھ کے نام کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور اکبر خان نے خود اپنی موجودگی میں ایک بہترین تجویز کر کے دو پلٹنوں کی نفری سے حملہ کرایا۔ ایک پلٹن کا کرنل محمد نواز سمیت اور دوسری پلٹن کے دو افسروں سمیت اتنا جانی نقصان ہوا کہ جو زمین انہوں نے حاصل کر لی تھی اس پر بھی وہ قابض نہ رہ سکے تو حملہ کرنے کے دوسرے مرحلہ کے اسباب بھی نہ بنے تو اوپر والوں کو بتا کر اس تجویز کو ختم کر دیا گیا۔

دوسری جارحانہ کارروائی کا ''ڈرامہ'' میجر جنرل افتخار جنجوعہ کے ڈویژن سے چھمب جوڑیاں کے علاقے میں کرایا گیا۔ جنرل افتخار کا باپ قادیانی ہوگیا تھا اور افتخار کی ماں' افتخار کے بچپن میں مرگئی تھی تو اس کے باپ نے ایک قادیانی عورت سے شادی کر لی اور خاندان کے باقی لوگ قادیانی نہ بنے تو افتخار کے بچپن کا ماحول بڑا عجیب و غریب تھا کہ وہ ایک بے دین شخصیت ہونے کے علاوہ جنون کی حد تک ''بہادر'' تھا اور شادی بھی نہ کی تھی تو اس کو کسی پر ترس بھی نہیں آتا تھا اور اس کے ماتحت اس کے ڈر سے کانپتے تھے۔ اس کے جس بریگیڈئر نے حملہ کی ابتدا کرنا تھی اس کی کمانڈ سے وہ کترا رہا تھا جنرل افتخار خود اس کو لینے کیلئے گیا لیکن بریگیڈیئر رحیم الدین طرح دے گیا اور کہیں چھپ گیا تو جنرل افتخار نے توپخانہ بریگیڈ کے کمانڈر نصیر اللہ بابر (بعد میں میجر جنرل) کو دوہری ذمہ داری دے کر اپنی نگرانی میں بھرپور حملہ کرایا۔ جس سے چھمب تو آزاد ہوگیا لیکن نصیر اللہ بابر بھی زخمی ہوگیا اور خود جنرل افتخار اتنا سخت زخمی ہوا کہ وہ بھی ہلاک ہوگیا اور چھمب دریا پار کرنے کے بعد کارروائی رک گئی۔ اس دفعہ ہم جوڑیاں تک بھی نہ پہنچ پائے جہاں ستمبر 65ء میں پہنچ گئے تھے۔ ڈویژن کی کمانڈ پاکستانی ''کسنجر'' میجر جنرل عمر کو دی گئی لیکن کرنل سٹاف عبدالرحمٰن دل چھوڑ چکا تھا کہ یہ آدمی ستمبر 65ء کی جنگ میں بریگیڈئر قیوم شیر کا بریگیڈئر میجر تھا اور یہ آدمی اس کی کوتاہیوں میں برابر کا شریک تھا۔ راقم بھی جیسے ذکر ہو چکا ہے اخبار نویسوں کو لے کر وہاں پہنچ چکا تھا لیکن کرنل عبدالرحمٰن کو دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کے حواس باختہ ہو چکے تھے۔ نہ وہ مجھے میجر جنرل غلام عمر سے ملنے دے رہا تھا اور نہ خود میرے اور اخبار نویسوں کے ساتھ چھمب جانے کو تیار تھا۔ ہمارے جوان بڑی بہادری سے حملہ آور ہوئے تھے۔ ڈیڑھ دوسو بھارتیوں کو قید کیا۔ بھارتی بھی بڑی بہادری سے لڑے۔ ان کی لاشوں کے ڈھیر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ میں ابھی چھمب ہی میں تھا کہ کرنل عبدالرحمٰن کی بات مانتے میجر جنرل غلام عمر نے چھمب سے آگے کی فوج کو واپس بلانے کے احکام دے دیئے اور یہ عاجز وہاں سے غیر ملکی اخبار نویسوں کو جلدی نکال لایا کہ وہ لوگ یہ عمل نہ دیکھیں کہ ہم نے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ بھی کھو رہے ہیں اور اتنی قربانی کے باوجود ہم صرف چند مربع میل حاصل کر سکے اور چھمب کے ''نام'' کا سہارا لے رہے تھے۔

قارئین! یہ ساری کارروائی غلط تھی۔ بے شک زمینی لحاظ سے یہ علاقے بھارت کا ایک کمزور حصار (Soft Belly) ضرور تھے لیکن ستمبر 65ء کی جنگ کے مضامین میں یہ عاجز تجزیہ پیش کر چکا ہے کہ آگے زمین ''فنل'' (Funnel) کی طرح تھی اور اکھنور فتح کرنا بہت مشکل تھا کہ جموں اور نوشہرہ کے درمیان رابطہ منقطع کر لیتے اور ہم تو جوڑیاں تک بھی نہ پہنچے اور چھمب کو تو اس کمزوری یا دوسری باتوں کی وجہ سے فتح کر کے آگے کچھ

حاصل نہ کیا۔ نہ ہی جنگ کے بعد بریگیڈئر رحیم الدین کو کسی نے پوچھا۔ اگر افتخار جنجوعہ زندہ رہتا تو وہ رحیم الدین کا کورٹ مارشل کراتا یا ایسی کوشش ضرور کرتا لیکن رحیم الدین نے جنرل کے عہدے تک ترقی کہ بھٹو کے زمانے میں میجر جنرل بن گیا تھا اور ضیاء الحق کے بیٹے کو بیٹی کا رشتہ دیدیا تو بے حساب بلندیاں دیکھیں۔ ستمبر 65ء کی جنگ کے زمانے میں بھارت کا صدر ڈاکٹر ذاکر حسین ان کا سگا چچا تھا اور یہ صاحب بھی جنرل شیر علی کی طرح ان لوگوں میں شامل ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں بھارت کا ''چھوٹا بھائی'' بن کر بھارت کے ساتھ ''گذارا'' کرنا چاہئے۔ کرنل عبدالرحمٰن بھی ہماری فوج سے میجر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے کہ ''بسروچشم'' والے آدمی ہیں۔ بہرحال چھمب کی جارحانہ کارروائی بھی ایک ''لاحاصل مشق'' ثابت ہوئی۔

سیالکوٹ محاذ پر ہماری حالت اس دفعہ ستمبر 65ء کے مقابلہ میں بہت بہتر تھی۔ بھارتی بکتر بند دستے بھی ستمبر 65ء کی طرح ادھر اس وجہ سے نہ آئے تھے کہ ان کو دہلی کی طرف کسی جگہ سے ہماری بھرپور کارروائی کا خطرہ تھا اور مشرقی پنجاب اور راجپوتانہ کے علاقوں میں تو وہ اپنی بکتر بند قوت کو بھی بکھیر چکے تھے تو سیالکوٹ سے آگے بڑھ کر ہم ایک طرف اگر پٹھانکوٹ سے جموں کے درمیان بھارت کے کشمیر کے ساتھ بڑے ذرائع آمدورفت کوئی جگہوں سے کاٹ سکتے تھے۔

تو دوسری طرف دریائے راوی میں کم پانی ہونے کی وجہ سے شکر گڑھ کے علاقوں سے آگے بڑھ کر ماجھہ کے شمالی علاقوں یعنی گورداسپور اور امرتسر کے کئی علاقوں پر بہت آسانی سے قبضہ کر سکتے تھے لیکن یہ عاجز یہاں ہماری غلط سوچ اور تجویز کا ذکر پہلے کر چکا ہے کہ یہاں کے قادیانی میجر جنرل عبدالعلی ملک نے بریگیڈئر شیر علی باز کے بریگیڈ کو اپنی زمین سے بھی پیچھے ''پسپا'' کرایا۔ ایک بنگالی میجر اس علاقے سے ہماری تجاویز لے کر سرحد پار کر کے بھارت پہنچ چکا تھا اور ایسا جنگ سے بہت پہلے ہوا۔ پھر بھی ہم نے تجاویز تبدیل نہ کیں اور اس علاقے کا نارووال جسڑ علاقے کا ڈویژن ٹھک ٹھک کرتا رہا اور ہم نے ان علاقوں سے اپنی فوجی برتری یا بہتر زمینی حالات پر ہونے کا کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ بھارت کے ''ماجھہ'' کے علاقہ کو تخت و تاراج کرنا بڑا آسان تھا کہ سیالکوٹ سے آٹھواں ڈویژن شمالی اور اوپر والے ماجھہ کے علاقے کو لاہور سے دسواں ڈویژن ماجھہ کے وسطی علاقے کو اور قصور سے گیارہواں ڈویژن کھیم کرن اور جنوبی ماجھہ کو مل کر تاخت و تاراج کر سکتے تھے لیکن ہمارے اوپر والوں نے لاہور سے جارحانہ کارروائی کی پہلے مرحلہ کیلئے محدود تجویز بنائی تھی کہ جنرل ٹکا خان کی بھرپور کارروائی کے نتائج کے بعد دوسرے مرحلہ میں یہ سارے ڈویژن آگے پیش قدمی کریں گے اور امرتسر میں خالصتان کی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیں گے جس کام کیلئے سکھوں کو سمجھنے والے اور جاننے والے ریٹائرڈ افسروں میں سے بریگیڈئر عطا محمد اور کرنل عدالت حسین وغیرہ کو بلایا ہوا تھا کہ وہ خالصتان کی عارضی حکومت کے مشیر کے طور پر کام کریں گے اور میں کوئی ''لال بجھکڑ'' والی تجاویز نہیں دے رہا۔ ہمارے اوپر والے جانتے تھے کہ ایسا ہو سکتا ہے لیکن سازش بہت گہری تھی۔ یہ عاجز بہت پہلے گذارش کر چکا ہے کہ جنگیں ''زمان و مکان'' کے صحیح استعمال کے تحت لڑی جاتی ہیں۔ ہم زمان و مکان کا صحیح استعمال نہ کر رہے تھے۔

اگر ہم پہلے مرحلے میں پٹھانکوٹ اور جموں کے درمیان رابطہ کاٹ دیتے اور جنرل اکبر خان کی فوجیں

پونچھ کے ساتھ اور افتخار جنجوعہ کی فوجیں چھمب کے ساتھ سر پھوڑنے کی کارروائیوں میں نہ لگا دی جاتیں بلکہ وہ اپنے علاقوں میں مختلف بھارتی ذرائع آمدورفت کاٹنے کی کارروائیاں کرتے تو کشمیر میں بھارتی فوج میں کھلبلی مچ جاتی۔ ان کو معلوم نہ ہوسکتا کہ ہمارے حملے کا زور کہاں ہے اور جو کمانڈو ستمبر 65ء میں کشمیر بھیجے تھے ان کو اور قبائلی مجاہدین کو جگہ جگہ کشمیر میں داخل کر دیتے تو جنگ کا رنگ ہی تبدیل ہو جاتا لیکن ہم نے اپنا علاقہ خالی کر دیا تو سانبھہ روڈ سے بھارتیوں نے آگے بڑھ کر ہمارے ''جال'' میں پھنسنے کی بجائے چند اہم مقامات پر قبضہ کیا اور ہماری بھرپور کوشش کے باوجود اور فرنٹیئر فورس کے کرنل اکرم کی عظیم قربانی کے بعد بھی ہم بھارتی فوج کو اپنے علاقوں سے پوری طرح سے خارج نہ کر سکے۔ کرنل اکرم شہید کو صحیح طور سے ہلال جرأت سے نواز دیا گیا لیکن سیالکوٹ کے ہمارے لاؤ لشکر سے ہم نے اس دفعہ کوئی فائدہ نہ اٹھایا جو اٹھا سکتے تھے۔ لاہور محاذ سے میرے پیارے رفیق اور پلٹن وال میجر جنرل ضامن نقوی اب مرحوم و مغفور کو محدود جارحانہ کاروائیوں کے احکام ملے اور اس عاجز نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ انہوں نے بڑی کامیابیاں حاصل کیں کہ یہاں ہی ہماری پرانی پلٹن پندرہویں پنجاب کے لانس نائک محمد محفوظ شہید کو نشان حیدر کا اعزاز بھی حاصل ہوا اور میری ستمبر 65ء والی دوسری پلٹن سولہویں پنجاب کو اس عاجز نے دیکھا کہ سمندر کے سیلاب کی طرح وہ کہیں رکتے نظر نہ آتے تھے کہ فائر بندی ہو گئی اور پہلے مرحلہ میں ان کے مقاصد بھی محدود تھے کہ دریائے ستلج تک پہنچنے یا امرتسر کو گھیرے میں لینے کی تجاویز دوسرے مرحلہ کا حصّہ تھیں جو نوبت ہی نہ آئی کہ ٹکا خان کے دستوں کو بروقت استعمال ہی نہ کیا اور وہ ''پر تولتے'' رہے اور دانت ''بھینچتے'' رہے۔ میرے عظیم رفیق میجر جنرل احسان الحق ڈار اب مرحوم و مغفور، ان دستوں کے اہم ساتویں ڈویژن کے کرنل سٹاف تھے۔ وہ جب مجھے اپنے مجاہدین کے تاثرات سناتے تھے ''کہ لڑنے والوں کو کسی نے نہ لڑایا تو ہم دھاڑیں مار کر روتے تھے اور اب بھی ساری باتیں یاد آتی ہیں تو میں پھوٹ پڑتا ہوں'' کہ اے میرے رب یہ سب کچھ میرے لیے کھول کر اس لئے رکھ دیتے ہو کہ میں تڑپتا رہوں۔ تیری مرضی! اور صرف ''احساس زیاں'' پر گذارا کروں۔''

قصور کے محاذ پر میجر جنرل عبدالمجید ملک کے ڈویژن کو یہ حکم دیا کہ وہ دریائے ستلج کے اس طرف ''قیصر ہند'' کے نشان یا **Monument** پر قبضہ کریں کہ نام ہو جائے گا کہ ستمبر 65ء میں ہم اس پر قبضہ نہ کر سکے تھے۔ تعزیراتی اور تدبیراتی طور پر کیا حاصل ہوگا؟ جواب ندارد! یہ صرف نام و نموش والی کارروائی تھی۔

پنجاب رجمنٹ کے کرنل غلام حسین شہید نے عظیم قربانی دیکر قیصر ہند پر قبضہ تو کر لیا اور ان کو ہلال جرأت سے تو صحیح طور پر نواز دیا گیا اور ان کیلئے بھی یہ پہلا مرحلہ تھا۔ جیسے بیان ہو چکا ہے کہ دوسرے مرحلہ میں انہوں نے دریائے ستلج تک کے علاقے فتح کر کے اوپر دسویں ڈویژن ۔۔ رابطہ باندھنا تھا۔ جس پر عمل کرنے کا ''وقت'' ہی نہ آیا۔

جنرل نیازی کو چاہئے تھا ہتھیار ڈالنے کی بجائے شہادت کے راستے پر چلتا

اب میں اس جنگ کی سب سے بڑی جاہلانہ کارروائی کی طرف آتا ہوں، جس کا سرسری ذکر یہ عاجز پہلے کر چکا ہے کہ میرے پلٹن وال میجر جنرل بی ایم مصطفیٰ حیدر آباد اور سندھ میں معمولی نفری چھوڑ کر اپنے

بریگیڈئر طارق میر اور بریگیڈئر ارباب کے دو بریگیڈوں کولیکر رحیم یار خان پہنچ گئے کہ وہاں سے وہ باری باری جیسلمیر کی طرف پیش قدمی کریں گے۔ جس کیلئے نہ کوئی راستہ تھا اور نہ سڑک، ریگستان میں گاڑیوں نے چلنا تھا جن کیلئے پٹرول اٹھانے والی دوگنی گاڑیوں کی ضرورت تھی اور سارے راستے میں کوئی پانی نہ تھا۔ اس لئے خاص واٹر ٹینکوں کے علاوہ کئی گاڑیوں کی ضرورت تھی جن میں پانی کی ''بخالیں'' رکھنی تھیں۔ جوانوں نے زیادہ تر پیدل چلنا تھا اور راتوں رات چل کر انہوں نے دس بارہ میل فاصلہ طے کر لیا لیکن بھارتیوں کو شاید کسی بنگالی بھگوڑے آفیسر نے سب کچھ بتا دیا کہ نیم اندھیرے میں جب گاڑیاں آگے نکلیں تو بھارتی ہوائی جہاز پہنچ گئے اور انہوں نے کافی گاڑیاں برباد کیں حالانکہ وہ اندازاً فائر کر رہے تھے کہ نقشے سے ان کو محل وقوع معلوم تھا تو گاڑیوں کو تتر بتر ضرور کیا لیکن جب دوسرے دن صبح ہوئی تو ریگستان میں نہ کوئی جھاڑی تھی نہ درخت ہر گاڑی ہوائی جہازوں کیلئے مشہور نشان تھی، اس لئے آگے جہاں پیدل فوج تھی وہاں تک چند ایک گاڑیاں پہنچیں کہ جوانوں نے بھی تتر بتر ہو کر پیش قدمی جاری کی ہوئی تھی۔ اب جنرل بی ایم مصطفیٰ نے اپنی فضائی فوج کے "Cover" کی گذارش کی تو ائر مارشل رحیم نے انکار کر دیا کہ وہ کسی ایسی تجویز سے آگاہ نہیں تھا۔ اس لئے وہ اس کام کیلئے کوئی جہاز نہیں دے سکتا۔

دراصل اس میں ذاتی وجہ بھی تھی ائر مارشل رحیم کا چھوٹا بھائی لیفٹیننٹ غفار عظیم ایک بے انتہا بگڑا ہوا افسر تھا اور راولپنڈی چھٹی آیا ہوا تھا تو 1964ء میں سٹیشن ہیڈ کوارٹر میں کچھ جھگڑے اور شرارتیں کیں، تو سٹیشن کمانڈر صاحبزادہ مصطفیٰ نے اس کو کھلی حراست میں لے کر ہماری یونٹ کے ساتھ attach کر دیا اور بی ایم مصطفیٰ ہمارا کمانڈنگ افسر یعنی کرنل تھا۔ میں نے کرنل صاحب کو بہت منع کیا کہ ایسے ''گندے'' آدمی سے بچنے کی کوشش کریں لیکن بی ایم مصطفیٰ کہتا تھا کہ ایسے آدمیوں کو ہم ٹھیک نہ کریں گے تو کون ٹھیک کرے گا۔ اس افسر نے ہمیں جن حالات سے دوچار کیا وہ لمبی کہانیاں ہیں کہ اچھل کر ایک دن وہ کرنل بی ایم مصطفیٰ کے بھی گلے پڑ گیا کہ میس حوالدار منصب خان نے اس کو پکڑ لیا اور میرا گھر نزدیک تھا۔ مجھے خبر ملی تو میں نے اس کی کھلی حراست کی بجائے ایک حفاظتی دستہ کے تحت اس کے کمرے میں اس کو قید کر دیا کہ کرنل صاحب خود جھگڑے کا ''حصہ'' بن گئے تھے۔ وہ ایسی کارروائی نہ کر سکتے تھے۔ اب پہلے اس کا باپ سفارش کیلئے پہنچ گیا لیکن بات ساری پلٹن اور چھاؤنی بلکہ ایوانِ صدر تک مشہور ہو گئی تھی۔ ہم کیسے اس کو چھوڑ دیتے۔ ائر مارشل رحیم اس زمانے میں گروپ کیپٹن تھا۔ تین چار دن کے بعد وہ آیا کہ بھائی سے ملنا چاہتا ہے کرنل بی ایم مصطفیٰ کوہاٹ گئے ہوئے تھے میں نے رحیم کو نہ صرف ملنے کی اجازت دی بلکہ علیحدگی میں بھائی کے ساتھ بات چیت کرنے کی بھی اجازت دیدی اور میں نے ساری کہانی اس افسر کے سامنے گروپ کیپٹن رحیم کو سنائی۔ اس کی بڑی عزت کی۔ چائے پلائی اور وہ خود میرے سامنے تسلیم کر گیا کہ ہم اس کے بھائی کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ہمیں قانونی کارروائی کرنا پڑے گی تو لیفٹیننٹ غفار عظیم کا کورٹ مارشل ہوا اور اس کو فوج سے نکال دیا گیا۔ اصل میں اب ائر مارشل رحیم یہ غصہ نکال رہا تھا کہ جنرل بی ایم مصطفیٰ کی مہم ناکام ہو اور وہ بدنام ہو یعنی ایسے لوگوں کو قوم کا کوئی خیال نہیں ہوتا اور ائر مارشل رحیم تو اب ویسے بھی یحییٰ خان اور بھٹو کی ''کھیل'' کھیل رہا تھا کہ بری فوج ہر جگہ ناکام ہو۔ اب جی ایچ کیو سے جنرل عبدالحمید نے یہ بہانہ بنایا کہ میجر جنرل مصطفیٰ نے ان کو یہ ضرورت لکھ کر نہ دی تھی تو اب ہم فضائی فوج کو مدد کیلئے مجبور نہیں کر سکتے تو جنرل

مصطفیٰ نے لکھا ہوا ثبوت بھی پیش کر دیا اور اس کی بڑے جنرل عبدالحمید سے ''توں توں' میں میں'' ہوگئی اور جنرل مصطفیٰ کو کمانڈ سے ہٹا کر قادیانی میجر جنرل چھوٹے عبدالحمید جو ''بھوپالی'' کے نام سے جانا جاتا تھا اس کو اس ڈویژن کی کمانڈ دی اور بڑی مشکل سے ریگستان میں پھنسے ہوئے دستوں کو نکالنے کا کام شروع ہوا لیکن بھارتیوں نے گدرا کے مقام سے پیش قدمی کر کے حیدر آباد کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ بھارتی ریگستان میں ہمارے پھنسے دستے ابھی واپس اپنی سرحد تک نہ پہنچے تھے تو اُن کو حیدر آباد کے دفاع کیلئے کیسے بھیجے تو ٹکا خان کے بھرپور کارروائی والے دستوں سے کچھ پیدل دستوں کو لیکر حیدر آباد بھیجا کہ بھارتیوں کی پیش قدمی کو روکیں اور ہماری سب ''بناوٹی'' اور ''لیپاپوتی'' والی تجاویز اپنا حشر دیکھ چکی تھی اس کے بعد۔

قارئین! میرے پرانے رفیق جنرل گل حسن نے اس کے بعد فوج میں جو چار پانچ ماہ نوکری کی وہ جب مجھے ملتے تھے تو آنکھ اٹھا کر اوپر نہ دیکھ سکتے تھے کہ یہ ''منہ پھٹ'' کہیں یہ نہ کہہ دے کہ کدھر گئی تمہاری ''بھرپور کارروائی'' یہی چیز مشرقی پاکستان کی جنگ کو لاگو ہے اور میں اس لڑائی کے واقعات بھی نہیں لکھ رہا کہ جہاں تک واقعات اور دسمبر 71ء کی جنگ کا تعلّق ہے خود جنرل امیر عبداللہ نیازی نے بڑی تفصیل سے اپنی کتاب میں لکھی ہے اور سب سچ لکھا ہے کہ لوگ بہت بہادری سے لڑے۔ انہوں نے بھارتیوں کے منہ پھیر دیئے لیکن ان واقعات سے میں نہ کوئی سبق نکال سکتا ہوں نہ کوئی مقصد حل ہوسکتا ہے کہ پہلے ہی تفصیل میں جا چکا ہوں کہ جنرل نیازی ایک لاحاصل مشق میں مصروف رہا اور اس سلسلہ میں جنرل گل حسن اور جنرل عبدالحمید اور ہمارے اوپر والے ''برابر'' کے قصوروار ہیں کہ تجویز ایسی بنائی تھی کہ نیازی کتنے دن لڑائی لڑ سکتا ہے اور خدانخواستہ اگر ہم مغرب میں خاطر خواہ کامیابی نہ حاصل کر سکے تو پھر مشرقی پاکستان میں عزت کیسے بچائیں گے۔ میں ایک بڑا سیدھا سوال کر کے اس بحث کو ایک فقرے میں ختم کرتا ہوں کہ اگر یہ کچھ کرنا تھا اور سب کو معلوم تھا کہ مشرقی پاکستان میں لڑائی نہیں لڑ سکتے تو چند دن لڑائی لڑانے کا اوپر والوں نے ڈرامہ ہی کیا اور اس طرح بے عزتی سے ہتھیار کیوں ڈالے؟ پہلے ہی کہہ دیتے کہ ہم جا رہے ہیں۔

لیکن قارئین! چند باتیں جن کے ''پوسٹ مارٹم'' کی ضرورت ہے' وہ یہ ہے کہ مان لیتے ہیں کہ جنرل نیازی کے ساتھ دھوکہ کیا گیا۔ اس کو بیوقوف بنایا گیا یا مغربی محاذ پر کوتاہیاں کیں یا ہوئیں اوپر والے نااہل ثابت ہوئے۔ کچھ ''غدار'' تھے خود غرض تھے ابن الوقت تھے لیکن مشرقی پاکستان کی شکست کے بعد کیا جنرل نیازی کو یہ کچھ کرنا چاہیئے تھا جو اس نے کیا؟ کیا اس کیلئے کوئی اور راستہ یا Course باقی نہ رہ گیا تھا؟ اس کے پاس بہت Courses (راستے) تھے۔ خاص کر امام حسینؓ کا عمل' وہ اعلان کرتا ''ہمارے ساتھ بہت دھوکے ہوئے یا یہ ہوا' وہ ہوا'' میں خود نے بھی بڑی غلطیاں کیں۔ میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں توبہ کرتا ہوں اور خود یا جو میرے ساتھ رہ جائیں گے آخری گولی اور خون کے آخری قطرہ تک لڑیں گے۔ مجھے امام حسینؓ کی طرح چراغ بجھانے کی بھی ضرورت نہیں کہ آپ میں سے اکثر مجھ سے دور ہیں یا آپ پر مجھے کنٹرول نہیں۔ اس لئے آپ جو کچھ کریں گے میرے سامنے آپ کی آنکھیں ہرگز نیچی نہیں ہوتیں۔ آپ لوگ بڑی بہادری سے لڑے اور لڑ رہے ہیں۔ اب آپ ''آزاد'' ہیں۔ آپ لوگ فرد کے طور پر بھی یا کوئی گروہ بنا سکیں گے یا کسی گروہ میں ہوں اور آپ میں لڑنے

کی ہمت نہیں رہی تو اگر چاہو تو دشمن کے سامنے سفید رومال ہلا دو اور اگر چاہو تو کسی غیر جانبدار ملک کی طرف نکلنے کی کوشش کرو یا مغربی پاکستان پہنچنے کی کوشش کرو یا ایسا بھارت کے راستے کرو اور اگر چاہو تو میری طرح آخری گولی اور آخری خون کے قطرے تک لڑ کر شہادت حاصل کرو۔'' میں بنگالیوں کو بھی گذارش کروں گا کہ ہم سے جو غلطیاں ہوگئی ہیں ان کو سمجھیں کہ ان کی کئی وجوہات تھیں اور ان کو بھول جائیں اور وہ مسلمان بن کر بھارتیوں کو خبردار کریں کہ وہ جہاں ہیں وہ وہاں رک جائیں۔ ہم یہ علاقہ اہل بنگال کے حوالے کرتے ہیں اور جہاں چاہیں وہ متحد ہو کر ہم سے علاقے کا کنٹرول سنبھال لیں اور ویسے بھی ہمارا تو اب کنٹرول نہیں۔ ہم کافر کے سامنے ہتھیار ڈالنے کو تیار نہیں۔

جنرل نیازی ہتھیار نہ ڈالتا تو یحییٰ خان جنگ بندی نہیں کرسکتا تھا

قارئین! ایسے اعلان کے بعد حالات کافی تبدیل ہو جاتے اور تاریخ کا دھارا بھی تبدیل ہو جاتا۔ اول تو سب لوگ لڑتے اور بنگالیوں میں بھی تبدیلی آ جاتی اور بھارتی بھی ہمارے فوجیوں کو کسی باعزت انخلاء کی اجازت دے دیتے اور یحییٰ خان مغرب میں کبھی فائر بندی نہ کر سکتا بلکہ اس کو حکومت چھوڑنا پڑتی اور بھٹو بھی اس طرح طاقت میں نہ آ جاتا بلکہ مومنانہ قیادت برسراقتدار آ جاتی اور بھٹو توبہ و ندامت کر کے ایسی قیادت کا حصہ بن سکتا تھا اور اب ہم مغرب میں بھارت کے ساتھ مومنانہ طریقے سے جنگ لڑ کر بھارت کو شکست دیتے کہ قرآن پاک سورۃ النساء میں فرمان الٰہی ہے کہ کافر مومنوں پر کبھی غلبہ حاصل نہیں کر سکتے اور سورۃ الروم میں فرمان ہے کہ رب مومنین کی مدد کرتا ہے۔ حیرانگی کی بات ہے کہ قوم کے ساتھ اتنے دھوکے کرنے کے باوجود یحییٰ خان امید رکھتا تھا کہ مغربی پاکستان کا صدر وہی رہے گا کہ اپنے سایہ جنرل عبدالحمید کے فائر بندی کے بعد تمام افسروں کو خطاب کرنے کیلئے ایوب ہال میں بھیجا جہاں ''مگرمچھ کی طرح آنسو'' بہا کر وہ اپنی ''مجبوریاں'' بیان کر رہا تھا۔ وہاں کیا ہلڑ بازی ہوئی اور اس عاجز نے سب جونیئر اور سینئروں کو کھری کھری سنا کر حالات کو کیسے کنٹرول کیا۔ ان سب پہلوؤں پر آنیوالے چھٹے حصے میں بھرپور تبصرہ ہوگا۔ اس کے باوجود کہ یحییٰ خان امیدوار تھا کہ بھٹو اس کو برائے نام صدر رکھے گا لیکن بھٹو کو جنرل گل حسن نے بتا دیا کہ فوجی افسر کس طرح یحییٰ خان سے نالاں ہیں تو بھٹو نے یحییٰ خان کو چلتا کر کے خود دنیا کا پہلا سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بننے کا فیصلہ کیا اور چند دن بعد ''معصومیت اور مخلصی'' کا لبادہ اوڑھ کر ہمیں خطاب کرنے کو آ دھمکا۔ پہلی دفعہ تو مصلحت میں اس عاجز نے اس سے کچھ شریفانہ اور تعمیری سوالات پوچھے لیکن فروری 1972ء میں جب اس نے ہمیں آ کر ''بوکھلاہٹ'' میں خطاب کیا تو اس عاجز نے ساری کسر نکال دی اور بھٹو کو منہ پر کہا کہ وہ کیا ہے اور کیسے عبرتناک انجام سے وہ دوچار ہوگا۔ قارئین! اس عاجز نے مضامین شروع کرتے وقت اگست 1971ء کی گکھڑ بابا کی پیش گوئی کا ذکر کیا تھا کہ مجیب کیلئے گولی اور بھٹو کیلئے پھانسی' ان سب باتوں کے تانے بانے مضامین کے چھٹے سلسلہ میں ملائے جائیں گے۔



چھٹا سلسلہ

میں نے جنرل نیازی سے کہا کہ وقت
آرہا ہے تمہارا نام گالی بن جائے گا

مضامین کا یہ چھٹا سلسلہ اس تمہید سے شروع ہوتا ہے کہ سقوط ڈھاکہ تاریخی' مذہبی' سیاسی اور فوجی لحاظ سے ایک بے مثال المیہ ہے۔ کسی اور قوم کے ساتھ ایسا المیہ ہوتا' تو وہ قوم چند سالوں میں مٹ جاتی۔ لیکن رب کی ذات پاک نے ہمیں 35 سالوں سے قائم رکھا ہوا ہے حالانکہ نہ قوم نے اس المیہ کی وجوہات کی پوری چھان بین کی نہ اس بے غیرتی اور اس بے عزتی سے کوئی سبق سیکھا۔ نہ کہیں سے توبہ وندامت کی صدا اٹھی' پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اس مملکت خداداد کو قائم رکھا ہوا ہے کہ یہاں سے ہی شاید اس قافلہ سخت جان جو عشق رسول ﷺ سے سرشار ہوگا' اس نے ظاہر ہونا ہے۔ گذارش ہو چکی ہے کہ حمود الرحمٰن کمیشن نے دھیلے کا کام نہ کیا کہ اس المیہ کی وجوہات سامنے لاتا کہ کون کتنا قصوروار ہے' وہ ہر چیز کھل کر بیان کرتا اور سب ''ایکٹروں'' کا کچا چٹھا کھولا جاتا۔

چنانچہ اس عاجز نے تمام تر وجوہاتی واقعات' اور ذمہ داریاں یا کوتاہیوں یا غداریوں یا سازش کے چھپے اور ظاہر پہلوؤں کو قوم کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے کہ غیروں کا اس میں کتنا ہاتھ ہے اور ہمیں یا ہم میں سے کچھ ''جانتے ہوئے'' اور کچھ ''بن جانے'' کس طرح ان غیروں کے ہاتھ میں ''کھیل'' رہے ہیں کہ ہم قوم کے طور پر مومن کی فراست سے عاری ہیں اور مومن بننے کی کوئی کوشش نہیں کر رہے کہ اسلامی فلسفہ حیات کو ہم نے اپنانا تو کیا تھا' سمجھنے کی بھی کوشش نہ کی کہ زندگی کی بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہر گھڑی ہر عمل کرتے یہ ذہن میں رکھیں کہ اس سلسلہ میں روز قیامت رب کی ذات پاک کو کیا جواب دیں گے کہ انسانیت کی سب سے بڑی خدمت انسانیت کو دوزخ کی آگ سے بچانا ہے۔ تو ضرورت یہ ہے کہ غیروں کے باطل فلسفہ ہائے حیات وموت سے موازنہ کرتے۔ اسلامی زندگیوں کی ان ضرورتوں کو سمجھ کر ان پر عمل کیا جائے کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ کہ مسلمان اور مومن ہونے کی وجہ سے انسانی زندگی کے مقاصد کھل کر ہمارے سامنے آ جائیں کہ معاشرہ یا زندگی کی ہر ضرورت کو فرد کے طور پر اور اجتماعی طور پر بھی ان مقاصد کے تابع کیا جائے اور ہمارے تمام تر سیاسی' حکومتی تعلیمی یا فوجی نظام ان مقاصد سے پھوٹیں۔

اس عاجز کے مضامین میں اسی پہلو کو ترجیحی طور پر مدنظر رکھا گیا ہے کہ ہم ''ترجیحات'' اور ثانوی ضرورتوں کو آپس میں گڈمڈ نہ کریں۔ غیروں' باطل فلسفہ والوں یا اسلام دشمن طاقتوں کے لئے اسلام اور مسلمان یعنی اہل حق بہت ''ناپسندیدہ'' عناصر ہیں اور وہ سب شیطان کے چیلے ہیں۔ انہوں نے اسلام کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی یا شیطان' ان پر سوار ہے۔ ان کا بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمان کو مسلمان نہ چھوڑو اور اس سلسلہ میں علامہ اقبال ان لوگوں کے دو مقاصد واضح کر گئے کہ شیطان اپنے چیلوں کو پہلی نصیحت یہ کرتا ہے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد ﷺ اس کے بدن سے نکال دو

افسوس کہ نہ فرد کے طور پر اور نہ قوم کے طور پر ہم نے اس شعر کی گہرائی میں جھانکنے کی کوشش کی کہ

مسلمان فاقہ یا بھوک کی پرواہ نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ سورۃ القریش کے مطابق بیابان میں بھی رزق عطا کرتا ہے اور ہم نے جو روٹی، کپڑا اور مکان کے نعروں کو ترجیح دینا شروع کیا ہوا ہے یہ مادیت میں گھس جانے کا عمل ہے۔ جس سلسلہ میں رب کی ذات پاک نے قرآن کی سورۃ الاعراف آیت مبارکہ 176 میں ایسے زمین یا مادیت میں گھس جانے والوں کو کتے کے متشابہ قرار دیا کہ بوجھ رکھیں تو بھی زبان لٹکا کر ہانپتا پھرتا ہے۔ بوجھ نہ رکھیں تو بھی زبان لٹکا کر ہانپ رہا ہوتا ہے۔ شعر کا اگلا حصہ ہے کہ ''مسلمان موت سے نہیں ڈرتا یا اس کو موت سے نہیں ڈرنا چاہیئے کہ ہمارے آقا ﷺ کا فرمان ہے کہ موت مومن کو تحفہ کے طور پر پیش کی جاتی ہے اور علامہ اقبال نے اسی چیز کو ''برلب تبسم آید'' کے طور پر بیان کیا کہ جب موت آ جائے تو مومن کے ہونٹوں پر تبسم آ جاتا ہے۔ حضور پاک ﷺ نے اس شعر کے لئے جو متشابہ مضمون ارشاد فرمایا وہ یہ ہے کہ ایک زمانے میں مسلمانوں کی تعداد بے حساب ہو گی لیکن وہ ذلت سے دوچار ہوں گے کہ وہ دنیا کی حب میں اندھے ہو جائیں گے اور ان کو موت سے کراہت ہو گی۔

یہ عاجز اپنے مضامین میں اسی پہلو پر بار بار تبصرہ کرتا آ رہا ہے کہ کیوں جنرل نیازی سلطان ٹیپو بننے پر تیار نہ ہوا۔ کیا زندگی اتنی زیادہ قیمتی ہے، تو جواب بھی دیتا آ رہا ہوں کہ مادیت ہمارا اوڑھنا بچھونا بن گیا ہے اور سقوط ڈھاکہ کے المیہ کا یہ ایک پہلو ہے۔ شعر میں سازش کا دوسرا پہلو یہ بیان کیا گیا کہ ہر مسلمان کے دل میں جو حضور پاک ﷺ کی شان کے بیان میں عاجزی ہے اس کو ایسے راستے پر لگا دو کہ وہ حضور پاک ﷺ کی بشریت اور اس دنیاوی زندگی کو سب کچھ سمجھ کر اپنی عقل سے حضور پاک ﷺ کی شان کو پرکھنا شروع کر دے (توبہ میرے اللہ) قرآن پاک عربی زبان میں ہے۔ عربوں پر قرآن پاک میں صاحب قرآن ﷺ کی شان کے بیانات کے ایسے اثرات ہوئے کہ انہوں نے ایک ہاتھ میں تلوار لے کر اور دوسرے ہاتھ میں قرآن پاک اٹھا کر اس دنیا میں حق کا بول بالا کر دیا اور عجمی اس عملی مثال سے متاثر ہو کر اسلام میں داخل ہوئے تو حضور پاک ﷺ کی محبت سے ان کے دل بھی لبریز ہو گئے اور انہوں نے بھی عربوں کی نقل میں اس جہاد کو عملی طور پر آگے بڑھا کر دنیا کے دوسرے ممالک میں اسلام کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اب غیر ہمیں کمزور کرنے اور نہتا بنانے کے لئے اسی حضور پاک ﷺ کی محبت کو ہمارے دلوں سے خارج کرنا چاہیں گے۔

یہ عاجز عملی مثالیں دے چکا ہے کہ 1947ء سے کشمیر میں جہاد کو شروع کرنے کے ساتھ یہ سازشیں ہمارے اسلام اور اعمال کو زنگ آلود کرنے پر بھی لگی ہوئی تھیں کیا کیا ''ڈرامے'' ہوئے، کیا غداریاں ہوئیں؟ کیا کوتاہیاں ہوئیں؟ کس طرح قبائلی مجاہدین کو کھلے میدان میں مار دلا کر ان کے ذہن سے ''جہاد کے کیڑے'' کو خارج کرنے کی کوشش کی۔ کس طرح ہم فوجیوں کو بغیر توپخانے کی مدد کے کشمیر کی جنگ میں جھونکا جاتا رہا کہ بھارتی ''سورما'' سے ہمیں مرعوب کرنا تھا۔ کس طرح فوج کا استعمال غلط اوقات پر کیا گیا اور کس طرح جہاد کو آتش بازی کے ڈرامے کے بعد ''جمود'' دے دیا گیا۔ کس طرح بہادری کے تمغوں سے ایسے لوگوں کو نواز دیا گیا جنہوں نے قوم سے وفاداری کی بجائے انگریز جنرلوں کے احکام مانے۔ کوئی ایک بات ہو تو یہ عاجز وضاحت کرے۔ میرے مضامین کے لفظ لفظ میں قوم کے لئے ''جھنجوڑ'' ہے کہ اے لوگو! تمہیں کس طرح بے جان اور بے غیرت بنانے کی تگ و دو جاری ہے۔ عزت نفس کا تمہارا معاملہ ختم ہے۔ تم لوگ اپنے گریبان میں منہ ڈالو کہ تمہیں کس

طرح گمراہ کیا جا رہا ہے اور تم غیروں کے ''پچھ لگ'' بن کر غیروں کے نظریات کی پیروکاری پر لگے ہوئے ہو کہ جہاد جو ہمارے لئے طرز زندگی ہے اس کو جمود دلا کر تمہیں مغربی فلسفہ دفاع کا پیروکار بنایا جا رہا ہے۔

تعلیم اس کے چاہیئے ترکِ جہاد
دنیا کو جس کے پنجہ خونیں سے ہو خطر

تو ''سقوط ڈھاکہ'' نے واقع ہونا تھا لیکن افسوس کہ ہم نے اس المیہ کے بعد یہ بھی نہ سوچا کہ اس المیہ کی وجوہات کیا تھیں اور اب قوم کے لئے صراط مستقیم کی تلاش کریں۔ حمود الرحمٰن کمیشن کے بارے تو بار بار گزارش کر چکا ہوں کہ انہوں نے قوم کے وقت اور دولت دونوں کا ضیاع کیا۔ تو اب اس عاجز نے قوم کے سامنے صحیح حالات کھول کر رکھ دیئے کہ کس نے اس سلسلہ میں کیا کچھ کیا۔ اور ہم پوری قوم ذمہ دار ہیں کہ کوتاہیاں قومی ہیں اور ہم اس طرف دھیان نہیں دے رہے لیکن چند افراد جو اس المیہ کے بڑے ایکٹر تھے۔ وہ سب عبرتناک انجام سے دو چار ہوئے۔ اس کے باوجود ان میں سے کسی ایک کو توبہ و ندامت کرنے کی توفیق نہ ہوئی بلکہ آخری ایام تک وہ اپنی غلط فہمیوں یا غلط کاریوں یا کوتاہیوں یا ''غداریوں'' کا دفاع کرتے رہے۔ جس کا کوئی جواز نہ تھا اس سلسلہ میں کچھ عملی مثالیں دینا ضروری ہیں کہ بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ لوگ بڑے مرتبوں پر پہنچ گئے اور انہوں نے سمجھا کہ ''یہ سب کچھ انہوں نے اپنی قابلیت'' سے حاصل کر لیا ہے اور یہ نہ سوچ سکے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ''امتحان'' میں ڈالا ہوا ہے کہ رب کی ذات کا فرمان ہے کہ بڑائی اور امیری میں بھی آزمائش ہوتی ہے کہ کون اپنے ''مقام'' پر رہتا ہے اور غریبی اور نچلا رہنے میں بھی آزمائش ہوتی ہے کہ کون صبر و شکر سے گزارا کرتا ہے۔''

اب سب سے پہلے جنرل امیر عبداللہ نیازی کا ذکر کروں گا کہ وہ فوج میں سپاہی بھرتی ہوئے اور یہ کچھ اس زمانے میں بے روزگاری کی وجہ سے کیا کہ شاید ترقی کر کے عہدیدار یا جمعدار، صوبیدار بن جائیں کہ ''کیڈٹ'' یعنی امیدوار کے طور پر بھی نہ بھرتی ہوئے کہ افسری کی امید ہو اور دوسری جنگ عظیم سے پہلے اور بعد بھی وہ فوج میں لانس نائک وغیرہ تھے کہ 1940ء میں جا کر نائیکی، حوالداری تک پہنچ گئے کہ ایمرجنسی کمیشن کھل گیا اور 1941ء میں وہ افسر بن گئے۔ دوسری جنگ عظیم میں انہوں نے ''نمایاں'' خدمات انجام دیں اور پاکستان جب وجود میں آیا تو وہ فوج کا ایک مانا ہوا میجر تھا اور فوجی سپہ گری کا مانا ہوا استاد تو چھوٹی ''تدبیرات'' کے فلسفہ کو خوب طور سے سمجھتا تھا اور بغیر کسی رکاوٹ کے ترقیاں کرتے وہ 1971ء میں لیفٹیننٹ جنرل بن گیا کہ انگریزوں سے دوسری جنگ عظیم میں بہادری کا تمغہ ملٹری کراس حاصل کرنے کے علاوہ ستمبر 1965ء میں اس کو ہلال جرأت کے تمغے سے بھی نواز دیا گیا اور وہ ''ٹائیگر نیازی'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ مشرقی پاکستان میں جو ذمہ داری اس نے ''قبول'' کی اس کو نبھانے سے صاحبزادہ یعقوب انکار کر چکا تھا۔ جنرل ٹکا خان نے یہ ذمہ داری چند دن سنبھالی لیکن کچھ ''اندرونی'' چخ چخ ضرور ہوئی کہ ٹکا خان کی جگہ نیازی کو بھیجا گیا کہ اس زمانے کے باقی دونوں لیفٹیننٹ جنرل گل حسن اور بہادر شیر بھی یہ ''ذمہ داری'' لینے کو تیار نہ تھے کہ ''اندھوں'' کو بھی نظر آ رہا تھا کہ بھارت کے ساتھ جنگ کی صورت میں، وہاں یہ کچھ ہونا تھا جو کچھ نیازی کے ساتھ ہوا۔ نیازی کی یہ ''سادگی'' تھی یا ''غلط فہمی'' کہ اس نے یہ ذمہ داری سوچے سمجھے بغیر سنبھال لی کہ اس کو زندگی میں جو بے شمار ''کامیابیاں'' ہوتی رہیں۔ اس نے سمجھا کہ یہاں بھی وہ

''کامیاب'' ہوگا۔

میں نے جنرل نیازی سے کہا کہ وقت آرہا ہے تمہارا نام گالی بن جائے گا

نیازی نے کچھ بھی نہ سوچا اور جو کچھ سوچا ''غلط'' سوچا اور بہادری سے اپنے جوانوں کو چند دن جولڑوایا اس کا طریقہ بھی غلط تھا اور یہ ایک لا حاصل اور بے مقصد ''مشق'' تھی اور ہتھیار ڈالنے کے سلسلہ میں جنرل نیازی صرف ایک بہانہ بناتا ہے کہ اس کو اوپر والوں یا یحییٰ خان نے حکم دیا کہ وہ ہتھیار ڈالے تو تب مغربی پاکستان بچ سکتا ہے تو اس نے حکم مانا۔ اب اس سلسلہ میں جنرل نیازی کوئی ثبوت نہیں پیش کرتا لیکن مانا جا سکتا ہے کہ یحییٰ خان نے ایسی ہدایت دی ہو کہ یحییٰ خان کے مشرقی پاکستان کو ''لات'' مارنے اور ''کھیل'' پر ہم بہت کچھ لکھ چکے ہیں لیکن ہمارے لحاظ سے جنرل نیازی کو یہ ذلت آمیز حکم نہ ماننا چاہیئے تھا۔ جنرل نیازی کو اسلام کی بھی کافی شدبد تھی اور بنیادی طور پر اس کا تعلق ایک اسلامی گھرانے اور اسلامی خاندان سے تھا اور نیازی عام افسران کی طرح شرابی کبابی بھی نہ تھا لیکن حیرانگی کی بات ہے کہ جب وہ قید سے رہا ہو کر آیا تو اس کے چہرے پر ذرا بھر ''پشیمانی'' کے اثرات نہ تھے۔ ادھر ہماری یہ حالت تھی کہ اس کے گہرے دوستوں میں سے اس عاجز اور برادرم محترم کرنل محمد اسلم عباسی نے جب ایک دوسرے کے ساتھ مشورہ کیا' کہ کیا جنرل نیازی کے ساتھ ''ملاقات'' کریں؟ تو ہم پر پشیمانی چھا گئی کہ اس کے ساتھ کیا بات کریں گے؟ یعنی ہم نیازی کو شرمسار تو نہ کر سکتے تھے اور باقی بھی کوئی بات کرنے والی نہ تھی کہ کیسے کہتے کہ اس نے ٹھیک کیا یا مجبوری تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ نیازی بھی جنگ کو ایک ''کھیل'' تماشہ سمجھتا رہا۔ جس میں ہار جیت ہوتی ہے اور اس نے اپنی طرف سے یہ کھیل خوب زور لگا کر کھیلا لیکن حالات کی مجبوری سے وہ ''کھیل'' ہار بیٹھا۔ یہ تھے اس عاجز اور اس کے اور مخلص رفقا کے تاثرات کہ فوج سے برخاست ہو جانے کے بعد' جنرل نیازی نے ایک سیاسی پارٹی کی بھی بنیاد رکھی۔ کچھ لوگوں نے کئی وجوہات کے تحت اس پارٹی میں شامل ہونا شروع کر دیا۔

نیازی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جنرل اروزہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے اسکی بہادری پر پانی پھر چکا ہے

جنرل نیازی یہ صورت حال دیکھ کر خوش ہوا اور لاہور جہاں وہ اپنے انتقال سے پہلے تک مقیم تھا وہاں سے مجھے خط لکھا کہ میں راولپنڈی میں اس کی پارٹی کی بنیاد رکھ کر اس کا سربراہ بن جاؤں۔ تو میں نے جواب دیا کہ کچھ لوگ جو اس کی پارٹی میں شامل ہوئے ہیں ان کو خیال ہوگا کہ تم کوئی خاص انکشافات کرو گے' کچھ ابن الوقت اور موقع پرست لوگ ہوں گے کہ ان کے مطابق آپ کے پاس کافی دولت ہے اور وہ آپ کے ''کارکن'' بن کر کچھ کما لیں۔ وقت آ رہا ہے کہ تمہارا نام ''گالی'' بن جائے گا۔ آپ کے لئے ایک ہی راستہ باقی ہے کہ اپنی غلطیاں اور کوتاہیاں وغیرہ تسلیم کرو اور باقی زندگی ندامت سے گزارو۔ لیکن جنرل نیازی پر کوئی اثرات نہ ہوئے بلکہ اپنے دفاع میں ایک کتاب بھی لکھ ڈالی جس میں انگریزوں کے زمانے میں اپنی بہادریوں کو بھی بیان کیا اور مشرقی پاکستان میں بہادری سے اتنے دن لڑنے کی کہانی' عسکری جائزوں کی مدد سے بیان کی کہ مغرب سے ہماری

حکومت نے حسب وعدہ کوئی کامیابی حاصل نہ کی تو اس وجہ سے نیازی کو شکست سے دو چار ہونا پڑا۔ بیچارے کو آج تک سمجھ نہیں آ رہی کہ جنرل اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بعد نیازی کی سب ''بہادریوں'' پر پانی پھر جاتا ہے۔ میں نے مجبوراً جنرل نیازی کو خط لکھا کہ اس نے یہ کتاب لکھ کر اپنا اور قوم کا وقت ''ضائع'' کیا ہے۔ کاش! قوم میں ایسے لوگ پیدا ہو جاتے جو کوتاہیوں اور عبرتناک انجام سے تو اسباق حاصل کرتے لیکن اکثر لوگ قوم کو ''بے وقوف'' بنانے سے باز نہیں آتے اور یہ نہیں سوچتے کہ وہ اپنے آپ کو بیوقوف بنا رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں دوسرے صاحب جنرل گل حسن کا ذکر ضروری ہے کہ مکمل طور پر مغربی تہذیب کا دلدادہ اور پیروکار ہونے کے باوجود لوگوں نے اس کے باقی اس قسم کے لوگوں کی طرح ''کرنٹے'' کا نام نہ دیا کہ خاندانی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے جنرل گل حسن کے کچھ اچھے اصول بھی تھے۔ وہ سچ سن بھی لیتا تھا اور اوپر والوں کے سامنے بھی سچ بولنے کی اس کو ہمت تھی۔ راقم کی اس کے ساتھ شناسائی کی وجہ سے' اس نے عہدہ کا کبھی خیال نہ کیا اور میری حد سے زیادہ عزت کرتا تھا اور خود اس میں بھی عزت نفس تھی لیکن شادی نہ کرنے کی وجہ سے اور شراب کا رسیا ہونے کی وجہ سے وہ بھی مار کھا گیا ورنہ اس سے ہمیں بڑی ''توقعات'' تھیں۔ اس نے تعلیم رائل انڈین ملٹری کالج ڈیرہ دون سے حاصل کی جہاں پڑھ کر امیر گھرانے کے لوگ فوج میں کمیشن حاصل کرتے تھے تو جنرل گل حسن جو پاکستان بنتے وقت کیپٹن تھا بالکل انگریزی رنگ میں رنگا فوج کا ایک پیشہ ور افسر مانا جاتا تھا۔ اس لئے وہ اہم عہدوں پر تعیّن رہا اور ستمبر 1965ء کی جنگ میں وہ جی ایچ کیو میں ڈائریکٹر ملٹری اپریشن تھا۔ اس جنگ نے مجھ پر یہ کچھ کھول کر رکھ دیا تھا کہ پاکستان کے تمام جنرل اور اعلیٰ فوجی قیادت والے کرنل کے عہدہ سے اوپر کی جنگ سے ''نابلد'' ہیں اور یہ عاجز ستمبر 1965ء کی جنگ پر بھرپور تبصرہ کر چکا ہے کہ سب تجاویز اور طریقے بودے تھے اور نہ صرف لڑنے والوں کو کوئی لڑانے والا نہ تھا بلکہ اوپر والی قیادت کی نااہلیوں اور ناسمجھیوں پر یہ عاجز بہت کچھ لکھ چکا ہے اور میرے پاس اس سلسلہ میں واقعاتی ثبوتوں کا اتنا مواد موجود ہے' کہ اس کے لیے ایک کتاب بھی کافی نہ ہو گی۔ زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں کسی نے آج تک اس سلسلہ میں کوئی بامقصد کتاب بھی نہیں لکھی کہ وہ کوتاہیاں کیا تھیں اور ہم کیا کچھ کر سکتے تھے۔ سوائے نوائے وقت میں کرنل غفار مہدی کے چند مضامین کے جن میں کچھ کوتاہیوں پر تبصرہ ہے۔ اس عاجز نے اب اپنے مضامین میں کچھ تبصرے کئے ہیں لیکن اخبار کے صفحات پر ایسے گہرے مضمون کو زیر بحث نہیں لایا جا سکتا اور پوری کتاب لکھنے کے نہ اس عاجز کے پاس ''ذرائع'' تھے نہ ہمارے فوجی یا قوم ایسے مضامین کی تہ میں جانا پسند کرتی ہے۔ تو گل حسن ملٹری آپریشنز کے ڈائریکٹر کے طور پر ان سب ''اعمال'' میں برابر کا ذمہ دار ہے کہ اس کے ہیڈکوارٹر نے پیدل دستوں کو اس طرح توڑ موڑ کر استعمال کرایا کہ مغربی طرز دفاع کے تدبیراتی پہلو اور ضرورتوں کی بھی ''ایسی تیسی'' کر دی گئی چنانچہ اس عاجز نے 1969ء میں جنرل گل حسن کو جو دفاع کے سلسلہ میں ''مسودہ'' پیش کیا تو یہ عاجز ایک طرح سے اپنی اعلیٰ قیادت پر ''عدم اعتماد'' کا اظہار کر رہا تھا کہ ستمبر 1970ء میں تو کھلے طور پر یحیٰی خان اور اس کے سب حواریوں کے سامنے اعلان کر دیا کہ فوج کا ''چھاتہ'' پاش پاش ہونے والا ہے۔ افسوس کہ جنرل گل حسن سمیت کسی بڑے افسر نے اپنے گریبان میں نہ جھانکا اور دسمبر 1971ء کی جنگ جس بھونڈے طریقے سے لڑی گئی اس کی تفصیل یہ عاجز پچھلے مضامین میں

بیان کر چکا ہے۔ یہ نااہلی تھی، کردار کی کمی تھی یا مشرقی پاکستان میں ایک ''ڈرامہ'' کر کے لات ماری جا رہی تھی اور ہمارے اوپر والوں کا ظاہر اور باطن بالکل دو مختلف سمتوں میں جا رہا تھا۔ جنرل گل حسن ایسے لوگوں میں بہت اوپر سطح والے لوگوں یعنی یحییٰ خان اور جنرل عبدالحمید کے بعد تیسرے نمبر پر ضرور آتا ہے کہ ان تین یحییٰ، حمید اور گل حسن کے اس سلسلہ میں قصور امیر عبداللہ نیازی سے زیادہ بھیانک ہے۔ اس کے باوجود گل حسن نے ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ بھی یارانہ ''گانٹھا'' ہوا تھا اور جو لوگ یہ کہتے تھے کہ اس بھیانک شکست کے بعد ذوالفقار بھٹو کی ''سیاست'' ہی باقی ماندہ پاکستان یعنی مغربی پاکستان کو قائم رکھ سکتی ہے۔ گل حسن ان میں پہلے نمبر پر تھا اور ائر مارشل رحیم کے ساتھ مل کر جنرل گل حسن نے ذوالفقار بھٹو کو پاکستان کی حکومت پر ''براجمان'' کرانے کے لئے ''بادشاہ گر'' کا کام کیا۔ اسی وجہ سے بھٹو نے جنرل گل حسن کو بری فوج کی سربراہی سونپ دی اور جنرل عبدالحمید وغیرہ جن جنرلوں کو بھٹو نے ''تخت'' سنبھالتے بے عزتی سے پہلے ہی دن ریٹائر کرنے کے احکام دیئے۔ ان سب کے نام جنرل گل حسن نے بھٹو کو دیئے اور بغیر کسی تفتیش کے بھٹو نے ان سب کو ''نااہلی'' کی بنا پر نکالنے کا اعلان کر دیا۔

اب فطرت کھڑی ''ہنس'' رہی تھی کہ دراصل ذوالفقار علی بھٹو اور گل حسن بھی اس المیہ کے ذمہ دار تھے لیکن انکی ''باری'' ابھی نہ آئی تھی کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا راز ہے۔ اس کے ساتھ جو کچھ کسی نے کیا وہ اس دنیا میں بھی عبرتناک انجام سے دوچار ہوا۔ پس کسی کو بھٹو کی طرح لمبی رسی ملی تھی کہ اس نے زیادہ عبرتناک انجام سے ''دوچار'' ہونا تھا، لیکن جنرل گل حسن کو وقت کم ملا کہ اس نے مقابلتاً کم ''بے عزتی'' سے دوچار ہونا تھا۔ تو ہماری گزارش پر وہ بھٹو کو جلدی تیار کر کے لے آیا کہ وہ ہمیں خطاب کر کے اپنی شخصیت کو ہمارے سامنے ''بحال'' کرے کہ وہ کیا ''چیز'' ہے اور اس کے ''ارادے'' کیا ہیں۔ بھٹو ایک غلط فہمی میں تھا کہ ساری فوج میں جنرل یحییٰ خان، اختر ملک اور گل حسن کی طرح شرابی کبابی ہیں۔ اس کو جلد معلوم ہو گیا کہ پاکستان کی فوج کی ریڑھ کی ہڈی مذہبی لوگ ہیں بہرحال بھٹو کی کہانی بعد میں آ رہی ہے لیکن بھٹو جلدی سے اپنے آپ کو ''بادشاہ گروں'' یعنی ائر مارشل رحیم اور جنرل گل حسن کی 'محتاجی' سے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ ادھر جنرل گل حسن وغیرہ نے اس کو باور کرا دیا تھا کہ بھٹو سویلین پر حکومت کرے۔ وہ فوج میں اس کی کسی ''مداخلت'' کی اجازت نہ دیں گے۔ بھٹو نے سازش 1951ء کے مقدمہ میں ''ملوث'' جنرل اکبر خان طارق کو اپنا سکیورٹی کا ''مشیر'' مقرر کیا اور اس طرح سے فوج پر ''غلبہ'' حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن اکبر خان اب 1971ء کی فوج کیلئے ''قدیم'' یا ''آؤٹ آف ڈیٹ'' یا ''آؤٹ آف پلیس'' ہو چکا تھا۔ تو بھٹو کو بڑی مایوسی ہوئی کہ کوئی اس کو خاطر میں نہ لا رہا تھا کہ اس کا فوج پر ''کنٹرول'' نہ تھا۔ تو فروری 1972ء میں وہ پھر ایوب ہال میں ''آدھمکا'' کہ شعبدہ بازی سے ہمیں کچھ ''ڈرانے دھمکانے'' کی کوشش کی اور سوالوں کی اجازت دیئے بغیر وہ جانے لگا تو اس عاجز کو کسی غیبی طاقت نے کھڑا کر دیا کہ بھٹو کو اس طرح جانے مت دو اور اس عاجز نے جو اس کی ''طبیعت'' صاف کی یہ پوری کہانی بعد میں بیان کریں گے، لیکن بھٹو کو سمجھ آ گئی کہ فوج میں ابھی تک کافی غیرت مند لوگ موجود ہیں اور پاکستانی فوج کو وہ ''مہاراجہ کی فوج'' یا ''ریاستی فوج'' نہ بنا سکے گا۔ اس کو گل حسن کی بجائے کسی ''ہاں جی'' کرنے والے جنرل کی ضرورت ہے جس کے فوج پر بھی ''اثرات'' ہوں اور بعد میں اس عاجز نے جنرلوں کے ساتھ بھٹو کے ساتھ چائے بھی پی تو مجھے

نظر آ گیا کہ بھٹو کی نظر ٹکا خان پر پڑ گئی کہ اس کو کسی ایسے ''ہاں جی'' والے کی ضرورت ہے جو شرابی کبابی نہ ہونے کی وجہ سے یا ستمبر 65ء میں سیالکوٹ میں اچھے کام یا کچھ ''سادگی'' کی وجہ سے فوج میں گل حسن کی نسبت زیادہ ''پاپولر'' تھا اور وہ گل حسن سے سینئر بھی تھا۔

اب بھٹو نے ایک چال اور ڈرامہ کے ذریعے سے جو جنرل گل حسن اور ائر مارشل رحیم کو ''چلتا'' کیا یہ بڑا خطرناک کھیل تھا۔ اگر گل حسن چوکنا رہتا اور ضروری حفاظتی اقدام کرتا تو یہ ''ڈرامہ'' اور ''جوا'' اسی طرح ناکام ہوتا جس طرح نواز شریف کا جنرل مشرف کو چلتا کرنے کا ڈرامہ ناکام ہوا تھا۔ لیکن گل حسن کسی غلط فہمی کا ''شکار'' تھا یا اس کو معلوم تھا کہ اس کا ''گزارا'' بھٹو کے ساتھ نہ ہو سکے گا اور اس کے مطابق وہ کسی وقت بھی کرسی ''چھوڑنے'' کو تیار تھا تو اس نے ''حفظ ماتقدم'' کا کوئی بندوبست نہ کیا۔ اس کو صرف یہ افسوس تھا کہ بھٹو نے اس کو نکالنے کیلئے بڑا بے عزتی والا طریقہ اختیار کیا۔ یہ کچھ شاید اس کو مرتے دم تک سمجھ نہ آیا کہ یہ ''بے عزتی'' فطرت کی ضرورت تھی کہ جنرل گل حسن نے جو کچھ پاکستان کے ساتھ کیا' یا ''ہونے دیا'' تو اس کے لئے ''عبرت'' نے بھی ظہور پذیر ہونا تھا کہ بھٹو نے جنرل گل حسن اور ائر مارشل رحیم کو ایوانِ صدر میں ایک پارٹی میں مدعو کیا جو شام کے وقت تھی اور وہاں دونوں سے استعفیٰ پر دستخط کرائے۔ پنجاب کا گورنر مصطفیٰ کھر وہاں موجود تھا اور دونوں کو کھر کے ''حوالے'' کیا کہ وہ دونوں کو لے کر پولیس کی حفاظت میں راتوں رات سفر کرا کے لاہور گورنمنٹ ہاؤس میں لے گیا۔ جہاں وہ ایک رات اور ایک دن ''نیم حراست'' میں رہے۔ ادھر اسی شام سے پہلے بھٹو نے ایک ہیلی کاپٹر میں اپنے وزیر خورشید حسن میر کو بھیج کر ملتان سے جنرل ٹکا خان کو منگوا کر فوج پر ''براجمان'' کر دیا اور جب ٹکا خان نے دوسرے دن بھٹو کو رپورٹ دی کہ بری فوج پر اس کا ''کنٹرول'' ہو گیا ہے تو لاہور میں گل حسن اور ر... حراست سے رہا کرا کے راولپنڈی کے ایک گیسٹ ہاؤس میں لا کر چھوڑ دیا کہ ایک ہفتہ وہاں ان کی ''نگرانی'' کی جائے گی۔ اس کے بعد وہ ''آزاد'' ہیں۔

جنرل ضیاء الحق نے گل حسن کو باور کرا دیا کہ اب وہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہے اُس کے پاس گل حسن جیسے مہربانوں کیلئے ٹائم نہیں

بھٹو نے تقرریوں میں ایک اہم تبدیلی کی کہ تینوں افواج میں جو ''کمانڈر انچیف'' کا عہدہ تھا اس کو ختم کر کے تینوں فوجوں کے سربراہوں کے عہدہ کا نام ''چیف آف سٹاف'' کر دیا اور فضائیہ یا بحریہ کے یہ عہدے جو پہلے بری فوج کے لیفٹیننٹ جنرل کے برابر ہوتے تھے اب ان کو بھی پورے جنرل کے برابر ایڈمرل اور ائر چیف مارشل کر دیا کہ بری فوج کے سربراہ کی ''وقعت'' کم ہو اور ائر مارشل رحیم کی جگہ ایک قادیانی ظفر چودھری کے سر پر فضائیہ کی سربراہی کا تاج رکھا جو پیشہ ورانہ لحاظ سے رحیم سے بہتر تھا اور بھٹو نے گل حسن اور رحیم دونوں کو سفارتی عہدے دینے کی پیشکش کر دی۔ گل حسن جب راولپنڈی واپس پہنچا اور اس کو لوگوں سے ملنے کی اجازت ہو گئی تو اس نے مجھے بلا بھیجا کہ میں اس کو ملوں کہ وہ میرے ساتھ کچھ ''مشورہ'' کرنا چاہتا ہے۔ اول جنرل ٹکا خان نے اس کو دعوت دی ہے کہ فوج کے جنرل اس کو الوداعی دعوت دینا چاہتے ہیں لیکن اس کو جس طرح ''بے عزتی'' سے

فوج سے نکالا گیا ہے اس کا ''دعوت'' میں جانے کو دل نہیں کرتا۔ میں نے گزارش کی کہ دعوت میں نہ جانے سے کیا یہ ''بے عزتی'' ختم ہو جائیگی یا کیا تم آئندہ زندگی گوشہ نشینی میں گزارو گے؟ جنرلوں کو نہ ملا کرو گے اور جنرل آپ کو عزت سے دعوت دے رہے ہیں۔ دعوت میں ضرور جاؤ۔ دوسری بات گل حسن نے یہ کی کہ بھٹو نے اس کو سفارت کی پیشکش کی ہے وہ منظور کرے یا نہ کرے میں نے پہلا سوال یہ پوچھا کہ اس کی مالی حالت کیا ہے اس نے کہا اس نے کوئی ''جائیداد'' نہیں بنائی۔ معمولی سی خاندانی جائیداد ہے اس کی آمدن پر گزارا نہیں ہو سکتا تو اس عاجز نے گزارش کی کہ پھر تو زیادہ ضروری ہے کہ سفارتی عہدہ قبول کر لیا جائے۔ یہاں کی ''خفیہ نگرانی'' سے بھی بچ جاؤ گے۔ گل حسن نے میرے دونوں مشورے قبول کئے لیکن جب ضیاء الحق نے بھٹو کو حراست میں لے لیا تو گل حسن سفارتی عہدہ چھوڑ کر پاکستان کی طرف ''سرپٹ'' دوڑ پڑا کہ ضیاء الحق' گل حسن کی رپورٹوں کی وجہ سے ترقیاں کرتا رہا تھا اور گل حسن کا بڑا ''وفادار'' مانا جاتا تھا۔ یہاں جب گل حسن پہنچا تو اس کو ضیاء الحق نے کسی کے ساتھ ملاقات بھی نہ کرنے دی اور ہوائی اڈہ سے سہالہ ریسٹ ہاؤس میں سرکاری نگرانی میں ''سرکاری مہمان'' بنا دیا گیا اور اس کو وہاں باور کرایا گیا کہ وہ اب گل حسن کے زمانے کا کرنل یا بریگیڈیئر ضیاء الحق نہیں۔ وہ پاکستان کا چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہے۔ اس کے پاس گل حسن جیسے ''مہربانوں'' کے ساتھ بات کرنے کا ''وقت'' نہیں ہے۔ اپنے سفارتی عہدوں پر ''قائم'' رہو اور پاکستان میں چھٹی لے کر بھی نہ آیا کرو ضیاء الحق نے اپنے ایک اور ''مہربان'' اور ڈویژن کمانڈر کو تو اپنا وزیر خارجہ بھی بنا لیا' لیکن ضیاء الحق کے پاس گل حسن یا مجھ جیسے ''رفقا'' سے ملنے کا بھی وقت نہ تھا۔ میں اپنی کہانی بعد میں لکھوں گا کہ حکومت پر ''براجمان'' ہونے سے پہلے ضیاء الحق کا میں بڑا بھائی یعنی ''لالہ'' تھا۔ جہاں میں کھڑا ہوتا تھا وہ خود چل کر میرے پاس آتا تھا۔ حکومت میں آنے کے بعد میرے اکثر خطوط کا جواب تک نہ دیا اور اس کے ڈویژن کمانڈر صاحبزادہ یعقوب جیسے لوگ ہر حکمران کی ''ضرورت'' ہوتے ہیں۔ گل حسن ایک خود پسند اور کافی حد تک سچا اور ''حق پرست'' آدمی تھا۔ لیکن ''ہم پیالہ'' ہونے کی وجہ سے بھٹو نے اپنا ''جادو'' گل حسن پر چلا لیا۔ یہ گل حسن میں مومن کی فراست کی کمی کی وجہ سے ہوا کہ خاندانی اسلامی اقدار کے علاوہ گل حسن اسلامی تعلیم سے کافی ''نابلد'' تھا اور ڈیرہ دون کے رائل کالج نے اس کو ''نیم انگریز'' بنا دیا تھا۔ ضیاء کی ہلاکت کے بعد وہ پاکستان آ گیا تھا۔ ایک یورپین امیر عورت کے ساتھ شادی بھی کر لی تھی اور اس سے ایک بیٹا بھی ہوا' لیکن وہ لوگ پاکستان نہ آئے اور گل حسن نے زندگی کے آخری دس بارہ سال ''گمنامی'' اور گوشہ نشینی کی حالت میں گزارے اور میں نے اس سے کوئی رابطہ نہ باندھا کہ کیا بات کریں گے۔

لیکن اچانک جب جنرل گل حسن کی ''اپنے دفاع'' میں ایک کتاب مارکیٹ میں آ گئی تو وہ کتاب پڑھ کر مجھے افسوس ہوا کہ کاش! میں گل حسن کو مل لیتا۔ اور گل حسن نے جو کتاب میں چند صحیح حقائق لکھے ہیں میں گل حسن کو مشورہ دیتا کہ وہ پورا سچ لکھتا اور اپنا دفاع نہ کرتا اور ندامت کرتا تو یہ ایک قومی خدمت ہوتی۔ افسوس! اس کتاب میں گل حسن نے زیادہ وقت مغربی پاکستان کی ناکام فوجی کارروائیوں کا ''بوجھ'' جنرل عبدالحمید پر ڈالنے کی کوشش کی۔ جنرل حمید مر چکا تھا لیکن اس کے ایک ''خاص حواری'' میجر جنرل ابوبکر مٹھا نے ایک کتاب جواب میں لکھ کر گل حسن کے الفاظ سے سب کوتاہیوں اور ناکامیوں کا ذمہ دار گل حسن کو بنا دیا اور صحیح بات یہ عاجز لکھ چکا ہے

کہ جنرل عبدالحمید اور جنرل گل حسن کہتے ہیں کہ نیازی کرنل کی سطح سے اوپر فوجی تزویرات سے بالکل نابلد تھا اور یہ بات صحیح ہے لیکن اصلی بات یہ عاجز پہلے ہی بیان کر چکا ہے کہ پاکستان کے سب جنرل چند ایک کو چھوڑ کر کرنل کے عہدہ کے اوپر کے پیشہ سے ''نابلد'' تھے اور گل حسن بھی ان میں شامل ہے۔ تو گل حسن نے مشرقی پاکستان کے سلسلہ میں جو ساری ذمہ داری نیازی کے سر ڈال دی یہ تجزیہ بھی غلط ہے کہ گل حسن اور ہماری ساری اوپر کی نااہل کمانڈ والے مشرقی پاکستان کے دفاع کو مغربی پاکستان سے طاقت یا مدد دینے میں بری طرح ناکام رہے اور یہ عاجز اپنے پہلے مضامین میں ثابت کر چکا ہے کہ کوتاہی حد سے بڑھی ہوئی تھی تو جنرل گل حسن جو کافی حد تک سچا آدمی مانا جاتا تھا۔ وہ آخری کوشش میں بھی قوم کے لئے کوئی نشانِ راہ تلاش نہ کر سکا۔ انہی دنوں میں الطاف گوہر نے ایوب خان اور ستمبر 65ء کی جنگ کے سلسلہ میں ایک کتاب لکھ ڈالی تھی جس میں کچھ ''سچی'' باتیں ہیں لیکن وہ بھی ایک ''لاحصل مشق'' تھی کہ قوم کے لئے کوئی نشانِ راہ نہیں دیا گیا تو اس عاجز نے انہی دنوں میں تقریباً ایک سو بیس صفحات کی کتاب ''پنڈورا باکس'' لکھ کر دونوں جنگوں کی کوتاہیوں اور اپنے لئے ندامت کرنے کے سلسلہ میں کچھ لکھ کر قوم کی توجہ گل حسن اور الطاف گوہر کی دونوں کتابوں کی طرف دلائی کہ یہ لاحاصل مشقیں ہیں۔ قوم کے دانشور میری اس چھوٹی سی کتاب میں حقائق کو بہتر طور پر اجاگر کیا ہوا پائیں گے اور اب ایک سال سے مجید نظامی کی مہربانی سے قوم کو صحیح صورتحال سے آگاہ کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔

کہ اس سلسلہ میں جنرل عبدالحمید جس کو جنرل یحییٰ خان کا ''سایہ'' کہا جاتا تھا اس کا ''خاموش'' کردار اتنا ہی بھیانک ہے جتنا یحییٰ خان گل حسن اور نیازی وغیرہ کا ہے۔ یہ صاحب یحییٰ خان کے ساتھ انہی ہی کے کورس کے ساتھ 1938ء میں انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون سے پاس ہوئے اور بہتر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے یحییٰ خان سے ایک نمبر سینئر تھے اور ان کو سونے کا تمغہ بھی ملا تھا۔ جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی شخصیت کے گرد ایک بہت بڑا قلعہ تعمیر کیا ہوا تھا اور بڑے فوجی ''مدبر'' اور ''مفکر'' مانے جاتے تھے لیکن شراب اور کباب میں یا ظاہری کردار میں یحییٰ خان کے ''سایہ'' مانے جاتے تھے کہ یحییٰ ''باتونی'' تھا اور یہ صاحب ''خاموش'' تھے بہرحال 1952ء سے یہ عاجز ان دونوں کی کلب کی بے حیا زندگی پر بہت کچھ لکھ چکا ہے کہ یہ دونوں صاحبان اپنے پیشہ کی طرف ذرا بھی دھیان نہ دیتے تھے لیکن ان کی ایک ''لابی'' تھی جو ان کو عظیم پیشہ ور جنرل ''گردانتی'' رہتی تھی اور جنرل حمید کو تو پاکستان کی قومی ضرورتوں کے مدنظر اپنے دفاع کو ''تراش'' کرنے کی ذمہ داری بھی دی گئی تھی اور جنرل حمید نے ایک غیر معروف جرمن لکھاڑی کی کتاب کے انگریزی ترجمہ سے چند ''الفاظ'' نقل کر کے لڑائی لڑنے کا ایک ''نیا طریقہ'' فوج کے سامنے پیش کیا اور ایوب خان و موسیٰ خان کو ایسا بے وقوف بنایا کہ انہوں نے ہمارے پروٹیسٹوں کے باوجود یہ ''طریقہ'' اپنا لیا جو اتنا ''بوگس'' تھا کہ ستمبر 65ء کی جنگ میں ہم نے اس طریقہ کو ایک دن بھی نہ اپنایا اور اپنے طریقوں یا پرانی روایات کے مطابق یا مدد سے جنگ لڑی تو ظاہر ہے ستمبر 65ء کی جنگ کے بعد اگر جنرل حمید کا کورٹ مارشل نہ کیا جا سکتا تھا کہ ایوب خان اور محمد موسیٰ بھی ''قصوروار'' تھے تو حمید کو فوج سے ضرور نکال دینا چاہیئے تھا کہ ستمبر 65ء کی جنگ میں جنرل حمید کے رویہ پر ایوب ناراض بھی ہوا تھا کہ اس نے بکتر بند دستوں کی مدد نہ کی اور خود بھی کوئی کامیابی حاصل نہ کی تھی۔ بہرحال یحییٰ خان کی دوستی نے حمید کو بچا لیا اور جب

یحییٰ خان کو فوج کا سربراہ بنایا گیا تو یحییٰ خان سے باقی سینئر میجر جنرلوں ملک شیر بہادر اور محمد سرفراز وغیرہ نے تو ریٹائرمنٹ لے لی لیکن حمید نوکری کو چمٹا رہا اور یحییٰ خان نے اس کو لیفٹیننٹ جنرل بنا دیا اور وہ کور کمانڈر بن گیا اور یحییٰ کا ''نائب'' بھی' کہ جب یحییٰ ملک سے باہر ہوتا تو بری فوج کی سربراہی اسی کو ملتی ایوب خان نے عبدالحمید کو ''ٹٹولا'' تھا کہ کیا وہ ایوب کی ''گیم'' کھیلنے پر تیار ہے؟ تو حمید نے ایوب خان کو ''مایوس'' کیا تھا وہ یحییٰ خان کا ''وفادار'' نکلا۔

اب جب یحییٰ خان نے صدارت سنبھال لی' تو وہ لیفٹیننٹ جنرل عبدالحمید کو بھی جی ایچ کیو میں لے آیا' کہ وہاں اس کو بھی جنرل بنا کر بری فوج کا چیف آف سٹاف بنا دیا اور ایک طرح سے بری فوج کے تمام روزانہ کے کام اس کے سپرد کر دیئے۔ یحییٰ خان کبھی کبھی جی ایچ کیو کا چکر لگاتا تھا اور ایسے ہی طریقے کو ضیاء الحق نے جاری رکھا اور آج کل جنرل مشرف نے بھی یہی طریقہ اپنایا ہوا ہے تو 1971ء کی جنگ کی ساری تجاویز کا نگران یہی جنرل حمید تھا کہ جنرل گل حسن نے اس پر ''بے اثر'' ہونے یا ''فیصلے'' نہ دینے کے الزامات لگائے ہیں اور ان باتوں میں کافی سچّائی موجود ہے کہ جنرل حمید نے ویسے بھی اپنی ''شخصیت'' پر قلعے تعمیر کرنے کے لئے یہ طریقہ اپنایا ہوا تھا کہ باتوں کو ادھورا چھوڑ کر اپنے ماتحتوں کو ساتھ رکھنے کے لئے ان کو ''سوالات'' کی دعوت دے دیا کرتا تھا اور سوالات سن کر اپنے ماتحتوں کو ''خراجِ تحسین'' پیش کرتا تھا اور کہتا تھا' کہ بڑے اچھے ''سوالات'' ہیں' تم لوگ اس سلسلہ میں اور بھی سوچ و بچار کرو وہ بھی مزید سوچے گا اور پھر مل کر اس مضمون یا تجویز کو آگے بڑھائیں گے لیکن دوسرا ''مرحلہ'' کبھی نہ آتا تھا اور معاملات ''درمیان'' ہی میں رہتے تھے یا اگر کوئی معمولی کام ہوتا تھا تو جنرل حمید ان سوالات کی سوچوں کی مدد سے کوئی فیصلہ بھی کر دیتا تھا کہ یہ طریقہ اس نے اپنی ''کم علمی'' یا ''نااہلی'' یا ''نامکمل مطالعہ'' پر پردہ ڈالنے کے لئے ''اختیار'' کیا ہوا تھا کہ اپنے آپ کو بڑا ''مدبر'' بنانے کے لئے مشہور کیا ہوا تھا کہ وہ ماتحتوں سے مشورہ بھی کرتا ہے لیکن فیصلے اپنے ''تدبر'' سے کرتا ہے اور وہ بڑا ''فوجی مفکر'' بنا ہوا تھا لیکن خود غرضی کی یہ حالت تھی کہ اس کا ایک بیٹا فوج میں اس کی پرانی بلوچ پلٹن میں کیپٹن تھا۔ 1971ء کی جنگ کے وقت یہ پلٹن راولپنڈی سے چھمب جوڑیاں محاذ پر جانے لگی' تو پلٹن کے کرنل کو پیغام بھیجا کہ وہ اس کے بیٹے کو راولپنڈی ہی چھوڑ جائے۔ 1971ء کے المیہ کے بعد کوئی افسر اس کیپٹن کے ساتھ بات کرنے کو تیار نہ ہوتا تھا کہ جنرل اکبر اور کئی سینئر افسروں کے بیٹے جنگ میں شہید ہوئے تھے تو اس کیپٹن نے مجبور اور تنگ ہو کر جنگ کے بعد فوج سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

لیکن جنرل عبدالحمید جس طرح ساری عمر فوج والوں کو بے وقوف بنا کر بڑا مفکر بنا ہوا تھا۔ دسمبر 1971ء کے المیہ کے باوجود اس کو یہ سمجھ نہ آئی کہ وہ بالکل ''ننگا'' ہو چکا ہے کہ دسمبر 1971ء کے تیسرے ہفتہ میں اس نے پنڈی میں موجود یا زیادہ تر جی ایچ کیو کے افسروں کو ایوب ہال میں خطاب کرنے کے ایک ''ڈرامہ'' کی کوشش کی۔ مگر مچھ کے چند آنسو بہا کر افسروں کو پرانے طریقہ پر سوالات اور رائے دینے کی دعوت دے دی' کہ اب حالات کو کیسے سنبھالا دیا جائے لیکن حالات سامنے تھے۔ ایوب ہال میں اودھم مچ گیا بلکہ کچھ لوگوں نے ہلڑ مچا دیا' کہ یحییٰ خان اور عبدالحمید کے کردار اور طریقوں پر سیدھے طور پر ''حملہ آور'' ہو گئے۔ دراصل سوال پوچھنے والوں میں یا

رائے دینے والوں میں غیر لڑاکا فوج سے ای ایم ای کے کرنل اختر علی یا ریماونٹ کے کرنل افتخار جیسے سنجیدہ لوگ بھی تھے تو دوسری طرف جنرل گل حسن جو سامعین میں بیٹھا تھا' اس نے بریگیڈیئر فضل رازق جیسے لوگوں کو بھی سوالوں کے ساتھ تیار کیا ہوا تھا' جس خود کی کارکردگی بڑی ''سوالیہ'' تھی اور مجھے بھی گل حسن کی طرف سے پیغام مل چکا تھا کہ میں جنرل عبدالحمید کی خوب ''گت'' بناؤں علاوہ ازیں بھٹو ''لابی'' کے افسر بھی موجود تھے جو یحییٰ خان اور حمید کو مستعفی ہونے کے لئے کہہ رہے تھے لیکن ہلڑ بازی اتنی زیادہ تھی کہ ایک وقت دو تین افسران اکٹھے بولنا شروع کر دیتے تھے اور جنرل عبدالحمید کے کنٹرول سے معاملات باہر ہو رہے تھے تو کسی غیبی طاقت نے مجھے کھڑا کر دیا اور میں نے زور زور سے سب کو خاموش ہونے کا ایسا ''نعرہ مستانہ'' لگا دیا کہ سب لوگ ''خاموش'' ہو گئے۔ تو اس عاجز نے گزارش کی کہ یہ عاجز عہدہ کے لحاظ سے بہت چھوٹا ہے لیکن عمر میں کوئی ایک آدھ صاحب مجھ سے چند سال بڑا ہوگا۔ میں آپ سے سوال پوچھتا ہوں کہ آج سے صرف تقریباً ایک سال پہلے ستمبر 1970ء میں اس عاجز نے اعلان کر دیا تھا کہ فوج کا چھاتہ پاش پاش ہونے والا ہے، آپ لوگوں میں سے ستر فیصد لوگ اس دن یہاں موجود تھے آپ میں سے کسی ایک آدمی کو ہمت نہ ہوئی تھی کہ میری ''امداد'' میں بات کرتا لیکن آج جنرل عبدالحمید چونکہ شکست خوردہ ہے تو بریگیڈیئر فضل رازق جیسے لوگ اپنے اندر جھانکنے کی بجائے جنرل حمید پر ''برس'' رہے ہیں اس لئے سب لوگ خاموش ہو جائیں اور مجھے جنرل عبدالحمید سے ایک چھوٹا سا سوال پوچھنے دیں۔

تو اس عاجز نے نہایت ادب کے ساتھ جنرل عبدالحمید سے گزارش کی کہ جنرل صاحب! میں آپ کی ''ہمت'' کو داد دیتا ہوں کہ آپ ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ اور ستمبر 1970ء کا سوال دہراتا ہوں کہ کیا آپ اور یحییٰ خان دونوں یا آپ اکیلے توبہ و ندامت کر کے صراط مستقیم پر چلنے کو تیار ہیں آپ کھلے طور پر اگر ''ہاں'' میں جواب دیں تو یہ عاجز چند الفاظ میں نشان راہ بیان کر کے پورے ہال سے اس پر عمل پیرا ہونے کی قسم لے گا۔ تو ہم حالات کو اللہ تعالیٰ کی مدد سے سنوار سکتے ہیں' میں نے دو تین دفعہ جنرل حمید کو ''ہاں'' کی گزارش کی لیکن وہ حسب معمول ''خاموش'' تھا کہ میرے سامنے اس کی پوزیشن ''ثانوی'' ہو رہی تھی۔ تو اس عاجز نے زور دے کر اعلان کر دیا ''جنرل صاحب! آپ ہاں نہیں کر رہے تو فطرت کی طرف سے ہمیں مزید سزا دینے والا پشاور کے ہوائی اڈہ پر اترنے والا ہے۔ ائر مارشل رحیم اس کو ''خوش آمدید'' کہنے کے لئے پشاور پہنچ چکا ہے۔ یہاں راولپنڈی میں میرے مہربان جنرل گل حسن جو میرے نزدیک بیٹھے ہیں' وہ اس کو ''حفاظت'' مہیا کرنے کا بندوبست کر چکے ہیں۔ آپ مزید بحث میں پڑ کر کچھ حاصل نہ کر سکیں گے۔ بہتر ہے یہ اکٹھ اب تتر بتر ہو کر ملک کے لئے دعا کرے'' قارئین اس میں میرا اشارہ ذوالفقار بھٹو کی طرف تھا جو اقوام متحدہ میں پولینڈ کی قرارداد پھاڑ کر ملک واپس پہنچ رہا تھا اور نوے ہزار فوجی ''ڈبل ہوسٹیج'' یا یرغمال بن چکے تھے۔ جنرل عبدالحمید اس کے پروردہ میجر جنرل ابوبکر مٹھا نے راولپنڈی میں موجود کمانڈو فوج کے انچارج بریگیڈیئر غلام محمد کو اپنے ساتھ ملا کر راولپنڈی کا کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کی تھی' لیکن غلام محمد نے اپنے ''باس'' لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کا حکم مانا اور پنڈی کا کنٹرول گل حسن کے پاس تھا کہ ائر مارشل رحیم کے احکام کے تحت لڑاکا ہوائی جہاز یحییٰ خان کے ایوانِ صدر پر ''ڈبکیاں'' لگا رہے تھے اور کھاریاں یا کئی مقامات سے میجر جنرل آر ڈی شمیم یا بریگیڈیئر اقبال مہدی شاہ یا کرنل آفریدی وغیرہ یحییٰ خان

اور اس کے گروہ کو ''دھمکیاں'' دے رہے تھے کہ وہ مستعفی ہو جائیں ورنہ وہ راولپنڈی کی طرف حرکت شروع کر دیں گے۔ اس لئے فطرت جب کسی کو لمبی رسی دیتی ہے تو اچانک اس رسی کو کاٹ بھی دیتی ہے یا کسی کو بہت زیادہ بلندیاں دے دیتی ہے تو اچانک ایک تختہ نیچے سے نکال کر اس کو ''دھڑام'' سے گرا بھی دیتی ہے کہ یہ لوگ جو بڑے طاقتور بنے پھرتے ہوتے ہیں دراصل سب سے زیادہ ''کمزور'' ہوتے ہیں۔ ایک ہی دن میں یحییٰ خان' جنرل عبدالحمید' جنرل غلام عمر' جنرل ابوبکر مٹھا' جنرل پیرزادہ' جنرل خداداد' جنرل شوکت رضا وغیرہ' متعدّد جنرلوں اور بریگیڈیروں کا ''پتا'' کاٹ دیا گیا اور کسی نے ''چوں'' بھی نہ کی بلکہ کوئی آنسو بھی نہ بہایا گیا۔

قارئین! میرے حساب سے یہ ''سزا'' بہت تھوڑی اور معمولی ہے کہ جس نے سزا دی وہ خود زیادہ قصور وار تھا اور اس کو خود بعد میں زیادہ عبرتناک سزا ملی۔ سب کو صحیح سزا کون دیتا؟ بھٹو خود کے بارے کہہ سکتے ہیں ''بلی دودھ کی رکھوالی'' بہرحال وہ کہانی بعد میں آ رہی ہے۔ فوج سے جن باقی جنرلوں کو ریٹائر کر دیا گیا ان میں ایک میرے پرانے رفیق اور میری پلٹن کے پرانے کرنل میجر جنرل بی ایم مصطفیٰ بھی تھے جن کو خواہ مخواہ اس وجہ سے ریٹائر کر دیا گیا تھا کہ وہ دسمبر 71ء کی جنگ میں جیسلمیر کی طرف ریگستان میں پیش قدمی نہ کر سکے تھے۔ وہ جنوری 1972ء میں مجھے ملنے آئے تھے اور کہنے لگے کہ دعا کرو کہ اس ذلت کی زندگی سے جلد چھٹکارا حاصل ہو اور پھر وہ جلدی وفات بھی پا گئے کہ اکیلے آدمی تھے نہ شادی کی اور نہ کوئی ذمہ داری تھی کہنے لگے کہ انہوں نے تو فوج سے کب کا استعفیٰ دیا ہوا تھا اور پرانے زمانے میں ہم تمہیں ''قدامت پسند'' وغیرہ یعنی بڑا rigid یا ضدی سمجھتے تھے اور تمہاری جہاد اور اسلام کی باتوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ اول تو تم نے ستمبر 65ء کی جنگ میں لاہور کو بچا کر اپنے رویوں کو عملی طور پر صحیح کر دیا تھا لیکن اب تو تمہاری ہر بات سچّی معلوم ہوتی ہے۔ کہاں گئیں ہماری ''جرنیلیاں'' ہم نے قوم کو کیا دیا؟ خود بھی ذلیل ہوئے اور قوم کو بھی ذلالت سے دو چار کیا۔ تم اپنی یہ تبلیغ جاری رکھو۔ تمہارا اجر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے''۔

اب بڑا لمبا مضمون سامنے ہے کہ بھٹو نے ''تخت'' کیسے حاصل کیا اور ''تختہ'' اتنی دیر کے بعد ملا۔ لیکن افسوس کہ اتنے سبق آموز واقعات کے باوجود قوم اب بھی توبہ و ندامت کی طرف نہیں آ رہی۔ ذوالفقار علی بھٹو' جس کو اس عاجز نے 1949ء میں ایک ''ٹیڈی بوائے'' کے طور پر کوہاٹ میں دیکھا تھا۔ وہ 1971ء میں ہمارا حاکم بن گیا کہ فطرت کے راز بھی نرالے ہیں کہ بھٹو کم از کم ایک ذہین آدمی تو تھا گو وہ زیادہ تر ''ایول جینیس'' Euil Gennius کی کیٹیگری کے لوگوں میں آتا ہے لیکن حیرانگی کی بات ہے کے بے نظیر بھی ہم پر دو دفعہ ''براجمان'' رہی اور نواز شریف بھی دو دفعہ براجمان رہا اور کچھ لوگ آج بھی ان کے ''منتظر'' ہیں کہ وہ آ کر ملک کو سنبھالیں۔ یہ عاجز حضور پاک ﷺ پر درود و سلام بھیج کر دعائیں ضرور مانگتا ہے لیکن جس طرح اور صاحبان کے سامنے کبھی ''پکار'' سے یا آہ بھر کر چیخ پکار کر لیتا ہوں ایسا کچھ اپنے آقاؐ کے سامنے کرنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ آپ ﷺ کو تو سب کچھ معلوم ہے۔ آہیں بھر کر آپ ﷺ کو مزید تکلیف سے دو چار نہ کیا جائے کہ 1988ء میں امریکہ جاتے وقت راستے میں جب عمرہ کی سعادت نصیب ہوگئی تو روضہ رسول ﷺ پر میرے دل سے کچھ آہیں نکل پڑیں۔ جہاں غیر ارادی طور پر مجھے ''لالہ'' کہنے والے ضیاء الحق کے بارے جو کچھ زبان سے نکل گیا' وہ کچھ ہو گیا۔

(توبہ میرے اللہ) اس لئے 1970ء سے رب کی ذات پاک نے اس چھوٹے سے میجر کو کچھ ''حجت'' بھی بنایا ہوا ہے اور ذوالفقار بھٹو کو بھی اس عاجز نے اس کے منہ پر یہ کہنے کی سعادت حاصل کر لی تھی کہ وہ ایک عبرتناک انجام سے دو چار ہو گا۔ بھٹو کے تخت حاصل کرنیکی کہانی ساری قوم کو معلوم ہے اور یہ عاجز بھی واقعات کی جھلکیاں دیتا آ رہا ہے کہ دسمبر 1971ء کے آخری ہفتہ جب وہ راولپنڈی پہنچا تو راولپنڈی پر دونوں ''بادشاہ گروں'' ائر مارشل رحیم اور جنرل گل حسن کا مکمل کنٹرول تھا۔ یحییٰ کو خیال تھا کہ اس نے جو نور الامین کو وزیر اعظم نامزد کر دیا تھا اس معاملہ کو ختم کر کے ذوالفقار علی بھٹو کو وزیر اعظم بنا دے گا اور خود صدر کے عہدہ پر قائم رہے گا لیکن بھٹو نے اس کو بتایا کہ حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ یحییٰ خان اور اس کے متعدد حواریوں کو فوج سے بھی سبکدوش کرنا ہو گا کہ ساری قوم اور ساری فوج ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہی ہے۔ اس لئے بھٹو نہ صرف خود صدر بنے گا بلکہ وہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی بنے گا۔ یحییٰ خان کے الگ الگ گروہوں کے بڑے' گل حسن اور پیرزادہ تو بھٹو کی راہ دیکھ رہے تھے تو وہ یحییٰ خان کی کیا مدد کرتے۔ جنرل عبدالحمید گروہ کو اپنی ''وقعت'' پہلے ہی ایوب ہال میں معلوم ہو چکی تھی کہ ایک افسر بھی اپنے آپ کو ان کے ساتھ ''وابستہ رکھنے کو تیار نہ تھا تو یحییٰ خان اور اس کے حواریوں کو ذوالفقار بھٹو نے ''ٹشو پیپر'' بنا کر پھینک دیا اور وہ عملی طور پر مغربی پاکستان کا بے تاج بادشاہ بن گیا کہ جنرل گل حسن کو بری فوج کا کمانڈر انچیف بنا دیا تھا۔ جو عملی طور پر فوج کی سربراہی پر پہلے ہی کنٹرول حاصل کر چکا تھا اور جنرل پیرزادہ پر اپنی ''وقعت'' عیاں ہو گئی کہ اس کیلئے نہ سول میں نہ فوج میں نہ اخباری دنیا میں کہیں بھی ذرا بھر ہمدردی کا اظہار تھا کہ یحییٰ خان کی سب کارگزاریوں میں پیرزادہ کو برابر کا ''حصہ دار'' بنا دیا گیا تھا۔

قارئین! یہ تھا 1971ء کی جنگ کا ایک فوری نتیجہ تو کیا پاکستان جو اللہ تعالیٰ اور حضور پاک ﷺ کے نام پر بنایا گیا' کیا یہ اس کے معاملات کا حل تھا؟ حیرانگی کی بات ہے کہ لوگوں نے بھٹو کے ساتھ بے شمار امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں اول بات نوے ہزار جنگی قیدیوں کی تھی کہ وہ ''دوہرے یرغمال'' تھے اور لوگ کہتے تھے کہ بھٹو جیسا سیاستدان ہی ان کو رہائی دلا سکتا ہے۔ میرے خیال کے مطابق یہ کوئی ''مسئلہ'' نہ تھا۔ پچاس ساٹھ ہزار بنگالی فوجی مغربی پاکستان میں موجود تھے جن کو بے ہتھیار کر کے مختلف مقامات یعنی مالاکنڈ' کوہاٹ' تھل' بنوں وغیرہ میں' ایک طرح سے ''نیم قید'' یا نگرانی کے اندر رکھا ہوا تھا۔ مجیب الرحمٰن ہماری ''قید'' میں تھا۔ بنگالی اس کی رہائی کے لئے کوئی بھی قربانی دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ پھر بھارت ہمارے قیدی روک کر کیا کرے گا۔ وہ لوگ ان کو ''برین واش'' کرنے کی کوشش کریں گے اس میں ''کامیابی'' کی صورت میں بھی بھارت نے ان کو پاکستان واپس کرنا ہو گا اور ناکامیابی کی حالت میں بھی بھارت اتنے لوگوں کو خوراک اور ان کے حفاظت کے بندوبست پر پیسے کیوں خرچ کرے گا؟ بات وقت اور صبر کی تھی میرے لحاظ سے بھٹو شعبدے اور مداری کے تماشے کرے گا اور وہ ہمارے لئے ''سزا'' کے طور پر ''براجمان'' ہوا ہے کہ ہماری کم علم قوم اس کو نجات دھندہ سمجھ کر اس کو ووٹ دے چکی تھی لیکن قرآن پاک میں ثبوت موجود ہے کہ سورۃ المائدہ آیت مبارکہ 49 اور سورۃ الانعام آیت مبارکہ 117 کے مطابق اکثریت اگر اللہ تعالیٰ سے رہنمائی نہ حاصل کرے تو وہ فاسق ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہی میں ڈال دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے 1970ء میں یہ کچھ عملی طور پر ہمارے لئے ثابت کر دیا کہ اکثریت نے مادیت میں گھس کر

مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو کو اپنا ''نجات دہندہ'' سمجھا' تو ملک دولخت ہو گیا لیکن زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جنہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔ وہ خود اسلام اور اسلامی فلسفہ حیات یا رسول عربی ﷺ کے اسلام سے ''نابلد'' ہیں اور نہ آزادی کے وقت اور نہ آزادی کے بعد یہ لوگ قوم کو رہنمائی دے سکے۔ جس سلسلہ میں یہ عاجز اپنے پچھلے مضامین میں کچھ جھلکیاں دے چکا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں بھرپور مضامین بعد میں لکھنے کا ارادہ ہے کہ یہ لوگ دین و دنیا کو شیر وشکر نہ کر سکے کہ وہ صرف دین کے ''وارث'' بنے ہوئے ہیں اور اسلام کو اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدوں میں ''محبوس'' کرتے رہتے ہیں اور دنیا کو آزاد سیاستدانوں کے حوالے کر دیا ہے۔ یہ آزادی سے پہلے کا وطیرہ چلا آ رہا ہے کہ علامہ اقبال بھی پکار اٹھا تھا۔

ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد

بھٹو نے کہا میرا سیاسی فلسفہ اسلام ہے

بہر حال ہم بھٹو کے ''رحم و کرم'' کے منتظر تھے۔ جس نے یہ ہرگز نہ سوچا کہ ملک کے ساتھ فراڈ کرنے والے پاکستانی فوج کے جنرل اس طرح بے عزت ہو چکے ہیں کہ اس نے ان کو ''ٹشو پیپر'' بنا دیا ہے لیکن سب سے بڑا ''فراڈ'' تو وہ خود ہے اور اس کو جو اتنی ''بلندیاں'' حاصل ہو گئی ہیں کہیں اس کی ''گراوٹ'' بھی اتنی زیادہ عبرتناک ہو سکتی ہے۔ اور میرے جاننے والوں میں اس کے چند ''چچوں'' کو اس عاجز نے باور کرانے کی کوشش کی' کہ وہ خود بھی اس پہلو پر غور کریں اور بھٹو کو بھی سمجھائیں۔ لیکن ایسے لوگ نشے میں تھے کہ بھٹو نے میدان مار لیا ہے۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور دسمبر 1971ء کے آخری دنوں میں بھٹو ہمیں خطاب کرنے کے لئے ایوب ہال میں آ دھمکا اور بڑی سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے عام شعبدہ بازی اور حسب عادت ''ڈرامے'' نہ کئے۔ کہنے لگا ملک گھمبیر حالات سے دو چار ہے۔ ہر طرف سے لوٹ مار شروع ہے اور لوگوں نے بڑی ''جائیدادیں'' بنالی ہیں وہ اکثر اداروں کو ''قومیانے'' کا پروگرام بنا رہا ہے کہ غریب لوگ بھی ملک کی دولت کے حصہ دار بن سکیں۔ مسائل بے حساب ہیں۔ نوے ہزار نوجوان لوگ بھارت کی قید میں چلے گئے ہیں۔ ان کو چھڑانا ہے۔ حکومتی اداروں میں گندے لوگ گھس آئے ہیں۔ ان اداروں کی صفائی کی ضرورت ہے۔ میں اپنے مقاصد حاصل کرنے میں بہت ''لیٹ'' ہو گیا ہوں کہ اب عوام نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی ہے لیکن حالات ''سازگار'' نہیں۔ آپ لوگ مجھے وقت دیں کہ میں حالات ٹھیک کروں اور آپ پیشہ ور لوگ' زیادہ دھیان اپنے پیشہ کو دیں اور حکومت کرنا سویلین کا حق ہے وغیرہ اور اس کے بعد سوالات کی کھلی دعوت دی۔ زیادہ تر سوالات مذہب کی طرف مائل افسران نے پوچھے اور فوج اور سول دونوں کے اعلیٰ افسروں کے لئے اسلامی اقدار کی پابندی کی ضرورت پر زور دیا کہ شرابی کبابی اور بے کردار لوگوں نے پاکستان کا بیڑہ غرق کر دیا۔ سوال پوچھنے والوں میں میجر منہاس جیسے ''باریش'' افسران بھی تھے جو یہاں تک چلے گئے کہ ایوب اور یحییٰ خان کے زمانوں میں ترقی ان لوگوں کو ملتی تھی جو کھلم کھلا بے حیائی اور کلبوں کی زندگی کے دلدادہ تھے اور اکثر سوالات ''بالواسطہ'' طور پر بھٹو کے رویہ کی تنقید میں تھے کہ بھٹو کے ''چچوں'' کو بھٹو کو ''خوش آمدیدی'' والا سوال کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اس عاجز نے ایک بڑا سادہ سا سوال کیا کہ ''مسٹر پریذیڈنٹ ہم آپ کی ''معاشی پالیسی'' سے تو کچھ آگاہ ہیں لیکن کیا آپ کسی ''سیاسی فلسفہ'' کے تحت کام کریں گے اور وہ کیا ہے؟ بھٹو سمجھ گیا کہ سوال میں ''گہرائی'' ہے کہ سوال کرنے والا دبی زبان میں کہہ گیا ہے کہ بھٹو کسی سیاسی فلسفہ کا پابند نہیں بلکہ ''ڈنگ ٹپاؤ'' یا شعبدہ بازی سے کام چلائے گا تو بھٹو کچھ سوچ میں پڑ گیا' سامعین کی مذہبی سوچ اور رویہ کو بھانپتے ہوئے اعلان کر دیا کہ اس کا سیاسی فلسفہ ''اسلام'' ہے اور سارا ایوب ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور میٹنگ ختم ہوگئی۔ بھٹو خوش تھا کہ اس نے ''میدان'' مار لیا ہے لیکن اس عاجز کو معلوم تھا کہ جواب ''وقتی'' ہے اور بھٹو سامعین کو خوش کر کے داد لینا چاہ رہا ہے۔ میری اب دعا تھی کہ مجھے رب کی ذات موقع دے کہ اگلی دفعہ میں کلمہ حق کا اعلان کر کے بھٹو کی ''شعبدہ بازی'' کو ننگا کروں۔ قارئین پاکستان میں اسلام کے بغیر کوئی اور سیاسی فلسفہ' کمیونزم' سوشلزم' فاشزم' کیپٹل ازم وغیرہ نہیں چل سکتے۔ بھٹو جیسے بے دین آدمی کو بھی اسلام کی آڑ لینا پڑی اور ہر بے دین سیاسی جماعت کا سربراہ بھی اسلام کا نام ضرور لیتا ہے لیکن اگر کوئی یہ اعلان کر دے کہ اس کا ''سیاسی فلسفہ'' اسلام ہے تو اس کو رسول عربی ﷺ کا اسلام نافذ کرنا چاہیئے اور خلفاءِ راشدین کے زمانے کے عملی اسلام کی پیروی کرنا چاہیئے لیکن ہمارے ہاں تو ہم پچھلے 59 سالوں سے اسلام کے ساتھ فراڈ کر رہے ہیں اور یہی بڑا المیہ ہے اور یہی ہمارا امتحان ہے کہ ہم ''مواقع تقدیر'' کا صحیح استعمال نہیں کر رہے۔

لیکن حکومت کرنا آسان کام نہیں۔ اسلام میں حکومت وہ کرے کہ خود بھی ''اطیعو اللہ اور اطیعوالرسول'' ہو اور ''اولی الامر'' کے طور لوگوں سے بھی رب کی ذات پاک اور اس کے حبیب ﷺ اور ہمارے آقا ﷺ کی اطاعت کرائے۔ یہ بنیادی ضرورت ہے اور ترجیح اس عمل کو ہے۔ مشورہ' جس کو ہم نے جمہوریت کا نام دے دیا ہے اس کو ثانوی حیثیت حاصل ہے کہ قرآن پاک کی دونوں سورتوں آل عمران اور الشوریٰ میں جہاں مشورہ کا ذکر ہے' وہ مشورہ اللہ تعالیٰ کے امر کو جاری کرنے اور اس پر عمل کے طریقوں کے بارے ہوتا ہے نہ کہ لوگوں یا پارلیمنٹ کے ممبروں کی اللہ تعالیٰ کی خدائی میں ''شرکت'' دے کر اپنے مرضی کے قانون بنائے جا رہے ہیں۔ تمام قوانین ہمارے پاس قرآن پاک کے ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' میں یا حضور پاک ﷺ کی سنت میں موجود ہیں۔ لیکن ایسی سنت میں جو قرآن پاک کے اصولوں کے تابع ہو نہ کہ بناوٹی اور گھڑی گئی حدیثوں کے۔ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے لاکھوں ایسی احادیث رد کر دیں لیکن اب بھی کئی شکیہ احادیث صحاح ستہ کی کتابوں میں موجود ہیں جو ایک دوسرے کے تضاد میں ہیں یا قرآن پاک کے اصولوں کی نفی کرتی ہیں اور ایسی کمزور یا شکیہ احادیث ہی قوم میں تفرقہ کا باعث بنتی ہیں کہ ہم فرقوں یا فقہی گروہوں میں بٹ گئے۔ اس عاجز نے اس سلسلہ میں کچھ کام کیا ہے اور اب اپنی قرآن پاک کی تفسیر میں اپنی تحقیق کے کچھ پہلوؤں کو اجاگر کر کے خود فرقہ بندی اور فقہی گروہ بندی سے توبہ کر کے اول اور آخر بھی صرف مسلمان ہوں اور مومن بننے کی سعی میں مصروف ہوں۔ کاش کوئی ادارہ ایسی کوشش کر کے قوم کی رہنمائی کرے۔

تو بات بھٹو کی حکومت کی ہو رہی تھی۔ وہ زبانی کلامی اسلام کا نام لے رہا تھا۔ وہ تو شعبدہ بازی سے کام چلانا چاہتا تھا۔ غیر مشروط طور پر مجیب الرحمٰن کو رہا کر دیا کہ دنیا میں ''واہ واہ'' ہو جائے۔ غیر مشروط طور پر بھارتی

جنگی قیدیوں کو بھی رہا کر دیا اور ہمارے پاس جو بنگالی تھے ان کو بھی بھارت کے راستے یا کسی بین الاقوامی مدد سے بنگلہ دیش بھیجنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کی بلا سے۔ وہ تو بنگلہ دیش کے وجود کو ''پکا'' کر رہا تھا اپنے قیدی رہا ہوتے یا نہ ہوتے۔ وہ ان کو بھارت کی قید میں زیادہ سے زیادہ وقت رکھنا چاہتا تھا کہ اس کو ڈرامے کرنے اور شعبدہ بازی کے لئے ایک مضمون یا ''حقیقت'' میسر تھی۔ تو فوج میں بڑا سخت ردعمل ہوا۔ اور جنرل گل حسن نے بھٹو کو باور کرا دیا کہ فوج، بنگالیوں کو بنگلہ دیش بھیجنے کی اس کو ہرگز اجازت نہیں دے گی جب تک ان کے بدلے ہمارے جنگی قیدی بھارت سے واپس نہیں آتے۔ بھٹو نے جو مادر پدر آزادی کی طرح ڈالی وہ رنگ لائی اور جن، بوتل سے باہر آ گیا۔ پولیس والوں نے ہڑتال کر دی۔ بھٹو نے فوج کو پولیس کے طور پر استعمال کرنا چاہا تو جنرل گل حسن نے انکار کر دیا۔ سرحد اور بلوچستان میں ولی خان اور جمعیت العلما اسلام نے بھٹو کی دھاندلیوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور وہاں خود مختار حکومت کی ڈیمانڈ دے دی۔ بھٹو کی پارٹی سے ہر آدمی وزیر بننا چاہتا تھا اور پارٹی کے کارکن ''مراعات'' مانگ رہے تھے اور بھٹو صرف فوج کے کندھے پر بندوق رکھ کر حکومت چلا سکتا تھا لیکن جنرل گل حسن اتنا گیا گزرا ہوا بھی نہ تھا۔ اس نے کہا کہ فوج سرحدوں کا دفاع کر رہی ہے۔ ابھی صرف فائر بندی ہوئی ہے۔ دونوں ملکوں کی فوجیں سرحدوں پر موجود ہیں، وہ فوج کو ملک کے اندرونی معاملات میں الجھانے کو تیار نہیں ہیں۔

تو جنرل گل حسن کو سیدھی ''دھونس'' دینے کی بجائے بھٹو فروری 1972ء کے وسط میں پھر ایوب ہال میں آ دھمکا کہ بھٹو کے خاص پروردہ ایچ کے برکی نے اخبار پاکستان ٹائمز میں فوج کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کیا ہوا تھا اور ہم نے گل حسن کو باور کرا دیا تھا کہ جو کچھ ہوا، وہ فوجی المیہ کم اور سیاسی المیہ زیادہ ہے جس میں بھٹو اور مجیب الرحمٰن اہم کردار ہیں۔ جس فوجی نے غلطی کی ہے، اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ کیا فوج کو بے عزت کر کے اس کی رہی سہی عزت ختم کی جا رہی ہے؟ اور بھٹو ہمیں مغربی پاکستان میں بھی بھارت کے آگے ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار کر رہا ہے تو جنرل گل حسن نے ہمارے الفاظ میں بھٹو کو اس سلسلہ میں ایک سخت پروٹیسٹ بھیج دیا اور بھٹو اپنے ساتھ نائب صدر نورالامین اور کابینہ کے چند وزرا کو لے کر ایوب ہال میں آیا، کہ ایک طرح سے ہمیں تسلی بھی دینا چاہتا تھا کہ وہ ڈر گیا تھا کہ فوج اس کو ''تخت'' سے اتار نہ دے اور کچھ دھونس بھی دینا چاہتا تھا اس لئے بھٹو کا خطاب ظاہر کر رہا تھا کہ وہ افراتفری کا شکار ہے اور سخت تذبذب میں تھا کہ اس نے صرف ایک کام کی بات کی کہ آئندہ فوج کے خلاف وہ ایسے مضامین لکھنے کی اجازت نہ دے گا جیسے برکی لکھ رہا تھا۔ علاوہ ازیں اپنی مشکلات کا کچھ ذکر کیا، لوگوں کی ناسمجھی پر تبصرہ کیا کہ وہ جلد نتائج چاہتے ہیں۔ کچھ ولی خان کی پاکستان سے وفاداری پر شک کا اظہار کیا اور آدھا گھنٹہ خطاب میں تمام ادھوری باتیں کیں۔ کوئی بامقصد یا مکمل بات نہ کر سکا اور سوالات کی اجازت دیئے بغیر وہ اچانک باہر نکل جانے کے لئے چل پڑا تو اس عاجز کو کسی غیبی طاقت نے کھڑا کر دیا اور سخت گرجدار آواز میں اعلان کر دیا۔

''جناب صدر صاحب۔ آپ اس طرح ہم سے ''فرار'' حاصل نہیں کر سکتے ہمارے پاس بے شمار سوالات ہیں ذرا رک جایئے اور کم از کم وہ باتیں سن تو لیں جواب اگر پاس نہ ہوں تو پھر کبھی ہماری تسلی کر دینا۔''

بھٹو کو مجبوراً واپس ہونا پڑا کہ میرے آگے بیٹھا میجر جنرل اور ڈاکٹر محمد ایوب کھڑا ہو گیا اور بھٹو کو کہا کہ

اس کو ولی خان کی غیر حاضری میں اس کے کردار پر ایسے حملے کرنے کا ہر گز حق نہیں پہنچتا اور یہ کہہ کر بیٹھ گیا۔ بھٹو نے جواب دیا ”میں جانتا ہوں کہ وہ تمہارا رشتہ دار ہے۔ آپ کو اگر تکلیف ہوئی ہے تو فوج کو چھوڑ کر اس کی پارٹی میں شامل ہو جائیں اور خود اندازہ لگالیں کہ ولی خان کے مقاصد اور ارادے کیا ہیں؟“ یہ عاجز البتہ اپنی جگہ پر کھڑا تھا اور عرض کی۔

”جناب صدر صاحب میرے پاس بے شمار سوالات بھی ہیں لیکن میں آپ کو کچھ تلخ حقائق گوش گزار کرنا چاہوں گا اور یہ بہت لمبے مضامین ہیں لیکن میں اختصار سے کام لوں گا۔ اول سوال یہ ہے کہ کہاں ہے آپ کا اسلام کہ پچھلی دفعہ آپ نے سامعین کو خوش کرنے کے لئے میرے سوال کا جواب دیا تھا کہ آپ کا سیاسی فلسفہ ”اسلام“ ہے؟ آپ لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے کہتے ہیں کہ میں تھوڑی سی شراب پی لیتا ہوں لیکن لوگوں کا خون نہیں پیتا۔

”جناب صدر صاحب۔ سورۃ البقرہ کے مطابق اسلام اپنی مرضی کا نہیں ہوتا بلکہ پورے طور پر اسلام میں داخل ہونے کے احکام ہیں اور اول ضرورت احکام الٰہی کی پابندی ہے کہ ہر آدمی جب احکام الٰہی ادا کرے تو حقوق العباد خود بخود ادا ہو جاتے ہیں۔ تو آپ نے عوام کا نمائندہ بن کر جوان کو بے وقوف بنایا کہ آپ ان کے رہنما ہیں۔ آپ ان کے حقوق کیسے ادا کریں گے جب خود ”حقوق اللہ“ ادا نہیں کرتے ہو۔

”جناب صدر صاحب! آپ اپنے آپ کو جمہوریت کی پیداوار کہتے ہیں تو پھر اس جمہوریت سے ملک کو چلاؤ' ہمارے کندھے پر ایوب خان اور یحییٰ خان کی طرح بندوق رکھ کر مارشل لاء سے تو حکومت کو نہ چلاؤ لیکن آپ کا خطاب ظاہر کر رہا ہے کہ اس مغربی جمہوریت نے آپ کو مایوس کیا ہے تو اب آپ اس جمہوریت کے ساتھ بھی ”فراڈ“ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ جمہوریت آپ کے ساتھ ”فراڈ“ کرے گی کہ آپ اس غلط فہمی میں ہیں کہ آپ بہت ”ہوشیار“ ہیں۔

”جناب صدر صاحب! آپ کا وزیر حفیظ پیرزادہ بھی یہاں موجود ہے' جو ہمیں ٹی وی پر بار بار ”سقوط ڈھاکہ“ کی فلم دکھا کر اور زیادہ بے عزت کرنا چاہتا ہے کہ یہ ”سچ“ ہے اور ہم ”سچ“ دیکھیں۔

جناب صدر صاحب! ہم نے سچ دیکھ لیا ہے۔ بعض سچ بڑے تلخ ہوتے ہیں' جن کو بار بار دیکھنا یا سننا انسان پسند نہیں کرتا۔ یہ سقوط ڈھاکہ فوجی المیہ ضرور ہے لیکن یہ زیادہ تر سیاسی المیہ ہے جس کی زیادہ ذمہ داری آپ اور مجیب الرحمٰن پر عائد ہوتی ہے“۔

”جناب صدر صاحب! یہ مت سوچنا کہ آپ سویلین صدر ہیں تو میں اس طرح آپ کو سچی باتیں سنا رہا ہوں۔ اس ہال میں ستر فیصد لوگوں کے سامنے اس عاجز نے یحییٰ خان اور عبدالحمید کو ستمبر 1970ء میں اس سے زیادہ سچ سنایا بلکہ میرے کرم فرما جنرل گل حسن جو میرے سامنے بیٹھے ہیں' ان کو 1969ء میں لکھ کر دیا کہ ستمبر 65ء کی جنگ ہم سترہ دن لڑ سکے۔ آنے والی جنگ سات دن لڑ سکیں گے۔ آؤ توبہ وندامت کر کے اسلام کو طرز زندگی کے طور پر اپنائیں۔

ازرہ [illegible] صدر صاحب! مغربی جمہوریت نہ اس ملک میں چلی ہے نہ یہ کافرانہ نظام آگے چل سکے گا

کہ بقول علامہ اقبالؒ اس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تو لا نہیں کرتے۔ میں آپ کو بھی یہی گزارش کروں گا جو جنرل یحییٰ اور حمید کو کر چکا ہوں کہ آپ توبہ وندامت کر کے اسلام کے راستے پر آئیں اور اسلامی فلسفہ حیات کے اصولوں کے تحت ملک چلائیں وغیرہ۔ بھٹو نے کچھ عرصہ غیر متعلقہ اور مہمل قسم کے جواب دینے کی کوشش ضرور کی کہ ہماری شکست جنرلوں کی وجہ سے نہ تھی یا کہنے لگا کہ میں اس کو اتنا گیا گزرا نہ سمجھ لوں جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس کے علاوہ زمانے کے لحاظ سے اور بھی ضرورتیں ہیں اور وہ سب معاملات کا اپنے زاویہ سے مطالعہ کر رہا ہے کہ وہ چاہے گا کہ اس کا تاریخ میں مقام ہو تو اس عاجز نے اٹھ کر کہہ دیا کہ اسلام تاریخ کو کوئی وقعت نہیں دیتا۔ اسلام کے لحاظ سے بڑا اصول یہ ہے کہ روز قیامت اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے۔"

اب کوئی اور کیا سوال پوچھتا۔ بھٹو جہاں چائے پی رہا تھا بریگیڈیئر (بعد میں جنرل) محمد اقبال مرحوم نے بریگیڈیئر (بعد میں جنرل) غلام حسن مرحوم کو بھیجا تھا کہ میجر امیر افضل کو ڈھونڈ کر لاؤ کہ وہ بھی چائے والی جگہ پر آ جائے کہ اس "تلخی" پر کچھ پانی پڑ جائے کہ عام اور کھلی مجلس میں کچھ گپ شپ ہو جائے۔ جب یہ عاجز وہاں پہنچا تو جنرل گل حسن کہنے لگا کہ مجھے کب لکھ کر دیا تھا مجھے تو یاد نہیں آ رہا۔ تو عرض کی کہ "جناب مسودہ تو آپ کے جی ٹو کو دے آیا تھا جو آپ کے نام تھا لیکن یاد کریں کہ اگست 1971ء میں مشرقی پاکستان سے واپس آ کر یہی کچھ میں نے آپ کو اس مسودہ کا حوالہ دے کر زبانی گوش گزار کیا تھا۔" تو بھٹو کہنے لگا "کہ تمہاری پیش بینی کے ذرائع کیا تھے؟" تو عرض کی کہ "آنے والے واقعات کا سایہ پہلے نظر آ جاتا ہے۔" تو جنرل آفتاب آگے آیا کہ "امیر افضل مجھ سے تو ناراض نہیں ہو۔ ستمبر 65ء کی جنگ کے پہلے دو دن میں آپ کا بریگیڈ کمانڈر تھا اور میں نے آپ کی رپورٹ کو صحیح قرار دیا تھا۔" تو گزارش کی کہ "میں تو کسی سے بھی ناراض نہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے کلمہ حق کہنے کی توفیق دے رہا ہے۔"

اتنے میں حفیظ پیرزادہ آ گیا تو اس کو میری طرف کر کے بھٹو کہنے لگا کہ "پیرزادہ! میجر امیر افضل سے معذرت کرو اور اعلان کیا کہ سقوط ڈھاکہ ٹی وی پر نہ دکھایا جائے گا" تو میں نے صدر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور گزارش کی کہ اس میں آپ کی بڑائی ہے۔ تو سب سامعین نے تحسین کے کلمات ادا کئے۔

میں ذرا ایک طرف ہوا تو سیکرٹری دفاع سید غیاث الدین میرے پاس آ گیا اور کہنے لگا۔ "امیر افضل! آپ ISPR میں ہیں اور آپ سے عمر اور تجربہ میں بہت کم جو صاحب بریگیڈیئر اور ڈائریکٹر بنے ہوئے ہیں۔ آپ کو وہاں ترقی کیوں نہ دی گئی ہے کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی تعلیم کہاں تک ہے؟ گزارش کی "جناب میری ساری تعلیم میرے آقا حضور پاک ﷺ کے قدموں کی خاک ہے۔" تو سید صاحب بات سمجھ گئے اور جلدی علامہ اقبال کا فارسی کا شعر پڑھا۔ جس کے معنی ہیں کہ ہاں حضور پاک ﷺ کی تابعداری نہ حاصل ہو تو سب کچھ "ابولہبی" کے تحت آتا ہے۔"

بھٹو کے جانے کے بعد مجھے لالہ کہنے والا ضیاء حاکم بن گیا تھا

ایک ماہ بعد ISPR سے میری تبدیلی کر کے مجھے اوکاڑہ ایک ڈویژن ہیڈکوارٹر میں تبدیل کر دیا۔ درخواست دی کہ میں اپنی نوکری پوری کر چکا ہوں اور مجھے مارچ [illegible] میں ISPR میں دوبارہ نوکری کیلئے مدعو

کیا گیا ہے۔ اگر وہاں میری لئے ''جگہ'' نہیں تو میں راولپنڈی میں تو کسی جگہ چند ماہ نوکری کر لوں گا۔ مجھے کسی باہر کے سٹیشن میں نوکری کیلئے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ تو پھر میری تبدیلی اس ادارے میں کر دی جو راولپنڈی جی ایچ کیو میں بنگالیوں کو بنگلہ دیش بھیجنے کی اور ان کی پاکستان میں رہائش وغیرہ کے معاملات کی تجاویز بنا رہا تھا۔ میں نے بنگالیوں کو مالاکنڈ، تھل، کوہاٹ اور بنوں وغیرہ جا کر دیکھا اور ان کی واپسی کی تجاویز کو جی ایچ کیو کی ہر ڈائرکٹوریٹ سے منظور کرایا۔ جس کا ترجیحی فقرہ یہ تھا کہ بھارت میں اپنے جنگی قیدیوں کی واپسی کے عہدنامہ کے بغیر کوئی کارروائی نہ ہوگی کہ ان دنوں بھارت اور بنگلہ دیش میں کئی ''شوشے'' چل رہے تھے کہ کچھ پاکستانیوں پر مقدمہ چلے گا۔ یعنی جن فوجیوں نے بنگالیوں پر ''ظلم'' کئے ہیں، ان کو رہا نہ کیا جائے گا۔ اب یہ تجاویز جب بھٹو حکومت کے پاس گئیں تو ہمارے انچارج بریگیڈئر اعجاز کو اوپر والوں نے ''جھاڑ'' دی کہ یہ ''مشروط تجاویز'' کیوں بنائی گئی ہیں۔ تو اس نے جواب دیا کہ میجر امیر افضل کو وہ ''قابو'' نہیں کر سکتا۔ مجھے اس سے ''چھٹکارا'' دلایا جائے۔ تو پھر میری تبدیلی آزاد کشمیر سنٹر میں مانسر کیمپ میں کر دی گئی۔ اس عاجز نے پھر ''احتجاج'' کیا کہ میں نوکری پوری کر چکا ہوں۔ مجھے اس طرح فٹ بال کی ''گیند'' نہ بنایا جائے۔ اگست 1972ء میں میری ریٹائرمنٹ کے احکام آ گئے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ میں کسی کا ''آدمی'' نہیں۔ تو بھٹو حکومت نے فیصلہ کیا کہ کوئی پارٹی یا ادارہ اس میجر کی سوچ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اسلئے اس کو فوج میں دوبارہ کمیشن دے کر وردی پہنا دی جائے اور اس کی ''خواہش'' کے مطابق راولپنڈی ہی میں نیشنل گارڈ یا کسی غیر اہم ادارے کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے تو فروری 1975ء میں یہ عاجز پھر فوج میں واپس آ گیا اور ستمبر 1979ء تک نوکری کی۔ جب بھٹو جا چکا تھا اور مجھے ''لالہ'' کہنے والا ضیاء الحق ہمارا حاکم بن گیا تھا۔

تو بھٹو حکومت کو یہ عاجز اس طرح نزدیک سے تو نہ ''دیکھ'' سکا۔ جیسے ایوب خان یا یحییٰ کی حکومتوں کو ''دیکھتا'' رہا۔ لیکن افسوس قوم نے آج تک اس زمانے کی تباہی اور بھیانک صورتحال کے نتائج اور اثرات کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ بھٹو ہماری زندگی کے ہر شعبے اور اسلامی اقدار کو ایسا تباہ کر گیا ہے کہ ان کے اثرات سے کوئی معجزہ ہی ہمیں چھٹکارا دلا سکتا ہے۔ بار بار گزارش کر رہا ہوں کہ میں پاکستان کی تاریخ کو ان چند مضامین میں پوری طرح مرتب نہیں کر سکتا بلکہ قوم کو ان حقائق کے بارے آگاہ کرنا چاہتا ہوں جو ہماری نظر سے اوجھل ہیں کہ بھٹو نے ہماری معیشت کو ایسا تباہ کیا ہے کہ فی الحال اس کے بحال ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی اور جو لوگ قوم کو معیشت کی بحالی کی ''خوشخبریاں'' سنا رہے ہیں۔ وہ قوم کو مزید ''بے وقوف'' بنا رہے ہیں۔ 1971ء میں ڈالر کی قیمت ساڑھے تین روپے تھی، اب ڈالر ساٹھ کے پیٹے میں چکر لگاتا رہتا ہے۔ 1973ء میں اس عاجز نے چودہ ہزار روپے میں ایک کنال زمین خرید کر اس پر مکان بنایا۔ اب اس علاقے میں چودہ لاکھ میں بھی ایک کنال زمین نہیں ملتی۔ سیمنٹ کی بوری کی قیمت جو آٹھ روپے تھی۔ اب سینکڑوں میں ہے۔ مزدور کی مزدوری پانچ روپے روزانہ تھی۔ اب سینکڑوں کے نیچے بات نہیں ہوتی۔ یعنی سو روپے کی اب کوئی وقعت نہیں۔ کل تک سو روپے سے ریلوے پلیٹ فارم کا ٹکٹ بھی نہ میسر ہو سکے گا۔ کوئی غریب مزدور اب اعلیٰ تعلیم تو دور کی بات ہے۔ اب اپنے بچوں کو کالج کی تعلیم تک نہیں دلا سکتا۔ اور غریبوں کیلئے اب غربت اور مزدوری کے علاوہ کوئی ''پیشہ'' باقی نہیں رہ

گیا۔ کچھ غریبوں نے اپنی تھوڑی سی جو جائیداد تھی جو بیچ کر بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ لیکن ان تعلیم یافتہ بچوں کو جو نوکری ملی ہے۔ اس سے وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کیسے کریں خود اپنا اور بچوں کا پیٹ نہیں بھر سکتے۔

ملک کی ہر چیز کو قومی ملکیت میں لے کر سب کچھ تباہ کر دیا۔ پیداوار کی کمی کے علاوہ کارخانوں کی مشینیں کل لوہے کے جنک (Junk) کے بھاؤ بکیں گی۔ غیر ملکی قرضے تو پہلے دن سے کسی تجویز کے تحت نہ لئے جا رہے تھے۔ ایوب کے زمانے میں معاشی معاملات کے سیکرٹری ایک حسنی صاحب ہوتے تھے۔ انہوں نے ہمیں کوئٹہ سٹاف کالج میں معیشت پر خطاب کیا تو اس عاجز نے سوال پوچھا کہ جناب یہ جو غیر ملکی قرضے لئے جا رہے ہیں۔ اندازاً کتنے سالوں تک ہم یہ قرضے ادا کر کے ان سے ایسے فوائد حاصل کر چکے ہوں گے کہ مزید قرضوں کی ضرورت نہ رہے گی۔ کہنے لگا کہ وہ کوئی فقیر ہے کہ ایسا اندازہ لگا سکے یہ حالات پر منحصر ہے۔ اور پھر موجودہ زمانے کی ''بوگس معیشت'' کے کئی تکنیکی پہلوؤں پر انگریزی کی مہمل اصطلاحیں استعمال کر کے مجھے خاموش کرنے کی کوشش کی۔ اس عاجز نے عرض کی کہ مجھے کچھ غلط فہمی تھی کہ آپ لوگ کسی فلسفہ اور تجویز کے تحت یہ قرضے لے رہے ہیں۔ اور ان قرضوں سے اتنی ترقی ہو گی کہ وقت آئے گا جب سب قرضے ادا ہو جائیں گے اور مزید قرضے نہ لینے پڑیں گے۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ آپ کے پاس کوئی معاشی فلسفہ نہیں ہے۔ آپ لوگ صرف ہماری طرح ''اکاؤنٹ افسر'' ہیں کہ جیسے ہم سے کوئی یونٹ یا بڑے ادارے کا اکاؤنٹ افسر بن جاتا ہے۔ اور آپ لوگ ''ڈنگ ٹپاؤ'' گزارا کر رہے ہیں۔ سارا ہال ہنسی سے گونج اٹھا اور میں تو کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ خدا کیلئے قوم سے فراڈ بند کرو۔ اور اپنے پیشہ کو کسی اصول کا تابع کرو کہ سینئر افسروں نے اشارہ کیا کہ ''مہمان'' ہے اتنا کچھ کافی ہے۔ تو بھٹو نے رہی سہی کسر بھی نکال دی کہ بغیر سوچے سمجھے خوب قرضے لئے اور نوٹ خوب تعداد میں چھاپے جاتے ہیں۔ قرضہ کا بڑا حصّہ تو ان مشیروں کی تنخواہوں اور ٹی اے ڈی اے الاؤنسوں پر خرچ ہو جاتا ہے۔ اور باقی سے زیادہ پیسے سیاستدان اور بیوروکریٹ کھا جاتے ہیں۔ کوئی دسواں حصّہ اس پروجیکٹ پر خرچ ہوتا ہے۔ تو ملک نے کیا ترقی کرنا ہے۔ پس ہر حکومت ''ڈنگ ٹپاؤ'' طریقے پر گزارا کرتی ہے۔ لیکن بھٹو کے زمانے میں جو طرحیں ڈالی گئیں اور ضیاء الحق کے زمانے میں جو فضول خرچیوں سے ''گل چھرّے'' اڑائے گئے۔ یہ فراڈ اب ہماری قومی زندگی کا حصّہ بن گیا ہے کہ ایک وقت آیا کہ یہودیوں کا خاص ''پروردہ'' معین قریشی آ کر ہمارا وزیراعظم بن گیا اور مالیات کا رخ یہودی ضرورتوں کی طرف اس طرح پھیر دیا گیا ہے کہ اب ہم لوگ مکمل طور پر یہودیوں یا ''زنجری'' کے مقاصد کا ایک حصّہ ہیں۔

بھٹو کے سامنے بڑا مقصد حکومت پر ''براجمان'' رہنا تھا۔ خواہ یہ حکومت یا اس کی ''سلطنت'' مغربی پاکستان سے گھٹ کر صرف صوبہ سندھ تک یعنی ''سندھو دیش'' تک محدود ہو جاتی یا۔ صرف لاڑکانہ تک۔ کہ پہلے مشرقی پاکستان کو الگ کرانے والوں یا لات مارنے والوں کی لسٹ میں وہ سب سے اوپر تھا۔ اور اب طاقت میں آ کر وہ صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان کے ساتھ ایسے رویے اختیار کر رہا تھا کہ وہ بھی پاکستان سے الگ ہو سکتے تھے کہ اس کو غصہ یہ تھا کہ یہ دونوں صوبے پیپلز پارٹی کو ''گھاس'' نہ ڈال رہے تھے۔ تو ہم لوگوں نے جنرل ٹکا خان کو اس کے سٹاف افسروں کے ذریعہ سے سمجھایا کہ وہ بھٹو کو کسی طرح ''باور'' کرائے کہ صوبہ پنجاب اور صوبہ سندھ پر

''محدود'' پاکستان زیادہ دیر نہ چل سکے گا۔ بھٹو کسی طرح سے صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان کو اپنے ساتھ رکھے۔ خواہ کچھ اصول قربان بھی کرنا پڑیں۔ بہرحال جنرل ٹکا خان کی حب الوطنی پر کسی شک کی گنجائش نہیں اور نہ اس کی بھٹو کے ساتھ ''وفاداری'' پر انگلی اٹھائی جا سکتی ہے۔ اور بھٹو جو اپنی چھ سالوں کی حکومت میں مداری کے تماشے دکھاتا رہا اور بقول علامہ اقبال ''تماشہ دکھا کر مداری گیا'' والی پیش بینی پوری ہوتی رہی۔ بھٹو کی ''طاقت'' جنرل ٹکا خان اور فوج تھی، اسلیئے بھٹو کو مجبوراً فوج کو مضبوط کرنا پڑا۔

البتہ بھٹو کو بڑا ڈر یہ تھا کہ بنگالی تبدیل ہوتے دیر نہیں لگاتے۔ بھارت والوں نے جو بنگلہ دیش میں لوٹ مار مچائی ہوئی تھی، بنگالی، جلد بھارت کے خلاف ہو جاتے اور پاکستان ایک رہنے کا اعلان کر دیتے، تو پھر بھٹو مغربی پاکستان کا حکمران نہ رہ سکتا تھا۔ اسلیئے بھٹو ظاہری طور پر تو جو ملک بنگلہ دیش کو تسلیم کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ناراضگی کا اظہار کر دیتا تھا کہ برطانیہ نے جب بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا تو بھٹو نے ''کامن ویلتھ'' سے بھی الگ ہونے کا اعلان کر دیا۔ لیکن دل ہی دل میں بھٹو چاہتا تھا کہ پاکستان بھی بنگلہ دیش کی حقیقت کو تسلیم کر لے اور بنگلہ دیش کو الگ ملک تسلیم کر لے۔ اسلیئے عوام کے اجتماع میں کئی دفعہ اس نے کوشش کی کہ لوگوں سے اعلان کرا دے کہ ہاں ہم بنگلہ دیش کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن بھٹو عوام کی سوچ یا جذبات کو اس راہ کی طرف تبدیل کرنے میں ناکامیاب رہا۔ اس کیلیئے کسی بڑے ''ڈرامے'' کی ضرورت تھی۔

بعد میں پاکستان میں جو اسلامی ممالک کی کانفرنس ہوئی جس میں مجیب الرحمٰن نے آ کر شرکت کی اور پاکستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا۔ تو اس اسلامی کانفرنس کرنے میں ایک مقصد یہی تھا کہ پاکستان اسلامی کانفرنس کا بندوبست کرے کہ بنگلہ دیش حکومت تسلیم ہو جائے۔ لیکن دراصل یہ اسلامی کانفرنس ہم مسلمان ممالک کیلیئے تو آج تک نہ کوئی فائدہ کر سکی ہے اور نہ کرے گی جب تک تمام مسلمان ممالک نظریاتی طور پر مسلم قومیت کے اپنانے کی بنیاد پر ایک نہیں ہو جاتے بلکہ اس نظریاتی پہلو کے بڑے بڑے تقاضے ہیں کہ تمام ممالک کو عملی طور پر اسلامی فلسفہ حیات کو اپنانا ہوگا کہ قارئین اس عاجز کے سامنے ان مضامین لکھنے میں بڑا مقصد یہی ہے کہ پاکستان اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا ایک راز ہے کہ یہ ملک اسلامی یا مسلمان قومیت کے فلسفہ پر وجود میں آیا اور اس قومیت کے ذریعہ اگر تمام دنیا کے مسلمان اپنے آپ کو ایک امت کے طور پر اس فلسفہ کے ذریعہ سے گانٹھ نہیں دیتے تو اسلامی ممالک کی صفر+صفر والی حیثیت برقرار رہتی رہے گی۔

1956ء میں سویز نہر پر برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کے ملے جلے حملہ کے زمانے میں ہمارے ملک کے وزیراعظم سہروردی نے اسلامی ممالک یا عرب ممالک کو جو صفر جمع صفر کا درجہ دیا تھا تو عرب ممالک میں بڑی لے دے ہوئی تھی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عرب ممالک نے پاکستان یا منسٹر سہروردی کو آج تک معاف نہیں کیا۔ ''نہ معاف کریں'' لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور اس زمانے میں سہروردی کو مغربی لابی کا ''پٹھو'' قرار دیا گیا تھا لیکن اینگلو امریکن بلاک نے جلد ہی سہروردی کو سکندر مرزا سے کہہ کر برخاست کرا دیا کہ اہل مغرب کو ڈر لگ گیا تھا کہ سہروردی ایک حقیقت پسند رہنما ہے۔ ایسے رہنما ملک اور قوموں کی صحیح طور پر رہنمائی کر سکتے ہیں۔ سہروردی چین کا کامیاب دورہ کر آیا تھا اور میں اپنے پہلے مضامین میں یہ تاثر دے چکا ہوں کہ سہروردی روس کا دورہ کرنے والا تھا

کہ وہ کمیونسٹ بلاک کو باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ لوگ اسلامی ممالک کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے میں یا کھڑا ہونے میں مددگار ثابت ہوں۔ اسلامی ممالک اینگلو امریکن بلاک کے خلاف ان کی طاقت ہیں لیکن اس کے برخلاف اسلامی ممالک کا موجودہ ''برائے نام'' اتحاد اینگلو امریکن بلاک کی ''ضرورت'' پورا کر رہا ہے۔ وہ لوگ مسلمانوں کے اس برائے نام ''اتحاد'' کے ذریعہ سے اپنی ''ضرورتیں'' پوری کرتے ہیں تو وہ لوگ اسی وجہ سے ہمیں موجودہ پاکستان سے بھی کم تر لنگڑا لولا پاکستان دیکھ جانا چاہتے تھے اور پاکستان کو دولخت کرانے میں بھی اینگلو امریکن بلاک کا بڑا مقصد یہ تھا کہ کمزور پاکستان ان کی ڈفلی پر ناچتا رہے گا لیکن وہ لوگ بھارت اور چین کے درمیان جو اختلافات پیدا کرا چکے ہیں وہ لوگ بھارت کو روس سے بھی دور کرنا چاہتے ہیں اور جس دن بھارت ایسا کرے گا۔ اسی دن اہل مغرب یا اینگلو امریکن بلاک والے پاکستان کو دہلی کی ''سربراہی'' میں ''بھوٹان'' یا ''سکم'' بنا دیں گے لیکن بھارت کو ڈرانے کیلئے کہ اگر بھارت نے ایشیا میں اینگلو امریکن کے ''سنتری'' کا کام نہ کیا اور روس کے ساتھ ''نزدیکی'' ختم نہ کی تو پاکستان تمام اسلامی ممالک کا سربراہ بن کر بھارت کیلئے ایسے مسائل پیدا کرے گا کہ بھارت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا لیکن اندرا گاندھی نے روس سے ''دوری'' اختیار کرنے سے انکار کر دیا تو پاکستان میں بھٹو نے جو اسلامی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کا ''ڈھونگ'' رچایا بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے علاوہ اس کی دوسری ''ضرورت'' اینگلو امریکن بلاک کی پالیسی تھی اور یہ ''تماشا'' آج تک چل رہا ہے کہ اہل مغرب پاکستان کو دہلی کی سربراہی میں اپنا ایک پروردہ رکھنا چاہتے ہیں اور پاکستان اگر اسلامی ملکوں سے الگ ہو جائے تو اسلامی ممالک کی کوئی ''وقعت'' باقی نہیں رہ جاتی۔ افسوس ہماری قوم نے پاکستان کے اللہ تعالیٰ کے راز ہونے کے پہلو کو نہ سمجھا کہ ہم نے مسلم قومیت اپنا کر اللہ تعالیٰ کی فوج (حزب اللہ) کی نظریاتی بنیاد ڈالنا تھی لیکن ایک طرف ہم کامن ہیلتھ (سانجھی دولت) کا ایک بے وقعت ممبر ہیں تو دوسری طرف ''سارک'' کے ذریعہ ہمیں دہلی کی سربراہی میں ''بھوٹان'' بنانا باطل طاقتوں کا مقصود ہے۔

اس زمانے میں البتہ جب اندرا گاندھی نے اینگلو امریکن بلاک کو ''گھاس'' نہ ڈالی تو اینگلو امریکن بلاک نے اندرا گاندھی کو ہٹا کر بنیاد پرست ہندوؤں کو آگے کیا اور پہلے مرارجی ڈیسائی کو آگے لائے جس کا وزیر خارجہ بھارت کا بعد میں وزیراعظم واجپائی تھا اور اندرا گاندھی یا کانگریس وغیرہ کو ختم کرنے یا ثانوی حیثیت دینے میں امریکہ والوں کو دیر لگ گئی۔ پاکستان میں بھی بڑی تبدیلیاں آئیں اور روس بھی افغانستان میں داخل ہو کر خوار ہوا۔ بہرحال ہم سب واقعات پر ''اپنے زمان'' کے حساب سے روشنی ڈالیں گے لیکن یہ یاد رہے کہ اب بھارت کے رہنما کافی حد تک امریکہ کے کنٹرول میں تھے لیکن بھارت میں بھی کچھ عجیب وغریب ''ہل چل'' معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ بھارتی وزیراعظم تبت کے سلسلہ میں اپنی پالیسی تبدیل کر کے چین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے ہم اپنے اوقات پر آ کر سب باتوں کے تانے بانے ملائیں گے۔ فی الحال قارئین کو یہ باور کرانا مقصود ہے کہ غیروں اور خاص کر اینگلو امریکن بلاک اور کئی ''ایجنسیوں'' نے ہماری قوم میں کئی گروہوں کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر جو کالا باغ ڈیم نہیں بن رہا تو کچھ غیر ملکی ایجنسیوں کی خواہش ہے کہ پاکستان والے ہائیڈل بجلی سے فائدہ نہ اٹھائیں کہ پاکستان میں بجلی تیل اور کارخانوں کے بننے سے جہاں ان کی **Monoply**

ہے اس لئے ہمارے سیاستدان اور حکومت کے اکثر رہنما ان غیروں کی گرفت میں ہیں کہ ہم نے اپنے نفس کو پہچاننے کی کوشش انفرادی طور پر نہیں کی اور قوم کے طور پر چونکہ مومن کی فراست سے عاری ہیں تو مسلمان قوم کے طور پر یا مومن کے طور پر ہم خود اپنے مقام کو نہیں سمجھتے۔ واقعات پر بھرپور عملی تبصروں اور ملک کے سربراہوں کے عبرتناک انجاموں کے جائزوں کے بعد اب ضروری ہو جاتا ہے۔ حضور پاک ﷺ کے اس فرمان کو ہم اپنے نفسوں کو پہچانیں تو رب کی ذات پاک کی بھی پہچان ہونے لگتی ہے۔ زمانے کے تناظر میں روزانہ کی ضرورتوں کے تحت عملی طور پر واضح کیا جائے کہ ہم اپنے اندر جھانکیں اور اپنے آپ سے سوال پوچھیں کہ میں کیا ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں۔ اس پوری کائنات میں اس دنیا کی حقیقت کیا ہے۔ تخلیق کائنات میں رب کی ذات پاک کے مقاصد کیا تھے کہ تخلیقِ کائنات کا مقصد ہم انسان کی ضرورتوں اور امتحانوں کیلئے ہوا اور انسان کا مقصد معرفت الٰہی ہے اور ہم مسلمانوں نے ان نظریات کو دنیا میں عام کر کے اور خود ان پر عمل کر کے سب دنیا کی رہنمائی کرنا تھا لیکن بدقسمتی سے باطل نظریات اور فلسفوں کی پیروی کر کے ہم باطل قوتوں کے پچھ لگ بنے ہوئے ہیں تو یاد رہے کہ سورہ آل عمران کی آیت مبارکہ 19 کے مطابق اللہ تعالیٰ کا دین اسلام اور صرف اسلام ہے اور اسی سورہ کی آیت مبارکہ 85 میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ دین اسلام کے بغیر اور کوئی دین منظور نہیں اور سورہ المومنون کی آیت مبارک 52 کے مطابق سب پیغمبروں کا دین ایک اور یہی دین اسلام تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایسے اعلان قرآن پاک میں موجود ہیں کہ وہ مومنین تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کے بارے رب کی ذات پاک نے فرمایا کہ وہ یہودی و نصرانی نہ تھے۔ وہ دین حنیف کے پیروکار مسلمان تھے۔ بات یہ ہے کہ سب پہلے پیغمبر محدود وقتوں کیلئے محدود خطوں میں اسی دین اسلام کی ایڈوانس پارٹی تھے اور سورہ آل عمران کی آیت مبارکہ 81 کے مطابق وہ ہمارے آقا ﷺ کی مدد میں مبعوث ہوئے اور ہم نے جو باقی مذاہب کو اسلام کے متوازی مذاہب بنا لیا ہے یہ سب بڑی غلطی ہے۔ رب کی ذات پاک اپنے حبیب ﷺ سے سورہ آل عمران کی آیت مبارکہ 64 میں اہل کتاب اور دوسرے گمراہوں کیلئے اعلان کرواتا ہے کہ ایک اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر اتفاق کریں۔ ان ''تین خداؤں'' کے چکروں اور پیغمبروں کو اللہ تعالیٰ کے بیٹے بنانے کی گمراہیوں سے باہر نکلو اور ایک اکیلا رب جس کی الوہیت اور ربوبیت میں کوئی شراکت نہیں ہو سکتی وہ کائنات کے زمان و مکان کا رب یعنی رب العالمین ہے۔

بھٹو خاندان سے پاکستان کی خیر خواہی کی اُمید رکھنا فضول ہے

اب اس کی پہچان کیلئے رب کی ذات پاک نے سورہ الاعراف کی آیت مبارکہ 172 کے مطابق ازل کے دن ہمارے نفوس کو ایک وجود عطا فرمایا تو ہم سب نفوس کو پکارا ''الستُ بِربِّکم'' کیا میں تمہارا رب نہیں؟ تو ہم سب نے جواب دیا ''قالُو بلٰی'' بے شک اے ذات پاک تو ہمارا رب ہے تو پھر ہم سوچتے ہیں کہ ہمیں ایک وجود مل گیا ہے اور اب ہم مزے کریں گے لیکن رب کی ذات قرآن پاک کے کئی مقامات میں لفظ ''نبلوکم'' ہماری آزمائش کا ذکر کرتے ہیں اور سورہ البلد کی آیت مبارکہ 4 میں ''کبد'' یعنی تنگ گھاٹی کا ذکر کرتے ہیں اور سورہ الشمس کی آیت مبارکہ 8 میں اس نفس کے جی میں ''فجور'' اور ''تقویٰ'' دونوں کو ڈال دینے کا ذکر کرتے ہیں کہ

''اے نفوس اربوں کھربوں سالوں کی اس کائنات کی زندگی میں صرف ستر اسی یا سو سال یا اس سے بھی کم صرف 18 سال میں دنیاوی زندگی میں تمہارا امتحان لوں گا اور یہ دنیا میرے لئے ایک کھیل تماشا ہے لیکن تم لوگ دین کو کھیل تماشا نہ سمجھ لینا (سورہ الانعام) کہ اصلی چیز آخرت ہے وہ دائمی اور پکی ہے اور اس کو حاصل ہوگی جو اس امتحان میں پاس ہوگا اور اسلامی فلسفہ حیات کے اجتماعی پہلو کی جھلک سورہ الفاتحہ میں اس طرح دے دی کہ'' مالک یوم الدین'' تک کی چار آیات میں اپنی ربوبیت کے شان کے سمندر جیسے مضمون کو کوزے میں بند کر دیا اور مومن کے مقاصد زندگی کو پانچویں آیت مبارکہ کے الفاظ ''ایاک نعبد اور ایاک نستعین'' کے ایک فقرہ میں واضح کر دیا اور مومن کیلئے طریق کار کو اگلی دو چھٹی اور ساتویں آیات مبارکہ میں واضح کر دیا کہ رب کی ذات پاک سے سیدھا راستہ طلب کرو ان لوگوں کا راستہ جو انعام یافتہ ہیں اور ان کے راستہ پر نہ چلو جو اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہوئے یا گمراہ ہیں۔ یہ عاجز اس نشان راہ اور مومن کے مقاصد حیات کو مضامین کے آخری سلسلہ جات میں بھرپور طور پر قرآن پاک کی زبان میں غیروں کے باطل فلسفہ ہائے حیات سے موازنہ کر کے اس طرح پیش کرے گا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے تو اب ہم بھٹو کے دور کے چند ان واقعات کی طرف واپس آتے ہیں کہ قوم اس سلسلہ میں بڑی غلط فہمیوں کا شکار ہے۔ اول قیدیوں کی واپسی کی کامیابی کا سہرا بھٹو کے سر باندھا جاتا ہے لیکن یہ نہیں سوچا جاتا کہ بھٹو خود تو ''دوہرا یرغمال'' بننے سے بچ گیا نوے ہزار قیدیوں کو ''دوہرا یرغمال'' بنوانے والا خود ذوالفقار بھٹو تھا تو وہ جس دن چاہتا ان کو رہا کرا لیتا۔ بھارتی اتنے قیدیوں سے نہ تو کچھ مشقت لے کر کام کرا سکتے تھے نہ ان کو ان سے کچھ آمدن ہو سکتی تھی بلکہ ان کی دیکھ بھال پر خرچ ہو رہا تھا۔ ان کو حفاظت میں رکھنے پر بہت خرچ ہو رہا تھا۔ بھارت ان کو قید کر کے کیا کچھ حاصل کر سکتا تھا لیکن بھاگتے چور کی لنگوٹی کے طور پر بھارت نے بہت کچھ حاصل کرنے کے بعد قیدیوں کو رہا کیا۔ یا ہماری قوم کو بے وقوف بنایا گیا کہ بھارت نے کسی شرط کے بغیر قیدیوں کو رہا کر دیا۔ جواہر لعل نہرو مجبور ہو کر کشمیر کا مقدمہ اقوام متحدہ میں لے گیا تھا اور یہ عاجز اپنے مضامین میں ثابت کر چکا ہے کہ جواہر لعل نے اس کارروائی سے بھارت کو ایک عظیم شکست سے بچا لیا۔ علاوہ ازیں ہم جو کشمیر کا دو تہائی حصہ آزاد کرا چکے تھے ہمارے انگریز جنرلوں نے غداری کر کے کس طرح بھارت کو یہ آزاد کردہ علاقے واپس دلائے وہ ذکر بھی ہو چکا ہے اور آتش بازی کے ڈرامے سے جو فائر بندی کر کے بھارت کی ''ضرورت'' کے تمام علاقے دیدیئے گئے۔ وہ ذکر بھی ہو چکا ہے کہ اقوام متحدہ سے ایک مہمل قرارداد پاس کرائی جس پر 1971ء تک کوئی عمل نہ ہو سکا تو اب بھارت کی خواہش تھی کہ اس برائے نام قرارداد کو بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے اور پاکستان آئندہ اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ نہ اٹھا سکے تو الفاظ سے شعبدہ بازی کی کہ اقوام متحدہ نے جو فائر بندی لائن مقرر کی تھی اس کو ختم کر کے اس کا نام ''کنٹرول لائن'' رکھ دیا جائے اور اس طرح اقوام متحدہ کے جو فوجی مبصر فائر بندی لائن پر تھے بھارت نے ان کو بے اثر کر دیا اور بھارت اب ان کو گھاس نہیں ڈالتا اور کنٹرول لائن کا مقصد یہ تھا کہ آئندہ بھی اگر کوئی کسی علاقے پر کنٹرول حاصل کر لے تو وہ علاقہ اس کا ہوگا۔ جیسے بھارت نے آگے بڑھ کر سیاچین پر قبضہ کر لیا اور وہ وہاں ''قابض'' ہے اور اس طرح بھارت کو جب موقع ملتا یا ملے تو وہ آزاد کشمیر کو آہستہ آہستہ اپنے کنٹرول میں لیتا رہے گا۔ دوسرا فائدہ بھارت نے الفاظ کی ''شعبدہ بازی'' سے یہ اٹھایا کہ کشمیر کا

مسئلہ اب بھارت اور پاکستان دو ملکوں کا ذاتی مسئلہ ہے اور یہ شملہ معاہدہ کے تحت خود بات چیت کے ذریعہ حل کریں گے اور اس طرح اقوام متحدہ یا دوسرے ممالک کی ثالثی وغیرہ کا ذکر خود بخود ختم ہو گیا کہ کشمیر کے لوگوں کے ''حق خود اختیاری'' جو ان کو اقوام متحدہ نے دی تھی۔ اس کا ذکر بھی نہ کر کے اس کو بھی ختم کر دیا بلکہ نجی طور پر یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ جب معاملات ٹھنڈے پڑ جائیں تو دونوں ممالک موجودہ کنٹرول لائن میں ضروری معمولی زمینی تبدیلیاں کر کے اسی کو بین الاقوامی سرحد تسلیم کر لیں۔ یہ کچھ آج تک نہ ہو سکا اور کشمیر کا مسئلہ کچھ ''زندہ'' ہے تو یہ رب کی ذات پاک کا کوئی راز معلوم ہوتا ہے کہ روس کے افغانستان پر حملے' بھٹو کے ''تخت'' سے تختہ پر جانے اندرا گاندھی کے قتل ہونے یا سنجے گاندھی کی ناگہانی موت یا راجیو گاندھی کے قتل نے معاملات کو فی الحال اس طرح رکھا ہوا ہے پھر مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ بھی عود کر آیا ہے تو مضامین کے اختتامی سلسلہ میں ہم پورے حالات کا تجزیہ پیش کریں گے کہ صورت حال کن اطراف میں پیش رفت کر رہی ہے۔ فی الحال یہ بات نوٹ کر لیں کہ ذوالفقار بھٹو کے خاندان سے خواہ خاندان کا سربراہ شاہ نواز بھٹو ہو یا خود بھٹو یا بینظیر بھٹو یا بھٹو کے بیٹے' ان سے کسی چیز اور بہتری کی توقع کرنا جاہلوں کی جنت میں داخل ہونا ہے۔ بینظیر کی حکومت کے زمانے میں راجیو گاندھی پاکستان آیا تھا تو لفظ کشمیر جہاں نظر آیا اس پر بھی' کشمیر روڈ کے بورڈوں سمیت مٹی تھوپ دی گئی تھی کہ راجیو گاندھی یہ دیکھنا بھی پسند نہ کرے گا کہ اہل پاکستان کا کشمیر کے ساتھ کوئی تعلق ہے بلکہ بینظیر کے سامنے راجیو گاندھی نے کشمیر کے بھارت کے اٹوٹ انگ ہونے کا جو اعلان کیا اور بینظیر کو سانپ سونگھ گیا کہ اس نے اور اس کے خاندان نے تو کشمیر کے قصہ سے کب سے ''دستبرداری'' کی ہوئی ہے۔

بھٹو نے پاکستان کو نیوکلیئر بنانے کا منصوبہ پاکستان کی خیر خواہی کیلئے شروع نہیں کیا تھا

اس تناظر میں مجھ سے اگلا سوال ہو گا کہ ذوالفقار بھٹو نے پاکستان کو نیوکلیئر بنانے کی کوشش کیوں کی؟ تو قارئین یہ سب ''لیپا پوتی'' تھی اور ''مجبوریاں'' تھیں اور قدرت نے ہمیں نیوکلیئر طاقت بنا دیا۔ اس سلسلہ میں اس عاجز کو جو معلومات ہیں میں پورے طور پر بیان نہیں کر سکتا صرف یہ گذارش کروں گا کہ ان دنوں یہ عاجز علاقہ کہوٹہ اور روات وغیرہ میں جانبازوں کو فوجی تربیت دیتا تھا تو جب کہوٹہ کے علاقے میں کام شروع ہوا تو امریکہ والوں کی ایک بہت بڑی گاڑی جس کو کئی ٹکڑوں میں راولپنڈی لایا گیا وہاں سے اس گاڑی کے پرزوں کو آ کر روات کے قریب جوڑ دیا گیا اور اس گاڑی میں بے حساب مشینیں تھیں اور اس گاڑی کا رابطہ امریکہ کے کئی سیٹلائٹ سے ہوتا تھا جو ہمارے ملک کے اوپر سے گذرتے تھے۔ تو یہ گاڑی والے کہوٹہ کے سارے محل وقوع کو امریکہ کے کئی سیاروں میں بھیجتے رہتے تھے۔ اس عاجز نے بڑی کوششوں سے کافی کچھ معلوم کر لینے کے بعد اپنے ہیڈ کوارٹر والوں کی وساطت سے جی ایچ کیو کے انٹیلی جنس کو لکھ کر رپورٹ بھیجی اور پوری صورتحال واضح کی تو مجھے معلوم ہے کہ جی ایچ کیو سے کئی ''مخبروں'' نے اس علاقہ کا دورہ کیا تھا اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن اس کے باوجود مزید تین ماہ وہ گاڑی اور سارا عملہ وہاں رہے کہ پوری ایک ایکڑ زمین کے پھیلاؤ میں وہ لوگ کام کرتے تھے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ لوگ سب کچھ ہماری حکومت کی ''مرضی'' یا ''اجازت'' سے کرتے رہے اور قارئین! ہمارے رہنماؤں یا

اوپر والے لوگوں کے کئی چہرے اور کئی بطون ہوتے ہیں اور یہی بڑا المیہ ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے اور کئی شہادتیں موجود ہیں کہ ملک کو نیوکلیئر طاقت بنانا یا اس طرف کچھ کوشش کرنا بھٹو کی مجبوری بھی تھی اور اس کو اس نے اپنی ایک ضرورت بھی سمجھا۔ مجبوری کی کئی وجوہات تھیں۔ بھٹو نے کچھ لیپا پوتی تو کرنا تھی۔ علاوہ ازیں 1974ء میں بھارت کے ایٹمی دھماکہ کے بعد افواج پاکستان کی طرف سے حکومت پر یہ دباؤ بڑھ گیا تھا کہ اگر سول حکومت کا کوئی محکمہ پاکستان کو نیوکلیئر بنانے کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا تو افواج پاکستان خود سائنسدانوں کی مدد سے یہ کام کرنے کو تیار ہیں۔ اس سے بڑھ کر سقوط مشرقی پاکستان کے بعد ملک کے کئی سائنسدان مل کر مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کو نیوکلیئر معاملات کے سلسلہ میں کام کرنے کے مواقع دیئے جائیں اور ڈاکٹر عبدالقدیر کی آمد سے پہلے کہوٹہ میں جس سائنسدان کے تحت نیوکلیئر بننے کا کام شروع تھا۔ وہ سلطان بشیر محمود ہیں اور راقم کے ذاتی دوست ہیں کہ ہم کچھ کتابوں کے ''سانجھے'' مصنف ہیں۔ ان کی وساطت سے یہ عاجز بہت کچھ جانتا ہے کہ بھٹو پر بہت سخت دباؤ تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ کرے۔ علاوہ ازیں راقم اپنے ایک پہلے مضمون میں اختصار کے ساتھ بیان کر چکا ہے کہ بھٹو کو کچھ غلط فہمی بھی ہوگئی تھی کہ نیوکلیئر طاقت بن جانے کے بعد فوج کے علاوہ سائنسدانوں کا گروہ ایک بڑی تعداد متبادل طاقت بن جائیں گے اور فوج جو اس طرح جب چاہے ملک کا کنٹرول سنبھال لیتی ہے وہ اس طرح ''واحد طاقت'' نہ رہے گی خیر یہ بھٹو کی غلط فہمی تھی یہ طاقت صرف بری فوج کے پاس اس کے سارے ملک میں پھیلاؤ زیادہ نفری اور زمین کو کنٹرول کرنے کی تنظیم کی وجہ سے ہے۔

بہرحال بات بڑی سیدھی سی ہے 1974ء کے بعد کوئی حکومت پر براجمان ہوتا اس کو نیوکلیئر طاقت حاصل کرنے کیلئے کچھ ضرور کرنا پڑتا۔ البتہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ بھٹو نے اپنے ''آقاؤں'' کی اجازت سے یہ کام شروع کیا اور ان کو تسلی دی کہ وہ مجبوری کی وجہ سے یہ لیپا پوتی کر رہا ہے اور اس سلسلہ میں کوئی خاص پیش رفت نہ ہونے دی جائے گی اور بھٹو ہر مرحلہ پر ان کو صورتحال سے آگاہ رکھے گا اور یہ عاجز جو ایک بہت بڑی گاڑی اور اس کے عملے کا ذکر کر چکا ہے کہ رُوات کے نزدیک سے وہ لوگ کہوٹہ کے محل وقوع کو کئی ماہ تک مانیٹر کرتے رہے یہ کچھ کسی Understanding کے تحت ہوتا رہا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کسی مرحلہ پر امریکہ والوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ بھٹو ان کے ساتھ چالبازی کر رہا ہے اور ڈبل گیم کھیل رہا ہے کہ وہ اس کے درپے ہو گئے جس کا 1977ء میں بھٹو نے راولپنڈی کی سڑکوں پر آ کر اعلان کر دیا۔

ویسے لیپا پوتی کے طور پر امریکہ کے صدر نے ضیاء الحق کو اپیل کی تھی کہ بھٹو کو پھانسی نہ چڑھائیں لیکن ضیاء الحق اس سے اپنی اور امریکہ ''دونوں'' کی ضرورت پوری کر رہا تھا۔ تفصیل آگے آئے گی کہ اگر امریکہ والے بھٹو کو بچانا چاہتے تو ضیاء الحق کو بھٹو کو پھانسی ہرگز نہ چڑھانے دیتے کہ ضیاء الحق امریکہ کا ہر حکم اتنی سختی سے مانتا تھا کہ طاقت میں آ کر ضیاء الحق نے ایک دفعہ تو نیوکلیئر پراجیکٹ پر کام بالکل روک دیا اگر کام باقاعدگی اور تیزی سے جاری رہتا تو ہم 81-1980 ہی میں نیوکلیئر طاقت بن گئے ہوتے۔ ضیاء الحق نے کیسی خاموشی سے اور ''چالاکی'' سے اس کام کو پھر ''جاری'' کیا۔ اس میں روس کے افغانستان پر حملہ اور امریکہ والوں کی اندرا گاندھی سے ''مایوسیاں'' یا امریکہ والوں کی اندرا گاندھی اور اس کے خاندان کو ''ٹھکانے'' لگانے کی تجاویز کا ضیاء الحق نے فائدہ

اٹھایا اور 86-1985ء میں جب امریکہ والوں کو معلوم ہو گیا کہ پاکستان تو نیوکلیئر طاقت بن چکا ہے اور ادھر روس کا بستر ابھی افغانستان سے ''گول'' ہونے لگا تو پھر امریکہ والے ضیاء الحق کے بھی ''درپے'' ہو گئے صرف ''وقت'' اور ''موقع'' کی تلاش تھی جو 1988ء میں ''میسر'' ہو گئے۔ قارئین! ہمارے رہنماؤں نے جو رویئے اختیار کئے ہوئے ہیں کہ آج تک ہر رہنما نے ترجیح اپنی کرسی کو دی۔ جو آئین اور قانون بنائے جاتے ہیں تو باطل رومن نظریوں' ایسی شکل دی جاتی ہے کہ آئین بنانے والے کی کرسی مضبوط ہو۔ اس لئے ہر حکمران کو ''بہروپیا'' بھی بننا پڑتا ہے۔ ہر حکمران کے کئی ''چہرے'' ہوتے ہیں۔ یہی بڑے المیے ہیں اور ذوالفقار علی بھٹو نے قوم کو جو 1973ء کا آئین دیا اس کو بھٹو کی ضرورتوں کے مطابق بنانے کے جلد بعد ''تراشنا'' بھی شروع کر دیا۔ اس لئے بھٹو کی خدمات میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ قوم کو ایک آئین دے گیا قوم ذرا سوچے کہ کہاں ہے یہ کافرانہ آئین اور کیا یہ آئین آج چل رہا ہے یا کبھی چلا تھا؟ یہ عاجز بہت پہلے اپنے مضامین میں گزارش کر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور حضور پاک ﷺ کے نام پر بنائے ہوئے ملک میں کوئی کافرانہ آئین اور نظام زیادہ عرصہ نہ چل سکے گا۔

بھٹو سمجھتا تھا کہ وہ حکومت کرتے کرتے بوڑھا ہو جائیگا

بھٹو نے اب جو حکومت حاصل کر لی تھی۔ اس نے سب قوم اور ہر خاص و عام کو خوب ''بے وقوف'' بنایا تھا اور اس کو تسلی ہو گئی تھی کہ وہ اسی طرح قوم کو بے وقوف بناتا رہے گا اور تا عمر حکومت پر براجمان رہے گا اور زیادہ بڑھاپے کی صورت میں اپنے کسی بیٹے یا بیٹی کو اپنا ''جانشین'' بنا دے گا تو اس نے 1973ء کا کافرانہ آئین بنانے کا ڈرامہ رچایا کہ وہ آئینی اور قانونی طور پر ملک کا حاکم اور سربراہ بننا چاہتا ہے۔ اب ہر آمر صدارتی نظام کے تحت ملک کا صدر بن کر آسانی سے حکومت کر سکتا ہے لیکن ہمارے ملک میں بڑا تماشا یہ ہے کہ صوبوں کی آبادی ایک جیسی نہیں بلکہ صوبہ بلوچستان کی آبادی صوبہ پنجاب کے ایک دو ضلعوں کے برابر ہو گی۔ اب جب ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تو بات ''وفاق'' اور ''صوبائی خود مختاری'' سے شروع کی لیکن اس کا اصول یہ تھا' کہ ہم مسلمان ہیں۔ اس لئے یہ علیحدگی کی باتیں کر رہے ہیں تو متحدہ ہندو پاکستان میں پارلیمانی نظام چل رہا تھا پاکستان بن جانے کے بعد اسی اصول کی شکل کو تبدیل کر کے ''خطوں'' اور قومیتوں کے تحت صوبائی خود مختاری کے اصول کو اپنا کر' چھوٹے صوبوں نے ''وفاق'' اور پارلیمانی نظام کے مطالبہ کو قائم رکھا کہ چھوٹے صوبے' بڑے صوبے کے برابر مراعات حاصل کریں اسلام ایسے تفرقوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ نہ خطوں یا قومیتوں کی خود مختاری کو تسلیم کرتا ہے۔ اسلام ایک مرکز کا داعی ہے۔ ''کل مومن اخوۃ'' سب مومن بھائی بھائی ہیں۔ ہمارا دین اسلام ہے اور قوم مسلمان ہے لیکن ہم مکمل طور پر باطل نظاموں کی پیروی کر کے ''خطوں'' اور ''قومیتوں'' کی سیاست کے چکروں میں ہیں۔ اس لئے بھٹو اگر پہلے آمروں ایوب خان اور یحییٰ خان کی طرح صدارتی نظام کو اپناتا تو اس کا ''سندھ کارڈ'' ختم ہو جاتا۔ یہی بڑا المیہ ہے تو اب پارلیمانی نظام میں زیادہ طاقت وزیر اعظم کے پاس ہوتی ہے اور صدر برائے نام آئینی سربراہ ہوتا ہے تو بھٹو کو صدارت چھوڑ کر وزیر اعظم کی کرسی سنبھالنی تھی اور ہمارے ملک میں ہر آئین ''حاکم'' اپنی کرسی مضبوط کرنے کے لئے بناتا ہے تو 1973ء کا آئین بھی پارلیمانی نظام کے تحت ''وزیر اعظم'' کا آئین یا بھٹو کا آئین تھا

اور ملک کا صدر بے چارا فضل الٰہی ایوانِ صدر سے باہر نکل کر خودؔ ایوانِ صدر کی دیواروں پر لکھتا رہا کہ "مجھ کو آزاد کراؤ" یعنی صدر فضل الٰہی کو بھٹو کی قید سے آزادی دلاؤ۔ اب یہ ہیں ذوالفقار بھٹو کی "کارستانیاں" لوگ کہتے ہیں کہ بڑے زرخیز دماغ کا مالک تھا اور بھٹو فضل الٰہی کے اس عمل پر خوب ہنسا تھا۔ کچھ کہتے ہیں بڑے اعلیٰ پایہ کا سیاستدان تھا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ تھا تو بڑا سمجھدار صرف برائی کی طرف مائل ہو گیا یعنی Evil Genius تھا لیکن یہ عاجز بھٹو کے ساتھ لفظ Genius کو کبھی وابستہ نہ کرے گا۔ میرے لحاظ سے وہ مداری اور شعبدہ باز تھا۔ بات بڑی سیدھی ہے۔ انگریز بے شک Evil Genius کا محاورہ یا Necessary Evil کے الفاظ استعمال کرتے رہیں اسلام کے لحاظ سے نہ ضرورت کو "بد" ہونا چاہیئے اور نہ "بد آدمی" کو "داناؤں" یا "مدبرین" یا "دانشوروں" کے زمرے میں لایا جائے کہ اسلام کے لحاظ سے "دانائی" اور "بدی" اکٹھی نہیں ہو سکتیں ہم نے چونکہ اپنے نفس کو نہیں پہچانا اور نہ مومن کی فراست کے حامل بن رہے ہیں تو رب کی ذات کبھی ہم پر ایوب جیسے مومن کی فراست سے عاری والے کو "مسلط" کر دیتی ہے کبھی یحییٰ خان جیسے شرابی اور بے حیائی کے مظہر کو اور کبھی بھٹو جیسے مداری کو۔ یہ عاجز اس سلسلہ میں سارا قصور اپنے "دانشوروں" یعنی ادیبوں اور اہل قلم کے سر تھونپ رہا ہے کہ وہ قوم کی صحیح رہنمائی نہیں کرتے۔

اورنگ زیب عالمگیر کو بھی یہ چیز آخری عمر میں سمجھ میں آئی اور دانشوروں اور اہل قلم کو بلا کر کہنے لگا "روز قیامت آپ لوگوں سے سخت جواب طلبی ہو گی۔ آپ نے میرے دادا کو "جہاں گیر" یعنی سب جہانوں کو سر کرنے والا بنا دیا۔ میرے والد کو "شاہ جہان" بنا دیا یعنی سب جہانوں کا بادشاہ ہے اور مجھے "عالمگیر" یعنی تمام عالموں کو اپنے قبضہ میں لانے والا بنا دیا اور حالات یہ ہیں کہ چند مرہٹے اور سکھ ہمارے قابو میں نہیں آ رہے۔

اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے پرانے استاد اور اتالیق کو لکھا کہ انہوں نے اورنگ زیب کو تعلیم دیتے زیادہ زور صرف ونحو اور "گردانوں" یا "لفاظی" پر دیا۔ کاش! ان کو اگر وہ اس مضمون میں سبق دیتا کہ قلعہ بند لڑائی میں کیسے کامیابی حاصل ہو سکتی ہے اور جہاد کے تقاضے کیا ہیں تو اورنگ زیب کو ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں پر اتنا وقت ضائع نہ کرنا پڑتا۔ اورنگ زیب نے خط میں اور بھی بہت کچھ لکھا کہ کاش! ہمارے علما لوگوں کو وہ علم پڑھاتے جس میں دین و دنیا دونوں کی ضرورتوں کو زیادہ مدنظر رکھا جاتا تو قارئین یہ مثالیں دینے میں بڑا مقصد یہ ہے کہ پاکستان بنانے کے بعد ہمارے دانشوروں اور اہل قلم نے "حقائق" کی طرف کبھی دھیان نہ دیا۔

جن لوگوں نے "دانشور" ہونے کا یا "ادیب" ہونے کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔ ان میں سے جنہوں نے اس عاجز کے ساتھ کبھی رابطہ کیا ایسے لوگوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے کہ ان میں اکثر "وقتی" لوگ ہوتے ہیں۔ جب پاکستان بنا تو ان لوگوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا کہ دنیا کی پانچویں بڑی طاقت یا پانچواں بڑا ملک وجود میں آ گیا ہے اور دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک پاکستان ہے۔ اس کے ہر رہنما کو جو کرسی پر ہوتا تھا' اس کی شخصیت کو ریت کی بنیادوں پر ایسے "قلعہ جات" میں گھیر دیا جاتا کہ ایسے لوگوں کے دھڑام سے گر جانے کے بعد' آنسو تو کبھی کسی نے نہ بہائے کہ اس کی ضرورت نہ تھی کہ ان کی شخصیت کی بنیاد ریت پر ہوتی تھی لیکن کسی نے سبق بھی نہ سیکھا۔ نہ ایوب خان نے اس بے حیائی کا "نوٹس" لیا جو یحییٰ خان اور اُس کے حواری کرتے رہتے تھے اور نہ قوم

میں سے کسی نے احتجاج کیا' کہ ایسے کردار والے آدمی مجاہدین کے کمانڈر کیسے بن سکتے ہیں۔ تو نتیجہ قوم کے سامنے ہے۔ چنانچہ 1949ء میں کوہاٹ کے مقام پر اس عاجز نے جب بھٹو کو ایک بھارتی شہری اور ''ٹیڈی بوائے'' کے طور پر دیکھا اور اس زمانے میں مجھے کوئی کہتا کہ یہ آدمی 1958ء میں تمہارے ملک کا وفاقی وزیر بن جائے گا اور 1971ء میں صدر' تو اپنا سر پیٹنا ہی پڑتا' کہ یہ بے کرداری رنگ لائی کہ ملک بھی دولخت ہو گیا اور نوے ہزار فوجیوں سے ہم نے ہتھیار بھی ڈلوا دیئے لیکن سبق پھر بھی نہ سیکھا۔ ''کچی بچی'' بینظیر اور ''کچا وچھا'' نواز شریف ہمارے رہنما اور وزیراعظم بن گئے اور قوم کا ایک بڑا طبقہ آج بھی ان کو وطن میں واپس لانے کے لئے ''بے قرار'' ہے۔ اگر صورتحال یہی رہی تو پاکستان کے اللہ تعالیٰ کے راز ہونے کا معاملہ صرف یہاں تک پہنچے گا کہ یہ ایک ''مواقع تقدیر'' تھا لیکن افسوس ہم اس امتحان میں بری طرح فیل ہو گئے۔

مولویوں میں فضل الرحمٰن کو چھوڑ کر کوئی بھی وزیراعظم بننے کا امیدوار نہیں

میں یہ کچھ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ذرا باقی ''متوقع'' اور ''امیدوار'' وزرائے اعظم پر بھی نگاہ ڈال لیں اول فضل الرحمٰن ہیں جن کا باپ مفتی محمود پاکستان بنانے کے ''گناہ'' میں تو شریک نہ تھا البتہ اس گناہ سے سرحد کی وزارت اعلیٰ کی ''آلودگی'' سے تو حظ اور مزے لیتا رہا اور فضل الرحمٰن کی پارٹی اب سرحد اور بلوچستان کے ''گناہوں'' کی آلودگی کے ساتھ خوب چمٹی ہوئی ہے کہ فضل الرحمٰن جب بھارت گیا تو وہاں ''بھارت بھاشا'' میں اس طرح باتیں کیں کہ واجپائی ان کے ساتھ ملنے کے لئے ''بیقرار'' ہو گیا کہ اب بھارت کا جیٹھ ملانی' ہمیں لالو پرشاد دے کر فضل الرحمٰن پکے طور پر ہم سے لینا چاہتا ہے۔ تو اب مسرت شاہین' انتخابات میں فضل رحمٰن کا بہتر مقابلہ کر سکے گی لیکن قوم کو اس بات پر حیران نہ ہونا چاہیئے کہ ''مولویوں'' میں فضل صاحب کو چھوڑ کر کوئی ''ایک'' بھی نہ وزیراعظم کے عہدے کا ''امیدوار'' ہے یا ''اہل'' ہے۔ ظاہر ہے کہ درس نظامیہ کے یہ ''سند یافتہ مولوی'' ایسے اسلام کے پیروکار ہیں جو بارہویں صدی عیسوی میں سلجوقیوں نے حکومت کے کام چلانے کے لئے ''تراشا'' تھا۔ اسلام جو نہ قدیم ہے نہ جدید اور ہر زمانے کے ''تناظر'' میں خود زمانے کو اپنے محیط میں لے سکتا ہے اس پہلو سے ہمارے مولوی بے چارے بالکل ''بے خبر'' ہیں کہ مودودی جیسا آدمی ''مفکر اسلام'' بن گیا اور اس کے عقائد کی مخالفت تو ہوئی لیکن کسی اور مولوی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ قوم کو بتاتا کہ نیاز فتح پوری جو ''نیچریہ'' عقیدہ کا تو کھلم کھلا اظہار کرتا رہتا تھا اور کچھ کے مطابق وہ ''دہریہ'' تھا۔ مودودی اس سے علم حاصل کر کے اسلام کا مفکر کیسے بن سکتا تھا۔ اس کی تحریروں میں جو ''بے ادبیاں'' اور ''گستاخیاں'' موجود ہیں ان کو پڑھ کر اس عاجز نے اپنا سر پیٹ لیا اور مجبوراً ایک کتاب بھی لکھنا پڑ گئی۔ بات یہ بھی ہے کہ مودودی ''اندھوں میں کانا'' سردار ہے اور ہماری کم علمی کا یہ حال ہے کہ مادر پدر آزاد کانگرسی مولوی جو کلام کا باپ بنا ہوا ہے۔ اس نے تاریخ کا ''حلیہ'' بگاڑ دیا اور اُس کی قرآن پاک کی تفسیر میں مودودی سے بھی بڑھ کر بے ادبانہ ہے اور قائداعظم اُس کو ہندو کانگرس کا ''بچہ جمہور'' اقرار دیتے تھے اُس کو بھی کچھ لوگوں نے ''امام الہند'' بنا دیا ہے حالانکہ اُس نے مردود غلام کذاب کے جنازہ میں بھی شرکت کی تھی اور کچھ لوگوں پر مودودی کی ''علمیت'' ایسی سوار ہے کہ مودودی کی کسی گستاخی یا بے ادبی جب مودودی

کے الفاظ میں بھی پیش ہو تو یہ لوگ اس بات کو پرکھنے کی بجائے کہتے ہیں کہ مودودی پر یہ ''ظلم'' ہو رہا ہے کہ اس کے بارے سچّی بات کیوں لکھی گئی۔ (توبہ میرے اللہ) یعنی یہ مودودی کا حق ہے کہ حضور پاک ﷺ کی شان کو کم کرے اور قرآن پاک کے الفاظ کو غلط معنی اپنائے۔ یا اُن احکام کو رد کرے جو قرآن پاک میں ہیں اور جو چاہے وہ بے ادبیاں کرے۔ حالانکہ ہمارے باقی ''مولوی'' بھی اندھوں کی طرح ہاتھی کے جس حصّہ پر ہاتھ رکھ کر اس کو ہاتھی سمجھ رہے ہیں' یہ لوگ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کے اندر اسلام کو ''محبوس'' کئے ہوئے ہیں۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ 59 سالوں میں نہ کوئی ایک آدمی نظر آیا نہ کوئی ادارہ سامنے آیا جو اس بیسویں صدی اور اکیسویں صدی کی سائنسی دریافتوں اور تخلیق کائنات کے سلسلے کے یا تخلیق انسانیت کے پہلوؤں کو قرآنی علوم کے تابع کرتا۔ چند صاحبان نے اس سلسلہ میں جو تھوڑا سا کام کیا ہے' اور مضامین لکھے ہیں ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے اور یہ عاجز اپنی اور اپنے رفقا کی اس سلسلہ کی کوششوں کا ذکر بعد میں کرے گا کہ بار بار گزارش کر رہا ہوں کہ آؤ ہم قوم کے طور پر قرآن پاک سے تخلیق کائنات کے مقاصد سمجھ کر دین اسلام اور اسلامی فلسفہ حیات کو موجودہ زمانے کی سیاسی دریافتوں میں اپنے لئے ملا جلا نشان راہ تلاش کریں کہ ہر زمانے کے لئے ہمارے رہنما مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

''ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے''

اس تناظر میں ذرا وزارت عظمیٰ کی گدی کے باقی امیدواروں پر بھی نگاہ ڈال لیں۔ ایک شیخ رشید صاحب ہیں جنہوں نے اب جنرل پرویز مشرف کو اپنا ہمیشہ کے لئے ''گرو'' تسلیم کر لیا ہے۔ پچھلے دنوں لالو پرشاد جو بن بلایا' لال حویلی میں پہنچ گیا تھا' قارئین اس واقعہ کو یاد رکھنا۔ دوسرے امیدوار ہمایوں اختر ہیں جن کو یہ ''وقعت'' اس لئے حاصل ہو گئی ہے کہ وہ اربوں میں ''کھیلتے'' ہیں۔ یہ دولت اُس کے والد جنرل اختر عبدالرحمٰن نے کب اور کیسے حاصل کی کہ 1958ء تک اُس کا بھی ہماری طرح ''سائیکل'' پر گزارا تھا۔

وزیراعظم بننے کا ایک امیدوار یہودیوں کا ''داماد'' عمران خان بھی ہے۔ نہ وہ ملکی معاملات کی کوئی سوجھ بوجھ رکھتا ہے نہ اس کو بین الاقوامی معاملات پر کوئی عبور ہے۔ اس کو خیال تھا کہ یہاں بھی شاید وہ کرکٹ کا کوئی ''چھکا'' مار لے۔ لیکن اب کچھ مایوس ہو رہا ہے۔ ایسی ہی صورت سے طاہر القادری ''دوچار'' ہے جس کو لوگ' گاؤں کے میراثیوں کے رہنما کا نام دیئے ہوئے ہیں۔ راقم کسی زمانے میں اس کے ساتھ کچھ خط و کتابت کرتا رہا تھا کہ اس کے منہ سے ایک دفعہ ایک اچھی بات نکل گئی تھی کہ اسلام تلوار کے استعمال سے ''دستبرداری'' کی اجازت بھی نہیں دیتا کہ مومنین سورۃ التوبہ کے مطابق قتل کرتے بھی ہیں اور قتل کئے بھی جاتے ہیں لیکن اپنے خطوط میں اس نے اپنا ''کچا چٹھا'' کھول دیا اور پھر اس کے کچھ ایسے ''دعوے'' بھی سامنے آئے کہ اس کو یاد کر کے یہ عاجز اب اپنی ہنسی کو نہیں روک سکتا۔ کہ کبھی وہ گھوڑے کا ''شاہسوار'' بن جاتا ہے اور کبھی گدھے پر بھی ''لٹکا'' ہوتا ہے سوار نہیں ہو سکتا۔

ان امیدواروں کے علاوہ فاروق لغاری اور خورشید قصوری بھی وزیراعظم بننے کی امیدوار ہیں۔ اور وزیر خزانہ شوکت عزیز تو کب کا پر تول رہا ہے کہ وہ معین قریشی ثانی بن جائے۔ (اور اب ایسا ہو گیا ہے) خواہ یہ عہدہ تھوڑے عرصہ کے لئے ملے کہ پھر وہ آسانی سے امریکہ میں پکے طور پر آباد ہو سکے گا' لیکن میری حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی جب زبیدہ جلال جیسی ''سکول کی استانی'' بھی وزیراعظم کے عہدہ کی امیدوار تھی اور امریکہ والے خاص کر پاول صاحب نے اس سکول ''ٹیچرس'' کو اس وزیراعظم کے عہدہ کیلئے ''موزوں'' قرار دیا کہ ان کے مطابق پاکستان کی حکومت کو ایک ''نتھو خیرا'' بھی چلا سکتا ہے۔ اب صرف چودھری شجاعت حسین باقی رہ گیا ہے جو ''بادشاہ گر'' تو اب بھی ہے جس وقت چاہے اس کرسی پر خود بیٹھ سکتا ہے۔ (اور دو ماہ اس کرسی پر بیٹھ بھی گیا ہے) اس کو ہمارے گورنر جنرل غلام محمد کی طرح ایک ایسا آدمی ساتھ رکھنا پڑے گا جو اس کی بات کو ''سمجھ'' سکے اور اگر غلام محمد تین سال تک ملک کا سربراہ رہ سکتا ہے تو شجاعت کیوں نہیں رہ سکتا۔ قارئین یہ عاجز ''قحط الرجال'' کی شکایت نہیں کر رہا صرف دانشوروں کو گزارش کر رہا ہے کہ وہ خود بھی اپنے نفوس کو پہچانیں اور قوم کو حقائق سے آگاہ کرتے رہا کریں تو شاید یہ قوم اپنی کوتاہیوں کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دے اور رہنمائی کیلئے ''مولانا'' اقبال اور ''مولانا'' جناح کی قسم کے لوگوں کی تلاش شروع کر دے۔

تو اب ہم ذوالفقار علی بھٹو کی ایک اور ''کامیابی'' پر تبصرہ کرتے ہیں کہ اس کی حکومت کے زمانے میں قادیانیوں کو ''اقلیت'' قرار دے دیا گیا۔ قارئین! یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ ہم جیتی ہوئی بازی ہار گئے۔ بھٹو کے زمانے میں ''قادیانیوں کے فتنہ'' کو ختم کرنے کے رب کی ذات پاک نے سنہری مواقع فراہم کر دیئے تھے لیکن گہری سازش جس میں بھٹو نے اہم کردار ادا کیا اس نے قادیانیوں کو ایک نئی زندگی عطا کر دی کہ قادیانیوں کو اقلیت تسلیم کر کے ہم قادیانیوں کو ایک گروہ یا مذہبی گروہ تسلیم کر چکے ہیں۔ اب قادیانی تو کہتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور ان کا ہی اسلام صحیح اسلام ہے تو ہم نے جو حدود ان پر لگائی ہیں کیا ان پر عمل ہو سکتا ہے یا ہو رہا ہے؟ تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ اور اگر قادیانی مسلمان ہیں تو پھر ہم کیا ہیں؟ کہ وہ لوگ ہمیں کافر گردانتے ہیں قادیانی فتنہ کوئی معمولی فتنہ نہیں۔ مسلمان کو مسلمان نہ چھوڑنے کی یہ ایک بہت بڑی سازش ہے جس کے ''پیدا'' کرنے والے اب بھی ان کو نئی سے نئی ہدایات دیتے رہتے ہیں کہ قادیانی ہمارے اندر ''گھس'' چکے ہیں اور یہ عاجز اپنے مشاہدات میں کئی چھپے ہوئے لاہوری قادیانیوں یا دوسرے قادیانیوں کا ذکر کر چکا ہے قادیانی ایک ''ناسور'' ہیں۔ اسلام کے جسم میں اس پلید اضافے کا آپریشن کر کے اس ناسور کو باہر پھینک دینے کی ضرورت ہے۔ یہ عاجز 1953ء کی اینٹی قادیانی تحریک کی حقیقت قوم پر اپنے پچھلے مضامین میں واضح کر چکا ہے کہ اس عمل نے مخلص مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا اور اب 1973ء میں جو ''حادثاً'' قادیانیوں کے خلاف تحریک شروع ہو گئی یہ بھی ممکن ہے ایسا کچھ قادیانیوں اور ان کے ''آقاؤں'' نے خود کیا ہو کہ دیکھیں قادیانی سازش کتنی گہرائی میں جا چکی ہے۔ بہرحال ردعمل بڑا سخت نکلا جس نے قادیانی طاقتوں کو ہلا کر رکھ دیا تو پھر بڑی سازش سے ہماری قوم کو ''بے وقوف'' بنایا گیا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے کر ہمارا منہ تو بند کیا لیکن ساتھ ہی ہمارے رومن کافرانہ قانون کے تحت قادیانیوں کو ہم نے ایک ''اقلیت'' یا گروہ تسلیم کر لیا جو بہت بڑا المیہ ہے۔ میں تاریخ نہیں لکھ رہا میں واقعات کے نتائج اور

اثرات کے حقائق لکھ رہا ہوں کہ قادیانیوں کو ''اقلیت'' قرار دے کر ہم نے کیا حاصل کیا؟ وہ اب بھی ہمارے ''اندر باہر'' موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ اور رسول پاک ﷺ کے نام پر بنائے گئے ملک کے عین وسط میں جھوٹے نبی کا مرکز موجود ہے اور اسی مرکز کے اردگرد سے شیعہ وسنی فسادوں کو جنم مل رہا ہے کہ آج ہماری مسجدیں اور عبادت گاہیں بھی ''محفوظ'' نہیں اور یہ فسادات ملک کے چپہ چپہ تک پھیل گئے ہیں کہ قادیانی اب ہمارے اندر گھس کر یہ سب کچھ کروا رہے ہیں کہ فطرت کی طرف سے ہم کو یہ سزا مل رہی ہے کہ مرزا غلام کذاب کی سازش کو ہم نے پھیلنے دیا تو مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کا نام مٹ گیا اور مسجدیں ختم ہو گئیں اب مغربی پنجاب میں اگر ہم نہیں سنبھلتے اور جھوٹے نبی کے ربوہ کے مرکز کو ''دریا برد'' نہیں کرتے تو فطرت کی طرف سے کسی سخت سزا یا عبرتناک صورتحال کے لئے تیار رہیں۔ بھٹو دور میں ہم نے اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں حاصل کیا۔

اس عاجز نے قادیانی سازش کی بھی گہری تحقیق کی ہے۔ ایک دو کتابیں بھی اس سلسلہ میں لکھ چکا ہوں۔ متعدد پمفلٹ بھی جاری کئے۔ قادیانیوں کی سازش کے پہلو کو 1990ء میں یہ عاجز فیڈرل شریعت کورٹ میں بھی لے گیا اور اس سازش کے سلسلہ میں 1993ء میں سپریم کورٹ میں ایک تحقیقی مراسلہ داخل کر کے یہ عاجز قادیانیوں کے وہاں کے مقدمہ میں اپنے آپ کو ایک ''فریق'' تسلیم کرانے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا اور میں نے کوئی وکیل نہ پیش کیا۔ اپنی وکالت خود کی کہ اس عاجز نے پورے پس منظروں کے ساتھ جو ''نکتے'' پیش کئے یا جس رنگ میں اپنی ''تحقیق'' کو شکل دی وہ سب باتیں ''انوکھی'' تھیں۔ پوری تفصیل کئی مضامین میں ختم نہیں ہوتی اختصار کے ساتھ شرعی عدالت کو گزارش کی کہ ''قادیزم'' کوئی مذہب نہیں یا یہ کہیں گے کہ قادیانیوں کا کوئی مذہب نہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور انکا مذہب دین اسلام ہے۔ اب اگر ہم یہ بات تسلیم کر لیں تو پھر ہم کہاں گئے؟ یعنی ہمیں قادیانیوں کا یہ عقیدہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم کافر ہیں (توبہ میرے اللہ) تو اب ضرورت اس امر کی ہے کہ عدالت عالیہ فیصلہ کرے کہ قادیانی کیا ہیں موجودہ صورت میں وہ ڈاکو اور حملہ آور ہیں اور ہم پر حملہ آور ہو کر ہمارا اسلام ہم سے زبردستی چھین کر اس کے وہ مالک بننا چاہتے ہیں۔ یہ عاجز عدالت میں اس لئے حاضر ہوا ہے کہ عدالت ہمیں ان قادیانیوں یا جو کچھ یہ اپنے آپ کو کہتے ہیں کے ڈاکے اور شر سے بچائے اور اس سلسلہ میں یہ عاجز کچھ تجاویز بعد میں پیش کرے گا کہ ایک اور نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ قادیانی کہتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ لیکن یہ زبانی اور قولی بات ہے۔ عملی طور پر ان کے عقائد مسلمانوں والے نہیں کہ انہوں نے ایک کذاب کو اپنا رہنما یا نبی اور پیغمبر بنایا ہوا ہے جو خود کبھی کسی عقیدہ پر قائم نہ تھا اور کیا کچھ نہ بن جاتا تھا کہ کبھی مجدد، کبھی نبی اور کبھی اپنے آپ کو حضرت مریم قرار دیا کہ اُس کو حیض آیا اور جب پاک ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ''رجولیت'' کی۔ کہ پھر اس سے ''مسیح موعود'' کی تخلیق ہوئی۔ یعنی وہ وہ وہاں تک چلا گیا کہ اس کو ماہواری کے طور پر عورتوں والا حیض بھی آیا تھا۔ اب یہ سب تو ایک ''تاریخی حادثہ'' تھا کہ ہماری غلامی کے زمانے میں ایسا مداری شعبدہ بازیاں کرتا رہا۔ آج اگر کوئی آدمی ایسی حرکتیں کرے تو اس کو پھانسی کی سزا مل جائے گی۔ اس لئے آج جو اس فراڈ کے پیروکار ہیں وہ اسی زمرہ میں آتے ہیں جس میں غلام کذاب تھا اور اسلامی پاکستان میں ہر قادیانی ''مرتد'' ہے اور

اس کو مرتد کی سزا ملنا چاہیئے۔ یا دیس نکالا، دو دن کی ان پیشیوں میں اس عاجز نے ان دو نکتوں کو پس منظروں میں جس طرح پیش کیا تو اس کا بریف ہم خود بنا کر اخباروں کو دے دیتے تھے جنھوں نے خبر کے طور پر ہماری گزارشات اور حقائق کو خوب پذیرائی دی کہ تیسری پیشی میں اس عاجز نے ان دونوں نکات کو شیر وشکر کر کے اپنی سفارشات پیش کرنا تھیں کہ اس قادیانی سازش کا قلع قمع کس طرح ہوسکتا ہے اور شرعی عدالت پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

بے نظیر نے شرعی عدالت کے چیف جسٹس کو ملاقات کیلئے بلایا تو مجھے شک پڑا کہ دال میں کالا ہے

حکومت پر ان دنوں بے نظیر براجمان تھی اور غیر ملکی ذرائع سے ایک خبر اخباروں میں آئی کہ پاکستان کے مسلمان قادیانی اقلیت کا ناطقہ بند کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو مجھے شک پڑا کہ اس خبر کو قادیانیوں کے ''آقاؤں'' نے نشر کرایا ہے کہ ساتھ ہی خبر آ گئی کہ بے نظیر نے شرعی عدالت کے چیف جسٹس کو ملاقات کیلئے بلا کر اس کے ساتھ ملاقات کی ہے تو مجھے شک پڑا کہ ''دال'' میں کچھ کالا کالا ہے اور بے نظیر نے چیف جسٹس کو کوئی ''ہدایت'' دی ہے یا کچھ بات کی ہے۔ میرے مقدمہ کی اگلی پیشی 17 اپریل 1990ء کو تھی لیکن 9/10 اپریل آدھی رات کو مجھے جگا کر 10 اپریل 90ء کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا اور مجھے عدالت نے بتایا کہ اس مقدمہ کی باتوں کو اخباروں میں اتنا زیادہ اچھال دیا گیا ہے کہ حکومت کے لئے اب یہ ایک مسئلہ بن گیا ہے اور شرعی عدالت تو ان نکتوں کے سننے کی مجاز ہی نہیں جو اس عاجز نے اٹھائے ہیں کہ یہ نئے معاملات اٹھانے سے قادیانی مسئلہ کو جو 1973ء میں ''حل'' کر لیا گیا تھا تم (درخواست گزار) اور مشکل بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اس لئے تمہاری درخواست رد کی جاتی ہے میں نے گزارش کی کہ عدالت عالیہ مہربانی سے میری رہنمائی کرے کہ میں اپنے حقوق پر قادیانیوں کی اس ''ڈاکہ زنی'' کا معاملہ کہاں لے جاؤں۔ تو چیف جسٹس نے کہا کہ یہ ان کا کام نہیں۔ تو میں نے گزارش کی کہ وہ یہ معاملہ سپریم کورٹ کے شرعی بینچ کو ''ریفر'' کر دیں کہ وہ اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ دیں۔ تو چیف جسٹس نے کہا کہ وہ اس کے بھی ''مجاز'' نہیں تو اس عاجز نے آخری گزارش کی کہ میری بات کو عدالت کی توہین نہ سمجھا جائے کہ توہین کے لئے ''نیت'' کو پرکھنا ضروری ہے۔ اب مہربانی سے میرا ایک ''احتجاج'' ریکارڈ کر لیں کہ اس کافرانہ رومن قانون کی ''زبان' اور طرز'' پر یہ شرعی عدالت بنانا اسلام کے ساتھ بہت بڑا مذاق ہے'' تو سارے ماحول پر ''سناٹا'' چھا گیا کہ مجھے کچھ کہنے یا جواب دینے کی بجائے چیف جسٹس نے اگلے مقدمہ کے درخواست گزاروں کو بلانے کا حکم دے دیا۔ قارئین یہ عاجز اس شرعی عدالت میں بعد میں بھی سیاسی پارٹیوں والے مقدمہ کے سلسلہ میں حاضر ہوتا رہا اور شرعی عدالت کے پہلے چیف جسٹس سے بھی ایک لیکچر کے دوران واسطہ پڑا تھا جہاں ایک صاحب نے قرآن پاک کی باتوں کو صرف روحانی غذا کے طور پر پیش کرنے کو ہی بڑا مقصد قرار دیا تو اس عاجز نے اعتراض کیا کہ قرآن پاک کو کسی ایک ''میدان'' کے لئے محدود نہ کیا جائے میرے لحاظ سے قرآن پاک فوجی زبان میں ہے اور اس کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ہم جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنائیں کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں پر

قرآن پاک کے یہ اثرات ہوئے کہ انہوں نے ایک ہاتھ میں قرآن پاک رکھ کر اور دوسرے میں تلوار لے کر حق کے نام کو بلند کر دیا اور باطل کو مٹا دیا۔ شرعی عدالت کا پہلا چیف جسٹس شیخ آفتاب اس مجلس کا صدر تھا۔ وہ کہنے لگا کہ دراصل قرآن پاک تو قانون کی کتاب بھی ہے اور سارا مغربی رومن قانون ایسے نظر آتا ہے کہ یہ قرآن پاک سے ماخوذ ہے تو اس عاجز نے ان کے بیان کے دوسرے حصّہ پر سخت اعتراض کیا کہ یہ کلمہ کفر ہے کہ آپ باطل رومن قانون کو قرآن پاک کے کلمات کا ''ماخوذ'' کہہ رہے ہیں میرے حساب سے یہ آفتاب صاحب بھی چھپے ہوئے قادیانی تھے اور شرعی عدالت کے لئے ایسے دستور بنا گئے کہ آج تک شرعی عدالت نے قوم کی کوئی خدمت نہیں کی اور شیخ آفتاب کے تعصب کی یہ حالت تھی کہ مجھے اپنا دشمن بنا لیا کہ گو میں تو اول اور آخر مسلمان ہوں اور اپنے آپ کو کسی ''مسلک'' سے وابستہ نہیں کرتا لیکن دو مسلکوں کے دو الگ الگ رہنماؤں پیر کرم شاہ الازہری اور درس حقانیہ کے سربراہ استاد سمیع الحق نے میری کتاب ''جلال مصطفےٰ ﷺ'' کیلئے انعام کی جو سفارش کی شیخ آفتاب نے ان سفارشات کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا' لیکن رب کی ذات پاک نے مجھے توفیق دی کہ اس عاجز نے اس سلسلہ میں ایک اور وسیع کتاب ''حضور پاک ﷺ کا جلال و جمال'' شائع کر دی' جس نے میری دنیا ہی تبدیل کر دی' لیکن قارئین شرعی عدالت کے معاملہ کو ذہن میں رکھیں کہ اس سے کیا قوم کو کوئی فائدہ حاصل ہوا ہے؟ اور شریعت کی ''آڑ'' میں کیسے کیسے لوگ وہاں سے تنخواہ وصول کر رہے ہیں۔

تو قادیانیوں کے مضمون کی طرف واپس آتے ہیں اور گزارش ہے کہ جلد رب کی ذات پاک نے میری یہ خواہش بھی پوری کر دی کہ میں کسی طرح قادیانیوں کے فتنہ کو ملک کی سب سے بڑی عدالت میں زیر بحث لا سکوں تو قادیانیوں نے میرے شرعی عدالت میں مقدمہ خارجہ ہونے سے اثرات لئے یا جو بھی ہوا۔ 92-1991ء میں انہوں نے سپریم کورٹ میں اپنے حقوق کا مقدمہ بڑی تیاری سے دائر کر دیا تو اس عاجز نے 75 صفحات میں ''قادیانی فتنہ'' کو اس کے پس منظر کے ساتھ سپریم کورٹ میں پیش کر دیا کہ قادیانی کے اس مقدمہ میں مجھے بھی ایک ''فریق'' تسلیم کیا جائے اور میں عدالت عالیہ کی توجہ کچھ حقائق کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو ان کو فیصلہ کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے۔ تو 1993ء میں جسٹس شفیع الرحمٰن کی سربراہی میں پانچ ججوں کے جس بینچ نے یہ مقدمہ سنا اس عاجز کو بھی ''فریق'' کے طور پر سنا گیا۔ قادیانیوں کا وکیل فخر الدین جی ابراہیم تھا جو پہلے کچھ عرصہ سندھ کا گورنر بھی رہ چکا تھا اور بعد میں فاروق لغاری نے جو معراج خالد کی سربراہی میں حکومت بنائی اس میں چند دن وزیر بھی رہا۔ کورٹ کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا۔

ایک طرف قادیانی اور ان کے وکیل بیٹھتے تھے۔ دوسری طرف مسلمان اور سرکاری وکیل اور مجھے بھی اس طرف آگے والے بنچ میں جگہ ملی تھی۔ پہلے قادیانیوں کے چھوٹے وکیلوں نے خطاب شروع کیا اور درمیان میں چائے کا وقفہ ہوا تو قادیانیوں کا یہ بڑا وکیل جی ابراہیم ہمارے بینچ کی طرف آ دھمکا' میں نے اعوذ باللہ پڑھتے اور کاذبوں پر لعنت بھیجتے منہ پیچھے کی طرف کر لیا۔ تو میرے ساتھ بیٹھے ایڈووکیٹ جنرل عزیز منشی نے مجھے گزارش کی کہ یہ وکیل قادیانی نہیں تو میں نے زیادہ نعوذ باللہ پڑھ کر کہا کہ پھر تو یہ قادیانیوں سے بھی بڑھ کر ''مردود'' ہے'' یہ حق کی بات سن کر اس وکیل کا چہرہ ایسا ''باسرہ'' ہو گیا اور وہ اتنا ''مرعوب'' ہو گیا کہ جب اس نے قادیانیوں کی

وکالت شروع کی تو اس کے منہ سے کوئی کام کی بات نہ نکلتی تھی اور یہ عاجز ''نگاہ بھر'' کر اس کی طرف دیکھتا تھا تو وہ تھتھیانے لگتا تھا۔ جب اس عاجز کی باری آئی تو جسٹس شفیع الرحمٰن جس نے بعد میں اپنے اعمال سے ثابت کر دیا کہ اس کی ''ہمدردیاں'' قادیانیوں کے ساتھ ہیں۔ اس نے مجھے ''مرعوب'' کرنے کیلئے مجھے بار بار ٹوکنا شروع کر دیا۔ تو اس عاجز نے گرج دار آواز میں کہا کہ میرے ہر فقرے کے اختتام پر مجھے وہ ٹوکے یا جو ریمارکس پاس کرے وہ صحیح ہوگا۔ اور میں اس کو خود بخود ایسی دعوت بھی دے دوں گا۔ لیکن ابھی میں نے بات مکمل نہیں کی ہوتی کہ آپ بیچ میں بول پڑتے ہیں۔ اخلاقی لحاظ سے یہ رویہ صحیح نہیں۔ ''تو کہنے لگا کہ تم اس مقدمہ میں ''فریق'' کیسے بن گئے'' تو گزارش کی کہ آپ کے سٹاف نے میری ''تحقیق'' کو پڑھا۔ آپ بھی وہ پڑھ لینا کہ میں اسلامی سکالر ہوں اور درجن بھر سے زیادہ کتابوں کا مصنف ہوں جن میں دو کتابیں قادیانی فتنہ پر عملی تبصرے ہیں۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے بڑی رحمت کی۔ شرعی عدالت کے اپنے بیانات کو دہراتے ہوئے۔ اس عاجز نے گزارش کی کہ قادیانی چور اور ڈاکو ہیں۔ ان کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ کسی اصول پر وہ پکے طور پر قائم رہتے ہیں۔ قائداعظمؒ کی وفات پر ان کے ظفر اللہ نے قائد کا جنازہ بھی نہ پڑھا۔ آجکل قادیانی دوڑ بھاگ کر ہمارے جنازوں میں بھی شرکت کرتے ہیں۔ اور جماعتوں میں بھی۔ تو ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ چوروں اور ڈاکوؤں کے کوئی حقوق نہیں ہوتے۔ تو شفیع الرحمٰن کہنے لگا۔ نہیں چوروں اور ڈاکوؤں کے ''حقوق'' ہوتے ہیں۔ میں نے گزارش کی کہ یہ حقوق ''دفاعی'' ہوتے ہیں اور وہ بھی اس وقت تک جب یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہ لوگ ''جارحیت'' کر رہے ہیں۔ یہ قادیانی جو اسلام پر سورۃ ہود میں بیان شیطان کے ہر رخ والے حملے کر رہے ہیں۔ ان کو آپ کون سے اور حقوق عطا کریں گے کہ یہ ہم پر مزید حملے کریں۔ جب شفیع الرحمٰن کوئی جواب نہ دے سکا۔ تو اس عاجز نے مزید گزارش کی کہ چور اور ڈاکوؤں کو کسی ''اجتماع'' کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ جہاں وہ بیٹھ کر ہمارے خلاف سازشیں کریں۔ اس لئے یہ لوگ جس جگہ کو ''عبادت خانہ'' کا نام دیں یا جیسے ربوہ کا جھوٹے نبی کا مرکز ہے۔ وہاں قادیانیوں کو کسی اجتماع کی اجازت نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ تمام مقامات سورہ التوبۃ کے بیانات کے مطابق ''مسجد ضرار'' کے متشابہ اور مطابق ہیں اور ان تمام مقامات کا وہی حشر ہونا چاہیئے جو حضور پاک ﷺ نے مسجد ضرار کا کیا راقم نے بہت کچھ کہا کہ جو آدمی قادیانیوں سے ملتا رہتا ہے یا معاشرتی تعلقات رکھتا ہے۔ وہ بھی حضور پاک ﷺ کا ''باغی'' ہے اور قادیانیوں کے زمرہ میں آتا ہے۔ میں قادیانیوں اور ان کے وکیلوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ مجھ سے جو سوال چاہیں وہ پوچھیں کہ اس ملک میں ہم امن سے تب رہ سکیں گے جب ہر قادیانی کو پہننے کیلئے ایک نشان دیا جائے اور ہر قادیانی گھر پر ایک نشان ہونا چاہیئے کہ جس طرح دس نمبر بدمعاش کو معاشرے میں رکھا جاتا ہے۔ ان قادیانیوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جائے۔ ورنہ بے شمار چھپے ہوئے قادیانی دن بدن ہمارے اندر گھس کر ہماری اندر سے جڑیں کاٹتے رہتے ہیں اور کیا نہیں کرتے رہتے۔ بہرحال اس عاجز نے دو الگ الگ مواقع پر قادیانی فتنہ پر عدالت کو خطاب کیا اور میرے بیانات کو اخباروں میں خوب پذیرائی ملی۔ لیکن سازش بڑی گہری تھی۔ شفیع الرحمٰن نے باقی ججوں کو کہا کہ وہ فیصلہ لکھ رہا ہے اور وقت پر کوئی فیصلہ نہ سنایا۔ اور اس میں تین ماہ لگا دیئے کہ وہ جسٹس افضل لون کی ریٹائرمنٹ سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا کہ معاملہ التوا میں ہی رہے تو اس عاجز اور ریاض گیلانی نے سپریم کورٹ کو

درخواستیں دینا شروع کر دیں کہ فیصلہ جلد سنایا جائے تو شفیع الرحمٰن نے ایک اوٹ پٹانگ فیصلہ لکھا جس میں قادیانیوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ باقی چار جج صاحبان نے اس فیصلہ کو رد کر دیا۔ تو جسٹس عبدالقدیر کے فیصلے کے ساتھ باقی تینوں جج صاحبان نے اتفاق کر کے قادیانیوں کی اپیل کو تو خارج کر دیا۔ دراصل جج شفیع الرحمٰن نے بڑا عجیب و غریب فیصلہ لکھا اور میرا نام لئے بغیر لکھا کہ مذہبی سکالروں کو "پارٹی" تسلیم کر کے یا ان کو عدالت میں سن لینے والا طریقہ صحیح نہ تھا کہ ان "سکالروں" نے عقائد اور جذبات کی آڑ میں ملک کے رائج قانون کو ثانوی حیثیت دینے کی سعی کی کہ قادیانیوں کے کوئی "حقوق" نہیں۔ ان قادیانیوں کے حقوق ہیں اور ان پر پابندی لگانے والے قوانین صحیح نہیں۔ خدا بھلا کرے جج عبدالقدیر اور باقی تین ججوں کا کہ انہوں نے شفیع الرحمٰن کے تمام فیصلوں کو رد کرتے فیصلہ دیا کہ مذہبی سکالروں نے بڑے اہم نکتے پیش کئے اس لئے وہ قادیانیوں کی اپیل کو خارج کرتے ہیں۔ لیکن یہ صاحبان میری ساری سفارشات پر فیصلہ نہ دے سکے کہ معاملہ صرف اپیل کا تھا۔ بہر حال قادیانیوں کا مسئلہ وہاں کا وہاں ہے۔ اور بھٹو کے زمانے میں بھی ہمیں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ قوم کو گزارش ہے کہ وہ میری سفارشات کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ قادیانیوں کو کسی اجتماع کی اجازت نہ ہو۔

بھٹو دھاندلی نہ کرتے تو بھی انکے خلاف تحریک چلتی

بھٹو کے حکومت کے زمانے کی طرف واپس آتے ہیں۔ 1976ء تک بھٹو اتنا اونچا جا رہا تھا کہ اس کو بھروسہ ہو گیا تھا کہ وہ پکے طور پر اب پاکستان کا حاکم رہے گا کہ اس نے بھارت سے قیدی چھڑانے کا سہرا اپنے سر باندھ لیا تھا۔ بنگلہ دیش الگ ملک بن چکا تھا۔ اب مغربی پاکستان اور بنگلہ دیش یا مشرقی پاکستان کے ایک ملک ہونے کا بھٹو کو کوئی "خطرہ" نہ تھا۔ اسلامی ملکوں کی کانفرنس پاکستان میں کر کے وہ اسلامی دنیا کا بڑا لیڈر بنا بیٹھا تھا۔ 1973ء کا آئین بنا کر وہ بڑا جمہور نواز اور آئینی سربراہ بنا ہوا تھا۔ قادیانیوں کو اقلیت قرار دلا کر وہ قادیانی "مسئلہ کو حل" کرنے کے سہرے اپنے سر پر باندھ رہا تھا اور کہوٹہ میں نیوکلیئر طاقت بننے کی طرح ڈال کر وہ بڑا ہی محب پاکستانی اور قائد عوام بن رہا تھا۔ فوج نے جنرل ٹکا خان کی سربراہی میں اس کو مکمل وفاداری دکھائی' لیکن بھٹو فوج پر دوہرا' تہرا کنٹرول چاہتا تھا۔ ٹکا خان کی نوکری پوری ہو رہی تھی۔ لیکن اس کا ایک جانشین مقرر کرنے کی بجائے بھٹو نے اس کے "تین جانشین" بنا دیئے۔ کہ کسی ایک آدمی کے پاس ساری فوجی طاقت نہ ہو۔ اول تو جنرل ٹکا خان کو ریٹائر کر کے سویلین کے طور پر وزیر دفاع یا دفاعی مشیر مقرر کیا کہ فوجی کمانڈروں پر "نگاہ" رکھے گا۔ دوم جنرل محمد شریف کے لیے ایک نئی جگہ وجود میں لائی گئی کہ وہ سہ افواج کا چیئرمین ہو گا یعنی جوائنٹ ڈیفنس سٹاف کا سربراہ ہو گا اور تینوں یعنی بری' بحری' اور فضائی افواج کے سربراہوں یا چیف آف سٹافوں کا کمانڈر ہو گا یا ان پر "نگاہ" رکھے گا۔ سوم بری فوج کے لئے چیف آف سٹاف کے لئے پہلے تو جنرل مجید ملک کے حق میں فیصلہ کیا۔ پھر سوچا کہ تینوں "بڑوں" کا تعلق راولپنڈی ڈویژن سے ہے۔ تو باقی تین جنرلوں' جنرل آفتاب' جنرل عظمت بخش اور جنرل محمد اکبر وغیرہ کے نمبر کاٹ کر جنرل ضیاء الحق کو بری فوج کا چیف آف سٹاف بنایا کہ اس کا تعلق ضلع جالندھر سے تھا اور اب مہاجر کے طور پر پشاور اور راولپنڈی دو جگہوں پر آباد ہونے کے بندوبست کر رہا تھا کہ بھٹو کو

خیال تھا کہ اس ارائیں قوم کے لوگ بھی فوج میں کم ہیں اور اس علاقے کے لوگ بھی جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ ضیاء الحق ہماری فوج میں جس طرح اپنی شخصیت کے بل بوتے پر ''گھسا'' ہوا تھا کہ اوپر والوں' برابر والوں اور اپنے ماتحتوں' ہر طبقہ میں میں ہر دلعزیز آدمی تھا۔ بہر حال بھٹو کو بڑا بھروسہ تھا اور اینگلو۔ امریکن بلاک نے بھی اُس وقت تک اپنی ''ناراضگی'' بھٹو پر ظاہر نہ کی تھی بلکہ وہ اپنے ''کارندوں'' سے بھٹو کو شہ دلا رہے تھے کہ وہ انتخابات کرا کے اور زیادہ سیٹیں حاصل کر کے ملک کا پکا ''حاکم'' بن جائے کہ اسمبلی میں اس کو دوتہائی اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ چنانچہ مکمل ''بھروسے'' کے ساتھ 1976ء میں بھٹو نے اعلان کر دیا کہ شروع 1977ء میں ملکی اور صوبائی انتخابات ہوں گے اور یہ اعلان قومی اسمبلی مین کیا اور ساتھ ایک ''ڈرامہ'' بھی کیا۔

یہ ''ڈرامہ'' کیا تھا کہ بھٹو کی ساری سیاست ''جھوٹ'' کے گرد گھومتی تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ لوگوں کو خوب بے وقوف بنا کر خود مزے کرے اور سب کچھ حاصل کر لو' اس نے ''تاشقند کے رازوں'' کی آڑ لے کر قوم کو خوب بے وقوف بنایا اور یہ عاجز واضح کر آیا ہے کہ تاشقند کے معاہدہ کی کوئی خفیہ ''شق'' نہ تھی اور ہم وہاں کچھ حاصل نہ کر سکتے تھے۔ صرف ایوب خان اور محمد موسیٰ نے جو قوم کے سامنے جھوٹ بولا کہ وہ جنگ ہماری ''فتح'' تھی۔ بھٹو اس ''جھوٹ'' کا فائدہ اٹھا رہا تھا اور قوم کو کہا کہ میدان جنگ کی فتح کے اثرات یا نتائج ہم کانفرنس کی میز پر نہ حاصل کر سکے۔ اب ایوب اور موسیٰ کس زبان سے کہتے کہ 65 ستمبر کی جنگ فتح نہ تھی۔ اس دفعہ اسمبلی میں بھٹو نے ایک بہت بڑا جھوٹ بولنے کا ڈرامہ رچایا کہ ایک تیل کی بوتل ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔ اور کہنے لگا ڈیرہ غازی خان کے علاقے میں تیل بہت بڑے پیمانے پر دریافت ہوا ہے۔ اس بوتل میں اسی علاقے کا تیل ہے۔ آج سے پاکستان تیل پیدا کرنے والے ممالک میں داخل ہو گیا ہے۔ اب پاکستان کو بہت ذمہ داری سے اس تیل کی دولت سے ثمرات حاصل کر کے زندگی کے دوسرے اور ہر شعبہ کو ترقی دینا ہوگی۔ اور اس دولت کو غیر ملکی لٹیروں سے بچانا ہو گا۔ اس کام کے لئے وہ اب سے ایک ''ماہرین'' کی کمیٹی بنا رہا ہے کہ ہم اس تیل کی دولت کا کیسے صحیح استعمال کریں۔ اور ایک کمیٹی بنائی۔ جس میں ایسے ''ماہرین'' قوم کی اس جھوٹ سے خوب ''برین واشنگ'' کرتے رہے اور تاثر یہ دینا مقصود تھا کہ صرف بھٹو جیسا حکمران ہی آئندہ صورت حال کو سنبھالا دے سکتا ہے۔ (توبہ میرے اللہ) کتنا بڑا جھوٹ تھا یہ جو لوگ آج بھی بھٹو کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے کہ عظیم سیاستدان تھا۔ یہ تھا وہ تھا' وہ اپنے گریبان میں نہیں جھانکتے کہ کیا جھوٹا آدمی قوم کا رہنما بن سکتا ہے؟ لیکن اصل بات یہ ہے کہ بھٹو کے ''پیروکار'' یا وفادار' جانشین' خود بہت ''جھوٹے'' ہیں اور ایسے لوگ ہماری قوم کے اندر ایک ''ناسور'' کی طرح ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں ہم ذلت سے دوچار ہیں۔ لوگ ذرا سوچ لیتے کہ بھٹو اور مجیب الرحمٰن کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر جو ان لوگوں نے ووٹ دیئے تو ہم کس ''ذلت سے دوچار ہوئے'' نتیجہ سقوط ڈھاکہ کی شکل میں ظاہر ہوا کہ نوے ہزار نہ سہی چلو ساٹھ ہزار فوجیوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ میرے لحاظ سے ایک ہزار یا ایک سو آدمی کو بھی ہتھیار نہ ڈالنے چاہئیں۔ میرے کچھ فوجی عزیز ان کو اعتراض ہے کہ میں نوے ہزار فوجیوں کے ہتھیار ڈالنے کی بات کیوں کرتا ہوں۔ جب مجھے معلوم ہے کہ مشرقی پاکستان کا دفاع ہم دولاکھ فوج کے ساتھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ تو گزارش ہے کہ پورے حالات کا یہ عاجز دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر چکا ہے۔ چلو نوے ہزار فوجی نہ سہی۔ ہمارے نوے ہزار افراد

عورتوں اور بچوں سمیت بھارت کے قیدی تو بنے۔ اور اس ذلت کی زیادہ ذمہ داری بھٹو اور مجیب الرحمٰن پر ہے۔

لیکن رب کی ذات پاک کے ہاں نہ دیر ہے نہ اندھیر ہے۔ مجیب الرحمٰن اپنوں کی گولی کا شکار ہو چکا تھا۔ ایک دن لاش بے گور و کفن رہی اور پھر خاموشی کے ساتھ اس کے جسد پر مٹی ڈال دی گئی۔ اب بھٹو کی ''باری'' تھی جہاں اس نے تخت حاصل کیا تھا۔ وہاں سے پرندوں کے اڑان کے ہزار گز کے فاصلہ پر اس کے لئے ''تختہ'' تیار ہو رہا تھا اور کال کوٹھڑی بھی جو کچھ بھٹو کے ساتھ ہوا یا اس کے بیٹوں کے ساتھ ہوا۔ خاص طور پر مرتضٰی بھٹو اس وقت پولیس کی گولی کا شکار ہوا جب اس کی بہن وزیراعظم تھی' ایسے عبرت ناک انجاموں کے بعد بھٹو خاندان' ان کے ہر فرد اور ہر ''پیروکار'' کو ساری زندگی توبہ و ندامت سے گزارنی چاہیئے کہ بھٹو جو بہت اونچی اڑان' اڑ رہا تھا' تو فطرت نے تمام بھٹو مخالف طاقتوں کو ایک غیر فطری اور منفی ''اتحاد'' میں اکٹھا کر دیا۔ جس کا مثبت پہلو یہ تھا کہ ''بھٹو جاوے ہی جاوے'' اس ''اتحاد'' میں ایک طرف دیو بندیوں کی جمعیت علمائے اسلام' بریلویوں کی جمعیت العلماء پاکستان' غیر مقلدوں کی جماعت اسلامی والے شامل تھے تو دوسری طرف بے دین اور علاقائی پارٹیوں کی بیگم نسیم ولی سمیت سندھ اور بلوچستان کی کئی قومیتوں والی پارٹیاں بھی شامل تھیں۔ ساتھ ہی مسلم لیگ کے پیر پگارا اور نصر اللہ کے حقے سمیت ''سولو فلائیٹ والے'' اصغر خان بھی تھے اور لطف کی بات یہ ہے کہ ''انتخابی اتحاد'' بھی تھا کہ ان لوگوں نے مل کر اور ایک پارٹی بن کر ہر سیٹ کے لئے اپنے ایک نمائندہ کو ٹکٹ جاری کیا۔ بھٹو بالکل دھاندلی پر تلا ہوا تھا کہ اپنی مخالفت والے جان محمد عباسی کی درخواست کو بھی رد کرا دیا۔ کہ خود بغیر ووٹوں کے بلا مقابلہ قرار دے دیا جائے۔ ووٹوں کے لئے پہلی انتخابی ریلی جنوری 1977ء کے دوسرے ہفتہ میں راولپنڈی میں بھٹو کی پیپلز پارٹی نے سرکاری مدد سے بندوبست کیا اس دن اتنی بارش ہوئی اور اتنی سرد ہوائیں چلیں کہ سب لوگ ٹھٹھر گئے۔ ظاہر ہے قدرت آثار ظاہر کر رہی تھی کہ بھٹو کے عبرتناک انجام کا وقت قریب آ گیا تھا۔ بھٹو نے دھاندلی ضرور کرائی اور محمد حیات ٹمن نے انتخابات کے ایسے نتائج نکالے جو اس کو حکم دیا گیا تھا کہ پیپلز پارٹی کو دو تہائی کامیابی دلانا ہے۔ اس لئے دھاندلی والی بات کھل کر سامنے آ گئی۔ فوج والوں نے جانباز فورس کو امن قائم رکھنے ذمہ داری دی تھی۔ اور اس عاجز نے راولپنڈی کہوٹہ کے اکثر سٹیشنوں کے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور باقی ساتھیوں سے بھی تمام ملک کے حالات معلوم کئے۔ بھٹو اگر دھاندلی نہ کرتا تو اس کو اکثریت تو حاصل ہو جاتی اور مخالفین کو یہ کچھ معلوم تھا وہ صرف ''خانہ پری'' کے لئے قومی اسمبلی کے انتخابات میں حاضری دے رہے تھے ۔ اگر دھاندلی نہ بھی ہوتی اور بھٹو معمولی اکثریت سے جیت جاتا تو پھر بھی ''مخالفین'' بھٹو کے خلاف تحریک چلاتے۔ اب دھاندلی کر کے بھٹو نے ان کو تحریک چلانے کا ''بہانہ'' مہیا کر دیا اور اتحاد کا بھان متی کا کنبہ ''تحریک'' میں کود گیا اور صوبائی انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کر دیا۔ نتیجہ صوبائی انتخابات والے دن خود بخود سامنے آ گیا۔ ہر پولنگ سٹیشن پر الو بول رہے تھے۔ خود پیپلز پارٹی کے ووٹر بھی بہت کم تعداد میں گھر سے نکلے کہ جب ''مقابلہ'' ہی نہیں تو وہ پولنگ سٹیشن پر کیوں جائیں؟۔ اور پیپلز پارٹی کے کارکن دل چھوڑ بیٹھے۔ صوبائی اسمبلیوں کے جھوٹے نتائج نکالے خود حکومت نے کچھ پرچیاں اپنے آدمیوں کے باکسوں میں ڈالیں اور کچھ مخالفین کے باکسوں میں اور جھوٹے نتائج سے جگ ہنسائی ہوئی تو پیپلز پارٹی والے خود ''شرمسار'' ہو رہے تھے۔

اب تحریک اس زور سے چلی کہ بھٹو کے ''آقاؤں'' نے بھٹو کو ہٹانے کے لئے اتنی دولت خرچ کی کہ لوگوں کے لئے ''کاروبار'' بن گیا مخالف پارٹیوں والے خود حیران تھے کہ ان میں سے کافی لوگوں کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ اور تحریک پھر بھی چل رہی تھی۔ مذاکرات ہو رہے تھے۔ لیکن بھٹو پارٹی کے ''رہنما'' اور ''کارکن'' دل چھوڑ چکے تھے۔

تو بھٹو کے ''آقاؤں'' نے بھٹو کو وہ خط جاری کر دیا جس کا ذکر یہ عاجز اپنے پہلے مضامین میں کر چکا ہے۔ کہ بھٹو اتنا دل چھوڑ چکا تھا' کہ وہ خط لے کر بھٹو راولپنڈی کی سڑکوں پر نکل آیا کہ یہ امریکن اس کے ''درپے '' ہیں اور اس کو ہٹانا چاہتے ہیں۔ بھٹو کی اس حرکت نے الٹا بھٹو کا نقصان کیا کہ ابن الوقت لوگ اسکا ساتھ چھوڑ گئے۔ لاہور میں بہت گڑ بڑ تھی۔ پولیس حالات کو کنٹرول نہیں کر رہی تھی۔ فوج کو حالات معمول پر لانے کے لئے ذمہ داری دی گئی۔ تین بریگیڈئروں نے لوگوں کے خلاف گولی چلانے سے ''انکار'' کر دیا۔ ان میں ایک بریگیڈئر قادیانی تھا۔ ظاہر ہے اس کو کسی ''چھپے ہاتھوں'' نے استعمال کیا ہوگا۔ لیکن ایک بریگیڈئر بڑے کردار والا اور اصول پسند تھا۔ اب اس کے لئے بھی نہتوں پر گولی چلانے کا عمل اس کو مشکل نظر آیا۔ اس نے صرف احتجاج کیا کہ فوج کو سول کے خلاف استعمال نہ کیا جائے۔ تیسرے بریگیڈئر کمانڈر کی یونٹوں پر پہلے دو بریگیڈئروں کے رویوں کے اثرات ہوئے تو تیسرے نے بھی کچھ تحفظات دکھائے۔ اب اس کو بغاوت ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا۔ تینوں بریگیڈئروں کا آپس میں کوئی ایسا رابطہ نہ تھا کہ اس کو ''سازش'' قرار دیا جائے۔ بہر حال ضیاء الحق کو عملی طور پر ثبوت مل گئے کہ بھٹو کے طور طریقوں کو فوج میں پسند نہیں کیا جاتا اور ضیاء الحق کے تعلقات ان ''چھپے ہاتھوں'' کے ساتھ بھی تھے جو بھٹو کو سبق سکھلانا چاہتے تھے۔ جنرل محمد شریف اپنی نئی ذمہ داری میں پہنچ کر کچھ شش و پنج میں تھا کہ اس کا ضیاء الحق پر کوئی کنٹرول نہ تھا۔ جنرل ٹکا خان ''ریموٹ کنٹرول'' میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ ضیاء الحق کے کیا ارادے ہیں؟۔ بھٹو سے ایک اور غلطی یہ ہوئی کہ جنرل ٹکا خان کو ذمہ داری دینے یا تینوں جنرلوں کو اکٹھا کر کے کوئی ذمہ داری دینے کی بجائے وہ خود حالات پر سیدھے طور پر ضیاء الحق سے بات کر لیتا تھا اور اس نے ضیاء الحق کو اجازت دی کہ وہ لوگ دونوں طرف کے رہنماؤں کے گھروں کی ''دیکھ بھال'' کر لے' کہ حکومت والوں کی شاید حفاظت فوج کو کرنا پڑے اور سب مخالفین کو شاید گرفتار کرنا پڑے۔ لاہور' کراچی اور کھاریاں کے کور کمانڈر جنرل ارباب جہاں زیب' جنرل محمد اقبال' اور جنرل غلام حسن ضیاء الحق کے پرانے دوست تھے۔ پنڈی کے کور کمانڈر جنرل فیض علی چشتی کے ساتھ ضیاء الحق نے یارانہ گانٹھ کر سارا کام اس اور اس کے چیف آف سٹاف بریگیڈئر اسلم شاہ (بعد میں جنرل) سے کرایا۔ راولپنڈی میں فوج تھوڑی کم تھی تو ضیاء الحق نے کھاریاں سے جنرل غلام حسن کو کہا کہ ایک بڑے بھروسے والے کرنل کی پلٹن کو بھی پنڈی بلا لیا۔ ضیاء الحق نے جی ایچ کیو کے اہم آدمی میجر جنرل عبداللہ ملک جو چیف آف دی جنرل سٹاف تھا کو تمام معاملات سے ''دور'' رکھا کہ اس پر بھروسہ نہ ہو سکتا تھا اور نہ جی ایچ کیو کے خفیہ ادارہ اور نہ آئی ایس آئی کو اپنی تجویز کی بھنک لگنے دی۔ بھٹو کو کچھ ''بھنک'' لگ تو گئی لیکن وہ کوئی تجویز نہ بنا سکا۔ صرف اتنا سنتے ہیں کہ غلام اسحٰق نے جنرل ارباب کو بتایا کہ بھٹو فوجی رہنماؤں میں کچھ تبدیلی کرنے والا ہے۔

بہر حال ''سخت ہیں فطرت کی تقدیریں'' اور وہ کچھ ہوا جو رب کی مرضی تھی نہایت خاموشی سے فوجیوں نے بھٹو، اُس کی کابینہ کے ممبروں اور مخالفین کو ''حفاظتی حراست'' میں لے کر حکومت خود سنبھال لی اور جولائی 1977ء میں جو مارشل لاء لگا دیا قوم حق باتوں سے آگاہ ہے۔ حالات کو مزید پیش رفت دینے سے پہلے اب ضیاء الحق کا وہ تعارف قوم کے سامنے پیش کرنا بہت ضروری ہے۔ جس کا یہ عاجز چشم دید گواہ ہے۔

ضیاء الحق ایک بہت زیادہ پیچیدہ شخصیت کا مالک تھا۔ اور اس کی وفات کے بعد اتنے سال گزر جانے کے باوجود اور اس کے بارے اتنا کچھ لکھا جانے کے باوجود اس کے کسی عمل یا اس کے کردار کے کسی پہلو پر حتمی رائے نہیں دی جاسکتی۔ میں نے اپنی اتنی فوجی نوکری میں ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا کہ ضیاء الحق کی طرح اوپر والوں کا اس طرح ''منظور نظر'' ہو اور نیچے والوں کے ساتھ ایسی وفاداری دکھائے کہ وہ اس پر جان دینے کو تیار ہو جائیں اور پھر حیرانگی کی بات یہ ہے کہ برابر والوں کے ساتھ اتنے اچھے تعلقات ہوتے تھے۔ جہاں نہ کسی رقابت یا حسد کی بو آتی ہو اور وہ سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ میں حیران تھا کہ ہماری ملاقاتیں بہت کم ہوئی تھیں۔ پھر بھی وہ میری اتنی زیادہ عزت کرتا تھا کہ مارشل لاء لگانے سے پہلے اور جنرل کے عہدہ پر ترقی کرنے کے باوجود میں جہاں کھڑا ہوتا تھا' وہ چل کر میرے پاس آتا تھا اور سلام و دعا کرنے میں ہمیشہ وہ پہل کاری مجھ سے چھین لیتا تھا۔ لیکن مارشل لگانے کے بعد سوائے ایک مسودہ مجھ سے جنرل غلام حسن کے ذریعہ سے حاصل کرنے کے بعد وہ مجھ سے اتنا دور رہا کہ میرے اکثر خطوط کا اس نے کبھی جواب تک نہ دیا اور نہ میرے ساتھ ہاتھ ملانے کی ''رسم'' پوری کی بلکہ مجھے دیکھ کر اپنا رخ تبدیل کر دیتا تھا۔ اس عاجز نے اس کو لکھا بہت کچھ لیکن مجھے ایک آدھ بات کے علاوہ اس کے ردعملوں سے ہرگز آگاہی نہیں تو میں اس کے حکومت کے ''براجمانی'' کے زمانے کی اس کی سوچ اور ارادوں سے ہرگز ''باخبر'' نہیں۔ اس لئے اس سلسلہ میں میرے ''اندازے'' غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ ضیاء الحق کو اس عاجز نے پہلی دفعہ نومبر 1952ء میں دیکھا۔ میں ISPR میں کیپٹن تھا اور ابھی مکان نہ ملا تھا۔ راولپنڈی کی بنک روڈ پر واقع گرانڈ ہوٹل میں رہتا تھا اور سورج غروب ہونے سے پہلے صدر بازار کا چکر لگا لیتا تھا یا کشمیر روڈ اور بنک روڈ کے چوک پر اپنے پرانے دوست اور چوہان سپورٹ کے مالک کی دکان پر آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ راولپنڈی صدر میں اس زمانے میں پرائیویٹ کاروں کی تعداد درجن بھر سے کم ہوگی کہ کاروں کو دیکھ کر ہم مالک کو پہچان جاتے تھے۔ زیادہ لوگ پیدل چلتے تھے۔ یا سائیکلوں پر ہوتے تھے۔ فوجی افسروں کو ہم شکل یا چال سے پہچان لیتے تھے۔ اور میرے ساتھ میرا پرانا دوست کیپٹن (بعد میں میجر اور اب مرحوم) محبوب نیازی بیٹھا تھا کہ کشمیر روڈ سے دو افسران گزر رہے تھے جن میں سے ایک کو میں جانتا تھا جو توپخانہ کا میجر پی بی گیلانی تھا اور دوسرا جو ''بچہ گاڑی'' میں اپنے ایک بچہ کو دھکیل رہا تھا۔ اس کو میں نہ جانتا تھا۔ انگریز افسران میں بہت کم افسر بچہ گاڑی کو دھکیلتے تھے۔ یہ کام ان کے بیرے اور نوکر کرتے تھے۔ لیکن کوئی ایک آدھ افسر یا سارجنٹ گورے یا ان کی لیڈیز ایسا کام کر لیتی تھیں۔ میں نے محبوب نیازی کو کہا کہ یہ گاڑی دھکیلنے والا آدمی بھی کوئی فوجی افسر معلوم ہوتا ہے۔ اور پکا ''گورا'' نظر آتا ہے۔ کیپٹن نیازی نے کہا کہ یہ گائیڈ رسالے کا کیپٹن ضیاء الحق ہے جو اب شاید میجر بن گیا ہوگا۔ اور یہ ''گورا'' یا ''ٹامی'' نہیں ہے۔ پانچ وقت کا نمازی بھی ہے۔ ''تو میرے منہ سے نکل گیا'' کہ بڑا ''بہروپیا'' ہے۔ ''اور قارئین

میں ان الفاظ پر قائم ہوں۔ مجھے ساری تاریخ یا سب جاننے والوں میں ضیاء الحق سے بڑھ کر کوئی کامیاب ''بہروپیا'' نظر نہیں آیا۔''

اس واقعہ کو ہفتہ دس دن ہوئے ہوں گے کہ یہ عاجز ISPR میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ گائیڈ رسالہ کے کرنل پیر عبداللہ شاہ انہی میجر ضیاء الحق کی معیت میں میرے دفتر آ گئے۔ کرنل صاحب کوہاٹ کے رہنے والے تھے اور میرے اور میرے خاندان کے پرانے دوست تھے۔ چند ماہ پہلے ہم نے اکٹھا ''لا کورس'' بھی کیا تھا۔ دفتر میں داخل ہوتے پختونوں کے گرم جوشی والے لہجے میں کہنے لگے۔ ''یارا ہم جی ایچ کیو آئے تھے۔ اکثر خودغرض لوگوں سے واسطہ پڑا۔ یہ میرے ایجوٹنٹ میجر ضیاء الحق ہیں۔ میں نے کہا چلو امیر افضل کو مل لیتے ہیں۔ ادھر چائے بھی پئیں گے۔ کچھ فوٹو بھی لیں گے اور گپ شپ بھی ہو جائے گی۔'' پھر ضیاء الحق کو مخاطب کر کے کہا ''کہ امیر افضل کا بڑا بھائی رسالدار فیروز خان ہماری یونٹ میں ہے۔ یہ بڑے مخلص اور خاندانی لوگ ہیں۔ ان کے ساتھ ہماری پچھلی دو پشتوں سے دوستی ہے۔'' ضیاء الحق عہدہ کے لحاظ سے مجھ سے سینئر تھا۔ لیکن عمر میں کافی چھوٹا تھا۔ اس ملاقات کے بعد ضیاء الحق نے ہم دونوں بھائیوں کی اپنے سگے بڑے بھائیوں والی عزت کی۔ اور راولپنڈی چھاؤنی میں اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ کہ 54-1953ء میں ضیاء الحق کی تبدیلی خیبر رائفلز میں ہوگئی۔ خیبر رائفلز کی اس زمانے میں خاص کر اور آج کل بھی بڑی اہمیت ہے کہ غیر ملکی معزز مہمان اکثر درہ خیبر جاتے ہیں تو ان کی میزبانی اور حفاظت کا کام خیبر رائفلز کو کرنا ہوتا ہے۔ عام طور پر رسالہ جیسے ٹیکنیکل آرمز کے افسروں کی سکاؤٹس میں تبدیلی نہیں کی جاتی لیکن ضیاء الحق کے پہلے کمانڈنگ افسر کرنل عباس درانی کو اس کے خاندانی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے خاص طور پر خیبر رائفلز کی کمانڈ دی گئی تھی۔ اور اس نے اپنے کمانڈر بریگیڈئر بختیار رانا (بعد میں جنرل) اور کئی بڑے افسروں کو خاص گزارش کر کے ضیاء الحق کی تبدیلی خیبر رائفلز میں کرائی کہ پرانے انگریزی رسم و رواج سے ہٹ کر پاکستانی اور اسلامی میزبانی کو بھی اپنی روایات اور رواجوں کا حصہ بنانا تھا۔ ضیاء الحق نے وہاں بڑا کام کیا اور یہ کہ ہم لوگ بھی اکثر غیر ملکی مہمانوں کے دوروں کے وقت وہاں جاتے تھے تو ضیاء الحق نے ہمیشہ اس عاجز کی وہی ''بڑے بھائی'' والی عزت قائم رکھی اور معزز مہمان کا درجہ بھی ہمیں دیا جاتا رہا۔ اس نوکری نے ضیاء الحق کے تجربات میں بہت اضافہ کیا۔ اور ہمارے ساتھ بھی وہ ہمیشہ مشورہ کرتا تھا کہ پاکستان کے وقار کو بلند کرنے کیلئے ہمیں کتنی محنت کرنا چاہیئے اور کتنا مخلص ہونے کی ضرورت ہے۔ قارئین! یہ عاجز یہ تمام باتیں اس لئے لکھ رہا ہے کہ آپ لوگ میری تحریروں سے یحییٰ خان اور بھٹو جیسے ملکی سربراہوں کی زندگی کے طور طریقوں اور ضیاء الحق کی زندگی کے طور طریقوں کا موازنہ کر سکیں۔

خیبر رائفلز میں نوکری کے دوران ضیاء الحق نے سٹاف کالج کا امتحان پاس کر لیا اور 1955ء میں سٹاف کالج کوئٹہ کورس کر کے 1956ء میں راولپنڈی میں تیسرے بکتر بند بریگیڈ کے بریگیڈ میجر کی ڈیوٹی سنبھال لی۔ پاکستانی فوج کے پاس اس زمانے یہ اکیلا بکتر بند بریگیڈ تھا اور رسالوں سے پہلے نمبر والے میجر کو اس تقرری پر متعین کیا جاتا تھا اور ضیاء الحق کی اہمیت تو بہت زیادہ ہوگئی کہ اس کے بریگیڈ کمانڈر عابد بلگرامی (بعد میں جنرل) کا تعلق پیدل دستوں کے ساتھ تھا۔ اس لئے بکتر بند کے تدبیراتی یا ٹیکنیکل کاموں کا کرتا دھرتا ضیاء الحق ہی تھا۔ راقم

اس وقت تک ISPR میں نوکری کر رہا تھا اور امریکہ سے ایک ٹیم والے آ کر پاکستان کی تینوں افواج پر ایک فلم بنا رہے تھے۔ جس کا ڈرافٹ ''سکرپٹ'' راقم نے لکھا تھا۔ جس کو امریکہ والوں نے پسند کر لیا تھا اور فلم پر کام شروع کر دیا۔ لیکن وہ کہتے تھے کہ اس سکرپٹ کے جنگی اور تدبیراتی پہلو کو کسی سینئر یا ماہر فوجی افسر سے لکھوا جائے۔ ہمارا ڈائریکٹر کمانڈر مقبول حسین یہ مسودہ ہمارے ملٹری آپریشن کے ڈائریکٹر بریگیڈیئر سلطان محمد کے پاس لے گیا۔ جس نے اس پر دستخط کر دیئے کہ تدبیراتی لحاظ سے وہ مسودہ صحیح ہے لیکن امریکی فلم کے ڈائریکٹر کو تسلی نہ ہو رہی تھی۔ تو میں نے اس کو کہا کہ اب تو تم امریکن کا ہمیں مدد دینے والا ادارہ بھی ہمارے جی ایچ کیو میں کام کر رہا ہے۔ وہاں میجر سمتھ ہے۔ جس نے ہمارے سٹاف کالج کوئٹہ میں کورس کیا ہے۔ آپ یہ مسودہ اس کو دکھائیں یا اس سے کسی افسر کا نام پوچھ لیں۔ تو ہم یہ مسودہ اس سے منظور کرا لیں گے۔ یہ سن کر وہ خوش ہو گیا۔ اور میجر سمتھ نے بھی مسودہ کو صحیح قرار دیا اور دو افسران کے نام لئے کہ ان میں سے کسی ایک کو دکھا دو۔ ایک ضیاء الحق کا نام تھا اور دوسرا نام میجر اعجاز عظیم (بعد میں جنرل اور امریکہ میں ہمارے سفیر) کا تھا۔ میں دونوں کو جانتا تھا۔ ضیاء الحق کا دفتر ذرا نزدیک تھا تو مسودہ لے کر میں دوسرے دن ان کے پاس چلا گیا۔ اور پوری کہانی سنائی۔ ضیاء الحق کہنے لگا ''امیر افضل جو چیز بریگیڈیئر سلطان محمد اور آپ کی منظور شدہ ہے' وہ اس میں کیا غلطی نکال سکتا ہے یا اضافہ کر سکتا ہے۔ مسودہ آگے کرو میں اس پر منظوری کے دستخط کر دیتا ہوں۔'' راقم نے گزارش کی کہ ''لیپا پوتی'' کیلئے ایک دن یہ مسودہ اپنے پاس رکھ لیں۔ کل کی تاریخ سے دستخط کر دینا۔ ضیاء الحق کہنے لگا۔ ''تم کل دوبارہ آنے کی تکلیف کیوں کرو گے۔ میں دستخط ابھی کر دیتا ہوں۔ اور تاریخ نہیں ڈالتا۔ تم کل کی تاریخ' ڈال کر مسودہ اپنے بڑوں کو کل دے دینا۔'' قارئین! یہ عام زاویوں سے چھوٹی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن میرے لئے ضیاء الحق کی شخصیت روز بروز بلند ہو رہی تھی۔ اور ''بہروپیا'' والی بات بھی ذہن میں رکھنا کہ امریکہ والوں کے ساتھ بھی کب کے تعلقات تھے۔ اور قارئین ہم سب ''بہروپیے'' اور ''ایکٹر'' ہیں۔ لیکن اس کے ''درجات'' ہوتے ہیں۔ کچھ Values یا قیمتیں یا ''اثاثے'' ہوتے ہیں۔ کس کی کتنی ''قیمت'' ہے کون کتنے میں ''بک'' جائے گا؟ پس توبہ کریں۔ اللہ تعالیٰ رہنمائی کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی سورہ الشمس کے مطابق ''فجور'' اور ''تقویٰ'' دونوں ہمیں القا فرمائے۔ لیکن دونوں کے ''بین بین'' بھی بہت کچھ ہے۔

ضیاء الحق اور اس عاجز نے نہ کبھی اکٹھی ایک ادارہ میں نوکری کی نہ ایک دوسرے کی ہمسائیگی میں کسی جگہ اکٹھے رہے۔ اس عاجز نے ضیاء الحق کو اکثر دور سے دیکھا لیکن اپنے بڑے بھائی سے ان کی تعریفیں سنتا رہا تھا اور ضیاء الحق کس طرح ہر مشکل وقت میں اپنے ماتحتوں کی جائز مدد کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں کئی مضامین لکھے جا سکتے ہیں کہ ضیاء الحق بعد میں گائیڈ رسالہ میں کھاریاں میں سکوارڈرن کمانڈر تھے میرا بڑا بھائی ان کا سینئر سردار تھا۔ اور جو عزت ضیاء الحق نے میرے بڑے بھائی کو دی وہ اب تک اس کے گن گاتے ہیں۔ 1960-62ء میں ضیاء الحق جی ایچ کیو میں ملٹری آپریشن ڈائریکٹوریٹ سے آ کر وابستہ ہو گئے اور یہ عاجز 1962ء میں اپنی پلٹن کے ساتھ ایوانِ صدر کی ڈیوٹی کیلئے آ گیا۔ تو انہی دنوں سنا کہ ضیاء الحق کو امریکہ سٹاف کالج فورٹ لیون ورتھ کیلئے کورس کیلئے چن لیا گیا ہے۔ اور ایسا کچھ بھی خاص چنیدہ افسران کیلئے ہوتا تھا۔ لیکن انہی دنوں ضیاء الحق کا کرنیلی کا

نمبر بھی آ گیا۔ تو ضیاء الحق اگر کرنیلی کیلئے رجمنٹ کی کمانڈ پر جانا چاہتا تو پھر امریکہ کورس پر نہ جا سکتا تھا۔ اتفاقاً میں سرکاری جیپ پر ایوانِ صدر جا رہا تھا کہ ضیاء الحق جی ایچ کیو سے باہر نکل کر کسی ٹرانسپورٹ کی تلاش میں کھڑا مجھے نظر آ گیا۔ میں نے جیپ کھڑی کر دی اور ملاقات کے بعد گزارش کی کہ کونسی مبارک دوں۔ کرنیلی کی یا فورٹ لیون ورتھ کی'' تو ضیاء الحق نے کہا کہ ''امیر افضل' کرنیلی نے جب ملنا ہے تو مل جائے گی لیکن فورٹ لیون ورتھ جانے کے روز روز مواقع میسر نہیں ہوتے۔'' اب قارئین خود اندازہ لگا لیں کہ ضیاء الحق کی دوررس نگاہیں کرنیلی کو کوئی وقعت نہ دے رہی تھیں۔ اور فورٹ لیون ورتھ میں تقریباً ایک سال رہ کر امریکہ والوں کے ساتھ کیا ''رابطے'' ہوئے ہوں گے کہ ان کی نگاہ میں میجر ضیاء الحق کب سے ایک اہم آدمی تھا۔ اس کے بعد میری ضیاء الحق کے ساتھ کبھی دوبدو ملاقات نہ ہوئی سوائے 1976ء کی ایک ملاقات کے جو آخری دوبدو ملاقات تھی۔ جب ضیاء الحق بری فوج کے سربراہ بن چکے تھے اور ISPR کی ایک افطار پارٹی میں ملاقات ہوئی۔ لوگ ضیاء الحق پر ٹوٹ رہے تھے۔ عزیزم جنرل ضامن نقوی اب مرحوم اور میں الگ کھڑے رہے کہ ضیاء الحق نے خُود ہماری طرف توجہ دی تو ملیں گے ورنہ خود کو اس ''جمگھٹ'' کا حصّہ نہ بنائیں گے جو ضیاء الحق کو گھیرے میں لئے ہوئے تھا۔ ضیاء الحق کو ذرا موقع ملا تو وہ جمگھٹ کو ''چیرتا'' ہوا۔ ہمارے پاس پہنچ گیا۔ دونوں سے خوب گلے لگ کر ملا۔ اور خیر خیریت کی کافی باتیں ہوئیں خاص کر میرے بڑے بھائی کے بارے تفصیل سے خیریت پوچھی۔ 1977ء کے مارشل لاء کے فوراً بعد ضیاء الحق نے میرے پلٹن والے لیفٹیننٹ جنرل غلام حسن کو میرے پاس بھیج کر مجھ سے اس مسودہ کی کاپی منگوائی جو اس عاجز نے 5 اکتوبر 1970ء کو یحییٰ خان کو دی تھی اور زبانی پیغام ملا کر وہ جلد میرے ساتھ ملاقات کرے گا۔ اب ملاقات تو بہت دور کی بات ہے۔ اس عاجز نے ضیاء الحق کو متعدد خطوط لکھے۔ جن کا ذکر آگے آتا رہے گا۔ ان میں سے ایک آدھ خط ضیاء الحق کے سٹاف نے ''اکنالج'' کیا۔ ورنہ اکثر خطوط پر کوئی ردعمل نہ ہوا۔ کسی خط میں البتہ اس عاجز نے ضیاء الحق سے ملاقات کی درخواست نہ کی اور نہ کوئی خط کسی ذاتی غرض سے لکھا اور آگے تفصیل آ رہی ہے لیکن ضیاء الحق نے مجھے ''ہیلو ہیلو'' کرنا کیوں بند کر دیا۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں میرا اسلام قرآن پاک کی سورۃ البقرہ کی آیت مبارکہ 208 کے مطابق تھا کہ پورے طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ ضیاء الحق کا اسلام ''مصلحتی'' تھا۔ اس کو ضرور خیال ہو گا کہ یہ عاجز اس کو بھی ایسے سخت الفاظ نہ کہہ دے جو ملک کے دوسرے یعنی پہلے سربراہوں کو کہتا رہا۔ میرے کچھ رفقا کا خیال ہے کہ ضیاء الحق کو اس عاجز کے ''قلندرانہ رویہ'' کی آگاہی تھی کہ ملک کے پہلے سربراہوں کیلئے میرے منہ سے جو الفاظ نکل گئے۔ ایسا کچھ ہو گیا۔ بہرحال مجھے ایسی کوئی غلط فہمی نہ تھی کہ ضیاء الحق مجھ سے ''گھبراتا'' تھا۔ میں چھوٹا آدمی تھا۔

میری ضیاء الحق کے سامنے کوئی ''وقعت'' نہ تھی۔ اگر وہ مجھے ختم کرنا چاہتا تو وہ میرے نام و نشان کو مٹا دیتا۔ لیکن پرانے تعلقات کی وجہ سے ضیاء الحق نے رکھ رکھاؤ قائم رکھا کہ ضیاء الحق کے ساتھ جو ایک دو افطاریوں میں اکٹھا ہونے کا اتفاق ہوا۔ تو وہ مجھ سے دور رہتا تھا۔ وہ جہاں مجھے کھڑا دیکھتا تھا تو رخ بھی تبدیل کر دیتا کہ ایک دفعہ جنرل محمد اقبال اور میجر ضمیر جعفری میرے پاس کھڑے تھے تو میں نے ضمیر جعفری کو کہا کہ اگر ضیاء الحق کو ملنا چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ' ضیاء الحق ادھر نہ آئے گا۔ جنرل اقبال کہنے لگا کہ اس کا رخ ہماری طرف ہے۔

ادھر ضرور آئے گا لیکن جنرل اقبال بھی حیران ہو گیا کہ جیسے جنرل ضیاء الحق کی نظر مجھ پر پڑی اس نے رخ ہی تبدیل کر دیا۔

بھٹو کو پھانسی لگانا آسان نہ تھا یہ کام صرف ضیاء الحق جیسا دل گردے والا ہی کر سکتا تھا

تو یہ عاجز ضیاء الحق کی حکومت کے معاملات سے بہت دور تھا مجھے اندرونی طور پر حالات کے بارے کچھ خبر نہیں ہے میرے پرانے پلٹن والے جنرل محمد صفدر سابق گورنر پنجاب ضیاء الحق کے ''خاص الخاص'' آدمی تھے۔1978ء میں ایک دفعہ مجھے ملنے آئے اور لمبی دیر تک بہت باتیں کیں اور یہ نہ ظاہر ہونے دیا کہ ان کو ضیاء الحق نے میرے پاس ''بھیجا'' ہے۔ وہ عام باتیں کر کے بھٹو کے بارے میری رائے معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اس کا کیا ''حشر'' ہونا چاہئے تو میں نے اس کا فوراً جواب دیا'' کہ ضیاء الحق بھٹو کو ضرور پھانسی چڑھائے ورنہ خود پھانسی چڑھنے کو تیار رہے'' جنرل محمد صفدر جو نوجوان افسر کے طور پر مجھ سے اکثر ''رہنمائی'' لیتے تھے۔ تو میرے مختصر جوابات سے جو ''حظ'' اٹھاتے تھے انہوں نے میرے اس جواب سے اسی قسم کا ''حظ'' اٹھایا اور مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا میرے پاس آنے میں بڑا مقصد یہی تھا لیکن وہ مجھے یہ بتانے پر تیار نہ تھے کہ ان کو ضیاء الحق نے بھیجا ہے۔ مجھے بھٹو کے پھانسی چڑھنے کے بارے کوئی شک نہ تھا کہ گکھڑ بابا نے بھٹو اور مجیب دونوں کے لئے جو پیشگوئیاں کی تھیں یہ فطرت کی بھی ''ضرورتیں'' تھیں۔ مجیب الرحمٰن والی بات پوری ہو گئی تھی۔ اب بھٹو کی ''پھانسی'' کی باری تھی بھٹو کو پھانسی لگانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ایسا کام صرف ضیاء الحق جیسے دل گردے والا آدمی کر سکتا تھا اور یہ امریکنوں کی بھی ''ضرورت'' تھی۔ امریکہ والے بھٹو کے ساتھ اس حد تک کیوں جانا چاہتے تھے اور اس کو عبرتناک انجام کی دھمکی تک کیوں دی یہ معاملات سمجھنے بہت مشکل ہیں۔ ایوب خان کے ساتھ اس حد تک کیوں نہ گئے۔ اس کو صرف ہٹانا ''مقصود'' تھا کہ امریکن جانتے تھے کہ ایک دفعہ ایوب خان کرسی سے ہٹ گیا تو اس کی ''وقعت'' ختم ہو جائے گی۔ البتہ ایوب خان کو ان لوگوں نے بہت ''مضبوطی'' دلا دی تھی۔ اس لئے اس کو ہٹانے میں ان کو کافی وقت ''صرف'' کرنا پڑا۔ یحییٰ خان کی کوئی وقعت نہ تھی۔ اس کو تو لایا ہی پاکستان کو دولخت کرنے کیلئے گیا تھا۔ اور ''زمین'' تیار تھی اور امریکنوں کو معلوم تھا کہ یہ لات مارنے کے بعد یحییٰ خان ''توازن'' کھو دے گا اور دونوں شانے چت گر جائے گا کہ امریکہ والوں کا ایک ''منظورِ نظر'' مجیب الرحمٰن مشرقی پاکستان پر ''بنگلہ بندھو'' کے طور پر ''براجمان'' ہو گیا اور دوسرا ذوالفقار بھٹو ''قائدِ عوام'' کے طور پر مغربی پاکستان پر لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھٹو نے امریکہ والوں کے ساتھ کوئی خاص ''دھوکہ'' کیا کہ بھٹو مکمل طور پر ان کے عمارت گروں کی ''تعمیر'' تھا۔ انہوں نے مکمل طور پر بھٹو کو اپنے مقاصد کے لئے ''تراشا'' تھا لیکن بھٹو نے ان کو نہ صرف ''مایوس'' کیا بلکہ وہ بھٹو سے سخت ناراض ہوئے کہ اس کے ''درپے'' ہو گئے۔

اب اس سلسلہ میں ضیاء الحق نے بھی نیوکلیئر معاملہ میں امریکہ والوں کے ساتھ ''وفاداری'' نہ کی۔ ضیاء الحق بھی نیوکلیئر معاملات کو آگے نہ بڑھانے کے ''وعدہ'' پر طاقت میں آیا تھا اور ایک دفعہ نیوکلیئر معاملات کو ''ٹھپ'' کر دیا گیا تھا۔ ضیاء الحق نے اس سلسلہ میں کیا پالیسی رکھی یا امریکنوں کو کیسے ''اندھیرے'' میں رکھا کہ

1984ء تک پاکستان کو نیوکلیئر بنا دیا۔ جو بات امریکہ والوں کو 1985ء یا 1986ء میں معلوم ہوئی لیکن ابھی اس وقت تک روس کو افغانستان میں مکمل شکست نہ ہوئی تھی۔ یا جو بات بھی تھی امریکہ والوں نے ضیاء الحق کے ساتھ کھلم کھلا وہ کچھ نہ کیا جو بھٹو کے ساتھ کیا۔ بھٹو کے ساتھ جو کچھ ہوا یا کیا گیا اول تو یہ فطرت کی بھی ''ضرورت'' تھی کہ اس نے زندگی کو بالکل ''فراڈ'' سمجھ لیا تھا اور اس کی کامیابیوں نے اس میں غرور بھی پیدا کر دیا تھا۔ اس لئے بھٹو کے ساتھ فطرت بھی عبرتناک انجام یا رویہ کو اپنی ''ضرورت'' سمجھتی تھی۔ پھانسی تو ایک وقتی سزا تھی لیکن بھٹو جس طرح ایک سال کے قریب کال کوٹھڑی میں رہا یہ سب بڑی عبرتناک نشانیاں ہیں لیکن افسوس ہماری قوم ایسی باتوں کے جائزے نہیں لیتی اور اسباق نہیں سیکھتی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بھٹو آخری وقت تک اس غلط فہمی کا بھی شکار تھا کہ اس کو پھانسی نہ لگایا جائے گا۔ اس کے ساتھ کسی خاص مقصد کے تحت ''ڈرامے'' کئے جا رہے ہیں کہ اس کی شخصیت کو توڑنا پھوڑنا مقصود ہوگا۔

بھٹو چونکہ دوسروں کے ساتھ ان کو ''توڑنے پھوڑنے'' کیلئے ہر قسم کے ''ڈرامے'' کرتا تھا تو اس نے سمجھا کہ یہ بھی ایکٹنگ ہو رہی ہے۔ اب امریکہ والے کئی وجوہات سے بھٹو کو پھانسی چڑھانا چاہتے تھے کہ اپنے اس قسم کے ''پروردوں'' کو سبق سکھلانا چاہتے تھے۔ دوم بھٹو میں کچھ ''کچاپن'' بھی تھا جیسا اس کی بیٹی بے نظیر کیلئے یہ عاجز ''کچی بچی'' کے الفاظ استعمال کرتا ہے تو بھٹو کسی وقت حکومت سے ہٹنے کے بعد وہ ساری کہانی بیان کر سکتا تھا کہ امریکنوں نے کیسے اس کی ''تعمیر'' کی۔ علاوہ ازیں بھٹو کے ''قماش'' جیسے لوگوں کیلئے بھٹو کو ''مظلوم'' بنا کر کچھ ''بقائے دوام'' بھی دینا مقصود تھا کہ کچھ لوگ اب اس کو ''شہید بھٹو'' کہتے ہیں کہ بھٹو نے جو پاکستان کی جڑوں کو اکھیڑا تو اس کو پوری طور پر ''ننگا'' ہونے سے بھی بچانا ضروری تھا کہ زندہ بھٹو شاید کسی دن امریکنوں کو بھی ''ننگا'' کر دیتا۔

اس عاجز نے ضیاء الحق کو بے شمار خطوط لکھے اور جب بھٹو پر یہ قتل کا مقدمہ چل رہا تھا تو اس عاجز نے ضیاء الحق کو لکھا تھا کہ یہ بڑا کمزور مقدمہ ہے اور رومن قانون کے ''ماہرین'' کبھی یہ بات نہ مانیں گے کہ اس مقدمہ میں بھٹو کو پھانسی دی جائے کہ بھٹو کا عمل بہت ''ثانوی'' حیثیت رکھتا تھا اور سب گواہیاں ازخود ''ثانوی'' تھیں۔ بھٹو کسی طرح رضا قصوری کے باپ کے قتل میں سیدھے طور پر ''ملوث'' نہ تھا تو اس عاجز نے ضیاء الحق کو مشورہ دیا تھا کہ بھٹو پر ستمبر 65ء کی جنگ کے سلسلہ میں غداری کا مقدمہ چلایا جائے اور اس سازش میں ''شرکت'' کا مقدمہ چلایا جائے جس کے تحت ملک دولخت ہوا اور نوے ہزار فوجیوں کو دوہرا یرغمالی بنایا گیا' ضیاء الحق کی طرف سے کبھی جواب نہ آیا۔ اس عاجز نے کئی ایسے لوگوں سے بات کی جو ضیاء الحق کے ''نزدیک'' تھے یا ''مشیر'' تھے۔ تو ان میں سے ظاہر ہے ایسے مقدمات میں یحییٰ خان وغیرہ یا ستمبر 65ء کی جنگ میں ایوب خان' محمد موسیٰ سب کی ''ذمہ داریاں یا کوتاہیاں'' کھل کر سامنے آ جاتیں۔ اس سلسلہ میں امریکہ کا حصہ بھی کھل کر سامنے آ جاتا۔ لیکن ضیاء الحق نے اس سلسلہ میں بھی کچھ ''گواہیاں'' اکٹھی کرانے کا بندوبست کیا تھا اور میرے پاس بھی ''رہنمائی'' کیلئے کئی آدمی آئے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر بھٹو' رضا قصوری کے والد کے قتل کے مقدمہ سے بچ جاتا اور اس کو پھانسی کی سزا نہ ملتی تو یہ دوسرے مقدمے بھی ''تیار'' تھے لیکن یہ مقدمے کھلے طور پر نہ چلائے جاتے بلکہ ''CAMERA'' میں یعنی ''بند عدالت'' میں چلائے جاتے اور ضیاء الحق نے ہر حالت بھٹو کو پھانسی لگانا تھا۔ امریکی صدر کی بھٹو کو پھانسی

سے معافی دینے کی اپیل ''لیپاپوتی'' تھی۔ اگر امریکہ والے بھٹو کو بچانا چاہتے تو ضیاء الحق بھٹو کو کبھی پھانسی نہ لگاتا۔ ضیاء الحق کو اپنی ''وقعت'' بھی معلوم تھی اور ضیاء الحق کو امریکہ کے ''طاقت'' اور طور طریقوں سے بھی آگاہی تھی۔ اس نے آخری وقت تک امریکنوں کے سامنے نہ مانا کہ پاکستان نیوکلیئر طاقت بن گیا ہے۔ اس نے امریکہ والوں کو کہا تھا کہ ہم نیکولر طاقت نہ بنیں گے لیکن اپنے ادارے کی انسپکشن کی ان کو اجازت نہ دیں گے۔ امریکہ والے ہم پر بھروسے کریں۔ ضیاء الحق نے امریکہ والوں سے یہ بھی وعدہ کیا ہوا تھا کہ وہ پاکستان میں شریعت نہ نافذ کرے گا کہ اس کو معلوم تھا کہ جس دن اس نے پاکستان میں شریعت کے نفاذ کا عمل کیا امریکہ والے اس کے ''درپے'' ہو جائیں گے اور 1987ء سے ضیاء الحق کو معلوم تھا کہ خفیہ طور پر امریکہ والے اس کے ''درپے'' ہو چکے ہیں اور وہ ہوائی جہاز کا سفر نہ کرتا تھا۔ اس 1988ء کے حادثہ کے وقت بھی وہ ہوائی جہاز پر اس وجہ سے سفر کر رہا تھا کہ ساتھ امریکی سفیر تھا۔ لیکن امریکہ والے ضیاء الحق کو ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے کہ انہوں نے اپنا سفیر بھی ''قربان'' کر دیا۔ یا ان کا سفیر CIA کو بتلائے بغیر آخری وقت جہاز میں سوار ہوا تو قارئین اندازہ لگائیں کہ امریکہ والے ضیاء الحق سے کتنے ''نالاں'' ہو چکے تھے یہ عاجز ایوب خان کے زمانے کے واقعات کے وقت سے قارئین کو باور کراتا آ رہا ہے کہ جب آدمی اوپر جاتا ہے اور ملک کی سربراہی یا فوج کی سربراہی حاصل کر لیتا ہے تو اس کو اپنا رویہ تبدیل کرنا پڑتا ہے اور اس کو امریکہ کا ''کھیل'' کھیلنا پڑتا ہے۔ ورنہ وہ کرسی پر زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔ جس دن کوئی اللہ والا اس کرسی پر پہنچ گیا جس کا سورۃ الانعام کے مطابق مرنا جینا اللہ تعالیٰ کیلئے ہوگا تو تاریخ کا دھارا تبدیل ہونا شروع ہو جائے گا۔ یہی پاکستان کے بنانے کا اللہ تعالیٰ کا بڑا راز ہے۔

اس عاجز نے ضیاء الحق کے ساتھ بہت امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں کہ وہ بہت ہوشیار آدمی ہے۔ ہر رنگ تبدیل کر لیتا تھا' لیکن مجھے پکا خیال تھا کہ اس کی اسلام کے ساتھ وابستگی پکی ہے اور کسی نہ کسی طرح وہ اسلام نافذ کر جائے گا۔ اس عاجز نے اس کو حالات کے مطابق بے شمار تبلیغی یا وقت کی ضرورت کے کچھ اعمال کیلئے خطوط لکھے جن میں سے کچھ کی کاپیاں میرے پاس اب بھی موجود ہیں اور مجھے خیال تھا کہ وہ حالات کا مطالعہ کر رہا ہے اور جب حالات سازگار ہوئے تو وہ اسلام کے نفاذ کی کوئی صورت نکال لے گا۔ اس لئے اس عاجز نے اپنے طور پر اپنے رفیق میجر جنرل احسان الحق ڈار مرحوم کے ساتھ مل کر کچھ بنیادی کام شروع کیا کہ فوج نے جو مذہبی ادارہ بنایا تھا اس کیلئے کچھ ہدایات اور فوج میں مذہبی تعلیم جاری کرنے کیلئے کچھ ہدایات لکھیں۔ پھر جنرل ڈار مرحوم نے مجھے ٹھیکہ دیا کہ میں حضور پاک ﷺ کی فوجی حکمت عملی پر ایک کتاب لکھوں کہ ہمیں فوج میں اسی حکمت عملی اور جنگ کے اصولوں کو اپنانا چاہیئے اس کے بعد مجھے ٹھیکہ دیا گیا کہ میں مشہور جرمن جنگ کے ماہر اور فلاسفر کلاسیوٹز کی جنگ پر آٹھ کتابوں کا اردو میں ترجمہ کروں اور ساتھ قرآن پاک اور سنت نبوی ﷺ سے موازنہ کے طور پر اسلامی جہاد کے اصولوں کا ذکر کر کے ثابت کروں کہ ہمارے پاس بہتر فلسفہ جنگ موجود ہے۔ اس کے بعد خلفاء راشدین کی جنگی حکمت عملی پر چار کتابیں لکھنے کا ٹھیکہ دیا کہ خلفاء راشدین نے عملی طور پر جہاد کو کس طرح اپنایا اور اسلام میں کوئی فرقہ بندی یا گروہ بندی نہیں اور اس طرح پروگرام یہ تھا کہ ساری اسلامی تاریخ کے عسکری' روحانی اور نظریاتی پہلوؤں کو موجودہ زمانے کے تناظر میں پیش کیا جائے اور اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے جہاد کو عملی طور

پر طرز زندگی کے طور پر اپنانے کی کوشش کی جائے کہ اس عاجز نے 1979ء میں اپنی موجودہ دفاعی پالیسی کے سلسلہ میں نوائے وقت میں کچھ مضامین لکھے تھے لیکن تماشا یہ بنا کہ اس عاجز نے ابھی خلفائے راشدین کی کتابوں پر کام مکمل نہ کیا تھا کہ جنرل ضیاء الحق نے ایک غلط رپورٹ کا سہارا لے کر جنرل احسان الحق ڈار کی مزید ترقی روک کر ان کو وقت سے پہلے فوج سے ریٹائر کر دیا۔ میرے لئے یہ ایک بہت بڑا المیہ تھا۔ اسلام کی عسکری تاریخ کون لکھواتا' خلفائے راشدین کی کتابوں کی اشاعت میں ایسے روڑے اٹکائے گئے کہ انکے مسودوں پر ایسے جاہلانہ اعتراض کئے جاتے تھے کہ مجھے سر پیٹنا پڑ جاتا تھا اور قارئین یہ لمبی کہانیاں ہیں میرے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں کہ جو کچھ میرے ساتھ ہوتا رہا اس سب کا الزام میں ضیاء الحق کو دوں یا جنرل کے ایم عارف کو بہرحال یہ خلفا راشدین کی کتابیں اس عاجز نے بہت مشکل سے شائع کرائیں اور فوج کی یونٹوں میں بانٹ ضرور دی گئیں لیکن جو مقاصد جنرل ڈار مرحوم اور میرے سامنے تھے ان کی طرف کسی نے دھیان نہ دیا اور ایسی ''مایوسیوں'' کی تاب نہ لا کر جنرل ڈار مجھے اکیلا چھوڑ کر اس جہان دنیا کے قید خانہ کو الوداع کر گئے اور اس عاجز نے 1993ء میں ''حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال پر ایک زیادہ وسعت والی کتاب لکھ کر شائع کرائی جس کی تین ایڈیشن شائع ہو کر بک چکے ہیں اور چوتھے کے اب تیاری ہے اور آج سے دو سال پہلے خلفائے راشدین کی کتابوں کا دوسرا سول ایڈیشن شائع کرا کے اس عاجز نے تو اپنی طرف سے بہت ذمہ داری نبھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک میری ان کوششوں کو منظور فرمائے لیکن افسوس میرے اپنے ''چھوٹے بھائی'' ضیاء الحق جو مجھے ''لالہ'' کہتا تھا اس کے دور میں اس کی مدد سے جو اسلام اور قوم کی خدمت میں کر سکتا تھا اس سلسلہ میں اس نے میری کوئی مدد نہ کی حالانکہ ضیاء الحق کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جنرل ڈار مرحوم یہ اہم کام کرا رہا تھا جو اس کے جانے کے بعد ''ٹھپ'' ہو جائے گا۔

میری ان مایوسیوں کے زمانے میں اس عاجز نے بریگیڈئر گلزار احمد سے رابطہ باندھا کہ معلوم کروں کہ اس ضیاء الحق کے کیا ارادے ہیں تو بریگیڈئر گلزار کا خیال تھا کہ ضیا الحق بڑا ''وقتی'' آدمی ہے۔ اسلام کے ساتھ اس کا تعلق بھی ''وقتی'' ہے۔ ہمیں اس کے ساتھ ''گزارا'' کرنا چاہئے کہ اس کی آمد سے اسلامی اقدار کی کچھ وقعت بڑھ گئی ہے اور بے حیائی کا جو دور دورہ ہو رہا تھا اس میں کچھ رکاوٹ پڑ گئی ہے۔

ضیاء الحق کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے لئے ہر میدان صاف تھا

ضیاء الحق گیارہ سال قوم پر کیسے براجمان رہا اور اس کو آخری وقت تک حالات پر مکمل کنٹرول حاصل تھا کسی کو ''چوں'' کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس سلسلہ میں متعدد عناصر ذہن میں رکھنے ہوں گے۔ اول تو فطرت نے کچھ حالات ایسے پیدا کر دیئے کہ روس آ کر افغانستان میں پھنس گیا تھا اور امریکہ کو ضیاء الحق جیسے آدمی کی ''ضرورت'' تھی کہ روس مکمل ناکامی سے دوچار ہو جائے اس سلسلے میں پورا تجزیہ بعد میں آ رہا ہے کہ روس والوں کی عقل پر پردے پڑے ہوئے ہیں کہ وہ چین والا طریقہ استعمال کر کے پاکستان کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ اس کے علاوہ ملک پاکستان میں قحط الرجال کی وجہ سے ضیاء الحق کی شخصیت یعنی اس کی چالاکی اور ہوشیاری والا کوئی آدمی نہ فوج میں تھا نہ سول میں۔

ضیاء الحق کی تبدیلیوں والی باتیں اکثر لوگوں کو بڑی دیر بعد سمجھ آئیں۔ یا اکثریت تو نابلد ہی رہی۔ یہ

عاجز اس سلسلہ میں بریگیڈئر گلزار احمد' بریگیڈئر صدیق ستی' کرنل شیر محمد وغیرہ کا ذکر کر چکا ہے۔ ان سے میں نے رہنمائی لینے کیلئے کوشش کی لیکن یہ "لسٹ" بہت لمبی ہے۔ میرے دیرینہ رفیق جنرل فضل مقیم سے بہت دفعہ اس سلسلہ میں بات چیت کی بلکہ بالکل مغربی رنگ میں رنگے جنرل عتیق الرحمٰن کے ساتھ بھی کئی دفعہ مشورہ کیا اور اخباری دانشوروں یا محکمہ تعلقات عامہ میں آنے والے ہر قسم کے لوگوں سے بات چیت ہوتی رہتی تھی کہ جنرل احسان الحق ڈار مرحوم کے ساتھ جو کچھ ہوا دل سے میں نے ضیاء الحق کو کبھی "معاف" نہ کیا تھا۔ اور مجھے کئی دفعہ خیال ہوا کہ میں اس کے ساتھ سیدھی ٹکر لے کر اس کو کچھ "کھری کھری" سنا دوں کہ اپنا دل تو "ٹھنڈا" کروں لیکن اکثر لوگوں نے مجھے محتاط رویہ اپنانے کی نصیحت کی۔ خاص کر میرا بڑا بھائی مجھے بار بار منع کرتا تھا کہ ان کے دل میں ضیاء الحق کی بڑی عزت ہے۔ میں اس کے لئے وہ رویہ کبھی نہ اپناؤں جو یحییٰ خان اور بھٹو سے اپنایا تھا۔

ضیاء الحق کی خوش قسمتی تھی کہ اس کیلئے ہر مقام پر "میدان" صاف تھا۔ شروع شروع میں اسے کچھ تکلیف ہوئی کہ جب فوجی سربراہوں کی کانفرنس ہوئی تھی تو جنرل محمد شریف اس سے سینئر بھی تھا' جوائنٹ سٹاف کا وہ چیئرمین بھی تھا اس لئے صدارت وہ کرتا تھا اور ائر مارشل ذوالفقار کی کچھ ہمدردیاں بھٹو کے ساتھ بھی تھیں۔ ضیاء الحق نے بڑی چالاکی کے ساتھ پہلی ہی میٹنگ میں یہ تسلیم کرا لیا تھا کہ مارشل لا کا چیف ایڈمنسٹریٹر وہ یعنی ضیاء الحق ہو گا۔ اس لئے آہستہ آہستہ ملکی سول معاملات کو الگ کر کے ضیاء الحق نے ایک الگ مارشل لا ہیڈکوارٹر بنا لیا اور فوجی سربراہوں کی میٹنگ میں کوئی اہم بات بڑے وقفوں کے بعد زیر بحث آئی تھی۔ جنرل محمد شریف ایک "بڑی طاقت" تھا کہ اس کا چچیرا بھائی محمد اقبال لیفٹیننٹ جنرل تھا اور لاہور میں کور کمانڈر تھا۔ اور فوج میں ان کا کافی اثر ورسوخ تھا۔ اگر یہ دونوں بھائی ہمت کرتے یا طاقت پر قبضہ کرنا چاہتے تو کسی کانفرنس میں ضیاء الحق کو "غسل خانہ" میں بند کر کے حکومت پر قبضہ کر سکتے تھے لیکن شاید وہ ایسے "جھنجھٹ" میں نہ پڑنا چاہتے تھے۔ اقبال اور ضیاء الحق نے اکٹھا سٹاف کورس کیا تھا اور ان میں کچھ دوستی بھی تھی۔ ضیاء الحق نے دونوں بھائیوں کو حد سے زیادہ عزت دی اور جنرل شریف جس نے شادی کرنے کے باوجود ایک "کنوارے" کی طرح زندگی گزاری' جب اس کی نوکری پوری ہوئی تو اس نے عزت کے ساتھ ریٹائر ہونے کو ترجیح دی۔ جنرل محمد اقبال اور جنرل سوار خان نے اپنی عزت کو قائم رکھتے' ضیاء الحق سے حد سے زیادہ وفاداری کی اور ضیا کی حکومت کے پہلے سالوں میں یہ دونوں صاحبان اس کی حکومت کے "ستون" تھے۔ جنرل فیض علی چشتی اور جنرل غلام حسن کو بھی ضیاء الحق نے خوب استعمال کیا لیکن ضیاء الحق کو معلوم تھا کہ دونوں "وقتی" آدمی ہیں اور حالات کی "پیداوار" ہیں۔ جب بھٹو کو پھانسی دینے کا وقت آیا' تو جنرل چشتی کچھ منظر سے "غائب" رہنا چاہتا تھا کہ اس کا یہ اندازہ صحیح تھا کہ بھٹو کی پھانسی والا معاملہ کبھی "اچھل" سکتا ہے۔ گو وقت نے یہ معاملہ دبا دیا اور یہ نہ "اچھلا"۔ لیکن ضیاء الحق کو چشتی کی "وقعت" کچھ معلوم ہو گئی۔ اور جنرل غلام حسن نے بھی ایک آدھ دفعہ چشتی کی "ہاں میں ہاں" ملائی تھی۔

ضیاء الحق نے ایک ایک کر کے ہم پلّہ جرنیلوں سے چھٹکارا پا لیا

دونوں کو "استعمال" کرنے کے بعد ضیاء الحق نے ان دونوں کو "فارغ" کر دیا کہ دونوں کی قومی لحاظ

سے کوئی ''دقعت'' نہ تھی۔

جنرل ضیاء الحق کے باقی ماتحتوں میں ''مشکل'' آدمی لیفٹینینٹ جنرل جہاں زیب ارباب تھا جو کراچی میں متعین تھا۔ اس کی دیانتداری کے سلسلہ میں ساکھ اچھی نہ تھی۔ البتہ کچھ دیر اور کسی حد تک ''دبنگ'' آدمی تھا۔ضیاء الحق نے اس کو بھی سفارت کا عہدہ دے کر اس سے بھی جلد چھٹکارا حاصل کر لیا لیکن ضیاء الحق کیلئے مشکل ترین آدمی میجر جنرل تجمل حسین ملک تھا جو نہایت غیرت مند' مخلص' بااصول اور پکا مسلمان آدمی تھا اور حال ہی میں وفات پائی ہے۔ اس نے ضیاء الحق کی ہر بے اصولی کو ٹوکا۔ ضیاء الحق نے ان کو بھی لیفٹینینٹ جنرل نہ بنایا۔ اور وقت سے پہلے ان کو فوج سے ریٹائرڈ کر دیا۔ بعد میں جنرل ضیاء الحق کے خلاف جنرل تجمل حسین نے اسلامی طریقے سے ''خروج'' کیا۔ ان واقعات کی جھلکیاں جنرل تجمل کی کتاب "My Struggle" میں موجود ہیں کہ ضیاء الحق نے ان کو چودہ سال سزا دلائی۔ بریگیڈئر محمد حیات وغیرہ کئی مخلص لوگوں کی سفارش پر ضیاء الحق ان کو رہا کرنے کو تیار تھا کہ جنرل تجمل معذرت کریں لیکن جنرل تجمل نے معذرت سے انکار کر دیا۔ اور اپنے مقدمہ میں کوئی لگی لپٹی نہ رکھی۔ کاش! یہ تمام تفصیل جنرل تجمل حسین خود قوم کے سامنے اپنی زبان میں پیش کر جاتے۔ ان چند ہم عصر جنرلوں کے جانے کے بعد باقی جن لوگوں کی مدد سے ضیاء الحق کام چلاتا رہا۔ وہ ضیاء الحق سے بہت جونیئر تھے اور ان کو جو حکم ملتا رہا وہ مانتے رہے۔ ضیاء الحق میں مردم شناسی کا ملکہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں کو خوب چھان پھٹک کر ان کے صحیح استعمال کو جانتا تھا۔ ان میں سے دو کا ذکر ضروری ہے۔ جن کے رویوں سے قوم کو بہت نقصان پہنچا۔ اس سلسلہ میں یہ عاجز واقعات پورے طور پر لکھے گا' اور قارئین اپنی رائے خود قائم کریں۔

ان میں پہلے ذکر جنرل کے ایم عارف کا کریں گے۔ جو کافی عرصہ سے ضیاء الحق کا چیف آف سٹاف رہا اور پھر ضیاء الحق نے اس کو ڈپٹی چیف آف سٹاف بنا کر بری فوج کا سربراہ بنا دیا۔

ضیاء الحق کا تعلق بکتر بندستوں سے تھا تو وہ پیادہ فوج کے کسی میجر جنرل کی تلاش میں تھا کہ ''جیم'' جالندھرنیٹ پر اس کے ساتھ میجر جنرل انور مسعود کو وابستہ کیا جا رہا تھا لیکن وہ ان دنوں بیمار تھا تو عارضی طور پر میجر جنرل کے ایم عارف جو بکتر بندستوں کا تھا اور ضیاء الحق اس کو جانتا تھا' وہ ضیاء الحق کا چیف آف سٹاف بن گیا۔ عارف کے پریس کے ساتھ ''تعلقات'' تھے' ان کے ذریعہ سے اس نے انور مسعود کی طرف سے کچھ ایسے بیانات اخبار میں دلا دیئے کہ انور مسعود' جلد انتخابات کرائے گا اور وہ ایک ''پالیسی میکر'' کے طور پر ضیاء الحق کا ''مشیر'' ہوگا تو مجھے صحیح یاد نہیں پڑتا کہ انور مسعود اس کرسی پر چند دن کیلئے آیا۔ یا پہلے اس کا ''پتڑہ'' ہو گیا۔ ضیاء الحق کو ایک ''بابو قسم'' کے جنرل کی ضرورت تھی اور یہ ساری ''خوبیاں'' کے ایم عارف میں ''موجود'' تھیں۔ پالیسی کے بارے ضیاء الحق کے اپنے طریقے تھے۔ کچھ باتیں اس نے پہلے سوچ رکھی ہوتی تھیں۔ اخباروں کا بھی وہ خود گہرا مطالعہ کرتے تھے۔ لوگوں کے مشورے بھی وہ خوب سنتا تھا لیکن کرتا اپنی مرضی تھا۔ اس لئے کے ایم عارف جیسا آدمی ضیاء الحق کی اس ''ضرورت'' کو خوب پورا کرتا تھا کہ ضیاء الحق نے اسی جگہ پر عارف کو پہلے لیفٹینینٹ جنرل کے عہدے پر ترقی دے دی اور بغیر ڈویژن کمانڈر یا کور کمانڈر کے عہدوں پر کام کرنے کے عارف کو بری فوج کا ڈپٹی چیف آف سٹاف یعنی ایک طرح کا ''وقتی سربراہ'' بنا دیا گو چیف آف سٹاف کا عہدہ ضیاء الحق نے اپنی موت تک اپنے پاس رکھا۔

جنرل کے ایم عارف عمر میں مجھ سے بہت چھوٹا ہے۔ میں جنگ عظیم سمیت فوج میں جب دس سال نوکری کر چکا تھا تو تب جنرل عارف فوج میں ''وارد'' ہوئے۔ البتہ کیپٹن اور میجر کے طور پر ہم ''سولہ سترہ سال'' ہم عصر رہے۔ اور یہ عاجز جنرل عارف کی زندگی کے ہر ''گوشہ'' کو بہت نزدیک سے دیکھتا رہا۔

جنرل کے ایم عارف وغیرہ تو ''شاعری'' کا شغل فرماتے رہتے تھے۔ جیسے جب بھارت نے اپنی فوج کشمیر میں داخل کی تو ہماری فوج کا انگریز سربراہ جنرل مچھلیوں کے شکار کا ''شغل'' کر رہا تھا (توبہ میرے اللہ) اور حالات آج تک وہی ہیں۔ ضیاء الحق کے ایک ہمعصر جنرل امیر حمزہ مرحوم نے 1994ء میں جب میری کتاب ''حضور ﷺ پاک کا جلال و جمال'' پڑھی تو اس نے اس وقت کے فوجی سربراہ جنرل وحید کاکڑ کو ایک خط لکھا تھا کہ امیر حمزہ جب بریگیڈیئر تھے تو وحید کاکڑ ان کا بریگیڈ میجر ہوتا تھا۔ خط کے کچھ الفاظ یہ ہیں:-

''ان دنوں فوجی بارکوں اور چھاؤنیوں میں جگہ جگہ ''ایمان' تقویٰ'' اور ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ اور یہ بورڈ ضیاء الحق لگوا گیا تھا۔ یہ ایک لیپاپوتی ہے کہ ان باتوں کو ہماری فوج میں کوئی نہیں سمجھتا کہ ان پر عمل کیسے کریں۔ ان پہلوؤں کو سمجھنے کیلئے غیروں کے تزویراتی اور تدبیراتی فلسفہ جنگ کی نقالی کی بجائے ہمیں سب کچھ اپنے رہنما حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نسبت سے سیکھنا ہوگا اور یہ باتیں میجر امیر افضل کی کتاب ''حضور ﷺ پاک کے جلال و جمال'' میں بڑی خوبصورتی سے بیان کی گئی ہیں۔ آپ کے سب فوجی افسروں کو یہ کتاب پڑھنی چاہئے۔ میں اس خط کی کاپی میجر امیر افضل کو دے رہا ہوں کہ وہ ایک کتاب آپ کو تحفتاً بھیجے یہ اس کی ''تجارت'' نہیں۔ وہ اپنا خرچ نکالنے کیلئے عام لوگوں کے مقابلہ میں آدھی سے بھی کم قیمت پر کتاب فروخت کر رہا ہے۔''

اس عاجز نے جنرل وحید کاکڑ کے سیکرٹری بریگیڈیئر افضل کی وساطت سے کتاب اس کو بھیجی۔ جنرل کاکڑ کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ اپنی طرف سے مجھے چند الفاظ لکھ دیتا۔ حالانکہ 62-1961ء میں جب یہ عاجز پلٹن میں میجر تھا تو وحید کاکڑ ہمارے بریگیڈ کی دوسری پلٹن میں ''طفل مکتب'' کے طور پر وارد ہوا تھا اور مجھے اچھی طرح سے جانتا تھا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وحید کاکڑ اور کے ایم عارف جیسے لوگ ہماری بری فوج کے سربراہ بنے رہے۔ تو جنرل کے ایم عارف کی طرف واپس آتے ہیں کہ اس کو امید تھی کہ ضیاء الحق اس کو اضافی مدت بھی دے گا لیکن ضیاء الحق اپنی نوکری میں تو اضافہ کرتا رہتا تھا۔ دوسروں کی نوکری میں عام طور پر اضافہ نہ کرتا تھا۔ پھر اس زمانے میں محمد خاں جونیجو وزیراعظم بن گیا تو وہ فوجی سربراہ اپنی مرضی سے بنانا چاہتا تھا اور عارف کی نوکری میں اضافہ نہ کرنا چاہتا تھا۔ ضیاء الحق کو کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ اگر جونیجو صاحب ایسا کچھ کر کے اپنے آپ کو ''طاقتور'' سمجھ رہے تھے تو ضیاء الحق کی بلا سے۔ وہ اپنی کرسی میں ''مضبوط'' تھا۔ بہرحال عارف نے سمجھا کہ یہ کچھ ضیاء الحق کی مرضی سے ہو رہا ہے تو اس نے اخباروں میں خبریں دلوانا شروع کر دیں کہ وہ اپنی نوکری میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ ضیاء الحق کے حادثہ میں ہلاک ہونے کے بعد عارف نے شہرت حاصل کرنے کیلئے ضیاء الحق کی پالیسیوں اور کارکردگیوں پر بڑے اعتراضات والے مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ ہے ہمارا قومی کردار' کہ ضیاء الحق کے ''پروردے'' آہستہ آہستہ اس کو ''الوداعی'' سلام کرتے جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں نواز شریف مسلم لیگ نے بھی ضیاء الحق کو ''آخری سلام'' کہہ دیا۔ ایک ملاقات میں اسی عاجز نے جنرل کے ایم عارف کو یاد دلایا کہ میں جب ضیاء الحق کو خط لکھتا تھا تو ان میں

سے عارف نے ایک آدھ خط کا جواب مجھے ان الفاظ میں لکھا تھا کہ ضیاء الحق ''فرشتہ'' ہے۔ ہم اس کو وقت دیں۔ وہ سب معاملات ٹھیک کر دے گا۔ اور اب تم کو ضیاء الحق میں خامیاں نظر آنے لگی ہیں۔

ضیاء الحق کے ''پروردوں'' میں دوسرا اہم آدمی جنرل فضل حق تھا۔ اس آدمی نے بنیادی تعلیم رائل ملٹری کالج ڈیرہ دون میں حاصل کی تھی گو فوج میں کمیشن اس کو پاکستان بننے کے بعد پاکستان اکیڈمی کاکول سے ملا تھا۔ یہ آدمی مکمل طور پر مغربی اقدار میں رنگا ہوا تھا اور اسلام کے ساتھ برائے نام تعلق تھا کہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوا تھا۔ یہ کافی ''چوکنا'' اور بنیادی طور پر ''شرارتی ذہن'' کا حامل تھا اور بہت ہوشیار اور وقت سے ہر قسم کا جائز یا ناجائز فائدہ اٹھانا اس کی گھٹی میں تھا۔ کیڈٹ اور نوجوان افسر کے طور پر اس نے اپنے ہم عصر سوات کے شہزادہ اورنگ زیب سے دوستی گانٹھ رکھی تھی۔ اورنگ زیب پہلے ایوب خان کا اے ڈی سی تھا پھر ایوب خان کا داماد بن گیا۔ بہرحال میجر کرنل بننے تک فضل حق نے اورنگ زیب کی دوستی کا خوب فائدہ اٹھایا اور جو جگہ اس کو پسند ہوتی تھی وہاں نوکری کی اور پریذیڈنٹ کے باڈی گارڈ رسالے کا کمانڈر بھی رہا۔ جہاں کبھی کبھی عارضی طور پر ایوب خان کا ملٹری سیکرٹری بھی بن جاتا تھا۔ یہ آدمی ادھر ضیاء الحق کی یونٹ کا تھا اور بریگیڈئر سے اوپر کے عہدے اس نے ضیاء الحق کے ''سایہ'' کے نیچے حاصل کئے اور جس سینیارٹی کے حساب سے وہ ترقی کرتا جاتا تھا تو ضیاء الحق کو جنرل سوار خان کے بعد کے ایم عارف کو ڈپٹی چیف آف سٹاف کی جگہ دینے کی بجائے وہ جگہ فضل حق کو دینا چاہیئے تھی لیکن ضیاء الحق کو فضل حق کی ہوشیاری سے بھی خطرات تھے۔ وہ فوج کی اتنی اہم جگہ پر فضل حق کو نہ رکھنا چاہتا تھا۔ ضیاء الحق نے کوشش کی کہ فضل حق کو سفیر بنا کر امریکہ بھیج دے۔ لیکن امریکہ والے بھی فضل حق پر پورا اعتبار نہ کرتے تھے۔ ان کی نظر 1956ء سے ضیاء الحق کی یونٹ والے اعجاز عظیم پر تھی۔ ضیاء الحق نے فضل حق کو اس کے صوبہ سرحد کی ''سیاست'' میں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا کہ افغانستان میں گڑبڑ کی وجہ سے صوبہ سرحد میں ایک سخت گیر ''منتظم'' کی ضرورت تھی اس لئے ضیاء الحق نے فضل حق کو پشاور کا مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنا کر صوبہ سرحد اس کے ''حوالے'' کر دیا لیکن پشاور کا ڈویژن کمانڈر اسلام کا عظیم فرزند میجر جنرل احسان الحق ڈار (مرحوم و مغفور) تھا جس کے ہوتے ہوئے فضل حق کی ''ہینکی پھینکی'' نہ چل سکی۔ تو فضل حق نے ان کو تبدیل کرایا اور میرا پلٹن والا عزیزم میجر جنرل محمد صفدر وہاں پہنچ گیا جو اپنے آپ کو وقت کے مطابق ڈھال لیتا تھا تو فضل حق آہستہ آہستہ صوبہ سرحد کی سیاست پر چھا گیا تو ضیاء الحق نے اس کو فوج سے ریٹائر کر کے صوبہ سرحد کا وزیراعلیٰ بنا دیا تھا لیکن اس پر کچھ ''کنٹرول'' رکھنے کیلئے اپنی یونٹ سے بریگیڈئر امیر گلستان جنجوعہ کو سرحد کا گورنر بنا دیا۔

ضیاء الحق، فضل حق اور گلستان جنجوعہ تینوں گائیڈ رسالہ میں اکٹھی نوکری کر چکے تھے۔ امیر گلستان بھی فضل حق سے سینئر تھا اور وہ فضل حق کو خوب ''سمجھتا'' تھا۔ بہرحال صوبہ سرحد کو کنٹرول کرنے کیلئے فضل حق، ضیاء الحق کی ''ضرورت'' ضرور تھی کہ افغانستان کے حالات ایسے تھے کہ سرحد میں کوئی پر اثر منتظم ہو لیکن مجموعی طور پر فضل حق نے پاکستان کو بہت نقصانات پہنچائے، جن کا ازالہ اب بھی نہیں ہو رہا۔ یہ نقصانات ضیاء الحق کے ''کھاتے'' میں بھی جاتے ہیں۔ صوبہ سرحد میں پاراچنار کے محدود علاقوں کو چھوڑ کر باقی کسی جگہ شیعہ، سنی جھگڑا نہ ہوتا تھا۔ فضل الحق نے اس کو سارے صوبے میں پھیلا دیا۔ کالا باغ ڈیم کی مخالفت کر کے فضل حق نے صوبائی تعصب کی ایسی راہ

نکالی ہے کہ دن بدن یہ تعصب بڑھتا جا رہا ہے اور ولی خان وغیرہ جو دن بدن غیر اہم ہوتے جا رہے تھے' ان کے خاندان کو سیاست چمکانے کیلئے راہیں پیدا کر دیں۔

فضل حق نے کالا باغ ڈیم کی مخالفت کسی چھپے پاکستان دشمن ''مافیا'' کے اشارے پر کی جو نہیں چاہتے کہ پاکستان دریاؤں کے پانی سے سستی بجلی پیدا کرے۔ اس میں ضیاء الحق کی بھی اپنی ''مرضی'' تھی۔ ہم یہ کچھ دلائل سے ثابت کریں گے ورنہ فضل حق کو ضیاء الحق ذرا اشارہ کر دیتا کہ وہ ایسا نہ کرے تو فضل حق جو ''وقتی'' آدمی تھا۔ وہ کالا باغ ڈیم کے فوائد کے پل باندھ دیتا۔ کہ افسوس قوم کو آج تک اس ڈیم کی متعدد افادیتوں کے بارے اندھیرے میں رکھا گیا ہے۔ اس ڈیم کی تجویز بنانے والے پہلے انجینئر شاہ نواز کا تعلق بھی صوبہ سرحد سے تھا۔ اور اس کو اس میں صوبہ سرحد کے فوائد ہی فوائد نظر آئے اور دوسرا آدمی جس نے واپڈا کے چیئرمین کے طور پر کالا باغ ڈیم کی ''افادیتوں'' سے صوبہ سرحد کو زیادہ فائدہ پہنچانا چاہا وہ بریگیڈیئر فضل رزاق تھا جو فضل حق کا بڑا بھائی تھا۔ دراصل بدقسمتی سے قوم کو اس کالا باغ ڈیم کی ساری افادیتوں سے آگاہ نہیں کیا گیا۔ کالا باغ سے نوشہرہ تک 120 میل کے فاصلہ تک یا خیر آباد تک کے سو میل کے لمبے علاقے تک دریائے سندھ جو ایک لکیر ہے وہ سو میل لمبی ٹھنڈے پانی کی جھیل بن جائے گا جس کے کئی کنارے کھڑے ہوں گے اور بعض جگہ چوڑائی بھی تین میل یا زیادہ ہو جائے گی۔ اب دریائے سندھ میں مغرب سے ضلع کوہاٹ' ضلع کرک اور ضلع بنوں سے بے شمار نالے جیسے کوہاٹ توی یا لاچی نالہ وغیرہ آگرتے ہیں۔ اور مشرق سے ضلع اٹک اور ضلع چکوال سے بھی آ کر متعدد نالے جیسے ہارو دریا' یا سواں دریا' گمبھیر نالہ وغیرہ آگرتے ہیں۔ ان نالوں اور دریائے سندھ کے جو سنگم ہیں وہاں بے شمار سوکھی گہری کھاڑیاں بھی بنتی ہیں یا کچھ میں برائے نام نیچی سطح پر پانی ہوگا یہ سب مقامات جب پانی سے بھر جائیں گے تو ٹھنڈے پانی کی جھیل مغرب اور مشرق میں بعض جگہ بیس میل تک اور بعض جگہ چالیس' پچاس میلوں تک جائے گی تو جھیل کے پھیلاؤ کا اندازہ لگائیں جس کا ٹوٹل پھیلاؤ سینکڑوں میل بنتا ہے۔

نوے فیصد کے قریب یہ پھیلاؤ غیر آباد نالوں میں ہوگا اور دس فیصد کوئی آباد زمین یا آباد گاؤں جھیل کا حصہ بنیں گے۔ اب گرم علاقوں میں اس ٹھنڈے پانی کی جھیل کے پھیلاؤ کے اثرات اول تو فضا سے کافی آلودگی کو ختم کر دیں گے۔ علاوہ ازیں ان نزدیکی علاقوں کے زیر زمین پانی کی سطح بہت اونچی ہو جائے گی اور جھیل کے سینکڑوں میل لمبے کناروں کے دونوں اطراف کو سرسبز علاقے بنایا جا سکتا ہے یا گھنے جنگلات لگائے جا سکتے ہیں تو صوبہ سرحد کے ان تین اضلاع اور صوبہ پنجاب کے دو اضلاع کے ان لوگوں کی قسمت جاگ اٹھے گی جن کی بارانی زمینیں اس جھیل کے کناروں کے پاس ہوں گی۔

بریگیڈیئر فضل رزاق کالا باغ ڈیم کی اس افادیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا تو وہ کالا باغ ڈیم کی اونچائی کو بیس فٹ اور بڑھانا چاہتا تھا کہ دریائے سندھ سے پانی اونچائی حاصل کرے گا تو چراٹ سے خیر آباد کے پہاڑی سلسلہ سے دریائے کابل کے جنوب میں جو نالے آ کر گرتے ہیں ان میں بھی کالا باغ ڈیم کا پانی پھیلاؤ اختیار کرے۔ یا کچھ معمولی جگہوں پر کھدائی کر کے ڈیم کے پانی کو جنوب کی طرح خشک گہری کھائیوں میں ڈالا جائے۔ لیکن ایسا سال میں صرف دو تین ماہ کے برسات کے موسم میں ہوتا تو وہ چاہتا تھا کہ ان خشک نالوں میں کچھ

''ڈائیک'' بنا کر مصنوعی رکاوٹیں بنائی جائیں کہ جب ڈیم کی سطح نیچی ہونا شروع ہو تو پانی کو ان رکاوٹوں کی مدد سے روک لیا جائے۔ ساتھ ہی نوشہرہ ضلع کے لوگوں کو بھی کچھ ''معاوضہ'' مل جائے گا کہ ان کی زمینیں زیر آب آ گئی ہیں۔ فضل حق کو تو بہانہ چاہئے تھا کہ نوشہرہ کا ذکر ہو جائے کہ اس کی کچھ زمینیں زیر آب آ سکتی ہیں اور دریائے کابل کے شمالی علاقوں کی زمینوں میں سیم اور تھور کا خطرہ ہے۔ اور ولی خان پارٹی کو ''مواد'' مل گیا کہ اپنی سیاست کو ''چمکائیں''۔ فضل حق نے یہ کچھ ضیاء الحق کی مرضی سے کیا کہ پرانی پیشگوئی والوں کے مطابق بنوں کوہاٹ اور دریائے سندھ کے مشرق کی سطح مرتفع کے لوگوں نے اس برصغیر میں اسلام کے پھیلاؤ میں خاص کردار ادا کرنا ہے اور ان علاقوں میں کافی رہنما قسم کے لوگ ہوں گے۔ ایوب خان کو بھی یہ پیشگوئی بتائی گئی اور اس نے جلدی سے تربیلا ڈیم بنا دیا کہ وہ علاقے بھی دریائے سندھ کے مشرق میں سطح مرتفع ہے۔ اور اسلام آباد کے بارے بھی پیش گوئی تھی۔ (واللہ اعلم) ضیاء الحق نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ہوتے کسی اور علاقے کے لوگ ملک کے رہنما بن جائیں کہ اس کی رہنمائی کو دھچکا لگتا اس لئے ضیاء الحق معاملات کو DELAY کرنا چاہتا تھا اور اس ''التوا'' کی پوری ذمہ داری ضیاء الحق پر ہے۔

البتہ وہ ''مافیا'' جس نے کالا باغ ڈیم کے بارے یہ ''التوا'' جاری کی ہوئی ہے ان کے اپنے مقاصد ہیں اور کئی گروہوں کو وہ لوگ ''استعمال'' کر رہے ہیں اور ان کو دولت سے بھی نوازتے رہتے ہیں۔ اور نت نئے شوشے چھوڑتے ہیں اول شوشہ دریائے کابل میں طغیانی آنے کا چھوڑا جاتا ہے کہ اگر 1929ء کی طرح طغیانی آ گئی تو کالا باغ ڈیم کی وجہ سے دریائے سندھ اس دریائے کابل کے پانی کو اپنے اندر نہ سمیٹ سکے گا اور دریائے کابل اپنے گرد و نواح کے علاقوں کو طغیانی سے برباد کر دے گا۔ 1929ء میں وارسک ڈیم نہ تھا۔ اب تو مچنی کے مقام پر دریائے کابل کو روکا جا سکتا ہے اور طغیانی کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ دوم تربیلا ڈیم سے سندھ کے بہاؤ کو ایک دن کیلئے روک لیا جائے تو دریائے سندھ میں دس دریا کابل سما سکتے ہیں اور کالا باغ ڈیم کے دروازے کھول دیئے جائیں گے تو دریائے کابل کی طغیانی کو دریائے سندھ میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے گی۔ ایک اور شوشہ چھوڑا جاتا ہے کہ کالا باغ ڈیم بن جانے کے بعد دریائے کابل کی طغیانی سے رکاوٹ پڑنے کی وجہ سے یہ طغیانی کا پانی پیچھے مڑ کر نوشہرہ کے علاقوں کو زیر آب کر دے گا۔ یہ سب باتیں پڑھ کر مجھے ہنسی آتی ہے جیسے گاؤں کی مثال موجود ہے کہ کسی نے کہہ دیا کہ کتا تمہارا کان لے جا رہا ہے تو آدمی کان کو ہاتھ مار کر محسوس کرنے کی بجائے کتے کے پیچھے بھاگ کھڑا ہو کہ کہاں ہے میرا کان؟ صوبہ سندھ والوں کو اعتراض ہے کہ دریاؤں میں خوب سیلاب آتا رہے اور سمندروں میں دریا کا پانی جاتا رہے کہ سمندر کا کھاری پانی خشکی کی طرف نہ آئے۔ سمندر کے کھاری پانی کو خشکی کی طرف آنے کے روکنے کے کئی اور طریقے بھی ہیں کہ اس کے آگے بند باندھے جائیں اور دیواریں بنائی جائیں اور دریا کے پانی کو سمندر کے نزدیک روکا جائے کہ وہاں جھیلیں بن جائیں، جن میں میٹھے پانی کی مچھلیوں کی افزائش بھی خوب تر ہو سکتی ہے۔ سندھ والوں کو رب کی ذات پاک عقل دے کہ پانی کے جتنے ریزروائر اوپر والے علاقوں میں موجود ہوں اس میں سندھ کے لوگوں کا فائدہ ہے کہ ضرورت کے وقت جتنا پانی وہ چاہیں گے ان کے لئے میسر ہو گا۔ صوبہ سرحد میں دریائے کابل کے جنوبی بارانی علاقوں کوہاٹ اور کرک کے بارانی علاقوں یا بنوں کے کچھ بارانی

علاقوں کی ضرورت ہے کہ کالا باغ ڈیم کی زیادہ سے زیادہ اونچائی ہو کہ ان کے زیادہ بارانی علاقے بھی سرسبز قطعوں میں تبدیل ہو جائیں اور پھر جو بارشوں کی اوسط میں اضافہ ہوگا یا جو ماحول میں بہتری ہوگی تو ان علاقوں کے لوگوں کی دنیا تبدیل ہو جائے گی۔ آؤ ہم لوگ صوبائی تعصبوں سے توبہ کر کے صرف مسلمان اور مومن بنیں تو مومن کی فراست سے ہم اللہ تعالیٰ کے نور سے ہر معاملہ کو پرکھیں گے۔

افغانستان میں روسیوں کے خلاف ''محدود جہاد'' امریکیوں کی ضرورت تھا

اب ذرا افغانستان کے جہاد پر کچھ تبصرہ کریں جو سعادت اللہ تعالیٰ نے ضیاء الحق کو ضرور کسی حد تک عطا فرمائی۔ لیکن یہ بھی یاد رکھیں کہ یہ ''محدود جہاد'' امریکہ کی بھی ضرورت تھی اور پاکستان میں جو حاکم بھی ہوتا اس کو اس ''محدود جہاد'' میں کودنا ضرور پڑتا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں اس عاجز نے ضیاء الحق کو بے شمار خطوط لکھے کہ افغانی رہنما اس جہاد کو بھان متی کے کنبے کے طور پر چلا رہے ہیں اس طرح سے امت میں وہ وحدت نہ پیدا ہو سکے گی جو ہم پر فرض ہے اور اس کی ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں بڑا ہی سنہری موقع عطا کر دیا ہے اگر ہم غیروں کی سازش کی وجہ سے پاکستان کی آزادی کے وقت جہاد کو طرز زندگی کے طور پر نہ اپنا سکے یا 1949ء میں کشمیر کے جہاد کو جمود دے دیا تھا یا ستمبر 65ء اور دسمبر 71ء کی جنگیں نظریہ جہاد کو اپنا کر نہ لڑ سکے تو اب افغانستان پر 1979ء سے روس کے حملہ نے بڑا موقع فراہم کیا تھا کہ ہم اپنے ''امریکن دوستوں'' کو کہتے کہ ہم روس کا مقابلہ جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنا کر ہی کر سکتے ہیں۔ تو وہ لوگ ہماری مدد کریں کہ ہم نظریہ جہاد کو اپنائیں اور اس طرح جو مجاہدین افغانستان میں روس کے خلاف جہاد کرنے جائیں گے وہ ایک مضبوط جہادی مرکز کے مستقر سے وہاں جا کر جہاد کریں گے تو تب ہی روس کو افغانستان سے نکالا جا سکتا ہے یہ جو ہم خواہ مخواہ فخر کرتے ہیں کہ ہماری وجہ سے افغانی روس کے خلاف جہاد جاری رکھ سکے اور اختر عبدالرحمٰن کے بیٹوں نے اپنے باپ کو فاتح بنا کر ایک کتاب بھی شائع کر دی تھی یہ باتیں اپنے دل کو ''لبھانے'' کیلئے ذہنی عیاشی ضرور مہیا کرتی ہیں لیکن ان میں کوئی حقیقت نہیں۔ یہ ''حادثات'' ہیں۔ یا یہ کچھ ایسے ہوگیا۔ جس بدنظمی سے اس جہاد کے عمل میں ہماری ISI نے حصہ لیا۔ 1988ء میں اوجڑی کیمپ کے دھماکے نے ہماری کوتاہی کا ''پول'' کھول دیا کہ بارود اور ہتھیار آ رہے تھے اور ہم ان ہتھیاروں اور بارود کو اچھی طرح سے ''سٹور'' بھی نہ کر سکے۔ افغانستان سے جو گروہ آتا تھا اس کو ہتھیار اور بارود دے دیا جاتا تھا اور افغانوں اور پختونوں کو ہتھیاروں اور بارود سے محبت ہے۔ وہ لوگ یہ ہتھیار لے کر افغانستان میں ''شکار'' کے لئے چلے جاتے تھے اور انکے بال و بچہ کو مختلف کیمپوں میں کھانا مل جاتا تھا۔ پنجابی کی کہاوت کے مطابق حج بھی ہو رہا تھا اور ''وپار'' بھی یعنی تجارت بھی۔ افغانستان کے جہاد کے عملی پہلو کا یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی مرکزی قیادت نہ تھی۔ کوئی ایک جماعت نہ تھی۔ کئی تنظیمیں تھیں اور ہر ایک تنظیم کا سربراہ اپنی ''ڈیڑھ اینٹ'' کی مسجد میں رہتا تھا اور اپنی الگ ''ڈفلی'' بجاتا رہتا تھا۔ بیچ میں اچھے لوگ بھی تھے جیسے حکمت یار، نبی محمدی اور یونس خالص وغیرہ اور ایسے لوگوں کی الگ ایک مرکزی تنظیم بنائی جا سکتی تھی لیکن ہم نے برہان الدین ربانی جیسے ابن الوقت لوگوں کو بھی خوب پذیرائی دی جو ''چیتھڑوں'' میں پاکستان پہنچا تھا اور ہم نے اس کو افغانستان کا صدر بنوا دیا' لیکن دوسرے ہی روز بھارت کے ساتھ پینگیں بڑھانا شروع کر دیں۔ بیچ

میں مجددی جیسے لوگ بھی ہیں جو ہر روز بدلتے رہتے تھے اور اسماعیل خان جیسے علاقائی لیڈر یا دوستم جیسے بے دین بھی اور علاقائی بھی اور افسوس ہم نے احمد شاہ مسعود کی خواہشات کا بروقت قلع قمع نہ کیا۔ افغانستان کی ضرورت ایک تنظیم تھی جو بعد میں ''طالبان کی شکل وصورت'' میں سامنے آئی' لیکن ان پر ہمارے دیوبندی مسلک والوں کے اثرات نے ان میں حب رسول ﷺ صرف سنت نبوی ﷺ کے برہانوی پہلو تک محدود تھی انکو یہ سبق نہ پڑھایا جا سکا کہ عجمیوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ حضور پاک ﷺ کی شان میں جنُوں تک عاجزی کر کے دنیا کی ہر چیز کو ہمارے آقا ﷺ کی وساطت سے سمجھنے کی کوشش کریں کہ ہمارے آقا ﷺ کا فرمان ہے کہ مومن ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے اور سورۃ المائدہ کی آیت مبارکہ 15 کے مطابق اللہ تعالیٰ کا نور از خود ہمارے آقا ﷺ ہیں۔

''کی محمد ﷺ سے وفا تو ہم تیرے ہیں' یہ جہاں ہے چیز کیا لوح وقلم تیرے ہیں''

طالبان ضیاء الحق کی ہلاکت کے بعد وجود میں آئے لیکن ضیاء الحق کے زمانے میں مجاہدین کے اکثر رہنما مجددی اور گیلانی کو چھوڑ کر زیادہ تر عقلی اور برہانی اسلام کے پیروکار تھے تو علامہ اقبال نے جو کہا تھا ''کہ اک دانش نورانی اک دانش برہانی' دانش برہانی ہے حیرت کی فراوانی' تو طالبان کی اکثریت نے روحانی اور نورانی عمل کو نہ اپنایا تو نتیجہ دنیا کے سامنے ہے کہ ایک دفعہ تو طالبان بکھر گئے ہیں۔ اور مجددی اپنے مریدوں کے نرغے میں محدود رہتا تھا اور گیلانی سیاست میں پڑ کر ظاہر شاہ کی دوبارہ ''تاجپوشی'' میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا تو طالبان کے اکوڑہ خٹک کے استاد سمیع الحق اور ان کے بیٹے حافظ راشد الحق کو متعدد خطوط لکھے گئے کہ وہ لوگ طالبان میں حضور پاک ﷺ کی غلامی کا جذبہ پیدا کریں لیکن ضیاء الحق کو اظہار نہ کرتا تھا صرف یہ کہتا تھا کہ اپنے ''مسلک'' کو اپنائے رکھو اور دوسروں کے مسلک میں دخل نہ دو' یعنی اثرانداز نہ ہو کہ ضیاء الحق خود دیوبندی مسلک میں اشرف علی تھانوی اور شبیر احمد عثمانی کا پیروکار تھا۔ وہ ایسی باتوں میں یقین نہ رکھتا تھا کہ قائداعظم وکالت کیلئے حضور پاک ﷺ کا چناؤ تھا یا غازی مرید حسین شہید یا غازی علیم الدین شہید کی طرح کوئی درجن بھر غازی دوسری جنگ عظیم سے پہلے اس برصغیر میں ناموس رسول ﷺ پر قربان ہو گئے تھے تو رب کی ذات پاک نے اپنے حبیب ﷺ کی امت کو پاکستان تحفہ کے طور پر عطا کر دیا اور اس خطہ میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ بقول علامہ اقبال

''عشق بلاخیز کے قافلہ سخت جان نے برپا کرنا ہے''

یعنی لوگ عشق رسول ﷺ سے سرشار ہو کر اللہ تعالیٰ اور رسول پاک ﷺ کا نام بلند کر دیں گے۔ ضیاء الحق کے ''عقائد'' جانتے ہوئے یہ عاجز یہ کچھ سیدھے طور پر تو اس کو نہ لکھتا تھا لیکن میں نے اس کو بہت کچھ لکھا کہ ہم پاکستان میں بھی جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنا کر ''حزب اللہ'' بن جائیں اور افغان مجاہدین کو بھی ''حزب اللہ'' بنائیں کہ ''قومیتوں'' کے تصور ختم ہو جائیں اور افغان اور ہم قائداعظم کی طرح اول بھی مسلمان بن جائیں اور آخر بھی مسلمان' لیکن ضیاء الحق کے بارے عام رپورٹ ہے کہ اس نے قائداعظم کے مزار پر کبھی حاضری نہ دی تھی نہ کبھی داتا گنج بخشؒ کے مزار پر حاضر ہوا اور اشرف علی تھانوی کے مرید سید سلیمان ندوی اور بشیر احمد عثمانی کے مزاروں پر وہ حاضر ہوا تھا۔ شاید علامہ اقبال کے مزار پر بھی حاضر ہوا یا علامہ اقبال کو جو پذیرائی دی وہ علامہ اقبال کے علم اور پیغام کی وجہ سے ان کو دی نہ کہ علامہ اقبال کے عشق رسول ﷺ والے پہلو سے آگاہی کی وجہ سے۔ تو

قارئین نتیجہ ہمارے سامنے ہے' افغانستان کے جہاد سے امریکہ والوں نے بہت کچھ حاصل کر لیا کہ وہ سپر پاور بن گئے اور روس کو دنیا میں بہت ثانوی درجہ پر تنزل برداشت کرنا پڑا' لیکن امت محمدی ﷺ نے کچھ زیادہ حاصل نہیں کیا کہ روحانی یا نورانی اقتدار حاصل کرنے سے تو اب بھی دور ہیں۔ فی الحال نہ افغانستان میں نہ پاکستان میں ہم کسی فکری وحدت کے نزدیک پہنچے ہیں یہ ایک نظریاتی ضرورت ہے جس کا تعلق دانش نورانی یا روحانیت سے ہوتا ہے' لیکن ہمارے آقا ﷺ کا فرمان ہے کہ ''عمل کا پھل نیت کی وجہ سے ہے۔'' یہ عاجز اہل حدیث یا دیوبندی یا کسی مسلک والوں کی نیت پر کبھی شک نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ کچھ کم علمی کی وجہ سے کچھ مسلک والے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں شرک کے ڈر کی وجہ سے حضور پاک ﷺ کو اور اللہ تعالیٰ کو الگ الگ خانوں میں ڈال دیتے ہیں جس میں ''مبالغہ'' کر کے حضور پاک ﷺ کی شان کو اپنے بشری پیمانوں سے ناپنا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ رب کی ذات پاک نے یوم ازل اپنے حبیب ﷺ کو رحمتہ اللعالمین ﷺ'' بنا کر زماں و مکان پر حاوی کر دیا۔ بشر کے طور پر بھی معراج کے بعد پکے طور پر آپ ﷺ کو زمان و مکاں پر حاوی کر دیا۔ ویسے وقتی طور پر تو پہلے بھی بشر کے طور پر کئی دفعہ رب کی ذات پاک نے اپنے حبیب ﷺ کو زماں و مکاں پر حاری کیا۔ حضور پاک ﷺ دنیا میں چند سال ''دیدار عام'' دینے سے پہلے بھی رحمت کے طور پر زماں و مکاں پر حاوی تھے اور اب آنکھوں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی زماں و مکاں پر حاوی ہیں۔ جب تک امت محمد یہ اس اصول پر اتفاق نہیں کرتی ہم دنیا میں اسی طرح تفرقوں سے دوچار رہیں گے اور ایک مغلوبہ قوم ہوں گے کہ غیروں کے پروردہ بن کر رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حضور پاک ﷺ کے سپاہی کے نام کی سعادت حاصل ہونے کے بعد یہ عاجز رسول عربی ﷺ کے اسلام کا پیروکار بن گیا جس میں نہ کوئی فرقہ بندی ہے اور نہ فقہی گروہ بندی (سورہ الانعام: 159) سیاسی گروہ بندی یا سیاسی پارٹیاں کی بھی اسلام میں کوئی جگہ نہیں اور یہ ہم نے جو سیاسی نظام اپنائے ہوئے ہیں یہ سراسر باطل اور کافرانہ نظام ہیں۔ جو آدمی جتنا زیادہ بہروپیا ہو گا وہی اتنا بڑا سیاستدان ہو گا اور ضیاء الحق سے بڑا سیاستدان ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوا کہ اس نے گیارہ سال سیاستدانوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا لیکن وہ بھی ایک غلط فہمی کا شکار تھا کہ اس سیاسی اکھاڑے سے وہ ''مثبت نتائج'' حاصل کرتا رہے گا اور ''مثبت'' سے ضیاء الحق کا مطلب قومی لحاظ سے مثبت نتائج نہ تھا بلکہ ضیاء الحق کے لحاظ سے مثبت نتائج تھے کہ وہ حکومت پر براجمان رہے۔

میں نے ضیاء الحق کو مجلس شوریٰ بنانے کا مشورہ دیا

یہی ہمارا بہت بڑا قومی المیہ ہے کہ جو حکومت میں آ جاتا ہے وہ ایسا آئین تیار کرتا ہے یا ایسے قانون بناتا ہے یا ایسے ذرائع پیدا کرتا ہے کہ وہ حکومت پر براجمان رہے جب انتخابات ہوں تو جو کامیاب ہوتے ہیں اس کے حساب سے انتخابات آزادانہ اور انصاف سے ہوئے تھے جو ہار جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ دھاندلی ہوئی ہے۔ اب اکثر رہنما عبرتناک انجاموں سے دوچار ہو چکے ہیں اور یہ عاجز پچھلے مضامین میں تفصیل لکھ چکا ہے لیکن کوئی سبق حاصل نہیں کرتا۔ اصل میں لیاقت علی کے وقت سے ایسے نااہل لوگوں کو حکومت مل رہی ہے اور ویسے قحط الرجال بھی ہے کہ جو آدمی حکومت کے ساتھ ذرا چمٹ جائے تو وہ کسی نہ کسی طرح حکومت کے ساتھ چمٹا رہنے کی تگ و دو میں رہتا ہے۔ اس عاجز نے ضیاء الحق کو بڑے تفصیلی خطوط لکھے کہ اول ضرورت ہے کہ ہم اپنے نفوس کو پہچانیں کہ ہم

کون ہیں کہاں سے آئے ہیں' ہمارے پیدا ہونے کے مقاصد کیا ہیں اور ہم اسلامی فلسفہ حیات کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اپنے تمام اعمال کو اس فلسفہ حیات کے تابع کریں اور ان اصولوں کے تحت اپنے لئے سیاسی فلسفہ متعین کریں لیکن ضیاء الحق کہتا تھا کہ لوگوں کو روٹی کپڑا اور امن کی ضرورت ہے اور یہی زندگی کا بھی فلسفہ ہے اور سیاسی فلسفہ بھی ہے۔ ضیاء الحق کو ظفر احمد انصاری وغیرہ نے یہ تو باور کرا دیا تھا کہ اسلام اور مغربی طرز جمہوریت ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن چل پھر کر یہ نیم اسلامی علماء موجودہ جمہوریت کو کھینچ تان کر اسلامی بنانے پر لگے ہوئے تھے جس کے بارے اس عاجز نے جیسے ضیاء الحق کو کئی دفعہ لکھا وہ سب لوگ اسلامی نظام متعین کرنے میں بری طرح فیل ہوئے اور ضیاء الحق اس باطل مغربی جمہوری نظام میں ''مثبت نتائج'' نہ حاصل کر سکا کہ اس کی نیت میں بھی ''ترجیح'' اس کے اپنے اقتدار کو تھی اور اسلامی نظام کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ اس عاجز نے کئی خطوط میں ضیاء الحق کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ جب وہ منظر سے ہٹے تو پاکستان میں ایسا نظام موجود ہونا چاہیئے کہ ذوالفقار بھٹو جیسا بے دین آدمی پاکستان کی حکومت پر براجمان نہ ہو جائے لیکن کیا ہوا ضیاء الحق نے کچھ بھی تو نہ کیا کہ اس کے جانے کے بعد غدار بھٹو کی مکار بیٹی کچی بچی بے نظیر برسر اقتدار آ گئی جس نے کھلم کھلا اسلامی سزاؤں کو ظالمانہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور حضور پاک ﷺ کے احکام کی نافرمانی کی اور حدود کے تحت کفر کا فتویٰ لگا کر اس پر مرتد ہونے کا مقدمہ چلنا چاہیئے تھا لیکن پاکستان اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا راز ہے کہ اللہ تعالیٰ بار بارہمیں اسباق سکھلانے کیلئے اچھی اور بری مثالیں پیش کر رہا ہے کہ کون خوش قسمت ان ''مواقع تقدیر'' سے فوائد اٹھاتا ہے۔ یہ عاجز ہر معاملہ کی افادیت اور اچھائی اس کے نتائج سے نکالتا ہے۔ تو ضیاء الحق کوئی ایسا کام نہ کر گیا جس کا اچھا نتیجہ نکلا ہو بلکہ کچھ لوگوں کو اسلام پر شکوک پڑ گئے کہ ضیاء الحق اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے چنیدہ یا ''اولی الامر'' کہتا تو سوال اٹھا کہ کیا اللہ تعالیٰ ضیاء الحق جیسوں کو چنا ہے؟

اور لوگوں نے بھی ضیاء الحق کو تجویزیں دی ہوں گی لیکن اس عاجز نے شاید سب لوگوں سے پہلے ضیاء الحق کو ''مجلس شوریٰ'' کی تجویز دی تھی کہ قرآن پاک کی سورہ آل عمران اور سورہ الشوریٰ کے مطابق مشورہ' اللہ تعالیٰ کے امر کو جاری کرنے کے طریقہ کے بارے ہوتا ہے۔ ہمارا قانون قرآن پاک کے امر با المعروف اور نہی عن المنکر کے تحت تشکیل کیا جائے۔ اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے محدود لوگوں کی ایک مجلس شوریٰ بنائی جائے۔ جس میں ہر ضلع سے ایک یا دو اضلاع کو ملا کر ان میں سے ایک ''صائب رائے'' والا صاحب پہلے نامزد کیا جائے اور پھر اس اکیلے کیلئے ''ہاں یا نہ'' کے تحت چناؤ ہو۔ ایسے سب صاحبان کو اسلامی فلسفہ حیات پر مکمل عبور ہو۔ کچھ ماہرین ہوں۔ یعنی سائنس دان' ٹیکنیکل آدمی' کچھ دانشور ہوں۔ ایسے سب لوگ پہلے نامزد کئے جائیں۔ اور پھر اپنے علاقوں سے یا متعلقہ ماہرین سے ان کا ''ہاں یا نہ'' کے ذریعہ چناؤ بھی ہو۔ اور ساری تعداد ساٹھ' ستر سے زیادہ نہ ہو۔ بہر حال ایک سینکڑہ سے تجاوز نہ کرے۔ ایسے لوگوں کو باقاعدہ ان کا خرچ پورا کرنے کے لئے تنخواہ ملے۔ لیکن یہ لوگ کبھی بھی وزارت کے امیدوار نہ بنیں۔ مجلس شوریٰ کو ''واچ ڈاگ'' کا کام کرنا چاہیئے۔ اور اس عاجز نے بڑی تفصیل سے وضاحت کی کہ مغربی جمہوریت ہمارے مزاج اور روایات کے خلاف ہے کہ اسلام کسی جغرافیائی نیشنلزم یا خطوں اور صوبوں کی ''قومیتوں'' کی سیاست کی اجازت نہیں دیتا۔ ہمیں اول بھی مسلمان اور آخر بھی مسلمان ہونا

چاہیئے اور کسی علاقے کا مسلمان کسی دور دراز علاقوں کے مسلمانوں کی نمائندگی کر سکتا ہے۔

سورۃ الانفال کی آیت مبارکہ 63 پر ہمارا سب کچھ قربان کہ رب کی ذات پاک نے ہمیں ایسے رشتہ میں گانٹھ دیا ہے اور ہمارے دلوں میں ایسی الفت ڈال دی ہے کہ جہاں دنیا کے تمام خزانے ایسی الفت نہیں پیدا کر سکتے۔ اگر پاکستان بنا کر ہم پاکستان کے لوگوں میں یہ الفت پیدا نہیں کر سکتے تو قصور ہمارا ہے۔ ہم نے تو ایسی الفت ساری امت میں پیدا کرنا ہے۔ افسوس کہ سیاسی رہنما تو ''فصلی بٹیرے'' ہیں۔ ہمارا مولوی یا دینی جماعتیں بھی یہ الفت نہیں پیدا کر سکے اور اس عاجز نے ضیاء الحق کو لکھا کہ یہ الفت پیدا کر کے وہ محدود لوگوں کی ایک مجلس شوریٰ تشکیل کرے۔ ضیاء الحق کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈئر ظہیر سے مجھے خبر ملی تھی کہ ضیاء الحق نے اسکے بعد مجلس شوریٰ بنانے کا فیصلہ کیا اور اس کے ممبروں کے ناموں کیلئے سب سے اوپر میرا نام لکھا اور میری تجویز کا خاکہ اپنے ''مشیروں'' کے حوالے کر دیا۔ اب ان لوگوں نے جو مجلس شوریٰ بنائی تو میری تجویز کے ''خاکہ'' کی ایسی تیسی کر دی اور پولیس کی مدد سے لوگوں کے نام لے کر ایک نامزد ''قومی اسمبلی'' بنا دی۔ اور اپنے جاننے والوں کو اس کا ممبر بنا دیا۔ اور میرا نام بھی ممبروں کی فہرست سے کاٹ دیا۔ اور ضیاء الحق کو اس کے ''مشیر'' باور کرا سکے کہ اگر میجر امیر افضل، مجلس شوریٰ میں آ گیا تو صرف اسی کی بات چلے گی اور وہی آدمی بات کر سکے گا جو اس کی ہاں میں ہاں ملائے گا۔ ساری فوج کو تجربہ ہے کہ جنگی مشقوں کے ''پوسٹ مارٹم'' سے اس کو دور رکھا جاتا تھا کہ سب کی ''ایسی تیسی'' کر دیتا تھا۔ ستمبر 65ء کی جنگ کے بعد پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور لاہور کے بڑے بڑے کمانڈر اس کے سامنے سے ''فرار'' اختیار کر رہے تھے۔ یحییٰ خان اور ذوالفقار بھٹو جیسے ملک کے سربراہ اس کے سامنے ''تھتھانے'' لگے یا ''تھرتھرانے'' لگے۔ اس نے یہ مجلس شوریٰ کی تجویز اسی وجہ سے دی ہے کہ وہ ''اہمیت'' حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس مجلس کی ''میٹنگیں'' One Man show بن جائیں گی۔ قارئین! اب جو مجلس شوریٰ نامزد کی اس کے لوگ عام چنے ہوئے ممبروں کی نسبت بہتر لوگ تھے۔ اور بحث و مباحثہ کا ریکارڈ دیکھا جائے تو عام اسمبلیوں کی ''بحثوں'' سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ اور ملکی معاملات خوب طور پر سامنے آئے۔ لیکن بڑے مقاصد واضح نہ تھے۔ تو یہ بحث مباحثے بھی ''بحث برائے بحث'' یعنی ''نشتہ'' اور ''گفتہ'' کی حد کو تک پہنچتی اور اس مجلس نے بھی باطل مغربی جمہوری نظام کو اپنانے کی سفارش کر دی کہ پوری مجلس میں ایک دو آدمی کراچی کے شاہ بلیغ الدین اور جہلم کے راجہ محمد افسر اس پہلو کو سمجھتے تھے کہ مغربی جمہوری نظام میں لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا ''شریک'' بنا دیا جاتا ہے اور حاکمیت یا اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے یا لوگوں کی۔ دونوں کو اس میں ''ساجھ کھاتہ'' نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن نہ ان کی آواز زور دار تھی۔ نہ وہ صاحبان مغربی جمہوریت کے منفی پہلوؤں کو پوری طرح واضح کر سکے اور نہ اسلام کے مثبت پہلو کہ لوگوں کی حکومت میں شمولیت کیسے ہو۔ تو وہ لوگ خود بھی نہ سمجھتے تھے۔ دراصل دو آدمی ظفر احمد انصاری اور مظہر ندوی جنہوں نے مسلمان دانشوروں کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا' وہ ضیاء الحق کو یہاں تک تو صحیح طور پر باور کرا سکے کہ مغربی جمہوری نظام اسلام کی ضد ہے یا غیر اسلامی ہے۔ لیکن اسلامی نظام کے خدوخال کیا ہیں یا اس کا ''خاکہ'' کیا ہے؟ یا مسجد یا محلّہ کی سطح سے اور ملک تک اولی الامروں کے ذریعہ سے پوری قوم کو ''حزب اللہ'' بنا کر اسلامی نظام کیسے چلایا جاتا ہے اس ''خاکہ'' سے وہ خود نابلد تھے۔ وہ باطل مغربی جمہوری نظام پر چند اسلامی ''لیبل'' لگا کر اس

جمہوریت کو اسلامی بنانا چاہتے تھے۔ جیسے سؤر پر تکبیر پڑھ کر اُس کا گلا کاٹ دیا جائے اور اعلان کر دیا جائے کہ وہ ''حلال'' ہو گیا ہے۔ اس لئے ضیاء الحق کے سارے تجربے ''لاحصل مشقیں'' ثابت ہوئیں۔ چنانچہ ضیاء الحق نے جھوٹ کے سلسلہ کو جاری رکھتے۔ 1973ء کے آئین کے تحت پارلیمانی نظام کو جاری رکھتے ہوئے 1985ء میں غیر جماعتی انتخابات کرا دیئے۔ تو مزید تین سال نکال لئے۔ اگر جماعتی انتخابات ہوتے تو صورت حال اور زیادہ گمبھیر ہو جاتی جیسی آج کل ہے۔

سیاستدانوں میں اکثر لوگ کم فہم ہوتے ہیں

عراق اور ایران محاذ پر خلفاء راشدین کے زمانے کے ایک سپہ سالار اور اسلام کے عظیم فرزند جناب مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث کی ایرانی شہنشاہ یزدگرد کے سپہ سالاروں شاہ بزار وغیرہ سے جو خط و کتابت ہوئی وہ بڑی دلچسپ ہے کہ ایک خط کے الفاظ ہیں کہ جس ملک کا بادشاہ یا سربراہ جھوٹ بولے وہ ملک زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ پاکستان اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا راز ہے کہ اس ملک میں جتنے جھوٹ بولے گئے ہیں۔ یہ عاجز اکثر واقعات پر تبصرہ کر آیا ہے اور یہ سلسلہ آج کل بھی زور شور سے جاری ہے۔ لیکن رب کی ذات پاک نے پاکستان کو قائم رکھا ہوا ہے۔ بہرحال ضیاء الحق صاحب تین ماہ کے بعد انتخابات کرانے کے وعدہ کا اعلان کر کے حکومت پر جولائی 1977ء میں براجمان ہوئے تھے۔ یہ عاجز بھی اس وقت تک وردی میں تھا اور جان بوجھ کر محکمہ تعلقات عامہ میں چلا گیا۔ جہاں بریگیڈئر تفضل صدیقی اور ونگ کمانڈر محمد افضل اخبار نویسوں کو ''تسلیاں'' دے رہے تھے کہ بس وہ انتخابات کا انتظار کریں اور اخبار نویس خوش ہو رہے تھے لیکن جب کچھ سنجیدہ اخبار نویسوں نے میرے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دیکھی۔ تو وہ میرے ''گرد'' ہو گئے کہ سچ بتاؤ کیا ہو گا؟ میں نے کہا کہ ''میاں لمبی تان کر سو جاؤ اور انتخابات کو بھول جاؤ'' کچھ نے لقمہ دیا کہ ضیاء الحق باعمل مسلمان ہے اور اسلام میں وعدہ کا بڑا پاس ہوتا ہے۔ اس عاجز نے سب کو بتا دیا کہ ضیاء الحق کے کئی ''چہرے'' ہیں۔ وہ اگر مسلمان ہے تو ساتھ ''سیاستدان'' بھی ہے۔ اور سیاست میں آپ لوگ خود مانتے ہیں کہ کوئی حرف آخر نہیں ہوتا۔ اس لئے جو وعدہ ضیاء الحق آج شام کو کرے گا، ممکن ہے کل صبح وہ اس کے تضاد میں وعدہ کر دے۔ اور قارئین! ضیاء الحق کا سارا زمانہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ میں پاکستان کی تاریخ نہیں لکھ رہا۔ خاص خاص واقعات کا بامقصد تجزیہ کر رہا ہوں۔ کہ ضیاء الحق کس طرح ہر روز ''پینترے'' تبدیل کرتا تھا کہ اس کو بھی ایوب خان اور یحییٰ خان کی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ سیاستدانوں میں اکثر لوگ کم فہم اور فصلی بٹیرے ہیں۔ ہر سیاستدان کی ''قیمت'' ہوتی ہے۔ لیکن ایوب خان نے پہلے کئی سال سیاستدانوں کو اپنے سے ''دور'' رکھا۔ اور ان کو ڈرا دھمکا کر یا نااہل قرار دینے کا خطرہ پیدا کر کے کام چلاتا رہا۔ اور بعد میں ان کو ''قیمت'' ادا کر کے اتنا عرصہ حکومت کر گیا۔ یحییٰ خان ذرا سیاستدانوں کو جلدی سمجھنے کی وجہ سے تکبر میں آ گیا کہ میں سیاستدانوں کو آپس میں لڑا کر حکومت پر براجمان رہوں گا تو وہ خود بھی بری طرح مار کھا گیا۔ اس لڑائی اور انتشار نے ملک کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ضیاء الحق نے جنرل غلام حسن کے ذریعہ سے مجھ سے جو مسودہ منگوایا۔ جو میں نے 5 اکتوبر 1970ء کو یحییٰ خان کو دیا تھا۔ اس میں اسلام کے نفاذ کے علاوہ یہ تمام تر پس منظر بھی لکھے ہوئے تھے اور ضیاء الحق نے ان باتوں سے یہ ''فائدہ'' اٹھایا کہ پہلے دن سے سیاستدانوں اور

مذہبی جماعتوں کو ''قیمت'' ادا کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور 1979ء میں بڑے سیاستدان بھٹو کو پھانسی بھی چڑھا دیا اور پورے ملک میں کسی نے ''چوں'' بھی نہ کی۔ بلکہ سیاستدان اور کئی دانشور اور عام لوگ ''سہم'' گئے تھے۔ میں ان دنوں وردی اتارنے والا تھا۔ شام کو بازار میں پیدل چل نکلا۔ ایک دو اخباروں کے دفتر میں بھی گیا۔ ایک آدھ نیوز ایجنسی کا چکر بھی لگایا۔ لوگوں کے منہ سے بات تک نہ نکل رہی تھی۔ یہ تھی ضیاء الحق کی ''سیاست'' ہر جگہ یہ عاجز نارمل حالات میں جب لوگوں سے الگ ہوتا تھا تو لوگ ''حیران'' ہوتے تھے کہ یہ آدمی تو ''ہوش'' میں ہے۔ اکثر لوگ ہوش وحواس کھو چکے تھے۔ پھر ضیاء الحق کی قسمت اچھی تھی کہ روس، افغانستان میں پھنسا ہوا تھا۔ امریکہ والوں کو ضیاء الحق کی ''ضرورت'' تھی۔ روس والے پاکستان سے سخت ''نالاں'' تھے۔ انہوں نے بھارت کو شہ بھی دی کہ وہ پاکستان پر حملہ کرے۔ لیکن بھارت کا وزیراعظم مرار جی ڈیسائی تھا اور وزیر خارجہ بھارت کا سابق وزیراعظم واجپائی جو امریکہ کے ''آدمی'' تھے تو انہوں نے پاکستان پر حملہ کرنے سے انکار کر دیا پاکستان اللہ تعالیٰ کا ایک راز ہے۔ اس کی حفاظت رب کی ذات پاک ازخود کئی ذرائع پیدا کر کے کر رہی ہے کہ ضیاء الحق نے چپکے سے نیوکلیئر طاقت حاصل کرنے پر دوبارہ کام شروع کر دیا اور مرار جی کو شکست دے کر اندرا گاندھی جب دوبارہ وزیراعظم بنی تو مشہور ہو چکا تھا کہ پاکستان نے بھی نیوکلیئر طاقت حاصل کر لی ہے۔ ساتھ ہی ضیاء الحق نے ''جیم'' جالندھر نیٹ پر سکھوں سے ''یارانہ'' گانٹھ لیا تھا۔ اور سکھ کہتے تھے۔ ضیاء الحق ہمارا ''متر'' ہے۔ تو ضیاء الحق نے اندرا گاندھی کو سکھوں کے ساتھ ''الجھا'' دیا تھا کہ فطرت کی ضرورت پوری ہو کہ پاکستان کی ''حفاظت'' ہوتی رہے۔ اور اس ''الجھاؤ'' میں اندرا گاندھی اپنی زندگی کی بازی بھی ہار گئی کہ پاکستان کے ہر دشمن کا خواہ بیرونی ہو یا اندرونی ہو اس کا عبرتناک انجام ہوتا ہے اگر مجیب کیلئے گولی تھی۔ بھٹو کیلئے پھانسی، تو اندرا گاندھی کو بھی اس کے گھر کے حفاظتی پہرہ داروں نے چھلنی کر دیا تھا اور بعد میں اندرا کے دونوں بیٹے سنجے اور راجیو طبعی موت نہ مرے۔ اور یہی کچھ ذوالفقار بھٹو کے دو بیٹوں کے ساتھ ہوا۔ پاکستان کے دشمنوں کے ایسے ''حشر'' بڑے سبق آموز ہیں کہ اس سے پہلے پاکستان کے دو بڑے دشمن افغانستان کا سردار داؤد اور اس کا بھائی نعیم اپنے ''ساتھیوں'' کے ہاتھوں اپنے حشر کو پہنچ چکے تھے (فاعتبروا یا اولی الابصار)

ضیاء الحق کو اس کے ''مشیروں'' نے خاص کر اور مجلس شوریٰ کی سفارشات نے مجبور کر دیا تھا کہ انتخابات اس زمانے کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اگر وہ مجھ سے مشورہ کرتا تو میں اس کو سمجھاتا کہ اسلام اس قسم کے کسی کام کی اجازت نہیں دیتا خواہ انتخابات ہوں یا کوئی کام جس سے امت میں تفرقہ پیدا ہو۔ یہ ''حزب اختلاف'' یا ''حزب اقتدار'' کے الگ الگ گروہ ہونے غیر اسلامی اصول ہیں۔ اسلام نہ کسی سیاسی گروہ بندی کی اجازت دیتا ہے نہ اس طرح لوگوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ پر کھڑا ہونے کی اجازت ہے جس سے قوم میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اور اسلام بے دین لوگوں کو قوم کا رہنما بننے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ اور میں نے ضیاء الحق کو مجلس شوریٰ بنانے کی جو تجویز بھیجی تھی۔ اس میں اسلامی انتخابات کے طریقے کو واضح کیا تھا۔ جس کے ''خاکہ'' کی ضیاء الحق کے مشیروں نے ''ایسی تیسی'' کر دی تھی کہ اگر جمہوریت سے صرف یہ مطلب لیا جائے کہ لوگوں کو کلمہ حق کہنے کی اجازت ہو اور ہر آدمی کے بارے وہ رائے دے سکیں کہ وہ ان کا رہنما بن سکتا ہے یا نہیں تو اسلام بڑا ''جمہوری'' دین ہے۔ لیکن

اسلام کو اسلام ہی کہیں گے۔ یہ صراط مستقیم ہے۔ اس میں کوئی ''انقلاب'' نہیں یعنی نہ پیچھے مڑنا ہے نہ اوندھے منہ گرنا ہے۔ نہ مادر پدر آزادی ہے۔ اس لئے غیروں کی باطل اصطلاحوں کو اسلام کیلئے ''اسم صفت'' کے طور پر نہ پیش کیا جائے کہ اسلامی انقلاب آ گیا۔ یا یہ اسلامی سوشلزم ہے یا اسلامی جمہوریت ہے'' اسلام ازخود ایک مکمل اصطلاح ہے اور اللہ تعالیٰ کا دین ہے۔ (سورہ آل عمران 19) لیکن ضیاء الحق ایک کافرانہ نظریہ اپنا کر 1985ء میں انتخابات میں ''چھلانگ'' لگا بیٹھا۔ لیکن ایک عقل مندی کی کہ انتخابات جماعتی کرا دیتا تو جس طرح پچھلے ایک سال سے ''گو مشرف گو مشرف'' کے نعرے لگ رہے ہیں۔ 1985ء ہی میں ''گو ضیا گو ضیا'' کے نعرے شروع ہو جاتے۔ غیر جماعتی انتخابات کرانے کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ پیپلز پارٹی اور کئی بے دین سیاسی جماعتوں نے انتخابات میں حصہ نہ لیا تو ضیاء الحق کچھ ''بچ'' گیا۔ اور تین سال نکال گیا لیکن فطرت بھی لمبی رسی نہیں دیتی کہ ضیاء الحق گیارہ سال سے اسلام کے ساتھ بھی ''فراڈ'' کر رہا تھا اور بے دین نظاموں کا بار بار تجربہ کر رہا تھا اور 1988ء میں بھی انتخابات کا وعدہ کر رہا تھا اگر جھوٹ مار رہا تھا تو یہ کچھ بھی فطرت کو منظور نہ تھا۔ امریکن بھی دل سے ''ناراض'' تھے کہ ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ ضیاء الحق نے چوری چوری نیوکلیئر طاقت حاصل کر لی ہے۔ اور افغانستان میں امریکہ والے جو بے دین نظام نافذ کرنا چاہتے تھے۔ ضیاء الحق اس میں بھی ''روڑے'' اٹکا رہا تھا۔ سٹیج ہر طرف سے ''تیار'' تھی کہ اگست 1988ء میں ضیاء الحق بھی اپنے ''پرخچے'' اڑوا بیٹھا۔ جس کی اس عاجز کو کچھ آگاہی مارچ 1988ء میں روضہ رسول ﷺ پر ہو گئی تھی کہ میں بڑا ''نادم'' ہو رہا تھا کہ ضیاء الحق کے پرتو ''کٹتے'' نظر آئے لیکن میرے منہ سے کوئی مثبت بات بھی نہ نکل سکی کہ ربّ نبی محمد ﷺ اب تو کوئی اللہ والا آ کر ہماری کمانڈ سنبھال لے کہ شاید اس میں کچھ دیر تھی۔ لیکن اب تو معاملات نزدیک پہنچ گئے ہیں اور امید واثق ہے کہ عشق بلاخیز کا قافلہ سخت جان جلد ظاہر ہو جائے گا۔

ضیاء الحق کو اس عاجز نے کیا کچھ نہ لکھا یہ سب باتیں ایک کتاب کا مضمون ہیں اور ہر خط کا کچھ پس منظر ہوتا تھا۔ 80-1979ء میں معلوم ہوا کہ ضیاء الحق نے ایک ریٹائرڈ میجر جنرل شوکت رضا کو ستمبر 65ء کی جنگ کی تاریخ لکھنے کا ٹھیکہ دیا ہے۔ یہ جنرل شوکت وہی تھا جس کے سلسلہ میں یہ عاجز مشرقی پاکستان سے ناکام واپس آنے کا ذکر اپنے مضامین میں کر چکا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کا دلدادہ تھا۔ تمام ترقیاں منہ بنا کر انگریزی بولنے کی وجہ سے حاصل کی تھیں۔ ضیاء الحق نے پاکستان کی تینوں جنگوں میں کوئی خاص حصہ نہ لیا تھا۔ البتہ ستمبر 65ء کی جنگ کی تاریخ لکھانے میں ضیاء الحق کے سامنے کچھ ''مقاصد'' تھے جو بیان آگے خود کھل کر قارئین کے سامنے آ جائے گا۔ اتفاقاً محکمہ تعلقات عامہ میں راقم کی میجر جنرل شوکت رضا کے ساتھ ملاقات ہو گئی اور میں نے اس کو اس ''سعادت'' پر مبارک دی اور بغیر کسی لالچ اور معاوضہ کے اس عاجز نے شوکت رضا کو اپنی خدمات پیش کر دیں کہ یہ عاجز ستمبر 65ء جنگ پر کافی ''تحقیق'' کر چکا ہے۔ شوکت رضا جو اپنے آپ کو ہر پہلو میں بڑا ''پھنے خان'' اور دانشور سمجھتا تھا۔ اس کو ایک چھوٹے سے میجر کی طرف سے ''تحقیق'' کا لفظ بڑا عجیب نظر آیا۔ اور اس نے مجھ سے میری ''تحقیق'' کی فوٹو کاپیاں مانگ لیں اور اس نے جب یہ ''تحقیق'' پڑھی۔ تو وہ حیران ہوا کہ ستمبر 65ء کی جنگ کی بنیادی طور پر اتنی گہری تحقیق ہو چکی ہے۔ جب میرے ساتھ اس کی دوسری ملاقات ہوئی تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ

مجھ سے ''جان'' چھڑانا چاہتا تھا۔ تو اس عاجز نے گزارش کر دی کہ جناب جنرل صاحب میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس ''تحقیق'' کو اور زیادہ ''بامقصد'' شکل وصورت دے سکیں گے۔'' تو اس نے تیوری چڑھائی اور کہنے لگا کہ اتنے سال نوکری کر کے وہ جھاڑ نہیں پھونکتا رہا۔ تو اس عاجز نے سیدھی گزارش کر دی کہ اس عاجز نے جو لفظ ''بامقصد'' استعمال کیا ہے تو میرا اس میں مطلب یہ ہے کہ ستمبر 65ء کی جنگ میں ہم نے اسلامی فلسفہ حیات اور اسلامی طرز جنگ کو نظر انداز کیا یا اس سے بے اعتنائی برتی اور کون کون سی اسلامی اقدار کو پامال کیا اور اب نشان راہ کیا ہے۔ یہ سب کچھ سن کر وہ مجھ پر ''برس'' پڑا کہ مجھ پر ہمیشہ اسلام کا خبط سوار ہے۔ بھلا اس زمانے کی پیشہ ورانہ جنگوں کا اسلام کے ساتھ کیا واسطہ ہے؟

یہ باتیں میری برداشت سے باہر تھیں میں نے شوکت رضا کو کہا میں آج ہی جنرل ضیاء الحق کو خط لکھ کر پورا پس منظر بیان کر کے تمہاری اسلام سے اس ''دوری'' کی اطلاع دوں گا اور جنرل سوار خان کو اس خط کی کاپی بھی دوں گا۔ بلکہ اس خط کو فوج میں بھی ''سرکولیٹ'' کروں گا اور پھر 3 جولائی 1980ء کو اس عاجز نے چار صفحات کا ایک انگریزی میں خط لکھ دیا، جس کی کاپی آج بھی میرے پاس موجود ہے اور اس زمانے میں اس عاجز نے اس خط کی ایک ہزار کاپیاں فوجی یونٹوں کو بھیجیں اور شوکت رضا کو بھی کاپی دی۔ خط میں اس عاجز نے پورا پس منظر لکھا کہ شوکت رضا اور میرے درمیان کیا بات ہوئی اور مزید لکھا کہ شوکت رضا بامقصد تاریخ نہیں لکھ سکتا اور گزارش کی کہ بامقصد تاریخ لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم جہاد کے نظریہ کو سمجھیں کہ اس سے کتنی روگردانی ہو رہی ہے ہمارا فوجی ریکارڈ کچھ اچھا نہیں۔ ہم نے قائداعظم کا حکم نہ مانا اور بروقت 1947ء میں کشمیر میں فوج نہ داخل کی اور جب داخل کی تو بڑے بھونڈے طریقے سے کی اور مجاہدین نے جو دوتہائی کشمیر حاصل کر لیا تھا، اس کو بھی ہم نے ''کھو دیا'' اور بھارت کی مرضی کے وقت فائر بندی کر کے عملی جہاد کو جمود دے دیا۔ ستمبر 65ء کی جنگ سے پہلے بھی نظریہ جہاد کی طرف دھیان نہ دیا اور جنگ میں عملی طور پر ہم ...... لوگوں نے جذبہ جہاد کو اپنا کر کے اور اللہ تعالیٰ کے راستے پر لڑنے مرنے کے عقیدہ کو اپنا کر کے ملک کو بچا لیا۔ ورنہ اوپر والی سطح پر وہی چال بے ڈھنگی جاری رہی جواب بھی جاری ہے۔

قارئین۔ میں آپ کو باور کرانا چاہتا ہوں کہ یہ عاجز یہ حقائق آج کل آپ کے سامنے پیش کر کے کوئی ''سرخروئی'' حاصل نہیں کر رہا۔ رب کی ذات پاک نے مجھے ہمیشہ کلمہ حق بلند کرنے کی سعادت فرمائی اور آپ حیران نہ ہونا ضیاء الحق نے یہ خط ''اکنالج'' تک نہ کیا۔ البتہ فوج کی کافی یونٹوں اور اداروں میں یہ خط پہنچ گیا۔ تو انہوں نے جی ایچ کیو کو رپورٹیں دیں کہ ان کو ایک ایسا خطا ملا ہے۔ تو کچھ ہیڈ کوارٹروں نے اپنی یونٹوں کو ایک خط لکھا کہ میجر امیر افضل جنون کے حد تک ایک جذباتی آدمی ہے۔ اس کی تحریروں کو زیادہ خاطر میں نہ لایا جائے۔ لیکن معلوم نہیں کس کی ہدایت سے ISI کے کچھ لوگوں نے بڑے اوچھے طریقے سے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا تو اس عاجز نے جنرل ضیاء الحق کو ایک اور خط لکھا جس کی کاپی ISI کے ڈی جی کو بھی دی اور ایسے چار پانچ جنرلوں کو بھی دی جو کسی زمانے میں جونیئر افسران کے طور میرے ماتحت نوکری کر چکے تھے اور لکھا کہ اگر میں نے یہ خط لکھ کر کوئی غلطی کی ہے تو مجھ پر مقدمہ چلایا جائے یہ ''اوچھے ہتھکنڈے'' نہ استعمال کئے جائیں تو پھر آئی ایس آئی کی

طرف سے ایک میجر عامر نے میرے ساتھ آ کر ملاقات کی اور معذرت کی کہ یہ کچھ غلط فہمی کی وجہ سے ہوگیا ہے آئندہ ایسا نہ ہوگا۔ یہ میجر عامر وہی ہیں جو بعد میں نواز شریف کے "خاص الخاص" آدمی بنے رہے اور جب پیپلز پارٹی کی حکومت آتی تھی تو کئی دفعہ زیر زمین چلے جاتے رہے۔

شوکت رضا نے ایک 290 صفحات کی "بے مقصد" سی کتاب لکھی کہ ہماری "عظیم قربانی" کو ان الفاظ میں لکھا گیا "پلٹن" اچھی طرح لڑتی رہی لیکن معلوم نہیں کیا ہوا کہ آخری دو تین دنوں میں اپنا اتنا نقصان کرا بیٹھی اول تو "پلٹن" والی بات غلط تھی۔ ہماری صرف دو کمپنیاں تھیں یہ تو بھارتی میڈیا نے ہمیں پاکستان کی پوری پلٹن یا "کریک بٹالین" کا نام دیا کہ آخری تین دنوں میں ہمارے سامنے ان کی دو بریگیڈ فوج تہس نہس ہوگئی تھی۔ 21 اپریل 1969 کو بھارتی لوک سبھا میں سناٹا چھا گیا تھا جب فرینک انتھونی نے اعلان کیا کہ واہگہ محاذ پر ستمبر 65ء کی جنگ کے آخری دنوں میں بھارتیوں کے "خودکشیوں" والے حملوں سے ان کے ہزاروں "سورما" کھیت رہے۔ اور یہ عاجز اپنے مضامین میں پوری تفصیل لکھ چکا ہے کہ بھارتیوں نے جھوٹ بولا ہوا تھا کہ ان کا شالامار باغ پر قبضہ ہے اور اس کو سچ ثابت کرنے کیلئے دو بھارتی بریگیڈوں نے پورے کور کے توپخانہ کی مدد سے اور دو بکتر بند یونٹوں کی مدد سے ہمیں تہس نہس کرنے کی تجویز بنائی۔ اور اس کے تباہ کن فائر کی تاب نہ لا کر ہمارے پیچھے والے ہمارے بکتر بند دستے بھی ہماری مدد سے "فرار" اختیار کر گئے۔ فائر بندی سے چوبیں گھنٹے پہلے ہم نے لیفٹیننٹ بعد میں کرنل افتخار کو بھیج کر قیوم شیر کو صورت حال سے آگاہ کیا' کہ وہ ہماری مدد کرے۔ ورنہ ہم تہس نہس ہو جائیں گے۔ اور قیوم شیر نے کوئی مدد نہ کی۔ ہمارا اتنا نقصان ہو چکا تھا کہ ہم پسپائی اختیار کرنے میں حق بجانب تھے۔ لیکن ہم نے آخری گولی اور آخری جوان تک لڑنے کا فیصلہ کیا۔ تو دشمن نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ لیکن دشمن بی آر بی پر قبضہ نہ کر سکا۔ اس گھمسان کی جنگ میں ہم نے دشمن کا اپنے سے دس گنا زیادہ نقصان کیا۔ اور بے شک عظیم قربانی دے کر ہم میں سے صرف چند مجاہدین راقم سمیت دشمن کا گھیرا توڑ کر بی آر بی پر فائر بندی تک دوسری دفاعی لائن بنا سکے۔ اور جنگ کے بعد پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ اور ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ میں اپنے اوپر والوں' برابر والوں اور ماتحتوں کو اپنے بہادری کے تمغے دلا سکا۔ جن میں چھ افسران ہیں۔ اور میں تو باقی مددگار یونٹوں کو بھی بہادری کے تمغے دلانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ لوگ اوپر والوں سے ڈر گئے کہ میں اوپر والوں کا ناپسندیدہ تھا۔ شوکت رضا نے بڑی "ڈھٹائی" سے ان سچے واقعات کو "نظرانداز" کر دیا۔

لیکن ضیاء الحق کی بلا سے اس کو نہ سچ اور حقائق تلاش کرنے کی ضرورت تھی نہ اس کو جنگ کے نظریاتی پہلو میں "دلچسپی" تھی۔ اس کو کچھ "گواہیاں" چاہیے تھیں کہ بھٹو نے وزارت خارجہ کی طرف سے کچھ ہدایات دلوائیں کہ چھ ستمبر صبح تک لاہور محاذ خالی رکھا جائے۔ اور پانچ چھ ستمبر کو لاہور میں ایک بین الاقوامی لوگوں کی ڈنر پارٹی تھی۔ جس میں لاہور محاذ کے سینئر افسران کو مدعو کیا گیا تھا۔ اور کچھ غیر ملکی لوگ پانچ چھ ستمبر شام کو بھارت سے آئے اور ایک جیپ تھانہ مناواں آ کر کسی بہانے سے واپس چلی گئی۔ جس میں شاید سویلین کپڑوں میں بھارتی افسر تھے۔ جنہوں نے امرتسر واپس جا کر جنرل ہربخش سنگھ کو محاذ خالی ہونے کا بتایا۔ تو جنرل چودھری کو خبر دی گئی کہ "محاذ خالی ہے" تو پھر جنرل چودھری چون اور گلزاری نندا کی مدد سے شاستری کو جنگ میں "دھکا" دے سکا۔ کہ یہ

ضرورت شوکت رضا کی کتاب نے پوری کر دی۔ لیکن یہ ''متبادل'' ضرورت تھی کہ اگر بھٹو کو رضا قصوری کی باپ کے قتل کے مقدمہ میں پھانسی نہ لگائی جا سکی تو اس پر ستمبر 1965ء کی جنگ کے سلسلہ میں غداری کا مقدمہ چلایا جائے گا اور مزید دسمبر 1971ء کی جنگ یا بنگلہ دیش کو الگ کرنے کی سازش کے سلسلہ میں مقدمہ چلایا جاتا۔ لیکن یہ سارے ''مشکل'' مقدمے تھے کہ کئی دوسرے ''پردہ نشین'' بھی بیچ آ جاتے جن کو ہاتھ لگانے کے ''احکام'' نہ تھے۔ البتہ معاملات کو لمبا کرنے کیلئے ''گواہیاں'' اکٹھا کرنا ضروری تھیں۔ لیکن ججوں نے بھٹو کو پہلے مقدمہ میں پھانسی پر چڑھا دیا۔ تو ضیاء الحق نے اس کتاب میں مزید کوئی دلچسپی نہ لی کہ ضیاء الحق افواج کو ''نظریاتی' ہرگز نہ بنانا چاہتا تھا۔ اس سلسلہ میں صرف ''لیپا پوتی'' کی۔ اور ہم جنرل امیر حمزہ کے 1994ء کے جنرل وحید کاکڑ کو خط کا ذکر پہلے کر چکے ہیں کہ یہ ضیاء الحق ''جہادی فی سبیل اللہ اور ایمان وتقویٰ'' کے چھاونیوں میں بورڈ لگوا گیا ہے۔ یہ صرف ''لیپا پوتی'' ہے۔

اس عاجز کو ضیاء الحق کو ایک اور لمبا چوڑا خط لکھنے کا موقع سابق چیف جسٹس آنجہانی منیر کی کتاب ''جناح سے ضیا تک'' کے سلسلہ میں میسر ہوا۔ یہ عاجز اپنے پچھلے کئی مضامین میں ثابت کرتا آ رہا ہے کہ جسٹس منیر ایک چھپا ہوا قادیانی یا بے دین آدمی تھا۔ اس نے اپنی اس کتاب میں ''لادینی'' کے مقابلہ اور موازنہ میں اسلام پر بڑے رکیک حملے کئے تھے۔ اور عملی طور پر اسلام کے نفاذ کی سخت مخالفت کی اور پاکستان کی تاریخ کو بڑے منافقانہ انداز میں پیش کیا۔ لیکن پاکستان ٹائمز میں اس کتاب کا جو ''ریویو'' یا تبصرہ شائع ہوا۔ اس میں اس کتاب کو ایک بڑی اونچے پایہ کی تحقیق اور سچّی کتاب قرار دیا گیا کہ قوم کیلئے اس میں نشان راہ ہے۔ زیڈ اے سلہری پاکستان ٹائمز کا ایڈیٹر تھا۔ جس نے اپنے اوپر دائیں بازو والا ہونے کا ''لبادہ'' اوڑھا ہوا تھا۔ اور گو اس کی پرورش اور پیدائش ایک قادیانی خاندان میں ہوئی تھی۔ لیکن وہ کہتا تھا کہ وہ قادیانزم سے توبہ کر گیا ہے۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر معلوم تھا کہ سلہری نہ صرف ''بے دین'' تھا۔ بلکہ وہ ''باعمل'' مسلمان بھی نہ تھا۔ میں نے اس کو ایک لمبا چوڑا خط لکھا کہ جسٹس منیر کی کتاب نے پاکستان کے اسلامی نظریاتی پہلو کی ''ایسی تیسی'' کر دی ہے۔ اور اخبار کا ریویو لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ تو میں نے کتاب پر ایک ریویو لکھ کر بھیجا کہ یہ ریویو کے طور پر یا میرے خط کے طور پر شائع کیا جائے۔ لیکن سلہری نے خط نہ شائع کیا اور نہ جواب دیتا تھا۔ تو میں نے اس کو بریگیڈیئر تفضّل صدیقی سے فون کرایا کہ وہ اس سلسلہ میں انصاف کرے لیکن سلہری بات کو ٹال گیا کہ اب اور کچھ شائع نہیں ہو سکتا۔ تو اس عاجز نے پورا پس منظر بیان کرنے کیلئے ضیاء الحق کو خط لکھا کہ نیشنل پریس ٹرسٹ ایک قومی ادارہ ہے۔ اس کو قوم کے ہر فرد کی بات شائع کرنا چاہیے۔ خاص کر اگر کوئی پاکستان کے اسلامی نظریہ پر حملہ کرے تو اس کو ضرور ''خاموش'' کیا جائے۔ آپ سلہری کو حکم دلائیں کہ وہ اس کتاب کے سلسلے میں میرا نقطہ نظر بھی شائع کرے۔ ضیاء الحق کی طرف سے اس کے چیف آف سٹاف میجر جنرل کے ایم عارف نے بڑا ''حوصلہ افزا'' قسم کا جواب دیا کہ وہ سلہری کے ساتھ بات کریں گے اور وہ میرے ساتھ رابطہ باندھے گا یا میری تسلی کرے گا۔ لیکن کوئی کاروائی نہ ہوئی۔ عارف کے بارے میں یہ عاجز واضح کر چکا ہے کہ میرے لحاظ سے وہ بھی چھپا ہوا لاہوری قادیانی ہے۔ ضیاء الحق نے اس کو ''اجازت'' دے رکھی تھی کہ جس قسم کا معاملہ میں نے اٹھایا تھا تو عارف اس کی ''ٹال مٹول'' کر سکتا ہے یا ضیاء الحق خود اسلام کے نظریاتی پہلو کی صرف زبانی وکلامی پیروی کرتا تھا۔ اس عاجز نے ایک آدھ یاد دہانی کا خط بھی کے ایم عارف کو

لکھا۔ لیکن میں کوئی مقصد حاصل نہ کر سکا۔

بھارت میں رب کی ذات پاک مسلمانوں کی حفاظت کریگی

اس سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ جنرل ضیاء الحق نے کبھی بھی میری کسی گزارش پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا یا اثرات نہ لئے۔ یہ عاجز پہلے گزارش کر چکا ہے کہ جب آغا شاہی نے بیان دیا کہ وہ بھارت کی کافی ''غلط فہمیاں'' دور کر آئے۔ تو اس عاجز نے آغا شاہی کو جو خط لکھا اور ضیاء الحق کو بھی آغا شاہی کی اس ''کم فہمی'' کے بارے آگاہ کیا۔ تو ضیاء الحق نے فوراً کاروائی کی اور صاحبزادہ یعقوب خان کو وزیر خارجہ بنا دیا۔ جو میرے لحاظ سے کافی ''لیس بیشتی'' تھا۔ لیکن زبانی طور پر سوچ کر بات کرتا تھا۔ اور قارئین یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ 60-1959ء میں صاحبزادہ یعقوب خان میجر جنرل تھا اور ضیاء الحق کا ڈویژن کمانڈر کہ ضیاء الحق اس کے ماتحت ایک میجر اور ایک رجمنٹ کا سکواڈرن کمانڈر تھا۔ کمانڈنگ افسر بھی نہ تھا۔ تو ضیاء الحق کی ''شخصیت'' کا اندازہ بھی لگالیں کہ یہی صاحبزادہ صاحب کئی سال ضیاء الحق کے ماتحت کام کرتا رہا۔ بلکہ جنرل محمد موسےٰ کے مقابلہ میں تو ضیاء الحق ایک ''طفل مکتب'' رہا۔ اور یہی موسےٰ صاحب، ضیاء الحق کے ماتحت بلوچستان کی گورنری کرتا رہا۔ علاوہ ازیں ضیاء الحق کی بھارت کے ساتھ پالیسی اور برتاؤ پر کوئی انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی۔ جب تک بھارت اور ہندوؤں کی یہی ذہنیت رہے جو پچھلی نصف صدی سے زیادہ عرصہ میں ہم دیکھ رہے ہیں تو یہ بول بڑا صحیح ہے ''ہندو کا جو یار ہے وہ غدار ہے'' ضیاء الحق نے بھارتیوں اور ہندوؤں کو اپنے ''مقام'' پر رکھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بھارت والوں کو ضیاء الحق بڑا ''چُبھتا'' تھا۔ پس قرآن پاک کے اکثر مقامات اور خاص کر سورۃ الفتح کے الفاظ ''لِیَغِیظَ بِهِمُ الْكُفَّار'' کو یاد رکھیں۔ حضور پاک ﷺ کے جن غلاموں کو دیکھ کر کفار کو تکلیف ہوتی ہے یا غصہ چڑھتا ہے وہی صحیح مسلمان ہیں۔ بھارتی اور ہندوانہ ذہنیت پر پروفیسر منور مرزا اور یہ عاجز بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ لیکن افسوس کہ مومن کی فراست سے عاری ہمارے لوگ بھارتیوں کے ساتھ صحیح برتاؤ نہیں کرتے۔ بھارت کے جو لوگ یہاں ''ٹریک ٹو ڈپلومیسی'' پر آتے ہیں۔ ان کے بیانات پڑھ کر اس عاجز کو آگ لگتی رہتی ہے۔ کہ ایک سانس میں کہتے ہیں کہ ہم پاکستان کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی کہ دیتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد پر وہ بھارت کا مزید بٹوارا نہیں چاہتے اور نہ ہی مذہب کی بنیاد پر کشمیریوں کو بھارت سے الگ ہونے کی اجازت دیتے ہیں کہ پھر بھارت میں بسنے والے باقی پندرہ کروڑ مسلمانوں کیلئے بھارت میں ٹھہرنا مشکل ہو جائے گا۔ تو ان کو آگے سے سیدھا جواب دینا چاہیے کہ وہ لوگ واپس بھارت جائیں اور اپنی قوم کو سمجھائیں کہ جس ''حقیقت'' کے تحت پاکستان وجود میں آیا۔ وہ باب ابھی تک نامکمل ہے۔ ہم لوگ مسلم اکثریت والے کشمیر کے علاقے میں جلد سے جلد پاکستان کے حوالے کریں کہ ہم نے وہاں غاصبانہ قبضہ جمایا ہوا ہے۔ باقی رہا بھارت میں مسلمان اقلیتوں کا سوال۔ تو رب کی ذات مسلمانوں کی حفاظت کرے گی۔ بہار اور بنگال میں تو آج کل صرف وہ لوگ صوبائی حکومت بنا سکتے ہیں جن کو مسلمان ووٹ دیں۔ جلد یہ صورت حال یو پی اور مدھیہ پردیش میں بھی حقیقت بننے والی ہے۔ جنوب میں کچھ صوبوں اور حیدر آباد دکن کے گرد و نواح میں مسلمان طاقت پکڑنے والے ہیں۔ اور اب ان علاقوں میں ہندو مسلم فساد نہیں ہوتے۔ گجرات میں جہاں ہندو مسلم فسادات ہو رہے ہیں کچھ مسلمان نوجوان مرنے مارنے پر تیار ہو گئے ہیں اور

انشاء اللہ ایک دن اس برصغیر اور خاص کر بھارتی علاقوں کو کفر سے پاک ہونا ہے۔ اور وہ وقت نزدیک ہے صرف پاکستان میں عملی اسلام کے نفاذ ہونے کی دیر ہے۔ اس کے بعد افسانوی عقائد والا ہندومت یا ہندو مذہب۔ جہاں ذات پات کے اصول کے تحت اقلیت میں ہوتے برہمنوں کا راج ہے یہ سسٹم بہت جلد اپنی موت آپ مر جائے گا۔ اور برصغیر ہندو پاکستان کفر سے پاک ہو جائے گا۔

مسلمان ملکوں کی ایک سُپریم باڈی ہونی چاہیئے

بہر حال تو مضمون ضیاء الحق کی خارجہ پالیسی کے سلسلہ کا تجزیہ تھا کہ یہ عاجز ملک کی خارجہ پالیسی کو زیادہ زیر بحث نہیں لاتا۔ ایک طرح کا ہی ''ڈنگ ٹپاؤ'' معاملہ چل رہا ہے اور ظفر اللہ قادیانیوں اور بے دین لوگوں سے وزارت خارجہ اور ہمارے باہر کے سفارت خانوں کو بھر گیا ہے۔ اور یہ لوگ ملک کے اندرونی حالات پر بھی اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ افسوس ہم نے نہ اپنے نفوس کو پہچانا ہے نہ اوّل و آخر مسلمان ہونے کے اصول کو اپنایا ہے اس لئے نہ ہماری قومی پہچان صحیح ہے اور نہ ہم نے اپنے گھر یعنی ملک کو درست کیا ہے۔ اس لئے ضیاء الحق کے زمانے میں بھی وہی چال بے ڈھنگی چلتی رہی کہ ہم اینگلو امریکن بلاک کے ''پروردہ'' ہیں۔ مثال کے طور پر جب مصر نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا تو مصر کو مسلمان ممالک کے تنظیم سے ''معطل'' کر دیا گیا تھا۔ بعد میں ضیاء الحق کی زیادہ سفارش پر مصر کو اسلامی ملکوں کے تنظیم میں دوبارہ شامل کیا گیا۔ اور ضیاء الحق نے یہ کچھ اینگلو امریکن بلاک کے اشارے کی وجہ سے کیا۔ اب مصر ایک ایسا ملک ہے کہ اس کی ہر قیادت نے دل سے کبھی بھی پاکستان کو پسند نہ کیا۔ اس میں مصر کا بادشاہ فاروق، جمال عبدالناصر، انور سادات اور حسنی مبارک سب شامل ہیں۔ بلکہ جمال عبدالناصر نے بھارت اور جواہر لعل نہرو کے ساتھ مل کر ہر بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے نظریاتی اصول اسلام پر شدید حملے بھی کیے۔ مصر والوں نے پاکستان کو اسلامی دنیا کے رہنما کے طور پر ہمیشہ اپنا ''رقیب'' بنایا ہوا ہے۔ مصر والے عرب ازم کے تحت اپنے آپ کو عرب دنیا کے ''رہنما'' بنائے ہوئے ہیں۔ اور اس اصول کے تحت وہ اسلامی دنیا کے بھی رہنما بننا چاہتے ہیں۔ اور پاکستان کو ثانوی حیثیت میں ''دھکیلے'' رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ افسوسناک رویہ ہے کہ اسلامی دنیا کے ملکوں میں خطوں یا جغرافیائی نزدیکی یا ایک زبان ہونے کی وجہ سے کوئی گروہ بندی ہو۔ پچھلے دنوں سعودی عرب کے شہزادہ عبداللہ نے ہمارے وزیر اعظم ظفر اللہ جمالی کو اسلامی متحدہ فوج کی تجویز دی۔ یا مسلمان جو معاشی وحدت یا اپنے ذرائع کو ایک کر کے کچھ اتحاد چاہتے ہیں یہ سب ثانوی اعمال ہیں۔ اور ایسا کرنے سے کوئی مقصد حاصل نہ ہوگا۔ اول ضرورت نظریاتی وحدت کی ہے کہ سب اول بھی مسلمان اور آخر بھی مسلمان بنیں۔ اور اپنے ملکوں کو ایک انتظامی وحدت اور ان کے الگ ناموں یا قومیتوں کو بین الاقوامی ''ضرورت'' سمجھیں۔ اور اس نظریاتی وحدت کے لئے ایک سپریم باڈی کی ضرورت ہے جو دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرونے کی ہدایات جاری کرے اور ملکوں سے اس پر عمل کرائے۔ کہ ہم سب مسلمان قرآن پاک اور سنت نبوی ﷺ میں بیان شدہ اسلامی فلسفہ حیات کے تحت ''حزب اللہ'' بن جائیں۔ جس سلسلہ میں کافی مضامین لکھنے کی ضرورت ہے بہر حال ان سب مضامین لکھنے میں بھی بڑا مقصد ''امت واحدہ'' بننا مقصود ہے۔

تو ہمارے سامنے ضیاء الحق کی خارجہ پالیسی والا جو مضمون زیر بحث ہے۔ ضیاء الحق کے زمانے میں بھی یہ ''ڈنگ ٹپاؤ'' طریقہ جاری رہا۔ بھلا صاحبزادہ یعقوب خان سے اور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ وہ اینگلو امریکن بلاک کا ''خاص الخاص'' آدمی مانا جاتا ہے۔ خاندانی طور پر وہ مکمل طور پر مغربی تہذیب کی پیداوار ہے۔ یہ عاجز اس کے ہم عصر کیڈٹوں کی وساطت سے اس کو نوجوانی کے زمانے سے جانتا ہے۔ اور میں نے کیپٹن سے میجر جنرل بنتے اس کو دیکھا۔ بالکل ''وقتی'' آدمی ہے۔ ہماری بدقسمتی کہ قحط الرجال ہے اور صاحبزادہ کی ''قماش'' کے لوگ' ہمارے ''ماہرین'' مانے جاتے ہیں۔

ضیاء الحق کو البتہ جس سلسلہ میں اس عاجز نے بہت خطوط لکھے وہ اس کا ان لوگوں کے ساتھ ''لبرل برتاؤ'' تھا۔ جنہوں نے میرے حساب سے دل سے پاکستان کو تسلیم نہیں کیا۔ یا ایسے ''دانشور'' ہیں جو بے دین یا لا دین ہیں۔ یہ بہت لمبا اور مشکل مضمون ہے۔ جن لوگوں نے پاکستان کی مخالفت کی اُن میں سے احرار پارٹی کے عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کو چھوڑ کر کسی ایک نے بھی آزادی کے بعد اپنے رویہ پر ندامت نہ کی۔ بلکہ مفتی محمود جیسے لوگ مرتے دم تک کہتے رہے ''کہ ہم تو پاکستان کے بنانے کے ''گناہ'' میں شریک نہ تھے۔'' اور اس ''گناہ'' سے خود بھی بے حساب مراعات حاصل کیں اور ان کی اولاد اور پیروکار آج بھی ''مراعتیں'' حاصل کر رہے ہیں بہرحال ایسے لوگوں نے دل سے پاکستان کے ''وجود'' کو کبھی بھی تسلیم نہ کیا اور خان غفار خان جیسے لوگوں نے پاکستان میں دفن ہونا بھی پسند نہ کیا اور افغانستان میں جلال آباد کے مقام پر دفن ہے۔ لیکن پاکستان سے خوب فوائد اٹھائے اور ان کی اولاد اور پیروکار آج بھی فوائد اٹھا رہے ہیں اور ہر اس عمل اور تحریک میں بھی شامل ہوتے ہیں جس سے پاکستان کے ''استحکام'' کو نقصان پہنچے۔ اور بھارت سمیت ہر غیر ملک کے اس ادارے سے رابطے رکھے جو پاکستان کے ''درپے'' ہو۔ صرف پاکستان کی زندگی کے پہلے سات سالوں میں خان عبدالقیوم خان نے صوبہ سرحد میں ایسے لوگوں کو اپنے ''مقامات'' پر رکھا۔ اور ایسے لوگ اپنی موت آپ مرنے والے تھے کہ گورنر جنرل غلام محمد کو کیا سوجھا کہ ڈاکٹر خان صاحب کو وزارتوں سے نواز کر ایسے لوگوں کو نئی زندگی عطا کر دی۔ ایوب خان کے زمانے میں ایسے لوگ پھر ''دب'' گئے تھے۔ لیکن 65-1964ء میں یہ لوگ مس فاطمہ جناح کی ''چھتری'' تلے آ گئے اور اتنی ''طاقت'' حاصل کر لی کہ 1970ء میں مغربی پاکستان کے انتخابات میں بھٹو کی پیپلز پارٹی کے بعد یہ لوگ دوسرے نمبر کی طاقت بن گئے بلکہ یہ لوگ سرحد اور صوبہ بلوچستان میں پہلے نمبر کی طاقت بن گئے۔ بھٹو نے ان لوگوں کو اپنی ''چھتری'' تلے لے کر اپنا ''ہم سفر'' بنانا چاہا۔ لیکن ایسے لوگوں کے سامنے سب سے بڑا مقصد پاکستان کے استحکام کو ''دھچکا'' دینا ہوتا ہے اور بھٹو جو ملک کو دولخت کرا چکا تھا۔ وہ الگ بات تھی۔ لیکن وہ مغربی پاکستان کو استحکام دے کر اس علاقے میں کامیاب حکمران کے طور پر پکے طور پر براجمان رہنا چاہتا تھا۔ تو ایسے لوگ اس کے راستے کے ''روڑے'' تھے۔ تو بھٹو نے بلوچستان میں ان کی طاقت کو ''بکھیر'' دیا۔ اور سرحد میں [illegible] کو طاقت سے ہٹا کر ولی خان کو حیدر آباد جیل میں رکھا ہوا تھا اور اس کی پارٹی کو ہمیشہ کیلئے ختم کرنے کی تجویز بنائی ہوئی تھی۔ ضیاء الحق نے طاقت میں آنے کے بعد اس چیز کو بالکل نہ سوچا کہ وہ اگر بھٹو والے رویہ میں کچھ تبدیلی کرنا چاہتا تھا تو اس حد تک جانے کی ضرورت تو نہ تھی کہ ایسے لوگوں کو سر پر چڑھا دیتا۔ ''حب الوطنی'' کے سرٹیفکیٹ ان کو دے [illegible] اور ایک وقت

فضل حق کے ذریعہ سے ولی خان کو پاکستان کا وزیراعظم بھی بنانے کی پیش کر دی۔ لیکن ان لوگوں نے ضیاء الحق کی افغانستان کی پالیسی میں بھی مخالفت کی اور نہ ضیاء الحق کے ''احسانات'' کی قدر کی اور نہ پاکستان کے استحکام کے سلسلہ میں اپنے رویہ میں تبدیلی کی اور پچھلے انتخابات میں بری طرح ہار جانے کے باوجود آج بھی کالا باغ ڈیم کی مخالفت میں پختون قومیت کو ہوا دے کر ملک میں انتشار پھیلا رہے ہیں۔ آزادی سے پہلے ان لوگوں نے کبھی پختون قومیت کا نام نہ لیا تھا۔ اور اپنی ''پٹھانیت'' کا اظہار بھی نہ کرتے تھے اور پکے ''ہندوستانی'' بنے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں بھی اور آج کل بھی ان لوگوں کو مسلم قومیت کے الفاظ سے نفرت ہے اور کبھی بھی اپنے مسلمان ہونے پر فخر نہیں کرتے۔

جو پاکستان کی مخالفت کرتے تھے انہیں پاکستان نہیں آنا چاہیے تھا

یہ لوگ اول اور آخر ہندوستانی تھے اور غفار خان اپنے آپ کو ''سرحدی گاندھی'' کہتا تھا نہ کہ ''پختون گاندھی'' آج کل ان لوگوں کو لفظ ''سرحد'' ناپسند ہے اور ہماری بھی ایک غلطی ہے کہ ہم لوگ بھی پاک سرزمین کو ''شادباد'' کر کے پاکستانی قومیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ہمیں بھی مسلم قومیت پر زور دینا چاہیے تھا۔ اور ضیاء الحق یا گورنر جنرل غلام محمد والی سیاست بھی غلط ہے کہ جو پاکستان کی مخالفت کرے اس کو ''مراعات'' دے کر اپنے ساتھ ملایا جائے بلکہ یہ کچھ ہمارے ایمان و یقین کا حصہ ہونا چاہیے اور یہی پاکستان بنانے میں اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے کہ ہم اول اور آخر مسلمان اور مومن بن جائیں۔ اور اس عاجز نے اس سلسلہ میں ضیاء الحق کو بے شمار خطوط لکھے۔ لیکن اس نے کوئی اثر نہ لیا۔

صوبہ پنجاب میں مسلم لیگ کی مخالفت' احرار پارٹی یا خاکساروں نے کی اور وہ جلدی اپنی موت مر گئے۔ علاوہ ازیں خضر حیات کی یونینسٹ پارٹی نے مسلم لیگ کی مخالفت کی تھی۔ پاکستان کی مخالفت نہ کی تھی۔ البتہ پنجاب میں لوگ ''مراعات'' کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں اور چڑھتے یا چڑھے ہوئے سورج کی خوب ''پوجا'' کرتے ہیں۔ اس لئے یہاں تو حکومت کیلئے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ لیکن سندھ کی صورت حال عجیب وغریب ہے۔ جس کو حکومت مل جائے تو وہ پاکستان کا ''وفادار'' بن جاتا ہے۔ جس کو حکومت نہ ملے وہ ''سندھ کارڈ'' استعمال کر کے صوبائی تعصب پھیلانا شروع کر دیتا ہے اور کوئی ''سندھو دیش'' کا نعرہ لگانا شروع کر دیتا ہے۔ اور کوئی فیڈریشن کی بجائے ''کنفیڈریشن'' کی صدا دینا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی بنیاد جی ایم سید نے باندھی۔ 46-1945ء سے پہلے وہ سندھ کی صوبائی مسلم لیگ کا صدر تھا۔ ان زمانوں میں اس آدمی نے مسلم قومیت کے پرچار پر جو کچھ لکھا یا بیانات دیئے۔ اتنا کچھ کسی اور رہنما نے نہ کیا اور سندھ میں مسلم اکثریت کے پہلو کی مدد سے اس نے صوبہ سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی سے الگ کرانے میں بھی اہم کام کیا۔ لیکن اس کے دل میں خود غرضی تھی کہ وہ صوبہ سندھ کا وزیراعلیٰ بھی بن جائے۔ لیکن سندھ میں ایک سے ایک ''وڈیرا'' موجود تھا۔ مثلاً ہدایت اللہ' غلام حسین' محمد ایوب کھوڑو' غلام علی تالپور' پیر الٰہی بخش' پیرزادہ عبدالستار' قاضی فضل اللہ' تو 1945ء میں جی ایم سید مسلم لیگ کے ٹکٹ اپنے آدمیوں کو دینا چاہتا تھا۔ جن کے جیتنے کی زیادہ امید نہ تھی۔ تو قائداعظم نے دوسرے صوبوں کا ایک پارلیمنٹری بورڈ بنایا جس

میں پنجاب اور یو پی کے مسلم لیگر تھے اور انہوں نے جو فیصلہ دیا' جی ایم سید کو وہ پسند نہ تھا۔ تو وہ مسلم لیگ سے ایسا الگ ہوا اور سندھی قومیت کو ایسا اوڑھنا بچھونا بنایا کہ بعد میں محمد ایوب کھوڑو جیسے مخلص مسلم لیگی نے بھی ''سندھ کارڈ'' کو اپنایا۔ اور اس کے سندھ کارڈ کو ختم کرنے کیلئے۔ بھٹو جیسے ''ماڈرن اور لبرل'' خاندان کو آگے لایا گیا۔ تو ممتاز بھٹو سمیت اس خاندان کو جو آدمی حکومت سے باہر ہوتا ہے وہ ''سندھ کارڈ'' استعمال کرتا ہے۔ اور کئی ''رسول پلیجو'' یا ''قادر مگسی'' قسم کے لوگ کسی ''مافیا'' کی ''پیداوار'' کے طور پر ہمیشہ ہمیشہ صوبائی تعصب کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ ضیاء الحق نے نہ صرف جی ایم سید کو کئی ''مراعات'' سے نوازا بلکہ سندھ کے شہروں خاص کر کراچی اور حیدر آباد میں مہاجر قومی موومنٹ والوں کی بھی حوصلہ افزائی کی اور ان مہاجرین نے دو بیڑیوں پر پاؤں رکھے ہوئے ہیں۔ ''مہاجر'' بھی ہیں اور اب ''سندھی'' بھی ہیں۔ میرے پرانے رفیق میجر ابن الحسن مرحوم نے ایک دفعہ اپنے سندھی ہونے پر اخبار میں فخر کیا کہ اس کے والد سندھ کے منوں مٹی کے نیچے مدفون ہیں۔ تو میں نے اس کو بہت سمجھایا تھا کہ وہ لوگ پاکستان میں اس لئے آئے ہیں کہ وہ لوگ اول بھی مسلمان بنیں اور آخر بھی مسلمان اور ان صوبائی قومیتوں یا مہاجر قومیتوں کے چکر میں نہ پڑیں۔ قارئین پاکستان کی تاریخ کا یہی بہت بڑا المیہ ہے۔ اور اس سلسلہ میں سیاسی رہنما اور دانشور لکھاڑی کچھ ''جانتے ہوئے'' اور کچھ ''بے جانے'' جو گمراہی پھیلا رہے ہیں۔ جب تک ہم اس کو ختم کر کے اول اور آخر مسلمان اور مومن نہیں بنتے فطرت کے سامنے جو پاکستان کو وجود میں لانے کے مقاصد تھے وہ نامکمل رہتے ہیں۔ اور ہم فطرت کے اس راز کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

سامعین نے کہا جوش زندہ باد میں نے کہا مُردہ باد

قارئین! اس عاجز نے موجودہ پاکستان میں آباد کچھ ان لوگوں کا ذکر تو کر دیا ہے جنہوں نے دل سے پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ ہم ان پر نظر رکھ سکتے ہیں۔ لیکن ان کو ''دیس نکالا'' تو نہیں دے سکتے کہ وہ لوگ اب کہتے ہیں کہ وہ پاکستانی ہیں۔ یا اگر وہ مسلم قومیت کے اصولوں پر یقین نہ کریں تو ان کو ''اقلیتوں'' کے زمرہ میں ڈالا جا سکتا ہے۔ لیکن پاکستان میں ہجرت کر کے صرف اس شخص کو آباد ہونا چاہیئے تھا اور ہے جو اول بھی مسلمان ہو اور آخر بھی مسلمان۔ یہ عاجز اس سلسلہ میں مشرقی پنجاب کے دو آدمیوں کانگریسی لیڈر سیف الدین کچلو اور احرار لیڈر حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا ذکر کرے گا۔ جنہوں نے پاکستان میں ''ہجرت'' کرنے سے انکار کر دیا اور بھارت کے باشندے بن کر ادھر ہی قیام کیا۔ تیسرے ضلع راولپنڈی کی تحصیل کہوٹہ کے کیپٹن شاہ نواز تھے جن کا سارا خاندان مسلم لیگی تھا۔ لیکن وہ پہلے سبھاش چندر کے ساتھ وابستہ رہے اور ہندو کانگریس کے بھولا بھائی ڈیسائی نے ان کی وکالت کی اور وہ آزادی سے پہلے کانگریس کے ساتھ وابستہ ہو گئے تو اس نے بھی بھارت میں رہنا پسند کیا اور وہاں ہی فوت ہوا لیکن مجھے حیرانگی ان لوگوں پر ہوتی ہے جو پاکستان کا نام سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد ''مراعات'' حاصل کرنے کیلئے پاکستان پہنچ گئے۔ اور ان میں دہلی کے گرد و نواح کے چند لوگوں کا ذکر ضروری ہے اور میں میجر جنرل نوابزادہ شیر علی کا ذکر کر چکا ہوں اور میں یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ اس نے پاکستان میں آ کر تسلیم کیا کہ اس کو نواب آف بھوپال نے مشورہ دیا تھا کہ اس کی جگہ پاکستان میں ہے بہر حال ان

صاحب کو جب فوج کی کمانڈر انچیفی نہ ملی تو پھر بھارت جانے پر تیار ہو گئے تھے اور آخری وقت تک ہمیں مشورہ دیتے رہے کہ ہم بھارت کا چھوٹا بھائی بن کر رہیں۔ یعنی سکم اور بھوٹان کی طرح۔ میرے خیال کے مطابق ایسے لوگوں کو پاکستان نہیں آنا چاہیئے تھا اور اگر آ جاتے ہیں تو ان کو جلد واپس بھارت بھیج دینا چاہیئے تھا لیکن میں سینکڑوں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو آزادی سے پہلے پاکستان کو گالیاں دیتے تھے اور پھر یہاں آ گئے اور پاکستان کی نسبت دل سے بھارت کے زیادہ وفادار تھے' ان میں سے ایک ہمارے ساتھ فوج میں میجر تھا یہاں آ کر وزارت خارجہ میں چلا گیا بڑی ترقیاں حاصل کیں اور باہر کے ملکوں میں ہمارا سفیر رہا جہاں سے مجھے رپورٹیں ملتی تھیں کہ وہ اس باہر والے ملک میں بھارت کا سفیر نظر آتا تھا' پھر کئی دانشور اور صحافی یا ادیب تھے جو بالکل لادین اور بے دین لوگ تھے اور انہوں نے یہاں لادینی پھیلائی۔ میں اپنے رفقاء بریگیڈیئر تفضل صدیقی' عبدالرحمن صدیقی یا میجر ابن الحسن کو کہتا رہتا تھا کہ بھارت سے ہجرت کر کے آنے والے کسی بے دین ادیب کی پاکستان میں کوئی جگہ نہیں۔ اگر وہ بلیغ الدین یا جمیل الدین عالی یا ظفیر احمد کی طرح اسلام کا فرزند نہیں تو اس کی پاکستان میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیئے اور ضیاء الحق جو ہر قسم کے ''ادیبوں'' کو سر پر چڑھاتا رہتا تھا۔ اس کو میں نے اس کے ایسے اعمال پر بے حساب خطوط لکھے کہ یہ غلط بات ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جوش ملیح آبادی کے خاندان کے لوگ اور پیروکار بھی پاکستان میں پہنچ گئے کہ جوش ملیح آبادی نے پاکستان کو بہت گالیاں نکالی تھیں اس کو تو پاکستان جلد آنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی لیکن اس کے رشتہ داروں نے یہاں آ کر خوب مراعات حاصل کیں اور آخر جوش ملیح آبادی کی بھی ایک ''دانشور اور ادیب'' کے طور پر پاکستان میں ''جگہ'' بنالی کہ اس جیسے کئی اور منہاج برنا' اور اے بی ایس جعفری وغیرہ پاکستان میں ایک طرف مہاجروں والی ''مراعات'' حاصل کر رہے تھے اور دوسری طرف لادینیت اور طبقاتی نفرت بھی پھیلا رہے تھے۔ کچھ لوگ ''مراعات'' کا مطلب جائیداد سمجھتے ہیں لیکن میرے لحاظ سے جو پاکستان میں آ کر کوئی سرکاری یا نیم سرکاری نوکری بھی کر لیتا ہے۔ وہ بھی ''مراعات'' ہیں تو میرے ان مضامین کے خلاف اے بی ایس جعفری کے رشتہ داروں نے پروٹیسٹ کیا۔ جو نوائے وقت نے شائع کر دیا۔ لیکن افسوس میرا جواب نہ شائع کیا۔ جس میں اس عاجز نے جعفری نے جو فوائد اُٹھائے اور ادھر جو پاکستان کو نقصان پہنچائے۔ وہ باتیں نہ شائع کیں۔ جوش ملیح آبادی نے پاکستان پہنچ کر نہ اپنی پاکستان کی مخالفت پر ندامت کی اور نہ منکر خدا ہونے کے عقیدہ کی اصلاح کی لیکن محرم کی مجلسوں اور عرسوں میں ایک ادیب کے طور پر وہ مہمان خصوصی کے طور پر بُلائے جاتے تھے کہ ایک عرس میں وہ صرف چند منٹوں کیلئے آیا اور اس کی اس ''مہربانی'' کیلئے اس کے جاتے وقت جب سامعین سے گزارش کی گئی کہ اس کے لئے ''زندہ باد'' کا نعرہ لگائیں اور بے دلی سے کچھ سامعین نے ''یہ رسم'' پوری کی تو اس عاجز نے پرزور آواز میں ''مردہ باد'' کا نعرہ لگایا کہ جوش یہاں کیا کرنے آیا تھا اور اس کے بعد یہ عاجز ایسے عرسوں سے دور ہی رہنے لگا۔ اب ضیاء الحق نے آ کر لکھنے والوں اور ادیبوں کو خوب پذیرائی دی جن میں جوش ملیح آبادی جیسے لوگ یا ترقی پسند بے دین لوگ شامل تھے تو اس عاجز نے ضیاء الحق کو یاد دلایا کہ ہمارے آقا حضور پاک ﷺ نے عربی زبان کے باطل فلسفہ پیش کرنے والے بہت بڑے ادیب اور شاعر/ امرؤالقیس کے بارے میں فرمایا کہ روز قیامت دوزخ کی طرف گمراہ لوگوں کی یہ آدمی قیادت کر رہا ہوگا'' آپ اگر جوش ملیح آبادی

جیسے لوگوں کی گمراہی کا کوئی قلع قمع نہیں کر سکتے تو ان کو پذیرائی تو نہ دیں لیکن ضیاء الحق پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ جوش کی موت پر بڑے تہنیتی پیغام بھیجے۔

اس سلسلہ میں اے میرے عزیزان! کس کا ذکر کروں اور کس کا نہ کروں جماعت اسلامی کے اخبار ''جسارت'' نے جوش کی موت کو آٹھ کالم کی سرخی کے تحت ایک قومی سانحہ قرار دیا لیکن خدا مغفرت کرے حفیظ جالندھری کی وہ اس وقت تک زندہ تھے انہوں نے کسی اخبار میں جوش کی موت پر بڑا پیارا تبصرہ کیا کاش! جوش چند دن اور زندہ رہتا اور توبہ و ندامت کرنے کے بعد وفات پاتا۔ یعنی زندگی کے آخری دن تک جوش کو توبہ کرنے کی توفیق نہ ہوئی اور وہ اپنے ''منکرانہ عقائد'' کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کے چند ماہ بعد حفیظ جالندھری جو اسلام کا فرزند اور عاشق رسول ﷺ تھا وہ بھی وفات پا گیا۔ جماعت اسلامی کے اسی اخبار ''جسارت'' نے وفات کی خبر بغیر تبصرہ کے اندر والے کسی صفحہ کے ایک کالم میں دی۔ اس عاجز نے اس سلسلہ میں اخبار کے ایڈیٹر صلاح الدین کو ایک خط بھی لکھا اور بعد میں ایک ملاقات میں اس پر واضح کیا کہ اس کے سٹاف میں کچھ لوگ مہاجرین تعصب کا شکار ہیں اور اگر وہ اسلامی رشتے کے پابند ہوتے تو جوش ملیح آبادی کو یہ اہمیت نہ دیتے اور حفیظ جالندھری کو اتنا کم تر نہ سمجھتے۔ صلاح الدین مرحوم پر اس بات کا بڑا اثر ہوا اور وہ مہاجر تعصب کی مخالفت میں ایک ننگی تلوار بن گیا اور اسی ''قصور'' میں مہاجر قومی تحریک والے اس کے درپے ہو گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو شہادت کے رتبے سے سرفراز کر دیا لیکن میرے خطوط کا ضیاء الحق پر کوئی اثر نہ ہوا اور اگلے سال جب جوش ملیح آبادی کی برسی منائی گئی تو اس نے ''پیغام'' دیا کہ ایسے ''دانشوروں'' کی برسیاں منانا ایک قومی ضرورت ہے۔ اب میرا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے اس سلسلہ میں ضیاء الحق کو جو مختصر خط لکھا وہ اس کی طرف میرا آخری خط بن گیا کہ میں نے لکھا کہ جوش کی اگلی برسی کے ساتھ ابوجہل کی بھی ایسی برسی کا بندوبست کرنا ''ضیاء الحق صاحب یہ کچھ ''ہضم'' نہ کر سکے اور مجھے بریگیڈئر تفضل صدیقی کی وساطت سے ان کا پیغام ملا کہ ''میجر امیر افضل یہ ''تبلیغ'' کب بند کرے گا''۔ میں ویسے بھی کچھ ''گوشہ نشین'' ہو رہا تھا کہ مجھے حج کی سعادت بہت دیر کے بعد 1986ء میں نصیب ہو گئی تھی حالانکہ لوگوں نے کب سے حاجی صاحب کہنا شروع کیا ہوا تھا۔ لیکن کعبہ کس منہ سے جاؤ گے۔ میں ندامت سے کانپتا رہتا تھا اور میرے عزیز دوست بریگیڈئر اختر علی کا خیال تھا کہ مجھے شاید علامہ اقبالؒ یا صلاح الدین ایوبی کی طرح حج کی سعادت نصیب نہ ہو کہ یہاں میرے ''آنسوؤں'' کی یہ حالت ہے میں روضہ رسول ﷺ پر پہنچتے پہنچتے بے حال ہو جاؤں گا۔ لیکن رب کی ذات پاک شاید مجھے تیار کرتی رہی کہ میرے خانہ کعبہ اور روضہ رسول ﷺ پر حاضری کے تاثرات بھی کچھ نرالے اور ''منفرد'' قسم کے ہیں جن کو بیان کرنے کیلئے کئی مضامین کی ضرورت ہے کہ اس قسم کے انکشافات سامنے آئے اور ایسے اشارے ہوئے جن کو بیان کرنے کی اس عاجز کو ہمت بھی نہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ صرف دو سال بعد 1988ء میں امریکہ جاتے ہوئے ایک عمرہ کی سعادت بھی نصیب ہو گئی اور انکشافات کی رہی سہی کسر بھی نکل گئی کہ ایسے تصورات میں کھو جاتا تھا کہ زمان و مکان کے تاثرات بھی غائب ہو جاتے تھے۔ لیکن یہ عاجز اللہ تعالیٰ کے سامنے تو خوب چیخ و پکار کرتا ہے اور اُمت کا جو دکھ و درد رب کی ذات پاک نے اس عاجز کو دیا ہے اس کا زور و شور سے اظہار کرتا ہوں لیکن اپنے آقا حضور ﷺ کے سامنے اس سلسلہ

میں یہ عاجز بڑا محتاط رویہ اختیار کرتا ہے کہ آپ ﷺ از خود امت کیلئے بڑے حریص ہیں اور سب کچھ آپ ﷺ کے سامنے ہے لیکن راضی برضا اللہ کی بہت بلند ترین منازل میں ہوتے مشیت ایزدی کی منشا کے سامنے خاموش ہیں تو امت کے دکھ و درد کی چیخ و پکار سے آپ ﷺ کے سامنے گریز ہی کیا جائے البتہ اس دوسری حاضری کے وقت اپنے آقا ﷺ کے سامنے یہ عاجز اپنی کچھ مایوسیوں کا اظہار کر بیٹھا اور پاکستان کے کچھ رہنماؤں کا نام لیکر ان کے سلسلہ میں جیسے ان مضامین میں تاثرات دے رہا ہوں کچھ ذکر کیا اور آخر میں کہا کہ پھر ایک ایسا شخص ہمارا حکمران بن گیا جو حاکم بننے سے پہلے مجھے اپنا بڑا بھائی کہتا تھا (یعنی لالہ) لیکن اب یہ آدمی مجھے منہ لگانے کو تیار نہیں۔ اس کو کس نام سے پکاروں۔

یہ الفاظ منہ سے نکلے ہی تھے کہ میرے لئے ایک بھونچال آ گیا اور میرے منہ میں کسی غیبی آواز نے جو الفاظ ڈال دیئے۔ میں وہ الفاظ نہ لکھوں گا کہ حیران کن منظر تھا پس یہ سمجھیں کہ میں لڑھک گیا اور بے حال ہو گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور مجھے نارمل ہونے میں خاصی دیر لگ گئی۔ البتہ اگست 1988ء میں جب امریکہ سے واپس آیا تو ضیاء الحق کے طیارے کے حادثے کی خبر سن کر وہ تصورات سامنے آ گئے۔ البتہ کچھ اشارہ کر دیتا ہوں۔ کہ ضیا ''حق'' تھا یا ''باطل''؟

ضیاء الحق پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔ ضیاء الحق کے جو پرانے رفیق تھے یا اس سے سینئر تھے یا برابر والے تھے یا جونیئر تھے ضیاء الحق کے حکومت میں آ جانے کے بعد ان سب نے بڑے فائدے اٹھائے جو ضیاء الحق کے پاس جاتا تھا رابطہ باندھتا تھا۔ ضیاء الحق بڑے کھلے دل سے اس کی مدد کرتا تھا۔ مجھ سے زیادہ میرے بڑے بھائی کے ضیاء الحق کے ساتھ تعلقات تھے ان کے پاس لوگ آتے تھے اور کہتے تھے ہماری یہ سفارش کرو۔ وہ سفارش کرو۔ بھائی صاحب نے ضیاء الحق سے ملنا ہی بند کر دیا تھا اور نہ انہوں نے جا کر ضیاء الحق کو اس ناانصافی کی یاد دہانی کرائی جو صاحبزادہ یعقوب نے کی تھی کہ اس کی اب تلافی ہو کہ ضیاء الحق نے اس زمانے میں بھائی صاحب کی بہت مدد کی کوشش کی تھی کہ ان کے ساتھ سراسر ظلم کیا گیا تھا اور جو باقی لوگ آتے تھے نہ ان میں سے کسی کی سفارش کی یہی حالت اس عاجز کی تھی کہ میں نے ضیاء الحق کے ساتھ کبھی کسی دنیاوی فائدہ کیلئے رابطہ نہ باندھا باقی معاملات کا ذکر کر چکا ہوں کہ ضیاء الحق نے کبھی بھی مجھے ''گھاس'' نہ ڈالی بلکہ میں جو تاریخ اسلام کے سلسلہ میں کام کر رہا تھا اس کو آگے نہ بڑھنے دینے کی پوری ذمہ داری ضیاء الحق پر آتی ہے میرے علاوہ مجھے صرف ایک آدمی جنرل گل حسن کے بارے میں خبر ہے جو ضیاء الحق کا سینئر تھا اور بڑی امیدوں کے ساتھ سفارت چھوڑ کر ملک میں واپس آیا لیکن ضیاء الحق نے اس کی ''میزبانی'' سہالہ ریسٹ ہاؤس میں کرائی اور اس کو باور کرایا کہ اگر پاکستان میں آنا چاہتے ہو تو سہالہ ہی میں ''قیام'' کرنا ہو گا تو گل حسن دوبارہ ملک کو چھوڑ گیا میرے بارے کئی لوگ شک میں تھے کہ میرا ضیاء الحق کے ساتھ ''رابطہ'' ہے اور اس سلسلہ میں میرے پاس بڑی دلچسپ کہانیاں موجود ہیں کہ لوگ حکمرانوں سے کیا کچھ حاصل نہیں کرنا چاہتے لیکن کچھ مخلص لوگ کسی اہم ضرورت کیلئے بھی میرے پاس آ جاتے تھے نمونے کے طور پر صرف ایک کہانی لکھ رہا ہوں۔ 1980ء میں اس عاجز نے پاکستان ٹائمز میں خط کی شکل میں ایک مضمون لکھا کہ اسلامی نظام حکومت کیا ہے اور موجودہ مغربی جمہوریت کے تحت سیاسی

حکومتیں اسلام سے بہت دور ہیں۔ میرے اس موجودہ گھر میں اس زمانے میں کوئی ٹیلیفون بھی نہ تھا اور سڑک بھی آدھی کچی پکی تھی کہ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے ایک دیرینہ دوست میجر ہاشمی کے ساتھ ایک عالم دین عبدالجبار غازی میرے گھر پہنچ جاتے ہیں جن کو میں غائبانہ طور پر جانتا تھا کہ جماعت اسلامی کے بانی ممبر تھے اور چند سال پہلے مودودی کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے جماعت اسلامی کو چھوڑ چکے تھے۔ غازی صاحب نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر بڑی سیدھی بات کی کہ انہوں نے میرا خط کی شکل میں مضمون پڑھا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ میں اسلامی نظام کو بھی سمجھتا ہوں اور میرا تعلق کسی گروہ کے ساتھ ہے اور ہمارا ضیاء الحق کے ساتھ بھی ''رابطہ'' ہے غازی صاحب بھی اس گروہ کے ممبر بننا چاہتے ہیں اور اس کام میں دیر نہ کریں ہم مل کر ضیاء الحق کو گزارش کریں کہ وہ ''اولی الامر'' بنیں اور ہم اس کی بیعت کرنے کو تیار ہیں اور وہ پاکستان کا امیر المومنین بن کر پاکستان میں وہ اسلام نافذ کر دے جس کا خاکہ میرے ذہن میں ہے اور کچھ اشارے میرے مضمون میں ملتے ہیں۔

برادرم کرنل شیر محمد مرحوم بھی نزدیک رہتے تھے میں نے ان کو بھی بلوا لیا اور غازی صاحب کو بتایا کہ ہم دو آدمی ''یک نفس'' ضرور ہیں اور اسی سوچ کو یہ عاجز ہر طرح سے پھیلاتا رہتا ہے لیکن ہمارا ضیاء الحق کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے آج سے تین سال پہلے ضیاء الحق نے لیفٹیننٹ جنرل غلام حسن کے ذریعہ سے ہمارے ساتھ رابطہ باندھا تھا اور ملنے کا بھی وعدہ کیا تھا لیکن آج تک ملاقات نہیں کی تو غازی صاحب کا اصرار تھا کہ اب ایسا گروہ بنا کے ضیاء الحق کے ساتھ ملاقات کر کے ہم اپنی ذمہ داری پوری کریں۔

میرا خیال ہے کہ غازی عبدالجبار کو شروع میں خیال تھا کہ ہم اس کے سامنے کھل نہیں رہے اور ہم ضرور کوئی ضیاء الحق کا ''گروہ'' ہیں بہر حال غازی صاحب نے ہمارے ساتھ کئی ملاقاتیں کیں اور یہ سلسلہ ایک مہینہ تک جاری رہا اور بڑی مشکل سے ان کے ایک بیٹے کی مدد سے ہم ان کو باور کرا سکے کہ ضیاء الحق ہماری کوئی بات نہ سنے گا کہ اسی دوران پاکستان ٹائمز نے میرے مزید مضمون شائع کرنے بند کر دیئے کہ وہ بھی اس غلط فہمی میں تھے کہ یہ مضامین ضیاء الحق لکھا رہا ہے لیکن میری بعد کی تحقیق سے مجھے معلوم ہوا کہ ضیاء الحق کے چیف آف سٹاف میجر جنرل کے ایم عارف نے اخبار سے پرسش کی کہ وہ اتنے سخت قسم کے اسلام پر لکھنے والے کو اتنی پذیرائی کیوں دے رہے ہیں تو اخبار نے میرے مزید خطوط یا مضامین شائع کرنے بند کر دیئے۔ ظاہر ہے کہ کے ایم عارف نے یہ سب کچھ ضیاء الحق کے اشارے پر کیا ہوگا تو قارئین کو اب یہ بات ضرور سمجھ آ جانا چاہئے کہ ضیاء الحق ''مصلحتی'' اسلام کا پیروکار تھا کہ یہ بھی ٹھیک ہے اور وہ بھی ٹھیک ہے۔ اور یہ عاجز سورۃ البقرۃ کی آیت مبارکہ 208 کے مطابق پورے طور پر اسلام میں داخل ہونے کا دعویدار ہے اور امامت کے رہنماؤں کے لئے اصول حسب ذیل ہونا چاہیئے۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے

ضیاء الحق کو مردم شناسی کا ملکہ حاصل تھا۔ وہ مجھے ایک ''جنونی اور جذباتی'' مسلمان سمجھتا ہوگا۔ مجھ سے

جو مسودہ منگوایا جو میں نے 5 اکتوبر 1970 کو یحییٰ خان کو دیا تھا اس کو پڑھ کر اس نے اندازہ لگایا ہوگا کہ بہتر ہے وہ مجھے دور ہی رکھے۔ وہ جو مجھے ملنے سے بھی ''کتراتا'' تھا وہ مجھ چھوٹے سے آدمی سے ڈرتا تو نہ تھا میری اس کے سامنے کوئی نہ اہمیت نہ وقعت تھی۔ اگر وہ مجھے ختم کرنا چاہتا تو مجھے وہ ایسا غائب کر سکتا تھا کہ کوئی میرا نام ہی نہ لیتا۔ لیکن کسی زمانے میں ہم دوست رہے تھے۔ ضیاء الحق کو اس کا ''پاس'' تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ یہ عاجز سب کچھ رب کی ذات پاک اور رسول پاک ﷺ کیلئے کرتا ہے۔ البتہ وہ مجھے ملتا اس لئے نہ تھا کہ کیا معلوم میں جو کچھ اس کو اپنے خطوط میں کہتا رہتا تھا ایسے الفاظ کسی زیادہ جنون سے عام لوگوں کے سامنے ادا نہ کر دوں۔ اور میں خود ایسی ''مجلسوں'' میں اس سے دور رہتا تھا کہ کیا معلوم یہ عاجز جنون میں کیا کچھ کہہ دے۔ ضیاء الحق کی مردم شناسی ایک بہت بڑا مضمون ہے۔ اس نے ہر پاکستانی کو اس کے ''مقام'' پر رکھا۔ کئی بہت بڑوں کو خوب ''استعمال'' کیا۔ سیاستدانوں کو انگلیوں پر نچایا اور 1988ء میں محمد خان جونیجو کی حکومت کو برخاست کیا تو ملک میں کسی نے ''چوں'' بھی نہ کی اور لوگوں نے ''ایوب کتا ہائے ہائے کے نعرہ لگائے یا یحییٰ کو ذلت کا نشان بنایا یا اب ''گو مشرف گو'' کے نعرے لگ رہے ہیں۔ ضیاء الحق نے سب کی ''بولتی'' بند کی ہوئی تھی۔ میری ذاتی مثال لے لیں کہ یحییٰ خان یا بھٹو کو ان کے منہ پر اس عاجز نے کیا کچھ نہ کہا لیکن فطرت نے اس عاجز کو ضیاء الحق کے منہ پر کچھ کہنے سے روکا ہوا تھا۔ ضیاء الحق کے آخری سالوں میں اس کے دو ''چناؤ'' نے مجھے حیران کر دیا کہ لیفٹیننٹ جنرل سید رفاقت کو اس نے اپنا چیف آف سٹاف بنا لیا اور لیفٹیننٹ جنرل حمید گل کو ISI کا ڈائریکٹر جنرل۔ میں ان دونوں عزیزان کو ان کی جوانی کے زمانے سے جانتا ہوں اور اب بھی بڑے گہرے تعلقات ہیں۔ ہمارے ملک میں جو ''قحط الرجال'' ہے تو ہماری 60 سالوں کی تاریخ میں یہ عاجز کوئی درجن کے قریب لوگوں کے تدبر سے متاثر ہوا۔ جن کو EVIL GENIUS کہا جاتا ہے کہ GENUUS قسم کے لوگوں کے سلسلہ میں یہ عاجز پہلے ہی مضامین میں گزارش کر چکا ہے کہ وہ لوگ ''مکاروں'' کے زمرہ میں آتے ہیں یہ دونوں صاحب اسلامی فلسفہ حیات کے طالب علم ہیں اور تمام واقعات اور معاملات کو بصیرت سے پرکھنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ اس لئے رب کی ذات پاک نے جو سورۃ البلد کی آیت مبارکہ 13 میں دونوں راہوں (نجدین) کی نشاندہی کا ذکر کیا ہے یہ دونوں صاحبان واقعات کا مطالعہ کرتے اپنی سوچوں کی تطہیر کی منازل طے کراتے ہیں اور میری طرح نہیں کہ جنون کو بھی اپنے اوپر سوار کر لیں۔ یہ صاحبان اعمال اور رویہ کے لئے مصلحت کے دامن کو بھی تھامے رکھتے ہیں۔ جنرل حمید گل کو تو اب ساری قوم جانتی ہے۔ جنرل رفاقت صاحب اب عمر کے لحاظ سے بھی اسی سالوں کے نزدیک پہنچنے والے ہیں اور فطرتاً بھی خاموش ہیں۔ ان کا تعلق سیالکوٹ کے ضلع میں سمبڑیال کے مقام کے ایک گیلانی سیدوں کے علمی گھرانے سے ہے۔ البتہ یہ عاجز اس ''چناؤ'' سے یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ کیا ضیاء الحق اب اپنے گرد ایسے تدبر والے لوگ اکٹھے کر کے 1988ء کے بعد قوم کو صراط مستقیم پر رواں دواں کرنا چاہتا تھا؟ بہرحال جو کچھ بھی تھا' ضیاء الحق نے اس قوم کو کچھ بھی نہ دیا۔ صرف اتنے اثرات ہوئے کہ ملک جس بے حیائی اور لادینی کے طوفان کی زد میں تھا۔ ضیاء الحق کے زمانے میں وہ چیزیں کچھ تھمی رہیں لیکن کلاشنکوف کلچر اور کئی برائیاں عود کر آئیں لیکن افسوس کہ ہماری قوم تاریخی حقائق کا صحیح جائزہ نہیں لے رہی اور یہ عاجز اس سلسلہ میں بارش کا پہلا قطرہ بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ عاجز اپنے

سمیت کسی کو ''معاف'' نہیں کرتا اور ہر پہلو کی اچھائی اور برائی دونوں کا جائزہ لیتا ہے اور خود ملامتی رویہ اختیار کیا ہوا ہے کہ قرآن پاک کی سورۃ القیامت کے مطابق رب کی ذات پاک کو نفس لوامہ پسند ہے آ ؤ پوری قوم اجتماعی طور پر توبہ وندامت کر کے اپنے لئے نشان راہ تلاش کریں اور یہ مضامین لکھنے میں اس عاجز کے سامنے بڑا مقصد یہی ہے۔

آصف نواز کی موت نے سکیم الفا کو ختم کر دیا

اب ضیاء الحق کے زمانے کی کہانی بھی اختتام کو پہنچنے والی ہے اور مضامین کا یہ چھٹا سلسلہ بھی ختم ہو رہا ہے کہ بہت پہلے گزارش کر چکا ہوں کہ جو لوگ ضیاء الحق کو لائے تھے وہ اس کو اب ''چلتا'' کرنے والے تھے اور 1986-87ء سے ضیاء الحق اس سے ''آگاہ'' تھا لیکن وہ بھٹو کی طرح کی ذہنیت رکھنے والا یعنی ''شودھا'' آدمی بھی نہ تھا کہ بازاروں میں آجاتا اور اعلان کرتا کہ یہ چھپے ہاتھ اس کے ''درپے'' ہیں۔ ضیاء الحق کو یہ بھی معلوم تھا کہ جس طرح یہ چھپے ہاتھ عزیز احمد کو ''حفاظت'' مہیا کرتے رہے تھے اب یہ لوگ ایسی حفاظت جنرل اختر عبدالرحمٰن کو ''مہیا'' کر رہے ہیں کہ شاید ضیاء الحق کے بعد وہ اس کو آگے لائیں گے۔ ضیاء الحق ہوائی جہاز کا سفر بھی کرنے سے گریز کرتا تھا اور وہ جو بہاولپور گیا تو امریکہ کا سفیر بھی ساتھ جا رہا تھا اور ضیاء الحق' اختر عبدالرحمٰن کو بھی ساتھ لے گیا کہ ان دونوں کی ''حفاظت'' کے مدنظر ضیاء الحق کی حفاظت خود بخود ہو جائے گی لیکن یہ چھپے ہاتھ ضیاء الحق کو ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ اپنا بھی نقصان کرانے کو تیار تھے تو ان لوگوں نے اگر ایک طرح سے جنرل اسلم بیگ کو ضیاء الحق سے دور رکھا تو وہ لوگ اس پر بھی تیار تھے کہ ''جانشین'' کے طور پر غلام اسحاق موجود ہیں جن کی ''پکی نوکری'' کا ذکر پچھلے مضامین میں ہو چکا ہے لیکن یہ سارے وقتی اور تھوڑے عرصہ کے بندوبست تھے یہ بات شاید ضیاء الحق کو بھی معلوم نہ ہو کہ ان لوگوں کی ''سکیم الفا'' کے تحت آصف نواز کو تیار کیا جا رہا تھا جو میجر جنرل کے عہدے تک پہنچ چکا تھا اور اس کو ''ایوب ثانی'' بنا کر ہم پر مسلط کرنا تھا اور یہ بے نظیر یا نواز شریف جیسے سیاستدانوں کو چند سال تگڑم ناچ نچایا گیا۔ یہ درمیانی وقفہ کی ایسی ہی ضرورت تھی جیسی 1954ء سے 1958ء تک محمد علی بوگرہ' سہروردی یا چندریگر کو ایسا ناچ نچایا گیا۔ سیاستدان جمہوری نظام کا سربراہ ان چھپے ہاتھوں کی ''ضرورت'' پوری نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں کو ایک ''آمر'' چاہیئے اور آصف نواز کو پہلے بری فوج کی سربراہی ''دلوائی'' اور وہ پہلا فوجی سربراہ ہے جس کو بھارت ''یاترا'' کی دعوت بھی مل گئی تھی لیکن آصف نواز کی اچانک موت نے ''سکیم الفا'' کو ختم کر دیا اور آج کل ''سکیم بریو'' چل رہی ہے یہ عاجز پہلے ہی گزارش کر چکا ہے کہ تلی تلی خان اس سکیم بریو میں ''فٹ'' نہ بیٹھتا تھا قارئین اس ''سکیم بریو'' کے مشاہدات کے لئے مضامین کے ساتویں سلسلہ کا انتظار کریں۔



ساتواں سلسلہ

فوجی افسران نے فوج کی پیشہ وارانہ تربیت میں غفلت برتی

واقعاتی لحاظ سے ہم مضامین کے ساتویں اور آخری سلسلہ میں پہنچ گئے ہیں۔ ایک سال سے زیادہ عرصہ ان مضامین کے جاری رہنے سے سینکڑوں صاحبان نے میرے ساتھ رابطہ باندھا۔ کئی صاحبان ملنے کیلئے تشریف لائے اور اس سلسلہ میں بہت باتیں ہوئیں لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مجھ پر کسی صاحب نے غلط بیانی کا الزام نہ لگایا۔ اور جو کسی ایک آدھ آدمی نے کچھ اختلاف ظاہر کیا۔ وہ کوئی خاص پہلو نہ تھے۔ ایک صاحب کا خیال تھا کہ میری یہ سوچ صحیح نہیں کہ سبھاش چندر، سرحد کے کانگرسی لیڈروں خان غفار وغیرہ کی مدد سے 1941ء میں افغانستان گیا۔ انہوں نے کسی چھوٹے آدمی کا ذکر کیا۔ جن کا نام انہیں خود کو یاد نہ تھا لیکن ساتھ ایک اضافہ کر دیا کہ سبھاش چندر اور کانگرس میں بڑی دشمنی تھی۔ اور جواہر لعل نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کے ذریعے سے سبھاش چندر کو مروا دیا۔ وہ بیان بڑی زیادتی تھی میں چشم دید گواہوں کی مدد سے ثابت کرتا ہوں کہ سبھاش چندر کی موت ایک حادثہ کی وجہ سے ایسے وقت جاپان میں ہوئی تھی جب ماؤنٹ بیٹن سیلون میں بیٹھا تھا اور اس وقت تک جواہر لعل نہرو اور ماؤنٹ بیٹن میں کوئی رابطہ نہ تھا۔ نہ ماؤنٹ بیٹن کا جاپان کے علاقوں پر کنٹرول تھا۔ بہرحال یہ ایسا مسئلہ نہ تھا جہاں بحث میں پڑ کر وقت ضائع کیا جاتا۔

ایک اور صاحب نے جو مضمون کو سمجھے بغیر مجھ پر مودودی کو ''نکو'' بنانے کا الزام لگایا وہ یہ تو ثابت نہ کر سکتا تھا کہ میں نے غلط بیانی سے کام لیا کہ میں نے مودودی کے الفاظ لکھے تھے کہ یہ ''بیانات'' ظاہر کرتے ہیں کہ مودودی بیچارا بھی بڑا ''کم علم'' تھا۔ اور یہ عاجز ثابت یہ کرنا چاہتا تھا اور ایسے لکھا کہ مودودی کے عقیدہ پر کئی لوگوں نے اعتراض تو کیے۔ لیکن افسوس آج تک کسی نے مودودی کی ''علمیت'' کا بھانڈا نہیں پھوڑا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم بڑی ''کم علم'' قوم ہیں۔ اب یہ عاجز تو بحث کو قرآنی علوم اور احادیث مبارکہ سے سیدھا استفادہ کرنے اور رہبر و رہنما ہر زمانے کیلئے مصطفیٰ ﷺ کی طرف موڑنا چاہتا تھا کہ ابن تیمیہ یا مودودی جو لوگ تفرقے کے باعث بنے ہیں ان کو بھول جائیں لیکن کچھ لوگ ان کم علم علما کو ''مقدس گائے'' بنا کر یا حضور پاک ﷺ کی نبوت میں ''شرکت'' دے کر یا ان کے سر پر ''امامت'' کا تاج سجا کر اپنا بھی اور قوم کا بھی وقت ضائع کرنا چاہتے ہیں۔ یہ عاجز ثابت کر چکا ہے کہ مودودی نہ صرف قرآن پاک کی آیات مبارکہ کو غلط معنی لیتا ہے۔ بلکہ قرآنی احکام کے خلاف فتویٰ دیتا رہا ہے (توبہ میرے اللہ) تو اس عاجز نے ان لوگوں کو مختصر جواب تو دے دیا لیکن اسلامی علوم کے حصول کے طریق کار اور ان کو سائنسی دریافتوں کے ساتھ شیر و شکر کر کے یہ عاجز ان ''ترجیحات'' کو بعد کے مضامین میں زیر بحث لائے گا۔

لیکن ایک صاحب نے تو حیران کر دیا کہ مجھے خراج تحسین پیش کرتا ہے کہ میں ایک جہاندیدہ انسان، پیشہ ور سپاہی، صاحب فراست قلم کار ہوں اور ایک محب وطن پاکستانی کی سوچ رکھتا ہوں اور اگر گہرا مطالعہ اور مشاہدہ والا مورخ ہوں اور میرے مضامین بہت ہی ایمان افروز، دلچسپ اور عسکری تاریخ کا روشن باب ہیں، تو قارئین ان

مضامین سے خوب مستفیض ہو رہے ہوں گے"۔ یہ لکھنے کے بعد اپنی لکھائی کا گیئر تبدیل کر کے منقلب اور اوندھے منہ گر گیا۔ کہ کہتا ہے کہ مضامین کے اثرات صحیح نہیں کہ قادیانیوں کو اتنا زیادہ ننگا کر دیا۔ وہ بھی "محبّ وطن" ہیں لیکن ان کو انگریزوں کا "پٹھو" کہہ دیا گیا۔ اور ہم سب پاکستانی ہیں" یہ صاحب اتنا کچھ سوچ لیتا کہ یہ عاجز سقوط ڈھاکہ کے وجوہات قوم کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے تو میں نے ہر اچھی بات' غداری' کوتاہی اور نالائقی پر تبصرہ کرنا ہے۔ کیا جو کچھ میں نے لکھا ہے اُس کو کوئی غلط ثابت کر سکتا ہے۔

یہ عاجز اپنے مضامین یا مشاہدات پر مختصر تبصرہ کر چکا ہے کہ یہ تلخ حقائق باقی اکثر لکھاریوں کی طرز سے ہٹ کر کیوں ہیں؟ لیکن یہاں اب ضروری ہو گیا ہے کہ اپنے ایک ہم عصر اور پاکستان کے مایہ ناز صحافی اور اب مرحوم و مغفور سید شبیر حسین کے میری کتاب جہاد کشمیر پر تبصرے کے چند الفاظ قوم کے سامنے پیش کر دوں' لکھتے ہیں...... "میجر امیر افضل نے اپنی فوجی ملازمت میں جو نہ صرف پاکستان کی تخلیق سے پہلے شروع ہوئی تھی بلکہ دوسری جنگ عظیم سے بھی پہلے شروع ہوئی۔ سب کچھ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اور جو کچھ مادی آنکھوں سے دیکھا۔ اسے اپنے زندہ اور بے چین دل سے پرکھا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ایک ہی شے کو دیکھنے والے' ایک ہی بات کو سننے والے یا پڑھنے والے کیوں الگ الگ اندازے لگاتے ہیں کیونکہ اکثر لوگ دیکھنے کے باوجود کچھ نہیں دیکھ پاتے۔ یا سننے' پڑھنے کے باوجود کچھ نہیں سمجھ پاتے۔ اور کیونکہ ایسے اشخاص بھی ہیں جو دور کھڑے ہو کر بھی سب کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ یا پڑھ سن کر معاملات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ امیر افضل نے دونوں طرح سے دیکھا قریب سے بھی اور دور سے بھی۔ اور ہر چیز کو خوب پڑھا یا سنا۔ اور ہر چیز پر پورے طور پر نگاہ ڈالی۔ یہی شے یا حالات ہیں جو امیر افضل کو بے شمار دوسرے دیکھنے والے اور لکھنے والوں سے "ممیز" کرتے ہیں۔ ان کے بیانات میں واقعات کی تاریخ بھی ہوتی ہے اور جھنجوڑ بھی ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں کا رنگ و روپ بھی اپنی قسم کا آپ ہے کہ وہ قوموں کی زندگی میں قوم کو سینہ و سپر ہو کر خون دینے کیلئے ہر وقت تیار کرتے رہتے ہیں کہ زندگانی اتنی زیادہ قیمتی نہیں۔ مسلمانوں کی جانیں اور مال رب کی ذات پاک سے خرید لیتے ہیں جس کا بدلہ آخرت کی زندگی میں جنت ہے۔ (قرآن پاک سورہ التوبہ)"

قارئین! اس عاجز نے مضامین کو عنوان ہی ایسا دیا کہ ہم تخلیق پاکستان کے "اللہ تعالیٰ کے راز" ہونے کے پہلو کو سمجھیں اور جب تک ہم مضامین کے تانے بانے تخلیق کائنات کے اللہ تعالیٰ کے مقاصد اور انسان از خود کی تخلیق کے بڑے مقصد "معرفت الٰہی" کے ساتھ نہ باندھیں کہ پاکستان معجزاتی طور پر وجود میں آیا ہے اور یہ تخلیق ماہ رمضان میں "لیلۃ القدر" کے اوقات میں ظہور ہوئی۔ تو تمام تر معاملات کو سمجھنا ایک مشکل عمل ہے۔ اس عاجز نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصّہ لیا اور 1944ء سے پاکستان کے وجود میں آنے تک اس عاجز نے برصغیر ہندو پاکستان میں جتنے سفر کئے یا جتنے لوگوں کو ملا۔ خاص کر افواج میں کام کرنے والے لوگوں یا صوبہ پنجاب کے مسلمانوں یا اپنے علاقہ سرگودھا میں مسلم لیگ والوں کے ساتھ مل کر دورے کئے۔ یا متعدّد اخبار نویسوں سے ملنے جلنے کے مواقع ملے جن میں غیر ملکی اخبار نویس بھی ہوتے تھے یا کانگرس اور مسلم لیگ کے بڑے بڑے لیڈروں کو قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ یا ان کی لکھی ہوئی کتابیں یا ان پر لکھی ہوئی کتابیں پڑھیں۔ یا ان دنوں میں جو

متعدد اخباروں کا روزانہ مطالعہ کرتا تھا۔ تو اس عاجز کی تحقیق یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ پاکستان بالکل معجزاتی طور پر وجود میں آیا۔ بے شک چند مسلم لیگی لیڈر مخلص تھے۔ کچھ اخبار نویس بھی اول اور آخر صرف مسلمان تھے۔ اور کچھ کارکنوں نے بھی اچھا کام کیا لیکن ظاہری طور پر میرے نزدیک پاکستان کی تخلیق ایک فرد واحد قائداعظم محمد علی جناح کی یکسوئی، فراست اور کاوش کا نتیجہ ہے کہ اس کافرانہ سیاسی نظام میں بات ''وکالت'' کی تھی۔ قائداعظمؒ ایک دیانتدار وکیل تھے۔ اور کئی لوگوں کو اس زمانے میں خواب آئے کہ حضور پاک ﷺ نے از خود قائداعظمؒ کا ''چناؤ'' فرمایا ہے کہ وہ مسلمانوں کی وکالت کریں اس کے علاوہ باقی ظاہر اعمال میں چند صاحبان کا نام لیا جا سکتا ہے جو ناموس رسول ﷺ پر قربان ہو گئے اور ان کے اس عمل نے ان کو غازی بھی بنا دیا اور شہید بھی اور یہ عاجز عبدالرشید، مرید حسین، علم الدین، ملک میاں محمد، دوست محمد، عبدالقیوم، محمد صدیق، عبداللہ، امیر احمد اور محمد منیر کا ذکر اکثر کر چکا ہے۔ کچھ اور بھی ہوں گے جو شہرت کو پسند نہ کرتے ہوں گے اور ان کی جزا رب کی ذات پاک کے پاس ہے۔
اس طرح مسلم قومیت کے اصول پر جو ملک وجود میں آ گیا۔ ایسی مثال صرف مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد جو ہمارے آقا ﷺ نے ایک اسلامی ملک کے طور پر شروع کی۔ پاکستان کی تخلیق اس کے متشابہ ہے۔ اور پاکستان بنا کر پہلی ضرورت یہ تھی کہ ہم جارج ششم کے جانشین بننے کے بجائے حضور پاک ﷺ یا خلفا راشدینؓ کے جانشین بنتے۔ اور اسلام کے ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا اجتماعی اور عملی نفاذ کر کے جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنا لیتے۔ چونکہ اس عاجز کو پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بہت مایوسی ہوئی۔ نہ کوئی ہم خیال ملتا تھا نہ ''ہم راز''۔ کچھ آدمی ہاں میں ہاں ملاتے تھے اور 1949ء میں کرنل شیر محمد مرحوم مجھے ایک پہلے آدمی ملے جو اس وقت بھی کرنل تھے اور میں نے تو ابھی افسری کی ابتدا ہی کی تھی۔ کرنل صاحب کو میں نے مکمل طور پر ہم خیال پایا۔ اور ہم پر جلدی عیاں ہو گیا کہ ہم دونوں ''ہم نفس'' بھی ہیں۔ چنانچہ آپ صاحبان کو جو میری یادداشتیں یا مشاہدات باقی لوگوں سے الگ طرز کے طور پر نظر آ رہی ہیں اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ پاکستان جو وجود میں آنے کے بعد جلد ہی مشکلات میں پھنس گیا حتیٰ کہ 24 سالوں کے اندر دولخت بھی ہو گیا، ہم کو بہت پہلے سے نظر آنے لگ گیا تھا کہ چونکہ ہمارے رہنما اور دانشور پاکستان کے اللہ تعالیٰ کے راز ہونے والی بات کو نہیں سمجھ پائے۔ اور ہم اپنا کعبہ درست نہیں کر رہے تو ہمیں پشتو کی کہاوت کے مطابق...... راتلونے واقعاتو دا سودے مخ کے رازئے'' کہ آنے والے حالات کا سایہ پہلے نظر آ جاتا تھا اور اس کی ''وجوہات'' جو ہمارے ذہن میں آتی رہیں۔ وہ سب صحیح ثابت ہوئے لیکن ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' اس عاجز نے حالات کے ساتھ گزارا بھی کیا لیکن اپنے مشاہدات کو بھی جاری رکھا اور جب موقع ملا تو کلمہ حق کا اعلان بھی کر دیا۔

لیکن 1979ء میں فوج سے پکے طور پر آخری بار ریٹائر ہونے کے بعد اس عاجز نے نوائے وقت میں کچھ مضامین بھی لکھے اور اپنے مشاہدات اور تاثرات یا قومی ضرورتوں کو کوئی دو درجن بھر کتابوں میں بکھیر دیا۔ اور ان کتابوں پر ہمارے ملک کے کئی دانشوروں کے بے شمار تبصرے کتابی صورت میں میرے پاس موجود ہیں لیکن یہاں پر بہت اختصار ہے۔ چند صاحبان خاص کر ملک کے مایہ ناز عالم دین اور سپریم کورٹ کے شرعی بنچ کے جج پیر کرم شاہ الازہری کے ایک تبصرہ سے بسم اللہ کی جاتی ہے۔ مرحوم و مغفور پیر صاحب نے یہ الفاظ وزارت مذہبی امور

کو لکھ کر 1981ء میں بھیجے اور مجھے کاپی دی۔ ان میں سے چند الفاظ یہ ہیں۔ "میں نے حضور سرور عالم ﷺ کے غزوات اور ہر بات کا کافی مطالعہ کیا ہے۔ بڑے بڑے قابل قدر مصنفین کی نگارشات پڑھنے کا موقع ملا۔ لیکن "جلال مصطفیٰ ﷺ" کے مصنف میجر امیر افضل نے جس اچھوتے انداز سے اس موضوع پر جو حقیقت افروز تبصرے کیے ہیں وہ انفرادی حیثیت کے حامل ہیں۔ (یعنی منفرد ہیں) جنگ احد کے بارے جو تفصیلات آج تک پڑھیں۔ ان سے ذہن میں یہی تاثر پیدا ہوا کہ اس غزوہ میں مسلمانوں کو بڑی شکست کا سامنا کرنا پڑا لیکن مصنف نے جو قرآن پاک کے حوالوں کی مدد سے جو حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا ہے اور جو نتائج نکالے ہیں تو اس سے یہ "سابقہ تصورات" درہم برہم ہو گئے ہیں کہ یہ تو مسلمانوں کی عظیم فتح تھی جس نے ابوسفیان کے لشکر کو فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔"

قارئین اس بیان میں ذرا غوطہ زن ہوں کہ سیرت النبی ﷺ کی کتابوں میں اکثر صاحبان حضور ﷺ پاک کی شان کو نہ سمجھ سکے۔ اور بیانات سے ایسے غلط تاثرات نکلتے ہیں کہ پیر صاحب پر بھی اس کے "اثرات" ہوئے۔ لیکن میری بامقصد کتابوں کا کلمہ حق ان کے سامنے آیا' تو انہوں نے جلد تسلیم کر لیا کہ ان کے "سابقہ تصورات" غلط تھے۔ تو اس عاجز نے اگر مودودی اور باقی علما کی کم علمی کا ذکر کیا ہے کہ ان کے غلط "اثرات" ہو رہے ہیں۔ تو ان کم علم لوگوں کو "مقدس گائے" بنانے والوں نے معاملات کو گہرائی سے نہ جھانکا اور اس پہلو کی طرف نہیں آ رہے کہ ہمیں سنت نبوی ﷺ کو بامقصد طور پر قوم کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ اور اس عاجز نے اس سلسلہ میں بارش کا پہلا قطرہ بن کر جو بسم اللہ کی ہے اس کو آگے بڑھایا جائے۔

گزارش کر چکا ہوں کہ اس عاجز نے جنرل احسان الحق ڈار کی غلط وقت پر سبکدوشی کی وجہ سے خلفائے راشدینؓ پر بامقصد کتابیں بڑی مشکل سے تکمیل تک پہنچائیں اور سب کتابیں فوج کی لائبریریوں میں بند پڑی ہیں۔ گو اس سلسلے میں یونٹوں سے خطوط آتے رہتے ہیں کہ علوم کے اس "ذخیرہ" کو عام کیوں نہیں کیا جاتا۔ بہرحال دو تین سال ہوئے کہ کوشش کر کے یہ عاجز لاہور سے ان کتابوں کا سول اور دوسرا ایڈیشن شائع کرا چکا ہے۔ ملک کے عظیم مفتیوں کے علمی گھرانے کے مایہ ناز فرزند اور عاشق رسول ﷺ مفتی لطف اللہ' ریٹائرڈ سیکرٹری مذہبی امور پہلے بھی اس عاجز کی کتاب "حضور ﷺ پاک کے جلال و جمال" کو اپنی نوکری کے دوران ہمارے سفارتخانوں اور حکومت کے اداروں میں پہنچا چکے تھے۔ اب جو خلفائے راشدینؓ کی کتابیں پڑھیں تو کہنے لگے کہ ان کتابوں میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو "چلتا پھرتا" اسلام کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ ان کے لئے ایک اللہ' ایک رسول ﷺ اور ایک قرآن تھا اور وہ عملی طور پر ایک امت تھے۔ برا ہو اس فرقہ واریت یا گروہ بندی کا جو بعد میں اسلام میں داخل ہوئی۔ ان کتابوں کے ایسے تاثرات کو مزید پیش رفت دینے اور پھیلانے کیلئے۔ لطف اللہ صاحب نے میری لکھی ہوئی قرآن پاک کی غیر مطبوعہ تفسیر کی ایڈیٹنگ اور اشاعت کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے کہ اس عاجز کے پاس اس کام کو "کمپوز" کرانے یا اس کی اصلاح کرانے کیلئے نہ مالی ذرائع ہیں نہ اس عمر میں کوئی بھاگ دوڑ کر سکتا ہوں' تو لطف اللہ صاحب پر یہ واردات ہوئی کہ میری باقی تصنیفات کی طرح یہ بھی منفرد کام اور وقت کی ضرورت ہے کہ قرآن پاک کی تفسیر زیادہ تر قرآن پاک کے بیانات یا احادیث مبارکہ یا راسخ تاریخی

واقعات کی مدد سے زمانے کی سائنسی دریافتوں کو ذہن میں رکھتے' اس دور کی ضرورتوں کیلئے لکھی گئی ہے۔ تو انہوں نے اس کی تکمیل کا بیڑا اٹھالیا ہے اور پہلی تین منزلیں یعنی آدھے قرآن پاک کی تفسیر اب شائع بھی ہو چکی اور باقی کام کی پہلی کتابت بھی ہو چکی ہے نظر ثانی اور تصحیح کا عمل جاری ہے۔

ضیاء الحق نے جو غلط طریقے اور غلط وقت پر جنرل احسان الحق ڈار کو ریٹائر کر دیا تو اب پوری اسلامی تاریخ کے نظریاتی اور عسکری پہلو کو وقت کی ضرورت کے مطابق آگے پیش رفت دینے کیلئے ہمارے پاس ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے۔ البتہ حضور پاک ﷺ کی سنت کے جلال کے پہلو کے ساتھ اب جمال کو بھی شامل کر کے سینکڑوں کتابوں کو ABRIDGE کر کے 534 صفحات کی ایک قرآن پاک کے تابع سنت نبوی پر ایک ایسی کتاب تیار کی گئی جس کے بارے بریگیڈئر صدیق ستی مرحوم لکھ گئے کہ انہوں نے قرآن پاک کی متعدد تفسیریں پڑھی ہیں لیکن یہ کتاب قرآن پاک کی بہتر اور عملی تفسیر ہے۔ مجھے تو اس کتاب پر نظر ثانی کرنے اور اشاعت کیلئے پائی پائی جوڑنے میں دس سال لگ گئے لیکن جنرل ڈار مرحوم اپنی وفات سے ایک ماہ پہلے اپنی وفات کی پیشگوئی کرتے کتاب اور مصنف کا تعارف لکھ کر مسودہ کی تیاری کے فوراً بعد مجھے اس ''میدان'' میں اکیلے چھوڑ کر دنیا کے قید خانہ کو الوداع کر چکے تھے۔ ان کے اس تعارف کے چند الفاظ یہ تھے۔ ''میجر امیر افضل کی نشوونما میں ایک غیر معمولی بلکہ عجیب وغریب امتزاج ہے۔ اول انہوں نے جدید جنگ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس سطح پر نہیں جہاں لڑائی کا شور سنائی دیتا ہے یا آتش بازی یا صرف فولادی کنکروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان کا واسطہ ہاتھا پائی اور مڈبھیڑ کی لڑائی سے بھی رہا۔ وہ دشمن کو سامنے' دائیں اور بائیں آگے پیچھے دیکھتے تھے اور اسے بارود اور زور بازو سے روکتے بھی رہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے جنگ کا ایک خاص مطالعہ بھی کیا۔ عملی طور پر بھی اور عقلی طور پر بھی۔ عملی طور پر وہ اپنے اس مطالعہ کو نیچے کی سطح کی تدبیرات کیلئے استعمال کرتے رہے اور عقلی طور پر جنگ کے اسباب۔ اس کی حقیقتیں۔ اسکے تقاضے اور تزویراتی یا حکمت عملی کے اصولوں میں غوطہ زن ہوتے رہے۔ اس پس منظر میں جو حقیقی آتش پنہاں تھی۔ وہ میجر امیر افضل کا اسلام کے ساتھ رشتہ ہے۔ انکی پرورش' اسلامی عقائد کی سخت پیروی والے ماحول میں ہوئی اور دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس لئے فوجی نوکری میں انہوں نے سالہا سال کی ریاضت اور مطالعے سے جو نتائج نکالے' اور عملی عسکری زندگی میں انہوں نے جو عملی سبق سیکھے تھے اب انہوں نے ان کا کھلم کھلا اعلان کر دیا گو ''نازک مزاج شاہاں'' پر یہ بات گراں گزری۔ چنانچہ زیر نظر کتاب میں اس کی علمی اور عقلی افادیت سے قطع نظر انداز بیان اس قدر پیارا ہے کہ خود بخود دل میں تحریک پیدا ہوتی ہے اور آنکھوں میں ایک طوفان اٹھتا ہے کہ قلب ونظر کی یہ کیفیت بیان کرنا مشکل ہے۔ اسلامی فلسفہ حیات کے بارے میں بیان عملی نقطہ نظر سے کسی داستان پارینہ کا سایہ کے طور پر نہیں بلکہ روزمرہ کی سائنسی اور تکنیکی تصادم کو مدنظر رکھ کر میرے خیال کے مطابق پہلی دفعہ پیش کیا جا رہا ہے اور اسلامی فلسفہ دفاع تو یقیناً پہلی مرتبہ پیش کیا گیا ہے۔''

اب قارئین خود اندازہ لگائیں کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد یہ پہلی ضرورت تھی کہ حکمران یا علما' یا دانشور چند الفاظ میں قرآن پاک اور سنت کی مدد سے اسلامی فلسفہ حیات کا ایک PREAMBLE تیار

کرتے جس پر قومی اتحاد پیدا کر کے عمل پیرا ہونے کی ضرورت تھی کہ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ تخلیق انسانی کے مقاصد کیا تھے؟ اور اس سلسلہ میں رب کی ذات پاک نے اس کائنات کی تخلیق اس انسان کے لئے ایک گزرگاہ کے طور پر کی کہ انسان کو عالم خلق میں امتحان کیلئے مختلف راستوں پر ڈال دیا گیا ہے اور عالم خلق ایک عارضی چیز ہے جو کچھ عرصہ کیلئے متوازی طور پر عالم امر کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے کہ اصلی چیز عالم امر ہے۔ اسی میں ہمارا وجود ظاہر ہوا اور اس عالم خلق میں امتحان کے پرچے دے کر اسی عالم امر میں ہماری رجعت اور واپسی ہے۔ ہم نے اپنے تمام حکومتی نظاموں کو یا معاشرہ کو اس نظریہ حیات کے اصولوں کے تابع کرنا تھا۔ لیکن ہمارے علما نے اس سلسلہ میں دھیلے کا کام نہ کیا اور اس عاجز نے مودودی سمیت ان علما کی ''کم علمی'' کی بات کی تو ان لوگوں کے ''اندھے پیروکاروں'' نے مجھے غلط ثابت کرنے کی بجائے اعتراض برائے اعتراض پر گزارا کیا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ملک کے دور دراز علاقوں سندھ میں کنڈکوٹ اور سرحد میں بُونیر شریف تک سے عام لوگ یہ کتاب پڑھ کر مجھے ملنے آئے لیکن ہمارے دانشوروں اور علما کے کان پر جوں بھی نہ رینگی کہ کوئی یہ کچھ پڑھ لیتا یا اس تحقیق کو آگے پیش رفت دیتا کہ یہ کام بھی مجھ کو خود کرنا پڑا کہ ملک کے مایہ ناز سائنس دان سلطان بشیر محمود کے ساتھ مل کر اس سلسلہ میں دو مزید کتابیں لکھیں۔ اول ''روز قیامت اور حیات بعد الموت'' اور دوسری ''قرآن پاک کے نئے نئے سائنسی معجزات'' کہ اس فلسفہ حیات کے طبعی اور سائنسی پہلوؤں کو قرآن پاک کے انکشافات کے تابع کیا یعنی ''روحانیت اور برہانیت'' کو شیر وشکر کیا کہ ہم اس فلسفہ حیات کا غیروں کے فلسفہ حیات اور باطل سوچوں سے موازنہ کر کے ساری انسانیت کی رہنمائی کریں کہ باقی لوگوں کی سوچیں کتنی غلط ہیں۔ اور اہل کتاب کس طرح اپنے عقائد کو زنگ آلود کر چکے ہیں۔

فوجی افسران نے فوج کی پیشہ وارانہ تربیت میں غفلت برتی

جہاں تک اسلامی فلسفہ دفاع کا تعلق ہے اس سلسلہ میں بھی عام دانشور اور علما تو ''خاموش'' ہیں۔ البتہ بریگیڈئر گلزار احمد اور کرنل شیر محمد نے اس سلسلہ میں کچھ بنیادی کام کیا تھا۔ اور اس عاجز نے کتاب ''اسلامی نظام حکومت'' لکھ کر قوم کو آگاہ کیا ہے کہ جہاد ہمارے لئے طرز زندگی ہے اور اس کو زندگی کے ہر عمل پر ترجیح ہے۔ البتہ یہ ذکر پہلے کیا جا چکا ہے کہ جنرل امیر حمزہ نے اپریل 1994ء میں جنرل وحید کاکڑ کو خط لکھا کہ یہ جو ہم نے پارکوں میں ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے بورڈ لگائے ہوئے ہیں یہ لیپا پوتی ہے۔ ہماری فوج جہاد کے تقاضوں کو نہیں سمجھتی۔ اس سلسلہ میں میجر امیر افضل کی کتابوں سے استفادہ کیا جائے۔ لیکن جنرل وحید کاکڑ کو زیادہ شوق ''گھڑ سواری'' کا تھا کہ فوجی دستہ کی حفاظت میں روزانہ کی گھڑ سواری اس کیلئے زیادہ اہم تھی۔ فوج کی تربیت میں وہ بھی مکھی پر مکھی مار رہا تھا کہ جنرل کے ایم عارف وغیرہ کا زیادہ وقت ''شعر و شاعری'' کی ذہنی عیاشی میں گزار کر ایک غلط مثال قائم کر گیا تھا۔ اور ہمارے فوجی سربراہوں نے فوج کی پیشہ ورانہ تربیت کے ساتھ ''بے دھیانی'' والا رویہ برتا۔

جنرل احسان الحق ڈار مرحوم نے اپنے زمانے کے ''پر آشام حالات'' پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ اشارہ بھی کیا تھا کہ اس طوفان برق و باراں کو سنبھالا دینے والے جب اپنی کوشش میں ناکام ہوئے تو انہیں دوسرے اور بہتر

لوگوں کیلئے میدان خالی کر دینا چاہیئے اور ان الفاظ میں انہوں نے ایک طرح سے کہہ دیا تھا کہ وہ تو جا رہے ہیں۔ اور ساتھ آنے والے پاکستانی افواج کے قائدین کو مشورہ دے گئے تھے کہ میجر امیر افضل کی کتاب میں وہ سب کچھ پائیں گے جن سے راہ راست اور صحیح طریق کار اختیار کرنے میں مدد ملے گی۔ انہوں نے کتاب کے ''انداز بیان'' پر تبصرہ کیا۔ اس کو جنرل سید رفاقت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ ''کتاب کی سطر سطر عشق رسول ﷺ سے مہک رہی ہے۔ صداقت، خلوص، روانی، تحقیق اور عقیدت کا یہ دل کشش امتزاج پڑھنے والے پر ایک گوناں گوں آسودگی کا گہرا اثر پیدا کرتا ہے۔ قاری اپنے گرد ایک حلقہ تنویر محسوس کرتا ہے اور جی یہی چاہتا ہے کہ اس حلقہ تنویر کی روحانی آسودگی میں بیٹھے اور اس مانوس تنفس کی صدا سنتا رہے۔'' اس سلسلے میں اگر جنرل رفاقت کے پورے تبصرے لکھے جائیں یا باقی تبصرہ کرنے والوں کے اثرات اکٹھے کیے جائیں تو یہ مواد کئی صفحات میں ختم نہیں ہوتا اور گو ہم پوری اسلامی تاریخ تو نہ لکھ سکے لیکن تحریک پاکستان یا پاکستان پر جو چند کتابیں لکھیں تو سامنے مقصد یہ تھا کہ سورہ الانعام کی آیت مبارکہ 162 کے مطابق ہمارا جینا، مرنا، نمازیں اور عبادتیں رب العالمین ذات پاک کیلئے ہیں کہ مقصد یہ سامنے ہو کہ روز قیامت رب کی ذات پاک کو کیا جواب دیں گے۔ یعنی تاریخ برائے تاریخ نہ لکھی اور باقی مورخین کی طرح مارگلہ پہاڑ کے پتھروں یا ٹیکسلا اور ہڑپہ یا موہنجوداڑو کی باطل تہذیبوں کے نشانات یا پتھروں کو ''پوترِ'' تسلیم کرنے پر وقت ضائع نہ کیا، نہ ان باطل تہذیبوں کی معاشرتی زندگی کے مطالعہ پر وقت ضائع کیا۔ ہمارے لئے پاک اور پوترِ رب کی ذات پاک اور اس کے حبیب ﷺ ہیں اور ہم نے نظریات کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی ضرورتوں کو ترجیح دی۔ اور باقی مصنفوں کی طرح کتابیں ذہنی عیاشی کیلئے نہ لکھیں کہ سامنے مقصد یہ تھا کہ روز قیامت شرمندگی نہ اٹھانا پڑے کہ مقصد نہ ہو تو یقین کی حاجت نہیں رہتی اور مقصد نہ ہو تو عمل کا رخ متعین نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ یہاں پر اپنا تعارف اور اپنی تحریک پر مختصر تبصروں کے مایہ ناز دانشور جنرل سید رفاقت کے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔'' میجر امیر افضل کے ساتھ میری شناسائی، دوستی اور رفاقت نصف صدی سے زیادہ وقت کا قصہ ہے یعنی چند دنوں کی بات نہیں۔ ہم 1950ء کے وسط میں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ جبکہ میں عسکریات کا طفل مکتب (کیڈٹ) تھا اور امیر افضل ''کیڈٹ'' کا بھیس بنا کر تماشائے اہل حرب دیکھ رہے تھے۔ کیڈٹ کو موم مثال خام مواد سمجھا جاتا ہے۔ جسے ''سسٹم'' جیسے چاہے ایک مروجہ اور بچے تلے سانچے میں ڈھال دے۔ لیکن امیر افضل اس وقت بھی کسی گھسے پٹے سانچے میں ڈھلنے کیلئے نہ موم مثال تھا، نہ خام مواد۔ ان کا دراز قد کشادہ سینہ مضبوط جسم بلند آواز پختہ خیال اور جنگ عظیم دوم کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ان کی شخصیت کو نمایاں انفرادیت بخشتے۔ اور یہ خوبیاں کیڈٹ کے روایتی تشخص میں چھپانے کی ہزار کوشش کے باوجود ہر روز ہر لحہ کسی نہ کسی رنگ میں پھوٹ پڑتیں۔ ان کی حق گوئی اور بے باکی کا اس زمانے میں بھی چرچا تھا۔ اور یہ خوبی عمر بھر ان کے ساتھ رہی۔ اس خوبی نے جہاں انہیں بے مثال روحانی رفعتیں بخشیں۔ وہاں بے پناہ ذہنی اور جسمانی اذیتوں کا باعث بنیں۔ اور دونوں کیفیتوں کا ذکر ان کی سب تحریروں میں اکثر اور بھرپور نظر آتا ہے۔ انہوں نے انگریز اور اس کی سلطنت کو خوب دیکھا جب وہاں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ پھر یہ سورج ڈوبتا بھی دیکھا۔ لیکن انگریز اپنے مکارانہ ریاکارانہ اور سازشی جوہر کو اپنی سلطنت سمیٹتے وقت یہاں کیسے چھوڑ گئے۔ میجر امیر افضل نے اس پہلو

کو خوب بھانپا۔ اور ایک مجاہد، محقق اور مصنف کے طور پر انہوں نے اپنے مشاہدات، تجربہ، تحقیق اور مطالعہ کا بے پناہ خزینہ اپنے سینے میں اکٹھا کر لیا۔ اور عرصہ سے آپ مضامین اور خطوط کی شکل میں اپنے تاثرات قارئین تک پہنچا رہے تھے۔ لیکن پچھلے چند سالوں سے جب وہ باقاعدہ تصنیف کی طرف متوجہ ہوئے۔ تو گویا ایک بند تھا جو ٹوٹ پڑا۔ اور اب تو ان کے قلم کی رفتار، خیالات کا بہاؤ اور جذبات کی اٹھان کو دیکھ کر قاری پر ایک ہیبت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ امیر افضل اب ایک طوفان کی صورت اور قوت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ جو باطل کی ساری کرشمہ سازی کو خس و خاک کی طرح بہا کے لے جائے گا۔ اس خش و خاک میں وہ شخصیات بھی شامل ہیں جن کا اعتقاد ضعیف اور ایمان متزلزل ہے۔ اس عہد جہالت کی اصطلاحات، تعلیمات اور نظریات بھی شامل ہیں جنہیں یہ طوفان حق بحیرہ عرب میں ڈبونے کا عزم رکھتا ہے۔"

"امیر افضل نے ایک نیا طرز تحریر اور اسلوب بیان ایجاد کیا ہے جسے ہوا کے الٹے رخ اڑتے ہوئے شاہین کی پرواز سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ بظاہر وہ ایک پر عظمت بلندی سے ان واقعات حادثات اور شخصیات کے ٹکراؤ یا تعاون سے بنتی اور بہتی تاریخ کا نظارہ کر رہے ہوتے ہیں لیکن ان کی عقابی نگاہ ہر وقت اور ہر مقام پر اس شکار کی تلاش میں بھی رہتی ہے۔ جو چوہے، بچھو یا سانپ کی طرح اسلام کے بنیادی اعتقادات کو کترنے یا ڈسنے سے کبھی گریز نہیں کرتے۔ اس قسم کے چوہے، بچھو یا سانپ (بشمول مار آستیں کے) جہاں ذرا بھی حرکت کریں وہ امیر افضل کی عقابی نگاہ سے چھپ نہیں سکتے۔ یہ شاہین ایک ہی لپک اور جھپٹ میں ان مردہ حشرات کو اٹھا لیتا ہے اور دلائل کے پنجوں میں مسل کر پھینک دیتا ہے۔ اور چند لمحوں کی اس ہیبت ناک مگر پرشکوہ تبدیلی (DIVERSION) کے بعد پہلی بلندی سے معمول کی پرواز میں لگ جاتا ہے ان کا یہ انداز بیان قارئین کیلئے ایک مخصوص جاذبیت رکھتا ہے میں نے خود جب بھی ان کی کوئی تحریر پڑھی تو نہ صرف اپنے شعور کو ان کی تحقیق سے محظوظ ہوتے پایا بلکہ اپنے اعتقادات کو بھی ایک تطہیر کے عمل سے گزرتے دیکھا۔"

"اب مثال کے طور پر ان کی کتاب "اسلامی نظام حکومت" کو لیں اس سلسلہ میں کتاب لکھنے کا بنیادی مقصد اور مرکزی نکتہ تو یہ تھا کہ مسلمان کے تصور حیات و ممات کے تناظر میں ایک جامع حکومتی خاکہ پیش کیا جائے اور انہوں نے انتہائی محنت کر کے قرآن پاک اور قرآن پاک کے تابع سنت نبوی ﷺ کی مدد سے یہ خاکہ پیش کرتے وقت جس پہلو پر زیادہ زور دیا ہے یا جہاں اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے تو وہاں زیادہ وقت ان سوالات کے جوابات ہیں کہ نظام حکومت کیوں ایسا ہے اور یہ کس کیلئے ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ پہلو طے کرنے کی کوشش کی ہے کہ خود انسان ہے کیا؟ اور اس کی زیست کیوں؟ اور کس کیلئے ہے؟ چنانچہ امیر افضل اب ایک تحریک کی صورت اختیار کر چکا ہے لیکن وہ کوئی نیا فلسفہ پیش نہیں کر رہا۔ وہ تو صرف رسول ﷺ عربی کے اسلام کے کلی اور بلاشرط نفاذ کا داعی ہے اور ہر وہ شخصیت یا فلسفہ یا ادارہ یا اصطلاحات یا روایت جو قرآن حکیم کے واضح احکام سے متصادم ہو یا رسول ﷺ عربی کی اطاعت سے راہ فرار اختیار کرے۔ ان کے خلاف وہ پیہم حالتِ جنگ میں ہیں اور یہی ایک سچے مسلمان کا مقصد حیات ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات پاک نے میجر امیر افضل کو اسلوب بیان بھی خوب بخشا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں تحقیق

اور تجزیہ کی بھرپور صلاحیت ہونے کے باوجود اپنے اسلوب بیان' زبان کے چناؤ اور الفاظ کے انتخاب میں سادگی اور سچائی سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ میں ان کی تحریروں کو اکثر تحیر کی کیفیت کے ساتھ پڑھتا ہوں کہ کیسے یہ شخص چند سو الفاظ پر مشتمل لغت کے سہارے اتنی گہری باتیں اور اتنی جاندار اور موثر نثر لکھ لیتا ہے۔ پھر مجھے گویا غیب سے جواب مل جاتا ہے۔ آخر حضور ﷺ پاک کا ''سپاہی'' ہے اس کملی والے کا ''سپاہی'' ہے جن ﷺ کے متعلق جناب ظفر علی خان نے کہا تھا......

جو فلسفیوں سے حل نہ ہوا
اور نکتہ وروں سے کھل نہ سکا
وہ راز اس کملی والے نے
بتلا دیا چند اشاروں میں

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ زور قلم میں مزید برکت بخشے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے یہ قطعہ اپنے علاوہ میجر امیر افضل کی تحریروں کے متعلق لکھا تھا۔ جس میں علامہ کے الفاظ امیر افضل کے اسلوب بیان اور مضمون داستان پر جامع خوبصورت تبصرہ ہے۔

''انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں مری بات
یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات''

پاکستان کی زندگی نصف صدی سے اوپر ہو چکی ہے لیکن آج تک چند الفاظ میں پاکستان بنانے کے ہمارے مقاصد کو کسی صاحب نے بیان نہیں کیا۔ ہم آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ ہم حضور ﷺ پاک اور خلفائے راشدینؓ کے ''جانشین'' ہیں یا جارج ششم کے یا دونوں طرفوں کے۔ یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکے کہ حکومت اللہ تعالیٰ ذات پاک کی ہے یا لوگوں کی یا دونوں کی۔ یہ عاجز ان باتوں کو نہیں دہرانا چاہتا جو پہلے بڑی تفصیل یا وسعت سے بیان ہو چکی ہیں لیکن چند ''اشارے'' ضروری ہیں کہ پاکستان کے پہلے حکمران لیاقت علی نے ہمیں کیا دیا کہ قوم کو کشمیر کے مسئلہ میں ایسے الجھا گیا جو دو تہائی کشمیر ہم نے آزاد کرا لیا تھا جہاد کو جمود دے کر اس سے آدھا بھارت کو واپس کرا دیا اور ہم کشمیر کے ساتھ صرف اپنے دانت ''اڑائے'' ہوئے ہیں۔ انگریزی تربیت یافتہ فوج اور سول بیوروکریٹس کو ہم پر ایسے سوار کر گیا کہ ایک سول بیوروکریٹ سکندر مرزا جو غدار میر جعفر کی اولاد سے تھا۔ فوج کی مدد سے پاکستان بنانے والی جماعت مسلم لیگ کے تین چوٹی کے لیڈروں سہروردی' چندریگر اور فیروز خان نون کو وزیراعظم کی گدی پر بٹھا کر ''ٹشو پیپر'' کی طرح پھینک دیتا ہے۔ اور قوم کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ اور بعد میں بری فوج کا سربراہ ایوب خان ملک کی باگ ڈور اس طرح سنبھال لیتا ہے کہ پاکستان کی آج تک کی تاریخ بری

فوج کے سربراہ کی شخصیت کے گرد گھومتی ہے۔ یہی بہت بڑا المیہ ہے کہ ان فوجیوں نے نہ اپنے فوجی سپہ گری کے پیشہ کی طرف دھیان دیا نہ یہ لوگ ملکی معاملات کو چلانے کے اہل تھے۔ ابن الوقت لوگ ایوب خان کو ایک طرف ایشیا کا ڈیگال بنا رہے تھے۔ تو ادھر اس کو اکبر بادشاہ کے ہم پایہ حکمران بنا رہے تھے۔ اور ایوب خان سات سال بری فوج کا سربراہ رہا اور گیارہ سال ملک کا حاکم۔ اتنا وقت کسی اور کو نہ ملا اس میں ذرا بھر مومن کی فراست ہوتی اور وہ مجاہد یا مومن بن جاتا اور قوم کو اللہ تعالیٰ کی فوج بنانے کے اس کو رب کی ذات پاک نے سنہری مواقع بخشے تھے۔ اس برعظیم میں تاریخ کا دھارا تبدیل ہو جاتا اور یہ علاقے مسلم انڈیا بن جاتے اور کشمیر کو غاصب بھارتیوں کے پنجوں سے آزاد کرانا تو معمولی کام تھا کہ یہ عاجز ثابت کر آیا ہے کہ مکھی پر مکھی مارتے ہوئے موجودہ صورتحال میں بھی 1962ء یا 1965ء تک ہم اس قابل تھے کہ اگر پیدل فوج میں وہ اضافہ کر دیتے جو ستمبر، اکتوبر 1965ء میں کیا۔ تو دہلی تک پہنچنا اور کشمیر کی غاصب بھارتی فوج کا رابطہ بھارت سے کاٹ دینا۔ یا بھارتی فوجی مشینری کو مشرقی پنجاب میں تہس نہس کرنا بالکل آسان تھا۔

کوئی آدمی جنرل کے طور پر پیدا نہیں ہوتا۔ اپنے مطالعہ اور اپنے ذہن کو تربیت دے کر انسان روحانی اور برہانی ''مقامات'' حاصل کرتا ہے کہ ہمارے آقا ﷺ کا فرمان ہے کہ...... ''جو کل والے ''مقام'' پر رہا وہ گھاٹے میں رہا'' کہ روزانہ مقامات میں عروج ہونا چاہیئے۔ اور مسلمانوں کو تو ایمان کی دولت میسر ہے۔ اسی وجہ سے یہ عاجز قوم کو بار بار گزارش کر رہا ہے کہ آؤ مومن بن جائیں کہ ایمان کے ایسے درجات ہیں کہ دنیاوی علوم بھی آ کر مومن کے سامنے ہاتھ باندھ کر ''کھڑے'' ہو جاتے ہیں کہ آؤ ہم سے استفادہ کرو۔'' حضور ﷺ پاک نے بات مومن کی فراست کی فرمائی تھی۔ مسلمان کیلئے فراست کو ضروری نہ قرار دیا کہ یہ تو ''تسلیم'' کی بسم اللہ ہوتی ہے، اس کے آگے کئی مرحلے ہوتے ہیں کہ پھر قلب کی تصدیق کا مرحلہ آتا ہے اور یہ جاری عمل ہے کہ ایمان میں اور فراست میں عروج ہوتا رہتا ہے۔ کہ ہمارے ہاں جو علم کے حاصل کرنے کے بارے ایک حدیث مبارکہ کا ذکر کیا جاتا ہے کہ حضور ﷺ پاک نے فرمایا کہ...... ''علم حاصل کرو خواہ اس کے لئے ملک چین میں جانا پڑے۔'' یہ بہت ضعیف قسم کی حدیث ہے کہ کسی صحاح ستہ کی کتاب میں یہ حدیث موجود نہیں۔ اگر حضور ﷺ پاک نے ایسا فرمایا تو یہ ہنر والے علم کے بارے ہو سکتا ہے۔ نظریاتی علم کے بارے تو کہیں جانے کی ضرورت نہیں کہ ایک متفقہ علیہ حدیث مبارکہ ہے کہ حضرت عمرؓ کو ہمارے آقا ﷺ نے تورات پڑھتے دیکھا تو اس عمل کو سخت ناپسند فرمایا اور جناب صدیق اکبرؓ نے حضرت عمرؓ کے ہاتھ سے تورات لے لی کہ فرمایا...... ''اے ابن خطابؓ! دیکھتے نہیں ہو کہ رحمت للعالمین ﷺ کے چہرہ مبارک پر کتنا غصہ ہے کہ ہمارے پاس سب نظریاتی علوم ام الکتاب قرآن پاک میں موجود ہیں''۔

قائداعظم نے ترس کھا کر ایوب خان کو میجر جنرل بنا دیا

یہ بڑا ہی اہم نکتہ ہے بلکہ نظریہ حیات کے سلسلہ میں ہم نے دوسروں کی بھی رہنمائی کرنا ہے۔ پہلی آسمانی کتابیں ''وقتی'' تھیں کہ رب کی ذات پاک نے ان کی حفاظت نہ فرمائی اور لوگوں نے ان میں ترمیمیں بھی کر دیں اور اضافے بھی کئے۔ سورۃ الحجر کے مطابق قرآن پاک کی حفاظت رب کی ذات پاک خود کرتی ہے کہ

ایک لفظ کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کتاب اور ہدایات پکی اور دائمی اور ہمیشہ کیلئے ہیں۔ ہم نے کسی سے کچھ بھی نہیں سیکھنا۔ غیر ہمیں ہنر یا سائنسی مضامین بھی نہ سکھلائیں گے۔ خود ہم نے ایمان کے ایسے درجہ پر پہنچنا ہوتا ہے یا مومن کی فراست حاصل کر لینا ہوتی ہے کہ سب علوم ہاتھ باندھ کر ہمارے سامنے آ کر کھڑے ہو جائیں۔ ایوب خان' ڈیگال اور اکبر بادشاہ کے ''مقامات'' تو حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن میں اپنے مضامین میں گزارش کر چکا ہوں کہ میں نے اس کے بیٹے اختر ایوب کو کئی دفعہ سمجھایا کہ ایوب خان اسلام کی چھتری اوڑھ لے۔ لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہ مومن اور مجاہد نہ بن سکا نہ قوم کو ''حزب اللہ'' بنانے کے بارے کبھی سوچا۔ اس نے اپنے نفس کو سمجھنے کیلئے کبھی ماضی میں شاید ''جھانکنے'' کی کوشش بھی نہ کی کہ سوچتا کہ 1944ء میں برما محاذ پر دریائے چندون کے نزدیک اس کے ڈویژن کمانڈر میجر جنرل ریس نے اس کو پلٹن کی کمانڈ کرنے کا اہل نہ سمجھ کر' کرنل سے میجر بنا کر دہلی واپس بھیج دیا تھا۔ جس کا یہ راقم چشم دید گواہ ہونے کا ذکر اپنے مضامین میں کر چکا ہے۔ کہ وہاں دہلی میں دیسی افسروں کو ہر حال کچھ ترقی دینے کی پالیسی تبدیلی ہو رہی تھی تو ایوب خان کو ایک دوسرے درجہ کی پلٹن کا کرنل تو بنا دیا گیا تھا اور پھر اس کی قسمت جاگ اٹھی کہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر موجودہ پانچویں پنجاب کی کمانڈ کے سلسلے میں دو انگریز کرنلوں میں جھگڑا ہو گیا تو ایوب خان چونکہ اس پلٹن کے پرانے افسر تھے تو ان کو پکی پلٹن کی کمانڈ تو مل گئی لیکن انگریزوں نے ایوب کو بریگیڈیئر بنانے کا اس کا نمبر کاٹ دیا تھا۔ یہ تو قائداعظمؒ کی مہربانی تھی کہ 14 اگست 1947ء کو انہوں نے ایوب خان کو بریگیڈیئر بنوا کر اس کو ''باؤنڈری فورسز'' میں پاکستان کا نمائندہ مقرر کرایا جہاں ایوب خان نے قائداعظمؒ کو بھی ''مایوس'' کیا۔ اور ایک دفعہ پاکستان میں ایوب خان کا میجر جنرل بننے کا نمبر بھی کاٹ دیا گیا تھا لیکن قائداعظمؒ کو گزارش کی گئی کہ ایوب کو باؤنڈری فورس میں ناکام کرانے والا انگریز میجر جنرل ریس وہی تھا جس نے ایوب کو کرنیلی سے توڑ کر میجر بنایا تھا اور باؤنڈری فورس میں اس پرانی ضد کی وجہ سے ایوب کو ناکام کرایا تو قائداعظمؒ کو ایوب خان پر ترس آ گیا اور انہوں نے اس کو میجر جنرل کے عہدہ پر ترقی دے دی۔

اب ایوب خان اگر یہ سب کچھ یاد رکھتا کہ وہ کتنا معمولی آدمی تھا اور 1954ء تک اس کا مطالعہ یا ملکی اور غیر ملکی معاملات کے بارے کتنا تھوڑا تھا کہ بری فوج کا سربراہ بن جانے کے باوجود اس کو یہ بات پوری طرح سمجھ نہ آ رہی تھی کہ عراق کا بادشاہ اور نوری السعید جیسی شخصیتیں پاکستان کا دورہ کن مقاصد کے تحت کر رہے تھے کہ رب کی ذات نے اس پر کتنی مہربانی کی کہ اس کو پاکستان کا سربراہ بنا دیا تو اس کو زیادہ وقت عاجزی کے ساتھ گزارنا چاہیئے تھا اور اپنے گرد مومن کی فراست والے لوگ اکٹھے کر کے ملک کو چلانا چاہیئے تھا۔ اسی چیز کو ہم بار بار دہرا رہے ہیں کہ حضور ﷺ پاک نے جو اپنے نفس کو پہچاننے کی تاکید فرمائی تھی کہ اپنی وقعت کو پہچانو۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں جب نااہل لوگوں کو ''بڑائیاں'' مل جاتی ہیں تو وہ اپنے گرد اپنے سے بھی زیادہ ''نااہل'' ''بے وقعت'' اور ''ابن الوقت'' لوگ اکٹھے کر دیتے ہیں کہ ان کی ''کرسی'' کو کوئی خطرہ نہ ہو۔

جنگ عظیم دوئم میں ہٹلر کی کامیابیوں نے سب کو حیران کر دیا تھا تو اس عاجز نے جرمن قوم کی تاریخ اور ان کے بڑوں کے کردار کا کچھ مطالعہ کیا تھا کہ ہر بڑا اور اہم آدمی اپنے ماتحت کردار والے اور قابل لوگوں کو رکھتا تھا اور ایک ایک آدمی سے یہ عاجز بہت متاثر ہوا۔ خاص کر جنرل ہنڈبرگ جس کی زار روس کی فوجوں کے خلاف

جنگ عظیم اول میں فتوحات کی وجہ سے اس جنگ میں جرمنی مکمل شکست سے بچ گیا اور جب جرمنی کا شہنشاہ قیصر ولیم تخت سے دستبردار ہو گیا تو یہی جنرل ہنڈبرگ جرمنی کا پہلا صدر بنا تھا۔ اس کی یادوں میں وہ اپنے ماتحتوں کی قابلیتوں کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ خاص کر اپنے نائب اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل لنڈنروف کے بارے کہتا ہے کہ وہ اتنا بڑا مدبر اور کردار والا تھا کہ میں کسی وقت بھی اپنا عہدہ چھوڑ کر یہ بھاری ذمہ داری اس کے سپرد کرنے کو تیار ہوتا تھا اور بے شک ان دونوں یعنی جنرل ہنڈبرگ اور جنرل لنڈنروف نے جنگ عظیم اول میں جرمن قوم کی عزت اور غیرت قائم رکھنے میں اہم کام کیا۔

ادھر قارئین ذرا میرے مضامین کے کچھ نکتے یاد رکھیں کہ ایوب خان ''بے وقعت'' آدمیوں سے کام چلواتا تھا کہ کوئی لائق یا قابل آدمی اس کو کرسی سے اتار نہ دے۔ 1956ء میں ایوب خان نے متعدد جنرلوں کے نمبر کاٹ کر میجر جنرل محمد موسیٰ کو اپنا نائب اور چیف آف سٹاف بنایا کہ اس سے سینئر مسعود شیخ' حیا الدین' شیر علی' عبداللطیف اور شاہد حامد ہر لحاظ سے اور خاص کر فن سپہ گری کی شُد بُد میں محمد موسیٰ سے بہتر تھے کہ انہوں نے جنگ عظیم دوم میں شرکت کر کے جنگ کے تجربات بھی حاصل کئے تھے۔ محمد موسیٰ نے جنگ کا سارا زمانہ عراق اور ایران میں انگریزوں کی خفیہ سروس کے ''مخبر'' کے طور پر گزار دیا۔ اور بغیر کمپنی کی کمانڈ یا پلٹن کی کمانڈ کے کرنل بن گئے کہ پاکستان بننے کے بعد چند دن ایک بریگیڈ کی کمانڈ کی اور پھر ایک دو بریگیڈوں والے لولے لنگڑے ڈویژن کی کمانڈ کی کہ 1956ء میں ایوب کے نائب بن گئے اور 1958ء میں بری فوج کے سربراہ۔ ستمبر 1965 کی جنگ میں ہم کوئی کامیابی نہ حاصل کر سکے اس کی ایوب اور موسیٰ دونوں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ موسیٰ کے اکثر جونیئر اس کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور اس کا مذاق اڑاتے رہتے تھے۔ اور یحییٰ خان اور اس کا ''سایہ'' عبدالحمید ویسے بھی موسیٰ کو ''بے وقوف'' بناتے رہتے تھے کہ انکو منہ بنا کر انگریزوں کے لہجہ میں انگریزی بولنے کا ہنر آتا تھا اور وہ بڑے پیشہ ور فوجی بنے ہوئے تھے۔ اور جنرل موسیٰ ان سے ''مرعوب'' تھا کہ جنرل عبدالحمید نے لڑائی لڑنے کا ایک بوگس طریقہ ''ایجاد'' کر کے موسیٰ کو مرعوب کیا ہوا تھا۔ اور یہ عاجز اپنے مضامین میں اس بوگس طریقہ جنگ کے بارے بہت کچھ بیان کر چکا ہے کہ عملی طور پر ستمبر 65ء کی جنگ میں ہم نے اس طریقہ کو ایک دن بھی نہ اپنایا۔

علاقے یا لوگوں پر حکومت مقصد نہیں ہوتا مقصد لوگوں کے دلوں پر حکومت کرنا ہوتا ہے

پاکستان بچ اس وجہ سے گیا کہ رب کی ذات پاک نے ہماری فوج میں جگہ جگہ کچھ مومن کی فراست والے لوگ پھیلائے ہوئے تھے جن کے جذبہ جہاد کی وجہ سے ہم بچ گئے کہ اصلی بات یہ ہے کہ موجودہ مغربی دفاعی نظام جو ہم نے اپنایا ہوا ہے۔ یہ ہمارے مسائل کا حل نہیں۔ اسلام کے لحاظ سے پوری قوم کو جہاد طرز زندگی کے طور پر اپنانا پڑتا ہے اور پیشہ ورانہ افواج کی جڑ اس سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح والی قوم میں ہوتی ہے کہ ''قتال یا جنگ'' کیلئے ایسی تزویرات اور حکمت عملیاں اپنائی جاتی ہیں کہ کم طاقت اور کم نفری کو بھی قرآن پاک میں بیان شدہ جنگی اصولوں کے ذریعہ سے اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ ہر محاذ پر دشمن کے ساتھ توازن حاصل کر لیا جاتا ہے اور پھر متحرک طرز جنگ کی تدبیرات اپنا کر دشمن کو اپنی چنی ہوئی زمین پر اور اپنے چنے ہوئے وقت پر جنگ کیلئے

ناکارہ کر دیا جاتا ہے اور علاقے یا لوگوں پر حکومت مقصد نہیں ہوتا۔ بلکہ مقصد لوگوں کے دلوں پر حکومت ہوتا ہے کہ اسلامی نظریہ حیات یا فلسفہ حیات پر عمل کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے۔ افسوس نہ ایوب کے زمانے میں اور نہ بعد میں قوم یا فوج نے یا ہمارے دانشوروں یا علما کا لبادہ اوڑھنے والوں نے اس بنیادی ضرورت کی طرف کبھی دھیان دیا۔

ایوب دور کے دو اور تحفے ''ذوالفقار علی بھٹو اور یحییٰ خان ہیں۔'' ایوب کی سیاسی چھتری کے نیچے یحییٰ ڈنڈ بیٹھکیں نکالتا رہا۔ ان دونوں نے ملک کیلئے جو کچھ کیا اس پر مزید تبصرہ کر کے اپنا سر ہی پیٹنا پڑتا ہے کہ اس ملک میں بڑی اہمیت فوجی سربراہ کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ خاص کر بری فوج کے سربراہ کو۔ اور اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو قائم رکھنا ہے تو اس نے ذوالفقار بھٹو سے جنرل ٹکا خان کو بری فوج کا سربراہ بنوا دیا۔

اب ٹکا خان کوئی زیادہ فوجی ماہر تو نہ تھا۔ تعلیم بھی اس کی واجبی سی تھی اور ذہنی لحاظ سے بھی اوسط درجہ والوں میں آتا تھا لیکن بھلا آدمی تھا۔ غیرت مند بھی تھا۔ اور پاکستان کے ساتھ بھی اس کو محبّت تھی۔ بے وفا بھی نہ تھا۔ اور بھٹو کے ساتھ بھی ''وفاداری'' دکھائی۔ تو یہ ملک پاکستان چلتا رہا۔ لیکن فطرت کی بھی کئی ''ضرورتیں'' ہوتی ہیں۔ بھٹو اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتا تھا۔ وہ ماہر ''بہروپیا'' تھا۔ مداری کی طرح کے تماشے کر لیتا تھا تو پاکستان کی تاریخ چونکہ بری فوج کے سربراہ کی شخصیت کے گرد گھومتی ہے تو رب کی ذات پاک نے بری فوج کی سربراہی بھی ضیاء الحق جیسے ''بہروپیے'' کو عطا کر دی جو بھٹو سے زیادہ ''بہروپیا'' تھا۔ اور ڈرامے کر کے کس طرح وہ گیارہ سال حکومت پر براجمان رہا۔ قدرت کی بھی اس میں کوئی مصلحت ہوگی لیکن نہ اس نے قوم کو کچھ دیا اور نہ فوج کو۔ ضیاء الحق کے زمانے میں بھٹو دور کی شروع کی ہوئی بے حیائی کو تو کچھ رکاوٹ ملی۔ باقی زندگی کے ہر میدان میں ضیاء الحق مکھی پر مکھی مار کر گزارا کرتا رہا۔

بھٹو کے دور میں بڑا ڈر یہ تھا کہ ترکی کی طرح افواج پاکستان کو لادینیت پر لگا نہ دیا جائے کہ ٹکا خان کی شکست خوردہ فوج میں جذبہ اسلام یا جذبہ جہاد کو قائم رکھنے میں کامیاب ہو گیا وہ بھٹو کے ہر حکم کو بسر وچشم مانتا تھا لیکن بھٹو نے بھی کوئی ایسا حکم نہ دیا جس سے لادینیت کو پھیلاؤ ملتا۔ ٹکا خان نے پیشہ سپہ گری کی طرف بھی خوب دھیان دیا اور ٹکا خان کے دور کے جنرل محمد اقبال اور جنرل سوار خان جیسے پیشہ ور جنرلوں کی خدمات بعد میں ضیاء الحق کے دور میں بھی کام آتی رہیں۔ ضیاء الحق کو پیشہ ور سپاہی نہیں کہہ سکتے۔ دراصل ضیاء الحق کو کسی فن کا ماہر نہیں گردان سکتے لیکن وہ ''ہر فن مولا'' تھا۔ ہر چیز کی اس کو تھوڑی تھوڑی سمجھ تھی۔ اس ''سمجھ'' کی مدد سے وہ گزارا کر لیتا تھا۔ وہ جب بات کرتا تھا تو ساتھ لوگوں کے چہروں کے اثرات پر بھی دھیان دیتا تھا اور لوگوں کے ردعمل اسے معلوم ہو جاتے تھے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور لاعلمیوں پر پردہ رکھنے کا ماہر تھا لیکن اپنے ماتحتوں کو چننے کے لئے وہ بھی ایوب خان کی طرح بے وقعت لوگوں کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ صرف اپنے آخری ایام میں دو مدبر صاحبان کو اپنے نزدیک لے آیا۔ یعنی جنرل سید رفاقت اور جنرل حمید گل اور یہ ذکر میں پچھلے مضامین میں کر چکا ہوں۔ البتہ افواج کی خوش قسمتی کہ جنرل محمد اقبال اور جنرل سوار خان جیسے پیشہ ور سپاہی ان کی رہنمائی کیلئے ضیاء الحق کے دور کے پہلے دنوں میں ان کے اندر موجود تھے۔

جنرل محمد اقبال نے جوائنٹ چیف آف سٹاف (سہ افواج کے متحدہ ادارہ) کے مرکز کو بھی کچھ جاندار

بنانے کی کوشش کی کہ اس مرکز کو آج تک وہ اہمیت حاصل نہیں ہو رہی جو اس کا ''حق'' ہے لیکن جنرل اقبال کے جانشین جنرل رحیم الدین نے اس ضرورت کو آگے نہ بڑھایا۔ یہ افواج پاکستان کی بدقسمتی ہے یا فطرت کو ابھی ایسے منظور ہے کہ موجودہ مغربی دفاعی نظام جو ہم نے اپنایا ہوا ہے۔ یہ اسی طرح ڈانواڈول رہے گا جس طرح کافرانہ نظاموں کی نقل میں باقی نظام ڈانواڈول ہیں کہ ضیاء الحق نے سہ افواج کی سربراہی جنرل رحیم الدین کو دے کر اور بری فوج کی سربراہی جنرل کے ایم عارف کو دے کر ان اداروں کو ''ٹھنڈا'' کر دیا۔ رحیم الدین تو قسمت کا دھنی ہے کہ جب وہ نوجوان افسر تھا تو اس کا چچا اور خسر ملک کے دفاع کا نائب وزیر ہوتا تھا۔ اور ایک دفعہ وہ ترقیوں کے زینہ پر سوار ہو گیا تو پھر خاندانی روایات اور ''ادبی اثرات'' کی وجہ سے وہ ترقیاں کرتا رہا کہ ضیاء الحق کے ساتھ رشتے ناطے ہو گئے کہ ضیاء الحق کے لڑکے اعجاز الحق کی شادی رحیم الدین کی بیٹی کے ساتھ ہو گئی۔ تو پھر ترقیاں گھر کی بات بن گئیں۔ بہرحال پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے کہ رحیم الدین اور کے ایم عارف جیسے لوگ بھی فوج کے سربراہ بنے رہے۔ جن کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ بڑے ''بے وقعت'' لوگ تھے لیکن اس کے باوجود فوجی ادارے چل رہے ہیں کہ گو ضیاء الحق جنرل اسلم بیگ کو پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن محمد خان جونیجو کی ''خواہش'' کے مطابق جنرل اسلم بیگ بری فوج کا سربراہ تھا۔ جس دن ضیاء الحق صاحب نے ہمیں ''الوداع'' کہا اور یہ کہانی ہم چھٹے حصہ میں مکمل کر چکے ہیں کہ ضیاء الحق نے ''ڈنگ ٹپاؤ'' گزارا کیا۔ اس نے صوبوں کو جو گورنر دیئے یا جن وزیروں سے کام چلایا سب بہت اوسط درجے کی شخصیتوں کے مالک تھے اور خیر شاعری کے شغل کرنے والے کے ایم عارف اور نہ کچھ کرنے والے رحیم الدین تو فوج سے تنخواہ لیتے رہے اور اب بھی اعلیٰ مراعات کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ ضیاء الحق نے کوئی ایک ایسا کام نہ کیا جس کو ''بقا'' کے طور پر یاد رکھا جائے یا حوالہ دیا جائے۔ وہ بھٹوازم کو ختم کرنے کے لئے پوری کوشش کرتا رہا لیکن جب وہ کرسی سے ہٹا تو بینظیر بھٹو نے اس کرسی کو سنبھال لیا۔ ہمارے ہاں کے کچھ بے دین اور لبرل لوگ ضیاء الحق کو مذہبی لوگوں کا لیڈر یا نمائندہ مانتے ہیں یا گردانتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔

جن چھپے ہاتھوں نے ضیاء الحق کی ''چھٹی'' کرائی۔ انہوں نے اس کے ''جانشینوں'' کے بارے بھی کئی تجاویز ''الفا'' اور ''بریوو'' ذہن میں رکھی ہوئی ہوں گی جو اس عاجز کو اس طرح سے نظر آتی ہیں کہ ملک میں طاقت کا سرچشمہ بری فوج کی سربراہی سے ''پھوٹتا'' ہے۔ اس لئے ضیاء الحق کی ہلاکت کے بعد یہ طاقت خودبخود ضیا کے نائب جنرل اسلم بیگ کے ہاتھوں میں چلی جانی تھی کہ وہ باقی جنرلوں کی طرح ضیاء الحق والے جہاز میں سوار نہ تھا اور الگ جہاز میں سفر کر رہا تھا کہ وہ بچ گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ چھپے ہاتھ اسلم بیگ کو یہ شہ دیتے رہے کہ ضیاء کے ساتھ کسی حادثہ کے بعد وہ کچھ عرصہ کسی ''بادشاہ گر'' کا کام کریں اور پھر جب ضرورت پڑے تو اپنی مرضی کے کسی بہتر وقت ملک کی باگ ڈور سنبھال لیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسلم بیگ کو یہ ''تجویز'' پسند آئی لیکن بیچارے کے لئے بعد میں ''بہتر وقت'' نہ پیدا ہوا۔ یا چھپے ہاتھوں نے پیدا نہ ہونے دیا۔ اسلم بیگ کے گھر کے کچھ ''ممبروں'' سمیت اسلم بیگ کو حکومت کی گدی پر براجمان دیکھنے والے آج تک اسلم بیگ کو کوستے رہتے ہیں کہ اس نے ایک ''سنہری موقع'' کا فائدہ نہ اٹھایا کہ اس سلسلہ میں اس کا ''واحد'' فوجی ''رقیب'' جنرل اختر عبدالرحمٰن بھی حادثہ میں

ہلاک ہو گیا جو غیر متوقع طور پر ضیاء الحق کا ہم سفر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ضیاء الحق کو ''بھنک'' لگی ہوئی تھی کہ اس کو ہلاک کرنے کا ''پروگرام'' بن چکا ہے اور اس کا ''جانشین'' جنرل اختر عبدالرحمٰن کو بنایا جائے گا اس لئے ضیاء الحق نے اس کو ''ہم سفر بنایا ہوا تھا اور ساتھ امریکی سفیر بھی تھا تو ضیاء الحق کو امید تھی کہ ان کے طیارہ کو کسی حادثہ سے ''دوچار'' نہ کیا جائے گا لیکن ضیاء الحق کو ختم کرنے والے ایک سال سے اس کے ''پیچھے'' لگے ہوئے تھے۔ بعد کے واقعات اور ان واقعات کے نتائج اور ان کے اثرات سے گزرے ہوئے واقعات کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ اس عاجز کے سارے جائزوں کا طریقہ ہی یہی ہے کہ مشاہدات کو یاد رکھا جائے اور بعد کے واقعات کی مدد سے اصلی صورتحال کے ساتھ چھپی باتوں کے تانے بانے ملائے جائیں۔

تو یہاں یہ صورتحال نظر آتی ہے کہ ان چھپے ہاتھوں کو غلام اسحاق، وقتی طور پر ضیاء الحق کے جانشین کے طور پر ''منظور'' تھا کہ 55-1954ء میں اس نے خان عبدالقیوم کی خواہش کو رد کر دیا اور سرحد کے وزیر اعلیٰ کا ''تاج'' اپنے سر پر نہ رکھا کہ پچھلے مضامین میں گزارش ہو چکی ہے کہ اس نے ''پکی نوکری'' کو ترجیح دی اور اب ملک کے صدر کا ''تاج'' اپنے سر پر رکھنے کے لئے بڑا ''موزوں'' آدمی تھا۔ ان چھپے ہاتھوں کو سیاست کے کچھ فصلی بٹیروں کی بھی ضرورت تھی کہ ان کو اسی طرح ننگر ناچ نچائیں جس طرح انہوں نے 1954ء سے 1958ء تک محمد علی بوگرہ، چندریگر، سہروردی اور فیروز خان کو نچایا اور اس سلسلہ میں ان کے لئے ایوب خان کے مارشل لا کی ''پیداوار'' ذوالفقار بھٹو کی بیٹی بینظیر اور ضیاء الحق کے مارشل لا کی ''پیداوار'' نواز شریف ''موجود'' تھے۔ اور ان چھپے ہاتھوں کا اصلی آدمی جنرل آصف نواز تھا، جس کو وہ کئی سالوں سے ''گروم'' کر رہے تھے کہ وہ اُس کو ''ایوب ثانی'' بنا کر ہم پر براجمان کر کے سکیم ''الفا'' کے تحت ہمیں اس خطہ میں بھارت کا چھوٹا بھائی بنا کر بھارت کو ایشیا کی ''تھانیداری'' عطا کرنا چاہتے تھے کہ بھارت میں بھی وہ ایسے لوگوں کو اوپر لا رہے تھے جو ان کا ''کھیل'' کھیلنے کو تیار تھے۔ قارئین! یہ عاجز ایسے اشارے، اپنے پہلے مضامین میں کر چکا ہے کہ سکیم ''الفا'' تو فطرت نے نہ چلنے دی اب سکیم ''براوو'' کے تحت وہی مقاصد حاصل کئے جا رہے ہیں اور قوم یہ پہلو سمجھنے کی کوشش کرے کہ جمہوری اداروں سے چنا ہوا گیا گزرا سیاستدان یا کتنا بڑا ''فصلی بٹیرے'' کی قسم کا سیاستدان بھی ان ''چھپے ہاتھوں'' کے مقاصد پورے نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں کو ''فوجی آمر'' کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ عاجز قوم کو بار بار گزارش کر رہا ہے کہ، خدارا صرف مسلمان کی بجائے مومن بننے کی کوشش کریں کہ رب کی ذات پاک تمہیں مومن کی فراست عطا کرے کہ تم لوگ اپنے ہر رہنما کو خواہ وہ فوجی آمر ہو یا سیاستدان ہو اس کو پہچان سکو کہ وہ کس کردار کا آدمی ہے اور ضیاء الحق کی ہلاکت کے بعد تیرہ چودہ سالوں کی تاریخ پر تبصرہ کر کے ہم آسانی کے ساتھ ثابت کر سکتے ہیں کہ ہم کتنی نکمی، ناداں، کم علم اور معلوم نہیں کیا کہا جائے کیسی قوم ہیں۔

بے نظیر کو حکومت دے کر اسلام پسندوں کے منہ پر تھپڑ مارا گیا

اب دیکھیں کہ ضیاء الحق کے جانے کے بعد کس طرح ایک ''ڈنگ ٹپاؤ'' حکومت وجود میں آئی کہ ہمارے رہنماؤں کو کافرانہ مغربی جمہوری نظام کے بغیر اور کوئی نظام نظر نہیں آتے اور نہ اس سلسلہ میں کچھ سوچتے ہیں تو ''بادشاہ گر'' جنرل اسلم بیگ نے حکومت کا ''تاج'' ''پکی نوکری'' کرنے والے غلام اسحاق جو ضیاء الحق کے

''باقیات'' میں سے تھا' اس کے سر پر رکھ دیا۔ جس نے اسلم بیگ کو وائس چیف آف سٹاف کے عہدہ سے ترقی دے کر بری فوج کا چیف آف سٹاف بنا دیا اور کافرانہ مغربی جمہوری نظام کے تحت پارٹیوں کی بنیاد پر انتخاب کرا دیئے تو وفاق میں بینظیر نے معمولی اکثریت حاصل کر لی اور صوبہ سندھ میں کافی زیادہ اکثریت' صوبہ پنجاب میں ضیاء الحق کے ''باقیات'' نواز شریف جس نے سرکاری یا سلطانی مسلم لیگ کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا اس نے کچھ اکثریت حاصل کر لی تو وفاق میں چونکہ بینظیر اور پیپلز پارٹی کی حکومت بن گئی تو انہوں نے پنجاب میں پیپلز پارٹی کے نمائندہ جنرل ٹکا خان کو گورنر بنوا لیا کہ وہ نواز شریف کی حکومت چلنے میں روڑے اٹکاتے رہیں لیکن صورت حال ایسی تھی کہ بینظیر کو صدارت کے لئے ضیاء الحق کے ''باقیات'' غلام اسحاق کو پکے طور پر صدر بنانے کے لئے ووٹ دینے پڑے اور بینظیر جو وزیراعظم کی کرسی حاصل کرنے کے لئے سب اصول توڑنے کو تیار تھی اور صدر غلام اسحاق اور ''بادشاہ گر'' اسلم بیگ کی خواہش یا ضرورت کے لئے ضیاء الحق کے ایک ''باقیات'' صاحبزادہ یعقوب خان کو وزیر خارجہ بنانا پڑا۔ صوبہ سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومت کچھ ''مضبوط'' تھی لیکن صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان کی صوبائی حکومتیں بھان متی کا کنبہ تھیں کہ روزانہ کسی نہ کسی وزیر کا ''اضافہ'' کرنا پڑتا تھا۔ یہ دو سال حکومت تو کوئی بھی پالیسی نہ بنا سکی تھی کہ بینظیر لاہور جاتی تھی تو وزیراعلیٰ نواز شریف لاہور سے کہیں باہر گیا ہوا ہوتا تھا کہ بینظیر کے ساتھ ''آمنا سامنا'' نہ ہو یعنی اس زمانے کے حالات کو ''ڈنگ ٹپاؤ'' والا گزارا کہنا بھی ٹھیک نہیں کہ جس کا جو جی چاہتا تھا وہ ایسے ہی کرتا تھا اور جن چھپے ہاتھوں نے بینظیر کو وزیراعظم کی کرسی پر چند دنوں کے لئے ''براجمان'' کیا اصل مقصد ضیاء الحق کے برائے نام اسلام کے نفاذ کی ایسی تیسی کرنا تھی کہ اسلام کی شریعت کی سزاؤں کو ''ظلم'' کہنے والی بینظیر کا اسلام صرف ''دوپٹہ'' تک محدود ہے اور وہ بھی آدھے سر پر دراصل اس کو لا کر اسلام پسندوں کے منہ پر ''تھپڑ'' رسید کرنا تھا اور وہ کیا حکومت کرتی؟ اس کو معلوم تھا کہ اس کے باپ کو امریکیوں نے پھانسی پر چڑھوایا تھا لیکن وہ امریکنوں کی دشمن بننے کو تیار نہ تھی اس لئے وہ صرف حکومت کا ''لٹکا'' لے کر بھی خوش ہو رہی تھی اس نے دھیلے کا کام نہ کیا سوائے اس کے اس کے خاوند نے دولت اکٹھا کرنا شروع کر دی اور جب غلام اسحاق اور اسلم بیگ نے بینظیر کو کرسی سے اتارنے کا فیصلہ کر لیا تو اسلام دشمن طاقتوں نے کوئی رکاوٹ نہ ڈالی۔ انہوں نے جو کچھ کرنا چاہا وہ کر لیا کہ اب وہ لوگ وفاق میں بھی حکومت کا تاج ضیاء الحق کے باقیات نواز شریف کے سر پر رکھنا چاہتے تھے۔ بینظیر کا ''تاج'' ختم ہو گیا تھا۔

اب نواز شریف کو آئی جے آئی بنا کر اس لئے آگے لایا جا رہا تھا کہ کچھ عرصہ کے لئے غلام اسحاق اور نواز شریف کو ''ایک کر کے'' جنرل اسلم بیگ کے وقت پورا ہونے کے بعد جنرل آصف نواز کو بری فوج کا سربراہ بنانا تھا۔ اسلم بیگ کو بڑی امید تھی کہ اس کی بری فوج کی سربراہی کے عرصہ میں حالات ایسی صورت اختیار کر جائیں گے کہ وہ حکومت سنبھال لے گا۔ وہ ہر میدان میں بڑی ''محنت'' کر رہا تھا۔ اس نے کچھ ایسے کام بھی کئے جن کے بارے پوری تفصیل تھوڑا بعد بیان ہو گی کہ اس نے محکمہ تعلقات عامہ کے میجر جنرل ریاض اللہ سے پاکستان کی پہلی جنگوں پر تجزیئے کرا کے ضروری اسباق کو کتابی شکل دینے کے لئے پروگرام بنائے جو مقاصد کسی تکمیل تک تو نہ پہنچے لیکن بسم اللہ تو ہو گئی تھی اس نے جنگی مشق ''ضرب مومن'' میں اخبار والوں کو خوب دعوتیں دیں

کہ وہ عسکری معاملات کو سمجھیں لیکن ساتھ ہی وہ کچھ سیاست میں بھی ''گھس'' گیا کہ آئی ایس آئی سے آئی جے آئی بنوانے میں اس کا بھی ہاتھ تھا اور ممکن ہے وہ سب کچھ صحیح نیت سے کر رہا ہوگا کہ اچھے سیاستدانوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور آج کل میں جو مقدمات چل رہے ہیں کہ اسلم بیگ نے اس دولت پر کیسے ''ہاتھ مارا'' اور کیا اس کے ایسے ''استعمال'' میں اس کا عمل صحیح تھا؟ بہرحال اس کو بڑی امید تھی کہ اس کو دوسری ''ٹرم'' کی بھی بری فوج کی سربراہی حاصل ہو جائے گی اور اس کو ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کا ضرور موقع مل جائے گا اور وہ اب بھی پر امید ہے کہ اس نے حوصلہ نہیں ہارا اور ملک کی سیاست میں وہ اصغر خان کی طرح ''اٹکا'' ہوا ہے لیکن اسلم بیگ نے بینظیر اور پیپلز پارٹی کو زیادہ ''سیاسی جھٹکا'' دے دیا کہ ایک دفعہ تو بینظیر کی ''وقعت'' ہی ختم ہوگئی اور اب جو غلام اسحاق نے غلام مصطفیٰ جتوئی کو وزیراعظم بنا کر انتخاب کرائے تو ملک میں ضیاء الحق کی ''باقیات'' یعنی غلام اسحاق اور نواز شریف کی مکمل حکمرانی ہوگئی اور سندھ میں بھی پیپلز پارٹی برسراقتدار نہ آسکی وہاں بھی غلام اسحاق نے جام صادق کے سر پر تاج رکھ لیا۔

تو حالات مکمل طور پر سیاستدانوں کے ہاتھ میں چلے گئے اور غلام اسحاق اور نواز شریف ملک کے کرتا دھرتا بن گئے جس سے اسلم بیگ اور فوج والے ''منظر'' سے ہٹ گئے کہ جو لوگ آصف نواز کو بری فوج کا سربراہ بنوانا چاہتے تھے۔ انہوں نے سیاستدان حکمرانوں کو شہ دی کہ فوج کے سربراہ مقرر کرنے کے معاملات مکمل طور پر اپنے ہاتھوں میں رکھو۔ کسی کی نوکری میں اضافہ نہ کریں اور اب جنرل آصف نواز کا نمبر آ گیا ہے اس کو بری فوج کا سربراہ بنا دو جو مکمل طور پر ''فوجی'' ہے اور اس کا فوجی گھرانے سے تعلق ہے اور اس کو فوجی معاملات کے علاوہ کسی اور چیز سے ''دلچسپی'' نہیں۔ ہم خود آصف نواز کو ایک پیشہ ور افسر سمجھتے تھے اور بچپن سے اس کو جانتے تھے اور اس کی ترقیوں کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے گو 1962ء میں کچھ شک پڑا کہ وہ موجودہ پانچویں پنجاب میں کیپٹن تھا اور ہماری پلٹن نے ان کی پلٹن سے ایوانِ صدر راولپنڈی میں آ کر یہ ڈیوٹی سنبھالی اور چند دن اکٹھے رہے تو میں اس کے ''رابطوں'' پر کچھ حیران ضرور ہوا تھا کہ اتنی چھوٹی عمر میں وہ کچھ اپنی ''وقعت'' سے بڑھ کر پاؤں پھیلا رہا تھا۔ بہرحال غلام اسحاق اور نواز شریف دونوں نے یک رنگی سے آصف نواز کو فوج کی سربراہی عطا کر دی۔

میرے خاندان کے بھی فوج میں ہونے کی وجہ سے' آصف نواز کے دادا صوبیدار میجر محمد نواز کے وقت سے پہلی جنگ عظیم سے بھی پہلے دونوں خاندانوں کی دوستی تھی اور آصف نواز کے دو چچا بریگیڈیئر محمد افضل اور بریگیڈیئر محمد زمان میرے ہم عصر رہے تھے اور خاص کر بریگیڈیئر محمد زمان کے ساتھ میری بہت دوستی تھی۔ ان کی اولاد نہ تھی تو انہوں نے آصف نواز کو بیٹا بنا کر اپنے گھر میں رکھ لیا اور اس کی پرورش انہوں نے کی کہ رب کی ذات پاک نے ان کو ایک بیٹا عطا کر دیا جس کا نام ناصر نواز تھا اور فوج میں 1965ء میں ہماری پلٹن میں وہ بھی کیپٹن تھا اور بڑی بہادری سے کام کیا۔ میں اس کی اپنے بیٹوں کی طرح دیکھ بھال کرتا تھا اور اس کے لئے بہادری کے تمغے کی بھی سفارش کی جو آدھی منظور ہوئی۔ اس کے بعد اس سارے خاندان کے ساتھ میرے تعلقات اور گہرے ہو گئے اور آصف نواز بھی میری اپنے والدین کی طرح عزت کرتا تھا اس لئے گزارش کر چکا ہوں کہ میں اس کی

ترقیوں کے لئے دعا کرتا تھا لیکن آصف نواز نے بری فوج کا سربراہ بننے کے بعد اپنے ''رویوں'' سے مجھے حیران کرنا شروع کر دیا۔

آصف نواز غلام اسحٰق خان اور نواز شریف کو آپس میں لڑا کے اپنا راستہ صاف کر رہا تھا

ہماری فوجی تربیت میں گو مکمل طور پر اسلامی رنگ موجود نہیں ہے لیکن فوج کی سوچوں میں Secular یا بے دینی کا رنگ بھی نہیں ہوتا اور طرز بیانات میں انشاء اللہ کے الفاظ یا ارادوں اور مقاصد کے بیانات وغیرہ عام طور پر مذہبی الفاظ میں ہوتے ہیں اور فوج کے سربراہ بھی فوجیوں میں مذہبی جذبہ بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آصف نواز نے یہ کوشش شروع کر دی کہ فوج کی زبان سے ان مذہبی روایات کو ختم کیا جائے اور ہماری تربیت مکمل طور پر Secular یا ''بے دینی'' کے الفاظ میں ہو اور ملٹری اکیڈمی کاکول والوں کو ہدایات دیں کہ وہاں کی تربیت بالکل سینڈھرسٹ کی کاربن کاپی ہو۔ جب مجھے یہ خبریں پہنچیں تو میں نے آصف نواز کو ایک خط میں سمجھانے کی کوشش کی کہ مذہبی جذبہ ہماری تربیت کا ہمیشہ حصہ رہا ہے۔ آپ اس کو قائم رکھیں، اس کو ختم کرنے کی کوشش نہ کریں لیکن آصف نواز پر کوئی اثر نہ ہوا کہ میری حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی کہ لیفٹیننٹ جنرل حمید گل کو کور سے تبدیل کر کے جہاں بکتر بند گاڑیاں بنتی ہیں اس ادارے کا سربراہ بنانے کے احکامات دے دیئے۔ جنرل حمید گل نے احتجاج کیا اور معاملات نواز شریف کے پاس چلے گئے جو وزیراعظم اور وزیر دفاع بھی تھے۔ میں نے آصف نواز کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے اسے ایک اور خط لکھا کہ ''عزیز من! تمہارے لئے ضروری ہے کہ حمید گل جیسے آدمی کے تدبر سے فائدہ اٹھاؤ' اور اس کو اپنے ''قریب'' رکھو اور تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تمہیں حمید گل جیسا آدمی مشاورت کے لئے میسر ہے۔ لیکن آصف نواز پر کیا اثر ہونا تھا۔ یہ ''چھپے ہاتھوں'' کی بھی ''ضرورت'' تھی کہ حمید گل کا رجحان دین کی طرف تھا اور وہ لوگ آصف نواز کے ہاتھوں سے ہماری افواج کو ترکی کی افواج کی طرح بے دین افواج بنانا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں حمید گل کے تدبر کی وجہ سے آصف نواز کو احساس کمتری تھی کہ وہ اس کے رویوں سے ''مرعوب'' تھا۔ اس کو ''بے وقعت' اور ابن الوقت لوگوں کی ضرورت تھی اور یہ عاجز اپنے اس قومی المیے کے بارے اپنے تاثرات لکھ چکا ہے کہ ہمارے ہاں اکثر نااہل لوگوں کو ''بڑائیاں'' مل جاتی ہیں اور وہ اپنے گرد اپنے سے زیادہ نااہل اور بے وقعت لوگوں کو ''اکٹھا'' کرتے رہتے ہیں۔

علاوہ ازیں حیران کن بات یہ ہے کہ اہل مغرب آصف نواز کے بری فوج کے سربراہ بننے کے سخت ''منتظر'' تھے۔ اس کو بہت جلد برطانیہ اور امریکہ کے دورے کرنے کی دعوت مل گئی بلکہ برطانیہ جاتے راستے میں وہ اٹلی میں ٹھہرا جہاں اس کا رابطہ ظاہر شاہ سے بندھوایا گیا کہ اہل مغرب کسی طرح سے ظاہر شاہ کو افغانستان کی حکومت پر براجمان کرنا چاہتے تھے اور آصف نواز کو برطانیہ اور امریکہ میں وہ پذیرائی ملی جیسے وہ کسی ملک کا سربراہ ہے۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آصف نواز نے نوکری کے دوران اپنے آپ کو اتنے چھپے ہاتھوں کے ساتھ ''وابستہ'' کر دیا تھا۔ بریگیڈئر محمد زمان جو آصف نواز کی پرورش کرتا رہا وہ 1956ء میں فوت ہو چکا تھا۔ اور یہ عاجز گزارش کر چکا ہے کہ اس کی ایوب خان کے ساتھ دوستی تھی کہ دونوں نے موجودہ پانچویں پنجاب میں اکٹھی نوکری

کی تھی اور 1951ء سے ایوب خان اور محمد زمان راولپنڈی میں رہتے تھے تو ان کے بچوں کی بھی دوستی ہو گئی تھی۔ خاص کر آصف نواز اور گوہر ایوب بڑے ''لنگوٹیے'' بن گئے تھے اور دونوں افسر بن جانے کے بعد اپنے والدین کی پرانی پلٹن پانچویں پنجاب میں اکٹھی نوکری کرتے رہے۔ اس لئے 62-1960ء کے عرصہ میں جب یہ پلٹن ایوانِ صدر کی حفاظت پر مامور تھی، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں میں گوہر ایوب اور آصف نواز کے کئی ''چھپے ہاتھوں'' کے ساتھ رابطے بندھتے رہے۔ اور گوہر ایوب تو سیاست میں چلا گیا۔ اور گو آصف نواز فوج سے وابستہ رہا۔ لیکن گوہر ایوب کے ساتھ اس کے گہرے رابطے قائم رہے۔ تو اب جب آصف نواز بری فوج کا سربراہ بن گیا تو گوہر ایوب بھی اوپر والی سطح کے سیاستدانوں اور سرکاری مسلم لیگ یا ضیاء الحق کی ''باقیات'' کا ایک اہم رکن تھا۔ تو مجھے اپنے ذرائع سے خبر ملی کہ دونوں خوب ملتے رہتے ہیں اور ''گھر مکے'' پکاتے رہتے ہیں۔ اور آصف نواز کی شہ پر گوہر ایوب کچھ اور سیاستدانوں خاص کر قدیر گل کی مدد سے نواز شریف اور بینظیر میں کچھ رابطے ''بندھوا'' رہا تھا۔ اور اصلی بات یہ تھی کہ غلام اسحاق اور نواز شریف میں ''ناچاقی'' پیدا کر کے پہلے ایک کی چھٹی کرانی تھی اور پھر ''دوسرے'' کو آسانی سے لات ماری جا سکتی تھی۔ میرے پاس اس سلسلہ میں کافی گواہیاں اور مواد موجود تھا کہ اندر اندر کیا ''گھر مکے'' پکتے ہیں۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ نواز شریف کی مسلم لیگ میں میرے دو جاننے والے بریگیڈئر ملک محمد حیات سینٹر اور جنرل مجید ملک کو میں نے آگاہ کر دیا کہ نواز شریف کو سمجھائیں کہ اس میں اور غلام اسحاق کے درمیان ناچاقی پیدا کی جا رہی ہے۔ جس سے مسلم لیگ کا نقصان ہوگا۔ اور بینظیر دوبارہ اقتدار میں آ جائے گی۔ ادھر آصف نواز نے غلام اسحاق کے ساتھ بڑی دوستی بنائی ہوئی تھی اور اس کا پہلا ''ہدف'' نواز شریف معلوم ہوتا تھا۔

لیکن طرفہ تماشا یہ بنا کہ انہی ایام میں اس عاجز کو ذاتی طور پر ایک اصول کے تحت آصف نواز سے ''الجھنا'' پڑ گیا۔ اور اس جھگڑے میں آصف نواز تو اللہ کو ''پیارا'' ہو گیا۔ لیکن نواز شریف اور غلام اسحاق میں وہ جو ''پھڈا'' ڈال گیا یا پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ جو سیاست میں کچھ ٹھہراؤ پیدا کر رہی تھی اس کے جو پرخچے اڑا گیا یا جنرل حمید گل نے آئی جے آئی میں محبِ پاکستان لوگوں کو اکٹھا کیا ان کو جس انتشار سے دوچار کر گیا تو ایک طرح سے وہ پاکستان کی بنیاد اور جڑوں کو بہت کمزور کر گیا۔ جس پر تبصرہ بعد میں آ رہا ہے۔ پہلے ذرا تفصیل سے اس عاجز اور آصف نواز کے ''الجھاؤ'' کو بیان کرنا ضروری ہے کہ قارئین کو معلوم ہو کہ ہماری قوم میں زیادہ لوگ مکھی پر مکھی مار رہے ہیں۔ نہ احساس زیاں ہے، نہ واقعات سے کوئی اثر لیتے ہیں کہ معاملات کس ڈگر میں پیش رفت کر جائیں گے۔ اور نہ حق کا ساتھ دینے کو تیار ہیں پس ''ڈنگ ٹپاؤ'' گزارا ہو رہا ہے۔

آصف نواز اسلام سے بھی کافی دور ہے اور فوج کے اسلامی جذبے کو بھی ختم کرنے پر تلا ہوا ہے۔ نواز شریف کو بھی اس خط کی کاپی دی اور صاف لکھا کہ آصف نواز کی ساکھ اب خاک میں مل چکی ہے تو 14 ستمبر 92ء کو نواز شریف کے پرائیویٹ سیکرٹری کا خط آیا کہ نواز شریف میرے ساتھ اتفاق کرتے ہیں کہ ہم سب کو پورے طور پر اسلام میں داخل ہونا چاہیئے۔

قارئین! میں یہ تفصیل ایک خاص مقصد کے تحت لکھ رہا ہوں کہ ہم اپنے گریبانوں میں جھانکیں کہ قومی

کردار کے لحاظ سے ہم کتنے مطلب پرست اور خود غرض ہیں اور جس کو قومی غیرت کہتے ہیں یا عزت نفس یا احساس زیاں وہ کہیں مشکل سے نظر آتی ہے اور ہم سب ''وقت'' گزار رہے ہیں کہ آصف نواز کی بھارت کے ساتھ ان ''پینگوں'' کے بارے جب حکومت ''خاموش'' تھی کہ آصف نواز، نواز شریف کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور نواز شریف اس پر ہاتھ ''ڈالنے'' سے ڈرتا تھا کہ آصف نواز نے غلام اسحاق سے ''دوستی'' بنائی ہوئی تھی کہ نواز شریف اگر اس کو نکالنے کی سفارش کرے تو غلام اسحاق یہ سفارش نہ مانے گا۔ اس لئے نواز شریف، آصف نواز کے خلاف زبان بھی نہ کھولتا تھا اور اس کے پرائیویٹ سیکرٹری نے بھی میرے خطوط سے صرف اسلام کی کچھ ''آڑ'' لی کہ آصف نواز اسلام سے کتنا دور تھا۔ باقی باتوں پر وہ بھی خاموش تھے کہ پیپلز پارٹی تو کھلم کھلا آصف نواز کو دعوت دے رہی تھی کہ حکومت پر قبضہ کر لیا جائے۔ صرف لیفٹیننٹ جنرل حمید گل، آصف نواز کے ''عزائم'' سے آگاہ تھا اور اس نے میری سوچوں کے ساتھ اتفاق کیا لیکن اخباروں میں وہ بیان دینے کو تیار نہ تھا۔ اس کے بیان کے بارے کہا جاتا کہ وہ اپنا ''ساڑ پھانک'' رہا ہے۔ بہرحال ملک کے ایک مایہ ناز دانشور کرنل غفار مہدی نے بڑا اچھا بیان دیا کہ آصف نواز کی یہ ''بھارت یاترا'' یا اس سلسلہ کا رویہ عام آدمی کی سوچ سے بالاتر اور بڑے اچنبھے والا ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ساری قوم ''خاموش'' تھی جیسے ان کو سانپ سونگھ گیا ہو، لیکن مجھے اندرونی طور پر معلوم تھا اور اندرونی خبریں مل رہی تھیں کہ میرے خطوط جس طرح میں ان کو ''سرکولیٹ'' کر رہا تھا اس وجہ سے آصف نواز کافی ''پریشان'' تھا اور دانت ''بھینچتا'' رہتا تھا صرف دو آدمی ایوب خان اور کے ایم عارف، آصف نواز کی طرح دل کے کچھ کمزور تھے باقی یحییٰ خان، ضیاء الحق، ٹکا خان، سوار خان وغیرہ سب دل کے مضبوط تھے لیکن ایوب خان یا کے ایم عارف، حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتے تھے اور مجبوری میں ''خاموش'' ہو جاتے تھے لیکن یہاں آصف نواز کیلئے یہ عاجز ایک ''مسئلہ'' بنا ہوا تھا سول حکومت پر نواز شریف براجمان تھا اور ISI کا سربراہ بھی آصف نواز کا ناپسندیدہ تھا اس لئے وہ کسی خفیہ ادارہ سے مجھے تنگ کرانے کی پوزیشن میں نہ تھا اور کافی لوگوں کے ساتھ تعلقات کی خرابی سے جو اس نے ذاتی ''بھینچنے'' شروع کئے ہوئے تھے یہی چیز اس کے لئے ''جان لیوا'' ثابت ہوئی۔

مجھے معلوم تھا کہ غلام اسحاق کو میری ''مظلومیت'' پر ہرگز ترس نہ آئے گا کہ ہر مصنف کو اس کی ''تخلیق'' اولاد کی طرح پیاری ہوتی ہے اور میری جو اس ''حقائق'' والی تخلیق کو جو KILL کرنے کی کوشش ہو رہی تھی اور یہ عاجز پچھلے مضامین میں گزارش کر چکا ہے کہ آصف نواز میری تصنیف جہاد کشمیر کی اشاعت سے انکار کر رہا تھا کہ میں نے اس کتاب میں مسلمانوں کے خلاف اینگلو امریکنوں کی سازشوں کو طشت ازبام کر دیا تھا۔ غلام اسحاق کی ''بناوٹ'' ایسی تھی کہ وہ اس ''ظلم'' کو نہ سمجھنے والا تھا لیکن میں تو اس کا نام استعمال کر رہا تھا کہ مجھے اپنی ''مظلومیت'' کو عام کرنے کا موقع مل رہا تھا لیکن تیسرے خط کے بعد اب یہ عاجز صرف سول کورٹ میں مقدمہ کر سکتا تھا لیکن مجھے ڈر تھا کہ وہاں جی ایچ کیو مجھے میری مزدوری دینے کی پیشکش کر کے کتاب کی اشاعت نہ ہونے کے احکام جاری کروا سکتا تھا کہ کچھ ''کھوج'' جو میں نے نکالے ہیں ان کا اظہار قومی دلچسپی میں نہیں ہے وغیرہ تو میں نے ایک طریقہ نکالا کہ 10 اکتوبر 92ء کو تمام معاملہ شرعی عدالت میں پیش کر دیا اور لکھا کہ یہ کتاب شائع نہ کرنا اسلام

اور پاکستان کے ساتھ غداری ہے کہ قوم سے اس حقیقت کو کیوں چھپایا جا رہا ہے اور معاہدہ کی خلاف ورزی بھی پاکستان کی دین اسلام سے نافرمانی کے تحت آتی ہے۔ اس درخواست کی کاپیاں اس عاجز نے صدر پاکستان، وزیراعظم، آصف نواز اور متعدد لوگوں کو دیں اور ساتھ لکھا کہ میں اس کی کاپیاں اخباروں میں بھی وقتاً فوقتاً بھیجتا رہوں گا۔ آصف نواز یہ سب کچھ پڑھ کر اور پریشان ہوا اور مزید دانت ''بھینچے'' لیکن غلام اسحاق یا نواز شریف کی طرف سے مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ حالانکہ یہ عاجز ان کو صاف لکھ چکا تھا کہ آصف نواز خدارا اپنی کرسی خالی کر دے کہ وہ اس کرسی کا ''تقدس'' قائم نہ رکھ سکا لیکن فطرت نے 1992ء کے آخری دنوں میں اس سے یہ کرسی خالی کرا دی۔ البتہ میرا مقدمہ جاری رہا کہ 25 نومبر 92ء کو شرعی عدالت نے ایک ٹیکنیکل نکتہ نکال کر کہ درخواست فلاں دفتری طریقہء کار کے مطابق نہیں اور مجھے درخواست واپس کر دی تو میں نے درخواست اس طریقہء کار کے تحت لکھ کر 7 دسمبر 92ء کو دوبارہ شرعی عدالت میں پیش کر دی اور 20 جنوری 1993ء کو ایک خط شرعی عدالت کو لکھا' جس کی کاپی نہ صرف صدر پاکستان اور وزیراعظم کو دی بلکہ دینی سیاسی جماعتوں کو بھی آگاہ کیا کہ یہ ملک میں جو سیاسی افراتفری مچی ہوئی ہے یہ ''چھپے ہاتھوں'' کے ایک پروگرام کے مطابق ہے کہ میں کئی ذرائع سے جانتا ہوں کہ بے دین طاقتیں اس ملک میں آصف نواز کے ذریعہ سے ایک ایسا مارشل لاء لگانے کی تیاری میں تھیں کہ ملک کے سب اداروں اور خاص کر فوج کو مذہب یا دین سے دور کر کے ترک فوج کی طرح نہ صرف لادین فوج بنا دی جائے بلکہ آئندہ کیلئے بھی فوج ''واچ ڈاگ'' کے طور پر ملک میں دینی طاقتوں کو برسر اقتدار نہ آنے دے۔ پاکستان چونکہ اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا راز ہے تو رب کی ذات پاک نے آصف نواز کو یہ موقع نہیں دیا۔ لیکن آئے دن جو شوشہ چلتا رہتا ہے کہ ملک کے آئین میں فوج کو کچھ ''کردار'' دیا جائے یہ اسی سازش کا نتیجہ ہے کہ افسوس ہم اصلی چیز کی طرف نہیں آ رہے کہ اس ملک میں اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے آئین کو نافذ کر دیں اور پوری قوم ''حزب اللہ'' بن جائے۔

میں جانتا تھا غلام اسحٰق کو میری مظلومیت پر ترس نہ آئے گا

لیکن ہماری قوم کی ''نادانی'' کی یہ حالت ہے کہ آصف نواز کے مرنے کے بعد جو اسے خراج تحسین پیش کیا گیا یا جو کارروائیاں ہوئیں ان سے میں بالکل حیران ہو گیا اور آج تک حیران ہوں کہ یہ سب کئی چھپے ہاتھوں کی ''ضرورت'' تھی۔ حالانکہ اس عاجز نے یکم مارچ 1993ء کو آصف نواز کے جانشین جنرل عبدالوحید اور باقی جنرلوں کو ایک خط لکھا کہ آصف نواز کی موت پر اس عاجز نے وہی دعا کی جو حفیظ جالندھری نے جوش ملیح آبادی کی وفات پر کی کہ ''کاش کچھ اور دن زندہ رہ جاتا اور توبہ و ندامت کے بعد اس کی وفات ہوتی۔'' آپ لوگ حالات سے ''آگاہ'' ہیں کہ جو کچھ میں اس کو لکھتا رہا اس کی کاپیاں آپ کو بھی دیتا رہا۔ آپ میرے ساتھ بھی ''انصاف'' کریں اور کرائیں اور اس پہلو کو سمجھیں کہ حق و سچ پر پردے نہیں پڑنے چاہئیں اور یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے وہ جذبہ قائم رہنا چاہیئے۔ لیکن ان ''عزیزان'' پر بھی کوئی اثر نہ ہوا جو لمبی کہانیاں ہیں جن کی کچھ جھلکیاں آگے آ رہی ہیں لیکن زیادہ حیرانگی کی بات یہ ہے کہ ساتھ ہی آصف کے مرنے کے بعد یہ خبریں آنے لگ گئیں کہ اس کی موت ''طبعی'' نہ تھی اور ملک کے صدر غلام اسحاق جن کی میری ''مظلومیت'' پر ذرا رگ نہ پھڑکی تھی' اس نے بیگم آصف نواز کی ان ''تشویشوں'' کو سن کر ''مظلوم'' قرار دے دیا۔ اس عاجز نے ملک کے صدر کو آصف

نواز کے بارے میں جو لکھا کہ اس کے ''غیروں'' کے ساتھ رابطے ہیں یا وہ فوج کے اسلامی جذبہ کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ کسی چیز کا صدر غلام اسحاق نے نوٹس نہ لیا لیکن آصف نواز کی موت کے بعد کوئی ''منظم چھپے ہاتھ'' آصف نواز کو پاکستان کے ایک عظیم جنرل کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ حالانکہ اس نے ایک جونیئر افسر کے طور پر بھی ستمبر 65ء کی جنگ یا دسمبر 71ء کی جنگ میں کوئی قابل قدر خدمت نہ انجام دی تھی اور مجھے اس ''عظمت کے تاج'' کے اس کو پہنائے جانے کی کوئی وجہ نظر نہ آ رہی تھی لیکن میں اگر اخبار میں اس سلسلہ میں کوئی بیان دیتا تو اس کو کوئی شائع نہ کرتا اور ویسے بھی رواج ہے کہ مرنے کے بعد اکثر لوگوں کو ''عظیم'' بنا دیا جاتا ہے لیکن میرے ذہن میں چند سوالات اور کچھ تلخ حقائق تھے جن کو میں ''ریکارڈ'' کرانا چاہتا تھا۔ تو میری کتاب ''پنڈورا بکس'' مکمل ہو کر اشاعت کیلئے جانے والی تھی تو اس کے آخری صفحات میں اس عاجز نے لکھ دیا کہ سوالات آ رہے ہیں کہ آصف نواز کی موت اگر غیر طبعی تھی تو حکومت نے خود کوئی کارروائی کیوں نہ کی؟ اور آصف نواز کی بیوہ کو آگے کیوں لایا گیا؟ اپنے فوجی ڈاکٹروں نے 24 نومبر کی زہریلی خوراک کے الزام کو جب غلط قرار دیدیا اور موت کی وجوہات میں آصف نواز کی ذاتی لاپرواہی کا ذکر بھی ہے۔ تو بیگم آصف نواز سے اپنے ڈاکٹروں کی بجائے غیر ملکی ڈاکٹروں سے معائنہ کی درخواست کو ''منظور'' کرنے سے اپنے فوجی ڈاکٹروں پر ایک ایسا الزام کیوں لگایا کہ شریف الدین پیرزادہ بعد میں ایوانِ صدر میں بیٹھ کر کوئی ایف آئی آر گھڑنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ کام وہ نہ کر سکا۔ اور اس عاجز نے 14 جون 1992ء کو ہی صدر غلام اسحاق کو لکھ دیا تھا کہ آصف نواز کسی ''انجانے'' خطرے سے ڈرتا رہتا تھا۔ یہ اس کی خاندانی بیماری ہے کہ خود مختار کرسی پر آ کر وہ ایسا کچھ کر بیٹھتے ہیں جس کی وہ خود ''تاب'' نہیں لا سکتے۔

علاوہ ازیں جب کوئی پوچھنے والا نہ ہو تو وہ ''سست'' ہو جاتے ہیں اور جب جاگتے ''ہیں'' تو گھبرا کر کوئی ''انتہائی کارروائی'' کر بیٹھتے ہیں جو جان لیوا ثابت ہوتی ہے اور آصف نواز کے کئی بزرگ اور خاندان کے دوسرے آدمی یعنی چچیرے بھائی اچانک دل کے دورہ پڑنے کی بیماری سے موت سے دو چار ہوئے۔ امریکہ والوں نے شاید یہ پہلو نہ سوچا کہ ان کیلئے اس کی ''موزونیت'' کی کئی اور وجوہات ہوں گی کہ وہ ان کے ''معیار'' پر پورا اترتا ہو گا۔ لیکن آصف نواز کی موت کے بعد اس کی ''قبر کشائی'' شاید فطرت کی بھی ''ضرورت'' تھی۔ کہ عبرت کیلئے وہاں کی فضا میں بدبو بکھر گئی۔

تو یہ عاجز جن حقائق یا تلخ حقائق کو زیر بحث لانا چاہتا ہے' ان میں پہلی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان ہمیں ایک نعمت کے طور پر عطا فرمایا ہے اور اس کی تلخ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس نعمت سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔ انہی لوگوں میں اکثریت ناشکر گزار لوگوں کی ہے کہ وہ پاکستان کو وہ وفاداری دینے کو تیار نہیں جو ان پر فرض تھی۔ جب تک فطرت کی یہ ضرورت پوری نہیں ہوتی کہ ہم سب مومن بن کر ''حزب اللہ'' نہیں بنتے۔ یہ بے یقینی والی صورتحال جاری رہے گی۔ تفصیل آگے آ رہی ہے۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ بھارتیوں یا ہندوؤں نے دل سے کبھی بھی پاکستان کے ''وجود'' کو تسلیم نہیں کیا۔ یہ عاجز اپنے مضامین میں ضیاء الحق کے زمانے میں اس وقت کے وزیر خارجہ آغا شاہی کے اس بیان پر پورا تبصرہ اور کہانی لکھ چکا ہے کہ وہ بے چارا بیان دے بیٹھا کہ ہم بھارت کی کئی ''غلط فہمیاں'' دور کر آئے ہیں۔ تو اس عاجز نے ثابت کیا کہ ایسا بیان وہ دے گا جو مومن کی فراست

سے عاری ہو۔ میں اس مضمون کی بھی اختصار کے ساتھ جھلکیاں دینا چاہتا ہوں کہ واجپائی جب نواز شریف کے زمانے میں آیا تو مینار پاکستان پر اعلان کیا کہ وہ لوگ پاکستان کے وجود میں آنے کی ''حقیقت'' کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے سانس میں اس نظریہ اسلام کو رد کر دیا جس کے تحت پاکستان وجود میں آیا تھا اور کہا کہ وہ کشمیریوں کو مذہب یا دین کے نام پر الگ ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ قائداعظمؒ کے بعد ہمارے کسی رہنما نے بھارت والوں کے ساتھ آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات نہیں کی اور مصلحت کے تحت یہاں تک چلے گئے کہ بینظیر نے راجیو گاندھی کی آمد پر کشمیر روڈ کی تختی پر مٹی ڈال دی کہ راجیو گاندھی کو کشمیر کا لفظ پاکستان میں پڑھ کر تکلیف ہوگی۔ بھارت نے آج تک ہمارے ساتھ کیا کچھ نہ کیا اور ہمیں مٹانے پر وہ کس طرح تلا ہوا ہے۔ صرف کشمیر کو لیں کہ ہندو کبھی ''مہنگا سودا'' نہیں کرتے اور بھارتی کشمیر پر قابض اس لئے ہیں کہ ہمارے لئے دریاؤں کے پانی کو روک کر پاکستان کو ریگستان میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے بھارتیوں کے موجودہ رویوں کے تحت یہ نعرہ بڑا صحیح ہے کہ ''بھارت کا جو یار ہے وہ غدار ہے'' تو بھارت کے ساتھ ہماری کیسی پالیسی ہونا چاہیئے یہ عاجز اس سلسلہ کے تلخ حقائق قوم کو باور کرانا چاہتا ہے۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں کچھ لوگ ''نیک نیتی'' سے پاکستان کو بھارت کے مقابلہ میں چھوٹا ملک سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ ایمان کی کمی کی وجہ سے بھارتیوں سے ''مرعوب'' ہیں اور یہ سب چاہتے ہیں کہ ہم بھارت کے ''چھوٹے بھائی'' بن کر ہندوؤں کے ساتھ گزارہ کریں۔ ان لوگوں کو ہندوؤں کی ذہنیت سے آگاہی نہیں۔ ہندوؤں میں یہ ''مروت'' ہی نہیں کہ کسی غیر کو اپنا ''چھوٹا بھائی'' بنائیں۔ تو یہ ایک ''مرحلہ'' ہوگا اگلے مرحلہ میں بھارت پاکستان کو ہڑپ کرنے کی کوشش کرے گا۔

یہ پہلو بھی تفصیلی وضاحتیں اور بحث سے سمجھنا ضروری ہے۔ چوتھی تلخ حقیقت یہ ہے کہ اینگلو امریکن بلاک والوں کو ایک ایسے پاکستان کی ضرورت ہے جوان کی ڈگڈگی پر ناچے اور پاکستان کے ذریعہ یا استعمال سے وہ لوگ بھارت کو اپنا سنتری بنانا چاہتے ہیں۔ تحریک پاکستان کے وقت سے جو کچھ وہ لوگ ہمارے ساتھ کر رہے ہیں اس کی سبق آموز جھلکیاں دینا ضروری ہے کہ ہم لوگ اس سلسلہ میں اپنی صحیح پالیسی بنائیں۔ پانچویں حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے اور اس آخری مضامین کے سلسلہ میں یہ عاجز قارئین کو یاد کرائے گا کہ پاکستان کے بن جانے کے بعد کیا کیا اندرونی اور بیرونی سازشیں ہوتی رہیں کہ پاکستان کو بھوٹان اور نیپال یا سری لنکا کی طرح بھارت کا ایک طفیلی ملک بنا دیں۔ لیکن فطرت نے یہ کچھ نہ ہونے دیا اور بھارت جو آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا بڑا ملک اور پاکستان سے تقریباً دس گنا بڑا ہے۔ اس کیلئے پاکستان ایک مسئلہ بنا ہوا ہے کہ پاکستان کی کوئی حکومت مصلحت کے طور جب بھارت کے سامنے کچھ جھک جاتی ہے تو وہ اس کرسی پر زیادہ دیر نہیں ٹھہرتی کہ ملک میں ایک بڑا طبقہ موجود ہے جو لوگ ایمان سے سرشار ہر لمحہ بھارتیوں کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کو تیار ہیں اور فطرت کو انتظار ہے کہ اس خطہ کے لوگ مومن بن کر حزب اللہ بن جائیں تو یہ برصغیر کفر سے پاک ہو جائے گا۔

کیسے؟ وہ ذات پاک مسبب الاسباب ہے۔ اس نے پچھلے 59 سالوں میں ہمارے لئے کئی مواقع پیدا

کئے کہ ہم بھارتیوں کو جنگ میں عبرتناک شکست دے کر بھارت کے کشمیر پر غاصبانہ قبضے کو ختم کر سکتے تھے اور اس کے بعد بھارت کے ٹکڑے ہونے میں دیر نہ لگتی کہ افسانوی عقائد والے ہندو ایک بھان متی کا کنبہ ہیں۔ ان کی موجودہ وحدت دھرتی کی پوجا اور پاکستان دشمنی کی وجہ سے چل رہی ہے۔ تو یہ عاجز قوم کیلئے چند الفاظ میں نشان راہ کی جھلکی دے گا اور آج کل جن کافرانہ نظاموں کے ساتھ ہم چمٹے ہوئے ہیں جن کے تحت کبھی کسی حکومت نے اپنی میعاد پوری نہ کی ان کے اختتامی پوسٹ مارٹم کر کے اس سلسلہ مضمون کی تکمیل ہو جائے گی۔

بھارت مسلمانوں کو نمائشی وزارتیں دے کر ٹرخا دیتا ہے

تو سب سے پہلے یہ عاجز قوم کو باور کرانا چاہے گا کہ پاکستان اس علاقے کے لوگوں کیلئے بہت بڑی نعمت ہے۔ جو لوگ وزارتوں کے مزے لیتے رہتے ہیں۔ یا بیوروکریٹس کے اعلیٰ عہدوں پر براجمان ہو جاتے ہیں یا فوج میں جنرل بن جاتے ہیں' انہوں نے کبھی سوچا ہے کہ بھارت نے دو تین مسلمانوں کو نمائشی صدر ضرور بنایا۔ جو بالکل بے اختیار تھے لیکن کیا کانگرسی مولوی آزاد اور رفیع احمد قدوائی کے بعد کبھی کسی نے سنا کہ بھارت کی مرکزی حکومت میں ان پچھلے 59 سالوں میں کوئی مسلمان کسی اہم وزارت پر مامور ہوا۔ یا کسی صوبے کا وزیراعلیٰ یا اہم وزیر بن گیا یا فوج میں جنرل بن گیا۔ بلکہ بھارتی فوج میں مسلمانوں کی نفری ایک فیصد بھی نہیں جبکہ وہ بھارت کی آبادی میں تقریباً 18 فیصد ہیں۔ بلکہ سرکاری نوکریوں میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے حساب سے اپنے حقوق صرف چار پانچ فیصد ملتے ہیں۔ بھارت میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً پندرہ کروڑ ہے۔ لیکن بھارت کے اوپر والے سرکاری عہدوں پر کبھی نمائشی طور پر کسی ایک آدھ مسلمان کو پہنچایا جاتا ہے۔ پولیس یا دیگر ملکی اور صوبائی ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں اپنے بیٹوں کو بتاتا رہتا ہوں کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو متحدہ ہندوستان میں آزادی کے بعد مجھے معمولی پنشن دے کر وقت سے پہلے گھر بھیج دیا جاتا کہ فوج میں مسلمانوں کی تعداد اپنی آبادی کی نسبت سے زیادہ تھی اور ہندو پہلا کام یہ کرتے کہ مسلمانوں کی تعداد فوج میں بہت زیادہ کم کر دیتے۔ تو میں اپنے بیٹوں کو صرف اتنی تعلیم دے سکتا کہ وہ کسی پرائمری سکول میں استاد بن جاتے یا کسی دفتر میں چھوٹے بابو۔ شاید نوکریوں کے دروازے بھی مسلمانوں پر بند رہتے تو انہیں زمین میں ہل چلا کر اپنا پیٹ پالنا پڑتا۔ تمام تجارت' کارخانوں اور انڈسٹری پر موجودہ پاکستانی علاقوں میں بھی ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ مسلمانوں کے پاس صرف کچھ زمینیں اور زمینداری تھی کہ غیر کاشتکار ہندو بنیوں کو زمین خریدنے کی اجازت نہ تھی۔ آزادی کے بعد یہ قانون تبدیل کر دیا جاتا۔ مسلمانوں کیلئے صرف کسانوں کا کام باقی رہ جاتا۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس کی ذات پاک نے ہمیں یہ خطہ زمین عطا فرمایا۔ لیکن ہمیں ہندوؤں کی طرح اس خطہ یا وطن کی پوجا تو نہ شروع کر دینا چاہیئے۔

"ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے"
جو پیرہن اس کا ہے' وہ مذہب کا کفن ہے

بلکہ رب کی ذات پاک کی عبادت کی اس طرح سے باقاعدگی ہونا چاہیئے کہ ہم عملی طور پر اول بھی

مسلمان اور مومن اور آخر بھی مسلمان اور مومن بن جائیں کہ ہمارے دونوں جہاں سنور جائیں اور پاکستان بنانے کا بڑا مقصد یہی تھا کہ یہاں پر ہم اسلامی اصولوں کے تحت غیرت اور عزت کی زندگی گزاریں اور آخرت کیلئے اجتماعی طور پر تیاری کریں کہ جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنالیں اور ان مادی چکروں میں نہ پڑتے کہ رب کی ذات پاک نے سورہ الاعراف کی آیت مبارکہ 176 میں ایسے زمین یا مادیت میں گھس جانے والوں کو کتے کے مشابہ قرار دیا کہ بوجھ رکھو تو بھی زبان لٹکا کر ہانپے اور نہ بوجھ رکھو تو بھی زبان لٹکا کر ہانپتا رہتا ہے۔ ہمارے جو لوگ جنرل آصف نواز کی طرح اہل مغرب کے کہنے پر بھارتیوں کے بھی ''پروردہ'' بننے پر تیار ہو گئے۔ شاید ان کے بزرگ ان کو یہ تربیت نہ دے گئے یا یہ کچھ باور نہ کرا سکے کہ ان جنرلوں سے کئی بہتر لوگ آزادی سے پہلے یعنی ملک غلام علی اور چودھری رحمت الٰہی وغیرہ نائکی' حوالداری' سے اوپر نہ جا سکے اور یہ عاجز تحریر کر چکا ہے کہ پھر ایسے لوگوں نے جماعت اسلامی میں پناہ لی۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے ایوب خان کا چھوٹا بھائی سردار بہادر بھی ہماری طرح فوج میں سپاہی بھرتی ہو گیا تھا کہ ترقی کر کے افسر بن جائے گا لیکن لانس نائیکی سے اوپر نہ جا سکا تو فوج کو چھوڑ گیا اور سیاست میں شامل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے پاکستان وجود میں آ گیا' تو یہی سردار بہادر مرکزی حکومت میں وزیر بن گیا۔ اور چند دن سرحد کا وزیر اعلیٰ بھی رہا اور کئی سال پاکستان کے کرتا دھرتاؤں میں شامل رہا۔

تو یہ عاجز اہل پاکستان کو پھر گزارش کرے گا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے بے حساب مواقع تقدیر پیدا کر رہا ہے۔ آؤ توبہ و ندامت کر کے اول بھی مسلمان اور مومن بن جائیں اور آخر بھی مومن و مسلمان بن کر جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنا لیں۔ اور ''حزب اللہ'' بن جائیں تو اللہ تعالیٰ ایسی صورتحال پیدا کر دے گا کہ یہی ''حزب اللہ'' والے اس برصغیر کو کفر سے پاک کر دیں گے۔

دوسری حقیقت کہ بھارت والوں نے دل سے پاکستان کے ''وجود'' کو کبھی تسلیم نہیں کیا' بہت گہرے مطالعہ کی دعوت دے رہی ہے اور جو نکتے اس سلسلہ میں یہاں زیر بحث آئیں گے۔ ان میں سے کئی نکتے باقی حقیقتوں میں بھی زیر بحث آئیں گے۔ اینگلو امریکن بلاک کی تو ایک لنگڑا لولا یعنی کمزور پاکستان ایک ضرورت تھی کہ اس کو ڈگڈگی پر نچا کر وہ بھارت کیلئے مسائل بھی پیدا کر سکیں اور بھارت سے اپنے مطالب بھی حاصل کریں اور بھارتیوں یا ہندوؤں نے وقتی طور پر کمزور پاکستان کو منظور کر لیا کہ اب ختم ہوا کہ اب ختم ہوا۔ اور اینگلو امریکن اور بھارت کی یہ مشترکہ قدر پچھلے کئی سالوں سے ''نہ ادھر نہ ادھر'' کا ڈرامہ بن کر چل رہی ہے۔ فطرت اور مشیت کی بھی اس میں کوئی بڑی گہری پالیسی ہے کہ پاکستان کا وجود اس کا ایک بڑا راز ہے کہ اتنے اندرونی اور بیرونی دشمن لگا تار حملہ آور ہو رہے ہیں۔ لیکن اس برصغیر میں مسلمانوں کی نفری کو بے پناہ عروج مل رہا ہے۔ آزادی کے وقت اس برصغیر میں مسلمانوں کی کل آبادی تقریباً ساڑھے دس کروڑ تھی جس میں سے دونوں مغربی اور مشرقی پاکستان میں تقریباً ساڑھے سات کروڑ مسلمانوں کو آزادی نصیب ہو گئی اور تقریباً تین ساڑھے تین کروڑ مسلمان بھارت کی غلامی میں جکڑے ہوئے تھے۔ ہندوؤں کے سامنے بڑا مقصد یہ تھا کہ پاکستان نہ بنے اور ان برصغیر کے مسلمانوں کا اسلام بھی ''رام رام'' والا اسلام ہو جائے اور مسلمان ہندو معاشرے کا حصہ بن کر معدوم ہوتے رہیں۔ فطرت کو یہ گوارا نہ تھا۔ اب پندرہ کروڑ مسلمان مغربی پاکستان میں اور پندرہ کروڑ مسلمان بنگلہ دیش میں صبح و شام رب واحد

کے لاشریک ہونے کی شہادت دے رہے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ بھارت کے اندر بھی پندرہ کروڑ مسلمان اپنا تشخص قائم کیئے ہوئے ہیں۔ کیا اتنی بڑی تعداد کے مسلمان' افسانوی عقائد والے ہندوؤں کے معاشرے کا حصہ بن کر معدوم ہو سکتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اس برصغیر نے کفر سے پاک ہونا ہے اور وہ وقت قریب ہے اور غزوات ہند کی تکمیل ہونے والی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہندوؤں کی جو جماعت تلوار کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ملیا میٹ کرنا چاہتی تھی' انہی لوگوں کو رب کی ذات پاک نے بھارت کی حکومت پر براجمان کر دیا اور ایک طرح سے چیلنج کیا کہ وہ اپنے غاصبانہ مقاصد پورے کرے لیکن چلو مکاری ہی مان لی جائے۔ لیکن اس حقیقت کو ضرور ذہن میں رکھا جائے کہ اس جماعت کا سربراہ واجپائی' امن کے پیغام کے ساتھ دو دفعہ پاکستان آ چکا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ ہمارے لئے اس میں پیغام یہ ہے کہ ہم مومن کی فراست حاصل کر کے ہندو کی ذہنیت کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ان کافروں کے ساتھ مومنین کی ایک جچی تلی پالیسی سے کام لیں کہ ہندو ذہنیت ایک بہت بڑا مضمون ہے۔ جس سلسلہ میں پروفیسر منور مرزا ایک کتاب اور یہ عاجز اپنی کتابوں میں کئی ابواب شامل کر چکا ہے کہ یہ لوگ دنیا کی ذلیل ترین قوم ہیں۔ اور کئی لحاظ سے یہودیوں سے بھی بدتر ہیں۔ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ غلامی میں رہنے سے ان کے اذہان میں رتی بھر تبدیلی نہیں آئی' کہ ان کا کوئی پکا اصول نہیں ہوتا۔ یہ بڑے وقتی لوگ ہیں۔ خود غرضی' ابن الوقتی اور لوبھ لالچ میں یہ لوگ سب حدیں پھلانگ جاتے ہیں۔ خلوص ان لوگوں میں نام کیلئے بھی نہیں ہوتا۔ میں نے ان کے گاندھی' نہرو' بڑے سے بڑے رہنما اور چھوٹے سے چھوٹے بنیا یا سرکاری بابو' یا سپاہی کو بہت نزدیک سے دیکھا۔ طاقتور کے سامنے یہ لوگ ہمیشہ ہاتھ جوڑ کر گزارا کرتے ہیں اور کمزور پر ان کو ترس نہیں آتا کہ کمزور پر یہ لوگ اتنا ظلم کریں گے کہ انسان یقین نہیں کر سکتا۔ وعدہ کا پاس ان کی گھٹی میں نہیں اور وفاداری صرف غرض حاصل کرنے کیلئے کرتے ہیں۔

میں اکثر حیرانگی سے یاد کرتا ہوں کہ آزادی سے پہلے موجودہ ضلع خوشاب کی وادی سون سکیسر یعنی مغربی کوہستان نمک میں ان ہندوؤں کی آبادی ہماری کل آبادی کا پانچ یا دس فیصد ہو گی لیکن جتنا اناج ہم اگاتے تھے۔ اس کا بڑا حصہ ہمارے کھلیانوں سے سیدھا ان کے انباروں میں پہنچ جاتا تھا اور اگلی فصل سے چند ماہ پہلے جب اناج کی قلت پیدا ہوتی تھی۔ تو یہی اناج دگنی یا تگنی قیمت پر ہمارے غریب کسان اور زمیندار ان لوگوں سے ادھار کے طور پر خریدتے تھے۔ جس پر بیاج لگا کر ہماری اگلی فصل کا بڑا حصہ پھر انہی رقوم کے عوض ان انباروں میں پہنچ جاتا تھا۔ غریب زمینداروں کی دوسری بڑی دولت خالص گھی ہوتا تھا کہ وہ ریوڑ پال کر دودھ 'بلو' کر اس سے خالص گھی حاصل کر کے ان ہندوؤں کے ہاتھ بیچ دیتے تھے۔ ویسے ہماری کوئی چیز خواہ خشک بھونے ہوئے دانے بھی ہوتے تو یہ لوگ نہ کھاتے تھے۔ لیکن ہمارے گھی کا بڑا حصہ ان کے ہاں چلا جاتا تھا کہ خود بھی کھاتے تھے اور اس کی تجارت بھی کرتے تھے۔ میں دیکھتا تھا کہ غریب عورتیں اپنے سروں پر گھی کے مٹکے اٹھا کر جا کر ان ہندو ساہوکاروں کو بیچتی تھیں۔ دلالی یا درمیان والے آدمی کے طور پر یہ لوگ اصل قیمت سے زیادہ قیمت صرف زبان ہلانے سے کما لیتے تھے۔ یہ لوگ اتنے خوش حال تھے اور اتنے اعلیٰ پکے مکانوں میں رہتے تھے کہ دنیا کی ہر نعمت ان کو میسر تھی۔ اور ان کے تعصب کا یہ حال تھا کہ سرکاری اداروں میں ان کی تعداد ہم سے زیادہ ہوتی تھی۔ بلکہ تعلیم کے سلسلہ میں اتنی کم

آبادی کے باوجود ہمارے آدھے سے زیادہ استاد اور طالب علم ہندو ہوتے تھے۔ لیکن ہمارے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس عاجزی سے معاشرے میں گزارہ کرتے تھے کہ جیسے ہم کوئی برتر قوم ہیں اور یہ لوگ کوئی نیچ یا کمین قوم ہیں۔ لیکن 1935ء کے صوبائی خودمختاری کے قانون کے تحت جب موجودہ بھارت کے سارے صوبوں اور موجودہ پاکستان کے صوبہ سندھ اور صوبہ سرحد میں جب کانگرس پارٹی برسراقتدار آ گئی۔ تو یہ لوگ ہمارے ''حاکم'' بن بیٹھے اور صوبہ پنجاب میں حکومت سر سکندر حیات کی یونینسٹ پارٹی کی تھی۔ لیکن ہندو قوم کا رویہ سارے برصغیر میں تبدیل ہو گیا اور ہم مسلمانوں کے ساتھ جو برتاؤ وہ لوگ کر رہے ہیں ہر خاص و عام پچھلے 59 سالوں سے دیکھ رہا ہے۔

ہندو کبھی مہنگا سودا نہیں کرتا۔ وہ لوگ جو غاصبانہ طور پر کشمیر پر قابض ہیں اور سات لاکھ فوج پر اربوں روپے خرچ کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس تجویز کا حصّہ ہے کہ کشمیر کے دریاؤں کا پانی روک کر کسی وقت پاکستان کو ریگستان بنا دیا جائے۔ آگے میں عاجز چوتھی تلخ حقیقت میں اینگلو امریکن بلاک کی پاکستان دشمنی کا خلاصہ پیش کروں گا اور انگریز دنیا کے نقشے پر کبھی کوئی مضبوط مسلمان ملک دیکھنا یا بن جانا پسند نہ کرتا تھا۔ چونکہ انگریز بھارت کے بھی ٹکڑے کرنا چاہتے تھے تو وہ لوگ بھارت کے شمال مغرب اور شمالی مشرق میں جو دو چھوٹے ملک بنانا چاہتے تھے وہ مشرقی اور مغربی پاکستان کو کبھی ایک متحدہ ملک نہ دیکھنا چاہتے تھے اور مشرق میں تو ''بنگلستان'' بنانا چاہتے تھے۔ اس میں کامیابی نہ ہو سکی تو مجبوری کے تحت وقتی طور پر مشرقی اور مغربی پاکستان کو چند سال اکٹھا رہنے دیا اور پھر ہمارے ہاتھوں سے ہمیں دولخت کرا دیا۔ مغرب میں بھی انگریز نہ صوبہ سرحد کو پاکستان کا حصّہ بنانے کے حق میں تھے اور نہ کشمیر پاکستان کو دینا تھا کہ مغربی پنجاب اور سندھ کے ایک ٹکڑے کو الگ کرنا ہی وہ لوگ کافی سمجھتے تھے۔ ہم جو صبح شام ماؤنٹ بیٹن اور ریڈکلف کو بدنام کرتے رہتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ بے ایمانی کر گئے یہ عاجز اپنے مضامین میں ثابت کر چکا ہے کہ یہ کچھ ہمارے ساتھ پوری انگریز قوم نے کیا۔ انگریزوں کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے اور چوتھی تلخ حقیقت کے بیان کے وقت تفصیل آ رہی ہے کہ وہ لوگ بہت پہلے سے ہر قسم کی پالیسی بنا لیتے ہیں ہمیں یہ غلط فہمی ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے آ کر ڈیڑھ دو ماہ میں یہ بٹوارے کی تجویز بنا لی۔ یہ تجویز کب کی بن چکی تھی۔ صرف وقت کا تعیّن باقی تھا اور جو گورداسپور کا ضلع یا امرتسر ضلع کی مسلم اکثریت والی دو تحصیلیں ہمیں نہ دی گئیں اس میں مقصد صرف بھارت کا کشمیر کے ساتھ زمینی رابطہ قائم رکھنے کے علاوہ مادھوپور ڈیم اور ہیڈ ورکس بھی بھارت کو دینا مقصود تھا کہ پاکستان کو جب مرضی ہو ریگستان بنایا جا سکے۔ البتہ آخری وقت ماؤنٹ بیٹن نے جواہر لعل نہرو کی سفارش سے ہمارے ساتھ مزید بے ایمانی کی کہ فیروز پور ہیڈ ورکس اور فیروز پور کی دو تحصیلیں مسلم اکثریت والی ہمیں دی جا رہی تھیں۔ وہ بھی ماؤنٹ بیٹن نے بھارت کو دلوا دیں کہ جے پور اور راجپوتانہ کے مہاراجوں نے فیصلہ کیا ہوا تھا کہ وہ اس ملک میں شامل ہوں گے جس کو فیروز پور ہیڈ ورکس ملے گا۔ اس تبدیلی کی البتہ ماؤنٹ بیٹن نے حکومت برطانیہ سے منظوری لی اور حکومت کے علاوہ مخالف پارٹی سے بھی منظوری لینا تھی۔ انگریز کی زبان پر کبھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ زبانی طور پر وہ کچھ اور کہتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ کرتے وہ کچھ ہیں جو قومی مفاد میں پہلے سے فیصلہ کیا ہوتا ہے اور اس عمل کیلئے کسی ایک آدمی پر ذمہ داری ڈال دی جاتی ہے کہ یہ کچھ تمہارے ساتھ لارڈ کلائیو نے کر دیا' یہ اٹھارھویں صدی کا واقعہ ہے۔ اور یہ کچھ تمہارے ساتھ ماؤنٹ بیٹن نے کر

دیا' یہ بیسویں صدی کا واقعہ ہے۔ ذرا دیکھیں کہ ساری انگریز قوم عراق میں امریکہ کے اتحادی بننے کی مخالفت کر رہی ہے لیکن پارلیمنٹ میں حزب اختلاف یعنی کنزرویٹو پارٹی نے بھی وزیراعظم بلیئر کو ووٹ دیا ہے کہ انگریز قوم نے پالیسی کے طور پر امریکہ کے اتحادی بننے کا کب کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔ یعنی منہ میں رام رام اور بغل میں چھری۔

تو ہماری قوم کو یہ اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیئے کہ بھارت نے اینگلو امریکن بلاک کی شہ پر کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے۔ بھارت نے دل سے پاکستان کے وجود کو بالکل تسلیم نہیں کیا اور بین الاقوامی آداب کے تحت وقت گزارنے اور ٹال مٹول سے کام چل رہا ہے۔ اب ہمارے لئے ضروری ہے کہ بھارت والوں کیلئے کشمیر پر قبضے کو اتنا مہنگا سودا بنا دیں کہ بھارت خود بخود کشمیر سے دستبردار ہو جائے۔ اس عاجز اور کرنل شیر محمد نے اس چیز کو 1952ء سے ہی سمجھ لیا تھا۔ جب ہم دونوں آزاد کشمیر افواج کے ساتھ وابستہ ہوئے اور اس کا حل ہمیں سورۃ الصف کی آیات مبارکہ 10 اور 11 میں نظر آیا کہ رب کی ذات پاک نے بڑے واضح الفاظ میں اس دنیا کی ذلت کی زندگی کو بھی ایک عذاب الیم قرار دیا اور اس کا علاج یہ بتایا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر ایمان لائیں اور اس کی راہ میں مال و جان سے جہاد کریں۔ تو پاکستان بنانے کا بڑا مقصد ہمارے خیال میں یہ ہے کہ ہم مومن اور مجاہد بن جائیں' جس کو ہم کئی طرز بیانات سے واضح کرتے آ رہے ہیں کہ جہاد ہمارے لئے طرز زندگی ہے اور اللہ تعالیٰ صرف مومنین کی مدد کا وعدہ فرماتا ہے۔ قرآن پاک میں کسی جگہ مسلمین کے ساتھ ایسا وعدہ نہ کیا اور پوری امت کو وحدت اختیار کرانے کیلئے ہمیں پہلے پاکستان میں حزب اللہ بن کر اس عمل کی بسم اللہ کرنا ہو گی۔ فوج میں ان خیالات کو ہم کسی حد تک پھیلا سکے اور پاکستان جواب تک ختم ہونے سے بچا ہوا ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ کچھ فوجی نظریہ جہاد کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں اور جہاد کے کچھ تقاضے عملی طور پر ہماری فوجی تربیت کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ برادرم کرنل شیر محمد مرحوم نے البتہ 1962ء کے بعد فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی نظریہ جہاد کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ سردار قیوم کو بعد میں جب سیاست میں کودنا پڑ گیا کہ وہ آزاد کشمیر کا صدر بننا چاہتا تھا اور اس کی اس تحریک میں شمولیت محدود ہو گئی لیکن ہم نے اس نظریہ کو پھیلانے کیلئے جو طریقے اختیار کئے یا ہماری جو مخالفتیں ہوئیں وہ بڑی لمبی کہانیاں ہیں۔ 1970ء میں کرنل شیر محمد مرحوم کو آئی ایس آئی میں بلا کر کئی طریقوں سے تنبیہہ کی گئی۔ میجر جنرل شیر دل نیازی جو شیر محمد کے ماتحت کام کر چکا تھا' کو شیر محمد کے ساتھ رابطہ باندھنے کیلئے اس کے پاس بھیجا گیا۔ ایک خفیہ سرکولر جاری کیا گیا جہاں افسروں کو ان کے ساتھ رابطہ سے منع کیا گیا اس عاجز کو فطرت نے کسی خاص مشیت کے تحت جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپاہی کے نام سے موسوم کر دیا تھا تو مجھ پر پردہ پڑا ہوا تھا کہ مجھے کسی نے کچھ بھی نہ کہا اور ایک دفعہ مجھے فوج سے ریٹائر کر کے پھر مجھے واپس بلا لیا بلکہ بھٹو کے عہد میں ایک دفعہ پکے طور پر چلے جانے کے باوجود مجھے دوبارہ فوج میں وردی پہنا دی گئی۔

اس سارے عرصہ میں اول فوجی اخبار ہلال کے مضامین کی مدد سے جس طرح اس عاجز کو رب کی ذات پاک نے فلسفہ جہاد کو عملی طور پر اجاگر کرنے کی سعادت نصیب فرمائی اور جس طرح اسلامی فلسفہ حیات کے عملی پہلو کو واضح کیا گیا اور متعدد لکھاڑیوں کی قلموں کی نوک پلک کو نظریہ حیات کی طرف موڑ دیا گیا میں اپنے تمام معاونین کا تہہ دل سے آج تک شکریہ ادا کرتا رہتا ہوں کہ پھر جلدی بعد رب کی ذات پاک نے افغانستان میں جہاد شروع

کرا دیا۔ اس سلسلہ میں بھی بعض دفعہ کچھ دانشوروں یا لکھاڑیوں نے وطن کی حرمت کی بات کی۔ کچھ نے اس کو جنگ آزادی قرار دیا۔ اور کئی باطل تلمیحات بھی استعمال ہوئیں۔ لیکن مجاہد دانشوروں نے آخر میدان مارلیا اس میں مشیت نے بھی بڑی مدد کی۔ تمام دنیائے اسلام سے مومن جو عمل شروع کئے ہوئے تھے اس مشترکہ قدر کو جہاد کے بغیر کوئی دوسرا نام دیا ہی نہ جا سکتا تھا اور مومنین کے اس ولولہ جہاد نے نہ صرف دہلی کے حکمرانوں کی چولیں ڈھیلی کر دیں بلکہ لندن اور واشنگٹن میں بھونچال آیا ہوا ہے اور اب اس عمل کو دہشت گردی قرار دیا جا رہا ہے۔ بے شک صحیح جہاد میں باطل طاقتوں کیلئے دہشت کا عمل ہوتا ہے۔ بہر حال بات سیدھی ہے کہ اگر ہم غیرت اور عزت کی زندگی کے خواستگار ہیں اور بھارت کو اس کے مقام پر رکھنا چاہتے ہیں اور بھارتی ارادوں کو مومن کی فراست سے سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنانا ہوگا۔ تو پھر اس برصغیر کے کفر سے پاک ہونے کا عمل بھی ساتھ ہی شروع ہو جائے گا۔ لیکن پہلی ضرورت یہ ہے کہ بھارت کیلئے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کو ان کیلئے مہنگا سودا بنانا ہوگا کہ بھارتی پاکستان کی حقیقت کو دل و جان سے سمجھیں کہ ان کے اندر بھی کئی پاکستان بننے والے ہیں اور ان کے افسانوی عقائد کے تحت معاشرہ اب مزید نہ چل سکے گا۔

ان وضاحتوں کے بعد تیسری تلخ حقیقت کو سمجھنا اب آسان ہو جائے گا کہ جو لوگ نیک نیتی سے بھارت کا چھوٹا بھائی بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ وہ باور کرلیں کہ قرآن پاک کی سورۃ ''ص'' میں جو دو بھائیوں کا ذکر ہے کہ ننانوے دنبیوں کا مالک بھائی' اپنے غریب بھائی کی ملکیت ایک اکیلی دنبی پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ تو بھارت کا چھوٹا بھائی بن کر اس اکیلی دنبی کی ملکیت کو بھی بھول جائیں۔ جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو ایمان کی کمی کی وجہ سے بھارت کے مقابلہ میں بھوٹان بننا چاہتے ہیں کہ بھارت بہت بڑا ملک ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام کے حساب سے سب بڑائیاں اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے ہیں اور ان کے غلاموں کیلئے ہی سب بڑائیاں ہیں یعنی بات رب کی ذات پر تقویٰ اور توکل کی ہے کہ رب کی ذات پاک نے سورہ توبہ کے مطابق مومنین سے مال اور جان خرید لئے ہیں کہ بدلے اس کے آخرت میں جنت ہے۔ زندگی اتنی قیمتی نہیں کہ چلو نوے ہزار نہ سہی پچاس' ساٹھ ہزار مسلمانوں نے جان بچانے کے لئے 1971ء میں ہتھیار ڈال دیئے اور صرف چند لوگ ''سلطان ٹیپو'' بننے پر تیار ہوئے اور قافلے میں ایک ''امام حسین'' بھی نہ تھا۔ یہاں تو چراغ بجھانے کی ضرورت بھی نہ تھی اور ایمان کے درجات ہوتے ہیں۔ ستمبر 65ء جنگ کے آخری ہفتہ میں شالامار باغ پر قبضہ کرنے کیلئے بھارت نے ہماری تقریباً دو سو نفری کی دو کمپنیوں پر کئی بریگیڈوں سے حملے کر کے اپنا اتنا نقصان کرایا کہ 21 اپریل 69ء کو بھارتی لوک سبھا میں سناٹا چھا گیا جب ان کو بتایا گیا کہ ان کا کئی ہزاروں کا جانی نقصان کچھ بھی نہ حاصل کرسکا اور یہ کچھ ہم ایمان کی طاقت سے کر سکے اور آخری جوان اور آخری گولی تک لڑتے رہے اور افسوس ہمارے اوپر والے ہماری مدد کرنے کی بجائے ہمارے عقب کی حفاظت بھی نہ کر سکے کہ 21/22 ستمبر کی رات کو دشمن نے ہمیں گھیرے میں لے لیا اور ہماری بارود کی سپلائی بھی ختم ہوگئی لیکن ہم نے کمک کی امید میں مزید سولہ گھنٹے گھیرے میں جنگ جاری رکھی اور جب سب کچھ ختم ہوگیا تو راقم سمیت چند مجاہدین نے دشمن کا گھیرا توڑ کر بی آر بی کے آگے ہی ایک اور دفاعی لائن بنالی اور بھارتیوں کی نگاہوں سے بھی شالا مار باغ کو

اوجھل رکھا۔ اب جنرل آصف نواز اگر بھارتی جنرل کو اس باغ میں دعوت دے کر اس کا تقدس ختم کرنا چاہتا تھا تو مجھے ایسے معلوم ہوتا تھا کہ میری ''پکار'' پر میرے سب شہدا ساتھی چیخ اٹھے کہ خبردار ایسا نہ ہوگا۔'' اور قارئین میں جس کسی کو شک ہے کہ یہ جذباتی باتیں ہیں تو اس کو گزارش ہے کہ وہ کسی دن لاہور کے فوجی قبرستان میں چلا جائے۔ وہاں ایک شہید گنج ہے جہاں ہماری سولہ پنجاب کے وہ شہدا مدفون ہیں جن کے جسد خاکی ہم نے میدانِ جنگ سے سیز فائر کے بعد اٹھائے اور جنگ اتنی شدید تھی کہ ہزار تلاش کے باوجود 24 شہدا کے لاشوں کا ہمیں کوئی ایسا حصّہ نہ ملا کہ ہم اس کی پہچان کر سکتے۔ جن کی کچھ پہچان کر سکے ان کو اکٹھا دفن کر کے ادھر ان کے نام کندہ کر دیئے اور کیپٹن صغیر شہید کو الگ قبر میں نزدیک ہی دفن کر دیا۔ وہاں ذرا فاتحہ پڑھنے کے بعد ان شہدا سے سوال کرنا تو بڑے جوابات ملیں گے۔ ایک جواب اس خطہ کے پہلے بڑے مجاہد محمود غزنوی کی زبان میں ہوگا کہ اسلامی فلسفہ حیات کو ایک ہی فقرہ میں بیان کر دیا کہ بات ہی ساری روز قیامت کی ہے اور وہ روز قیامت بت فروش کی بجائے بت شکن کے نام سے پکارے جانے کو پسند کریں گے۔ ساتھ ہی سلطان ٹیپو کی آواز سنائی دے گی کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے۔ کوئی شک ہے تو آخری بات سن لینا۔ اکثر شہدا پر شہادت زندگی میں ہی آ کر چھا جاتی ہے اور یہ لوگ مجھے میدان جنگ میں کہا کرتے تھے کہ میں ان کی کہانیاں لکھوں گا اور مجھے وہ لوگ ایسا اعزاز عطا کر گئے کہ یہی میرا زادِ راہ ہے کہ یہ عاجز حساب کتاب سے پہلے عرض کرے گا کہ اے میرے رب مجھے جو ''حضور پاک ﷺ کے سپاہی'' کا نام عطا ہوا ہے۔ مجھے اب اسی نام سے ہی پکارا اور جانا جائے۔ اس عاجز کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کیلئے اعمال نہیں ہے۔ علامہ اقبال زیادہ دانا تھے۔ ان کو تو بہانہ آتا تھا کہ حضور پاک ﷺ کی نگاہ سے ''پوشیدگی'' کی بات کی۔ بھلا کونسی جگہ ان ﷺ کی نگاہ سے پوشیدہ ہوگی؟ لیکن اس عاجز کے پاس تو آقا ﷺ کے نام کی غلامی کے بغیر اور کوئی زادِ راہ نہیں تو رب کی رحمت کا امیدوار ہوں اور قارئین کے لئے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان نکتوں میں اپنے لئے نشان راہ تلاش کریں تو رب کی ذات ان کو مومن کی فراست عطا کر دے گی۔

اور یاد رہے کہ چوتھی تلخ حقیقت کو سمجھنے کیلئے بہت زیادہ مومن کی فراست کی ضرورت ہے کہ بے شک ہم نے پاکستان حاصل کرنے کیلئے بڑی قربانیاں دیں ...... ایک رہنما بھی میسر ہوگیا کہ یہ بھی یاد رکھیں کہ اینگلو امریکن بلاک والے ہمیشہ اس ملک کو اپنی ضرورت کے مطابق ''تراشتے'' رہتے ہیں اور ہمیں اپنی ڈگڈگی پر نچا رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ جو بے ایمانی وہ کرتے ہیں وہ اپنی قوم کے کسی ایک آدمی کا عمل بنا کر خود کو ہمارا ''دوست'' ظاہر کرتے ہیں۔ میں اپنے مضامین میں ثابت کر چکا ہوں کہ ہمارے ساتھ ہر بے ایمانی اینگلو۔ امریکن بلاک کی ''پالیسی'' اور ''ضرورت'' کے تحت کی جاتی ہے۔ سب سے بڑی اور پہلی بے ایمانی ہمارے ساتھ انگریزوں نے یہ کی کہ مادھو پور ہیڈ ورکس اور اس کے ملحقہ مسلم اکثریت والے علاقے بھارت کو دے کر دریائے راوی کا سارا پانی بھارت کو دے دیا اور آخری وقت فیصلہ تبدیل کر کے فیروز پور ہیڈ ورکس اور اس کے ملحقہ مسلم اکثریت والے علاقے بھارت کو دے کر دریائے ستلج اور دریائے بیاس کا پانی بھی بھارت کو دے دیا۔ جنوری 2004ء میں نوائے وقت میں سابق وفاقی وزیر مشاہد حسین اس بے ایمانی کا سرسری ذکر کرتا ہے لیکن یہ عاجز اپنے مضامین میں بہت تحقیق کر کے پوری

کہانی لکھ چکا ہے کہ راجپوتانہ کے راجے خاص کر مہاراجہ جے پور نے فیصلہ کیا ہوا تھا کہ وہ اس ملک میں شامل ہوں گے جس کا فیروز پور ہیڈ ورکس پر کنٹرول ہو گا۔ اگر یہ علاقے جن پر ہمارا حق تھا وہ ہم کو مل جاتے تو بھارتی مشرقی پنجاب کے کچھ علاقے مجبور ہو کر بھارت کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ مل جاتے اور شمالی ہندوستان اب تک مسلم شمالی ہندوستان ہو چکا ہوتا اور آہستہ آہستہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان زمینی طور پر ایک ہو جاتے اور ایک دن ایسا ہونا ہے کہ اس برصغیر نے کفر سے پاک ہونا ہے۔ حکومت برطانیہ اور انگریز قوم نے یہ بے ایمانی ماؤنٹ بیٹن اور ریڈکلف کے ''کھاتے'' میں ڈال دی اور ہماری نادان قوم آج بھی برطانیہ اور امریکہ کو ہمارے ''خیر خواہ'' گردانتی رہتی ہے۔

جموں کو ہم نے چھوڑ دیا تو جموں نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا

دوسری بڑی بے ایمانی ہمارے ساتھ ہمارے انگریز نوکروں نے جو کی اور یہ ایک سازش تھی جو انگریز قوم کب سے تیار کر چکی تھی اس کو ''پروان چڑھانے'' کا کام ماؤنٹ بیٹن اور ہمارے انگریز نوکروں نے کیا۔ برطانیہ کی پالیسی کے مطابق مسلم اکثریتی آبادی والا کشمیر کا علاقہ ہرگز پاکستان کو نہ دینا تھا۔ اس لئے بے ایمانی کر کے اکثریت مسلم آبادی والا ضلع گورداسپور' انگریزوں نے بھارت کو دے دیا کہ ان کا ریاست جموں و کشمیر کے ساتھ زمینی رابطہ ہو جائے۔ یہ عاجز واضح ثبوتوں کے ساتھ بیان کر آیا ہے کہ مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ خود ہندو ہونے سے ہندو ذہنیت کو بہتر طور پر سمجھتا تھا اور بھارتی کانگرس پر اس کو کوئی اعتبار نہ تھا کہ بھارت میں شامل ہو جانے کے بعد وہ لوگ مہاراجہ کا مقام قائم رکھیں گے یا نہیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے ہمارے انگریز نوکروں سرحد کے گورنر جارج کنگھم' پنجاب کے گورنر فرانسس موڈی اور ہماری بری فوج کے سربراہ جنرل میسروی اور ان کے انگریز سٹاف سے مل کر ایک سازش تیاری کی کہ اہل پاکستان کو شہ دی جائے کہ قبائلی مجاہدین سے مظفر آباد والے راستے پیش قدمی کرا کے سری نگر ''فتح کیا جائے''۔ اس کام کے لئے برطانوی خفیہ سروس کے ریاست مالیر کوٹلہ کے ایک افسر میجر خورشید انور کو چنا گیا۔ جس کو یہ ''ٹاسک'' دیا گیا کہ وہ بارہ مولا کے نزدیک بجلی گھر مہورا پر دسہرہ والے دن قبضہ کر کے شام سات بجے بجلی بند کر دے۔ مہاراجہ کے دربار میں ریاستی سیکرٹری مینن اور اس کا وزیراعظم مہر چند مہاجن موجود تھے جنہوں نے سری نگر میں اندھیرا گھپ ہونے کے بعد مہاراجہ کو مشورہ دیا کہ اگر وہ ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ کرنے کو تیار ہے تو راتوں رات جموں پہنچے اور اس کا قیمتی سامان بھی سوٹرکوں میں جموں لے جایا جا رہا ہے تو بھارت والے اس کو ''حفاظت'' پہنچا سکتے ہیں۔ مہاراجہ تو اپنی موت کے بغیر ہر حکم پر دستخط کرنے کو تیار تھا۔ سرحد کا گورنر جارج کنگھم اور جنرل مسروی کا نائب جنرل گریسی' بھارت کی فوج کے سربراہ جنرل راب لاکھرٹ کو گھڑی گھڑی کی خبر پہنچا رہے تھے کہ قبائلی لشکر کہاں ہے اور بھارتی فوج تیار کھڑی تھی۔ قبائلی مجاہدین بارہ مولا بٹھا دیئے گئے تھے اور بھارتی فوج ان سے پہلے سری نگر پہنچ گئی کہ اکبر خاں طارق نے جو سری نگر کے نزدیک بڈگام کے ہوائی اڈہ پر قبضہ یا خلل کی تجویز بنائی تھی' اس طرف دھیان ہی نہ دیا گیا۔ ادھر جو پنجاب سے سیالکوٹ کے علاقے سے تین ہزار مجاہدین نے کٹھوعہ' جموں روڈ پر قبضہ کرنا تھا اور اکبر خان طارق نے پنجاب پولیس کے ذریعہ سے ان کو تین ہزار

رائفلز دیں۔ ان کو سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر غلام کذاب کے پوتے ایم ایم احمد نے گورنر پنجاب فرانس مودی کے حکم پر رپوچک میں ''سگر یکیٹ'' کر لیا کہ خبردار جموں کشمیر سرحد کی طرف کوئی حرکت نہ ہو۔ اس کام کے لئے جنرل میسروی کے حکم پر سیالکوٹ چھاؤنی میں سولھویں پنجاب سنٹر کا کمانڈر کرنل ہوبرٹ ایم ایم احمد کی مدد کر رہا تھا کہ مہاراجہ کشمیر کو تسلی دینا تھی کہ جموں میں اس کی حفاظت کا بندوبست کر لیا گیا ہے تا کہ وہ ریاست کے بھارت کے ساتھ الحاق پر دستخط کر دے یا مشہور کر دیا جائے کہ مہاراجہ نے دستخط کر دیئے ہیں کہ وہ ایک طرح سے بھارتی حکمرانوں کی ''حراست'' میں تھا اور پٹھانکوٹ سے بھارتی فوجیں جموں پہنچ چکی تھیں۔ ہمارے انگریز مشیروں اور نوکروں نے اس سلسلہ میں ہمارے وزیراعظم لیاقت کو اپنے ساتھ ملایا ہوا تھا کہ اس نے پنجاب کے وزیراعلیٰ خان افتخار حسین ممدوٹ کو حکم دیا کہ پنجاب سے جموں وکشمیر میں مجاہدین کوئی کارروائی نہ کریں گے کہ ایسی کارروائی سے دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ سکتی ہے۔ اور جب قائداعظم نے پنجاب کے گورنر مودی کی وساطت سے جنرل میسروی کو حکم دیا کہ ہماری افواج جموں کا رابطہ بھارت سے کاٹ دیں تو میسروی صاحب مچھلیوں کے شکار کا ''شوق'' فرما رہے تھے کہ اس کا نائب جنرل گریسی ٹال مٹول کر سکے اور فیلڈ مارشل آکنلیک سے رابطہ باندھا جائے اور آخر لاہور میں ان سب انگریزوں آکنلیک' مودی' میسروی اور گریسی نے لیاقت کابینہ کو اپنا ہم خیال بنا لیا کہ کسی جہاد کی کارروائی کا سوچیں بھی نہ کہ وہاں ہندوؤں کی بھی کافی آبادی ہے اور اسی وجہ سے لیاقت علی نے اکبر خان طارق کی قبائلی مجاہدین کے جموں محاذ پر استعمال کی تجویز مسترد کر دی جو اپنی کتاب میں لکھ گیا ''جموں کو ہم نے چھوڑ دیا تو جموں نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔''

''قارئین ذرا اندازہ لگائیں کہ برطانیہ کی خفیہ سروس کا میجر خورشید انور قبائلی مجاہدین کو سری نگر محاذ پر استعمال کرتا ہے تو دونوں ملکوں میں جنگ نہ چھڑی اور جنگ چھڑنے کا کوئی ''خطرہ'' نہ تھا کہ وہاں مجاہدین کو سازش کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا کہ انہوں نے اول مہاراجہ کیلئے ''اندھیرا گھپ'' کر کے اس کو ڈرانا تھا اور جب بھارتی فوجوں کا سری نگر پر قبضہ ہو گیا اور ہوائی فوج بھی بڈگام پہنچ گئی تو خورشید انور نے قبائلی مجاہدین سے سری نگر کی طرف کھلے میدان میں پیش قدمی کرائی۔ جہاں بھارتی توپوں اور ہوائی جہازوں نے دیکھ بھال کر کے ان پر اس طرح گولے برسانے تھے کہ ''جہاد کا کیڑا'' ان کے دماغ سے خارج کیا جائے۔ (توبہ میرے اللہ)

افسوس کہ ہماری قوم نے اس وقت اس سازش کو نہ سمجھا۔ نہ اب سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس زمانے میں صرف جارج کنگھم کو سرحد کی گورنری سے فارغ کیا کہ اس کے بھارتیوں کو قبائلیوں کی پیش قدمی کی اطلاع دینے کی خبر خود بھارتی اخباروں نے دی۔ ہمارے باقی انگریز نوکر ہمیں اسی طرح ''بے وقوف'' بناتے رہے کہ کشمیر جو تاریخی' جغرافیائی اور روحانی لحاظ سے پاکستان کا حصّہ تھا اور سیاسی بانٹ کے اصول کے لحاظ سے بھی ہمارا حصّہ تھا اور قانونی طور پر مہاراجہ کشمیر ہمارے ساتھ **Stand Still** معاہدہ کر چکا تھا۔ وہ یک طرفہ طور پر بھارت سے نہ الحاق کر سکتا تھا نہ بھارت اکیلا وہاں اپنی فوج داخل کر سکتا تھا لیکن ماؤنٹ بیٹن اور آکنلیک نے ہمیں مزید بے وقوف بنایا کہ ہم اپنی فوج کے کشمیر میں داخلہ کو ایک ہفتہ کیلئے التوا میں ڈالیں کہ ''تصادم'' نہ ہو اور ہفتہ بعد نہرو اور پٹیل دونوں لاہور آ کر کشمیر کے بارے فیصلہ کر جائیں گے کہ دریائے چناب کے مشرق کے علاقوں میں ہم کوئی

فوجی کارروائی نہ کریں کہ جھگڑا صرف ان علاقوں کا ہے۔ باقی علاقے پاکستان کا حق ہے اور پاکستان کو مل جائیں گے لیکن نہرو اور پٹیل نہ آئے اور نہ انہوں نے آنا تھا۔ البتہ ہمارے انگریز نوکروں نے فروری 1948ء میں ہمارے افتخار خان اور موسیٰ سے چناب کے مشرق اور سیالکوٹ کے علاقوں میں مجاہدین پر جھاڑو لگوا دیا۔ یہ عاجز جس نے ایک ایک مجاہد سے تحقیق کی اور خود بھی اکثر واقعات کا چشم دید گواہ ہے تو اب بھی میں تنہائی میں ڈھائیں مار کر روتا ہوں کہ اے رب نبی محمد ﷺ تو ہماری قوم کو کب مومن کی فراست عطا کرے گا اور کب ہم غیرت کی زندگی بسر کرنا شروع کریں گے کہ اس زمانے میں تو پھر بھی کچھ غیرت تھی کہ ان سب بے ایمانیوں کے باوجود جھنگڑ دھرمسال کی عظیم فتح حاصل کی اور ڈھنڈ کے کے مقام پر ایک بھارتی پلٹن کے پرخچے اڑا دیئے۔ نوشہرہ اور پونچھ ہمارے گھیرے میں تھے اور پکے ہوئے پھل کی طرح ہماری جھولی میں گرنے والے تھے کہ اوڑی کے محاذ پر اکبر خان طارق گوالھن کے مقام پر ایک بھارتی پلٹن کو تباہ کر چکا تھا اور شمالی محاذ پر بھارتی اپنے زخموں کو چاٹ رہے تھے۔ یہ دسمبر 1947ء کی کارروائی اور دو ماہ کے جہاد کے ثمرات تھے۔ اب اکبر خان طارق، راولپنڈی آ کر بھارتی ''غاصبوں'' کو سارے کشمیر میں تتر بتر کرنے کی تجویز بنا رہے تھے اور بھارتی سخت گھبراہٹ میں تھے تو ماؤنٹ بیٹن نے نہرو کو مشورہ دیا کہ وہ کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ لے جائے تو تب وہ پاکستان کے انگریز نوکروں کی مدد سے کشمیر کے جہاد میں ''ٹھہراؤ'' پیدا کر سکے گا۔ قارئین اکبر خان کی تجویز پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ بھارتی اپنا ''سر'' کشمیر وادی، میں لے گئے تھے اور ان کے ''پاؤں'' جموں میں تھے اور ہم ان کے ''بدن'' کے ہر حصے پر چوٹیں مار مار کر بھارتی فوجی مشینری کو اس طرح تباہ کر سکتے تھے کہ وہ لوگ حیدر آباد کی طرف میلی آنکھ بھی نہ دیکھ سکتے۔ شمال میں مجاہدین نے جو کامیابیاں حاصل کیں کہ وہ کارگل سے آگے درہ ''زوجیلہ'' تک پہنچ چکے تھے اور بھارتیوں کا سڑک کے راستہ سے لِہ کے ساتھ رابطہ منقطع ہو چکا تھا اور کچھ مجاہدین بانڈی پور کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ٹھوال سے مجاہدین ہندواڑہ پہنچ گئے تھے، اور ضلع سوپور کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ جنوب میں اگر ہم ایک طرف پونی بارکھ کو آزاد کرائے ہوئے تھے تو راجوری سے مشرق میں ایک طرف بانہال اور رام بن تک پہنچے ہوئے تھے تو راجوری سے شمال میں تھنہ منڈی، شوپیاں اور پیر پنجال تک سب علاقے آزاد ہو چکے تھے۔

اکبر خان طارق نے بھارتی فوج کو تتر بتر کر کے جگہ جگہ جو چوٹیں مارنے کی کارروائی شروع کرنے سے پہلے ماؤنٹ بیٹن کے کہنے پر ہمارے انگریز نوکروں نے جہاد میں ''ٹھہراؤ'' پیدا کر دیا کہ معاملہ اب اقوام متحدہ میں چلا گیا ہے۔ دوسری طرف ظفر اللہ خان قادیانی سے لمبی لمبی بے مقصد تقریریں کرا کے کشمیر کے معاملات کو التوا میں ڈالا جا رہا تھا۔ لیکن اینگلو امریکن میڈیا نے ظفر اللہ کو وہ پذیرائی دی کہ ہم نے اس کو وزیر خارجہ بنا دیا۔ لیکن اصلی سازش چند ماہ بعد میں ''نمودار'' ہوئی ہمارے انگریز جنرل نے اکبر خان کو جو کرنل تھا اس کا برگیڈیئر بننے کا نمبر کاٹ دیا کہ برگیڈیئر تب بنے گا کہ فوج میں واپس جائے اور اس طرح سے اس کو طارق ہیڈ کوائٹر سے ہٹا کر لیاقت علی نے ہمارے پاکیزہ جہاد کو انگریزوں کے ہاتھ میں ''پکڑا'' دیا۔ تو انہوں نے نہ صرف نظریہ جہاد کے بخیے ادھیڑنے شروع کیے بلکہ پاکستانی فوج کو غلط وقت اور غلط جگہوں پر بغیر ہوائی جہازوں اور توپوں کی مدد کے اس طرح استعمال کیا کہ بھارتی ''سورماؤں'' کو ہم پر برتری حاصل ہو گئی کہ آزادی سے پہلے لڑاکا فوج میں مسلمانوں کی نفری

45 فیصد تھی۔ سکھوں کی 15 فیصد اور ہندوؤں کی نفری 40 فیصد سے بھی کم اور وہ مسلمانوں سے بہت مرعوب رہتے تھے کہ میدان جنگ یا کھیل دوڑ میں ڈوگرے' جاٹ اور راجپوت وغیرہ ہم سے بہت کم تر یا نیچے ہوتے تھے۔ جنرل گریسی نے 20 اپریل 48ء کو حکومت کو ایک خط لکھ کر خوب بے وقوف بنایا کہ پاکستان کے دفاع کیلئے ضروری ہے کہ بھارتی فوجیں نوشہرہ' جھنگڑ' پونچھ اور اوڑی سے آگے نہ بڑھیں' اور ہم ''نادانی'' میں یہ خط اقوام متحدہ میں لے گئے کہ ہمارا ایک انگریز نوکر بھی ہمیں ایسا مشورہ دے رہا ہے کہ کشمیر میں ہماری موجودگی ضروری ہے اور یہ نہ سوچا کہ اس کے بعد راجوری سے مشرق اور شمال کے وسیع علاقوں یا ہندواڑہ' سوپور یا بانڈی پورے یا درہ زوجیلہ کے وسیع علاقے جو ہم نے آزاد کرا لئے تھے۔ ہم سارے کشمیر اور خاص کر ان علاقوں سے ایک طرح سے ''دستبردار'' ہو رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ہمارے انگریز نوکروں نے کیا کچھ کیا صرف چند لوگوں کو اس زمانے میں کچھ سمجھ آئی۔ جس کا نتیجہ ''راولپنڈی سازش'' کے مقدمہ کے 'ڈرامہ' کی صورت میں نکلا کہ ہمیں مکمل طور پر خاموش کر دیا گیا' کہ ہمارے حکمران ہمیں ''بے جان'' کرتے رہے۔ یہ الگ کہانی ہے لیکن کشمیر کے حالات کا چشم دید گواہ ہوتے یہ عاجز اب بھی جب اکیلا ہوتا ہے تو میرے آنسو جاری ہو جاتے ہیں کہ نومبر 1948ء میں ان انگریزوں نے نہ صرف شمال میں ہمیں کارگل کے پیچھے تک پسپائی کرائی کہ بھارتیوں کا 'لِہ'' کے ساتھ رابطہ بندھ جائے بلکہ جھنگڑ کا پونچھ کے ساتھ رابطہ بحال کر کے کشمیر کی زرخیز مینڈھر کی وادی بھی بھارت کو دیدی اور چونکہ بھارت کو جو کچھ تب تک گیا تھا وہ اس کو ''ہضم'' نہ کر سکتا تھا۔ تو توپوں کے فائر سے ''آتش بازی'' کرا کے یکم جنوری 1949ء کو جہاد کو پکا جمود دے دیا تھا۔ اس سے پہلے انگریز جنرل ہمیں بے وقوف بناتے رہے کہ بھارت جس دن حیدر آباد میں کوئی فوجی کارروائی کرے گا' اس دن پاکستانی افواج بھی کشمیر میں کھلم کھلا داخل کر دی جائیں گی۔ لیکن یہاں ہماری افواج کو ''چوروں'' کی طرح کشمیر میں داخل رکھا گیا کہ ہمارا کشمیر پر کوئی ''قانونی'' حق نہیں ہے۔ اور ''پانڈو'' یا ''چیچ'' کے مقامات پر ہماری افواج کی بھارت کے خلاف عظیم فتوحات بھی ہمیں یہ کچھ دے سکیں کہ بھارتیوں کے ''قبضہ'' سے مظفر آباد بچ گیا۔

ظفر اللہ خاں اینگلو امریکا میڈیا مہم کے نتیجے میں وزیر خارجہ بنا۔
قصور ہمارا ہے کہ ہم مغربی میڈیا والا نظام اپنائے ہوئے ہیں

اس کے بعد بھی اینگلو امریکن بلاک والے کس طرح ہمارے ذرائع پر ''قابض'' رہے اور بھارت نے دریاؤں کا پانی بند کر دیا کہ نہ ہمارے پاس کچھ کھانے کیلئے تھا' نہ کچھ پہننے کے لئے اور فوجی سامان کے سلسلہ میں دھکے دے کر گاڑیاں چلا رہے تھے۔ ہمارے دانشور تو ہمیں دنیا کا پانچواں بڑا اور سب سے بڑا اسلامی ملک گردانتے رہے لیکن ہم ایک طرف ''سانجھی دولت'' کامن ویلتھ کے ایک بے وقعت ممبر تھے تو دوسری طرف ''سینٹو'' یا ''سیٹو'' اینگلو امریکن بلاک کے ''پچھ لگ'' تھے۔ جنہوں نے 1962ء میں بھی ہمیں دھوکہ دیا اور 1965ء میں بھی ہمیں ایسا بے وقوف بنایا اور ہمارے اندر ایسے سازشی پیدا کئے کہ ہم عارضی طور پر ملک کو بچا سکے۔ چھ سال بعد انہی لوگوں نے ہمیں دولخت کرا دیا۔ قصور ہمارا اپنا ہے کہ ہم ان لوگوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے اور ان کی نقل

میں باطل و کافرانہ سیاسی نظام، مغربی دفاعی نظام، کافرانہ معاشی نظام، کافرانہ رومن عدالتی نظام، نوکر پیدا کرنے والے لارڈ میکالے کا تعلیمی نظام وغیرہ اپنائے ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک کا ہر سربراہ عبرتناک انجام سے دوچار ہوا۔ کسی کو گولی کا شکار بنایا گیا، کسی کو برخاست کیا گیا، کسی کو گھسیٹ کر گورنر جنرل ہاؤس سے باہر نکالا اور کسی کو قید کر کے، کسی کو ''کتا ہائے ہائے'' کے نعرے سننے پڑے اور کوئی ذلت کا نشان بن گیا۔ کسی کو پھانسی چڑھایا گیا، کسی کے پرخچے اڑ گئے اور اب ''دو ہستیاں'' ملک سے باہر ایک دوسرے کو اس طرح ''چاٹ'' رہے ہیں۔ جس طرح گاؤں میں ایک کہانی مشہور ہے کہ دو بیل لڑتے بھڑتے ایک کنویں میں گر گئے، جب کچھ ہوش آیا تو ایک دوسرے کو چاٹنے لگ پڑے، اور کیا کرتے؟ ہمارے ان لیڈروں کا یہ ایک دوسرے کو ''چاٹنا'' بھی مجبوری ہے۔ ورنہ اس کافرانہ سیاسی نظام میں بڑا اصول ہی مخالفت برائے مخالفت ہوتا ہے کہ ''حزب اقتدار'' کے مقابلے میں ایک ''حزب اختلاف'' کا ہونا ضروری ہے۔ ادھر اسلام کے لحاظ سے تمام مومن بھائی بھائی ہیں لیکن یہاں ان کافرانہ نظاموں نے ان کو شیطان کی طرح مادر پدر آزاد کر دیا ہے۔ وہ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حکومت میں ''شریک'' بنے بیٹھے ہیں کہ ان کو ان باطل اصطلاحوں میں ''طاقت کا سرچشمہ'' قرار دیا جاتا ہے۔ سورہ الذاریات میں ایسے خراصوں کو قتل کرنے کے احکام ہیں تو یہاں رب نے ہمارے ہر رہنما کو عبرتناک انجام سے دوچار کر دیا ہے اور 59 سالوں میں کئی دفعہ ذلت کا طوق ہمیں گلے میں پہننا پڑا کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں نے جب موت کے ڈر سے فرار شروع کیا۔ جو بات ''استعارہ'' کے طور سورہ البقرہ کی آیت مبارکہ 243 میں بیان ہے تو آگے یہ الفاظ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''موتوا'' یعنی مر جاؤ، اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں موت کا لفظ استعارہ کے طور پر استعمال ہوا ہے کہ اس کے بعد فرمان الٰہی ہے کہ پھر انہیں زندہ کر دیا۔ تاریخی طور پر کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا کہ اپنے ہزاروں، ہزاروں جو لاکھوں کے معنی میں آتے ہیں کو کبھی دنیاوی موت دے کر اللہ تعالیٰ نے زندہ کیا ہو۔ یہ ذلت کی زندگی کی طرف اشارہ ہے کہ ہم ستر ہزار نوجوان عورتیں کفار کے پاس چھوڑ آئے اور نوے ہزار فوجیوں سے ہتھیار ڈلوائے۔ اس سے اگلی آیت مبارکہ 244 میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتال کا حکم ہے۔ تو اس عاجز کے یہ سارے مضامین ان دو آیات مبارکہ کے گرد گھومتے ہیں کہ پانچویں تلخ حقیقت خود بخود سامنے آ گئی کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے۔ ان ذلتوں کے بعد اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہمیں ''غیرت مند زندگی'' عطا فرمائے گی۔ یہی ''زندگی'' ہے اور ایسا کچھ جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنانے سے حاصل ہوگا۔

اس عاجز نے پاکستان کو بنتے دیکھا اور میں حیران ہوں کہ پاکستان بن گیا۔ غیروں یا غیر مسلموں کی مخالفت کی بات تو سمجھ میں آ سکتی تھی لیکن خود پاکستان کا حصہ بننے والوں نے جو مسلم لیگ یا پاکستان کی مخالفت کی اس سلسلہ میں سرحد میں خان غفار خان کے خاندان کا کردار تو ایک کھلی کتاب ہے اور یہی کچھ بلوچستان میں عبدالصمد اچکزئی نے کیا اور سندھ میں ایک لاؤ لشکر تھا جن میں جی ایم سید اور سارا سومرو خاندان اور بھرگڑی وغیرہ متعدد لوگ شامل تھے۔ لیکن پنجاب جس کو پاکستان کا دل کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی مخالفین بے شمار تھے۔ اول علامہ عنایت اللہ مشرقی اور خاکسار پارٹی، دوم احرار پارٹی جس میں عطاء اللہ شاہ بخاری، حبیب الرحمٰن لدھیانوی، احتشام الدین، مولوی اظہر علی اظہر سیالکوٹی، نوابزادہ نصر اللہ خان مظفر گڑھ جس کا حال ہی میں انتقال ہوا۔ یہ سب لوگ

پاکستان کے خلاف تھے پھر یونینسٹ پارٹی جنہوں نے مسلمانوں کا بہت نقصان کیا کہ کانگرس اور اکالی دل کے ساتھ مل کر حکومت بنالی اور مسلم لیگ کو حکومت نہ بنانے دی۔ ان میں انتخابات کے وقت تو فاروق لغاری کا دادا سر جمال خان لغاری اور صادق قریشی کا باپ عاشق قریشی وغیرہ پنجاب کے اکثر لینڈ لارڈ شامل تھے۔ لیکن یہ لوگ یونینسٹ حکومت میں شامل نہ ہوئے۔

خضر حیات ٹوانہ' نواب مظفر علی قزلباش' میاں ابراہیم برق۔ اللہ بخش ٹوانہ' سلطان علی ٹنکیانہ' چودھری اصغر علی' سرور بودلہ' پیر لال بادشاہ وغیرہ اور مسلم لیگ کے ساتھ غداری کر کے لاہور کا ایک محمد رفیق اور مشرقی پنجاب کا ایک عبدالغفور قمر وغیرہ تو جون 1947ء تک پاکستان کی مخالفت کرتے رہے۔ ڈاکٹر عالم لوٹا کی طرح ناکامیاب لوگ الگ تھے۔ جنہوں نے مسلم لیگ کا مقابلہ کیا۔ اگر غیر مسلموں اور ان پاکستان کے مخالف مسلمانوں کے ووٹ اکٹھے کئے جاتے تو موجودہ مغربی پنجاب میں بھی ان کی تعداد مسلم لیگیوں کے ووٹوں سے زیادہ بنتی تھی اور شکر ہے کسی نے اس ''اصول'' سے فائدہ نہ اٹھایا کہ اللہ تعالیٰ پاکستان بنانے پر تلا ہوا تھا کہ یہ اس کی ذات پاک کا کوئی بہت بڑا راز ہے اور اس سلسلہ میں یہ عاجز اپنے مضامین میں بہت کچھ لکھ آیا ہے۔ ان باتوں کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ البتہ یہ ضرور تحریر کروں گا کہ صرف 24 سال زندگی کے بعد جب یہ ملک دہ لخت ہو گیا تو مسلم قومیت کے اصول کو بہت بڑا دھچکا لگا اور میں بہت پریشان تھا کہ ہمارے دشمنوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مغربی پاکستان بھی آئندہ دس سالوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا کہ یحییٰ خان نے ''ون یونٹ'' کو توڑ کر یہاں بھی چار صوبے بحال کر دیئے تھے اور صوبائی عصبیت ہمارا اوڑھنا بچھونا بنی ہوئی تھی۔ انہی دنوں میرے عزیز رفیق اور اسلام کے فرزند کرنل افتخار چودھری کو خواب میں کسی بزرگ نے بتایا کہ پاکستان تو ہار گیا لیکن اسلام جیت گیا اور تم میجر امیر افضل کو یہ کچھ بتا دینا۔ یہ عاجز اپنے پہلے مضامین میں ذکر کر چکا ہے کہ افتخار نے ایک جونیئر افسر کے طور پر ستمبر 65ء کی جنگ میں میرے ماتحت بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور وہ میرے لئے بیٹوں یا چھوٹے بھائیوں کی طرح ہے کہ حب اللہ اور حب رسول ﷺ کا ہم دونوں میں ایک ایسا رشتہ استوار ہو چکا ہے کہ ہم ''ایک نفس'' ہو چکے ہیں۔

بہر حال مجھے یقین ہو گیا کہ میرے لئے اس خواب میں پیغام تھا کہ ''لا تقنطوا من رحمۃ اللہ'' حوصلہ نہ ہارو۔ اسلام کی خدمت جاری رکھو۔ پاکستان کو وطن کے طور پر ہم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنانا شروع کر دیا تھا اور پہلے ''بندے ماترم'' یعنی میری ماں دھرتی کی نقل میں پاک سرزمین کو 'شاد باد' کیا تو بنگلہ سرزمین ''شاد باد'' ہو گئی کہ پاکستان قومیت کی کوئی وقعت نہیں۔ ہمیں اول اور آخر مسلمان اور مومن بننا چاہیئے۔

قرآن پاک کی سورہ آل عمران کی آیت مبارکہ 19 کے مطابق ''اسلام رب کی ذات پاک کا دین ہے۔ قرآن پاک غیر مخلوق ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور سورہ قصص کی آخری آیت مبارکہ میں جو سب کچھ ہلاک ہونے کا ذکر ہے کلام اللہ کیلئے ہلاکت نہیں کو سورہ حجر کی آیت مبارکہ 9 کے مطابق رب کی ذات پاک اس کی محافظ ہے بارھویں تیرھویں صدی عیسوی میں ایک طرف منگولوں اور دوسری طرف صلیبیوں نے اسلام پر اور مسلمانوں پر بڑی یلغاریں کیں۔ لیکن اسلام کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ پچھلی دو صدیوں میں اہل یورپ نے بھی بڑی یلغاریں کیں لیکن وہ لوگ اپنے گھروں کو واپس جا چکے ہیں صرف اپنے باطل نظریات کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں اور ہم نے ان نظریات کو

سمندروں میں ڈبونا ہے اور بھلا افسانوی عقائد والی کمزور قوم ہندو ہمیں کیسے تباہ کر سکے گی۔ آج سے نصف صدی پہلے جب ہمیں آزادی ملی تو ہماری تعداد بھارت میں رہ گئے مسلمانوں سمیت کوئی دس کروڑ تھی۔ آج برصغیر ہندو پاکستان میں مسلمانوں کی تعداد 45 کروڑ ہے کہ کیا اس قافلہ میں ایک بھی ''حسین'' نہ ہوگا؟ یا کوئی سلطان ٹیپو نہ ہوگا نہیں نہیں! ہمت کرو یہاں تو کئی سلطان محمود غزنوی نظر آ رہے ہیں۔ ''کونسی وادی میں کونسی منزل میں ہے۔ عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جان'' اس کے ظاہر ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے تو قارئین! ذرا دیکھیں وسطی ایشیا میں کیا تماشہ بن گیا روس نے اسلام کو ختم کرنے کی تگ و دو کو حد سے آگے بڑھا لیا کہ آگے افغانستان تک پہنچ گیا اور بھارت کے ساتھ مل کر پاکستان کے حصے بخرے کرنا بھی اس کا پروگرام تھا۔ لیکن اب ماسکو واپس پہنچ کر اپنے زخم چاٹ رہا ہے۔ وسطی ایشیا میں مسلمانوں نے مسجدوں کو آباد کرنا شروع کر دیا ہے اور وہ جو برائے نام مسلمان رہ گئے تھے ''دوبارہ'' مسلمان بن رہے ہیں اور چیچنیا کے چند لاکھ مسلمان تو مومن بھی بن رہے ہیں۔ جزیرہ نما بلقان میں بوسنیا کے مسلمان بھی جاگ اٹھے ہیں۔ ترکی میں بھی لادین حکومت کی بجائے اسلامی خیالات والے لوگ برسر اقتدار ہو رہے ہیں اور ''اپنے محسن اور عاشق رسول ﷺ غازی انور پاشا'' کے جسد خاکی کو اپنے ملک میں واپس لے آئے ہیں۔ الجیریا میں اسلامی گروہ طاقت پکڑ رہا ہے اور نہ صرف افریقہ سے بلکہ شرق الہند میں انڈونیشیا میں بھی جہاد کے نعرے لگ رہے ہیں اس عاجز پر اس سلسلہ میں 1986ء اور 1988ء میں جو واردات ہوئیں۔ ان میں سے چند واردات کا اختصار سے ذکر ضروری ہے کہ قارئین اس سلسلہ کے مختلف پہلوؤں کو عملی طور پر باور کر سکیں۔

اس عاجز کو کب سے لوگ حاجی صاحب کے نام سے موسوم کر کے پکارتے تھے لیکن 63 سال کی عمر پوری ہو جانے کے باوجود اس عاجز کو حج کی سعادت نہ نصیب ہوئی تھی۔ ایک تو یہ عاجز اکثر گنگناتا رہتا تھا کہ کعبہ کس منہ سے جاؤ گے؟ اور پھر میرے ایک عزیز رفیق بریگیڈیئر اختر علی کا خیال تھا کہ مجھے شاید علامہ اقبال کی طرح حج کی سعادت نصیب نہ ہو اور اگر مدینہ منورہ پہنچ بھی گیا تو کچھ ایسے تجربات سے واسطہ پڑ سکتا ہے جن سے جناب عبدالرحمٰن جامی دوچار رہتے تھے۔ بریگیڈیئر اختر علی خود عرصہ سے گنگنا رہے تھے کہ ''میرے مولا مدینے بلا لو مجھے'' اور 1967ء میں بلالئے گئے تھے اور تین سال وہاں قیام ہوا۔ یہاں واپس آئے تو ہمارے ساتھ مل کر فوج میں تحریری اور عملی طور پر عید میلاد منانے کے عمل میں مددگار ثابت ہوئے لیکن حضور پاک ﷺ کے سلسلہ میں یہ عاجز ان زمانوں میں ایسی واردات سے گزر رہا تھا کہ آنکھیں کبھی خشک نہ ہوتی تھیں تو اختر علی کے مطابق بھلا ایسا آدمی مدینہ منورہ کیسے پہنچ سکتا تھا لیکن بیس سال اس عاجز سے رب کی ذات پاک نے حضور پاک ﷺ صحابہ کرامؓ اور بزرگوں کے سلسلہ میں جو کچھ تحریر کرایا تو اتنے آنسو بھی ساتھ بہتے رہے کہ کیفیات میں کچھ ''ٹھہراؤ'' پیدا ہو رہا تھا تو 1986ء میں رب کی ذات کی طرف سے بلاوا آ گیا لیکن اکیلا نہ تھا بیوی بھی ساتھ تھی کہ اس میں شاید مصلحت تھی کہ کسی وقت جذبہ جنون میں آ کر ''عدم'' میں چھلانگ نہ لگا دوں تو دنیا میں واپس آ جاؤں کہ ''عدم'' کی ایک کیفیت جناب داتا گنج بخشؒ نے بیان فرمائی ہے اس میں سرور ہی سرور ہے کہ فرماتے ہیں' کاش میں عدم میں چلا جاؤں'' اس عاجز کو ان کیفیات کا تجربہ ستمبر 65ء کی جنگ میں ہوتا رہا اور اپنے مضامین میں اس کا ذکر ہو چکا ہے دوسری کیفیت جناب محی الدین ابن عربیؒ نے بیان فرمائی ہے کہ دردناک صورتِ حال ہے۔ یہ عاجز بارہ سال کی

عمر سے اس کیفیت سے بھی دوچار ہوتا آ رہا تھا کہ جب میں لفظ ''عدم'' کے معنی بھی نہ سمجھتا تھا۔ اس دردناک صورتحال سے میں اب بھی فرار اختیار کرتا ہوں کہ حالات برداشت کرنے مشکل ہو جاتے ہیں اور ''خلا'' میں انسان ''کچھ نہیں تھا'' میں ایسے ''گم'' ہو جاتا یا اپنے آپ کو کھو دیتا ہے کہ ہوش و حواس ختم ہو سکتے ہیں کہ قلندر یا مجذوب شاید ایسی ہی کسی صورتحال سے دوچار ہوتے ہیں اور ان تجربات یا مشاہدات کی وجہ سے اس عاجز نے اکثر ان صاحبان کی ''رفاقت'' سے بچنے کی کوشش کی۔ وغیرہ

چنانچہ یہ عاجز اپنی بیوی کی ہمراہی میں جب مکہ مکرمہ میں پہلی دفعہ خانہ کعبہ کی حاضری کیلئے چلا تو بتلایا گیا کہ ''داخلہ باب سلام'' سے ہو۔ خانہ کعبہ پر جب نظر پڑے تو جو پہلی دعا مانگی جائے وہ منظور ہو جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ''اے رب العالمین کیا ہم تیرے در پر ایک دعا کو منظور کرانے کیلئے حاضر ہو رہے ہیں؟ اور باقی دعاؤں کو ''خلا'' میں چھوڑ جائیں گے۔ میں تو آپ کی ذات پاک کے ساتھ بہت زیادہ باتیں کرنے کیلئے حاضر ہو رہا ہوں۔ اس لئے مجھے توفیق دے کہ میں آپ کے ساتھ وہ تمام باتیں کھل کر کے اس مقصد کے تحت کروں کہ اس میں میری اور ساری امت محمدی ﷺ کی بھلائی ہو'' قارئین یہ بڑی لمبی کہانی ہے کہ کیا باتیں ہوئیں یہ مضمون کئی کتابوں میں بھی ختم نہیں ہوتا لیکن حسب وعدہ یہاں چند جھلکیوں پر اکتفا کروں گا۔ صرف ایک چیز پہلے سے واضح کر دوں کہ سنتے تھے مکہ مکرمہ میں جلال ہی جلال ہے اور مدینہ منورہ میں جمال۔ ہی جمال اپنے تاثرات تو یہ ہیں کہ دونوں مقامات پر نہ جلال انسانی پیمانوں سے ناپا جا سکتا ہے نہ جمال کو ان واردات کا تعلق صورت حال اور کیفیات کے ساتھ ہے اور دونوں تصورات ''حصہ بقدر جثہ'' انسان پر حالات کے مطابق وارد ہوتے رہتے ہیں چنانچہ ہم جب باب سلام سے خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو بیوی نے میرا بایاں ہاتھ پکڑا ہوا تھا کہ بھیڑ میں وہ مجھ سے الگ نہ ہو جائے۔ جیسے ہی خانہ کعبہ پر نظر پڑی تو یہ عاجز رک گیا اور عرض کی۔

یارب العالمین! کیا یہ تیرا گھر ہے؟ اور تو ادھر ''محدود'' ہے میرا رب تو محدود نہیں۔ وہ تو ہر جگہ موجود ہے تو پھر یہ کیا مقام ہے''؟ کیا دیکھتا ہوں کہ سارے خانہ کعبہ پر مسکراہٹ چھا گئی اور ایسے جمال کی جھلکی ملی کہ معلوم ہوا کہ حجاب بھی اس کی ''وحدانیت'' ہے اور اس کا ''حجاب'' اسی کی ذات پاک کا ''وجود'' ہے اور معلوم ہوا کہ کوئی صاحب کان میں کہہ رہے ہیں ''اے سپاہی! یہ ''توحید وجودی'' کا ایک منظر ہے۔ اپنے آقا ﷺ کا فرمان یاد کر کہ جس نے پہچانا اپنے نفس کو اس نے پہچانا رب کی ذات پاک کو اور مزید فرمایا کہ میں نے اپنے پروردگار کو اپنے پروردگار کے ذریعہ سے پہچانا ہے'' یہ واردات کیا ہوئی کہ ایک چیخ نکل گئی اور میں سجدے میں گر گیا۔ تو بیوی نے سہارا دے کر مجھے اٹھایا اور کہنے لگی کہ اس طرح تو گزارا نہ چلے گا۔ اپنے جذبات پر کنٹرول کرو اس عاجز نے اپنے آپ کو کچھ سنبھالا دیا تو ساتھ ہی عرض کی ''یا رب العالمین! اس عاجز کو جو تیرے گھر آنے کی اتنی دیر لگ گئی تو کیا آپ مجھے تیار کرتے رہے کہ میں اس قسم کے نادانی یا ندامت والے سوالات کروں اور آپ اس عمل سے محظوظ ہو رہے ہیں تو اگلی گزارش بھی سن۔ توحید کا مطلب یہ عاجز یہ سمجھتا ہے کہ ایک اللہ ایک رسول ایک قرآن اور ایک امت۔ پہلی تین باتیں تو ٹھیک ہیں لیکن کیا ہم ایک امت ہیں؟ ہم تو غیروں کی بھیڑ بکریاں بنے ہوئے ہیں بلکہ ذلالت کی زندگی گزار رہے ہیں'' اور یہ ندامت کرنے سے میری جو چیخ نکلی تو ساتھ میری بیوی کی چیخ بھی نکل گئی

اور دونوں اکٹھے سجدے میں چلے گئے۔ اپنے گروپ کے اور جاننے والے کچھ لوگ ساتھ تھے۔ وہ کچھ فکر مند ہوئے اور آ کر تسلی دی کہ ابھی تو تم لوگ عمرہ کیلئے خانہ کعبہ آئے ہو اور اس کی کچھ ضرورتیں اور اعمال ہیں۔ پہلے وہ شرائط پورے کریں۔ پھر اپنے رب کے سامنے چیخ و پکار کا عمل جاری کریں لیکن اسی دوران واردات ہو چکی تھی'' کہ اے سپاہی تم لوگ مسلمان تو ہو۔ تم مومن بنو رب کی ذات پاک نے سورہ النساء اور سورہ روم میں مومنین کی مدد کا وعدہ کیا ہے تو ایک امت بھی بن جاؤ گے اور عزت کی زندگی بھی تمہیں حاصل ہو جائے گی۔ لیکن یہ عاجز خاموش نہ رہ سکا اور عرض کی کہ ''اے میرے رب! لوگ تو کہتے ہیں کہ ہم تیرے ہیں تو اپنے نام اور اپنے حبیب ﷺ کے نام کے صدقے ہم پر رحم فرما دے۔ یہ عاجز اسی وجہ سے تیرے گھر پر حاضری دیتے ڈرتا تھا کہ تیرے قہر سے دو چار نہ ہو جاؤں کہ تیرے گھر میں داخلے سے پہلے آپ پوچھ نہ لیں کہ کہاں ہے تمہارا زاد راہ اور یہ سفر کس بل بوتے پر کر رہے ہو؟ اے میرے رب یہ عاجز جو امت محمدیہ ﷺ کے لئے دعاؤں کو اپنا وطیرہ بنائے پھرتا ہے یہ اس وجہ سے تو نہیں کہ میں نیک پاک ہوں۔ اس عاجز کو معلوم ہے کہ میرے گناہوں کے بارے میں خود آگاہ ہوں اور آپ کے سوا کوئی دوسرا ان گناہوں کے بارے میں آگاہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود آپ نے پردہ رکھا ہوا ہے اور مجھے ''حضور پاک ﷺ کے سپاہی'' کے نام سے موسوم کر دیا ہے۔ اب روز قیامت مجھے اسی نام سے پکارنا کہ حساب کتاب سے بچ جاؤں اور وہاں بھی پردہ قائم رہے اور اب اس دنیا میں بھی مجھے ان گناہوں کے باوجود جو اپنے گھر بلا لیا ہے تو اس عاجز نے تو جھولی پھیلا دی ہے کیا میں یہاں سے خالی واپس جاؤں گا؟'' تو اس عاجز نے محسوس کیا کہ رب کی ذات پاک کی رحمت جوش میں آ گئی ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور ہم ''عدم'' میں چلے گئے یا ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔ جب ذرا ہوش آیا تو ایک دعا الہام کے طور پر مل چکی تھی جو اب میری زندگی کا حصہ ہے اور میری ہر کتاب میں جلی الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ دعا یہ ہے:

''رب نبی محمد ﷺ! تو مقلب القلوب ہے۔ ہمارے دلوں کو پھیر دے کہ حضور پاک ﷺ کے جمال سے عالم اسلام کو معطر، مطہر اور منور کر دیں اور حضور پاک ﷺ کے جلال سے غیرت حاصل کر کے عشق بلاخیز کا قافلہ سخت جان بن جائیں اور جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنا کر اللہ تعالیٰ کی فوج (حزب اللہ) بن جائیں''۔

قارئین! اب ہم اپنے مضامین کے آخری سلسلہ میں واقعی طور پر بھی آخری دہائی میں پہنچ چکے ہیں کہ آصف نواز کی موت کے بعد 1993ء کا سال بھی اسی چال بے ڈھنگی سے گزر گیا۔ جس طرح پہلے سال گزرتے رہے کہ اس ملک کی ساری تاریخ بری فوج کے سربراہ کے گرد گھومتی ہے۔ آصف نواز کی موت کے بعد ملک کا صدر غلام اسحاق اور وزیر اعظم نواز شریف اس الجھن میں ''الجھ'' گئے کہ کون آدمی اس کو اپنی کرسی پر زیادہ دیر براجمان رکھ سکے گا۔ جس ملک کے صدر اور وزیر اعظم کی ''وقعت'' ایسی گری ہوئی ہو جہنم میں جائیں ایسی ''کرسیاں'' اور ایسی حکومتیں۔ فیصلہ چونکہ غلام اسحاق کے ہاتھ میں تھا تو اس نے اپنے ایک پختون بھائی عبدالوحید کاکڑ کو یہ کرسی عطا کر دی جو کافی جونیئر تھا۔ اس وجہ سے فوج کی کارکردگی بھی مجروح ہوئی اور پیشہ ورانہ لحاظ سے بھی وحید کاکڑ اوسط سے کچھ نیچے والوں میں شامل ہوتا تھا اور زیادہ وقت اپنی ''گھڑ سواری'' پر ضائع کرتا تھا کہ پہلے مضامین میں گزارش ہو چکی ہے کہ جنرل امیر حمزہ کی نصیحت کے باوجود کہ نظریہ جہاد کو سمجھا جائے لیکن وحید کاکڑ کے کان پر جوں تک نہ

رینگی۔ اور یہ ہماری عسکری زندگی کے "اندھیرے" پہلو ہیں جن کے ہمارے مستقبل پر بڑے خراب اثرات ہوں گے۔ البتہ وحید کاکڑ نے غلام اسحاق کی سیاسی قوت کو وقتی طور پر طاقت ضرور دی کہ اس نے نواز شریف کی حکومت کو برخاست کر دیا لیکن ایسا کرنے کے لئے اس کو سارے اصول توڑنے پڑ گئے کہ نئی حکومت بنانے کے لئے اس کو پیپلز پارٹی کی مدد کی ضرورت تھی اور بینظیر کے خاوند زرداری جس کی "بددیانتیوں" اور دھاندلیوں کی وجہ سے وہ بینظیر کو چند سال پہلے برخاست کر چکا تھا۔ اس زرداری کو اسے وزیر بنانا پڑ گیا۔ وزیراعظم بلخ شیر مزاری کو بنانا پڑا جو انیسویں صدی میں رہتا تھا اور اس کا تعلق ڈیرہ غازی خان کے تمون داروں اور لینڈ لارڈوں سے تھا جو زمانہ حاضرہ کے "تقاضوں" سے بہت دور رہتے تھے تو چند ماہ ملک اس لئے چلتا رہا کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے کہ غلام اسحاق نے صوبوں میں سیاسی خربازاری کی مدد سے جو حکومتیں بنوائیں ان کی کہانیاں لکھ کر اپنا ہی سر پیٹنا پڑتا ہے کہ پنجاب میں نواز شریف کے "پروردہ" اور کمزور حیدر وائیں کی جگہ منظور وٹو کو وزیر اعلیٰ بنایا گیا جو پنجاب اسمبلی کا سپیکر تھا اور اُس کا باپ پکا قادیانی تھا۔ اور منظور وٹو نے مسلمان کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔

لیکن قدرت کے رنگ بھی نرالے ہیں کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا راز ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ اور رسول پاک ﷺ کے نام پر بنائے ہوئے ملک میں، ہر بددیانت آدمی کو خواہ ایسی بددیانتی مادی ذرائع کے لئے ہو یا Intellectual Dishonesty ہو جس کے لئے اسلام میں کوئی لفظ نہیں کہ اسلام کے لحاظ سے نہ "ضرورت بد" necessary evil ہو سکتی ہے نہ انسان کو evil genius "بد دانا" کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے لحاظ سے حکمت اور دانائی اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی میں ہوتی ہے۔ اس لئے "پکی نوکری" والے غلام اسحاق کے "عبرتناک انجام" کا وقت آ گیا تھا اور سب سیاستدان خوب "ننگے" ہوئے بلکہ کافرانہ رومن قانون بھی تھیلے سے باہر آ کر "ننگا ناچنے لگا" ان ایام میں جو غلام اسحاق کے نواز شریف کو برخاست کرنے کی کارروائی کو عدالت میں چیلنج کیا گیا یا منظور وٹو کو وزارت اعلیٰ سے ہٹانے کی قانونی تگ و دو ہوئی۔ یا غلام اسحاق کی کارروائی کو غلط قرار دے دیا گیا یا ایک وقت میں پنجاب میں "دو گورنر" تھے۔ ایک غلام اسحاق کا مقرر کیا ہوا گورنر اور دوسرا نواز شریف کا "نامزد" یا نواز شریف کی حکومت تو بحال ہو گئی لیکن اس کا دائرہ کار صرف اسلام آباد تھا۔ قارئین ان باتوں کی تفصیل میں جا کر یہ عاجز آپ لوگوں کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ جنرل وحید کاکڑ بھی "بے بس ہو گیا اور غلام اسحاق کی مزید مدد نہ کر سکا۔ اور اس کے ماتحتوں نے اس کو مجبور کر دیا کہ غلام اسحاق اور نواز شریف دونوں کی چھٹی ہو جائے۔ عدلیہ نے پاکستان میں پہلی دفعہ ایک بہت بڑا "تیر مارا" تھا کہ صدر کی کارروائی کو بروقت غلط قرار دیا لیکن عملی طور پر ان کا یہ فیصلہ چند دن بھی نہ چل سکا۔ یہ عاجز زیادہ تبصرہ نہ کرے گا۔ قوم کو صرف یہ باور کرائے گا کہ فطرت نے یہاں کافرانہ اور باطل نظاموں خواہ یہ نظام سیاسی ہوں یا معاشی، دفاعی ہوں یا رفاعی، کبھی کامیاب نہ ہونے دیئے کہ یہ ملک دین اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے اور یہاں صرف اسلامی نظام یا نظام مصطفیٰ ﷺ کامیاب ہو سکتا ہے جس کا اصول یہ ہے کہ ہر زمانے کے لئے رہبر و رہنما مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

"ہے وہی تمہارے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کر دے"

لیکن یہ تو کلمہ حق اور تصویر کا صحیح رُخ ہے۔ اس عاجز نے اوپر جو ڈرامے بیان کئے ہیں کہ سیاستدان، فوجی اور عدلیہ اپنی اپنی بنسری بجا رہے تھے کہ وہ سب کچھ ہیں۔ اور کچھ بھی نہیں۔

افسوس کسی دانشور نے یہاں ہمارے دشمنوں کی اصلی سازش سے پردے نہیں اتارے کہ اصلی سازش یہ تھی کہ ''پکی نوکری'' والا غلام اسحاق جس نے یہ چارج غلام کذاب کے پوتے ایم ایم احمد سے سنبھالا تھا۔ وہ جا رہا تھا۔ ایم ایم احمد کے دشمنوں کے ایجنٹ ہونے کی کہانی بہت لمبی ہے۔ اختصار کے طور پر صرف اتنا ذکر کریں گے کہ اکتوبر 1947ء میں سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر کے طور پر اس نے گورنر مودی کے احکام کے تحت جموں محاذ نہ کھولنے دیا کہ مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ کو جموں میں کچھ ''حفاظت'' مہیا کی جائے اور پھر مشہور کر دیا جائے کہ مہاراجہ نے بھارت کے ساتھ ریاست کے الحاق پر دستخط کر دیئے ہیں۔ یہ عاجز اس تلخ حقیقت کو کئی بار دہرا چکا ہے کہ اس کے بعد بھارتی فوج کشمیر میں داخل ہوئی۔ آخری بار ایم ایم احمد کا نام مارچ 1971ء میں آتا ہے کہ یہ آدمی جنرل یحییٰ خان کا مشیر خصوصی تھا۔ اور مشرقی پاکستان کو ''لات مارنے'' کا جب مارچ 1971ء میں عملی فیصلہ کیا اور بغیر مکمل تیاری کے پاکستانی فوج کو ''پولیس کارروائی'' کیلئے جب ''جھونک'' دیا کہ بنگالی یونٹس بغاوت کر جائیں تو قارئین یاد کریں کہ یہی ایم ایم احمد' ڈھاکہ میں یحییٰ خان سے سب کچھ کرا رہا تھا اور پھر جب پاکستان دولخت ہو گیا۔ تو مغربی پاکستان میں ایم ایم احمد کا یار خاص ذوالفقار علی بھٹو تخت حاصل کر چکا تھا۔ جس کے ساتھ ایم ایم احمد اور اختر ملک 1964ء میں ایک مسٹر سبحان کے گھر ملتے تھے کہ کشمیر میں گوریلا کارروائی کا ''ڈرامہ'' رچایا گیا۔ قارئین یہ عاجز سب کچھ اپنے مضامین میں بیان کر چکا ہے۔ ان بیانات کے تانے بانے ملائیں کہ ضیاء الحق کیلئے ایم ایم احمد کی بجائے پکی نوکری والے غلام اسحاق کی ''مشاورت'' موجود تھی۔ اپریل 1993ء میں یہی غلام کذاب کا پوتا' جو امریکہ آباد ہو گیا تھا وہ پاکستان آیا اور اس نے آ کر غلام اسحاق کے ساتھ ملاقات کی تو میرا ماتھا ''ٹھنکا'' تو یکم اگست 1993ء کی اخبار نوائے وقت میں عطاء الحق قاسمی کہتا ہے کہ غلام کذاب کا پوتا' غلام اسحاق کو مشورہ دے گیا کہ وہ معین قریشی کو پاکستان کا وزیراعظم بنائے اور پھر ایسے ہی ہوا۔ معین قریشی کو قسم اٹھانے والے دن کے لئے شیروانی' نواز شریف کے ایک ''پروردے'' سرتاج عزیز نے مہیا کی تھی۔ قارئین میں لمبی بحث میں نہیں پڑتا۔ اوپر والے سب ایک ہیں۔ ہمارے حکمران خواہ وہ مسلم لیگ کی شکل میں ہوں۔ خواہ پیپلز پارٹی کے روپ میں' خواہ مارشل لاء کے ڈنڈے کے طور پر یا قادیانی یا بے دین لوگ یا بیوروکریٹس یا یہودی اور اینگلو امریکن والے' سب ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔ یہ معین قریشی جو امریکہ کا شہری ہے۔ امریکہ میں اس کی فرم کے زیادہ حصے دار یہودی ہیں اور اس فرم کا زیادہ کاروبار بھارت کے ساتھ ہے۔ پاکستان میں ان کا دھیلے کا بھی کام نہیں۔ اس کی بیوی غیر مسلم ہے اور اولاد ماں کے مذہب پر ہے۔ خود معین قریشی کو لاہور میں یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس کی ماں کہاں دفن ہے۔ گو پاکستان میں رہتے اس کو ایک دن یاد آیا کہ اس کی ماں مسلمان تھی اور لاہور میں دفن تھی۔ معین قریشی خود اسلام کے بارے سب کچھ بھول چکا ہے۔ اور شاید نماز کا سبق بھی بھول گیا ہو گا۔ تو اس آدمی کو پاکستان کا وزیراعظم کیوں بنایا گیا؟ کہ اس کے بغیر پاکستان میں کوئی آدمی نہ مل سکتا تھا جو ''غیر جانبدار'' انتخابات کرائے؟ قارئین! یہ ایک بہانہ تھا کہ معین قریشی نے ہماری معاشیات کا رخ زمانے کے ضرورت کے تحت پکے طور پر یہودی سود خوروں

اور امریکہ کی معاشیات کے ساتھ ملانا تھا کہ چند سالوں میں ڈالر کی قیمت میں بے پناہ اضافہ ہوا اور ان تین چار ماہ میں اس کو فتح خان بندیال قسم کے وزیر دیئے گئے۔ جو ''بسر وچشم'' کے بغیر کچھ نہ جانتے تھے۔ یہاں پر یہ یہ عاجز ایک اضافہ کرے گا کہ معین قریشی ہماری معیشت کو اس طرح تباہ کر گیا کہ اس کے جانے کے بعد نواز شریف کو غیر ملکی کرنسی یا ڈالروں کے اکاؤنٹ کو Freez کرنا پڑا۔ میں نے بھٹو کے زمانے میں جو ذکر کیا تھا کہ بھٹو نے ہماری معاشی تباہی کی ایسی بنیاد باندھی کہ حالات صحیح نہیں ہو سکتے۔ تو موجودہ حکومتوں کے یہ دعوے کہ حالات بہتر ہو گئے ہیں' بالکل غلط ہیں کہ اگر ذرا بھر بہتری آتی تو غیر ملکی کرنسی کے اکاؤنٹ سے Freez ہونے کی پابندی ختم ہو جاتی۔ یہ عاجز عملی آدمی ہے اور عملی مثالوں کو صحیح مانتا ہے۔

قارئین! چھپے ہاتھوں کو معلوم تھا کہ غلام اسحاق جا رہا تھا۔ وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کی ''ضرورت'' ختم ہو گئی تھی اور سیاسی افراتفری کے طور پر بے نظیر اور نواز شریف کو کچھ اور دن تگڑم ناچ نچانا تھا۔ بے نظیر چیخ و پکار کر رہی تھی۔ کہ اس کو ایک اور موقع دیا جائے۔ وہ امریکہ کی پرورد گی کا پورا حق ادا کرے گی۔

لغاری سیاسی قلابازیاں مارنے کے ماہر تھے

اس لئے 1993ء کے انتخابات بھی ایک ڈرامہ تھا کہ بے نظیر کو ایک ''موقع'' عطا کیا۔ ویسے ''میدان'' اور مقابلہ میں کئی شاہسوار ہوتے ہیں۔ بوڑھا غلام اسحاق بھی کچھ امیدوار تھا۔ جب بے نظیر کو اکثریت مل گئی تو آ کر بڑی خوش آمد کی کہ وہ بے نظیر کی ''دانائی'' اور ''سمجھ بوجھ'' میں شریک ہو کر ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ نوابزادہ نصر اللہ بھی ''امیدواروں'' میں شامل ہو گیا کہ اس نے ساری عمر مادر پدر آزاد جمہوریت کی خدمت کی۔ اس کو اب اس کا ''صلہ'' ملنا چاہیئے۔ لیکن ''چھپے ہاتھوں'' کی نگاہ ڈیرہ غازی خان کے ایک لینڈ لارڈ کی طرف بھی تھی۔ اس خاندان میں جب نواب آف کالا باغ امیر محمد خان کے ایک بیٹے نے شادی کا فیصلہ کیا' تو نواب صاحب نے بیٹے کو اجازت دینے کے باوجود جو تبصرہ کیا۔ صحافت کے آداب مجھے وہ کچھ لکھنے میں مانع ہو رہے ہیں۔ ورنہ اس تبصرہ کے دو فقروں کے مضامین میں ایک پوری کتاب لکھ دی گئی ہے۔ میری اس لغاری خاندان کے ساتھ ''واقفیت'' اس وقت سے ہے جب 1944ء میں ان کا سربراہ جمال خان لغاری' قائداعظم کو دعوت دینے والوں میں بھی سرفہرست تھا کہ پنجاب میں یونینسٹ وزارت مسلم لیگی حکومت کہلائے اور پھر گورنر سر گلانسی کی ذرا آنکھ دکھانے پر ''قلابازی'' مارنے میں بھی دیر نہ لگائی۔ اس خاندان کا ''خاندانی قرضہ'' بھی ابھی باقی ہے جو سر عمر حیات ٹوانہ اور سر سکندر حیات کے خاندان کافی حد تک ''ادا'' کر چکے ہیں۔ شاید کچھ بچت محمد خان لغاری کے رویہ کی وجہ سے ہو رہی ہو کہ گو ہر چڑھتے سورج کی پرستش تو وہ بھی کرتا تھا کہ دولتانہ کی وزارت میں بھی شامل' فیروز خان نون وزارت میں بھی شامل اور عبدالحمید دستی کے وزارت میں بھی شامل تھا۔ لیکن ''مقابلتاً'' دیانتدار آدمی تھا ویسے رب ذات پاک عبرتناک انجام میں بعض دفعہ لمبی رسی دے دیتا ہے کہ یہ عاجز پہلے بیان کر آیا کہ دسمبر 1971ء میں جب کچھ جنرل بے عزتی کے ساتھ فوج سے نکالے گئے تو جنرل گل حسن جو برابر کا ''قصور وار'' تھا۔ وہ بچ گیا تھا لیکن چند ماہ بعد اس کو زیادہ بے عزت کر کے فوج سے نکالا گیا۔ اسی طرح سب سیاستدان جلد بے عزت ہوتے رہے اور بھٹو بچتا رہا اور اس کو لمبی رسی ملتی رہی لیکن جب وقت آیا تو بھٹو کے لئے کال کوٹھڑی' تختہ اور شاہ نواز اور

مرتضیٰ بھٹو کی ناگہانی اموات' پھر دیر نہ لگی۔ شاید فاروق لغاری اور اس کا بیٹا اویس یا فاروق کی بھانجیاں' سمیرا ملک اور عائلہ ملک سب اچھے لوگوں میں شامل ہوں کہ اتنے خاندانی جھگڑوں کے باوجود جو علیحدگی تک پہنچے۔ یہ لوگ پاکستان میں ''دندناتے'' پھرتے ہیں۔ بے نظیر سے بھول ہوگئی یا مجبوری تھی یا فطرت کی کوئی ضرورت تھی یا ہے اور اس ''قصہ'' نے لمبی دیر چلنا ہے کہ فاروق لغاری کا صدر بن جانا اور کئی معاملات میں ''ملوث'' ہونا۔ خواہ رمزی کا معاملہ ہو۔ یا ڈیرہ غازی کی چوٹی کو بھی ''ایوانِ صدر'' بنا لینا۔ میرے لئے بہت اچھنبا ہے۔ کہ معاملات چل رہے ہیں اور یہ خاندان ''قرضہ ادا'' کرتا ہے یا جو ''الزامات'' ہمارے تک پہنچے ہیں وہ غلط ہیں۔ یا کچھ ''ان ہونیاں'' بھی ہوتی رہتی ہیں۔ یا کسی کو ''معافی'' بھی مل جاتی ہے۔ یا ''قلا بازیاں'' مارنے کے یہ لوگ ماہر ہیں کہ اس خاندان کو یہ کچھ ورثہ میں ملا ہے تو اس لئے بچ جاتے ہیں۔ بے نظیر اور پیپلز پارٹی والے شاید ان قلا بازیوں کے بارے بے خبر تھے کہ انہوں نے صدارت کا تاج ''بلوچوں کے لغاری'' قبیلے کے سر پر رکھ دیا۔ ''قلا بازی'' کیلئے پنجابی زبان کا لفظ ''کھر بوجی'' یا ''خر بوجی'' اپنے اندر وسیع معنی سموئے ہوئے ہے کہ ''خر بازاری'' کے ساتھ بھی اس کے تانے بانے ملتے ہیں جو ''اجتماعی'' عمل ہوتا ہے۔ اور ذاتی یا فرد کے کردار کیلئے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ کہ اس عمل کیلئے پہلے زمین پر ماتھا ٹیکنا پڑتا ہے اور بدن کو پورا الٹا چکر دینے کے باوجود ماتھا بالکل صاف ستھرا دکھایا جاتا ہے اور اس پر شکن بھی نہیں پڑنے دی جاتی۔

فاروق لغاری کی خوش قسمتی اسے پسرور کے مشہور اور ''وقتی'' ککے زئی خاندان کے شاہد حامد کی ''مشاورت'' بھی میسر تھی یہ لوگ بھی ''کھر بوجیوں'' کے ماہر ہیں کہ میری اس خاندان کے ساتھ واقفیت دوسری جنگ عظیم سے پہلے کی ہے کہ شاہد حامد کے دادا مغفور و مرحوم شاہ نواز جو پاکستان بننے کے بعد پنجاب اسمبلی کے ممبر بھی رہے' ہمارے خاندان سے شناسا تھے اور شاہد کے والد اور دو چچاؤں نے میرے ساتھ فوج میں نوکری بھی کی اور میرے ہم عصر بھی تھے۔ بلکہ شاہد حامد کے دو چچیرے بھائی بھی فوج میں آ گئے اور میرے رفقا میں شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ فاروق لغاری اور شاہد حامد مل کر اس طرح پاکستان کے معاملات پر چھا گئے کہ بے نظیر اپنے ''محسن'' وحید کاکڑ کو جو اس کے طاقت میں آنے کا سبب بنا تھا۔ کو بھی نوکری میں بڑھوتری نہ دلوا سکی۔ اور اس کے ''جانشین'' کے طور پر قاضی اشرف کو بھی بری فوج کی سربراہی نہ دلا سکی۔ گزارش ہو چکی ہے کہ پاکستان کے معاملات بری فوج کے سربراہ کی شخصیت کے گرد گھومتے ہیں۔ تو اب فاروق لغاری اور شاہد حامد کو ایک ایسے شخص کی تلاش تھی۔ جس کو وہ ''استعمال'' کر سکیں یا جو آدمی ان کی طاقت کا سبب بن سکے۔ تو شاہد حامد کے ''گرائیوں'' یا ''ہمسایوں'' میں ایک قادیانی خاندان نے بھی' جن کا تعلق شاید وزیر آباد کے نزدیکی علاقوں سے تھا' سیالکوٹ میں انگریزوں سے بڑے ٹھیکے اور مراعات حاصل کی ہوئی تھیں۔ اور ان میں سے ایک کرامت علی نے چھاؤنیوں کے انتظامی افسر کی نوکری بھی حاصل کر لی تھی اور اس کا بیٹا جہانگیر کرامت اپنی ''قادیانیت'' پر پردہ رکھے فوج میں لیفٹیننٹ جنرل ہو چکا تھا۔ کچھ ''چھپے ہاتھوں'' کی بھی اس کو مدد حاصل تھی کہ وہ لوگ ایک قادیانی کو فوج کا سربراہ بنوا کر فوج میں ''لادینیت'' کو لانا چاہتے تھے۔ تو اس طرح بری فوج کی سربراہی جہانگیر کرامت کو مل گئی۔ جس نے شرافت کا لبادہ بھی اوڑھا ہوا تھا اور بنیادی طور پر کچھ ''کمزور'' انسان بھی تھا کہ شاید اس شرافت کے لبادہ نے اس کو ظاہر طور پر بھی بے جان

کر دیا۔ تو اس کو فاروق لغاری اور شاہد حامد صرف اتنا استعمال کر سکے کہ اس کے ''بل بوتے'' یا مدد سے انہوں نے بے نظیر کو چلتا کیا۔ لیکن اپنے اصلی عزائم کوئی بھی نہ حاصل کر سکا کہ فاروق لغاری نے معراج خالد کے تحت جو حکومت تشکیل کی، اس کے آدمیوں کو دیکھ کر فاروق لغاری کی ''فراست'' کا پول بھی کھل گیا کہ اس کے مشیر کتنے گئے گزرے ہوئے ہیں۔ سفر پر کچھ پابندیاں تھیں ہر مسافر کی ہوائی اڈوں پر سخت چیکنگ ہوتی تھی اور ایک صاحب جو لغاری کے وزیر بننے کیلئے لاہور ہوائی اڈے پر پہنچے کہ انہوں نے وزارت کی قسم اٹھانی ہے تو ان کی بات کو سیکورٹی کے ہیڈ کانسٹیبل بھی ''ماننے'' کو تیار نہ ہوئے کہ شکل وصورت سے تو وہ ایسا نہیں لگتا۔ ایک فوجی کرنل کو بھی اس لئے وزیر بنایا گیا کہ لغاری کے ساتھ رشتہ داری ہے اور صوبہ سرحد سے بھی ایسے آدمی کو وزیر بنایا گیا جو فاروق کا رشتہ دار تھا ورنہ کسی نے اس کا نام بھی نہ سنا تھا اور یہ عاجز اپنے پچھلے مضامین میں قادیانیوں کے ایک وکیل کا ذکر کر چکا ہے جس کے بارے اٹارنی جنرل عزیز منشی نے مجھے کہا تھا کہ وہ قادیانی نہیں اور اس عاجز نے گزارش کی تھی کہ تب وہ قادیانیوں سے بدتر ہے۔ وہ بھی چند دنوں کیلئے وزیر بن گیا۔ اب ان لوگوں کی مدد سے وہ ملک کی سربراہی پکے طور پر کیسے سنبھال سکتا۔

میں نے نواز شریف سے کہا اوّل تو آنے والے انتخاب میں وزیراعظم نہیں بنے گا اگر بن گیا تو پہلے سے زیادہ بے عزتی سے نکالا جائے گا

بہر حال فاروق لغاری نے اندرونی طور پر بہت کوشش کی کہ کسی طرح وہ ملک کی سربراہی پر پکے طور براجمان ہو جائے یا اپنی کرسی کو ایسا مضبوط کرلے کہ آنے والی حکومت اس کے سامنے ''کٹھ پتلی'' کے طور پر کام کرے۔ یا جہانگیر کرامت اور فوج کو کچھ اہمیت دے کر وہ کوئی ایسا نظام ڈھال لے کہ اس کی ''اہمیت'' قائم رہے۔ لیکن شاہد حامد اپنی اور اس کی ''وقعت'' کے بارے اچھی طرح ''آگاہ'' تھا۔ فاروق اپنے خاندان کے زور کی وجہ سے ملک کے انتخابات میں کسی قومی یا صوبائی اسمبلی کا ممبر ضرور بن جائے گا لیکن قومی سیاست میں اس کے خاندان کو نہ کبھی پہلے سربراہ بننے کی سعادت حاصل رہی ہے اور نہ آئندہ کبھی اس کے خاندان کا کوئی آدمی ایسی سعادت حاصل کرسکتا ہے کہ لوگ ان پر اعتبار نہیں کرتے اور انگریزوں نے بھی اس خاندان کو عمر حیات یا سکندر حیات وغیرہ کے مقابلہ میں ''ثانوی حیثیت'' سے بھی کم تر رکھا۔ تو صدر کی کرسی اس نے پیپلز پارٹی میں شمولیت کی وجہ سے حاصل کی۔ ان کے اعتبار پر پورا نہ اتر کر اس نے ''کھر بوجی'' والی خاندانی روایت پر مہر لگا دی۔ اس لئے قومی سیاست میں اس کے لئے سربراہی حاصل کرنا مشکل تھا۔ یہی ''وقعت'' شاہد حامد کے اپنے خاندان کی تھی کہ اس کا دادا مرحوم ومغفور، دولتانہ مسلم لیگ کی وجہ سے صوبائی اسمبلی کا ممبر بن سکا اور اس کا والد کرنل حامد نواز پیپلز پارٹی میں شمولیت کی وجہ سے، اس لئے شاہد حامد کی مشاورت کے طور فاروق لغاری نے نواز شریف کے ساتھ ایک ''غیر فطری'' اتحاد کرلیا کہ اپنی کرسی کو بچائے اور یہ ایک ''عارضی'' معاملہ تھا۔ اور قوم کو سب کچھ معلوم ہے چنانچہ دسمبر 1996ء میں اس عاجز نے قوم کو ایک کھلا خط لکھا، جس کے چند صفحات میں اس عاجز نے پاکستان کی پوری تاریخ لکھ دی کہ ہر حکمران کس طرح عبرتناک انجام سے دوچار ہوُا کہ ہم کافرانہ اور باطل نظاموں کی پیروکاری کرکے

عوام کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا دیتے ہیں۔ تم لوگ ان ''خرباز اریوں'' اور کافرانہ طرائق سے توبہ و ندامت کر کے اسلام کے فرزند بنو اور فاروق کو یہاں تک لکھا کہ جناب عمر فاروقؓ کے خط کے اثرات تو دریائے نیل نے بھی قبول کر لئے۔ تم پر میرے خطوط کا اثر کیوں نہیں ہو رہا اور نواز شریف کو آخری تنبیہہ کر دی کہ اول تو آنے والے انتخابات میں شاید وہ وزیر اعظم نہ بن سکے۔ لیکن اگر وہ وزیر اعظم بن سکا تو پہلے سے بھی زیادہ بے عزتی کے ساتھ اس کو وہ کرسی خالی کرنا پڑ جائے گی۔

قارئین! یہ عاجز نہ کسی فقیری کا دعویدار ہے نہ کبھی میں نے بڑماری ہے کہ میرے پاس کوئی روحانی طاقتیں ہیں۔ پس بعض اوقات کوئی غیبی طاقت میرے منہ میں کوئی الفاظ ڈال دیتی ہے یا بعض دفعہ میری قلم سے کوئی ایسے الفاظ لکھا دیئے جاتے ہیں جن کے بارے میں نے کبھی سوچا ہی نہیں ہوتا۔ قارئین! میں زیادہ تبصرہ نہیں کرتا۔ ہماری 59 سالوں کی ذلت کی زندگی کا قصہ ختم ہو گیا۔ جب نواز شریف کو اس کے اپنے چنیدہ ایک فوجی نے بے عزتی سے وزیر اعظم کی کرسی سے ہٹا دیا۔ اس فوجی کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اس عاجز نے اس عزیز کو انہی دنوں میں لکھ دیا تھا کہ ایوب' یحییٰ خان اور ضیاء الحق کے حشر کو مدنظر رکھو۔ افسوس کہ میرا وہ خط یا باقی خطوط اس کو ''دکھائے'' نہیں جاتے۔ یا وہ دیکھتا نہیں ہے۔ یہ عاجز مضامین کے اس سلسلہ کو ختم کرتا ہے۔ میں نے اب تک بہت کچھ کہہ دیا ہے اگر ہم ان باتوں سے سبق نہیں لیتے تو ہم ''مواقع تقدیر'' کا فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ جیسا مضامین کے شروع میں عرض کی تھی کہ اپنے آقا ﷺ کے فرمان کو مدنظر رکھیں۔ اس جہاں دنیا کی وقعت رب کی ذات پاک کے سامنے مچھر کے پر کے برابر نہیں۔ آیئے اس دنیا میں آخرت کے امتحان کیلئے تیاری کریں کہ انسانیت کی سب سے بڑی خدمت اس کو دوزخ کی آگ سے بچانا ہے۔ یہ ملک اللہ تعالیٰ سبحانہ اور رسول پاک ﷺ کے نام پر بنا ہے۔ یہاں کبھی بھی کوئی باطل اور کافرانہ نظام کامیابی سے نہ چل سکے گا۔ ہر حکمران یا ''بڑا'' جو کچھ کرے گا۔ اس دنیا میں بھی عبرتناک انجام سے دوچار ہو گا۔ پاکستان اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا بہت بڑا راز ہے۔ رب کی ذات کو انتظار ہے کہ عشق بلاخیز کا قافلہ سخت جاں یا یا مومنین کا قافلہ اسی خطہ سے اٹھے گا۔

مضمون ختم کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اول تو میں جو سچ لکھنا چاہتا ہوں' وہ شاید پوری طرح سے مجید نظامی صاحب بھی شائع نہ کر سکیں کہ میرے ماضی پر تبصروں کو تو کچھ برداشت کر لیا گیا کہ وہ لوگ اب زندہ نہیں یا برسر اقتدار نہیں۔ برسر اقتدار آدمی اس عاجز کا ''سچ'' نہ برداشت کر سکیں گے کہ فوجی وردی میں ہوتے ہوئے میرے سچ کو اوپر والوں نے مجبوراً برداشت کیا۔ کہ فوج میں میرے رفقا اور ساتھیوں کا ایک ''انبوہ'' تھا اور اوپر والے کچھ ڈرتے تھے۔ 1995ء میں مجھے ایک بڑا ہی تلخ تجربہ ہوا۔ شروع سال میں ہم کچھ ریٹائرڈ فوجیوں' کچھ دانشوروں' کچھ لکھاریوں وغیرہ کو دعوت ملی کہ ہم انٹر کنٹینل ہوٹل میں اجتماع کریں۔ جہاں پنجاب کا وزیر اعلیٰ منظور وٹو ہمارے ساتھ کچھ قومی معاملات کے سلسلہ میں مشورہ کرنا چاہتا ہے لیکن جب وہاں پہنچے تو سٹیج پر کچھ ''مولوی'' اور ایسے لوگ بیٹھے تھے جو ہر چڑھتے سورج کی پوجا کرتے ہیں۔

جمہوریت اور سیاست میں ہر آدمی کا مقام ہوتا ہے۔ نواز شریف پنجاب کا آمر بننا چاہتا تھا تو منظور وٹو نے مجبوراً اس کی مخالفت شروع کی ہے اور پیپلز پارٹی۔ کے ساتھ اتحاد کر کے پنجابیوں کو نواز شریف کی آمریت سے

چھٹکارا دلانا چاہتا ہے۔

بہر حال طریقہ یہ اپنایا کہ کچھ چنیدہ لوگوں نے قومی معاملات کے الفاظ کی آڑ لے کر منظور وٹو کی "شخصیت" کے گرد قلعے تعمیر کرنے شروع کر دیئے۔ تو اس عاجز نے ان "مولویوں" کو ٹوکا کہ اللہ تعالیٰ کا خوف کرو۔ جو آدمی برسراقتدار آئے تم اس کے گن گانا شروع کر دیتے ہو۔ ہمیں تو کہا گیا تھا کہ یہاں قومی معاملات زیر بحث آئیں گے۔ یہاں ہم لوگ تمہارے "خطاب" سننے تو نہ آئے تھے کہ لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب، مگر لذت شوق سے بے نصیب" اس کے بعد اس عاجز نے قومی افراتفری اور سیاسی خر بازاری کا ذکر کیا اور کہا کہ منظور وٹو صاحب سمیت تمام برسراقتدار لوگوں کیلئے میرا پیغام یہ ہے کہ وہ توبہ و ندامت کریں اور ان "خر بازاریوں" کو ختم کریں۔ مسلمان اور مومن بنیں۔ ان باطل سیاسی نظاموں سے توبہ کریں۔ اور پوری قوم کو اللہ تعالیٰ کی فوج بنایا جائے وغیرہ۔ اب "چمچوں" نے مجھے روکنے کی کوشش کی کہ آپ کو بلایا نہیں گیا کہ آپ تقریر کریں۔ پہلے ان لوگوں کی باتیں سنیں جو خطاب کرنے کیلئے چنے گئے ہیں۔

سویلین کپڑوں میں پولیس والے مجھے زبردستی تھانے لے گئے

تو ایسا ہی ایک آدھ اور مولوی سامنے آیا تو بجلی بند ہو گئی اور پانچ دس منٹ انتظار یا متبادل انتظام کی کوشش بھی ناکام ثابت ہوئی تو اس عاجز نے اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ کو بھی یہ "لاحاصل مشق" ناپسند تھی تو بجلی بھی بند ہو گئی اور احتجاج کے طور پر میں اس مجلس کو "الوداع" کہتا ہوں کہ ہمیں غلط اطلاع دے کر یہاں اکٹھا کیا گیا اور ہمارا وقت ضائع کیا۔ میں تھوڑا آگے نکلا تو ایک آدمی جو بعد میں معلوم ہوا راولپنڈی کا اے سی تھا' اس نے مجھے روکنے یا پکڑنے کی کوشش کی تو میں نے الٹے ہاتھ سے اس کو روکنے کی کوشش کی تو یہ ہاتھ کا جھٹکا اتنا سخت تھا کہ اس کے منہ پر ایک سخت تھپڑ رسید ہو گیا جس سے اس کے قدم لڑکھڑا گئے تو سویلین کپڑوں والی پولیس میرے چاروں طرف پھیل گئی اور میں ان کے گھیرے کے اندر اپنی کار کی طرف چلتا رہا۔ لیکن جیسے ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو پولیس والوں نے زبردستی مجھے پکڑ کر ایک دوسری گاڑی میں ڈالنے کی کوشش کی۔ اخبار کے فوٹوگرافروں کو کچھ "بھنک" لگ گئی تھی اور وہ سارے مناظر کے فوٹو لیتے رہے۔ آگے لمبی کہانی ہے۔ پولیس والے مجھے سول لائن پولیس سٹیشن میں لے گئے۔ اور مجھے کہا کہ میں ان کی نگرانی میں ہوں۔ میں نے پولیس والوں سے کوئی بحث نہ کی اور نہ کہا کہ مجھے رہا کرو۔ ظہر کی نماز کا وقت آیا تو میں نے پولیس والوں سے باتھ روم کے بارے پوچھا اور وضو کر کے نماز پڑھی تسبیح میرے پاس تھی میں وہ پڑھتا رہا کہ پھر پولیس والے مجھے کہنے لگے کہ ان کی نگرانی ختم ہو گئی ہے۔ وہ میری کار وہاں لے آئے تھے اس کی چابی مجھے دی اور مجھے کہا کہ میں گھر جا سکتا ہوں۔ میں نے انکار کر دیا کہ میرے ساتھ ایسے کیوں کیا گیا۔ اب فیصلہ عدالت کرے گی اور میں نے پولیس کے ساتھ کوئی بھی بحث کرنے سے انکار کر دیا۔ عصر کے وقت کیا دیکھتا ہوں کہ میرا بھانجا بریگیڈئر لیاقت جو اس وقت میجر تھا اور داماد ڈاکٹر نور زمان وہاں پہنچ گئے۔ اور انہوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں گھر چلوں کہ کسی طرح یہ خبر میرے بیٹے ڈاکٹر خالد کو امریکہ میں بتا دی گئی ہے اور وہ اور اس کے بیٹے بہت پریشان ہو رہے ہیں اور یہ خبر میرے بیٹے میجر شبیر کو بھی پہنچا دی گئی ہے کہ وہ مانسہرہ میں تھا اور کام چھوڑ کر گھر آ رہا ہے اور چھوٹے پوتا' پوتی یا نواسہ اور نواسی رو رہے ہیں کہ

بڑے ابا جی کو پولیس والے کیوں پکڑ کر لے گئے؟ تو میں گھر چلا آیا لیکن اخبار والوں کو کسی نے کچھ نہ بتایا تو دوسرے دن راولپنڈی کی تمام انگریزی اور اردو اخباروں کے پہلے صفحے پر یہ ساری خبر نمایاں طور پر شائع ہوگئی۔

اخباروں نے سب کہانی صحیح طور پر بیان کی۔ البتہ کچھ اخباروں نے میرے اے سی کو تھپڑ رسید کرنے کی کہانی کی سُرخی ''ڈرامائی'' انداز میں دی۔ ایسا شاید پولیس والوں نے کرایا کہ وہ مجھے بلاوجہ پکڑ کر تھانے لے گئے' اس کا کچھ ''جواز'' بنایا گیا۔ بہرحال سخت ردعمل ہوئے' میرے گھر ملنے والوں کا تانتا بندھ گیا' اور بے حساب فون آئے کہ زیادہ اخباروں نے وہ فوٹو شائع کئے' جہاں پولیس والے مجھے زبردستی اٹھا کر پولیس کی گاڑی میں ڈال رہے تھے۔ حاضر نوکری والے فوجی ادارے تو خاموش رہے لیکن ریٹائرڈ فوجیوں نے احتجاج کرکے اخبار بھر دیے۔ عزیزم کرنل چودھری نے ایک انگریزی اخبار کو ایک احتجاجی خط لکھا کہ اے سی کو کوئی حق نہ پہنچتا تھا کہ وہ میجر صاحب سے آ کر الجھ پڑا۔ اور پھر پولیس والے کس قانون کے تحت میجر صاحب کو گرفتار کرکے تھانے لے گئے کہ پھران کو رہا کرنے کیلئے میجر صاحب کے بچوں کی منتیں شروع کر دیں۔ میجر امیر افضل ہماری فوج والوں کیلئے ایک بڑے بھائی اور والد کی طرح ہیں اور ساری فوج کو حکومت پنجاب کے اس عمل پر بہت دکھ ہوا ہے کہ انہوں نے میجر صاحب کے علم اور عمر کی قدر نہ کی وغیرہ۔ میرے دیرینہ دوست سید ضمیر جعفری نے اخبار میں دو کالم کا مضمون لکھ دیا کہ میجر امیر افضل کی اور خدمات کے علاوہ صرف یہی ایک خدمت کافی ہے کہ ستمبر 65ء کی جنگ کے لاہور کے محاذ کے سب سے آگے والے مورچوں کی کمانڈ کی اور ملک اور قوم کی لاج کیلئے اس کے ماتحت آخری گولی اور آخری جوان تک اس جذبے سے لڑے کہ بھارتی فوج کے بریگیڈوں کو پاش پاش کر دیا کہ بعد میں بھارتی لوک سبھا میں بھارتی اپنے اس عظیم نقصان کی خبریں سن کر سکتے میں آ گئے۔ کیا قوم کے ہیروؤں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے جو قوم کے اس مایہ ناز فرزند سے ہوا۔ بہرحال سید بشیر حسین جعفری سمیت بے حساب لوگوں نے احتجاج کیا۔ یہاں البتہ ہم جنرل سید رفاقت کا مختصر تبصرہ لکھ رہے ہیں' جو ایک اخبار میں شائع ہوا تھا:۔

''افسوس کہ ان لوگوں کو میجر امیر افضل کے بارے معلوم نہیں کہ اس کھردری چمڑی کے اندر کتنا حساس دل' کتنا روشن ضمیر کس قدر وجیہہ کردار اور کتنا پرسوز دل چھپا پڑا ہے۔ اس سیدھے سادھے جسم نے اپنی ساری زندگی حق کی سربلندی کی خاطر اور جھوٹ اور عیاری اور مکاری کو بے نقاب کرنے میں صرف کر دی ہے۔ اس چھوٹے سے سپاہی نے بڑے بڑے فرعونوں کو للکارا اور اس کے کلمتہ الحق کی صدا مصنوعی ایوانوں میں ہمیشہ زلزلہ کشاں رہی۔ وہ درباری رسم و راہ نہ اپنا سکا۔ وہ صرف آداب فقر و قلندری جانتا ہے۔''

لیکن قارئین! اب صورتحال اور تبدیل ہو چکی ہے۔ مجھے کسی نے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا تو کوئی ردعمل نہ ہوگا۔ مجھے جاننے والے جا چکے ہیں اور میرے ساتھی و رفقا اب ''انگلیوں'' پر گنے جا سکتے ہیں۔ اور وہ بھی گوشہ نشین والی صورت سے دوچار ہیں کہ بڑھاپے یا کسی چھوٹی موٹی بیماری کی وجہ سے گھر کی ''چار دیواری'' تک محدود ہیں۔

آج سے دو اڑھائی سال پہلے یعنی 2001ء یا یعنی 2002ء میں مغرب کی نماز کے بعد ایک شام آئی ایس آئی کا ایک حوالدار یا ہیڈ کانسٹیبل آیا اور کہنے لگا کہ وہ مجھ سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا ''کہ میں کیا جانوں کہ تمہارا تعلق آئی ایس آئی سے ہے یا بھارتی ایجنسی را سے ہے یا تم قادیانیوں کے ایجنٹ ہو۔ میں سورج غروب

ہونے کے بعد کسی اجنبی کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ چند ماہ پہلے تمہاری طرح ایک آدمی دن کے وقت مجھے ملنے آیا۔ میں نے سمجھا کوئی کتاب لینا چاہتا ہے۔ میں نے اس کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ کہنے لگا کہ اس کا تعلق آئی ایس آئی سے ہے۔ میں نے کہا کوئی شناختی نشانی دکھاؤ کہنے لگا باہر جا کر موٹر سائیکل کے بیگ سے لاتا ہوں لیکن باہر نکل کر ایسا بھاگا کہ واپس نہ آیا میں نے آئی ایس آئی والوں کو رپورٹ دی تو انہوں نے جواب دیا کہ ان کا کوئی نمائندہ تمہارے پاس نہیں آیا۔ تم نے اگر مجھ سے کوئی پوچھ گچھ کرنی ہے تو سرکاری چٹھی لے آؤ اور کل دن کے وقت آ کر مجھے ملنا۔ لیکن بہت ضروری بات ہے تو آپ کا کوئی افسر میرے ساتھ بات کر لے۔''

وہ دو آدمی تھے اور موٹر سائیکل پر تھے۔ اور اس وقت نظر آیا کہ انہوں نے میری بات مان لی ہے لیکن تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ وہ میرے کئی ہمسایوں کے گھر گئے اور میرے بارے سیدھے سوالات کر کے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہی۔ کچھ بیچارے انجان ہمسائے سہم گئے۔ اور اکثر نے سمجھا کہ میجر صاحب نے کوئی بڑا جرم کیا ہے اور یہ تفتیش کرنے والے لوگ تھے کہ ایک دو نے اسی رات دس بجے آ کر ہمیں خبر دی کہ میجر صاحب کی سخت نگرانی ہو رہی ہے تو میں ہنس پڑا۔ صرف ایک فوجی رشتہ دار کو خبر دی کہ کل وہ آئی ایس آئی سے پوچھیں کہ وہ کیا ڈرامے کر رہی ہیں کہ انجانے سویلین پر بڑے خراب اثرات ہو رہے ہیں اور یہ طریقہ صحیح نہیں۔ اسی بیاسی سال عمر والے میجر صاحب کے بارے اس طرح کا رویہ اختیار نہیں کیا جاتا۔

رات کے بارہ بجے' فون کی گھنٹی بجی اور آئی ایس آئی کا نام لے کر ایک سویلین افسر نے اپنا تعارف کرایا کہ انہوں نے اپنی ایک ٹیم مجھ سے کچھ پوچھ گچھ کرنے کیلئے بھیجی تھی۔ جس کو میں نے ''گھاس'' نہ ڈالی تو میں نے کہا کہ تم نے مجھے فون کیا ہے' تم افسر ہو یا افسر بنے ہوئے ہو کہ آگے سے میں جواب دوں۔ آپ کی وہ ٹیم بڑے نادان لوگوں کی تھی کہ ہمارے محلّہ میں ہل چل مچی ہوئی ہے کہ میجر امیر افضل نے کوئی بڑی سازش کی ہے کہ اس کی سخت نگرانی ہو رہی ہے۔ میرے عزیز میں اب اس عمر میں پہنچ چکا ہوں کہ حکومت چلانا تو دور کی بات ہے میں مسجد میں نماز باجماعت کیلئے نہیں جا سکتا۔ اور صرف جمعہ کی نماز مسجد میں پڑھتا ہوں۔ عزیزم جنرل مشرف کو بتا دینا کہ میری ذات سے وہ کوئی خطرہ محسوس نہ کرے۔ اور وہ افسر کچھ مرعوب ہو رہا تھا اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے دوسری بات جلدی میں کر دی کہ میرے عزیز...... یہ کون سی ایمرجنسی تھی کہ آپ نے مجھ بوڑھے کو آدھی رات کو جگا دیا تو وہ افسر کہنے لگا کہ اگر کوئی آدمی جیل میں جا رہا ہو تو اس کو جیل میں جانے سے بچانے کیلئے ضروری ہے کہ اس کو رات کو بھی جگا لیا جائے۔ اس عاجز نے کہا کہ کیا ہماری موجودہ حکومت یا صاحب اقتدار اس حد کو پہنچ چکے ہیں کہ اپنے محسنوں کو بھی نہیں پہچانتے کہ اس عاجز نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصّہ لیا۔ پاکستان کی تینوں جنگوں میں حصّہ لیا خاص کر ستمبر 65ء کی جنگ میں میرے ماتحتوں نے عظیم قربانی دے کر لاہور کو بچایا اور کسی سنی سنائی غلط بات کی چھان بین کئے بغیر مجھے تنگ کیا جا رہا ہے۔ تو وہ کہنے لگا کہ ہم تمہارا تعارف کسی اور کی زبانی سننا چاہیں گے جو فوج میں کسی اعلیٰ عہدہ پر رہا ہو اور تمہارا ہم عصر تھا۔

میں نے کہا میرے اکثر ہم عصر رب کے پاس پہنچ چکے ہیں کہ جنرل ضیاء الحق بھی نوکری میں مجھ سے

سات سال جونیئر تھے اور آصف نواز وغیرہ جو میرے بیٹوں کے زمرے میں آتے تھے وہ بھی جا چکے ہیں۔ میں ذرا یاد کرتا ہوں کہ کس کا نام لوں۔ تو عرض کی ہاں موجودہ پنجاب کے گورنر جنرل محمد صفدر میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہیں اور میرے ساتھ جونیئر افسر کے طور پر نوکری کی اور جنرل محمد اقبال جو چند ماہ پنجاب کے گورنر رہے تھے۔ وہ بھی ایسی ہی کیٹیگری میں آتے ہیں۔ اسلم شاہ وغیرہ اور احمد کمال چند جنرلوں کے نام لئے۔ اور ساتھ ہی پوچھا کہ میں نے کون سا قتل کیا ہے کہ میری ایسی تفتیش ہو رہی ہے۔

تو اس افسر نے پوچھ لیا کہ سلطان بشیر محمود سائنسدان کے ساتھ تمہارے کیوں اور کیسے تعلق ہیں؟ میں نے کہا کہ میرے تعلقات اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور رسول ﷺ پاک کی وساطت سے ہوتے ہیں۔ ''حب اللہ بغض اللہ'' سلطان بشیر اور یہ عاجز مسلم قومیت اور امت واحدہ کے تصور کے پیروکار ہیں ہم نے مل کر چند کتابیں لکھی ہیں۔ وہ افغانستان مہاجرین کیلئے قربانی کے جانوروں کی قیمت یا ویسے چندہ اکٹھا کرتا رہتا ہے اور ایک اشتہار میں میری اجازت سے اس نے اپیل کرنے والوں میں میرا نام اور پتہ بھی لکھا ہے۔ اور ہم ملتے رہتے ہیں۔ تو وہ افسر کہنے لگا کہ ''تم کبھی افغانستان گئے ہو؟'' میں نے کہا..... ''اگر عمر اجازت دیتی تو ضرور جہاد میں بھی شرکت کرتا لیکن میں تو اب چلنے پھرنے سے بھی معذور ہوں تو وہ افسر کہنے لگا کہ بشیر صاحب افغانستان کیوں گئے تھے؟ میں نے کہا اس نے اپنی تحریک اور عمل پر اخبار نوائے وقت میں کئی مضامین لکھے ہیں اور ہمیں زبانی بھی یہی بتایا تو وہ افسر کہنے لگا کہ بشیر صاحب کیسا آدمی ہے؟ تو میں نے کہا نہایت مخلص انسان ہے اول بھی مسلمان ہے اور آخر بھی مسلمان۔ آج تک اس عاجز کو اس کے کسی دوست اور رفیق نے ''مایوس'' نہیں کیا کہ وہ اس کے بغیر کچھ اور ہو۔ جو کچھ میں نے اس صاحب کے بارے سوچا' کہ یہ رشتہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور رسول پاک ﷺ کے طفیل ہے۔ اس لئے میں بشیر صاحب کے خلوص پر کبھی شک نہ کروں گا اور نہ اس کے بارے کسی سنی سنائی بات یا الزام پر یقین کروں گا جب تک خود چھان بین نہیں کرتا تو وہ افسر کہنے لگا کہ اچھا میں پھر کبھی آپ کے ساتھ پوری بات کروں گا۔ لیکن اس کے بعد آئی ایس آئی سے کسی نے میرے ساتھ رابطہ نہ باندھا۔ دوسرے دن میں نے بشیر صاحب کے ساتھ فون پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ لاہور گئے ہوئے تھے۔ دو دن بعد معلوم ہوا کہ ان کو حراست میں لے لیا گیا۔ باقی کہانی اخباروں میں آتی رہی ہے کہ بشیر صاحب کافی دن آئی ایس آئی کے ''مہمان'' رہے لیکن ان پر کوئی الزام ثابت نہ ہوا اور نہ ان کا کوئی ''جرم'' سامنے آیا اور نہ ڈاکٹر عبدالقدیر کی طرح ان کو اپنی کوئی غلطی ''تسلیم'' کرنا پڑی۔ اور مجھے کئی ذرائع سے معلوم ہوا کہ آئی ایس آئی والے میرے بارے بھی پوچھ گچھ کرتے رہے۔ لیکن لوگوں نے آگے سے بتایا کہ میجر امیر افضل ایک کھلی کتاب ہے وہ جو کچھ کہنا چاہے وہ ملک کے سربراہوں کے منہ پر بھی کہہ چکا ہے ایسا آدمی کسی چوری چھپے والے عمل میں مشکل سے ملوث ہوتا ہے میں نے یہ ساری کہانی تفصیل سے اس لئے لکھی ہے کہ ہمارے خفیہ اداروں کے پاس ایسی کوئی لسٹ نہیں ہوتی ہیں کہ کسی کے ساتھ کیسا طریقہ اختیار کیا جائے۔ وہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کے عادی ہیں۔

بھٹو میری بات سمجھ گیا تھا اس نے آئی ایس آئی کا ایک متعلقہ ذیلی ادارہ توڑ دیا

یہ عاجز آئی ایس آئی والوں کے طور طریقوں کو خوب سمجھتا ہے کہ پرانے زمانے میں ان کے اکثر سربراہ

جنرل شاہد حامد، جنرل سید غواص، جنرل ملک شیر بہادر، بریگیڈئر ملک محمد حیات اور جنرل محمد اکبر وغیرہ میرے ہم عصر اور ذاتی درست تھے اور سٹاف کے اکثر افسران میرے گہرے دوست تھے۔ اور ملکی معاملات کے بارے میں ہم میں وحدت فکر تھی۔ ان سب لوگوں کی پالیسی حقیقت پسندانہ تھی۔ لیکن جنرل ریاض یا جنرل نوازش یا جنرل ارشاد جیسے لوگ وہاں آئے تو یہ ادارے بھی ''کاغذوں کی پیروی'' والے ادارے بن گئے۔ اور ستمبر 65ء کی جنگ کے بارے قوم کو یا فوج کو ہرگز بروقت تنبیہہ نہ کر سکے حالانکہ ہمارے جیسے لوگ شور مچا رہے تھے کہ خدارا اپنی حفاظت کرو، دشمن حملہ کرنے والا ہے۔ بہر حال آئی ایس آئی کی پالیسی بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ علاوہ ازیں آئی ایس آئی میں بھی وہی بھیڑ چال چلتی ہے جس کی ہماری قوم شکار ہے کہ ہر خبر پر اعتبار کر لیں گے۔ ''خبریت'' کی ہمارے ملک میں کوئی کمی نہیں۔ ہر ادارے کے پاس بے حساب سچی اور جھوٹی خبریں پہنچتی رہتی ہیں۔ لیکن خبروں کی Collation یا چھان بین ایک ایسا ہنر یا ملکہ ہے، جس کے لئے بہت زیادہ ''فراست'' یا ''مومن کی فراست'' کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور 1974ء میں اس عاجز نے جو چند ماہ آئی ایس آئی میں گزارے۔ مجھے یہ پہلو بڑا کمزور نظر آیا۔ اس عاجز کے زمانہ میں ہماری سیکشن میں خبر دینے والوں نے خبریں دینا بند کر دی تھیں کہ جب وہ کوئی خبر دیتے تھے تو میری طرف سے ردعمل کے طور پر جو سوال ہوتے تھے۔ خبر دینے والوں کے پاس اس کے ''جوابات'' نہ ہوتے تھے۔ کہ اڑتی ''ہوائیوں'' کی وہ خبر تو دے دیتے تھے لیکن اپنے ذرائع اور اعمال کے ثبوت نہ پیش کر سکتے تھے۔

علاوہ ازیں کچھ لوگ لاحاصل مشقوں میں مصروف ہوتے ہیں اور ایسے محکمے بھی بنائے جاتے ہیں جہاں لوگ مفت کی تنخواہ لے رہے ہوتے ہیں کہ میرے زمانے میں وہاں ISI کے ایک بریگیڈئر صاحب کے ماتحت ایک بڑا ادارہ کام کر رہا تھا جس کیلئے فیلڈ میں چار یا پانچ کرنل کام کرتے تھے۔ اور ان کا بہت بڑا سٹاف تھا یہ لوگ جس عمل کی روک تھام کیلئے خبریں دیتے تھے۔ اس عمل کو عملی طور پر روکنا ناممکن تھا۔ اور ایسا وہاں ہوسکتا ہے جہاں پورے ایمان سے سرشار اللہ تعالیٰ کی فوج بنی ہوئی ہو۔ اس ادارہ کی جو سہ ماہی رپورٹ وزیر اعظم کو جاتی تھی اس کا جب اس عاجز نے ڈرافٹ تیار کیا تو ''دبی زبان'' میں ادارہ کے ''دفاع'' میں اس عاجز نے جان بوجھ کر لکھ دیا کہ ان رپورٹوں پر عمل کرنے کیلئے اتنے ذرائع کی ضرورت ہے جو ہمیں میسر نہیں یہ رپورٹ ویسے ہی ذوالفقار بھٹو کے پاس چلی گئی۔ اور میں تو آئی ایس آئی کو چھوڑ چکا تھا کہ میں پچھلے مضامین میں تاثر دے چکا ہوں کہ میں جنرل غلام جیلانی کیلئے میں ''ناپسندیدہ'' آدمی تھا۔ بھٹو البتہ بات کو سمجھ گیا اور آئی ایس آئی کے اس متعلقہ ذیلی ادارے کو توڑ دیا گیا۔ اور غلام جیلانی وغیرہ کو اس بات کی سمجھ نہ آئی کہ ان کے اپنی اپنے ''دفاع'' کی رپورٹ کی وجہ سے جن لوگوں کو مفت میں تنخواہ مل رہی تھی ان کو کسی کام والی جگہ پر تبدیل کر دیا اور یہ قومی بچت ہوگئی۔

بہر حال یہ ISI والا قصہ کئی کتابوں کا مضمون ہے کہ اصلی بات یہ ہے کہ پاکستان بنانے کا مقصد چونکہ واضح نہیں اور اس پر عمل نہیں تو ہر ادارہ ''ڈنگ ٹپاؤ'' طور پر چل رہا ہے اور ISI میں ''خبریت'' زیادہ تر ''حولداروں'' یا ''ہیڈ کانسٹیبلوں'' کے ذرائع سے حاصل کی جاتی ہیں تو ان ''مخبروں'' کی خبریت کی سطح بھی بہت نیچی ہوتی ہے۔ مانا کہ ہر خبر کیلئے بہت زیادہ تجربہ کار لوگ یا افسران کو ملازم نہیں رکھا جا سکتا لیکن ہر خبر کی اہمیت کے مطابق اس کے ''مخبر'' کے ''برتن'' کا مطالعہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ''برتن'' کتنے پایہ کا ہے۔ اس میں کیا کچھ

سما سکتا ہے اور اس برتن والے کی ''بصیرت'' کتنی ہے کہ ''آنکھ کا نور دل کا نور نہیں'' پھر مخبر کے کردار کی چھان بین کی ضرورت ہے، لیکن پاکستان میں قحط الرجال کا رونا کتنا رویا جائے۔ اسی وجہ سے یہ عاجز بار بار مومن کی فراست کا ذکر کرتا ہے۔

میں نے تو کیا ہے پردۂ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے تیرا مرض کورِ نگاہی

تو قارئین! اس عمر میں اس عاجز نے ڈرنا شروع کر دیا ہے کہ سچّی باتیں لکھ کر یہ عاجز ''نازک مزاج شاہاں'' کے عتاب کی ''تاب'' نہ لا سکے گا اور بیٹوں اور بیٹی کی تو میں نے تربیت کی تھی اور ان کو پہلے دن سے یہ باور کرا دیا تھا کہ میں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے آپ میری تکالیف کی فکر نہ کیا کریں لیکن اب پوتوں، پوتی اور نواسے اور نواسیوں کی ''فکرمندی'' نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں 'محتاط' رویہ اختیار کروں ورنہ ''خبریت'' کی اس ملک میں کوئی کمی نہیں۔ اخبار والے اگر چاہیں تو ان کے پاس خفیہ اداروں کی نسبت بغیر کچھ زیادہ خرچ کے زیادہ خبریں اور اندرونی باتیں پہنچ سکتی ہیں اور مغربی ممالک میں اخبار والے ملک کے خفیہ اداروں سے زیادہ ''باخبر'' بنتے جا رہے ہیں اور ہمارے ملک میں تو ہر بات کا کھوج لگانا بہت آسان ہے، لیکن اس سلسلہ میں بڑے تجربہ کار سٹاف کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کام بڑے سائنٹفک طریقوں سے کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال ہم تو یہ ''میدان'' خالی کرنے والے ہیں۔ خدا کرے کہ بہتر لوگ اس میدان میں آ کر قوم کی رہنمائی کریں۔ یہ عاجز صرف یہ جھلک دے کر ان مضمونوں کا سلسلہ ختم کرنا چاہے گا کہ ہم فرقہ وارانہ یا گروہ بندی والے اسلام کی بجائے یا خطوں یا صوبوں کے چکر میں پڑنے کی بجائے مسلم قومیت، امت واحدہ کے تصور اور رسول عربی ﷺ کے اسلام کو اول سمجھنے کی کوشش کریں اور پھر اس پر عمل کر کے ''حزب اللہ'' بن جائیں۔ پاکستان کی تخلیق میں رب کی ذات پاک کا یہی بہت بڑا راز ہے۔

اس عاجز نے یہ تاثر بھی دیا ہے کہ ہمارا اسلام عربی اسلام نہیں' ترکی یا فارسی اسلام ہے اور جو لوگ ''مفکر اسلام'' بنے ہوئے ہیں وہ خود اسلام سے نابلد ہیں۔ اس عاجز نے البتہ عربی اور بنیادی اسلام کا کچھ مشاہدہ کیا ہے اور وہ اس طرح ہے کہ میرا تعلق علاقہ سون سیکسر سے ہے جو کوہستان نمک کا مغربی حصہ ہے۔ کوہستان نمک کا علاقہ جناب محمود غزنوی کی فتوحات کیلئے بڑی فوجی اہمیّت کا حامل تھا کہ اس علاقے کو فتح کرنے کے بعد وہ اننگ پال اور ملتان کے سبز واریوں کے درمیان رابطہ منقطع کر دیتا تھا۔ اس لئے جادوناتھ سرکار نے جو تاریخ کا رنگ تبدیل کر کے محمود غزنوی کے بھیرہ پر حملے کا ذکر کیا ہے۔ یہ غلط بات ہے یہ حملہ کوہستان نمک کے قلعہ بھادیہ پر تھا جو موجودہ انب کے نزدیک تھا اور محمود غزنوی اس طرح کوہستان نمک کے علاقہ کو اپنا علاقہ بنانا چاہتا تھا۔ محمود غزنوی کے لشکر میں ایک علوی خاندان کے ایک عرب الجتی صاحب تھے' جنہوں نے ایک عربی میں کتاب لکھی ہے جس کا نام الیمینی ہے اور اس کا بعد میں انگریزی میں ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ وہ صاحب کہتے ہیں کہ محمود غزنوی نے صرف دریائے سندھ کو کالا باغ کے مقام سے اوپر ایک جگہ سے جو عبور کیا گو اس وقت کالا باغ کا نام کسی نے نہ سنا تھا لیکن جو محل وقوع الجتی نے بیان کیا وہ اس محل وقوع کے ساتھ ملتا ہے جس جگہ سے بعد میں جلال الدین خوارزم نے دریائے سندھ کو عبور کیا اور دوسری طرف چنگیز خان سب کارروائی دیکھ رہا تھا' جس نے مزید پیش قدمی

کو روک دیا کہ اس کا لشکر اس ماں کے عظیم فرزند کو گرفتار نہ کر سکے گا۔ تو ہم اندازہ لگاتے ہیں کہ یہ جگہ موجودہ کالا باغ سے اوپر ہے۔ عتبی کہتا ہے کہ صرف ایک دریا پار کیا اور آگے پہاڑی پر جو قلعہ تھا اس پر حملہ کرنا تھا وہ سیدھی اونچائی پر تھا کہ اس کی طرف دیکھتے تھے تو پگڑیاں سر سے نیچے گر جاتی تھیں۔ بہرحال اس وضاحت میں مقصد یہ ہے کہ بھیرہ کیلئے دو دریا عبور کرنا پڑتے اور وہاں کوئی پہاڑی نہیں اور مصنف کے بیان کے مطابق اور آگے بھی جو بیانات آئیں گے ان سے ثابت ہوگا کہ یہ مغربی کوہستان کا علاقہ سون سیکسر تھا۔ پھر بھیرہ کے علاقے کی کوئی عسکری تزویراتی اہمیت نہ تھی۔ کوہستان نمک کے علاقوں کو حاصل کرنے کے بعد علاقے کی اہم زمین پر محمود غزنوی کی حکمرانی ہو جاتی تھی۔

عتبی مزید لکھتا ہے کہ محمود غزنوی کے لشکر میں ایک بڑا دستہ علویوں کا تھا جو ہرات سے آ کر محمود غزنوی کے لشکر میں شامل ہوئے تھے۔ یہ بات بھی تاریخی طور پر ثابت ہے کہ ابو مسلم خراسانی بھی علویوں کا ''آدمی'' تھا اور بعد میں عباسی خلفا کے زمانے میں بھی کافی علوی ہرات اور خراسان کے علاقے میں آباد ہو گئے تھے۔ دوسری کتابوں میں تحقیق سے یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ اس علوی لشکر کا سالار قطب شاہ اول تھا جو جناب علیؓ کے بیٹے محمد بن حنفیہؒ کی اولاد سے تھا تو عتبی کے مطابق اونچائی کی وجہ سے بھادیہ کا قلعہ سر نہ ہو رہا تھا تو علوی لشکر نے ایک زوردار حملہ کر کے قلعہ کی دیواریں مسمار کر دیں اور محمود غزنوی کو فتح نصیب ہوئی۔ عتبی آگے ایک خوبصورت وادی کا ذکر کرتا ہے جس میں جھیلیں اور چشمے تھے اور ان بیانات کے مطابق یہ متشابہ علاقہ آج کل وادی سون سیکسر کہلاتا ہے جو اوچھالی سے پد ہراڑ تک کوہستان نمک کا مغربی حصہ ہے تو عتبی کہتا ہے کہ محمود غزنوی نے علوی قبائل کو اس علاقہ میں آباد کر دیا اور قرین قرین یعنی ہر گاؤں میں ایک مسجد بھی بنائی گئی کہ محمود غزنوی نے ان کو اعوان یعنی اپنے مددگار قرار دیا اور یہ عرب علوی بڑے خوبصورت عربی لہجہ میں قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے تو اعوان قاری کے نام سے مشہور ہو گئے۔ یہیں سے آگے بڑھ کر یہ قبائل مشرقی کوہستان نمک میں چوہا سیدن شاہ بلکہ ٹلہ جوگیاں تک آباد ہو گئے۔ جنوب میں خوشاب جو اس زمانہ میں ملاحوں کا ایک چھوٹا گاؤں تھا اس تک اور پنڈ دادن خان کے علاقے تک پھیلتے گئے۔

شمال میں موجودہ تحصیل تلہ گنگ کے علاقوں میں خوب پھیلاؤ اختیار کیا اور اکا دکا خاندان دھن، چکوال اور گھیبی (پنڈی گھیب) کے علاقوں میں بھی پھیلے اور کچھ اکا دکا خاندان راولپنڈی کے گرد و نواح یا ہزارہ اور آزاد کشمیر تک بھی چلے گئے، بلکہ ضلع سیالکوٹ اور جالندھر کے کچھ علاقوں میں بھی جا کر آباد ہو گئے دراصل ان میں زیادہ تعداد قرآن پاک کے حافظوں اور قاریوں کی تھی کہ جگہ جگہ اسلام کی تبلیغ میں یہ لوگ اہم کام کرتے رہے۔

علوی اعوانوں کا خوبصورت عربی لہجہ میں قرآن پاک کا پڑھنا اور اکثر لوگوں کا حافظ قرآن ہونا بیسویں صدی تک نمایاں اور ممتاز تھا۔ اورنگزیب عالمگیر کے زمانے میں جو صاحب ماہ رمضان کے آخری تین راتوں میں بادشاہ کو تراویح میں پورا قرآن پاک سناتے تھے ان کا تعلق موجودہ تلہ گنگ کے جنوب میں کھچی گاؤں سے تھا کہ اپنے ہاتھ سے بادشاہ جوان کو جائیداد عطا کر گیا آج بھی انہی حافظ صاحب کی اولاد اس جائیداد کی مالک ہے۔ پہلی جنگ عظیم کا یہ عاجز اپنے مضامین میں ذکر کر چکا ہے کہ والد صاحب مغفور و مرحوم کو بڑی ندامت تھی کہ وہ انگریز کی

فوج میں تھے اور ترکی میں جنگی قیدی بھی رہے لیکن ساتھ ہی یہ ذکر کیا تھا کہ والد صاحب کے ایک رفیق ہمارے علاقہ کے انگہ گاؤں کے حافظ محمد قاسم بھی تھے جو عربی لہجہ میں قرآن پاک اس خوبصورتی سے پڑھتے تھے کہ جگہ جگہ ترک ان کو لے جاتے تھے اور قرآن پاک سن کر جھوم جھوم جاتے تھے۔ یہ عاجز جب دوسری جنگ عظیم سے پہلے انگریزی فوج میں ''کرایہ کا سپاہی'' بھرتی ہوا تو ہماری پلٹن 33 محمدی (موجودہ 15 پنجاب) میں چھ سات حافظ قرآن تھے جو سب کے سب اعوان تھے اور دیکھا گیا تھا کہ ہر یونٹ میں ماہ رمضان میں تراویح میں کوئی اعوان حافظ ہی قرآن پاک سناتا تھا۔

ان اعوان قبائل نے اپنے خراسان یا عراق میں آباد عرب قبائل کے ساتھ بھی تعلق رکھا بلکہ وہاں کے بڑے بڑے عرب سربراہ اپنے لوگوں کو ان قبائل کی مدد کیلئے بھیجتے رہتے تھے۔ جناب شیخ عبدالقادر گیلانی نے اپنے بیٹے سید عبدالرزاق کے دو بیٹوں سید یعقوب اور سید اسحاق کو مشرقی کوہستان نمک میں تبلیغ کیلئے بھیجا تھا۔ جہاں کچھ مشرک قبائل نے ان کو دھوکے سے شہید کر دیا تھا اور یہ دونوں کلر کہار میں مدفون ہیں جن کی قبر کی نشاندہی جناب فرید شکر گنج نے کی جو وہاں بعد میں چلہ کی غرض سے آئے تھے۔ دونوں صاحبزادے ہمشکل تھے تو لوگ ان کی قبور کو ہوبہو (یعنی ایک جیسے) کے مزار کہتے تھے اور آج کل بھی ان کا مزار اسی نام سے مشہور ہے۔ غزنوی سلطنت کچھ کمزور ہو رہی تھی تو جناب عبدالقادر گیلانی نے علوی خاندان کے قطب شاہ ثانی والئے ہرات کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ مجاہدین کے ساتھ جائیں اور علوی قبائل کو مضبوط کریں کہ وہ یہ تبلیغ جاری رکھیں بلکہ شاہ ہمدان جب اس خطے میں آئے تو اپنے خاندان سے شاہ بلاول کو بھیجا جنہوں نے تحصیل تلہ گنگ کے گاؤں دندہ اور سون سیکسر کے گاؤں انگہ کو اپنا مرکز بنایا اور انیسویں صدی کے آخری حصوں میں جب انگہ سے زیادہ ہمدانی خوشاب اور جھنگ کی طرف چلے گئے تو بھیرہ میں آباد شاہ شرف قلندر گیلانی کو اشارہ ملا کہ وہ اور اس کی اولاد اعوان قاری کے علاقوں میں جو روحانی خلا پیدا ہو گیا ہے اس کو پر کریں۔ شاہ شرف قلندر خود تو انگہ میں دفن ہیں لیکن ان کا ایک بیٹا نلی اور دوسرا کھبکی تحصیل خوشاب میں دفن ہیں تیسرا اور چوتھا تحصیل تلہ گنگ کے گاؤں بھلومار اور چیچی میں دفن ہیں۔ حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے کہ فقر اور تلوار امت کیلئے وراثت کے طور پر چھوڑ رہے ہیں اور ''رسول الملاحم ﷺ'' آپؐ کا ایک اسم شریف ہے تو اعوان قبائل نے تلوار اور گھڑسواری کو ہمیشہ ایک پیشہ کے طور پر اپنائے رکھا اور اس خطے کے افغان اور ترک بادشاہوں کے لشکروں میں اعوان قبائل نے نمایاں طور پر شمولیت رکھی۔ البتہ مغل حکمران جس طرح افغانوں پر زیادہ بھروسہ نہ کرتے تھے تو اعوان قبائل کو بھی افغانوں کے مددگار گردانتے رہے لیکن اعوان قبائل نے پیشہ سپہ گری کو ہمیشہ اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا اور سکھ حکومت کو کبھی تسلیم نہ کیا اور انگریز تو ایک طرح سے چلیانوالہ کے مقام پر سکھوں سے شکست کھا کر گجرات تک پسپا ہو گئے تھے یہ اعوان قبائل اور کوہستان نمک کے سارے فوجی قبائل کا لشکر تھا جنہوں نے سکھوں پر ٹلہ جوگیاں سے آگے بڑھ کر پیچھے سے حملہ کر دیا اور سکھ دوطرفہ لڑائی میں تتر بتر ہو گئے اور انگریزوں کو مفت میں فتح حاصل ہو گئی تو انہوں نے اعوانوں کو ایک ریاست کی پیش کش کر دی کہ اپنا فرمانروا چنیں۔ اعوان مکمل خود مختاری چاہتے تھے اور اس جھگڑے میں سکھ فوج کے افسر فتح خان ٹوانہ نے آگے بڑھ کر انگریزوں کی وفاداری کا وعدہ کیا اور ٹوانے انگریزوں کے کرتا دھرتا بن گئے اور اعوان کافی عرصہ انگریزوں کے

زیرِ عتاب رہے۔ ان کی فوج میں بھرتی بند تھی لیکن کوئی اور روزگار نہ تھا تو بھوک سے مجبور ہو کر اعوان اپنے آپ کو ٹوانے یا راجپوت لکھا کر فوج میں بھرتی ہو جاتے تھے۔ دوسری افغان جنگ کے دوران لارڈ رابرٹ کو اس کی بھنک لگ گئی تو 1885ء سے اعوانوں کی فوج کی بھرتی کھل گئی اور جب انگریز گئے تو افواج پاکستان کا اعوان قاری والے سب سے بڑا قبیلہ تھے گھڑ سواری میں اعوان قاری کے لوگ پورے برصغیر میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے جس طرح پاکستان میں ہر سال گھوڑوں کا لاہور میں میلہ لگایا جاتا ہے ایسا ہی ایک میلہ آزادی سے پہلے پورے برصغیر کا ہر پانچ سال بعد دہلی میں ہوتا تھا اور ایسا آخری میلہ جنگ عظیم دوم سے پہلے 36-1935ء میں ہوا تھا۔ جس میں بڑے بڑے راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کی گھڑ سواروں کی ٹیمیں نیزہ بازی وغیرہ میں حصّہ لیتی تھیں۔ اس آخری میلہ میں جس ٹیم نے پہلی پوزیشن حاصل کی اس میں اعوان قاری کے علاقے کے جو چار سوار تھے ان میں سون سیکسر کے گاؤں کھبکی کے ملک شاہ محمد اور جابہ کے ملک محمد سرفراز اور تحصیل تلہ گنگ کے گاؤں بھلومار کے پیر مہتاب جیلانی اور چنجی کے پیر پھول بادشاہ شامل تھے۔ آخری دونوں صاحبان شاہ شرف قلندر کے پوتے تھے' جن کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔

بیسویں صدی کے وسط تک اعوان قاری کے ہر گاؤں میں اسلامی درس موجود رہے جہاں قرآن پاک اور حضور پاک ﷺ کی محبت کے اسباق دیئے جاتے تھے بیسویں صدی کے مشہور عالم اور صوفی پیر مہر علی شاہؒ نے بھی اسلامی تعلیم جا کر ہمارے علاقہ کے گاؤں انگہ میں حاصل کی تھی۔ دور دراز کے سجادہ نشینوں نے علاقہ سون سیکسر میں رہائش کیلئے مکانات بنائے ہوئے تھے اور گرمیوں میں وہاں آتے تھے اور علاقے کے علماء کے ساتھ علمی رابطے باندھتے تھے۔ سیال شریف کے سجادہ نشین کا ایسا مقام کٹھوائی کے مقام پر بنایا ہوا تھا اور موسے زئی شریف والے سجادہ نشینوں کا ایسا مقام کفری اور کوڑدی کے درمیان ڈیپاں کے مقام پر تھا اور خیر سلطان باہو صاحب کا تعلق تو اعوان خاندان سے تھا جو جا کر شورکوٹ میں آباد ہو گئے تھے۔ سلطان باہو صاحب ان علاقوں میں کئی دفعہ آئے کہ خوشاب میں نے اُن کے ہم زمانہ اور رفیق سید احمد شاہ اور محمود شاہ تھے اور ان کے ساتھ ان کا رابطہ تھا جو صاحبان خوشاب کے بادشاہوں کے نام سے مشہور ہیں اور وہاں دفن ہیں اور اعوان برادری میں ان کے ہم زمانہ سلطان مہدی، سلطان حاجی احمد اور سلطان ابراہیم تھے جو بالترتیب جابہ، اوچھالہ اودندہ شاہ بلاول میں دفن ہیں اور سلطان باہو صاحبؒ کی اولاد نے بعد میں انب کے سلطان ابراہیم اور چھپڑ کے بزرگوں کے ساتھ رابطہ رکھا اور یہ سارے لوگ اسلام کی بڑی خدمت کرتے رہے کہ سلطان باہو صاحب کی کلر کہار آمد کا ذکر بھی ہے کہ ساتھ سلطان نورنگ کھیتران بھی تھا جو ان کا مرید تھا اور سلطان باہو صاحب ہو بہو کی خانقاہ کے نیچے ایک غار میں چلہ کے حالت میں بھی رہے۔

اعوان قبائل نے عربی زبان کے کئی الفاظ اور کچھ روایات کو بھی اپنے ساتھ رکھا کہ ''دن'' کیلئے انہوں نے عربی لفظ ''نہار'' کو ''دہار'' بنا دیا اور ''پیاز'' کیلئے عربی لفظ ''بصل'' کو ''وصل'' بنا دیا۔ ''لسن'' کو ''توم'' کی جگہ ''تھوم'' بنا دیا اور متعدّد عربی الفاظ ''توکل''، ''خسارہ''، ''ضرورت''، ''حبیب''، ''رحیم''، ''رحمٰن''، ''غفور''، ''صالح''، ''کتاب''، ''قاعدہ''، ''کفر''، ''حیات''، ''دنیا''، ''شدید''، ''قتل''، ''صادق''، ''صابر''، ''علم''، ''حق''، ''باطل''،

''دین''، ''ولی''، ''عزیز''، ''فساد''، ''فتنہ''، ''غیر''، ''فرق''، ''اول''، ''آخر''، ''ظالم''، ''مظلوم''، ''جزا''، ''لعنت''، ''طعام''، ''حرام''، ''حلال''، ''غنی''، ''عالم''، ''غریب''، ''اکثر'' اور ''عقل'' اور متعدد عربی الفاظ کو ہماری علاقائی زبانوں کا حصہ بنا دیا۔ اگر ہمارے اس زمانے کے دانشور آغا خان کی نصیحت کو مان کر قومی زبان عربی کو بنا دیتے تو آج ہم سب بھی مسلمان ہونے کے علاوہ ''عرب'' بھی ہوتے اور امت واحدہ کے اتحاد والا معاملہ بڑا آسان ہو جاتا۔ اعوان قبائل کی عربی زبان کے ساتھ محبت کے علاوہ رب اکیلے کی توحید اور حضور پاک ﷺ کے ساتھ محبت بھی اپنی مثال آپ ہے۔ جب اذان شروع ہوتی ہے تو اعوان گھرانے کا بچہ بچہ پکار اٹھتا ہے۔ ''لبیک اے میرے رب'' اور پھر کہا جاتا ہے ''صدقے یارسول اللہ'' جنرل تجمل حسین مرحوم جب قید سے رہا ہوئے تو میں نے ان کو گزارش کی کہ ایک دن جمعہ کی نماز ہماری مسجد میں آ کر پڑھنا اور کھانا بھی یہاں آ کر کھانا اب جنرل تجمل جہاں کے رہنے والے ہیں وہاں اعوان قبائل آبادی کا تھوڑا حصہ ہیں لیکن میں نے دیکھا کہ اذان کی آواز پر انہوں نے وہی رویہ اختیار کیا جو اعوان گھرانوں میں ہوتا ہے بلکہ حضور پاک ﷺ کے اسم مبارک کی شہادت کا جب اعلان ہوا تو ادب کے ساتھ ان کے آنسو جاری ہو گئے اور اپنے انگوٹھوں کو چوم کر آنکھوں پر اس ادب سے لگایا کہ مجھ پر بھی رقت طاری ہوگئی۔ تو میں نے سوال کر دیا کہ یہ ادب آپ کو مبارک ہو۔ یہ ادب کہاں سے سیکھا ہے؟ تو کہنے لگے کہ والد مرحوم و مغفور نے وراثت کے طور پر یہ ادب خاندان میں چھوڑا ہے۔ اس عاجز کے پاکستان کے معجزاتی طور پر وجود آنے کے مضامین میں جن عوامل کا ذکر تھا کہ آزادی اور جنگ عظیم دوم سے تھوڑا پہلے سات آٹھ ہستیاں ''ناموس رسول ﷺ'' پر قربان ہوگئیں کہ ہمارے آقا ﷺ سے گستاخی کرنے والوں کو واصل جہنم کر دیا تو ان کے صدقے رب کی ذات پاک نے ہمیں ایک ملک عطا کر دیا۔ ورنہ ہم نے اس سلسلہ میں زیادہ محنت نہ کی تھی تو ان میں تین صاحبان کا تعلق ان خطوں سے ہے جہاں اعوان آباد ہیں۔ اول غازی ملک میاں محمد شہید کا تعلق تلہ گنگ سے تھا۔ دوم غازی ملک دوست محمد شہید کا تعلق علاقہ سون سیکسر کے گاؤں پدھراڑ سے تھا اور سوم غازی مرید حسین شہید کا تعلق چکوال کے نزدیک ایک گاؤں بھلا کریالہ سے تھا۔ قارئین! یہ مضمون بہت لمبا ہے۔ ہمارے جدامجد جناب علیؓ کی اصحابہ ثلاثہؓ کے ساتھ اتنی محبت تھی کہ بیٹوں کے نام ابوبکر، عمر اور عثمان رکھے۔ اعوان قبائل اس روایت پر بھی آج تک سختی سے کاربند ہیں اور بڑے فخر سے بیٹوں کے نام ''ابوبکر''، ''عمر''، ''عثمان'' یا ''صدیق'' یا ''فاروق'' یا ''غنی'' رکھتے ہیں۔ ہمیں ادب سکھلایا گیا۔ مسجدوں کے پاس سے ہم گزرتے تھے تو مسجد کی دیوار کو ہاتھ لگا کر ہاتھوں کو چوم لیتے تھے۔ صبح کی نماز ختم کرنے کے بعد درود شریف اونچی آواز میں مل کر پڑھتے تھے اور بچپن میں درود شریف کے ان الفاظ ''اللھم صلے علی سیدنا محمد'' کی صدا کئی دفعہ آج بھی میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔

نہ فرقہ بندی ہے نہ گروہ بندی

قارئین! اس عاجز نے اپنے بزرگوں کے سینوں سے جو اسلام سیکھا۔ اس میں نہ کوئی فرقہ بندی تھی نہ گروہ بندی۔ میرے بچپن کے زمانے میں علاقہ سون سیکسر کے بائیس گاؤں میں سب مسجدیں، مسلمانوں کی مسجدیں تھیں۔ میں نے یہ کبھی نہ سنا تھا کہ یہ فلانے فرقہ کی مسجد ہے۔ ماہ رمضان میں جب ہم تراویح کی سنتیں پڑھتے تھے

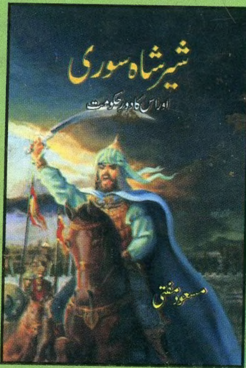
تو ہر چار رکعت کے بعد اونچی آواز میں اپنے آقا ﷺ پر درود سلام کا ایک فقرہ جو ادا کرتے تھے یہ آواز آج بھی میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ ہم سکول میں بھی پڑھتے تھے تو ساتھ گھروں میں اسلامی تعلیم بھی حاصل کرتے تھے۔ چوتھی جماعت تک میں نے یہ تعلیم گاؤں کے امام مسجد بابا حافظ اور ہمشیرہ صاحبہ سے حاصل کی ہائی سکول میں داخل ہو جانے کے بعد اپنے عربی کے استاد قاضی منظور الحق سے اسباق فالتو وقت میں حاصل کر لیتے تھے۔ قاضی صاحب بھی ہمارے اعوان قبیلہ کے ایک معزز علمی گھرانے کے فرد تھے۔ وہ علم کے سمندر تھے۔ عربی زبان پر ان کو اپنی مادری زبان کی طرح عبور تھا۔ ان کے والد صاحب ایک بہت بڑی لائبریری وراثت میں چھوڑ گئے تھے جس میں عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کتابیں ہوتی تھیں۔ زیادہ کتابیں قلمی یعنی قلم سے لکھی ہوئی تھیں۔ قاضی صاحب کو اگر ضرورت پڑتی تو ان سے استفادہ کرتے تھے۔ قرآن پاک کا ترجمہ وضاحت کے ساتھ پڑھانے کے علاوہ حضور پاک ﷺ کی شان میں عاجزی کرنے پر بہت زور دیا جاتا تھا اور زیادہ زور تاریخ پر دیا کہ صحابہ کرامؓ چلتے پھرتے اسلام تھے اور ان میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

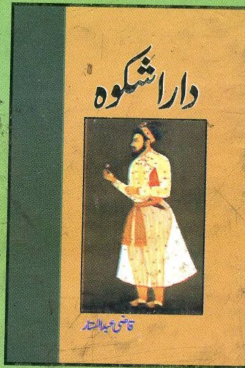
قاضی صاحب کی اس عاجز پر خاص نگاہ تھی اور مجھے اسلام کا فرزند کہتے تھے۔ بہر حال اس بنیادی صحیح اسلام کی تعلیم کے تحت مجھے پڑھایا گیا کہ اسلام صراط مستقیم ہے اور جو آدمی صراط مستقیم سے ذرا ہٹتا اس کو ''خارجی'' کہا جاتا تھا کہ اگر کوئی بیل ہل چلاتے وقت ذرا ٹیڑھا پن دکھاتا تھا تو اس کو بھی ''خارجی'' کہہ دیا جاتا تھا۔ میں نے جو اسلام کا مزید مطالعہ جاری رکھا تو میرے بزرگوں اور استادوں کی دعاؤں کی وجہ سے یہ عاجز صراط مستقیم پر ہی رہا اور کسی مذہبی جماعت کے دانشوروں نے جو ''اسلامی انقلاب'' کے نعرے لگا دیئے تو مجھے اللہ تعالیٰ نے منقلب ہونے یعنی پیچھے مڑنے یا اوندھے منہ گرنے سے بچا لیا کہ مجھے سورۃ واقعہ کے بیان کے مطابق تمام دائیں والے صراط مستقیم پر ازل سے آخر تک رواں دواں نظر آئے کہ چلتے چلتے اسی سورۃ کی آیت مبارکہ 91 کے مطابق اپنے آقا ﷺ پر سلام بھی بھیجتے جا رہے ہیں۔ میں نے اسلام کا جتنا زیادہ مطالعہ کیا تو علمی ذریعہ سے بھی میرے سامنے اپنے آقا ﷺ کی شان دن بدن ایسی بلندیاں اختیار کرتی گئی کہ میری عاجزی بڑھتی گئی اور مجھے یقین ہے کہ حضور پاک ﷺ کی عشق سے سرشار مومنین اور مجاہدین کا قافلہ سخت جان یا حزب اللہ اسی خطہ سے اٹھے گا۔ امام مہدیؓ کے ظہور میں بھی زیادہ دیر نہیں اور شروع مضامین میں یہ کچھ لکھ چکا ہوں لیکن امام مہدیؓ کے ظہور سے پہلے جگہ جگہ کچھ ''منصوروں'' نے بھی ہونا ہے اور غزوات الہند نے بھی پایہ تکمیل کو پہنچنا ہے اور اس برصغیر نے بھی کفر سے پاک ہونا ہے۔ اگر موجودہ مسلمان مومن نہ بن سکیں اور ہم کسی تباہی کا شکار ہو جائیں تو پھر معاملہ اور لمبا ہو جائے گا جو بات صحیح نہیں۔ اس لئے مضامین کا سلسلہ ختم کرتے وقت یہ عاجز سب مسلمانوں کو گزارش کرے گا کہ آؤ ہم سورۃ الصّف کے مطابق مومن بن کر جان و مال سے جہاد کی تجارت شروع کر دیں اور ہر زمانے کیلئے رہبرو رہنما مصطفےٰ ﷺ کا نعرہ بلند کریں تا کہ لوح اور قلم کے بھی وارث بن جائیں۔

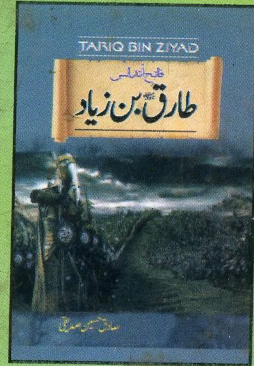
کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

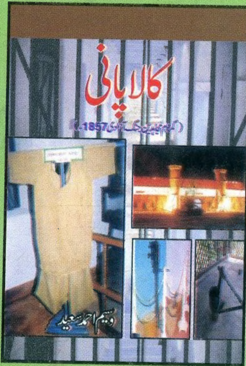


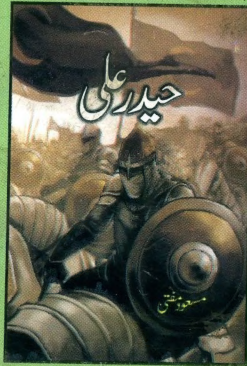
ادارے کی دیگر بہترین کُتب

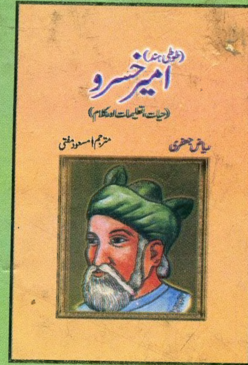


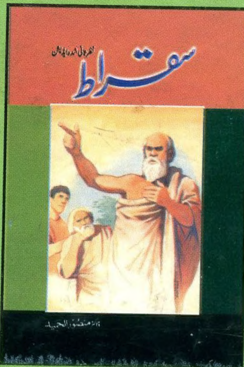


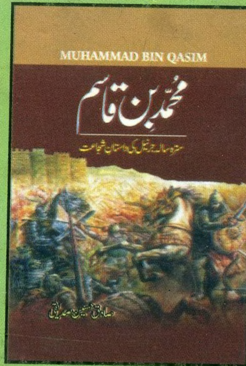


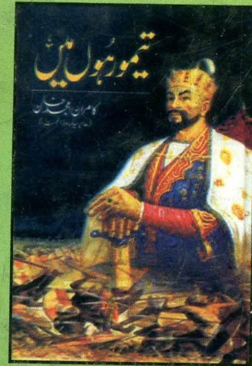












عِلم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

فون: 37352332 ،37232336 فیکس: 37223584

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com